اوّل
پازیب
ایم اے راحت

دیباچہ

آدم کی طلب، انسان کی ماں، اس قدر بے وقعت کیوں کر دی گئی۔ یہ مقدس وجود تو ہر روپ میں قابل احترام ہے، لیکن اسے بھی بازارِ حُسن کی جنس بنا دیا گیا۔ وہ صدیوں سے بک رہی ہے۔ کوئی ایسا نہ پیدا ہوا جو اس بازار کی جنس کو اٹھا کر احترام سے اپنے گھر میں رکھ لیتا۔ کسی محمود غزنوی نے ''ستی'' کی یہ رسم ختم نہ کرائی بلکہ اس آتش کدے کو ہمیشہ فروغ ہی دیا گیا۔ عورت بکتی رہی اور مرد اسے خریدتا رہا۔ بازارِ حُسن، ہیروں کی منڈی، بادشاہوں تک نے ان بکیوں کی سرپرستی کی، طوائف کو معاشرتی دوام دیا۔

چندر گپت موریہ کے دور میں جسم فروشی کو کارِ مملکت سمجھا جاتا تھا اور اس کے لئے باقاعدہ محکمہ تشکیل دیا گیا تھا۔ ایک ہزار قبل مسیح ہندوستان میں طوائف کے پیشے کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ البیرونی کی تحقیق کے مطابق راجہ، مہاراجہ طوائفوں کے ذریعے دولت کماتے تھے۔ مغلوں کے دور میں بھی طوائف کو عروج حاصل تھا۔ اکبر کے دور میں صرف شہر لاہور میں طوائفوں کے چھ ہزار گھر موجود تھے۔ طوائفیں فوجوں کے ہمراہ بھی رہا کرتی تھیں اور جنگوں کے دوران ان کے علیحدہ خیمے نصب کئے جاتے تھے۔

ہم لاہور کے بازارِ حُسن کی ایک داستان پیش کر رہے ہیں۔ یہ داستان بھی طوائف کی تاریخ سے الگ نہیں ہے۔ طوائف انسانوں سے الگ کوئی مخلوق نہیں ہے۔ وہ جیتا جاگتا وجود ہے جو ان تمام اعضاء سے مرصع ہے جن کی ترتیب ''انسان'' کہلاتی ہے۔

کوثر جہاں، شمشیرہ بیگم، اکرام، رب نواز شاہ اس داستان کے وہ کردار ہیں جو برسوں فراموش نہ کئے جاسکیں گے۔ میں اس ناول کو اپنے شاہکار ناولوں میں سرِفہرست کہہ سکتا ہوں اور اس یقین کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ آپ اسے شروع کر کے ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ انشاء اللہ۔

ایم۔اے۔راحت

تین گھنٹے کے سفر کے بعد آخر کار موٹر کار لاہور میں داخل ہوگئی۔

تیرہ دروازوں کا شہر لاہور...... جو کبھی صرف دریائے راوی کے کنارے آباد تھا، مگر اب راوی نے بھی راستہ تھوڑا سا بدل لیا ہے اور لاہور اپنے اطراف میں دور تک پھیل گیا ہے۔ شہنشاہ اکبر نے اس کے گرد مضبوط فصیل تعمیر کی تھی جس کے گرد ایک خندق بھی کھودی گئی تھی۔ اس فصیل میں تیرہ دروازے تھے جنہیں مغرب کے وقت حفاظتی طور پر بند کر دیا جاتا تھا۔ ان دروازوں کے نام 1- ٹکسالی دروازہ، 2- روشنائی دروازہ، 3- مستی دروازہ، 4- کشمیری دروازہ، 5- شیرانوالہ دروازہ، 6- ذکی دروازہ، 7- دلّی دروازہ، 8- اکبری دروازہ، 9- موچی دروازہ، 10- شاہ عالم دروازہ، 11- لوہاری دروازہ، 12- موری دروازہ، 13- بھاٹی دروازہ ہے۔

موٹر کار شاہی قلعے کے ساتھ ٹکسالی دروازے کے سامنے شاہی محلے میں داخل ہوگئی جسے ہیرا منڈی بھی کہا جاتا ہے۔ شاہی محلہ تو اسے شاہی قلعے کے حوالے سے کہا جاتا ہے لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک خاص آدمی ''ہیرا'' کے نام پر پڑا ہے۔ ویسے صاحب نظر حسین صورتوں سے سجے اس بازار کو ہیروں کی بستی یا ہیرا منڈی بھی کہتے ہیں۔

موٹر کار سے کئی خواتین نیچے اتری تھیں۔ پیچھے ایک اور پک اپ آ کر رکی جس سے سازندے نیچے اترنے لگے۔ خواتین میں عمر رسیدہ خاتون شمشیرہ بیگم تھیں۔ سچ مچ تلوار کی جیسی کاٹ رکھتی تھیں۔ دوسری کوثر جہاں، تیسری غزالہ، چوتھی شبانہ...... سب کی سب تھکن سے چور تھیں۔ شمشیرہ بیگم نے کہا۔

''آرام کرو لڑکیو...... اس وقت کچھ اناپ شناپ نہ بھک لینا۔ بیمار پڑ جاؤ گی۔''

''اماں! دلارے سے چائے کے لئے تو کہہ دو۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔''

''سونا نہیں ہے کیا...... چائے پیو گی تو نیند بالکل اُڑ جائے گی۔''

''نہیں اُڑے گی اماں...... پلیز۔'' کوثر جہاں نے کہا

''ٹھیک ہے، میرا کیا ہے۔ کہے دیتی ہوں۔'' شمشیرہ بیگم نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ لڑکیاں اوندھی سیدھی فرش پر دراز ہو گئیں۔

''ہائے، بری طرح تھک گئی۔'' غزالہ نے کراہتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ.......... لچوں لفنگوں کا مجمع تھا...... ایک بھی تو شریف آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔''

شبانہ نے کہا۔

''شریف آدمی......'' کوثر ہنس پڑی۔

''کیوں......؟''

''بے وقوف کہیں کی، شریف آدمی تو جیسے مجرے ہی کراتے ہیں۔ یہ پروگرام ہوتے ہی لچوں لفنگوں کے لئے ہیں۔ اور پھر یہی لوگ تو ہمارے کام کے ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو ہم کہاں جائیں۔''

''کچھ بھی کہو، بڑے ہی بدتمیز لوگ تھے۔''

''میرے تو پیروں میں چھالے پڑ گئے۔'' شبانہ نے کہا۔

''نئی جوتی کیوں پہن لی تھی تُو نے؟'' غزالہ نے کہا۔

''ننگے پاؤں جاتی کیا......؟'' شبانہ جھلا کر بولی۔

''چھالے تو پڑنے ہی تھے۔'' غزالہ نے لاپرواہی سے کہا۔

''جوتی سے چھالے نہیں پڑے ہیں۔'' شبانہ غرائی۔

''تو پھر......؟''

''باجی دیکھو، چھیڑے جا رہی ہے مجھے...... اسے پتہ نہیں ہے کہ پورے پانچ گھنٹے ناچی ہوں میں......'' شبانہ نے کوثر جہاں سے شکایت کی۔

''ہاں یہ تو ہے...... یہی سب سے زیادہ ناچی ہے۔'' کوثر جہاں نے تائید کی۔

''اور سب سے زیادہ نوٹ بھی اسے ہی ملے ہیں...... وہ ہٹلر تو پاگل ہوا جا رہا تھا اس کے لئے...... جیب سے دمڑی نہیں نکال رہا تھا اور چاہتا یہی تھا کہ شبانہ اس کے پاس ہی ناچتی رہے۔'' غزالہ منہ دبا کر ہنسنے لگی۔

''ہٹلر......'' کوثر بھی ہنس پڑی۔

''ہٹلر جیسی ہی مونچھیں تھیں کمبخت کی۔

''ہائے ستیاناس ہو اس کا، کمبخت نے پسینے میں بھیگی ہوئی قمیض پہن رکھی تھی۔ جیب سے دس سے زیادہ کا نوٹ نہیں نکال رہا تھا اور وہ بھی بدبو سے بھرا ہوا، پسینے میں ڈوبا ہوا۔''

''سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے ہمیں...... یہی ہماری زندگی ہے۔'' اچانک کوثر جہاں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ اسی وقت دلارے چائے لے کر اندر آ گیا تھا۔

○●○

لاہور انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر طیارے کی آمد کا اعلان ہوا اور مسافروں کا استقبال کرنے کے لئے آنے والے الرٹ ہو گئے۔ وہ اپنوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ چوہدری نظام الدین بارہ سال کے بعد بیٹے کو دیکھنے والے تھے۔ اس دوران سبھی لوگ شمس سے انگلینڈ جا کر ملاقات کر چکے تھے۔ چوہدری نظام الدین کا نظریہ بالکل مختلف تھا۔ بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن بھیجتے ہوئے انہوں نے پہلے ہی یہ بات کہہ دی تھی کہ جب تک وہ تعلیم حاصل کرے گا وہ اس سے نہیں ملیں گے۔ کیونکہ اگر وہ اس سے ملنے انگلینڈ گئے یا اسے یہاں بلایا تو سارا کیا دھرا چوپٹ ہو جائے گا۔ یا تو ان کے دل میں بیٹے کی جدائی جاگ اٹھے گی یا اگر وہ یہاں آیا تو وطن کی محبت اسے روک لے گی یا پریشان کرے گی۔ یہ جہاد اس کے اعلیٰ مستقبل کے لئے ضروری ہے۔ حالانکہ شمس الدین کا اعلیٰ مستقبل پشتوں کے لئے روشن تھا۔ چوہدری نظام الدین کا گھرانہ تو پشتوں ہی سے شیخوپورہ کے نواح میں آباد تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب سے شیخوپورہ آباد ہوا ہو گا تو چوہدری نظام الدین کے گھرانے نے اس کی آبادی میں بھرپور حصہ لیا ہو گا۔

اتنی زمینیں تھیں چوہدری نظام الدین کی کہ جب چاہتے ایک نیا شیخوپورہ آباد کر سکتے تھے۔ لیکن بہرحال زمینداروں کی بات مختلف ہی ہوتی ہے۔ چوہدری نظام الدین اپنے اکلوتے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے تھے اور انہوں نے اس کی جدائی برداشت کر لی تھی۔ بارہ سال کے بعد کچھ ایسے عوامل بن گئے کہ چوہدری صاحب نے خود شمس الدین کو پاکستان آنے کی اجازت دے دی اور اب وہ اپنے اہل خاندان کے ہمراہ لاہور انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اس کی آمد کے منتظر تھے۔ بڑا گھرانہ تھا۔ چوہدری صاحب کے پانچ بھائی تھے۔ پانچوں

الگ الگ خصوصیات کے حامل۔ لیکن بھائیوں میں آپس میں بڑی محبت، بڑا پیار تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انہوں نے عورتوں کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیا تھا۔ بھائی آپس میں ہی خاندانی فیصلے کیا کرتے تھے۔ البتہ بڑی لچک، بڑی گنجائش رکھی گئی تھی۔ ہر ایک اپنی مرضی کا مالک تھا۔ ویسے تو سارے ہی ٹھیک تھے لیکن ظہیر الدین ذرا مختلف قسم کا آدمی تھا۔ خالص قسم کا تماش بین اور رقص وموسیقی کا رسیا، حُسن کا شیدائی۔ بڑی شناسائیاں تھیں خاص طور سے ہیرا منڈی میں۔ بہت سے ہیرے اس کی دولت سے چمک رہے تھے۔ بڑے بھائی کو اس ذوق وشوق کے بارے میں علم تھا لیکن بس ایک حد تک۔ آج تک مداخلت نہیں کی تھی۔ لیکن بات یہ نہیں تھی کہ مداخلت نہ کر سکتے۔ خود ان کی اپنی بیگم کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا یعنی شمس الدین کی والدہ کا۔ بھائیوں میں چار بھائیوں نے شادیاں کی تھیں، بس ایک ظہیر الدین ہی تھا جس کا قول تھا کہ جب بازار میں آسانی سے دودھ مل جاتا ہے تو گھر میں بھینس پالنے سے کیا فائدہ...... یہ تھا چوہدری نظام الدین کا کنبہ۔

جہاز رن وے پر اتر گیا تھا۔

نجانے کس کس طرح ان بارہ سال تک بیٹے کی جدائی برداشت کی تھی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ بارہ سال کے بعد گھورے کی شکل بھی بدل جاتی ہے۔ تو شمس الدین ان بارہ سالوں کے بعد دوبارہ ان کی نگاہوں کے سامنے آنے والا تھا۔ بڑے انتہا پسند آدمی تھے چوہدری نظام الدین۔ بیٹے کی تصویر تک دیکھنا پسند نہیں کیا تھا کہ دل میں محبت نہ جاگ اٹھے اور وہ اسے واپس بلا لیں۔ البتہ ٹیلی فون پر بیٹے سے باتیں ہو جاتی تھیں اور وہ اسے صرف ایک ہی نصیحت کیا کرتے تھے۔

''شمس الدین! پاک وطن کی توہین مت کرنا ان سپیروں کی گود میں بیٹھ کر۔ یہ ہم سے ہمارا سب کچھ چھین کر لے گئے۔ تم ان سے ان کی دولت چھین کر لانا۔ پاکستان کے وقار کو روشن رکھنا۔ ان کی غلاظتوں کو مت اپنا لینا۔ نجانے کیوں اللہ کے حکم سے مجھے تم پر یقین ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے۔''

اور جب بات اللہ کے حکم کی آ جاتی ہے تو پھر شیطانی قوتیں بہت پیچھے رہ جاتی ہیں۔

لندن میں شمس الدین کو شمس پاکستانی کہا جاتا تھا۔ کچھ لوگوں کے انداز میں احترام ہوتا تھا اور کچھ کا انداز مذاق اُڑانے والا ہوتا تھا۔ کیونکہ شمس الدین کی پارسائی مشہور تھی۔ لندن

کے نائٹ کلب ہوٹل، وہاں کی خرمستیاں، رنگ رلیاں شمس الدین کے قریب تک نہ پھٹکی تھیں۔ شراب وکباب تو ایک الگ سی چیز ہے، اس کا ایک الگ سا حلقہ بھی بن چکا تھا جو اس جیسے نیک نفسوں کا حلقہ تھا۔ اور وہاں وہ اپنی دنیا میں مست رہتا تھا۔

چوہدری نظام الدین نے جہاز کی سیڑھیوں سے ایک بانکے سجیلے پنجابی کو اترتے دیکھا۔ بلند وبالا قامت، نیک نفسی اور پاکیزگی چہرے پر سجی ہوئی۔ بڑی بڑی آنکھوں پر پلکوں کی جھالر۔ ایسے نقوش کہ دیکھنے والا دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔

''آپ نے دیکھا بڑے چوہدری جی! وہ اپنا شمس ہے۔'' نیاز الدین نے محبت بھرے لہجے میں کہا اور چوہدری نظام الدین کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ بانکا سجیلا جوان ان کا اپنا ہی ہے۔ جسے دیکھ کر آنکھیں اس پر نثار ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ شمس الدین سینے سے لگا تو چوہدری نظام الدین کے آنسو نہ رک سکے۔ بھیگے رخساروں سے بیٹے کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بمشکل تمام منہ سے نکلا۔

''اللہ عمر دراز کرے۔''

اور اس کے بعد ساری گاڑیاں شیخوپورہ روانہ ہو گئیں۔

چوہدری نظام الدین کی پشتنی حویلی میں بہار آ گئی۔ ہر شخص خوشی سے سرشار تھا۔ زندگی کھل کھیلی تھی۔ ہر طرف شادیانوں کا راج تھا۔ چچاؤں کے بیٹے تھے لیکن کچھ اس طرح مرعوب تھے شمس الدین سے کہ بے تکلفی کا وہ ماحول پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ بہر حال شمس الدین کو پاکستان کی سیر کروائی گئی۔ بارہ سال پہلے جب وطن سے باہر گیا تھا تو ننھا منا خرگوش تھا۔ اب جوان ہو کر آیا تھا تو بات ہی کچھ اور تھی۔ پاکستان کو دیکھ کر بولا۔

''کیسی بری بات ہے کہ ہمارے ہاں سے ہمارے وطن کے حُسن کی تشہیر ہی نہیں ہوئی صحیح معنوں میں...... ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔''

چچا ظہیر الدین نے کہا۔ ''ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے بیٹا...... بہت کچھ ہے ہمارے وطن میں۔ اور پھر شمس الدین، ظہیر الدین کے ہاتھ لگ گیا۔

''ایک بات بتائیے مجھے چاچا جی! آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟'' شمس الدین نے ظہیر الدین سے سوال کیا۔

''کون کہتا ہے بیٹا۔ یہ لوگ جو ہیں نا، ہیں تو چوہدری مگر کچے چوہدری، کچے زمیندار

ہیں۔ بیٹا، زمینداروں کی شان یہ نہیں ہوتی۔“

”میں تو کچھ جانتا ہی نہیں ہوں چاچا جی۔ زمینداری کے بارے میں باہر کے لوگ مجھ سے میرے وطن کے بارے میں پوچھتے تھے تو میں ان سے یہی کہہ دیتا تھا کہ بھائی دیکھوں گا تو بتاؤں گا۔“

”ہم دکھائیں گے تجھے بیٹا، ہم دکھائیں گے۔“

اور پھر ظہیر الدین، شمس کو لے کر چل پڑا اور شمس نے پہلی بار وہ نئی دنیا دیکھی۔ ظہیر الدین ہر طرح کا تجربے کار، ایسے وقت میں شاہی محلے میں داخل ہوا تھا جب رات ہو چکی تھی۔ ہر طرف بھیڑ نظر آ رہی تھی۔ گلیوں میں مرد ہی مرد بکھرے ہوئے تھے۔ چہل پہل خوب ہو رہی تھی۔ دوکانیں روشن تھیں اور پان اور پھول بیچنے والے لڑکے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ظہیر الدین نے خاص طور پر شمس کو یہاں کی پیدل سیر کرائی۔ وہ کوئی بیس فٹ چوڑی سڑک تھی جو راہگیروں کے لئے کافی کشادہ تھی۔ حالانکہ یہاں کبھی کبھی کوئی کار بھی آ نکلتی تھی مگر علاقے میں زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ مکانوں کی نچلی منزلیں سڑک سے کوئی تین چار فٹ اونچی تھیں اور ان پر صرف سیڑھیاں چڑھ کر ہی پہنچا جا سکتا تھا۔ بعض سیڑھیاں اوپر کسی چبوترے یا مکانوں کے سامنے بنے کھلیارے تک جاتی تھیں۔ چہل قدمی کرتے ہوئے کمروں میں عورتیں نظر آتیں۔ وہ عمدہ لباس پہنے آرام سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کمروں کے سامنے کی دیواریں غائب تھیں اور ان کے دروازے کشادہ تھے جن پر باریک سے پردے یا چک پڑی ہوئی تھی۔ عورتیں زیادہ تر کمرے کے درمیان فرش پر بیٹھی نظر آتی تھیں۔ کہیں کہیں صوفوں پر بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ یعنی کمروں میں عورتوں کی پشت پر طبلہ بجانے والے اور ہارمونیم وغیرہ بجانے والے صف باندھے بیٹھے ہوئے تھے۔ زیادہ تر عورتوں نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اوپر بالا خانوں میں دو عورتیں بھڑک دار کپڑے پہنے اور گہرا میک اپ کئے جھروکوں میں نظر آ رہی تھیں۔ وہ جھانک کر مسکراتیں اور کسی راہگیر کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ہاتھ سے اشارے کرتیں اور پھر اپنے کمروں میں غائب ہو جاتیں۔ عمارتوں کی دونوں منزلوں پر یہ کمرے مہمانوں کے منتظر تھے اور نیچے مٹر گشت کرتے ہوئے مہمان اپنی پسند کا مال تلاش کر رہے تھے۔ اسی بھیڑ میں کچھ بچے پانچ اور دس روپوں کے نوٹوں کی گڈیاں لئے پھر رہے تھے اور بہت سے گاہک ان سے بڑے نوٹ بھنا

رہے تھے۔ چھوٹے نوٹوں سے رقاصاؤں پر نقدی لٹانے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ شمس حیرت سے یہ سارے مناظر دیکھ رہا تھا اور سچ یہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی معصوم فطرت صحیح طور پر تجزیہ نہیں کر پائی تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے یا یہ انوکھا ماحول کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے پوچھ ہی ڈالا۔

”یہ سب کیا ہے چاچا جی؟“

”جہنم کا پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ۔“ ظہیر الدین نے کہا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

”آپ یقین کریں، میں نہیں سمجھا۔“

”آؤ، میں سمجھاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر ظہیر الدین شمس کو ہاتھ پکڑے ایک گھر کی جانب مڑ گیا جو اوپری منزل پر تھا۔ شمس الدین کے دل میں واقعی تجسس جاگا ہوا تھا۔ بڑا انوکھا سا لگ رہا تھا یہ ماحول۔ پھر وہ ایک بہت بڑے ہال نما کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں بہت سے جوتے رکھے تھے۔ ظہیر الدین نے کہا۔

”جوتے اتار لو۔“

شمس الدین نے خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ یہ شمشیرہ بیگم کا کوٹھا تھا۔ شمشیرہ بیگم شاہی محلے کی پرانی مکین تھیں۔ بہت سے دور انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے سے گزار دیئے تھے۔ محلے کی تنظیم کی سرگرم کارکن تھیں اور ایک طرح سے لیڈر کا درجہ رکھتی تھیں۔ کوثر جہاں، غزالہ اور شبانہ ان کا سرمایہ تھیں۔ بلینک چیک۔ لیکن اس طرح کی طوائفیں جو عقل و دانش سے بھری ہوئی ہوتی ہیں، ایسے بلینک چیکوں کو نہ جانے کتنی بار کیش کراتی ہیں اور پھر ان کی سیاہی مٹا دیتی ہیں۔ نکھری نکھری لڑکیاں مہمانوں کی آمد پوری ہونے کا انتظار کر رہی تھیں کہ شمشیرہ جہاں نے ظہیر الدین کو دیکھا تو مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔

”لو، کورم پورا ہو گیا...... بعض لوگ اپنی ذات میں انجمن ہوتے ہیں۔ آیئے ظہیر الدین صاحب۔ مغلوں کا دور تو ختم ہو گیا لیکن تاریخ کچھ بادشاہ چھوڑ گئی ہے۔ اب ہی تھوڑی دیر پہلے مہمان مطالبہ کر رہے تھے کہ رقص شروع کیا جائے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ معزز مہمانوں کو تو آنے دیا جائے۔ ابھی تو بڑی گنجائش تھی یہاں۔ لیکن آپ آئے تو گویا محفل مکمل ہو گئی۔ وزیر خان! دروازہ بند کر دو۔ اب کسی کی گنجائش نہیں۔“

وسیع و عریض کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے منہ بگڑ گئے۔ مہمان تو وہ بھی تھے لیکن ظہیر الدین کی پذیرائی جس طرح کی گئی تھی بات ہی کچھ اور تھی۔ ایک نے دوسرے کے کان میں کہا۔

"میاں! برا ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوں گے کوئی بڑے چوہدری۔ منہ بھر دیں گے شمشیرہ بیگم کا۔ انہیں تو بس اپنا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔"

ادھر شمشیرہ بیگم کی نگاہ شمس پر پڑی جس کے انداز میں تھوڑی تھوڑی شرم نمایاں ہو گئی تھی اور وہ شمس کو دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس نے کہا۔

"ظہیر میاں! یہ تم نے کیا، کیا۔ دل میں جوانی جگا دی۔ مردوں میں بھی ایسا حُسن ہوتا ہے...... کہاں سے لائے ہو اسے؟"

"شمشیرہ بیگم، بھتیجا ہے میرا۔ یورپ سے آیا ہے۔ تم جانتی ہو چوہدریوں کا خاندان ہے اور پھر بڑے بھائی نظام الدین اللہ معافی بڑے سخت آدمی ہیں۔ یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے سب ان کی خاطر مدارت کر رہے تھے...... ہم نے سوچا کہ کون انہیں اس سندر سبھا میں لائے گا۔ کوئی ہے ہی نہیں۔ ہم نے بھی اپنا فرض پورا کیا۔ اب آپ اپنا فرض پورا کریں۔"

"زہے نصیب...... لڑکیو! کھڑی ہو جاؤ۔"

ظہیر الدین نے شمس کے کان میں کہا۔ "طوائفوں کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ یہ صرف شمشیرہ بیگم ہیں جو ایرے غیروں کو اپنے گھر نہیں آنے دیتیں۔ بڑا مقام ہے ان کا اس محلے میں۔ ان کا دروازہ بند ہوتا ہے بس۔"

شبانہ اور غزالہ کھڑی ہو گئیں۔ بڑے ناز سے پیروں میں گھنگھرو باندھے گئے۔ سازندوں نے ساز سیدھے کئے۔ اب ذرا کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ شمس کو دنیا سے اس قدر ناواقفیت بھی نہیں تھی۔ کم از کم معاشرتی فلمیں ضرور دیکھی تھیں۔ ابتداء میں تو واقعی ہونق رہا تھا لیکن بعد میں سب کچھ سمجھ آ گیا۔ لیکن ابھی تک اس کی نگاہ کوثر جہاں پر نہیں پڑی تھی۔ جب کہ کوثر جہاں اس قدر وارفتگی سے شمس کو دیکھ رہی تھی جیسے دنیا جہاں بھول گئی ہو۔ اور اس کے بعد شمشیرہ بیگم نے کوثر جہاں سے گانا شروع کرنے کو کہا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"استاد جی، میر کی غزل گاؤں گی۔" اس نے انہیں غزل کے مصرعے بتائے۔ اور

سارنگی نواز نے سارنگی پر گز پھیرنا شروع کر دیا۔ پھر کوثر جہاں گانے لگی......

"وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی"

کچھ ایسا انداز تھا گانے کا اور آواز شاید دل سے نکل رہی تھی کہ سماں بندھ گیا۔ تماش بینوں پر سکوت طاری ہو گیا۔ کوثر جہاں جیسے زندگی کا پہلا نغمہ گا رہی تھی۔ اب اس کے وجود میں زندگی کے ساز چھیڑ رہے تھے۔ تھی بھی بہت مختلف باقی بہنوں سے۔ کوٹھوں کے ماحول کا کوئی صحیح اندازہ تو ہوتا نہیں ہے۔ کون کہاں سے آیا، کس کا شجرۂ نسب کہاں سے ملتا ہے کون جانے۔ لیکن دل تو سب کے پاس ہی ہوتا ہے اور جب دل کنول کی طرح کھلتا ہے تو حسین ترین کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ وہ جھوم رہی تھی، گا رہی تھی۔ شبانہ اور غزالہ رقص کر رہی تھیں۔

ظہیر الدین نے شمشیرہ بیگم کے کان میں کچھ کہا اور انہوں نے گردن ہلا دی اور کسی کو اشارہ کیا اور کچھ لمحوں کے بعد دو بلوری گلاس ایک ٹرے میں لا کر ظہیر الدین کے سامنے رکھ دیئے گئے۔

"شربت نوش فرمائیے۔ چوہدری صاحب پہلی بار آئے ہیں۔ منہ تو میٹھا کر ہی ڈالیں۔"

ظہیر الدین نے اپنا گلاس اٹھایا اور دوسرا گلاس اٹھا کر شمس کو دیتے ہوئے کہا۔

"شرط یہ ہے کہ ایک ہی سانس میں خالی کرنا ہوتا ہے۔ یہ کوٹھوں کے آداب ہیں۔ اور خبردار اس کی مٹھاس پر منہ نہ بنے......"

یہ الفاظ ظہیر الدین نے سرگوشی میں کہے تھے اور شمس نے بادل نخواستہ عمل کر ڈالا تھا۔ ایک چھری سی دل میں اتر گئی تھی جسے شربت کہا گیا تھا۔ وہ شربت تو نہ تھا، سمجھ گئے کہ شراب ہے۔ لیکن یہاں آ کے کچھ ایسے حواس باختہ ہوئے تھے کہ چچا جو کہتے تھے وہ کئے چلے جا رہے تھے۔ سرور طاری ہونا شروع ہوا۔ تھوڑے سے کھلے۔ کوثر جہاں نے خوب ہی رقص کیا تھا اور شمس کے سامنے آ بیٹھی تھی۔ شمس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور آنکھوں کے یہ پیغام برچھیوں کی طرح دلوں میں اتر رہے تھے۔ اور پھر جب کمرے کے پُرسکوت ماحول میں کوثر جہاں نے اپنا سر شمس کے سینے پر رکھا تو شمس کے دونوں ہاتھ اس کے جسم سے لپٹ گئے۔

"کاش میں اس کوٹھے پر نہ ہوتی...... کاش یہ کسی چھوٹے سے گھر کا بھدا سا کمرہ ہوتا اور آپ اس طرح پیار سے مجھے اپنے سینے سے لپٹائے ہوئے ہوتے تو میں سمجھتی کہ واعظوں نے جنت کو بلاوجہ آسمان پر پہنچا دیا ہے...... جنت تو زمین پر ہی ہے۔ کسی محبوب کی آغوش میں سجی ہوئی۔ ان کو کسی دولت زدہ طوائف کے الفاظ نہ سمجھیں۔ یہ دل کی آواز ہے جو صرف دل کا طواف کرتی ہے۔"

شمس الدین تو ان الفاظ کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکے کیونکہ زبان میں لڑکھڑاہٹ تھی لیکن دل اس رات کی کہانی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اور جب صبح ہوئی تو بڑی دکھی دکھی سی صبح تھی۔ ظہیر الدین نے ہی جگایا تھا۔

"صاحبزادے! وہ سامنے غسل خانہ ہے۔ تیار ہو جاؤ۔ وہ جو کہا جاتا ہے ناں کہ اٹھیے کہ بس اب لذت خواب سحر گئی۔ تو خوابِ سحر کی لذت کو بھول کر واپسی کی تیاریاں کریں۔ بازار سو چکے ہیں۔ گزری رات کی روشنیاں بجھ گئی ہیں، چلئے۔"

شمس الدین پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ باہر نکلے تو گویا دنیا ہی الٹ چکی تھی۔ رونقیں بے نور ہو چکی تھیں۔ یہاں تو جاگتی راتوں کا شہر تھا۔ دن کو سنسان جنگل ہوا کرتے تھے۔ ظہیر الدین کی گاڑی گلی سے باہر ایک جگہ پارک کر دی گئی تھی۔ وہ اسے جان بوجھ کر گلی میں نہیں لائے تھے۔ لیکن جب وہ اپنی گاڑی تک پہنچے تو انہوں نے اپنی گاڑی کے عقب میں ایک اور گاڑی دیکھی اور اسے دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے...... یہ چوہدری نظام الدین کی گاڑی تھی اور اگلی سیٹ پر چوہدری نظام الدین بیٹھے ہوئے تھے۔ پتھروں جیسا سنگین چہرہ لئے...... جو سپاٹ تھا...... ظہیر الدین کی تو جیسے پیروں کی جان ہی نکل گئی۔ شمس الدین نے حیران نگاہوں سے باپ کو دیکھا اور بولا۔

"بڑے چوہدری صاحب......"

نظام الدین کی آنکھیں آگ کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ ڈرائیور کو اشارہ کیا اور اس نے آہستہ سے گاڑی پیچھے کی اور پھر اسے واپسی کے لئے موڑ دیا۔ ظہیر الدین لرزتے قدموں سے اپنی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے شمس الدین سے کہا۔

"آؤ بیٹھو۔ روزِ قیامت آ پہنچا ہے۔" شمس الدین ظہیر کے برابر میں بیٹھ گئے اور انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا ہوا چاچا جی......" لیکن ظہیر الدین نے جواب دینے کی بجائے گاڑی کا رخ موڑ دیا تھا۔

○●○

حویلی پر موت کا سا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ظہیر الدین کو پتہ تھا کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ اب اتنی مجال تو تھی نہیں کہ راستے ہی سے بھاگ نکلتے۔ عقل اور سمجھداری کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ کم از کم گھر تک تو ساتھ جائیں اور اس کے بعد غائب ہو جائیں۔ ایسا ہی ہوا۔ شمس اپنے کمرے میں چلا گیا اور ظہیر الدین اپنے کمرے میں۔ لیکن اس کے بعد حویلی کے چور دروازے سے باہر نکلنا اس وقت سب سے ضروری مسئلہ تھا۔ چنانچہ وہ خاموشی سے غائب ہو گیا۔ نظام الدین اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ شمس الدین کی معصومیت پر کسی کو شک نہیں تھا۔ باقی بھائی بھی صورتحال سے واقف ہو گئے اور جو سنگین صورتحال ہونے والی تھی وہ کسی قدر اس سے واقف بھی تھے۔ چوہدری نظام الدین ساری رات اور سارا دن سکوت کے عالم میں بیٹھے رہے۔ دوسری صبح انہوں نے سارے بھائیوں کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا اور بولے۔

"ظہیر الدین، شمس کو اس بازار میں لے گئے تھے...... وہیں شمس نے رات گزاری۔ میں نے شمس کو لندن میں تعلیم کے لئے بھیجا تھا اور جہاں تک آپ لوگوں کی رپورٹ ہے اور میری ذاتی کاوشیں بھی ہیں یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ لندن میں شمس الدین ایک آئیڈیل شخصیت رہے ہیں...... اور انہوں نے کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو ہماری مرضی کے خلاف ہو۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ لندن میں ہمارے شمس کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن ظہیر الدین نے انہیں یہاں کوٹھے کا راستہ دکھا دیا۔ بارہ سال کے بعد شمس پاکستان آئے تھے۔ اس بات کے بھی امکانات تھے کہ ہماری محبت اب ان کی جدائی برداشت نہ کر سکے اور ہم اپنے سارے مفادات نظر انداز کر کے شمس کو اب باہر نہ بھیجیں۔ خدا کے فضل سے یہاں جو کچھ ہے وہ اتنا ہے کہ ہمارے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن ظہیر الدین نے ہمارے ساتھ بہت ظلم کر ڈالا۔ کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہیں ہم...... یہ بالکل نہیں کہیں گے کہ ایسا کسی سازش کے تحت کیا گیا۔ نہیں، ظہیر الدین ہمارے مخالف نہیں ہیں اور نہ ہی اس طرح وہ ہمیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ لیکن جو غلیظ حرکت انہوں

نے کی ہے آپ لوگ بھی جانتے ہیں کہ یہ ہمارے مفادات کے کس قدر خلاف ہے۔ چنانچہ آج شام کو ہم شمس کو واپس لندن بھیج رہے ہیں اس ہدایت کے ساتھ کہ اب وہ پاکستان واپس نہ آئیں۔ وہیں پر ہم ان کے لئے زندگی گزارنے کا بندوبست کر دیں گے۔ یہ ہمارا اٹل فیصلہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ہم ایک افسوس ناک اطلاع بھی آپ کو دے رہے ہیں، وہ یہ کہ ظہیر الدین کو ان کا حصہ دے کر الگ کر دیا جائے۔ اور اس کے بعد اس حویلی سے ان کا کوئی تعلق نہ رہے...... میرا مطلب ہے ہماری حد تک۔ ہمیں علم ہے کہ اس وقت وہ حویلی میں نہیں ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ہر دربان کو ہدایت کر دی جائے کہ ظہیر الدین کا ہماری زندگی میں اس حویلی میں داخلہ ممنوع ہے۔"

"بھائی جان......"

"یہ صرف اطلاع ہے، مشورہ نہیں ہے۔" نظام الدین نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ ان کے مزاج سے سبھی واقف تھے۔ اب کسی ردّ و قدح کی گنجائش نہیں تھی۔

○●○

شاہی محلے سے داتا دربار کا فاصلہ ہی کتنا تھا۔ بگھی داتا دربار کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ ویسے تو داتا کے بھکاری سارا سال، سارے مہینے، سارے ہفتے اور سارے دن ہی ان کی چوکھٹ پر زندگی کی مرادیں پانے کے لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ کیا ہی شان ہے۔ ہر مہینے کی گیارہویں شریف کو لگی دودھ کی سبیلیں۔ لاہور ہی کیا پنجاب کے دوسرے چھوٹے چھوٹے شہروں کے گوالے بھی اس دن دودھ نہیں بیچتے بلکہ اپنی ساری اساس لے کر داتا کے قدموں میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کے نام پر دودھ کی نہریں بہا دی جاتی ہیں۔ پھر دن کے چوبیس گھنٹے لنگر ہوتا رہتا ہے۔ کسی اور شہر کی یہ شان کہاں...... داتا کی نگری میں ہر بھوکے کو کھانا ملتا ہے۔ کسی بھی لمحے پہنچ جاؤ، زمانہ بھر ٹھکرا دے، داتا کے قدموں میں انکار نہیں رہتا۔ ہر لمحے کھانے کا انتظام رہتا ہے۔ اور پھر جمعرات کا دن تو عقیدت مندوں کی عید ہوتی ہے۔ اتنا رش ہوتا ہے داتا دربار میں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

کوثر جہاں، غزالہ، شبانہ، شمشیرہ بیگم کی کمان میں داتا دربار جانے کے لئے تیار تھیں۔ مغرب گزرتے ہی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ کوثر جہاں ان دنوں بیمار تھی۔ اس نے آئینے پر نگاہ ڈالی، چہرہ اتر گیا تھا۔ نرگسی آنکھوں کے گرد حلقے نظر آنے لگے تھے۔ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ لیکن حُسن و جمال میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ کون جانے اس کے من کا روگ۔ داتا کے نگر میں ان کے قدموں میں پہنچ کر دل کی بھڑاس نکال لیتی تھی۔ اس وقت بھی بگھی داتا دربار کے سامنے رکی، خواتین نیچے اتر آئیں اور اندر کا رخ کیا۔ سیڑھیاں طے کی گئیں۔ داتا کا دربار روشن تھا۔ عقیدت مند عقیدت کے پھول چڑھا رہے تھے۔ جگہ جگہ مجمعے لگے ہوئے تھے۔ کہیں نعت خوانی ہو رہی تھیں، کہیں قرآن خوانی۔ عظیم الشان صحن میں انسانوں کے گروہ کے گروہ نظر آ رہے تھے۔ مسجد میں ابھی تک نماز ہو رہی تھی۔ شمشیرہ بیگم نے کہا۔

"غزالہ، شبانہ! بہن کو سنبھال کراؤ۔ بڑی کمزور ہوگئی ہے۔"

"جی، ہم سنبھالے ہوئے ہیں۔"

آج داتا کے دربار میں عقیدت کے پھول بھی چڑھانے تھے۔ بیٹا تو تھا ہی، خدا نے داتا کی دعاؤں کے طفیل کچھ دن پہلے بیٹی بھی عطا کردی تھی جس کا نام تسنیم رکھا گیا تھا۔ اور تسنیم کے بعد ہی سوا مہینے کا چلّہ مکمل کر کے شمشیرہ بیگم، کوثر جہاں کو داتا کے حضور سلام کرانے لے کر آئی تھیں۔ سازندوں میں جنہیں شمشیرہ بیگم سے قربت حاصل تھی ان میں غلام شاہ اور حاجو سرفہرست تھے۔ غلام شاہ لمبے تڑنگے اور حاجو انہی کی مناسبت سے ساڑھے چار فٹ کے۔ گویا دس کا ہندسہ مکمل ہو جاتا تھا۔ حاجو کا نام بھی پہلے کبھی کچھ اور ہو گا لیکن بس حج کرنے کی خواہش دل میں رکھتے تھے۔ نام تو کبھی قرعہ اندازی میں نہیں آیا، حاجی کلانا چاہتے تھے۔ حاجی نہ بن سکے تو اپنے آپ کو حاجو کہلوانا شروع کر دیا۔ اور یہ نام کچھ اس طرح زبان میں آیا کہ سب کی زبان زد عام ہو گیا۔ بہرحال دونوں کردار اپنی اپنی جگہ بے مثال تھے۔

بہت زیادہ رش تھا۔ شمشیرہ بیگم کوثر جہاں کے لئے پریشان تھیں اور لڑکیوں کو بار بار ہدایت کر رہی تھیں کہ کوثر جہاں کا خیال رکھیں۔ غلام شاہ اور حاجو پھولوں کی دکان سے پھولوں کی چادر، مکھانے اور اگر بتیاں لے آئے تھے اور شمشیرہ جہاں تینوں لڑکیوں کے ساتھ اوپر والے حصے میں پہنچ گئی تھیں۔ چادر تو یہاں کے متولی کے حوالے کرنی تھی۔ کیونکہ عورتوں کو مزار تک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اس کے بعد فاتحہ خوانی کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ غزالہ اور شبانہ تو ٹھی، ٹھی، ٹھی کرتی رہیں۔ کوثر جہاں کا چہرہ البتہ سُت گیا تھا۔ دوزانو بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں اور اس کے منہ سے مدھم سی آواز نکلی۔

"داتا جی، دنیا کہتی ہے کہ آپ کی دعائیں کبھی خالی نہیں جاتیں۔ میرے لئے بھی دعا کر دیجئے۔ داتا جی، تقدیر نے مجھے کوٹھے پر پیدا کیا لیکن مزاج کوٹھے والے نہ بن سکے۔ ایسا روگ لگا کہ دل کالا ہو کر رہ گیا۔ ایک بار ملا دیں...... بس ایک بار...... ایک بار...... داتا جی، کیسے دعا مانگوں بس ایک بار...... تمہیں اپنے سب پیاروں کا واسطہ ایک بار شکل دکھا دو۔ بس ایک بار......" کچھ ایسی رقت طاری ہوئی کوثر جہاں پر کہ چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ شبانہ نے گھبرا کر کہا۔

"باجی...... کیا طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے...... اماں کو بلاؤں؟"

"نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ دعائیں مانگ رہی ہوں۔"

بہرحال فاتحہ خوانی کی گئی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا اور کوثر جہاں کی آنکھیں آنسو برسا رہی تھیں۔ بہرحال اس کے بعد واپسی کی ٹھہری۔ ابھی کوثر جہاں نے سوا مہینے کا چلّہ نہایا ہی تھا۔ زیادہ عرصے انتظار نہیں کر سکتی تھی چنانچہ وہاں سے واپسی کی ٹھہری اور ہجوم سے گزرتے ہوئے دروازے تک آ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بگھی تک پہنچ گئیں اور بگھی گھر جانے کے لئے چل پڑی۔ کوثر جہاں نے حسرت بھری نگاہوں سے دربار کی طرف دیکھا۔ اداس آنکھیں دربار کی جانب اٹھیں اور اس کے بعد بند ہو گئیں۔ ان آنکھوں میں مایوسیاں قید تھیں۔ سب گھر پہنچ گئے لیکن گھر کے سامنے ایک قیمتی موٹر کار کھڑی دیکھ کر شمشیرہ بیگم چونکیں۔

"اوہ...... ہو...... راجہ صاحب آئے ہیں شاید۔ ویسے یہ راجہ واجہ بے تکے وقت آ جاتے ہیں۔ دبی زبان سے تو میں نے انہیں کتنی ہی بار سمجھایا ہے کہ آنے کے اوقات ہوتے ہیں۔ لیکن اب کوئی کیا کہے۔ دولت بھی تو اسی طرح اطلاع دیئے بغیر آ جاتی ہے۔ پھر اگر مزاج نہ بگڑے تو کیا ہو......"

راجہ نواز اصغر منتظر تھے۔

"ارے کہاں چلے گئے تھے آپ لوگ...... مجھے تو بڑی مایوسی ہوئی۔ میں نے سوچا کہ کہیں پیاسا ہی واپس نہ لوٹ جاؤں۔ دیدار کر لیتا ہوں تو دل سیراب ہو جاتا ہے۔ پرسوں مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر روانہ ہو رہا ہوں۔ کون جانے کتنا وقت لگ جائے۔ میں نے سوچا کہ ذرا اپنی کوثر جہاں سے ملتا جاؤں۔ اری کوثر، یہ کیا ہو گیا تمہیں...... کیسا چہرہ لگ رہا ہے۔"

"بس راجہ صاحب، چلّے سے اٹھی ہے۔ زچگی میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔"

"ہاں، ہاں، ہاں......" راجہ صاحب کا چہرہ تھوڑی دیر کے لئے اتر گیا۔ کوثر جہاں پر بہت عرصے سے نیت رکھتے تھے مگر قربت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ نجانے وہ کون خوش نصیب تھا جس کی اولاد کو کوثر جہاں نے اب جنم دیا تھا۔ طوائف کی بات ہی کیا ہوتی ہے...... بیچاری کوثر جہاں۔

بہر حال راجہ صاحب خاصی دیر تک بیٹھے رہے۔ کوثر جہاں سے پوچھا کہ کوئی فرمائش؟ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انکار کر دیا۔ پھر وہ اندر چلی گئی۔ کوثر جہاں کے خشک ہونٹوں سے بڑبڑاہٹیں نکل رہی تھیں۔

"کہاں کھو گئے تم...... نام تک نہ بتایا اپنا...... آنکھوں میں خواب کی مانند آئے اور روشن ہوتے ہی چلے گئے۔ اپنی نشانی چھوڑ گئے...... ورنہ شاید بھول بھی جاتی۔"

اور اسی وقت شمس الدین کی نشانی اندر داخل ہوئی اور کوثر جہاں چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔ اس کی عمر کوئی گیارہ بارہ برس کے درمیان ہو گی۔ نیلی آنکھیں، دودھ جیسا گورا رنگ، تیکھے نقوش، ایسا صاف چہرہ جیسے پلاسٹک کا بنا ہوا ہو...... بے شک لباس ملا کچیلا اور بال بڑھے ہوئے تھے لیکن بس شمس الدین کی ہو بہو تصویر تھا۔ ایک رات کا مہمان یہ سوغات دے گیا تھا۔ نشے میں تھا شمس الدین...... پہلی بار ظہیر الدین نے پلائی تھی۔ ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا اور اس بے حواسی کے عالم میں متاعِ کائنات کوثر جہاں کی آغوش میں چھوڑ گیا تھا۔ اس متاعِ کائنات کا نام شمشیرہ بیگم نے اکرام رکھا تھا اور اس بے چارے کو کرمو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور یہ نام کوثر جہاں کو ہمیشہ برا لگا تھا۔ طوائفوں کے کوٹھے پر پیدا ہونے والے بیٹے ہمیشہ نفرتوں کا شکار رہتے ہیں...... ان کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا...... وہ تو بس زبردستی کی چیز ہوتے ہیں اور ٹھوکروں میں پلتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ گھروں کی صفائی، بازار سے سودا سلف لانا یا پھر شاہی محلے میں پھول بیچنا، یہی ان کی تقدیر ہوتی ہے۔ کسی صاحبِ نظر کی نظر پڑ گئی تو سازندے بن گئے۔ یہ بہت بڑا عہدہ ہوتا ہے ورنہ بس۔ لیکن یہ نشانی تھی کس کی۔ شمشیرہ جہاں نے اسے کرمو کا نام تو دے دیا تھا لیکن اس سے زیادہ کی کوئی چیز کوثر جہاں نے قبول نہیں کی۔ اور کیونکہ خود کوثر جہاں اس کوٹھے کی میراث تھی اس لئے شمشیرہ بیگم نے بے بسی سے اکرام کی برتری کو قبول کر لیا تھا۔

اکرام آہستہ آہستہ چلتا ہوا تسنیم کے پاس پہنچ گیا۔ تسنیم جس کے بارے میں اس سے کہا جا رہا تھا کہ یہ اس کی بہن ہے۔ لیکن اس کا دل اس بات کو نجانے کیوں قبول نہیں کر رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور سوئی ہوئی تسنیم کی پائنتی کی طرف بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔

"اکرام......" کوثر جہاں نے اسے آواز دی۔

"ہوں...... کیا بات ہے باجی؟"

"کہاں واہی تباہی پھرتے رہتے ہو...... صبح سے اب نظر آئے ہو۔"

"اور آپ تو جیسے مجھے دن بھر نظر آتی رہتی ہیں باجی۔ آپ کہاں تھیں صبح سے؟"

"صبح سے......؟" کوثر جہاں نے اسے گھورا۔

"ہاں...... مجھے تو صبح سے ہی نظر نہیں آئیں۔"

"تمہاری کبھی کوئی بات سیدھی نکلی ہے؟" کوثر جہاں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"نہیں......" وہ آہستہ سے بولا۔

"بہت آوارہ ہو گئے ہو تم...... ماں کا کوئی خیال نہیں ہے تمہیں۔ کتنے دن سے بیمار ہوں۔ کبھی پوچھا مجھے؟"

"ماں......" اکرام کے منہ سے طنزیہ سی آواز ابھری اور کوثر جہاں چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"کیوں...... ماں نہیں ہوں تمہاری؟"

"کہاں ہیں آپ میری ماں...... آپ تو باجی ہیں۔" اکرام نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ کوثر جہاں نروس ہو گئی تھی۔ چند لمحے وہ اکرام کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اکرام کے لہجے کی گہرائی نے اسے ششدر کر دیا تھا۔ گیارہ سال کا بچہ...... صرف گیارہ سال کا، اس قدر طنزیہ لہجہ اختیار کر سکتا ہے۔ وہ طنز کر رہا تھا کہ کوثر جہاں اس کی ماں نہیں ہے۔ کچھ لمحے وہ اس کو گھورتی رہی پھر بولی۔

"تم کیسی فضول باتیں کرنے لگے ہو اکرام......"

"جھوٹ تو نہیں بول رہا باجی...... تم اکیلی ہوتی ہو تو کہتی ہو کہ تم میری ماں ہو...... سب کے سامنے تم باجی ہوتی ہو۔"

"مجھے پریشان کر کے خوشی ہوتی ہے تمہیں؟"

"آپ نے مجھے کبھی خوش دیکھا ہے باجی؟" وہ ترکی بہ ترکی بولا اور کوثر جہاں کی آنکھیں جھک گئیں۔

"میری بیماری کا کوئی خیال نہیں ہے تمہیں۔" وہ جھکی ہوئی نگاہوں سے بولی۔

"میں بھی تو بیمار ہوں باجی۔" اس کی آواز میں ایک سسکی سی ابھری اور کوثر جہاں بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا...... کیا ہو گیا تمہیں؟"

"پتہ نہیں......" گیارہ سالہ لڑکے کی کرب ناک آواز ابھری۔ پتہ نہیں اس کے اندر کون سا کرب پک رہا تھا۔

"مجھے بتاؤ نا، کیا ہو گیا ہے تمہیں......؟"

"کچھ نہیں ہوا مجھے۔" اچانک ہی اکرام بکھر گیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے کوثر جہاں کا ہاتھ شانے سے جھٹک دیا۔ کوثر بھونچکی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ نیلی کنچوں جیسی آنکھیں، تیکھے نقوش، تمتماتا چہرہ...... اور اچانک ہی کوثر جہاں کو یہ محسوس ہوا جیسے اس کے بدن کی جان نکل گئی ہو...... اعصاب بے جان ہوتے جا رہے تھے۔ یہ چہرہ اور یہ جسم...... بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ یہی چہرہ تو تھا...... یہی آنکھیں تو تھیں، نیلی کنچوں جیسی اور یہی تمتماتے نقوش تو تھے جنہوں نے اس کی دنیا لوٹ لی تھی۔ بڑی احمقانہ بات ہے کہ لوگ طوائف کو صرف طوائف سمجھیں۔ انسان تو ہر حال میں انسان ہی ہوتا ہے۔ جیلوں میں سزائے موت کے حکم پر پھانسی دینے والا، لوگ سوچتے ہوں گے کہ وہ انسان نہیں جانور ہے جو اپنے جیسے انسانوں کو ختم کر دینے میں کوئی دقت نہیں محسوس کرتا۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس کی تنہائیاں بھی اس کے لئے کرب کا باعث ہوتی ہوں گی۔ طوائف کے سینے میں بھی تو دل ہوتا ہے۔

اکرام، شمس الدین کا بیٹا تھا۔ وہ رات جب شراب کے نشے میں بھٹکا ہوا ایک شریف زادہ کوثر جہاں کی آغوش میں اپنی نشانی چھوڑ گیا تھا...... طوائف کے لئے وہ رات کسی اہمیت کی حامل نہیں ہوتی۔ لیکن طوائف اگر کچھ لمحوں کے لئے عورت بن جائے تو پھر اس کی پریشانی عام عورتوں سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ تو اپنے جذبوں کا اظہار تک نہیں کر سکتی کسی سے۔ کوثر جہاں کا دل چھلنی تھا۔ شاید وہ رات اس کے ذہن سے نکل جاتی جو اس کے پسندیدہ محبوب کی قربت کی رات تھی۔ لیکن اس رات کا تحفہ اکرام کی شکل میں موجود تھا۔ بلاشبہ ایک شریف زادہ جو ایک بھٹکے ہوئے لمحے کا پھل تھا۔ لیکن اس کی رگوں میں خون تو ایک ایسے ہی خاندان کا تھا جو اپنی نیک نامی میں بے مثال تھا۔ یہ شریف زادہ کوٹھے پر کرمو کے نام سے پل رہا تھا۔ تنگ دل، تنگ نظر لوگ اسے اکرام تک نہیں کہہ سکتے تھے۔ بھلا کوٹھے پر بیٹوں کی کیا اہمیت...... زمین کا بوجھ، گھٹیا ترین۔ یہاں تو بیٹیوں کی عزت تھی۔ اور شاید یہی احساس، یہی غم اکرام کے سینے میں پل رہا تھا...... اگر وہ کسی ایسے ہی

بازاری شخص کا پھل ہوتا تو شاید با آسانی یہاں کے ماحول کو تسلیم کر لیتا...... لیکن اس کے دل کا کرب بار بار ابھر کر اس کی زبان تک آ جاتا تھا اور کبھی کبھی وہ ایسی بڑی بڑی باتیں کرنے لگتا تھا کہ کوثر جہاں بدحواس ہو جاتی۔ جہاں تک رہی شمشیرہ بیگم کی بات تو ظاہر ہے وہ ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک ایک مکمل طوائف تھیں۔ اکرام کی سرکشی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ لیکن کوثر جہاں اس کوٹھے کی ٹیکسال تھیں۔ اور اکرام کوثر جہاں کی اولاد۔ چنانچہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں۔ ابھی ماں کی ممتا اکرام کے لئے جاگی ہی تھی کہ شمشیرہ بیگم کی آواز سنائی دی۔

"کوثر! دوا پی لی تم نے...... ناغہ نہ ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ......" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے شمشیرہ بیگم اندر آ گئیں۔ لیکن اکرام کو دیکھ کر ان کا منہ بگڑ گیا۔

"تُو یہاں کیوں مر رہا ہے...... صبح سے کہاں غائب تھا...... کہا تھا کہ دیواروں کے جالے صاف کر۔ پھر رہا ہوگا آوارہ لڑکوں کے ساتھ۔ حرام کے پلّے، اس کے علاوہ آتا ہے کچھ تجھے......؟" اکرام خاموشی سے شمشیرہ بیگم کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے ایک نگاہ کوثر جہاں پر ڈالی اور اس کے ہونٹوں پر ایک زخمی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ماں، باجی......" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ کوثر جہاں کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ شمشیرہ بیگم نجانے کیا کیا بکتی جھکتی باہر نکل گئیں۔ کوثر جہاں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

○●○

شام جھکی، گجرے مہک اٹھے۔ آنکھوں میں سُرموں کی لکیریں کھنچ گئیں...... حُسن و جمال کی محفل گرم ہو گئی۔ طبلوں کی تھاپ اُبھری، استادوں کی مونچھیں نوکیلی ہو گئیں۔ ہونٹوں کی لالیاں مسکرانے لگیں اور بن بارات کے دُلہا سجنیوں کی دہلیز پار کرنے لگے۔ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار، ہونٹوں پر پانوں کی لالی، آنکھوں میں دولت کا نشہ۔ شمشیرہ جہاں کا کوٹھا بھی سج گیا۔ ایک سے ایک بڑا تماش بین...... سارے کے سارے شمشیرہ جہاں کے شناسا، کوثر جہاں کے شیدائی جس کی آواز کا جادو ان دنوں ہیرا منڈی کا وقار بن گیا تھا۔

احسان مغل نے جیب سے ایک ڈبیہ نکالی اور اسے ہاتھوں میں گھماتے ہوئے بولے۔

"کہاں ہے وہ کوثرِ تسنیم...... ہم آپ کی جنت میں آئے ہیں۔"

"کیا مزاج پایا ہے احسان میاں آپ نے بھی...... شعر و شاعری کرتے تو پاکستان کے سب سے بڑے شاعر ہوتے۔ وہ ٹھیک ہے۔ اور آپ نے یہ کوثرِ تسنیم کی بات خوب ملائی۔"

"ہاں بھئی...... تسنیم بھی تو ہمارا ہی دیا ہوا نام ہے...... یہ ایک حقیر سا تحفہ لائے ہیں اس کے لئے۔" سونے کی ایک خوبصورت پائل انہوں نے شمشیرہ جہاں کو پیش کر دی تو شمشیرہ بیگم نے کہا۔

"واہ احسان میاں...... آپ نے تو اس ننھی سی عمر میں ہی اس کے پیروں میں گھنگھرو باندھ دیئے۔"

دوسرے مہمان آنے لگے اور اس کے بعد سازندے اپنے اپنے سازوں کی دھنیں ملانے لگے۔ غزالہ اور شبانہ عربی لباس میں اندر داخل ہوئیں اور محفل کے سامنے دوہری ہو کر آداب بجالائیں۔ محفل کا رنگ نکھر اٹھا...... وہ دونوں اپنی اداؤں کے ساتھ شمشیرہ جہاں کے ساتھ دو زانو ہو کر بیٹھ گئیں اور سازندوں نے ساز درست کر لئے۔ اس کے بعد سماں بندھتا گیا۔ غزالہ اور شبانہ مدھم مدھم گنگنانے لگیں اور ایک استقبالیہ راگ کا آغاز ہو گیا۔

دونوں کی آوازیں اچھی تھیں لیکن دونوں بہنوں کی آوازیں مل کر اس کمی کا احساس کم نہیں کر سکتی تھیں جو کوثر جہاں کی آواز میں تھی۔ کوثر جہاں پہلے بھی اچھا گاتی تھی لیکن گیارہ سال سے...... پورے گیارہ سال سے اس نے کچھ عجب ہی دھوم مچا دی تھی۔ اس کی آواز کا سوز اور اس سوز کے ساتھ جو درد تھا وہ بے مثال ہوتا تھا...... خاص بات یہ تھی کہ اس میں بھی راگ کے بھاؤ نہ بتاتی بلکہ راگ خود اس کے چہرے پر چھا کر سارے بھاؤ بتانے لگتے۔ اور محفل پر سکوت طاری ہو جاتا...... ہر راگ اس کے چہرے پر بولتا تھا۔ غزل شروع کرتی تو چہرے نقشِ غزل کی زبان بن جاتے۔ دونوں بہنیں اپنے فن کا جادو جگاتی تھیں لیکن اس طرح نہیں جو کوثر جہاں کی خاصیت تھی۔

یوں وقت کے دھارے اپنا رخ بدلتے رہے...... زندگی کی کہانیوں میں نجانے کیسی کیسی تبدیلیاں ہوتی رہیں اور پھر ننھی سی تسنیم نے اپنے پیروں کا سہارا لے لیا......!

○●○

بلند و بالا قد و قامت چھ فٹ دو انچ، چہرہ پنجاب کی تصویر، ڈھلا ڈھلا، مضبوط، سر گھنگھریالے بالوں سے بھرا ہوا، آنکھوں میں دوہری کیفیت، ماتھے پر شکن پڑ جائے تو آگ برسانے لگے۔ محبت کی نمی پیدا ہو جائے تو دیکھنے والا نثار ہو جائے۔ کراچی یونیورسٹی سے ماسٹرز کی ڈگری فرسٹ کلاس، فرسٹ ڈویژن میں ملی تو اللہ نواز شاہ نے فوراً ہی واپس بلانے کے لئے ٹیلی فون کر دیا۔

"سوچ رہا تھا کہ کچھ عرصے کراچی میں رہوں ابا جی۔ دوستوں سے وعدہ بھی کیا ہوا تھا کہ کچھ وقت ان کے ساتھ گزاروں گا۔"

"اوہ بیٹا! میں نے بھی کسی کے ساتھ کچھ وعدے کئے ہوئے ہیں۔ جتنے عرصے تجھے آنکھوں سے دور رکھا ہے اللہ ہی جانتا ہے۔ کتنی بینائی کم ہوئی ہے۔ واپس آ جا میرے یار۔ بعد میں تجھے سوئٹزرلینڈ بھجوا دوں گا، ہنی مون کے لئے۔"

"میرا سوئٹزرلینڈ کراچی ہی ہے ابا جی۔ آپ کا جو بھی حکم ہو۔"

"آ جا یار، بیٹھ کر تجھ سے باتیں کرنی ہیں۔" اللہ نواز شاہ کی محبت بھری آواز ٹیلی فون پر سنائی دی تو رب نواز شاہ کو ہنسی آ گئی۔

"ٹھیک ہے ابا جی...... آ رہا ہوں۔" اور اس کے بعد اس نے اپنے دوستوں سے اپنی واپسی کی بات کی تو سب کے سب اداس ہو گئے۔

"ہمیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں تو جانا ہی تمہارے ساتھ ہے۔" نور شاہ نے کہا۔

چار دوست تھے۔ نواز شاہ، دلبر خان، فضل خان اور شالے خان۔ نور شاہ فیصل آباد کا رہنے والا تھا۔ باقی تینوں سرحد کے جوان۔ یہ سارے کے سارے رب نواز کے مصاحب تھے اور اس کے پیسے پر پلتے تھے۔ کراچی میں رہائش اختیار کی ہوئی تھی لیکن ذرا دوسرے مزاج کے

لوگ تھے۔ لڑائی بھڑائی کے ماہر۔ ہر طرح کی مشکل میں رب نواز کا ساتھ دینے والے۔
رب نواز دوسری قسم کا آدمی تھا۔ یونیورسٹی کے نیک نام لڑکوں میں۔ لیکن اپنے گروپ کا لیڈر۔ اور جب کبھی کوئی ایسا مشکل لمحہ آجاتا جو یونین وغیرہ کا معاملہ ہوتا اور کچھ لوگ غنڈہ گردی پر آمادہ ہوتے تو پھر رب نواز شاہ کے تیور ہی دوسرے ہوتے۔ ایک بہت بڑا حلقہ اس سے کانپتا تھا۔ کیونکہ پُر وقار شخصیت کا مالک تھا اور سب سے خاص بات یہ تھی کہ اللہ نواز شاہ تقریباً نو سال تک دو وزارتوں میں رہ چکے تھے۔ وزارتِ محنت ان کے پاس تھی اور دوبارہ جب دوسری پارٹی منتخب ہو کر آئی تو اس نے اللہ نواز شاہ کو ایک اور وزارت کا قلمدان سونپ دیا اور اس کے بعد اللہ نواز شاہ نے ملک کی سیاست میں حصہ لینے سے معذرت کر لی۔ انہوں نے کہا کہ اب ان کا ذہن اس قابل نہیں ہے کہ دیانت داری سے وزارتوں کے بوجھ کو سنبھال سکیں۔ لیکن پورے ملک میں ان کی اپنی ہی ایک دھاک تھی۔ بڑے بڑے اعلیٰ عہدے داران سے ان کے تعلقات تھے۔ ایسے ہی تعلقات گجرات کے چوہدری غیاث الدین سے بھی تھے ان کے۔ چوہدری غیاث الدین کا بھی ایک پورا شجرۂ نسب تھا۔
صدیوں سے زمیندار چلے آرہے تھے اور ایک صاف ستھری شخصیت کے مالک تھے۔ عرشیہ ان کی بیٹی تھی۔ عرشیہ نے لاہور یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا۔ آگے پڑھنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن غیاث الدین صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔
”نہیں بیٹا، خدا کے فضل سے سب کچھ موجود ہے۔ لیکن اب آگے پڑھانا نہیں چاہتا۔ تمہارے فرض سے سبکدوش ہونے کی خواہش ہے۔“
سعادت مند بیٹی نے باپ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا۔ بہت ہی اعلیٰ قسم کی شخصیت کی مالک تھی۔ لیکن باپ نے بھی اس کے مستقبل کا فیصلہ معمولی نہیں کیا تھا۔ پنجاب کا گبھرو جو کراچی کی نم آلود فضاؤں میں تعلیم کے مراحل طے کر رہا تھا، مرکزِ نگاہ بنا اور مختلف ذرائع سے چلتی ہوئی بات اللہ نواز شاہ تک پہنچی۔ غیاث الدین کی اعلیٰ نسبی اور اعلیٰ حیثیت کسی طرح سے مشکوک نہیں تھی۔ چنانچہ سعادت مند بیٹے کے باپ نے بڑی فراخدلی کے ساتھ عرشیہ کے لئے رشتہ دے دیا جو خوشی سے منظور کر لیا گیا۔ باپ نے بیٹے سے کہا۔
”او بھئی رب نواز، یار تھوڑی دیر کے لئے ہمارا دوست بن جا۔ کچھ پوچھنا ہے تجھ سے۔“

”جی ابا جی، حکم۔“
”او بھئی، کراچی سے کہیں کسی کو زندگی بھر ساتھ نبھانے کی دعوت تو نہیں دے ڈالی...... مطلب یہ ہے ہمارا کہ مکان کرائے کے لئے خالی ہے یا کرائے دار اس میں بسے ہوئے ہیں۔“
”ابا جی، جب آپ نے مظفر گڑھ سے کراچی بھیجا تھا تو کہا تھا کہ جو حقوق آپ کے ہیں وہ آپ ہی کے پاس رہنے دیئے جائیں اور عشق محبت کا کوئی کھیل نہ کھیلا جائے۔ ابا جی! آج تک تو آپ کی ساری باتیں مانی ہیں۔“
”وجہ ہے نا یار۔ کلیجہ کس کا ہے تُو۔ وہ اصل میں چوہدری غیاث الدین سے بات چل رہی ہے۔ عرشیہ بیٹی کو دیکھنا چاہے تو دیکھ لے۔“
”ہے تو لڑکی نا ابا جی......؟“ رب نواز نے مزاحیہ لہجے میں پوچھا۔
”او سو فیصدی بھئی......سو فیصدی۔“
”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“
ماں باپ نے بڑی خوشی سے معاملات آگے بڑھائے تھے۔ بیٹے پر بھرپور اعتماد تھا۔ اور بات تھی بھی اعتماد کی۔ چنانچہ بڑی محبت کے ساتھ یہ رشتہ طے ہو گیا۔ البتہ رب نواز نے ایک اجازت مانگی تھی۔
”ابا جی! آپ اپنا شوق پورا کر لیں بے شک۔ لیکن ذرا شادی کے لئے دو تین سال چاہئیں۔“
”کیوں بھئی؟“
”بس ابا جی، ذرا آزادی کی زندگی چاہتا ہوں......اب تک تو آپ کے حکم کے مطابق تعلیم کے لئے سر جھکائے رکھا تھا۔ کبھی گردن نہیں اٹھائی۔ اور آپ دیکھ لیجئے آپ نے جو حکم دیا تھا اسے پورا کر کے ہی دم لیا۔“
”بیٹا! دو تین سال زیادہ نہیں ہیں؟ رشتے کے بعد ماں باپ کے لئے لڑکی کو بٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پچاس باتیں نکلتی ہیں۔ ڈیڑھ سال کر لیتے ہیں۔ ڈیڑھ سال میں تو بیٹا ساری دنیا گھومی جا سکتی ہے۔ اور ایسا کرتے ہیں نکاح کر دیتے ہیں۔ بعد میں رخصتی ہو جائے گی۔“
”ٹھیک ہے......مگر ڈیڑھ سال سے پہلے نہیں۔“

"اومنظور ہے بھئی، منظور ہے۔" اللہ نواز شاہ نے مسرور لہجے میں کہا تھا۔

بیٹے کی یہ سعادت مندی بے مثال تھی۔ حالانکہ دل میں ایک داغ تھا۔ ایک ایسا انوکھا داغ جسے کبھی پیشانی کی شکن کے طور پر بھی سامنے نہیں لایا جا سکتا تھا۔ لیکن بہرحال سب کچھ ماضی کے پردوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اللہ نواز شاہ نے چوہدری غیاث الدین کو گرین سگنل دے دیا اور کہا کہ ماسٹر کا نتیجہ آتے ہی وہ تاریخ لے لیں گے۔ رب نواز نے چونکہ انہیں پورے پورے اختیارات دے دیئے تھے اس لئے انہوں نے تیاریاں شروع کر دیں اور آخر کار تاریخ طے ہو گئی اور رب نواز کو اطلاع دی گئی۔ کراچی یونیورسٹی کے طلباء نے رب نواز کے اعزاز میں باقاعدہ ایک تقریب کی تھی اور اسے الوادعی پارٹی دی تھی۔ اس پارٹی میں بڑے بڑے لطیفے سامنے آئے تھے۔ کئی ایسی لڑکیاں جو رب نواز سے بڑی متاثر تھیں، بہت غمزدہ نظر آ رہی تھیں۔ نور شاہ، دلبر خان، فیض خان اور شالے خان کے بارے میں یہ طے ہو چکا تھا کہ وہ رب نواز کے ساتھ ہی ملتان جائیں گے اور وہاں سے مظفر گڑھ۔

رب نواز نے ان سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ انہیں اپنی زمینوں پر ملازمت دلوائے گا اور وہ باعزت طریقے سے زندگی گزاریں گے۔ دوستی کا بس اتنا ہی حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ رب نواز کو یقین تھا کہ اس کا بے پناہ دولت مند باپ اس کے دوستوں سے وہی سلوک کرے گا جو خود رب نواز چاہے گا۔ بہرحال یہ رب نواز ہی کی خوشی تھی کہ وہ ٹرین سے سفر کریں۔

ریلوے اسٹیشن ملتان پر اس کی آمد کے سلسلے میں بڑی تیاریاں کی گئی تھیں اور بے شمار افراد اسے خوش آمدید کہنے آئے تھے۔ پھر اسے پجارو کے ایک بیڑے کے ساتھ مظفر گڑھ لے جایا گیا اور مظفر گڑھ کی عظیم الشان حویلی میں بہار آ گئی۔ دوستوں کو دعوت نامے بھیجے گئے اور ایک اعلیٰ درجے کی تقریب کا انتظام ہونے لگا۔

رب نواز نے کراچی میں ایک طویل وقت گزارا تھا۔ ملتان آنے کے بعد مظفر گڑھ اور اس کے نواحوں میں سیر و سیاحت کرنے لگا۔ دوستوں کو زمینیں دکھائیں، عظیم الشان باغات کے سلسلے نگاہوں کی حد سے کہیں آگے تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سارے کے سارے لمحے بڑے خوشگوار گزرنے لگے اور آخر کار حویلی میں مہمان آنا شروع ہو گئے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ افریقہ سے مرزا حیات بیگ بھی آ رہے تھے۔ مرزا حیات بیگ اللہ نواز شاہ کے بچپن کے دوست تھے خود بھی ایک صاحب حیثیت شخصیت تھے۔ کینیا میں ان کے

چائے کے باغات تھے اور تقریباً بین الاقوامی قسم کے تاجر تھے۔ کوئی اٹھارہ سال کے وقفے کے بعد پاکستان آ رہے تھے۔ ان کے استقبال کی بھی زبردست تیاریاں کی گئی تھیں۔ اور پھر اس وقت ذرا سی تکبر کی فضا پیدا ہو گئی جب مرزا حیات بیگ نے ٹیلی فون پر اللہ نواز شاہ سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ کچھ انتہائی مصروفیات کی وجہ سے وہ اس وقت نہیں پہنچ سکیں گے جو تاریخ نکاح کے لئے طے کی گئی ہے بلکہ انہیں تھوڑی سی دیر ہو جائے گی۔ یہ ایک دکھ بھری بات تھی۔ لیکن اللہ نواز شاہ کے بھی کچھ اصول تھے۔ صرف ایک دوست کے لئے وہ تمام مہمانوں کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ غیاث الدین کی بات بھی تھی۔ تاریخ بڑھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مظفر گڑھ سے جو بارات گجرات چلی اس کی تفصیل ناقابل بیان ہے۔ اکلوتے بیٹے کے لئے اللہ نواز شاہ نے اپنی دولت کے دروازے کھول دیئے تھے۔ ایسی عظیم الشان بارات گجرات کی تاریخ میں کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ بڑے کروفر کے ساتھ نکاح ہوا۔ رخصتی کے لئے پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ ڈیڑھ سال بعد ہو گی۔ بہرحال غیاث الدین صاحب نے بھی اپنی زمینداری کی لاج نبھائی تھی اور بہت بڑے بڑے لوگوں کی دولت کے مظاہرے لوگوں کے لئے یادگار بن چلے تھے۔

نکاح کے بعد رب نواز شاہ مظفر گڑھ واپس آ گئے۔ چہروں پر محبتوں کا خمار تھا۔ بہرحال آیاتِ الٰہی کے حوالے سے جو شخصیت ان کی زندگی اور تقدیر کا حصہ بنی تھی اس کا مقام دل میں بن گیا تھا۔ حویلی میں بھلا اس عظیم الشان تقریب کے بعد فوراً ہی سکون کہاں سے ہو جاتا۔ اور پھر مرزا حیات بیگ کی آمد نے حویلی میں چار چاند لگا دیئے۔ انگریز بیوی کی مسلمان بیٹیوں کے ساتھ گھر میں آئے تھے۔ ایک دلکش اور دلچسپ فضا پیدا ہو گئی تھی۔ پہلی ہی رات دوست کو ساتھ لے کر ایک الگ کمرے میں پہنچ گئے اور ماضی کے قصے دہرائے جانے لگے۔

"یار ویسے ایک بات پر مجھے بہت غصہ ہے اور بڑی شکایت ہے تجھ سے۔" مرزا حیات بیگ نے اللہ نواز شاہ سے کہا۔

"کیا؟"

"یہ تیرا بیٹا وہی گلنار نامی طوائف کی اولاد ہے نا جسے تُو لاہور کی ہیرا منڈی سے اٹھا لایا تھا؟"

اللہ نواز شاہ کے چہرے پر ایک ناگواری سی کیفیت پھیل گئی۔

’’یہی تو خوبی ہے ایشیاء اور اس کے باہر کے ممالک کی۔ یورپ ہو یا افریقہ، اقدار یا تہذیب سے تو اتنا فاصلہ ہو گیا ہے کہ صرف شرم ہی آتی ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ پاکستان سے جانے والے بھی اس رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ رب نواز میرا بیٹا ہے اور ہیرا منڈی کی جس عورت کو تم نہایت حقارت سے گلنار طوائف کہہ رہے ہو اس سے میں نے نکاح کیا تھا اور نکاح کے بعد رب نواز پیدا ہوا تھا۔ گلنار کو میں نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ لاہور کے ایک خوبصورت علاقے میں کوٹھی میں رکھا تھا اور وہیں اس کا انتقال ہوا اور اس کے بعد دنیا میں رہنے والے کسی شخص کی یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ میرے بیٹے کو ایک طوائف زدہ کہے۔ مگر افسوس مرزا حیات بیگ! تم نے جس حقارت سے میرے بیٹے اور میری بیوی کا تذکرہ کیا ہے وہ میرے لئے بڑے دکھ کا باعث ہے۔‘‘

’’ارے نہیں نہیں...... معافی چاہتا ہوں۔ واقعی میرے الفاظ نازیبا تھے یار۔ بس دوستی، بے تکلفی اور روانی میں کہہ گیا...... لیکن ایک شکایت بھی ہے مجھے تم سے۔ میری بھی تو بیٹیاں تھیں۔ تم مجھ سے بات نہیں کر سکتے تھے؟‘‘

’’خوش ہوں اس بات پر مرزا حیات بیگ کہ غلطی سے مجھے تمہارا خیال نہیں آیا۔ ورنہ شاید کبھی تذکرہ کر بیٹھتا۔ مجھے معاف کرنا، سارا کھیل بگاڑ دیا تم نے۔ میں ذرا اس قسم کا انسان ہوں۔ اپنے ذہن کو کسی ناخوشگوار بات سے صاف نہیں کر سکتا۔ یہ میری کمزوری ہے۔‘‘

مرزا حیات بیگ، اللہ نواز کی صورت دیکھتے رہ گئے تھے۔

اللہ نواز اپنی جگہ سے اٹھا تھا لیکن جب وہ باہر جانے والے راستے میں داخل ہوا تو ایک منظر دیکھ کر خشک پتے کی طرح کانپ گیا...... رب نواز پتھرایا ہوا سا کھڑا تھا اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے یہ ساری گفتگو سن لی ہے۔ اللہ نواز کانپتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے قریب سے گزرا اور باہر نکل گیا۔ مرزا حیات بیگ پریشانی سے سر کھجاتا رہا تھا۔ اور پھر وہ بھی باہر نکل آیا۔ اس نے بھی رب نواز کو دیکھا، دیکھتا رہا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ کوئی بہت ہی بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔

○●○

آج تیسرا دن تھا۔ رب نواز نے اپنا کمرہ بند کیا ہوا تھا۔ کسی کی ہمت نہیں پڑی تھی کہ وہ اس بند کمرے کو کھلوا سکتا۔ اللہ نواز کی بیوی ذکیہ بیگم الگ پریشان تھیں۔ اللہ نواز نے انہیں ساری صورتحال بتا دی تھی۔ مرزا حیات بیگ بھی بہت شرمندہ تھا۔ حویلی کے ہنگامے یکلخت ختم ہو گئے تھے جبکہ اندازہ یہ تھا کہ ابھی تو نجانے کب تک شادی کے اثرات قائم رہیں گے۔ لیکن سب ہی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی بڑی اور سنگین صورتحال ہو گئی ہے۔ اللہ نواز نے بیوی سے کہا۔

’’ذکیہ بیگم! بھوک سے مر ہی نہ جائے کہیں۔ کیا کریں؟‘‘

’’میں دروازہ کیسے کھلواؤں۔ تم خود کوئی ترکیب کرو۔‘‘ ذکیہ بیگم پریشانی سے بولیں۔

’’میں کوشش کروں۔‘‘

’’کرنی ہی پڑے گی۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ کچھ زیادہ صورتحال بگڑ گئی ہے۔‘‘

ذکیہ بیگم ہانپتی کانپتی رب نواز کے کمرے کے دروازے پر پہنچی تھیں۔

’’رب نواز بیٹے! میں ذکیہ ہوں۔ دروازہ کھولو، میں تمہارے پاس اسی لئے آئی ہوں۔‘‘

قرب و جوار میں سارے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ کسی کو امید نہیں تھی کہ دروازہ کھل جائے گا۔ لیکن دروازہ کھل گیا تھا۔ رب نواز سامنے کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔

’’آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں آپ کے حکم سے بھی دروازہ نہیں کھولوں گا؟‘‘

’’میں اندر آ جاؤں بیٹے؟‘‘ ذکیہ بیگم نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’آیئے...... اندر آ جایئے۔‘‘

ذکیہ بیگم اندر داخل ہو گئیں۔

’’دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے؟‘‘

’’سوچ رہا تھا...... یکسوئی سے سوچ رہا تھا...... اپنے مستقبل کے فیصلے کر رہا تھا۔ دروازہ بند رکھنا تھا مجھے ابھی لیکن آپ...... آپ کا مقام بہت بڑا ہے میری نگاہوں میں۔ کیونکہ آپ نے میری ماں نہ ہونے کے باوجود میری پرورش کی ہے، بے لوث، بے غرض۔ اور وہ بھی اس طرح کہ کم از کم ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک مجھے یہ احساس نہیں ہو سکا کہ آپ میری ماں نہیں ہیں۔

’’بیٹے! میں اُس وقت بھی تمہاری ماں تھی اور اب بھی تمہاری ماں ہوں۔‘‘

''نہیں، مجھے معاف کیجئے گا محترم خاتون! آپ میری ماں نہیں ہیں۔ میری ماں تو ہیرا منڈی کی ایک طوائف تھی۔ افسوس، مجھے میری ماں کے بارے میں کبھی نہیں بتایا گیا۔ کسی نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ آپ نے بھی نہیں۔''

''سنو، مجھے موردِ الزام نہ ٹھہراؤ۔ میں بھی صاف گفتگو کرنے کی عادی ہوں۔ تمہیں میری آغوش میں دیا گیا تھا اور حکم دیا گیا تھا کہ میں اس طرح تمہاری محبت میں ڈوب جاؤں کہ کبھی تمہیں یہ احساس نہ ہو سکے کہ میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔ مجھے بتاؤ کیا کرنا چاہئے تھا مجھے؟ حکم دینے والے میرے سرپرست تھے۔ میں کیسے انکار کر سکتی تھی...... میرا قصور بالکل نہیں ہے بیٹے۔ مجھے قصوروار مت ٹھہرانا۔''

''بالکل نہیں...... قصور کسی کا نہیں ہے۔ لیکن سارا امیج ختم ہو گیا ہے میرا یونیورسٹی میں۔ مجھے لوگ اعلیٰ نسل کا ایک فرد کہا کرتے تھے۔ اللہ نواز شاہ مظفر گڑھ کے مالک، وزیر محنت کا بیٹا رب نواز ایک اعلیٰ نسل کا اعلیٰ فرد۔ مگر بزرگ خاتون! وہ تو ایک طوائف زادہ ہے...... ہیرا منڈی کی تخلیق...... وہ ایک عزت دار شخص کہاں سے ہو سکتا ہے؟ آپ مجھے بتائیے، دنیا سے کیسے منہ چھپاؤں؟ خودکشی کبھی نہیں کروں گا کیونکہ بہرحال میری ماں بھی میری ماں ہی تھی۔ میں اس کے وجود کا ایک ٹکڑا ہوں۔ بہرحال آپ نے حکم دیا، میں نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ تو ویسے بھی مجھے کھولنا ہی تھا۔ میں تو صرف اپنا منہ چھپائے ہوئے تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ دنیا کے سامنے کیسے آؤں۔ میرا خیال ہے ممکن نہیں رہے گا۔ او کے...... او کے۔''

رب نواز نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی تو ذکیہ بیگم نے کہا۔

''اپنے آپ پر سے جذباتیت کا بھوت اتار دو۔ میں فوراً تمہارے ملک سے باہر جانے کا بندوبست کرتی ہوں۔ باہر چلے جاؤ، ذہن معتدل ہو جائے گا۔ بات بہت چھوٹی سی تھی مگر کچھ لوگوں کو گڑھے مُردے اُکھاڑنے کی عادت ہوتی ہے۔ ہم انہیں دوست تو نہیں سمجھتے۔ مرزا حیات بیگ اگر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر خود یہاں سے نہ چلے گئے تو میں انہیں یہاں سے نکال دوں گی۔ کھانا بھجواؤں تمہارے لئے؟''

''نہیں...... ابھی نہیں۔ میں خود آپ سے ملاقات کروں گا۔''

اور یہ ملاقات کوئی دو بجے کے قریب کی گئی تھی۔ اس وقت جب اللہ نواز، مرزا حیات بیگ کے ساتھ زمینوں پر گئے ہوئے تھے اور ذکیہ بیگم گھر میں تنہا تھیں۔ مطلب یہ کہ اللہ نواز کے بغیر دو بجے اپنے کمرے کے دروازے پر رب نواز کو دیکھ کر چونکی تھیں۔

''آؤ...... خیریت؟''

''آپ نے مجھ سے کہا تھا ناں کہ میں ملک سے باہر چلا جاؤں۔ میں خود بھی اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ یہاں سے منہ چھپا کر کہاں جانا چاہئے مجھے...... میں جا رہا ہوں۔ خاص طور سے ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میرے باپ نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ کم از کم ذہنی طور پر مجھے اس کے لئے تیار کر دیتا کہ میں ایک طوائف زادہ ہوں۔ مگر بڑے لوگ ایسا کہاں کرتے ہیں...... ان کی عیاشیوں کی داستانیں تو نجانے کہاں کہاں بکھری ہوتی ہیں۔''

''رب نواز! کہاں جا رہے ہو تم؟''

''نہیں، کچھ حق میرے پاس بھی رہنے دیجئے۔ اب مجھے اپنے بارے میں علم ہو گیا ہے تو میرا فیصلہ مجھے خود ہی کرنے دیں۔''

ذکیہ بیگم رب نواز کو نہیں روک سکی تھیں۔ رب نواز کے چاروں جاں نثار جو کراچی میں بھی اس کے حکم پر دنیا اِدھر سے اُدھر کر دینے کی کوشش میں اپنی جان دینے کے لئے تیار رہا کرتے تھے، رب نواز کے ساتھ ہی تھے۔ رب نواز نے کہا۔

''ہم لاہور چل رہے ہیں...... وہیں جائیں گے جہاں کے رہنے والے ہیں۔''

لاہور کے ایک تاریخی ہوٹل فلیٹیز میں پانچوں نے قیام کیا۔ رب نواز جو تین دن تک اپنے کمرے میں بند رہا تھا...... بہت کچھ سوچتا رہا تھا۔ بے وقوف نہیں تھا، اپنے مستقبل کے لئے مضبوط فیصلے کئے تھے اور ہر طرح سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے بعد آئندہ زندگی کے لئے اقدامات کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ فلیٹیز میں قیام کے بعد دوستوں سے مشاورت ہوئی اور پھر پراپرٹی ڈیلروں سے رابطے قائم ہوئے اور انہیں اپنا مقصد بتایا گیا اور ایک پراپرٹی ڈیلر نے نوگزہ چوک پر ایک جگہ دکھائی۔

سازوں کی بے شمار دکانیں اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں۔ کچا مال، مرغیاں اور گوشت ریستورانوں کے سامنے لٹکا ہوا رہتا تھا اور بڑے بڑے چولہوں پر رکھی ہوئی دیگوں کے باعث اس چوک کا ایک الگ ہی انداز نظر آتا تھا۔ بے شمار ایسی دکانیں تھیں جن کے بڑے بڑے دروازے کسی گیراج جیسے تھے جو بند تھے۔ بہرحال یہیں پر ایسی وسیع العریض جگہ

بتائی گئی جو دیکھنے میں تو بس کیا سے کیا تھی لیکن اس کی قیمت انتہا درجے کی تھی۔ پرانا چوبی دروازہ نوگزہ چوک کے پاس تھا۔ لکڑی کے اس پرانے دروازے کو بھی دونوں طرف لانڈری اور دودھ کی دکانوں نے تقریباً چھپا رکھا تھا لیکن اندر کافی مکانیت تھی۔ بارہ سے لے کر پندرہ کے قریب کمرے...... سب کے سب مضبوط لیکن بے رونق۔ رب نواز نے یہ جگہ پسند کر لی تھی اور پراپرٹی ڈیلر کو کہا تھا کہ مالک کو فوراً بیعانہ دے دیا جائے۔

"سنو بھائی، ایمانداری سے کام کرنا۔ زندگی بڑی چیز ہوتی ہے۔ ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے لیکن جب کسی سے نقصان اٹھانے کا خطرہ ہوتا ہے تو اس خطرے کو نقصان اٹھانے سے پہلے ختم کر دیتے ہیں۔" رب نواز کے لہجے میں وہی درندگی تھی جس نے کراچی یونیورسٹی کے بڑے بڑے ٹیڑھوں کو سیدھا کر رکھا تھا۔

بہر حال رب نواز اس جگہ منتقل ہو گیا اور شاہی محلے میں اس نئے مہمان کو ذرا حیرت کی نگاہوں سے دیکھا گیا جس کا کروفر بے مثال تھا اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ رب نواز شاہ نے جسے اس کے حواری شاہ جی، شاہ جی کہا کرتے تھے اس محلے کو کیوں اپنا رکھا ہے۔ یہ تھی تمام تر صورتحال۔ اتنا سامان آیا تھا یہاں اور سارا کا سارا کمپنیوں سے کہ قرب و جوار کے لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے تھے۔

بہر حال یہ سب اسی طرح سے گزر رہا تھا اور شاہی محلے کے اندر ایک نئی جہت کا آغاز ہو گیا تھا۔

○●○

ایک طرف اکرام عرف کرمو، کرموں کا پھل بھوگ رہا تھا اور دوسری طرف تسنیم کی پرورش اس طرح ہو رہی تھی کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔ شمشیرہ بیگم معمول کے مطابق اپنی بیٹیوں کا بڑھاپا تعمیر کر رہی تھیں۔ تسنیم کوٹھے کی بیٹی تھی اور نجانے کس کس کا مستقبل بن کر پرورش پا رہی تھی۔ اس وقت بھی اسی کے بارے میں تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ شمشیرہ بیگم نے اسے اپنی نگرانی میں دودھ پلوایا، صفائی ستھرائی کی اور نیا لباس پہنا کر کالا ٹیکہ لگایا۔ سنہری پازیب پیروں میں ڈالی اور پھر آواز لگائی۔

"کرمو...... ارے او کرمو...... کہاں مر گیا، ادھر آ، بہن کو سنبھال۔"

اکرام دور سے شمشیرہ کی آواز سن کر آیا اور ہاتھ میں جھاڑن سنبھالے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"اتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں تجھے۔ سو رہا ہوگا کنجر...... کیسا چالاک ہے، اُٹھا اور ہاتھ میں جھاڑن لے کر اندر آ گیا جیسے بڑے کام کر رہا ہو۔ میں کہتی ہوں تُو دیر سے اٹھنا نہیں چھوڑے گا؟"

"کہاں نانو...... سو کہاں رہا تھا؟ دو گھنٹوں سے تو کمروں کی صفائی کر رہا ہوں۔" اکرام نے کہا۔

"ہاں اماں! میں نے خود دیکھا ہے اسے۔ کر دو اسے برباد، کر دو۔ ایک کام دے دو اسے، چھ گھنٹے کے لئے چھٹی۔ ارے میں جانتی ہوں اسے۔ کتے کے بچے، کھڑا کیا دیکھ رہا ہے، لے تسنیم کو سنبھال۔"

"میں نے ناشتہ نہیں کیا ہے۔" کرمو نے کہا۔

"نواب کا بچہ ہے نا تُو...... دس بج رہے ہیں، ناشتہ نہیں کیا۔ ابھی صاحب زادے دس بجے ناشتہ کریں گے اور دو بجے کھانا کھائیں گے۔ پھر چھ بجے تک قیلولہ کریں گے۔ تم کان

کھول کر سن لو کوثر جہاں! یہ لڑکا ناک کان کاٹ کر چھوڑے گا ہمارے۔ ارے کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے؟’’ شمشیرہ بیگم نے کہا اور اکرام نے جھاڑن چھوڑ دی۔ اسی وقت کوثر جہاں آگے بڑھی اور کہا۔

‘‘جاؤ اکرام، تم ناشتہ کرلو۔ تسنیم کو میں لے لیتی ہوں۔’’

مگر اتنی دیر میں اکرام نے تسنیم کو گود میں لے لیا تھا اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ کوثر جہاں کے اندر اضطراب کی ایک لہر اٹھی۔ بیٹے نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔ ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔

‘‘تم بھی حد کرتی ہو۔ ناشتہ بھی نہیں کرنے دیا اسے۔’’

‘‘ہاں، ہاں...... جاؤ، گود میں بٹھا کر ناشتہ کراؤ۔ ارے میں کہتی ہوں کسی کام کا نہیں رہے گا وہ تمہاری ان حرکتوں سے۔ گھر کے کام کاج نہیں کرے گا تو کیا اچار پڑے گا اس کا؟ توبہ توبہ میں تو ہار گئی اس لڑکے سے۔’’ شمشیرہ بیگم نے کہا اور بکتی جھکتی باہر نکل آئیں۔

صحن میں اکرام تسنیم کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اچانک ہی اس کی نظر بہن کے پیروں پر پڑی۔ سنہری گنگا جمنی پازیبیں ننھی سی تسنیم کے پیروں میں چمک رہی تھیں...... اکرام کی نیلی آنکھوں میں غصے کی چمک پیدا ہوگئی۔ شمشیرہ بیگم اسے گھورتی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ سازندے غلام شاہ اور حاجو ایک طرف بیٹھے اپنے کسی کام میں مصروف تھے کہ چھن کی ایک آواز آئی اور سونے چاندی کی گنگا جمنی پازیب دیوار سے ٹکرائی۔ دونوں اچھل پڑے تھے۔

ابھی صورتحال پوری طرح سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی کہ دوسری پازیب بھی دیوار سے ٹکرائی اور غلام شاہ اچھل کر کھڑا ہوگیا اور غراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

‘‘ابے گرمی چڑھ گئی ہے کیا دماغ میں...... یا کیڑے کلبلا رہے ہیں...... یہ کیوں اتار کر پھینکی ہے تُو نے؟’’

‘‘یہ گھنگھرو کس نے ڈالے ہیں اس کے پیر میں؟’’ اکرام کی بکھری ہوئی آواز ابھری۔

‘‘تیری نانی نے...... کیوں، کیا ہوا؟’’

‘‘ہوں...... نانی......’’ اکرام نے کہا اور تسنیم کو لے کر چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔ غلام شاہ اور حاجو کچھ نہیں سمجھ پائے تھے۔ لیکن حاجو نے غصے سے پازیبیں

اٹھائیں اور شمشیرہ بیگم کے پاس پہنچ گیا۔

‘‘لیجئے شمشیرہ بیگم! قیمتی چیز ہے، گم ہوگئی تو قصوروار ہم غریب لوگ ہی ٹھہرائے جاتے ہیں۔’’

‘‘ارے...... یہ تو تسنیم کی پازیبیں ہیں۔’’

‘‘کرمو نے پیروں سے اتار کر دیوار سے دے ماری تھیں۔’’

‘‘کیوں......؟’’

‘‘اب یہ تو وہی بتا سکیں گے۔’’

‘‘کہاں مر گیا ہے وہ؟’’

‘‘چھت پر تشریف لے گئے ہیں۔’’ حاجو نے چنگاری لگاتے ہوئے کہا۔

‘‘پتہ نہیں یہ کہاں سے اس گھر میں آمرا...... کیسی منحوس گھڑی تھی جب ہمارے گھر میں یہ مصیبت آئی۔ سنو غلام شاہ، آج اس کتے کے پلّے کی تھوڑی سی مرمت کردو۔ روگ بن گیا ہے ہمارے گھر بھر کے لئے...... دیکھو، سینکڑوں کی چیز اتار کر پھینک دی جیسے بڑا نواب کا بچہ ہے۔’’

‘‘حد سے گزر گیا ہے یہ شمشیرہ بیگم...... ایسی ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ ہم تو بچہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں مگر بڑھتی ہی جارہی ہیں ان کی یہ حرکتیں۔’’

‘‘بلاؤ ذرا کتے کو......’’

اور پھر غلام شاہ، اکرام کو آواز دینے لگا۔

‘‘کیا بات ہے؟’’ اکرام نے کہا اور نیچے آگیا۔ شمشیرہ بیگم غصے سے دانت کچکچا رہی تھیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے سنہرے بال پکڑ لئے اور پھر اس کی گود سے تسنیم کو لے لیا۔

‘‘یہ پازیبیں تم نے اتار کر پھینکی تھیں؟’’

‘‘ہاں......’’

‘‘کیوں......؟’’ غلام شاہ غرایا۔

‘‘نہیں بتاتا۔’’ اکرام بولا اور غلام شاہ کا تھپڑ اس کے رخسار پر پوری قوت سے پڑا۔ اکرام پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹکرایا تھا۔

''کیوں اتاری تھیں یہ......؟''

''نہیں بتاؤں گا......'' اس نے اسی انداز میں کہا۔ آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ غلام شاہ نے آگے بڑھ کر لات ماری تو وہ اچھل کر دور جا گرا۔

''بول، کیوں اتاری تھیں؟''

''نہیں بتاؤں گا...... کبھی نہیں بتاؤں گا۔'' اکرام نے غصیلے لہجے میں کہا۔ اسی وقت کوثر باہر نکل آئی۔ غلام شاہ نے اکرام کا گریبان پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور بولا۔

''نہیں بتائے گا تُو؟''

''نہیں بتاؤں گا......'' وہ بپھر کر بولا اور غلام شاہ نے ایک زوردار تھپڑ اس کے رخسار پر جڑ دیا اسی وقت کوثر آگے بڑھ آئی۔

''ارے، ارے...... دماغ خراب ہو گیا ہے کیا تمہارا...... پاگل ہو گئے ہو کیا؟ کیوں مار رہے ہو اسے...... اور تم دیکھ رہی ہو اماں، دیکھ رہی ہو تم......'' کوثر جہاں غرا کر آگے بڑھی اور اس نے اپنے کمزور ہاتھوں سے غلام شاہ کو دھکا دیا۔

''بتاؤ...... کیوں مارا تم نے اسے؟'' وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

''مجھ سے پوچھو...... رئیس صاحب کو یہ پازیبیں پسند نہیں آئیں۔ اٹھا کر دیوار پر دے ماریں...... اور پھر اوپر سے زبان چلائے جا رہا ہے۔''

''غلام شاہ! پیچھے ہٹ جاؤ...... ورنہ میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔ اچھا کر رہی ہو تم اماں! خدا کا خوف بھی نہیں رہا تمہارے دل میں۔ معصوم سے بچے کو اس بھیڑیئے سے پٹوا رہی ہو۔ تُو مر کیوں نہیں جاتا اکرام...... مر کیوں نہیں جاتا تُو...... کیوں یہاں اپنی زندگی کھو رہا ہے...... بھاگ جا یہاں سے...... مار ڈالیں گے یہ لوگ یہاں تجھے۔'' کوثر جہاں زار و قطار روتی ہوئی بولی اور پھر اکرام کو ساتھ لیا اور اندر چلی گئی۔

''یہ اچھی بات ہے...... پہلے تم ماں بیٹی فیصلہ کر لیا کرو کہ کیا کرنا ہے پھر مجھ سے کہا کرو۔ بلاوجہ مجھے برا بنواتی ہو۔'' غلام شاہ نے کہا۔

''ارے بیڑا غرق ہو اس کتے کا۔ کسی کی آئی میں موت اسے آ جائے۔ جان جلا کر رکھ دی ہے۔'' شمشیرہ بیگم نے کہا اور بکتی جھکتی خود بھی وہاں سے چلی گئیں۔ کوثر جہاں کی طبیعت کا خیال آیا۔ وہ ان کے کوٹھے کی ٹکسال تھیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اُس کے نام کا ڈنکا بج

رہا تھا۔ دل پر بوجھ پڑا تو بیمار ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر کمرے میں چلی گئیں۔ کوثر جہاں خاموش بیٹھی خلا میں گھور رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے مدھم مدھم آوازیں نکل رہی تھیں۔

''الٰہی! کیا کروں میں...... کیسے گھر کا پھول ہے یہ، کیچڑ میں پڑا ہوا ہے۔''

شمشیرہ بیگم نے کہا۔ ''کہاں گیا......؟''

''باہر گیا ہے۔''

''دیکھو میری اس سے کوئی دشمنی تو ہے نہیں۔ تم خود دیکھو، کتنا بگڑتا جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں اس کا ہو گا کیا......؟''

''میں بھی یہی سوچتی ہوں...... کیسا تقدیر کا کھوٹا ہے۔ نجانے یہاں کیوں پیدا ہو گیا...... کسی اچھے گھر میں ہوتا تو اس گھر کا چراغ ہوتا۔''

شمشیرہ بیگم تھوڑی دیر تک بولتی رہیں، اس کے بعد باہر نکل گئیں۔ کوثر جہاں کے رخسار آنسوؤں سے تر ہوتے رہے۔ کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں سمجھ سکتا اکرام کے دل کا درد۔ وہ اس ماحول کا بچہ نہیں ہے۔ اس کی رگوں میں دوڑتا خون اس ماحول کو قبول نہیں کر سکتا...... اسے گھنگھروؤں سے نفرت ہے...... ہوش سنبھالنے کے فوراً بعد گھنگھروؤں کی چھما چھم نے اس کی سماعت زخمی کر دی ہے۔ وہ اکرام کے لئے کڑھتی رہی۔ پھر اس کے دل میں ایک اور درد سلگ اٹھا۔ اس کے منہ سے مدھم سی آواز نکلی۔

''بے وفا...... ایک دفعہ پلٹ کر دیکھ تو لیتے، کیسے جی رہے ہیں وہ جو تمہارے پیار کا شکار ہوئے۔ مجھے تو زخمی کیا ہی تھا، اسے بھی اس دنیا میں چھوڑ گئے جو اس کی نہیں ہے۔'' اس کی آواز سسکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

○●○

رب نواز نے لاچا کُرتا پہنا تو چاروں ساتھی اسے دیکھ کر مسکرانے لگے۔ نور شاہ نے کہا۔

''بلے بلے...... پہلے تو کبھی آپ کو اس رنگ میں نہیں دیکھا شاہ جی۔''

''کیوں بھئی، برے لگ رہے ہیں یہ کپڑے؟ یہ تو ہماری ثقافت کا ایک حصہ ہیں...... اب یہ الگ بات ہے کہ کراچی میں اس کا کبھی موقع نہیں ملا۔''

''خدا کی قسم شاہ جی، پورا پنجاب بن گئے ہو۔ یہ نوکیلی مونچھیں، کالے بھنورے جیسے گھنگھریالے بال اور یہ شیر جیسا چوڑا سینہ اور یہ لمبا قد۔ شاہ جی، قربان ہونے کو دل چاہ رہا

ہے۔"

"قربان ہونے کی بجائے تم لوگ بھی کپڑے بدل لو۔ نئی نگری، نیا نگر...... ذرا باہر چل کر تو دیکھیں کہ ہیروں کی اس مارکیٹ میں کیسے کیسے ہیرے جگمگا رہے ہیں۔"

"شاہ جی! پاگل ہو جائیں گے لوگ آپ کو دیکھ کر۔"

"او یار مکھن مت لگا...... چلو تم لوگ بھی جلدی سے اپنے اپنے لباس تبدیل کر لو۔ آتے تو ہیں نا یہ کپڑے پہننے؟"

"اس کی تو آپ پرواہ ہی نہ کرو شاہ جی۔"

اور پھر ان چاروں نے بھی لاچے کُرتے پہن لئے۔

"مگر شاہ جی! ایک بات تو بتا دو، یہ سوجھی کیا؟"

"او کمال کرتا ہے تُو بھی نور شاہ! او بھئی جیسا دیس ویسا بھیس۔ اب تم لوگوں سے کیا چھپانا، اوقات ہی یہی ہے ہماری۔ یہیں سے ہمارا خمیر اٹھا ہے۔ طوائف کی اولاد ہیں ہم۔ وہ تو بس یوں کہو کہ ایک دولت مند نے اپنے گناہوں پر پردہ ڈال کر ہماری پرورش کی، دنیا سے چھپ چھپ کر پلے ہیں ہم۔ بہت کم لوگوں کو ہماری اوقات کا پتہ ہے لیکن ہم اپنے آپ کو نہیں چھپا سکتے۔ بس یوں کہو "خاک وہیں پر پہنچ گئی جہاں کا خمیر ہے" چلو اب دماغ خراب مت کرو۔ اور سنو، اس کے بعد اس طرح کی کوئی فضول بات سننے کو نہ ملے کیا سمجھے۔"

ہیرا منڈی نئی نئی کہانیوں کا مسکن...... رب نواز، کالے رنگ کے کڑھے ہوئے کُرتے اور کالے ہی رنگ کے بارڈر والے لاچے میں ملبوس باہر نکلا تو دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں...... گورے رنگ پر سیاہ چڑھی ہوئی مونچھیں اور پھر لمبا چوڑا قد و قامت...... ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔

"میں نے کہا نبی بخش، ذرا دیکھنا انہیں۔ یہ کہاں کے جاگیردار چلے آ رہے ہیں؟"

"وہی لوگ جنہوں نے پیلا کرائے پر لیا ہے۔"

"مگر ہیں کہاں کے...... کچھ پتہ تو چلے۔"

پان کی دکان پر اکرام بیٹھا ہوا تھا۔ پان والے سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی اور وہ اسی کو اپنا دکھ درد سناتا تھا۔ اس وقت بھی دونوں باتیں کر رہے تھے کہ گاہک آ گئے۔

"ذرا پان کھلاؤ" چوڑی چھاتی والے شخص نے کہا۔ پان والا پان بنانے لگا۔ کالی کُرتی

پہنے ہوئے شخص نے جو رب نواز کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور پھر اس کی نگاہیں پان والے کی دکان پر بیٹھے ہوئے اکرام پر پڑیں اور وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کے منہ سے آواز نکلی۔

"فضل خان! ذرا دیکھنا بچے کو، یہ اس پنواڑی کا تو نہیں معلوم ہوتا...... کیا شکل صورت بنائی ہے اللہ نے۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ غلام شاہ، اکرام کو تلاش کرتا ہوا آ گیا۔ شاید اکرام کسی کام سے آیا تھا اور پان والے کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اسے دیکھا تو غصیلے لہجے میں بولا۔

"تُو یہاں مر رہا ہے...... کب سے پان منگوائے تھے شمشیرہ بیگم نے۔ ابے تُو ہوش میں آئے گا یا نہیں......؟" غلام شاہ نے اکرام کا کالر پکڑ کر اسے نیچے گھسیٹ لیا اور پھر اس کا اٹھا ہوا ہاتھ درمیان ہی میں رک گیا...... کیونکہ اس کے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی گئی تھی۔

"دماغ میں کوئی کیڑا کاٹ رہا ہے...... یہ بچہ اس قابل ہے کہ تم اس پر یہ اپنے کھرپے جیسے ہاتھ اٹھاؤ؟"

"کون ہو تم...... مطلب کیا ہے تمہارا؟" غلام شاہ نے ہاتھ چھڑانے کے لئے زور لگایا اور اس میں ناکام رہ کر حیران رہ گیا۔ لمبا چوڑا، طاقتور آدمی تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کی کلائی اس طرح روک لے۔

"تمہیں سمجھا رہا ہوں بالے...... ان رخساروں پر تو شبنم بھی گرے تو پھسل جائے۔ اور تم ان پر اپنا یہ کلہاڑا مار رہے ہو۔"

"ہاتھ چھوڑو۔" غلام شاہ نے غرا کر کہا اور ایک زوردار جھٹکا اپنے ہاتھ کو دیا۔ لیکن دوسرے ہاتھ میں جنبش بھی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ رب نواز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"واہ، چھڑا لو کاکے، چھڑا لو۔ ہم نے کوئی روکا ہے۔ ویسے ہمارا مشورہ ہے کہ معافی مانگ لو اس بچے سے...... بات بگڑ گئی تو پھر بنے گی نہیں۔"

قرب و جوار کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اس دوران اکرام موقع پا کر کھسک گیا تھا۔ محلے کے کچھ بدمعاش آ گئے اور ان میں سے ایک نے سینہ تان کر کہا۔

"کیا ہو گیا شاہ جی...... کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں، ذرا کلائی پکڑ لی ہے تمہارے شاہ جی کی۔ آؤ، ذرا کوشش کرو۔"

بدمعاشوں نے تیور بگاڑے تو نور شاہ، دلبر خان، فضل خان اور شالے خان نے لمبے لمبے چھرے نکال لئے۔

"ایک قدم آگے بڑھے تو پیٹ کھلے ہوئے ہوں گے تمہارے...... کیا کہتے ہو شاہ جی! پھڑکا دوں؟" نور شاہ نے اپنا چھرا ایک بدمعاش پر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو...... رہنے دو...... ان میراثیوں کے خون سے اپنے چھرے گندے کرو گے۔ جاؤ، دفع ہو جاؤ حرام کے جنوں...... آئندہ ہمارے راستے میں آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ گردنیں اٹھا کر لے جانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔" غلام شاہ کی کلائی ایک جھٹکے سے چھوڑ کر رب نواز نے ایک لات اس کی کمر پر رسید کی اور وہ کئی قدم دوڑتا چلا گیا۔ لوگ دیکھ رہے تھے۔ غلام شاہ نے ایک لمحے کے لئے رُک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر وہاں سے بھاگ گیا۔ شالے خان نے ہاتھ سیدھے کرتے ہوئے کہا۔

"جاؤ بھائیو، جاؤ...... خیال رکھنا، شاہ جی اس محلے میں آ گئے ہیں۔ کسی کی کوئی بدمعاشی نہیں چلنی چاہئے۔" صورتحال کا سبھی کو اندازہ ہو گیا تھا چنانچہ لوگ آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ رب نواز نے پان والے کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"بڑے بھیا! یہ بچہ کون تھا جس پر یہ ظلم ہو رہا تھا...... ذرا بتاؤ تو ہمیں اس کے بارے میں؟"

"وہ جی شمشیرہ بیگم کا نواسہ ہے...... کوثر جہاں کا بیٹا ہے۔ وہ جو کوٹھا نظر آ رہا ہے، وہاں رہتا ہے۔"

"اور وہ سورما کون تھا؟"

"غلام شاہ ہے اس کا نام...... وہیں کام کرتا ہے۔"

"ہوں...... ٹھیک ہے۔ سنا تم نے نور شاہ! یہ طوائفوں کے کوٹھے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ لڑکیاں سونے میں تولی جاتی ہیں اور لڑکے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اس گدڑی کے لعل کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہئے..... کیا نام ہے اس کا پان والے؟"

"اکرام نام ہے اس کا...... کرمو کہا جاتا ہے۔"

"کرمو...... ٹھیک ہے...... اب ایک بات کا خیال رکھنا، جو بھی ملے اس سے کہہ دینا کہ کسی نے لڑکے کی طرف نظر ٹیڑھی کر کے دیکھا تو دوبارہ کوئی چیز نہیں دیکھ سکے گا۔ پان

والے! یہ تمہاری ڈیوٹی ہے۔"

"جج...... جی...... اچھا......" پان والے نے بادل نخواستہ جواب دیا اور پھر یہ ٹولی پان والے کو ضرورت سے زیادہ رقم دے کر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ رب نواز نے کہا۔

"مجبوری ہے نور شاہ...... اس بچے سے طبیعت لگتی ہے۔ نجانے کیوں ہمیں اس میں رب نواز نظر آتا ہے...... ہمیں تو خیر اللہ نواز نے اپنا نام دے دیا ہے، اس بچے کے نام کے ساتھ کوئی نام جڑا ہوا نہیں ہوگا...... کوئی اکرام بھی نہیں کہتا ہوگا اسے۔ بیچارہ کرمو زندگی گزار رہا ہے اسے وہ زندگی نہیں گزارنی چاہئے...... آؤ ذرا اس کی خبر لیں۔ کیا نام بتایا تھا اس کا، شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر۔"

اور حقیقت یہی تھی کہ شمشیرہ بیگم نے اکرام کو پان لگوا کر لانے کے لئے کہا تھا جو خاص مہمانوں کے لئے منگوائے جاتے ہیں اور اکرام نے دیر کر دی تھی۔

بہرحال غلام شاہ ذلیل و خوار ہو کر واپس پہنچ گیا۔ بڑی شرمندگی تھی۔ کیونکہ ہیرا منڈی میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس علاقے کا سب سے طاقتور پہلوان نما آدمی تھا۔ مگر آج جو کچھ ہوا تھا وہ بڑا ہی شرمندہ کرنے والا تھا۔ بہرحال بات سنبھالنی تھی۔ بڑے بڑے سرپھرے آ جاتے تھے یہاں۔ اور کبھی کبھی تو واقعی ایسا ہوتا تھا کہ کوئی گلے پڑ جائے تو جان بچانا مشکل ہو جائے۔

بہرحال محفل جمی ہوئی تھی اس لئے خاموش رہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد رب نواز اپنے چاروں ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا تو لوگ دم بخود رہ گئے۔ گائیکی اپنے عروج پر تھی۔ رب نواز کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں...... وہ ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ خود شمشیرہ بیگم بھی بے چین ہو گئی تھیں۔ پھر یہ غزل ختم ہوئی تو پانچوں ایک دم اٹھ گئے۔ بڑے نوٹوں کی دو گڈیاں تھال میں ڈالیں اور واپسی کے لئے پلٹے تو شمشیرہ بیگم بولیں۔

"ارے ارے، کچھ پسند نہیں آیا...... آپ کی پسند کا گایا جائے گا، بیٹھئے تو سہی۔" نوٹوں کی گڈیاں آنکھوں میں چکا چوند جگا رہی تھیں...... اور شمشیرہ بیگم اب نوٹوں کی زبان بول رہی تھیں۔ "پان تو کھائیے...... بیٹھئے تو سہی۔"

"ہم کوٹھوں کے پان نہیں کھاتے بائی جی! آؤ......" رب نواز نے کہا اور دروازے کی جانب مڑ گیا۔ کافی دیر کے لئے ایک سنسنی سی چھا گئی تھی۔

○●○

جلتا ہوا سورج آگ برسا رہا تھا...... اور لاہور اپنی روایتی گرمی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اہل لاہور اس گرمی سے بچنے کے لئے حسب توفیق انتظامات کیا کرتے تھے۔ ٹیٹیاں لگے ہوئے ایئر کولر گھروں میں چلتے تو ماحول ٹھنڈا ہو جاتا۔ پرانی حویلیوں میں تو تہہ خانے بنے ہوتے تھے۔ جب سورج اونچا ہوا تو حویلیوں کے مکین تہہ خانوں میں چلے گئے، پھر شام ہی کو باہر نکلے۔ دروازہ کھلا تو لُو کے جھونکے اندر آئے۔ بس ہر جگہ ایک ہی انداز ہوتا تھا اور سب اسی طرح گرمی مناتے تھے۔ شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کے اس کمرے میں جو کوثر جہاں کے لئے مخصوص تھا، کوثر جہاں آرام کر رہی تھی۔ اکرام نجانے کہاں سے اس وقت آ گیا تھا اور اس نے ننھی سی تسنیم کو گود میں بٹھا لیا تھا اور اسے بڑے پیار سے چوم رہا تھا۔ کوثر جہاں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولی۔

"اکرام......"

"ہاں......"

"یہ تمہیں بہت اچھی لگتی ہے؟"

"ہاں...... لیکن......"

"لیکن کیا......؟"

"میرا دل چاہتا ہے کہ یہ کبھی بڑی نہ ہو۔ ہمیشہ اتنی ہی رہے۔ بڑی ہو جائے گی تو یہ بھی......"

"یہ بھی...... کیا......؟"

"یہ بھی تم جیسی ہو جائے گی۔"

"کیوں، بہت بری ہوں میں"

"ہاں بہت بری ہو تم سب......غوں، غزالہ، شبانہ تم سب بہت برے ہو۔ تم جب لوگوں کے سامنے ناچتی ہو تو میرا دل کرتا ہے کہ تمہارے پیروں کے نیچے شیشے کے ٹکڑے بچھا دوں تا کہ تمہارے پیر زخمی ہو جائیں...... اتنے بڑے بڑے زخم بن جائیں کہ ان میں سے ہر وقت خون نکلتا رہے۔ پھر ڈاکٹر تمہارے پاؤں کاٹ دیں۔ جس طرح لنگڑے شرابی کے کاٹ دیئے گئے ہیں۔ جب تم گاتی ہو تو لوگ تمہیں پیسے دیتے ہیں تو میرا دل......

میرا...... دل......" اکرام نے گھونسا بنا کر ہونٹ بھینچ لئے...... کوثر جہاں بے بسی کی نگاہوں سے اکرام کو دیکھ رہی تھی۔ اکرام پھر بولا۔

"میں نے اس کی پازیبیں اسی لئے تو پھینکی تھیں۔ سنو باجی! اسے یہ پازیبیں کبھی مت پہنانا...... ان میں گھنگھرو بجتے ہیں باجی! اس کے پیروں میں گھنگھرو بجے تو میں اس کے پیر کاٹ ڈالوں گا چھری سے...... میری بات غور سے سن لینا، ایسا ہی ہوگا۔" اکرام کے لہجے میں ایک ایسا اظہار تھا کہ کوثر جہاں کانپ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نیلے شعلے ابھر رہے تھے اور کوثر جہاں کو یوں لگ رہا تھا جیسے اکرام نہیں، وہ بول رہا ہو جس نے اکرام کو اس جہنم میں چھوڑ دیا تھا......

○●○

شاہی محلے میں اس نئے مکیں کی آمد لوگوں کے لئے ایک معمہ بن گئی تھی اور وہ ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا، صاحب حیثیت آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ شان و شوکت تو بے مثال۔ کبھی دیکھا نہیں کہ کوٹھوں پر آ جا رہے ہوں۔ اور پھر لین دین کے اتنے کھرے کہ ایک کے چار ادا کرنے کو تیار......"

پھر ایک شام معمول کے مطابق رب نواز شاہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکلا۔ پان والے سے سب سے زیادہ یاری ہو گئی تھی کیونکہ پان کے شوقین تھے اور سچی بات یہ کہ پان والے کی چاندی ہو گئی تھی۔ ایک دن کہنے لگے۔

"نام نہیں بتایا تم نے پان والے؟"

"سرکار خیرالدین ہے ہمارا نام...... لوگ خیرو کہتے ہیں۔"

"دیکھو، تمہارا پان اتنا پسند آیا ہے ہمیں کہ تمہارے محلے میں ہی آ بسے ہیں۔ اور محلے والوں کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"ضرور سرکار......" خیرالدین نے کہا اور آس پاس کے دکانداروں کے بارے میں اور پھر کوٹھوں کے بارے میں بتانے لگا۔

"ٹھیک...... محلے کی سرپرستی بھی کرتا ہے کوئی؟"

"سرپرستی...... ہم سمجھے نہیں سرکار۔"

"یہاں کوئی جھگڑے ہنگامے ہوتے ہیں تو کوئی دیکھتا ہے؟"

"جھگڑے ہنگامے بہت کم ہوتے ہیں...... اور پھر اگر کوئی بڑا ہی جھگڑا ہو جاتا ہے تو گوگیا کو بتا دیا جاتا ہے۔ گوگیا پہلوان سارے معاملات ٹھیک کر لیتا ہے۔ ہم سب اسے مہینہ دیتے ہیں سرکار۔"

"ہوں، ٹھیک۔"

اسی وقت دور سے اکرام آتا ہوا نظر آیا تو رب نواز نے نور شاہ سے کہا۔

"نور شاہ! ذرا اس بچے کو ساتھ لے آؤ۔ ہم اندر جا رہے ہیں۔" نور شاہ نے اکرام سے کیا کہا کیا نہ کہا، یہ الگ بات ہے لیکن وہ اکرام کو ساتھ لے کر رب نواز کے احاطے میں پہنچ گیا۔ یہ احاطہ اب بے مثال فرنیچر سے آراستہ ہو گیا تھا۔

نور شاہ نے کہا۔ "آ جاؤ بچے، ڈرو نہیں۔"

یک دم جیسے اکرام کو کرنٹ سا لگا۔ "میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔"

رب نواز مسکراتی نگاہوں سے اکرام کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے بیٹا۔ آؤ، بیٹھ جاؤ۔ ہم سے دوستی کرو گے؟"

اکرام بیٹھ گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"کرمو۔"

"ارے نہیں، کرمو بھی کوئی نام ہوا...... پورا نام کیا ہے؟"

"اکرام۔"

"ہوں...... ہمارا نام رب نواز شاہ ہے...... لوگ ہمیں شاہ جی کہہ کر پکارتے ہیں۔ اچھا ایک بات بتاؤ بیٹا، اس دن جب ہم نے تمہارے اس آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا جو تمہیں مارنا چاہ رہا تھا تو اس نے گھر جا کر کچھ کہا تو نہیں تھا تم سے؟"

"میں چھپ گیا تھا۔" اکرام نے مسکرا کر کہا۔

"ارے نہیں...... نہیں بیٹا، مرد بنو مرد۔ مرد کبھی کسی سے چھپتے نہیں۔ آئندہ اگر کسی سے کوئی جھگڑا ہو تو کہہ دینا شاہ جی کا دوست ہوں اور شاہ جی انتڑیاں نکال کر کندھے پر ڈال دیتے ہیں۔"

"غلام شاہ سے بھی کہہ دوں؟"

"اس کی ایسی تیسی۔ کوئی بھی ہو۔ ہمارے بیٹے بن گئے ہو تم...... اور ٹھہرو ایک منٹ۔"

رب نواز شاہ نے شالے خان کی طرف دیکھا اور شالے خان نے اپنے لباس سے ایک خوبصورت سا چاقو نکال کر رب نواز کو پیش کر دیا۔ رب نواز نے وہ گراری دار چاقو کھولا اور اس کا پھل آنکھوں کو خیرہ کرنے لگا۔

"لو...... یہ ہماری طرف سے تحفہ ہے، جس پر جی چاہے کھول لینا۔ سب ٹھیک ہو جائیں گے۔"

یہ پہلا تحفہ تھا جو کسی نے اسے دیا تھا۔

"رکھ لوں......؟" اس نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

"ہاں، ہاں...... تمہارے ہی لئے منگوایا ہے جان......" اور پھر رب نواز نے اس کے لباس پر نظر ڈالی اور اچانک اس کا چہرہ مرجھا گیا اور اس نے آواز لگائی۔

"دلبر خان......"

"میں یہیں موجود ہوں شاہ جی۔" دلبر خان نے کہا۔

"کوئی درزی ہے آس پاس؟"

"دیکھا تو نہیں ہے۔"

"صبح کو ہمارے جانوں کو کچھ جوڑے چاہئیں سمجھے۔ کیسے آئیں گے یہ تم جانو اور تمہارا کام۔"

"بالکل آ جائیں گے شاہ جی۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"کچھ کھانے کو منگوایا؟"

"ہاں جی...... فضل خان صاحب گئے ہیں۔"

"ٹھیک...... ہاں بیٹا، اب بتاؤ گھر بار کی۔ کون کون ہے تمہارے گھر میں اور کیا کرتے ہو دن بھر؟"

"کچھ نہیں...... بس گھر کی صفائی کرتا ہوں۔ باورچی کے ساتھ باورچی خانے میں کام کرتا ہوں۔ گھر میں باجی ہیں، ننوں ہیں، باجی غزالہ اور باجی شبانہ ہیں، میں ہوں۔ شام کو سارے سازندے آ جاتے ہیں جب محفل ہوتی ہے۔" اکرام نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد فضل خان مٹھائی، کچوریاں، کباب، دہی بڑے لے آئے جو ایک میز پر رکھ کر سجا دیئے گئے اور شاہ جی نے اکرام کا ہاتھ پکڑ کر میز کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو بیٹا..... چلو شروع ہو جاؤ۔''

''میں.....؟'' اکرام تعجب سے بولا۔

''ہاں، اور کون..... تمہارے لئے ہی تو یہ سب منگوایا ہے..... چلو اب تکلف مت کرو۔'' بڑی محبت گھلی ہوئی تھی رب نواز کے لہجے میں اور اس کے چاروں ساتھی محسوس کر رہے تھے کہ رب نواز کے اندر اس وقت کوئی اور ہی احساس پل رہا ہے۔ اکرام نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''وہ..... مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''لگ جائے گی..... لگ جائے گی..... اگر تم نے تکلف کیا تو دوستی ختم ہو جائے گی ہماری۔''

''اور اگر ننوں کو خبر ہو گئی تو؟''

''تو کیا ہو گیا..... ماریں گی ناں؟''

''ہاں۔''

''تو پھر وہ چاقو کس لئے دیا ہے تمہیں..... کوئی بھی ہو، تم پر ہاتھ اٹھائے تم اس پر چاقو اٹھاؤ اور کھینچ دو نیچے سے اوپر تک..... یہ ہمارا وعدہ ہے کہ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔'' رب نواز کے لہجے میں غراہٹ پیدا ہو گئی۔

پھر اکرام نے کھانے کی جانب ہاتھ بڑھا دیئے۔ رب نواز نے کہا۔ ''ننوں تمہاری نانی ہے؟''

''ہاں۔''

''اور تمہاری ماں؟''

''ماں.....'' اکرام آہستہ سے بولا۔ ''ماں خبر نہیں کون ہے؟ باجی اکیلے میں کہتی ہیں کہ تم مجھے ماں کہا کرو اور جب میں انہیں ماں کہتا ہوں تو بہت خوش ہوتی ہیں۔''

''کون سی باجی؟''

''کوثر جہاں۔''

''اور تمہارے باپ کون ہیں.....؟'' رب نواز نے سوال کیا اور اکرام کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

○●○

کہانیاں تو نجانے کہاں کہاں کی ہوتی ہیں..... بے چارہ شمس یورپ سے آیا تھا۔ نجانے کتنے وار دل پر لے کر گیا..... اور نجانے کتنے داغ کسی کے دل پر چھوڑ گیا..... داغوں کی کہانی تو پوشیدہ ہوتی ہے..... لیکن کھلی کہانی بے چارہ اکرام تھا۔ ایک شریف زادے کا خون۔ لیکن ہیرا منڈی کی گلیوں میں بھٹکتا ہوا، اپنی تلاش میں سرگرداں..... ان کہانیوں کی کوشش بھی ہوتی ہے اور اس کوشش کے لئے قدرت نے رب نواز کی ذمہ داری لگائی تھی اور جہاں تک رب نواز کا تعلق تھا، زندگی جس بڑی شان و شوکت سے گزاری تھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ لیکن بس دل کو ایک داغ لگا تھا۔ بات وہی پھر داغ والی آ جاتی ہے اور اس داغ نے ساری سوچیں خاکستر کر دی تھیں اور وہ اس تصور کے ساتھ ہیرا منڈی میں آ کر آباد ہو گئے تھے کہ جب ایک طوائف کی اولاد ہیں تو شریفوں کا گھر کیوں خراب کریں۔ پتہ نہیں ملک اللہ نواز نے اکلوتے بیٹے کی جدائی کو کیسے محسوس کیا۔ پتہ تو یہ بھی نہیں کہ چوہدری نظام الدین نے بیٹے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے دور کر کے اپنے سینے پر کون کون سے داغ سہے۔ گیارہ بارہ سال ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے بھی بیٹا وہیں تھا۔ خود شمس الدین کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ یہاں بے چارے اکرام کو ایک سہارا نصیب ہوا تھا تو ادھر گجرات کے غیاث الدین اور ان کی بیٹی عرشیہ نجانے کس غم کا شکار ہو گئے تھے۔ یہ کہانی در کہانی، یہ تانے بانے قدرت کا کھیل ہوتے ہیں۔

قدرت کی کہانیاں اِدھر سے اُدھر منتشر ہوتی رہتی ہیں اور ایک اور کہانی کا آغاز ہیرا منڈی کی شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر ہوا۔ یہ کہانی نعمان فضلی کی تھی۔ ایک اور زندگی بہت سے تانوں بانوں کے ساتھ مشکلوں کا شکار ہوئی۔ محفل سجی ہوئی تھی۔ شیر علی جن کا سکھر میں سچے موتیوں کا کاروبار تھا، لاہور پہنچے تو اپنا فرض پورا کرنے کے لئے شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر آئے۔ وہ یہاں کے پرانے مسافر تھے۔ کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو تماش بینی کو تماش بینی ہی سمجھتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو یہاں دل ہار جاتے ہیں، خصوصاً نوجوان، جیسا کہ نعمان فضلی۔ شیر علی انہیں بھی ساتھ لے آئے تھے اور ایک اور نئی کہانی کا اس کوٹھے پر

آغاز ہو گیا تھا۔ شیر علی کا نعمان فضلی سے کیا تعلق تھا اس کا تو اندازہ نہیں ہوا لیکن گیارہ بارہ سال پہلے جس طرح یہیں اس کوٹھے پر شمس آیا تھا اسی طرح نعمان فضلی بھی پہنچے تھے۔ بھولا بھالا، خوبصورت سا نوجوان، لگ رہا تھا پہلی بار کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھا تھا۔ لجایا لجایا، شرمایا شرمایا۔ اس کے چہرے کی سُرخی قابل دید تھی۔ شیر علی نے آتے ہی کوثر جہاں کے بارے میں پوچھا تھا۔ بہرحال مضبوط اسامی تھی شمشیرہ بیگم کی فہرست میں۔ شمشیرہ بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بولی۔

''بیمار ہو گئی تھی...... اب اللہ کا فضل ہے ٹھیک ہے۔''

''میں ملنا چاہتا ہوں اس سے۔''

''محفل ختم ہو لے تو آپ کو اس سے ملوا دیں گے۔ ذرا انتظار کی زحمت اٹھائیے۔ آج کچھ بدن گرم تھا، اس لئے باہر محفل میں بھی نہیں آئی۔ یہ کون ہیں؟''

''بس انہیں آپ کے دیدار کرانے لائے ہیں۔ نعمان فضلی نام ہے، بہت بڑے آدمی کے بیٹے ہیں۔ میرے بزنس پارٹنر سمجھ لیجئے۔ ہاں بھئی، باقی اپنے بارے میں خود ہی بتا دو۔''

نعمان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اور کتنی دیر یہاں رکیں گے؟''

''ایں...... بھائی، ابھی کچھ دیر دم تو لو، جانِ محفل کی ایک جھلک تو دیکھ لیں۔''

فضلی کو یہاں گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد کوثر جہاں اندر آ گئیں۔ بیماری اس کے چہرے پر ایک پُرسوز کیفیت چھوڑ گئی تھی جو غضب کی کشش رکھتی تھی۔ محفل تقریباً ختم ہی ہونے والی تھی۔ دوسرے لوگ جا چکے تھے۔ شیر علی نے اپنے لباس میں سے سچے موتیوں کا ایک ہار نکالا اور کوثر جہاں پر نچھاور کر کے تھال میں ڈال دیا۔

''یہ خیرات کر دیجئے گا شمشیرہ بیگم......''

شمشیرہ بیگم جوہری کی نگاہ رکھتی تھیں...... لاکھوں روپے کی مالیت کے ہار کو خیرات کرنا کیا معنی رکھتا تھا۔ شیر علی کہنے لگے۔

''جب بھی لاہور آتے ہیں آپ یقین کیجئے کوثر جہاں کی یاد ہی کھینچ کر لاتی ہے۔ اپنی کہئے کہ کچھ سنوار رہی ہیں کوثر جہاں سے؟''

''آپ کے لئے تو جان حاضر ہے۔ حالانکہ آدابِ محفل کے خلاف ہے لیکن بھلا آپ سے کون انکار کرے۔''

شمشیرہ بیگم نے کوثر جہاں کو اشارہ کیا اور کوثر جہاں نے ایک خوبصورت غزل چھیڑ دی اور صحیح بات یہ ہے کہ اس غزل نے نعمان فضلی کا سارا غرور توڑ دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح کوثر جہاں کو دیکھ رہا تھا...... وہ جھجک جو اس پر کچھ دیر پہلے تک طاری تھی نجانے کہاں جا سوئی تھی۔ اس کی آنکھیں کوثر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور شیر علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جانتے تھے کہ شکار پوری طرح زخمی ہوا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے اجازت مانگی اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے نعمان فضلی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''کیا خیال ہے فضلی...... چلیں کہ نہیں؟''

''جی ہاں...... جی ہاں......'' نعمان نے کہا اور جیب سے کچھ نکال کر سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ...... یہ...... یہ......''

''بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔ بڑی زیادتی کرتے ہیں آپ۔'' شمشیرہ بیگم نے کہا اور ان دونوں کو دروازے تک پہنچانے آئی۔

دوسرے دن صبح دس بجے جبکہ کوٹھوں پر صبح کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا، دروازے پر دستک ہوئی۔ حاجو نے دروازہ کھولا اور شیر علی کو دیکھ کر آداب بجا لائے تھے۔

''بھئی معاف کیجئے گا، کچھ ایسی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ ذرا شمشیرہ بیگم سے ہمارا سلام کہئے۔''

شمشیرہ بیگم شیر علی کی آمد کا سن کر باہر نکل آئیں اور حسب دستور مسکرا کر خیر مقدم کیا۔

''ناوقت زحمت دینے کی معافی چاہتے ہیں...... ایک غرض سے حاضر ہوئے تھے۔''

''حکم فرمائیں۔''

''ہم تو آج جا رہے ہیں...... لیکن نعمان فضلی یہاں رکیں گے اور رکنے کا یہ فیصلہ انہوں نے اچانک کیا ہے۔ ہم اس کی وجہ سمجھ گئے ہیں۔ کبھی کبھی اپنوں کے سپرد کچھ ذمہ داریاں بھی کر دی جاتی ہیں۔''

''جی فرمائیے۔''

''اب آپ کو ہم بتائیں، نعمان فضلی ایک بہت بڑے گھرانے کے چشم و چراغ ہیں...... یہ لوگ ہمارے کاروباری حریف ہیں اور ہم نے ان کے بزرگوں کے ہاتھوں ایک عرصے

تک شدید نقصانات برداشت کیے ہیں۔ اب خدا خدا کر کے وہ وقت آیا ہے کہ سودے چکا لئے جائیں۔ نعمان فضلی ہمارے پارٹنر ہو گئے ہیں...... رات کو ان کی کیفیت دیکھ کر ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ کوثر جہاں کی آواز کا جادو ان پر پوری طرح اثر کر گیا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ہی واپس جانے والے تھے لیکن اب وہ یہاں رکیں گے اور ہم اس رکنے کی وجہ جانتے ہیں۔ ہم سے تو انہوں نے نہیں کہا لیکن ایک بات ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ اگر وہ یہاں آئیں تو ایسی پذیرائی ہونی چاہئے کہ وہ کوثر جہاں کے سحر سے نکل کر نہ جانے پائیں۔ ہم نے آپ سے بڑی آس لگائی ہوئی ہے۔ ہمارے مستقبل کا اور ماضی کا سوال ہے۔''

شمشیرہ بیگم کے دل میں لاکھوں چراغ روشن ہو گئے تھے، جلدی سے بولیں۔

''شیر علی! آپ نے ایک ذمہ داری ہمارے سپرد کی ہے جو دل و جان سے پوری کی جائے گی۔ آپ اطمینان رکھیں۔''

شیر علی کی باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے جیب سے ایک مخملی ڈبیا نکالی اور اسے شمشیرہ بیگم کے سامنے پیش کرتے ہوئے بولے۔

''یہ ہیرے کے آویزے ہیں...... قبول فرمایئے۔''

''سب کچھ تو آپ ہی کا ہے...... اس کی کیا ضرورت تھی؟''

''ہماری خوشی ہے......''

شمشیرہ بیگم نے ڈبیا ان کے ہاتھ سے لے لی۔ شیر علی کہنے لگے۔ ''اچھا تو پھر ہم چلتے ہیں۔''

''اللہ نگہبان۔'' شمشیرہ بیگم بولیں اور شیر علی چلے گئے۔ لیکن شمشیرہ بیگم کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کی گہرائی کا کوئی جواب نہیں تھا اور بات بالکل سچ تھی۔ شام ہوئی، محفل سجی اور شیر علی کا کہنا غلط ثابت نہ ہوا۔ فضلی صاحب سلک کا خوبصورت لباس زیب تن کیے ہوئے، لجائے، شرمائے اندر آ گئے۔ ان کا واقعی پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا تھا۔

''کہیے...... مزاج تو بخیر ہیں...... آپ تو شیر علی کے ساتھ واپس جا رہے تھے؟''

''جی ہاں...... کچھ ضروری کاموں کی وجہ سے رکنا پڑا۔ میری آمد ناگوار تو نہیں گزری آپ کو؟''

''کیسی باتیں کرتے ہیں فضلی صاحب، آپ کے آنے سے دل کو جو خوشی ہوئی ہے وہ

بیان نہیں کی جا سکتی۔ آج آپ غزالہ اور شبانہ کو بھی سنیئے اور اگر آپ کا حکم ہوا تو کوثر جہاں بھی آپ کے ذوق کی تسکین کرے گی۔''

بہر حال اس کے بعد محفل کا آغاز ہوا...... اور بڑی حسین محفل جمی۔ مہ جبیں کو ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس کے لئے خاص طور پر فرمائش کی گئی تھی۔ بہر حال کوثر جہاں کا تعاون تو شمشیرہ بیگم کے ساتھ تھا۔ ایسی آواز کی ساحری کی کہ نعمان فضلی حواس باختہ ہو گئے۔ انہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا۔ اس سے پہلے انہیں آواز اور انداز کے ایسے جادو کا تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا اور یہ جادو ایسے سر چڑھ کر بولا کہ نعمان فضلی نے لاہور ہی میں ڈیرے ڈال لئے۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ شیر علی ساری تفصیل بتا گئے تھے۔ شمشیرہ بیگم کو تو ایسے ہی شکار درکار ہوتے تھے۔ ایسا جال ڈالا فضلی صاحب پر کہ پھنس کر رہ گئے اور دولت برق رفتاری سے شمشیرہ بیگم کے پاس منتقل ہونے لگی۔

کوثر جہاں اب اتنی دھرماتما بھی نہیں تھی کہ ماں کے مشن سے روگردانی کرتی۔ اداؤں کی سوداگری ہوتی رہی، راوی کنارے ایک انتہائی خوبصورت اسکیم میں کنالوں زمین خرید لی گئی۔ کوثر جہاں کے نام سے ایک اور شاندار کوٹھی کی تعمیر ہونے لگی اور فضلی صاحب عموماً شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر نظر آنے لگے۔ بہت سے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ ان میں احسان مغل پیش پیش تھے۔ سب سے زیادہ اثر انہی پر ہوا تھا۔ دل کا بخار اتارنے پر تُل گئے اور نعمان فضلی کے خلاف جاسوسی شروع کر دی۔ کافی کوششیں کر کے انہوں نے زبردست معلومات حاصل کر لیں۔ نعمان فضلی کا تو جیسے اس گھر پر اختیار ہو گیا تھا۔ فضلی صاحب کے بارے میں پوری اسکیم سوچ لی۔ چنانچہ تیاریاں مکمل کر کے کام شروع کر دیا اور آخر کار فضلی ہاؤس پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے کوششیں کیں اور آخر کار احسان مغل اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے۔ ایک ایسے فرد کا سہارا لیا تھا جس سے کہیں نہ کہیں سیار اللہ نکال لی تھی۔ یہ چوہدری بدرالدین تھے جنہیں فضلی خاندان کے بارے میں تمام معلومات حاصل تھیں۔ چوہدری بدرالدین نے فضلی صاحب کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... ان کا نام سبحان فضلی ہے اور ان کے بیٹے کا نام نعمان۔''

''کیا آپ انہیں جانتے ہیں چوہدری صاحب؟''

''ہاں کیوں نہیں۔ خاندانی دوستی ہے۔ باپ دادا کے زمانے سے ہمارا تو گھر آنا جانا

ہے۔ فضلی صاحب کی بیوی بڑی اللہ والی ہیں۔ بہت نیک اور شریف خاتون۔"

"فضلی صاحب کے کوئی بھائی وغیرہ ہیں؟"

"نہیں...... یہ تین بہنوں کے اکلوتے بھائی ہیں۔"

"کسی بہن کی شادی ہو گئی؟"

"نہیں...... لیکن تینوں سیانی ہو گئی ہیں ماشاء اللہ۔"

"مالی حالات کیسے ہیں؟"

"ایسے ویسے...... بہت بڑا کاروبار ہے۔ لیکن آپ یہ تحقیق کیوں کر رہے ہیں...... کوئی رشتے وغیرہ کی بات ہے کیا؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ لوگوں کے ایسے تعلقات ہیں تو یقیناً آپ کی نعمان فضلی صاحب سے بھی دوستی ہو گی۔"

"دوستی تو نہیں ہے...... ویسے بھی باپ کی دولت پر عیش کرنے والوں میں سے ہیں۔ خود کمائی ہوئی دولت کبھی کبھی انسان کو انسان بھی رکھ لیتی ہے۔ لیکن ماں باپ کی چھوڑی ہوئی دولت دماغوں میں خرابی پیدا کر دیتی ہے۔ ہاں، ان کی والدہ بے چاری بہت اچھی۔ آج بھی اسی طرح ملتی ہیں۔"

"اچھا آپ ایک بات بتائیے، شیر علی نامی کسی شخص کو جانتے ہیں؟"

"بڑی واقفیت ہے آپ کی۔ یہ شیر علی صاحب تو آج کل فضلی صاحب کے پارٹنر ہیں۔"

"کیسے آدمی ہیں یہ؟"

"بس ذرا دو نمبر کے ہیں، عیاش طبع ہیں۔ طوائفوں کے چکر میں رہتے ہیں۔ کئی بار پولیس کے جال میں بھی پھنسے ہیں۔ لے دے کر بچے ہیں۔ ویسے فضلی کی والدہ کو نعمان کی شیر علی کے ساتھ دوستی پسند نہیں ہے۔"

"اچھا، شیر علی سے آپ کے کیسے تعلقات ہیں؟"

"بھئی سیدھی سیدھی سی بات ہے، ہم لوگ ان کی برابری تو نہیں کر سکتے۔"

"میں فضلی صاحب کی والدہ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں اور آپ کو بھی اتنا بتاؤں گا کہ آپ کو اگر ان سے ہمدردی ہے تو اس خاندان کو تباہی سے بچائیے۔"

"ایں......؟" بدرالدین صاحب اچھل پڑے۔

"ہاں...... اگر آپ پسند کریں تو میری ملاقات کرا دیں ان سے۔ ان کے سامنے ساری تفصیل آپ کو بتاؤں گا۔"

"جب جی چاہے چلو۔"

اور اسی شام چوہدری بدرالدین، احسان مغل کو ایک انتہائی خوبصورت کوٹھی میں لے گئے۔ بڑی ماں کمرے کے دروازے کے پیچھے آ گئیں۔ انہیں خبر بھجوا دی گئی تھی کہ چوہدری صاحب ملنے آئے ہیں۔"

"کہئے چوہدری صاحب، کیسے آنا ہوا؟"

"یہ احسان مغل ہیں، لاہور سے آئے ہیں۔ آپ سے خاص طور سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"بات صرف اتنی سی ہے کہ میں بھی بہن بھائیوں والا ہوں...... مجھے پتہ چلا کہ نعمان آپ کے اکلوتے بیٹے ہیں تو دل نہ مانا اور آپ کو کچھ بتانے حاضر ہو گیا۔ بات ذرا پریشانی کی ہے۔"

"مولا خیر کرے، کیا ہوا؟"

"کیا آپ یہ بتا سکتی ہیں کہ وہ شیر علی کے ساتھ لاہور کیوں گئے تھے؟"

"کچھ کاروبار کر رہے ہیں ان کے ساتھ مل کر۔ سات دن کا کہہ کر گئے تھے، اب ایک مہینہ ہونے کو آیا ہے۔ شیر علی نے بتایا کہ کسی ضروری کام سے رک گئے ہیں۔"

"ہوں...... میں سمجھ گیا، یہ شیر علی کی کارستانی ہے۔" احسان مغل نے کہا۔

"میاں، بھائی میاں مجھے بتاؤ تو سہی کہ بات کیا ہے؟"

"نعمان فضلی کو لاہور میں کوئی کام نہیں ہے۔ آج کل وہ ہیرا منڈی کے کوٹھے پر پڑے رہتے ہیں۔ کوثر جہاں نامی ایک طوائف ہے، اس کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ جائیدادیں خریدی ہیں، کوٹھیاں بنوا رہے ہیں۔ اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ شیر علی انہیں پہلی بار کوٹھے پر لے کر گئے تھے۔ مگر ایک بات آپ سن لیں کہ میرا نام بیچ میں نہ آئے۔"

نعمان فضلی کی والدہ کے ہاتھوں کے تو جیسے طوطے اڑ گئے۔ بین کرنے لگیں، سینہ پیٹنے لگیں۔ "ہائے میں لٹ گئی...... میں برباد ہو گئی۔ ارے شیر علی، اللہ تجھے تباہ و برباد کر دے۔ تجھے موت مروڑ کر لے جائے۔ مجھے پتہ تھا کہ سانپ ڈسے بغیر نہیں رہے گا۔"

’’حوصلے سے کام لیں بیگم صاحبہ! کوئی تدبیر کریں۔ ورنہ پریشانی اٹھانی پڑے گی۔‘‘

’’ارے میں کیا کروں...... کون بچائے گا میرے بچے کو؟‘‘

تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر بیگم صاحبہ نے خود کو سنبھالا اور بولیں۔

’’تمہارا شکریہ بیٹے! خدا تمہیں خوش رکھے۔ دیکھتی ہوں کیا کر سکتی ہوں۔‘‘

احسان مغل اپنا کام کر کے واپس آ گئے تھے۔ اچھا داؤ مارا تھا اور اب نتیجہ زیادہ دور نہیں تھا۔

○●○

اکرام کی ساری جھجک نکل گئی تھی۔ اب وہ بڑے اعتماد کے ساتھ رب نواز کی رہائش گاہ پر جاتا تھا۔ رب نواز اور اس کے ساتھی محلے میں مقبول ہوتے جا رہے تھے اور لوگ انہیں پسند کرتے تھے۔ بنیادی وجہ یہ تھی کہ فراخ دل اور فراخ ہاتھ رکھتے تھے۔ ہر ایک کی طلب پر کچھ نہ کچھ اس کے حوالے کر دینے والے۔ کسی نے کچھ کہا تو شاہ جی کا ہاتھ جیب میں گیا اور باہر آیا تو مشکل حل ہو گئی۔

ادھر اکرام کی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ شاہ جی نے اس کے لئے ایک ماسٹر کا انتظام کیا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ بچے کو تیار کر دے کیونکہ اسے سکول میں داخل ہونا ہے۔ اکرام کے قیمتی لباس ابھی تک نگاہوں میں نہیں آئے تھے اور بالکل اتفاق کی بات تھی کہ کئی دن سے شمشیرہ بیگم بھی بیمار پڑی ہوئی تھیں۔ نزلہ زکام ہوا تھا اور بخار آ گیا تھا۔ ناز ونخرے آسمان پر پہنچے ہوئے تھے۔ کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ کوٹھے کے معاملات کوثر جہاں ہی سنبھالتی تھی کیونکہ سب سے بڑی تھی۔ البتہ کوثر جہاں نے اکرام کی شان وشوکت دیکھی تھی۔ اس سے سوال کیا تھا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ہنستا ہوا باہر بھاگ گیا تھا۔ پھر شمشیرہ بیگم کو بھی پہلی بار اکرام کا نظارہ ہوا تو وہ ایک لمحے کے لئے حیران رہ گئیں۔ اور پھر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

’’حاجو! یہ سب میں کیا دیکھ رہی ہوں...... یہ سب کس کے چونچلے ہیں...... میری چار دن کی بیماری میں کوثر جہاں نے بیٹے کو راج رجانا شروع کر دیئے۔ میں کہتی ہوں اس کی گنجائش کیا ہے؟‘‘

’’ہم تو حکم کے بندے ہیں بیگم جی...... زبان کھولیں تو گردن کٹ جائے۔ پر ایسا ہوتا

نہیں ہے۔ کوٹھوں کی بھی کچھ عزت ہوتی ہے۔ یہ لڑکا جس طرح کوٹھوں کی عزت نیلام کر رہا ہے، کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔‘‘

’’مطلب؟‘‘

’’وہ ایک دن آئے تھے نا۔ نام تو پتہ نہیں کیا ہے، لوگ شاہ جی، شاہ جی کہتے ہیں۔ بری نظر کے مالک ہیں۔ اکرام زیادہ تر انہی کے اڈے پر دیکھا جاتا ہے۔‘‘

’’ہیں...... توبہ، توبہ...... ارے کوثر جہاں! ذرا ادھر آؤ۔ دیکھو اپنے لال کے کرتوت۔ بھیا خوب ہمارے گھرانے کا نام روشن کر دیا اس نے تو۔ اور سر پر بٹھاؤ۔‘‘ شمشیرہ بیگم شعلوں کی طرح بھڑک رہی تھیں۔ کوثر جہاں نے یہ سب کچھ سنا۔ دیکھ تو رہی تھی کچھ روز سے لیکن توجہ نہیں گئی تھی ان باتوں پر۔ اس نے اکرام کو بلایا۔

’’ادھر آ...... یہ کپڑے کہاں سے آئے؟‘‘

’’چوری کے نہیں ہیں باجی۔ اطمینان رکھو۔‘‘

’’بتاتے کیوں نہیں، معشوقی میں آ گئے ہو شاہ کی جی؟‘‘

’’تم سے مطلب۔‘‘

’’جوتی اتاروں، اتنی لگاؤں گا چندیا پر کہ سارے بال اُڑ جائیں گے۔‘‘

’’ارے حاجو! ذرا دماغ ٹھیک کر اس کمینے جنے کا۔‘‘ شمشیرہ بیگم نے گرج کر کہا اور حاجو نے پاؤں کی جوتی نکالی۔

’’سارے محلے میں بدنام کر دیا ہے ہمیں......‘‘ یہ کہہ کر اکرام پر جوتا تانا۔ اکرام تیزی سے پیچھے ہٹا اور دوسرے لمحے اس کا ہاتھ سامنے آ گیا۔ گراری کے گھومنے کی آواز سنائی دی اور چاقو کا پھل نظر آنے لگا......

’’انتڑیاں نکال کر کندھوں پر ڈال دوں گا۔ ایک منٹ میں یہ جوتی نیچے ڈال دے۔‘‘

یہ الفاظ کیا تھے، بم کا دھماکہ تھا...... خوفناک چاقو کی چمک دیکھ کر حاجو پھدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ باقی افراد کا سانس بند ہو گیا تھا۔ اکرام کی آنکھوں میں خون کی سرخی تھی اور وہ ایک ایک کو گھور رہا تھا۔

’’سب لوگ ہوش میں آ جاؤ...... ورنہ ناکیں کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ سمجھے تم لوگ؟‘‘ وہ بولا اور غرائے ہوئے لہجے میں باہر نکل گیا۔

اس کے باہر جاتے ہی شمشیرہ بیگم نے بین شروع کر دیا۔

"اور چڑھالو بی بی سر پر...... یہی کرانا تھا بیٹے سے۔ ارے آن ہوتی ہے، ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔ ایسے کوٹھے بدنام نہیں ہوتے۔ ارے خدا نے غارت کیوں نہ کر دیا اس دن کو جب یہ اس دنیا میں آیا۔"

اچانک ہی کوثر جہاں بپھر کر کھڑی ہو گئی۔ "زبان ذرا بند کرو اماں! میں دیکھتی ہوں ذرا جا کر۔ حاجو...... حاجو کہاں مر گئے؟"

حاجو فوراً ہی سامنے پہنچ گیا۔

"چلو...... میں شاہ جی کے گھر جاؤں گی۔"

"کیا......؟" حاجو پھر اچھل پڑا۔ "بھیڑیوں کے بھٹ میں جائیں گی...... نہ بابا، بڑا مشکل کام ہے یہ۔ بڑے خونخوار آدمی ہیں۔"

"بھیڑیوں کے بھٹ میں تو زندگی گزر گئی ہے حاجو۔ میرے ساتھ چل کے مجھے راستہ بتا دو۔"

"ٹھیک ہے جی...... ٹھیک ہے۔ مگر کچھ ہو گیا تو آپ خود ذمہ دار ہوں گی۔"

"ہاں، میں ذمہ دار ہوں گی۔" کوثر جہاں غصے میں بپھری ہوئی شاہ جی کے گھر کی جانب چل پڑی۔ تھوڑا فاصلہ تو بپھرے ہوئے انداز میں طے کیا لیکن اس کے بعد دل میں ایک خوف کا احساس جاگا۔ کسی رئیس کی حویلی میں مجرے کا بلاوا ہوتا تو وہ اتنا نہ گھبراتی۔ لیکن نجانے کیوں اب ایک حجاب سا تھا۔

"وہ ہے دروازہ جی۔"

"ٹھیک ہے...... دفع ہو جاؤ۔ میں آ جاؤں گی۔"

"میں وہاں کھمبے کے پاس کھڑا ہوا ہوں۔"

"جاؤ۔" کوثر جہاں غرائی اور حاجو گردن کھجا کر واپس چل پڑا۔

احاطے کے دروازے کے کواڑ آدھے بھڑے ہوئے تھے۔ کوثر جہاں نے انہیں تھوڑا سا دھکیلا تو اندر کا منظر نظر آیا۔ برآمدے میں ایک منجی بچھی ہوئی تھی جس پر لاچے کرتے میں ملبوس شاہ جی نیم دراز تھے۔ سامنے ایک نہایت خوبصورت اور قیمتی حقہ رکھا ہوا تھا۔ برابر کی منجی پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے جن کے سامنے ٹوپی پہنے ہوئے اکرام نظر آ رہا تھا۔

درمیان میں کتابیں پڑی ہوئی تھیں اور اکرام ہل ہل کر کچھ پڑھ رہا تھا۔ بزرگ اسے سمجھاتے جا رہے تھے۔ یہ منظر کوثر جہاں کے لئے اتنا حیران کن تھا کہ وہ ساکت رہ گئی۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسی وقت شاہ جی کی آواز ابھری۔

"استاد جی! کوئی ایسی ترکیب بھی ہے کہ یہ ساری کتابیں انسان کو گھول کر پلا دی جائیں؟"

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے شاہ جی! یہ بچہ ماشاء اللہ اتنا ذہین ہے کہ آپ ذرا دیکھتے تو رہئے، بس بہت مختصر وقت میں کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ اتنے دن تک اس کی تعلیم سے کیوں غفلت برتی گئی۔ اسے پڑھاتے ہوئے جی بڑا خوش ہوتا ہے۔"

"بس یوں سمجھ لیں مولوی صاحب کہ یہ اپنا لال محل ہے۔ یہ لال محل تعمیر ہو جائے تو آپ کی زندگی بھی بن جائے گی۔ جتنی جلدی ہو سکے اسے اتنا چلا دیں کہ میں اسے سکول میں داخل کرا سکوں۔"

"انشاء اللہ...... انشاء اللہ۔ ہاں بیٹے، چلو آگے چلو۔"

کوثر جہاں جیسے زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہو گئی تھی۔ کیا سوچ کر آئی تھی اور کیا دیکھ رہی تھی۔ کون ہے یہ آسمان کا باسی...... کون ہے یہ فرشتہ جس پر بد اعمال لوگ کیچڑ اچھال رہے ہیں...... اتفاق سے چادر ڈھلکی تو اس نے پلو سنبھالا اور ہاتھ کواڑ سے جا لگا جس سے چوڑیاں بجیں تو شاہ جی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور جلدی سے سنبھل کر ٹھیک ہو گئے۔

"کون ہو بی بی...... اندر آ جاؤ، کوئی کام ہے ہم سے...... آ جاؤ، آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ، گھبراؤ نہیں۔ جو کام ہو ہمیں بتاؤ۔"

کوثر جہاں جھجکتے قدموں سے آگے بڑھیں تو اکرام کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں اور گھبرا کر اس کے منہ سے نکلا۔

"ب...... بائی......"

"پڑھو...... تم پڑھو۔ بس ایسے ہی دیکھنے آ گئی تھی۔" کوثر جہاں کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "معاف کیجئے......" اس سے آگے حلق سے بات نہیں نکل سکی تھی۔

"ارے...... ارے...... اچھا، اچھا...... آپ ہمارے بیٹے کی والدہ ہیں۔ باجی ہیں آپ اس کی۔"

"نہیں...... میں اس کی ماں ہوں۔" کوثر جہاں نے کہا۔

"ارے نہیں، اس تکلف کی کیا ضرورت ہے کوثر جہاں! آپ تو اس کی باجی ہیں۔ اس نے ہمیں یہی بتایا تھا کہ گھر میں ننوں ہیں، باجی غزالہ ہیں، باجی شبانہ ہیں اور دوسرے لوگ بھی ہیں۔ ماں کا تذکرہ اس نے کبھی نہیں کیا اور کرنا بھی نہیں چاہئے تھا اسے۔ مائیں تو کوٹھیوں میں ہوتی ہیں، گھروں میں ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ جھونپڑیوں میں ہوتی ہیں...... اور کوٹھوں پر تو......" رب نواز نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ کوثر جہاں کا گلا بند ہوا جا رہا تھا۔ رب نواز کے الفاظ برچھی کی طرح دل پر لگ رہے تھے۔ رب نواز نے فوراً ہی پست لہجے میں کہا۔

"معاف کیجئے گا...... کچھ زیادہ بول گئے ہم۔ مگر ایک بات اور کہہ دیں، یہ بچہ جو ہے نا یہ آپ کی دنیا کا باشندہ نہیں ہے۔ اس کا تعلق کسی اور دنیا سے ہے اور ایک دن یہ ضرور اپنی دنیا میں واپس لوٹ جائے گا۔"

کوثر جہاں کے حلق سے آواز نکلی۔ "دوسری دنیا کے لوگ کیا ایک دن اپنی دنیا میں ضرور واپس لوٹ جاتے ہیں؟"

انوکھا سوال تھا، ناقابل فہم بھی۔ رب نواز کئی اور سوال کرنا چاہتے تھے کہ کوثر جہاں واپس مڑی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی گھر میں داخل ہوگئی۔ حاجو، شمشیرہ بیگم کی شان میں قصیدہ خوانی کر رہا تھا اور شمشیرہ بیگم آگ بگولا بنی ہوئی تھیں...... کوثر جہاں کو دیکھ کر بولیں۔

"ادھر آؤ...... کدھر گئی تھیں؟"

"انہوں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"کیوں گئی تھی؟"

"آپ لوگوں کے شبہات کی تصدیق کرنے۔"

"کس کی اجازت سے......؟" شمشیرہ بیگم بولیں اور کوثر جہاں کا چہرہ بھبوکا ہو گیا۔

"میں کسی محل سرا کی کنیز نہیں ہوں...... سمجھ رہی ہیں آپ؟"

"کس کی زبان بول رہی ہو بی بی...... کس یار کی یاری نے یہ زبان دی ہے تمہیں...... مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔" شمشیرہ بیگم نے سفاک لہجے میں کہا۔

"بہت وقت گزر چکا ہے اماں...... وقت کے ساتھ چلنا سیکھیں ورنہ ایسی ٹھوکر کھائیں گی کہ چہرہ بگڑ جائے گا۔" یہ کہہ کر کوثر جہاں اندر کی جانب چلی گئی۔ پیچھے سے حاجو کی آواز سنائی دی۔

"یہی تو ہمیں ڈر تھا شمشیرہ بیگم! حالات ضرورت سے زیادہ بگڑ چکے ہیں۔ ماں بیٹے نے نیا کھیل شروع کیا ہے۔"

ادھر کوثر جہاں اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر گر پڑی تھی۔ بے شمار الجھی لکیریں دماغ میں گردش کر رہی تھیں...... یہ گندگی کھانے والے، گندگی پینے والے اس سے زیادہ اور سوچ بھی کیا سکتے ہیں...... ہائے میرا اکرام اتنے اچھے لباس میں کتنی خوشی سے بیٹھا پڑھ رہا تھا...... کیسا فرشتہ صفت آدمی تھا۔ اس کے الفاظ کوثر جہاں کے کانوں میں سلگنے لگے۔

"نہیں...... میں برا نہیں مانوں گی۔"

اسی وقت دروازے پر کسی کا سایہ نظر آیا اور وہ چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ شمشیرہ بیگم اندر آ گئی تھیں غالباً کوئی نیا پینترا سوچ کر۔

"بی بی! خون تو میرا ہے اس میں تم کیا جانو کون ہے وہ شاہ جی، ارے بڑے بڑے رنگے سیاد آتے ہیں۔ اور ہائے، تم نے دیکھا نہیں کیسا چاقو نکال لیا تھا حاجو میاں پر۔ دیکھو تم حالات کو سنبھالو۔"

"آپ صرف اپنا کام کریں۔ مجھے اپنا کام کرنے دیں۔ ورنہ نقصان اٹھائیں گی۔"

"یہی تو خطرہ تھا بی بی...... یہی تو خطرہ تھا۔" شمشیرہ بیگم نے کہا۔ کچھ دیر وہاں کھڑی سوچتی رہیں اور اس کے بعد باہر نکل آئیں۔ غلام شاہ سے کہا تو غلام شاہ بولا۔

"ہاں، سب کچھ دیکھ رہے ہیں بھائی۔ سارا گھر بھنڈک بنا پڑا ہے اور صاحب زادے نوک پلک سنوار کر نکل جاتے ہیں۔ ارے بڑے دیکھے ہیں فرشتے۔ تم دیکھ لینا کوئی بہت بڑی بات سامنے آئے گی۔"

"غلام شاہ! حاجو تو اس کے چاقو سے ڈر گیا۔ تم بتاؤ، تم کیا کر سکتے ہو؟"

"دیکھتے ہیں...... دیکھتے ہیں۔ ویسے سب کو جان عزیز ہوتی ہے۔ وہ لوگ کوئی اچھے

لوگ نہیں معلوم ہوتے۔"

"تو پھر ایک بات بتاؤ۔ وہ حرام خور گو گیا کس کام آئے گا...... اسے بلاؤ اور سامان پھنکواؤ ان کا باہر۔ جا کر بات کرو اس سے۔ ہم رقمیں دیتے ہیں اسے، ایسے بے یار و مددگار چھوڑ دے گا ہمیں؟"

"چلو ٹھیک ہے، کرتے ہیں کچھ۔"

شمشیرہ بیگم سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ پھر کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا۔

"مگر رکو...... تھوڑا سا سوچ سمجھ کر چلنا چاہئے۔ بلاوجہ ہم لوگ اتنے زیادہ غصے میں ڈوب گئے ہیں۔ انہیں نکالنے کے لئے ذرا چالاکی سے کام کرنا پڑے گا۔ میں بتاؤں گی تمہیں کیا کرنا ہے۔ ابھی میں ایک نیا بکرا ذبح کر رہی ہوں۔"

"کون...... نعمان فضلی؟"

"اے ذرا آواز کو قابو میں کرو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" شمشیرہ بیگم نے کہا اور غلام شاہ مسکرانے لگے۔

○●○

نظام الدین کی صحت کافی خراب رہنے لگی تھی۔ بھائی کسی بھی طرح چوہدری صاحب سے فرنٹ نہیں تھے بلکہ سچی بات یہ ہے، سب کے سب ان کا خیال رکھتے تھے۔ ظہیر الدین کوئی تین سال تک تو بالکل روپوش رہے، اپنی بدکاریوں کی وجہ سے جو حصہ ملا تھا، وہ سب کھو کر بیٹھ گئے تھے۔ ذرا ناک والے تھے، بھائیوں کے پاس نہیں آئے۔ البتہ جب خبر ملی کہ چوبرجی پر فقیر بنے پڑے رہتے ہیں، طوائفوں کے محلے سے اب ان کا گزر بھی نہیں ہوتا تو بھائیوں ہی کو رحم آیا۔ بڑے بھائی سے مشورہ کیا تو نظام الدین نے روتے ہوئے کہا۔

"میرا بیٹا چھین لیا ظہیر الدین نے...... اس کے پاس تو چھیننے کو بھی کچھ نہیں ہے۔ بہرحال دیکھ لو تم لوگ۔ اماں جی کی روح کو تکلیف ہو رہی ہو گی بیٹے کو اس حال میں دیکھ کر۔ ہم ان پر تو سختی نہیں کر سکتے۔ جو مناسب ہو کرو۔ مجھے اعتراض نہیں ہے۔"

چنانچہ ظہیر الدین کو گھر لے آیا گیا اور ایک گوشہ دے دیا گیا۔ پھر اس کے بعد وقت گزرتا گیا۔ شمس الدین کے بارے میں مکمل اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ ڈاکٹر بن چکے تھے اور کسی مخصوص شعبے میں اسپیشلائزیشن کر لی تھی۔ اب اس کے بعد ان کے ملک سے باہر رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ نظام الدین نے ان کے لئے ایک دیہی علاقے میں شاندار کلینک بنوا لیا۔ بیٹے کو اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ وہ اسے سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ اور جب کلینک مکمل ہو گیا تو انہوں نے آرزو بھری آواز میں کہا۔

"جاؤ...... لے آؤ اب اسے۔ جدائی کی گھڑیاں ختم ہو گئی ہیں۔ میں اسے اس کا منصب سونپ دینا چاہتا ہوں۔"

منجھلے بھائی شہاب الدین لندن پہنچ گئے۔ یہاں پہنچنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ لندن کے ایک انتہائی شاندار ہسپتال میں ڈاکٹر شمس الدین کا نام بڑی شہرت کا حامل ہے...... شمس الدین سے ملے، شخصیت ہی بدل لی تھی اس نے۔ چہرہ تو پہلے ہی بے پناہ دلکشی کا حامل تھا،

فرنچ کٹ داڑھی اور گھنی مونچھوں نے قیامت ڈھا دی تھی۔ بہرحال چچا سے مل کر بہت
خوش ہوئے تو شہاب الدین نے کہا۔
"بیٹے! میں تمہیں واپس لینے آیا ہوں۔ کافی رہ لئے انگلینڈ میں...... اب اپنا گھر آباد
کرو۔ یہاں سے زیادہ پاکستان کو تمہاری ضرورت ہے۔"
"خدا پاکستان کو مجھ سے ہزار گنا قابل ہزاروں ڈاکٹر نصیب کرے۔ مجھے یہیں رہنے
دیں چچا جان۔"
"کیا مطلب...... کیسی باتیں کرتے ہو؟" شہاب الدین نے کہا۔
"میں یہاں سے کہیں نہیں جانا چاہتا۔"
"تو کیا ساری زندگی یہیں پر گزار دو گے؟"
"ہاں......" شمس الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"لیکن کیوں......؟"
"بس چچا جان...... بہت محترم ہیں آپ میرے لئے۔ لیکن زندگی کے کچھ پہلو ایسے
ہوتے ہیں جنہیں زبان تک نہیں لایا جا سکتا۔ آپ کا بہت شکریہ، میں یہاں مطمئن ہوں۔"
"کوئی شادی وادی کر لی ہے کیا؟"
"میں نے کبھی آپ کی شان میں گستاخی نہیں کی۔ آپ مجھے گالیاں دینا چاہتے ہیں تو یہ
شوق پورا کر لیں، آپ کو حق ہے اس کا۔"
شہاب الدین ایک دم شرمندہ ہو گئے۔ کہنے لگے۔ "غلطی ہو گئی مجھ سے...... واقعی مجھے
اس طرح یہ جملے استعمال نہیں کرنے چاہئے تھے۔ لیکن یقین کرو یہ میں نے صرف ازراہِ
مذاق کہا ہے۔"
"کوئی بات نہیں...... مذاق کیا، میں تو سنجیدگی کا بھی برا نہیں مانتا۔ ایسی کوئی بات نہیں
ہے، کبھی بھی ایسا نہیں کروں گا۔ بہرحال میرا ایک خاندانی وقار ہے۔ ہمارے ہاں جس
انداز میں سب کچھ ہوتا ہے میں اس انداز میں کبھی بھی تبدیلی نہیں کروں گا۔ اگر کبھی شادی
کی یا کبھی شادی کا خیال دل میں آیا تو گھر آؤں گا، آپ لوگوں سے کہوں گا اور اس کے بعد
ایسا ہی کروں گا جیسے آپ سب نے کیا ہے۔"
"بھئی اب یہ مذاق ختم کرو اور چلنے کی تیاریاں کرو۔"

"کاش یہ مذاق ہی ہوتا۔"
شہاب الدین اپنی ہر کوشش میں ناکام رہے تھے۔ نظام الدین کو جب یہ بات معلوم
ہوئی تو آگ بگولا ہو گئے۔
"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... ہم بھی دیکھیں گے کب تک ناک لگاتے ہیں۔ ہم
جانتے ہیں کہ انہوں نے وطن واپس آنے سے کیوں انکار کیا ہے، قصوروار نہیں مانتے انہیں
اس لئے کہ ساری آگ ظہیر الدین کی لگائی ہوئی ہے۔ مگر اب تو وہ سمجھ دار ہو چکے ہیں،
ڈاکٹر بن چکے ہیں۔ سمجھ داری سے کام لینا چاہئے تھا انہیں۔"
مزید کچھ وقت گزر گیا۔ پھر نظام الدین کو احساس ہوا کہ کیا وہ واقعی بیٹے کو کھو چکے ہیں؟
مضطرب رہنے لگے...... شمس الدین کو واپس لانے کے لئے کچھ اور کوششیں کی گئیں لیکن وہ
اپنے موقف میں سخت تھا۔ اور اندازہ یہ ہو گیا کہ اس کی واپسی ممکن نہیں ہے۔
وقت گزرتا رہا۔ تقریباً گیارہ بارہ سال ہو گئے تھے اور شمس الدین کے انداز میں کوئی
نرمی نہیں آئی تھی۔ رابطے ہوتے رہتے تھے لیکن شمس الدین کا فیصلہ اٹل تھا۔ باپ نے ہر
طرح کی کوششیں کر لی تھیں اور آخر کار نظام الدین صاحب خود یورپ پہنچ گئے۔ بیٹے کے
بالوں میں چاندی کے تار نظر آنے لگے تھے۔ باپ بیٹا آمنے سامنے ہوئے۔ شمس الدین
نگاہیں جھکائے بیٹھے تھے۔
"یہ ناراضگی آخر کیسی ہے؟"
"ناراضگی نہیں ہے، آپ یقین کیجئے ابا جی۔"
"تو پھر وطن واپسی سے گریز کیوں کرتے رہے ہو اب تک؟"
"آپ کے سامنے زبان نہیں کھولنا چاہتا۔"
"اگر میرے حکم کی کوئی حیثیت ہے تو میں حکم دیتا ہوں کہ مجھے بتاؤ۔"
"چچا ظہیر الدین مجھے کہیں لے گئے تھے، مجھے دھوکے سے شراب پلائی گئی اور اس کے
بعد مجھے کسی کی آغوش میں پہنچا دیا گیا۔ باپ ہیں آپ میرے لیکن آپ کے حکم کی تعمیل کر
رہا ہوں۔ آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ یورپ کے رنگوں میں مست نہ ہو جاؤں، اُس وقت
بھی اور آج بھی آپ میرے کردار کی تحقیق کرا سکتے ہیں۔ وہ شراب جو دھوکے سے مجھے
پلائی گئی تھی اور وہ ایک وجود جسے کوئی گندا لفظ دے کر میں قیامت تک اس کی توہین نہیں کر

سکتا مجھ تک پہنچا دیا گیا تھا، وہ میری زندگی کا پہلا اور آخری مرحلہ تھا۔ میں نے اس سے پہلے یا اس کے بعد نہ شراب اور نہ کسی ایسے وجود کو اپنے قریب آنے دیا۔ میں نے آپ کے خون سے ایک کردار تعمیر کیا۔ برائی یورپ نے مجھ پر نہیں لادی بلکہ میرے اپنے وطن میں میرے ساتھ یہ ناانصافی کی گئی۔ میں وہاں نہیں جانا چاہتا کیونکہ مجھے وہاں جانے کے بعد اپنا ماضی یاد آئے گا اور میں ہوسکتا ہے دوبارہ کسی کی مدد کے بغیر وہاں جا پہنچوں کیونکہ میں اپنے وجود کی ساری دلکشی وہاں چھوڑ آیا ہوں۔ معافی چاہتا ہوں۔ اس گستاخی پر بھی شاید کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کرسکوں۔"

"مگر اس کا کوئی حل تو ہونا چاہئے۔" نظام الدین نے کہا۔

"حل ہے......" شمس الدین پتھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جہاں تک میرا علم ہے ہیرا منڈی میں ہیرے فروخت ہوتے ہیں، انسانی شکل میں...... میں چاہتا ہوں کہ اگر کسی کو میرا شریک حیات بنایا جائے تو یہ وہی خاتون ہوں اور انہیں ہی میرا شریک حیات بنایا جائے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں ایک نارمل زندگی گزاروں۔"

نظام الدین اس بری طرح حواس باختہ ہوئے کہ جھنجھنا کر رہ گئے۔ دیر تک سکرات کے عالم میں ڈوبے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"وہ ایک طوائف زادی ہے...... حالانکہ میں اسے جانتا بھی نہیں ہوں۔"

"میں بھی نہیں جانتا...... نہ پہلے جانتا تھا۔ وہ جو کوئی بھی ہے، میں اسی شرط پر پاکستان آ سکتا ہوں کہ اسے میری زندگی کا ایک حصہ بنا دیا جائے۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے...... ہمارے خاندان کے بارے میں جانتا ہے......؟"

شمس الدین نے گردن جھکا دی تھی۔

"تُو ایک طوائف زادی سے شادی کرے گا، بول......"

لیکن شمس الدین اس کے بعد نہیں بولا تھا۔ نظام الدین نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ آخر میں اس نے کہا۔

"بس آپ اپنے ہر قدم میں آزاد ہیں۔ مجھے لندن کے کسی چوک میں لے جائیے، اپنا جوتا اتاریئے اور مجھے اس وقت تک مارتے رہیئے جب تک زندہ رہوں۔ آپ کے سامنے گردن نہیں اٹھاؤں گا۔ لیکن اپنے موقف پر قائم ہوں۔"

نظام الدین کو شمس الدین کے منہ سے پتھر کے ٹکڑے گرتے محسوس ہوئے تھے اور انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ان پتھروں سے کبھی پانی نہیں نکلے گا چنانچہ صبر کر کے گھر واپس آ گئے تھے۔

○●○

وقت گزر رہا تھا...... اکرام کا وہی طور تھا۔ نہا دھو کر، کپڑے بدل کر باہر نکلنا اور شمشیرہ بیگم اسے دیکھ کر خون کے آنسو روتی رہتی تھیں۔ ویسے انہیں اور بھی بہت سے کام تھے۔ اکرام ان کی اکلوتی الجھن نہیں تھا۔ لیکن نئی نئی خبریں ملتی تھیں۔ اکرام نے گھر کے کام کاج بھی چھوڑ دیئے تھے۔ پہلے گھر کی صفائی اس کے ذمے تھی۔ لیکن اب کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

اس دن بھی وہ ہاتھ منہ دھو کر، کپڑے بدل کر باہر نکلا تو شبانہ نے شمشیرہ بیگم سے کہا۔

"اماں! تمہارا منہ کیوں بند ہو گیا ہے...... یہ اس کمبخت اکرام کو کیا ہو گیا ہے...... صبح ہوئی، گھر سے نکلا، رات کو کس وقت آتا ہے خبر ہی نہیں ہوتی۔ سارا گھر گندا پڑا ہوا ہے۔ اب بتائیے کہ گھر کی صفائی ستھرائی بھی کیا اب ہم ہی لوگ کریں گے؟"

"کیا بتاؤں بچی کیا ہوگا اس گھر کا...... ایک سانپ ہماری آنکھوں کے سامنے پھنکارتا پھر رہا ہے۔ ارے ڈسے گا...... اور ایسا ڈسے گا کہ پانی بھی نہیں مانگ سکیں گے ہم لوگ۔"

"بھاڑ میں جائے سانپ اور بھاڑ میں جائے سب کچھ...... میرے کمرے کی صفائی کون کرے گا؟"

"کرتی ہوں تلاش کسی کو۔ حاجو کو بھیجوں گی کسی نوکرانی کی تلاش میں۔ اب تک تو اس سے کام لیا جاتا تھا۔ مگر اب یہ لگتا ہے کہ یہ سانڈھ کچھ کر کے نہیں دے گا۔ خدا غارت کر دے اس رب نواز کو، نجانے کہاں سے آمرا اس محلے میں۔ کوئی اس حرامی کو پوچھنے والا نہیں ہے اور وہ کتیا کا جنا گویا بھی کہیں مر گیا ہے...... جھولی بھر کے رقم لیتا ہے اور مہینہ بھر ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ تھوڑا سا گزارا کر لو، کچھ نہ کچھ بندوبست کر دوں گی۔"

"یہ باجی کے بھی پَر نکلتے آ رہے ہیں آج کل۔ کسی بات پر اسے ٹوکتی ہی نہیں۔"

"برا وقت اسی طرح آتا ہے۔ کسی نئے رنگ ڈھنگ میں ہیں۔ مگر یہ بات نہیں جانتی کہ شمشیرہ بیگم کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ دیکھوں گی، کتنے پانی میں ہے۔"

اسی وقت غلام شاہ کسی کام سے اندر آ گیا۔

''ارے غلام شاہ! ادھر میری بات سنو۔'' شمشیرہ بیگم نے طنزیہ لہجے میں کہا اور غلام شاہ سامنے آ گیا۔

''ہاں بولو۔''

''کتنی روٹیاں کھاتے ہو صبح، دوپہر، شام؟''

''کیا ہو گیا شمشیرہ بیگم...... آٹا کم پڑ گیا کیا......؟'' غلام شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آٹا تو اللہ کے فضل سے بہت ہے مگر میں سب کے رنگ بدلے دیکھ رہی ہوں...... کوئی حلال کر کے نہیں کھا رہا۔ غلام شاہ! تم یہاں صرف طبلہ ڈھونکنے کے لئے نہیں رکھے گئے ہو۔ ہم نے تمہیں گھر کا ایک فرد بنا کر رکھا ہے۔ مگر لگ رہا ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑ رہا ہے۔ میں تو یہی دیکھ رہی ہوں۔''

''ہوا کیا شمشیرہ بیگم! میں تو بڑی خوشخبری لے کر آیا تھا تمہارے لئے۔''

''ارے اب مجھ موئی نصیبوں جلی کی قسمت میں خوشخبری کہاں ہے؟ ویسے لگتا ہے کہ تم بھی اس کے چاقو سے ڈر گئے۔''

''کس کے چاقو سے؟'' غلام شاہ نے چونک کر کہا۔

''ارے اسی سانپ کے بچے اکرام کے اور کس کے؟''

''خیر میں اس کے چاقو سے تو کیا ڈروں گا شمشیرہ بیگم! مگر اس نے جس کا ہاتھ پکڑا ہے اس آدمی کو جب اپنی عزت کا پاس نہیں تو کسی اور کی عزت کا کیا پاس کرے گا؟ ارے ہم لچے لفنگے نہیں ہیں، اس لئے لچے لفنگوں کو منہ بھی نہیں لگاتے۔''

''واہ، واہ...... غلام شاہ واہ...... چاہے گھر لٹ جائے۔''

''نہیں، گھر تو خیر کیا لٹے گا، عزت اگرچہ لٹ رہی ہے۔ لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کر دیا ہے۔ کہنے لگے ہیں کہ شمشیرہ بیگم تو مٹی سے بھی سونا نکالنا جانتی ہیں۔ ہر شے کا مصرف ہے ان کے پاس۔''

''جھاڑو پھرے کم بختی ماروں کو...... لفنگے لوگوں کو محلے میں بسا کیوں لیا ہے۔ کوئی پوچھتا کیوں نہیں ہے ان سے کہ لاچا کرتا پہن کر یہاں کہاں منکتے پھرتے ہو...... کیا کر رہے ہو اس محلے میں...... یہ تو کنجروں کا محلہ ہے، کنجر ہو تو سیدھی سیدھی دلالی کرو۔ ہمیں

سب کچھ کہہ رہے ہیں لیکن ان کے معاملے میں سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔''

''سب کو جان عزیز ہے شمشیرہ بیگم...... ان کی غنڈہ گردی کا مقابلہ کون کرے گا؟''

''پھر دیکھ لینا، سن گن لے رہا ہے یہاں کی۔ ایک دن دیکھنا ڈاکہ پڑے گا اور سب چھاتی پیٹتے رہ جائیں گے۔ ارے تم ایک کام تو کرو غلام شاہ۔''

''بولو...... بولو...... کیا؟''

''اس حرام کے جنے کو تلاش کرو جس کا نام گوگیا ہے۔ کہتا ہے اپنے آپ کو گوگیا پہلوان۔ اسے جا کر ذرا غیرت دلاؤ، اسے کہو کہ ہر مہینے ہیرا منڈی سے جھولیاں بھر بھر کے روپیہ لیتے ہو نا، اس لئے کہ محلے کی حفاظت کرو۔ اب ذرا اپنا کام بھی دکھاؤ۔''

''تم کہتی ہو تو چلا جاؤں گا...... سوچ لو۔''

''لوگوں کو سمجھاؤ کہ انہیں محلے سے بھگائیں۔ سبھی کو خطرہ ہے، ایک ہم اکیلے تو نہیں ہیں۔''

''کچھ کام دوسروں کے سپرد بھی تو کر دو۔ سارے کام میرے ہی سر پر ڈال دیتی ہو۔''

''ٹھیک ہے...... میں حاجو سے ہی کام کراؤں گی۔ دماغ پک کر رہ گیا ہے۔ ہاں، خوشخبری کیا سنا رہے تھے؟''

''کوٹھی دیکھ آیا ہوں، شاہدرہ میں راوی کنارے ایسی کوٹھی بنائی ہے کہ بس دیکھتے رہ جاؤ۔''

''میرے سر کی قسم کھاؤ۔''

''تمہارے سر کی قسم۔ میں کسی کام سے گیا تھا وہاں۔ ویسے میں تمہیں ایک مشورہ دوں، اس دن خود کہہ رہی تھیں کہ بعد میں محاذ قائم کریں گے۔ ذرا یہ بکرا حلال ہو جائے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے خود کوثر جہاں بیگم بھی اس سے متاثر ہیں۔ ذرا یہ کام ہو جانے دو۔ اگر ہم نے فوراً ہی کچھ کارروائی شروع کی تو کہیں ہتھے سے نہ اکھڑ جائے۔ کوثر جہاں بگڑ گئی تو فضلی صاحب کو ہاتھ سے نکال دے گی۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو غلام شاہ۔''

''اور پھر تم تو ایک تجربہ کار جنرل ہو...... تجربہ کار جنرل کو بڑی ہوشیاری سے فوجیں لڑانی پڑتی ہیں۔''

شمشیرہ بیگم نے کہا۔ ”ارے کیا کروں غلام شاہ، کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ ورنہ ہیرا منڈی کے سارے چراغ بجھا دوں۔ اور پھر اس بالشت بھر کے لڑکے نے الگ نچا رکھا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، دیکھتی ہوں، آگے آگے کیا ہوتا ہے......“

اور اس کے بعد درحقیقت شمشیرہ بیگم نے چولا بدل لیا۔ اکرام کے رنگ ڈھنگ دیکھتیں تو حلق خشک ہو جاتا تھا۔ پورے بدن میں آگ سلگنے لگتی تھی۔ کیا شان وشوکت ہوتی جا رہی تھی اس کی۔ قیمتی سے قیمتی لباس...... نواب زادہ لگنے لگا تھا۔ کوثر جہاں اسے دیکھتی تو آنکھوں میں چراغ جل اٹھتے۔ کوثر جہاں اب رب نواز سے پوری طرح مطمئن تھیں...... اب اسے دنیا کی باتوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ شمشیرہ بیگم نے اپنی زبان پر تالا لگا رکھا تھا۔

ادھر نعمان فضلی دہلیز کے کتے بنے ہوئے تھے۔ روز کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آتے۔ کبھی کنگن اور کبھی کانوں کے آویزے۔ اتنا کچھ لا کر رکھ دیا تھا انہوں نے اس دوران کہ شمشیرہ بیگم کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ پھر کوٹھیوں اور جائیدادوں کا حساب الگ تھا۔ بہرحال شمشیرہ بیگم کی اس کیفیت سے اکرام کو پورا پورا فائدہ پہنچا تھا۔ شمشیرہ بیگم ہر چیز برداشت کر رہی تھی اس امید پر کہ بس ذرا ان کا کام ہو جائے پھر کوثر جہاں کو سنبھالا جائے۔ لیکن اس وقت تک خاموشی اختیار کر لی تھی جب تک یہ کام پورا نہ ہو جائے۔

اس دن موسم انتہائی خوشگوار تھا اور آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ایسے میں بھلا نعمان فضلی کو کہاں چین مل سکتا تھا۔ لدے پھندے آ گئے۔ یہ بڑی سی موٹر لے کر آئے تھے کہ کوثر جہاں کو بادلوں کی چھاؤں میں سیر و سیاحت کرائی جائے۔ اجازت مانگی۔ بھلا شمشیرہ بیگم انکار کیسے کر سکتی تھیں۔ چنانچہ کوثر جہاں تیار ہو گئی۔ ادھر موسم کی حسین سوغات منچلوں کے لئے نئی زندگی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ دریا کنارے رش ہی رش لگا ہوا تھا۔ ہر طرف نوجوان، بچے اور بوڑھے دریا میں گھسے ہوئے تھے۔ سڑک پر پانی بہہ رہا تھا۔

موٹر آہستہ آہستہ دریا کے کنارے سے گزرنے لگی۔ نعمان فضلی دل کی ساری کائنات کوثر کے قدموں میں رکھ دینا چاہتے تھے۔ پھر ایک انتہائی خوبصورت علاقے میں کار روکی گئی۔ سامنے ہی ایک انتہائی حسین کوٹھی نظر آ رہی تھی۔ نعمان فضلی نے اس کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کوثر جہاں! میں نہ تو شاعر ہوں نہ مصور اور نہ ہی کوئی فنکار۔ الفاظ کی بہت کمی ہے

میرے پاس...... لیکن کہا جاتا ہے کہ جذبات کو کسی بھی الفاظ میں بیان کر دیا جائے، ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ آئیے آپ کو اس نامکمل گھر کی سیر کراؤں۔“

”کس کی ہے یہ کوٹھی؟“

”کیا کہوں کس کی ہے...... بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہ میرے دل کی کائنات ہے یا اسی کو میرے دل کا نقشہ تصور کیجئے۔“

”آپ کو پسند ہے...... ذرا بتایئے تو سہی یہ سب کیا ہے؟“

”کاش یہ بادل گھر کر نہ آتے، جذبات اس طرح بے قابو نہ ہو جاتے تو میں آپ کو اس وقت یہاں لاتا جب اس کے دروازے پر آپ کے نام کی تختی آویزاں ہوتی لیکن بادلوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں آپ کے ساتھ یہاں آؤں۔ یہاں سے بیٹھ کر راوی کی موجوں کا نظارہ کروں۔ میں اس گھر کو تاج محل کا نام نہیں دے سکتا کیونکہ دونوں طرف کی حیثیتیں بالکل جدا ہیں۔ کوثر جہاں! میں آپ کے ساتھ زندہ اس گھر میں آنا چاہتا ہوں، اس میں رہنا چاہتا ہوں۔ یہ آپ ہی کے لئے ہے۔ دیکھئے، یہاں سے کامران کی بارہ دری کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔“

کوثر جہاں نے نگاہیں اٹھا کر نعمان فضلی کو دیکھا اور پھر اچانک اس کی آنکھوں میں کچھ آنسوؤں کے قطرے جھلملانے لگے۔ نعمان فضلی اس وقت راوی کی لہروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ کوثر جہاں کے دل میں یہ لہریں اچانک کس طرح موجزن ہو گئی ہیں۔ اس کے دل کی آواز اس کے وجود میں پھیل رہی تھی۔ لیکن یہ آواز کوئی بھی نہیں سن سکتا تھا۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ کپکپا رہے تھے اور یہ کپکپاہٹ مدھم سی سرگوشی کی شکل میں نکل رہی تھی۔

”ایک بار...... آج صرف ایک بار، صرف ایک بار وہ میرے سامنے آ جائے...... صرف ایک بار......“ یہ آواز بیشک نعمان فضلی کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی لیکن اس آواز کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ کوثر جہاں کس کی آرزو کر رہی تھی، کسے چاہتی تھی وہ...... اچانک نعمان فضلی کی آواز ابھری۔

”کہاں کھو گئی کوثر......؟“ وہ چونک پڑی۔ آنکھوں کے آنسو پی گئی۔ آہستہ سے بولی۔

”کچھ نہیں...... بس ایسے ہی۔“

"ایسے ہی تو کچھ بھی نہیں ہوتا......کوئی نہ کوئی خیال تو ہوگا آپ کے دل میں۔"

"ہاں......آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" کوثر جہاں نے سنبھل کر کہا۔

"کیا......؟"

"یہی کہ آپ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟"

"یہ سوال عجیب سا ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔"

"میری بات سنیں گے آپ...... کیا جانتے ہیں آپ میرے بارے میں؟ آپ نہیں جانتے میرے بارے میں۔ سنئے فضلی صاحب! میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے پیشے سے ہٹ کر آپ کو حقیقتوں کی دنیا میں لاؤں۔ طوائف کا کوٹھا ایک غار ہوتا ہے۔ آپ دولت کے انبار اس غار میں ڈالتے رہیں مگر یہ غار کبھی نہیں بھرے گا۔ پھر ایک دن آپ قلاش ہو جائیں گے اور اس کے سارے دروازے آپ کے لئے بند ہو جائیں گے۔ کوٹھوں کا یہی دستور ہوتا ہے۔ آپ کیوں میرے لئے اپنی دولت ضائع کر رہے ہیں...... نجانے کس کس کا حق ہوگا اس کے اوپر۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ کوثر جہاں۔ میں آپ کو اپنی دنیا میں آباد کرنا چاہتا ہوں ...... یہ سب کچھ ایک طوائف کے لئے نہیں بلکہ ایک شریکِ زندگی کے لئے ہے۔ آپ ہمیشہ کے لئے میری زندگی میں شامل ہو جائیں گی شمشیرہ بیگم کو آپ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا ہوگا اس دولت کا جو آپ کے بدلے انہیں حاصل ہوگی۔ اگر انہیں یہ دولت یکمشت ادا کر دی جائے تو بھلا ان کا کیا نقصان۔ مگر کوثر جہاں یہ آپ کی قیمت نہیں ہوگی بلکہ آپ کے دل سے طوائف کا بوجھ ہٹانے کے لئے میں یہ سب کچھ کروں گا۔"

کوثر جہاں کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"کوٹھوں پر صرف طوائف پیدا ہوتی ہے فضلی صاحب! وہ طوائف ہی کی حیثیت سے پلتی ہے، جوان ہوتی ہے اور طوائف ہی رہ کر بوڑھی ہو کر مر جاتی ہے۔ وہ فطری طور پر طوائف ہوتی ہے۔ آپ زندگی کی ان کہانیوں سے نظریں کیوں چرا رہے ہیں جو طوائف کے نام سے منسوب ہیں۔ میری مانئے، بس کیجئے۔ اس سے آگے بڑھنا آپ کے لئے مناسب نہیں ہوگا۔ یہ ایک طوائف دوست کا مشورہ ہے۔ میں آپ کی دوست ہوں۔"

"اگر آپ کے دل میں میرے لئے کوئی گنجائش نہ ہو تو مجبوری ہے۔ آپ اپنے طور پر فیصلہ کریں۔ اور اگر اپنے دل میں مجھے جگہ دے سکتی ہیں تو خدا کے لئے یہ سب کچھ نہ کہیں۔ باقی ذمہ داریاں آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"میں عمر کی اس منزل میں ہوں جو نوخیزی کی منزل نہیں کہلاتی۔ آنکھیں بند کر کے دوڑنا ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں دو بچوں کی ماں ہوں۔"

"میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ آپ کوثر جہاں ہیں اور آپ کی ذات سے جو کچھ بھی متعلق ہے وہ مجھے عزیز ہے۔ آپ بچوں کی بات کرتی ہیں ناں، یہ دونوں بچے میری دونوں آنکھوں کی روشنیاں ہوں گے...... اور آپ میرے دل کو روشن کریں گی۔ اگر آپ نے میری زندگی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تو میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔"

کوثر جہاں نے گہری نگاہوں سے نعمان فضلی کو دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ٹھوکر کھائے بغیر نہیں سنبھلتے۔ وقت ہی انہیں وقت کی کہانی سناتا ہے۔ اب یہ جانیں اور ان کا کام۔

شام ڈھلے واپسی ہوئی۔ کوثر جہاں کو نہیں معلوم تھا کہ حاجو میاں جاسوسی کر رہے ہیں اور ان لوگوں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ بہرحال جب وہ واپسی کے لئے مڑے تو حاجو میاں ان سے پہلے گھر پہنچ گئے اور انہوں نے کوٹھی کی کہانی شمشیرہ بیگم کو سنا دی۔ شمشیرہ بیگم کی باچھیں تو خوشی سے کھل اٹھی تھیں۔

"سچ سچ بتا، کیا کوٹھی نہایت شاندار تھی؟"

"ایسی ویسی شمشیرہ بیگم...... دیکھو تو عقل حیران رہ جائے۔ محل تھی پوری محل۔"

شمشیرہ بیگم کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بہرحال آج کی شام بڑی خوشگوار تھی۔ محفل سجنے لگی۔ مہمان آنے لگے۔ کچھ نئے مہمان بھی موجود تھے۔ نعمان فضلی صاحب بھلا کہاں جاتے، وہ بھی موجود ہی تھے۔ موسم کی مناسبت سے شمشیرہ بیگم نے لڑکیوں کو بڑے حسین لباس پہنائے تھے اور پھر ماحول بھی کچھ ایسا ہی بن گیا تھا کہ موجود لوگوں کو لطف آ گیا۔ فضلی صاحب بھی ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن پھر اچانک ہی ان کا دل دھک سے ہو گیا۔ کچھ نئے مہمان اندر آئے تھے جن میں دو افراد خاص طور سے قابل ذکر تھے۔ ان میں سے ایک لمبے چوڑے قد و قامت کے شوکت حسین صاحب تھے جن کی عمر پچاس پچپن سے

کم نہیں ہوگی۔ ساتھ ہی ایک اور صاحب بھی تھے، دونوں ہی روشن چہروں کے ساتھ اس محفل سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی فضلی صاحب کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ لیکن ان کے آنے کے بعد فضلی صاحب کی جو حالت خراب ہوئی تھی، وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ آخر کار محفل ختم ہوگئی اور وہ دونوں بھی خاموشی سے نیچے اتر گئے۔ لیکن فضلی صاحب جس قدر پریشان تھے وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ جانے کی تیاریاں کرنے لگے تو شمشیرہ بیگم نے کہا۔

''ارے نعمان میاں! آپ کہاں۔ کیا بات ہے، آج کچھ پریشان پریشان سے ہیں۔''

''نہیں ٹھیک ہوں...... کل حاضری دوں گا۔'' نعمان فضلی نے کہا پھر پاگلوں کی طرح نیچے اتر آئے۔ بادشاہی مسجد سے چند قدم کے فاصلے پر وہ دونوں افراد جیسے انتظار کر رہے تھے۔ نعمان فضلی دوڑتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے۔

''ماما جی...... ماما جی......''

لمبے چوڑے بدن کا شخص رک گیا۔ اس نے پلٹ کر طنزیہ نگاہوں سے نعمان فضلی کو دیکھا اور پھر بولے۔

''معافی چاہتے ہیں میاں...... ایک ہی جگہ دونوں شکار ہوگئے۔''

''ماما جی آپ...... آپ......''

''ہاں کیوں، کیا بات ہے؟ ہم مرد نہیں ہیں کیا؟ آ گئے بس تماش بینی کے لئے۔''

''مگر آپ ماما جی......''

''ہاں، اپنے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تمہاری ہی تلاش میں آئے تھے اور آخر تمہارا پتہ چلانے میں کامیاب ہوگئے۔ بھئی واقعی رئیس زادے ہو...... رئیسوں جیسے کام کر رہے ہو۔''

''ماما جی آپ ٹھہرے ہوئے کہاں ہیں؟''

''چلنا چاہو تو چلو آ جاؤ۔ دراصل بہن جی کو یہ بتانا تھا کہ تمہارے بارے میں جو کہانیاں سنی جا رہی ہیں وہ سچ ہیں یا جھوٹ؟ بس یوں سمجھ لو کہ اس کی وجہ سے ہیرا منڈی کے اس کوٹھے پر پہنچ گئے۔''

''میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں ماما جی!'' نعمان فضلی نے چور نگاہوں سے دوسرے

آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جسے وہ نہیں جانتے تھے۔

راستہ خاموشی سے کٹا اور پھر وہ ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچ گئے۔ مکان میں ایک ملازم بھی موجود تھا۔ باہر دالان میں بستر لگے ہوئے تھے۔ کمرے سے مدھم روشنی آ رہی تھی۔ ماما جی نے اس آدمی سے کہا۔

''تم چائے بناؤ اور اس کے بعد جا کے آرام سے سو جاؤ۔'' اور اس کے بعد انہوں نے نعمان فضلی کو دالان میں پڑے ہوئے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تیسرے صاحب ان سے کچھ فاصلے پر بستر پر جا بیٹھے۔

''ہاں...... تو یہ عیش ہو رہے ہیں یہاں۔''

''ماما جی میں...... میں......''

''ہاں بیٹا، عشق کرنے لگے ہو گے کسی سے۔ بالکل اچھا کیا گھر چھوڑ کر یہاں پر پڑے ہوئے ہو۔ کتنے دن ہو گئے، گھر کی خبر بھی لی ہے۔ بڑے پیار سے ذمہ داریاں پوری کر رہے ہو بہنوں کی، بھائیوں کی، ماؤں کی۔''

''ماما جی میں شرمندہ ہوں...... مگر کچھ کاروباری مصروفیت تھی۔''

''یہی چیز تو سب سے زیادہ تشویش کی بات ہے بیٹا۔ کیا تم نے اپنا کاروبار بھی بدل لیا؟ اور بدلا بھی تو یہ نیا کاروبار۔ توبہ توبہ، کیا اس کے بعد تمہارا شمار شرفاء میں ہو سکتا ہے؟''

''آپ جتنا چاہیں برا بھلا کہہ لیں لیکن میں واقعی کاروبار میں الجھا ہوا تھا۔ یہاں تو بس دل بہلانے کے لئے......''

''سچ بول رہے ہو......؟'' ماما جی نے گہری نگاہوں سے نعمان کو دیکھا اور نعمان کی نظریں جھک گئیں۔

''تمہاری جھکی ہوئی نظریں بتاتی ہیں نعمان کہ تم یہاں کاروبار کے لئے نہیں رکے بلکہ دل کے کاروبار میں لگ گئے ہو۔ اپنی ماں کو بھول گئے ہو۔ بہنوں کو بھی بھول گئے۔ یہ بھی بھول گئے کہ یہ تمہارا خاندان ہے اور اس خاندان کی بھی کچھ عزت ہے۔''

''میں مجبور ہوں ماما جی۔''

''ٹھیک ہے...... ہم کیا کر سکتے ہیں۔ وہ تو بس بہن کی محبت تھی جو ہمیں یہاں تک لے آئی۔ یہاں ہم زندگی میں کبھی نہیں آئے۔ بہر حال انہیں یہ خوشخبری سنا دیں گے کہ بیٹے

اب طوائفوں کے ہاں رہتے ہیں۔''

''نہیں ماما جی...... آپ......''

''اپنی عزت کا نہیں تو کم از کم ہماری عزت کا خیال کیا ہوتا۔ یہ سوچا ہوتا کہ بہن بیاہ کر ایک اور گھر میں جا رہی ہے۔ اب دنیا کیا کہے گی، کیا سوچے گی کہ اس بھائی کی بہن ہے جو طوائفوں کے کوٹھے پر پڑا رہتا ہے...... نہیں بھائی، بہن چاہئے کتنا بھی برا مانے، روئے دھوئے، کچھ بھی کرے لیکن ہم اس صورت میں شادی نہیں کریں گے تمہاری بہن سے اپنے بیٹے کی۔ تمہارے کانوں میں بھی یہ بات ڈال دی ہے۔''

''لیکن ماما جی...... میرے معاملے کا میری بہن سے کیا تعلق؟''

''اس خاندان سے بھی تمہارا تعلق ختم ہو گیا ناں...... ٹھیک ہے، اب نیا خاندان بنا لیا ہے۔ طوائفیں ہی تمہاری عزیز و اقارب ہوں گی۔''

''تو آپ یہ سمجھ لیں ماما جی کہ میں آپ کے لئے مر گیا...... میں اپنے طور پر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔''

''تو ہم نے کب منع کیا ہے۔ تم اپنے طور پر زندگی گزارو۔ لیکن ہمیں بھی تو اپنے طور پر زندگی گزارنے دو بھائی۔ ہم اس صورت میں تمہاری بہن کو بیاہ کر اپنے گھر میں نہیں لا سکتے۔ میرا خیال ہے کہ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ باقی فیصلے کرنا تمہارا کام ہے۔ اگر چاہو تو اس فیصلے سے اپنے گھر خود اطلاع کرا دینا اور اگر تم نہ آئے تو سمجھ لو کہ یک طرفہ فیصلہ کرنے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا، سمجھے۔''

نعمان فضلی گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ ماما جی نے اپنے ساتھی سے کہا۔

''کیا کہتے ہو؟''

''ٹھیک ہے...... آپ کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے۔''

''آپ میرے بزرگ ہیں ماما جی! آپ اماں سے بات کر لیں، میں اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کروں گا۔''

''ٹھیک ہے، منظور ہے۔ تم آرام کرو، بس رشتہ ایک حد تک نبھایا جا سکتا ہے۔ ہمارا جو فرض تھا ہم نے پورا کر دیا۔ اب ہماری بہن یہ تو نہیں کہے گی کہ ہم نے یک طرفہ فیصلہ کر لیا۔ اچھا تم بھی چلو، ہم بھی چلتے ہیں۔ خدا حافظ'' ماما جی اپنی جگہ سے اٹھ گئے تھے۔

○●○

ماما جی کی یہاں آمد بھی اصل میں احسان مغل کی ایک اور کوشش تھی۔ حاجو میاں ان کے آلہ کار بنے ہوئے تھے اور شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کی تمام تفصیلات خاص طور سے نعمان فضلی سے متعلق احسان مغل کو معلوم ہو جاتی تھیں۔ اکرام کا معاملہ بھی ان کے کانوں تک پہنچ چکا تھا اور رب نواز کا نام بھی۔ بہر حال اس کے بعد ایک نئے کھیل کا آغاز یعنی ماما جی کا کردار اس کہانی میں داخل ہوا۔ ماما جی کو وہاں تک پہنچا دیا گیا اور انہوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر دوسرے کام کا آغاز ہوا۔

اس بار نعمان فضلی کی والدہ بھی ماما جی کے ساتھ آئی تھیں۔ احسان مغل سامنے آ کر تو کچھ نہیں کر رہے تھے لیکن پیچھے سے بھرپور وار کر رہے تھے اور ایک منصوبہ بندی کے تحت انہوں نے ماما جی کو ایک مکان بھی فراہم کر دیا تا کہ نعمان فضلی کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ ان کی والدہ بھی آئی ہیں۔ یہ سارا گیم اس پہلے گیم کے بعد ہوا تھا اور نعمان فضلی کی والدہ رات بھر تسبیح لئے بیٹھی رہی تھیں اور اپنے بیٹے کے لئے دعا کرتی رہی تھیں۔ وہ تو خود بھی نعمان فضلی کے پاس جانا چاہتی تھیں لیکن منصوبہ بندی کے تحت بھرپور طریقے سے کام ہو رہا تھا۔ بہر حال نعمان فضلی کی والدہ پر غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ جب ان کی حالت بہتر ہوئی تو رو رو کر کہا کہ اب کچھ بھی ہو جائے میں نعمان سے ضرور ملوں گی۔

''کہاں ملیں گی ان سے آپا...... کیا طوائف کے کوٹھے پر؟'' ماما جی نے پوچھا۔

''جہاں وہ ہوگا، میں جاؤں گی۔ کیا کروں، نصیب ہی ایسے ہیں۔''

''نہیں وہاں نہیں جائیں گی آپ۔ آپ اپنے بیٹے کی بھیک کسی سے مانگیں گی۔ اور کیا آپ کا خیال ہے کہ وہ طوائف آپ کی جھولی میں اس کی بھیک ڈال دے گی؟ بھول جایئے بہن جی اس بات کو۔ نعمان میاں کیا نہیں دے رہے اسے۔ یہ سونے کی چڑیا وہ آسانی سے کیسے چھوڑ سکتی ہیں؟''

''تو پھر تمہی بتاؤ، میں کیا کروں؟ میں زندہ نہیں رہ سکوں گی بھائی۔ یہ غم مجھے کھا جائے گا۔''

''اگر آپ لوگ میری تجویز پر عمل کریں، تو کام بن سکتا ہے۔'' احسان مغل نے اس معاملے میں مداخلت کی۔

"بتاؤ، تم بھی میرے بھائی ہو احسان مغل! کیا تجویز ہے؟"

"ہیرا منڈی میں ایک شاہ جی رہتے ہیں۔"

"کوئی فقیر درویش ہیں؟"

"نہیں...... کچھ اور ہیں وہ...... بڑے مشہور ہیں۔ میرا خیال ہے ان سے تذکرہ کیا جائے۔ وہ کام کے آدمی ہیں۔ اگر ظرف والے آدمی ہیں تو آپ کے معاملے سے ضرور متاثر ہوں گے۔ آج کل ان کی بڑی گڈی چڑھی ہوئی ہے۔"

"تو مجھے لے چلو وہاں...... اللہ کے واسطے مجھے لے چلو۔ دل بیٹھا جا رہا ہے میرا۔ ہائے میرا بچہ کس جنجال میں پھنس گیا ہے۔"

انتظام کیا گیا اور آخر کار ایک معزز اور عمر رسیدہ خاتون رب نواز شاہ کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ یہاں دروازے ہمیشہ کھلے رہا کرتے تھے۔ اس وقت بھی رب نواز اور اکرام آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں لمبے چاقو دبے ہوئے تھے اور رب نواز ہنس ہنس کر اکرام کو مشق کروا رہا تھا۔

"نہیں، غلط...... چاقو اس طرح پیٹ میں سے نکل جائے جیسے صابن میں سے تار اور پتہ بھی نہ چلے کہ وار کہاں سے کیا اور کب انتڑیاں باہر نکل آئیں۔ جب انتڑیاں باہر جھولیں تو پتہ چلے کہ چاقو پیٹ کو چھو گیا ہے۔ شاباش...... ایسا ہی ہونا چاہئے۔ بڑا اچھا وار کیا ہے تم نے۔ اب لو، ذرا سنبھلو، بچو اس سے۔" رب نواز نے چاقو کے دو تین ہاتھ دکھائے اور اکرام اچھل اچھل کر پیچھے ہٹتا رہا۔ پھر اس نے موقع پاتے ہی رب نواز کی کلائی پر وار کر دیا...... اگر چمڑے کا پٹا ہاتھ پر نہ ہوتا تو کلائی چر گئی تھی۔ لیکن رب نواز اس غیر متوقع وار پر ناراض ہونے کی بجائے خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے اپنا چاقو زمین پر دے مارا جو زمین میں گڑ گیا اور اس نے آگے بڑھ کر اکرام کو سینے سے لپٹا لیا۔

"جی خوش کر دیا اوئے...... خدا دی قسم جی خوش کر دیا۔ کیا چرکہ لگایا ہے۔ ارے نظر اتارو میرے لعل کی۔" اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ نگاہ سامنے اٹھ گئی۔ اس نے ایک پردہ نشین بزرگ خاتون اور ایک مرد کو سوالیہ انداز میں کھڑے ہوئے دیکھا تو جلدی سے پُر احترام انداز میں بولا۔

"آپ لوگ دروازے پر کھڑے مجھے ذلیل کیوں کر رہے ہیں...... دروازہ کھلا ہے۔

آیئے، بہن صاحبہ آیئے۔"

چادر میں لپٹی ہوئی خاتون اندر داخل ہوئیں تو شاہ جی نے انہیں بڑے احترام سے چارپائی پر بٹھایا اور پھر اپنے خاص آدمی دلبر خان سے بولے۔

"دروازہ بند کر دو۔"

"بھائی ایک ضروری کام سے آپ کے پاس آئی ہوں۔ ہم لوگ ایک مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنی مشکل بیان کریں۔" آنسوؤں بھری آواز ابھری۔ رب نواز نے بڑی دلجوئی سے کہا۔

"میری بہن آپ نے مجھے اس قابل سمجھا، میری چھاتی چوڑی ہو گئی۔ بتایئے کیا بات ہے، بے تکلفی سے بتایئے۔"

"شاہ جی، یہاں شمشیرہ بیگم نامی ایک طوائف رہتی ہے۔ اس کی تین بیٹیاں ہیں۔"

"ہاں، ہاں...... کوثر، غزالہ اور شبانہ۔"

"میرا بیٹا کوثر جہاں کے جال میں پھنس گیا ہے۔ وہ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ یہاں وہ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹا رہا ہے اور وہاں خاندان کی عزت لٹ رہی ہے۔ میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور کوئی سرپرست نہیں ہے۔ آپ کے پاس فریاد لے کر آئی ہوں۔ کوئی صاحب دل ہی مظلوموں کی مدد کر سکتا ہے۔"

"ہوں...... تو شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کا معاملہ ہے۔" رب نواز نے نوکیلی مونچھ مروڑتے ہوئے کہا۔ بزرگ خاتون ہچکیاں لے لے کر رونے لگیں۔ بمشکل تمام انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولیں۔

"بیٹے میں تمہاری ماں کے برابر ہوں۔ میرا بچہ بری صحبت میں پڑ گیا ہے...... اسے ایک سازش کے تحت اس چکر میں ڈال دیا گیا ہے۔ خدا کے لئے اسے بچاؤ۔"

"نہیں بہن صاحبہ...... آپ ہرگز پریشان نہ ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں جو کچھ ہو سکے گا ضرور کروں گا۔" رب نواز نے دردمندی سے کہا۔

"بہن کہہ رہے ہو تو بہن کی عزت بچا لو۔ تمہیں اللہ کا واسطہ۔"

"بس آپ کا اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے...... آپ اطمینان رکھئے، کیا نام بتایا آپ نے اس لڑکے کا؟"

"نعمان فضلی۔ لاکھوں کی دولت لٹا چکا ہے۔ راوی کنارے کوٹھی بنوا رہا ہے۔ سنبھلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

"سنبھل جائے گا...... اچھی طرح سنبھل جائے گا۔ اور کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی؟ رونا چھوڑ دیجئے۔ یوں سمجھئے کہ آپ نے یہ ذمہ داری ہمارے کاندھوں پر ڈال دی ہے۔ آپ آرام سے جائیے اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سن لیجئے۔"

"ہوں...... ہاں بولو۔"

"آپ واپس چلی جائیں۔ آپ کا بیٹا خود ہی آپ کے پاس واپس چلا آئے گا۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

رب نواز شاہ بڑے احترام سے اسے دروازے تک پہنچانے گیا تھا۔ پھر وہ اندر آ کر چارپائی پر بیٹھا تو اس کے چہرے پر گہری سوچ کے آثار تھے۔

"کیا ہوا شاہ جی...... کیا بات ہے؟" نور شاہ نے کہا۔

"رک جاؤ ذرا، کچھ سوچ لوں۔" تھوڑی دیر تک گردن جھکائے رہنے کے بعد رب نواز نے نور شاہ سے کہا۔

"ادھر آ جاؤ...... سب آ جاؤ۔ ایک مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ یہ بے چاری جو آئی تھیں، شریف گھرانے کی بی بی ہیں۔ لڑکا شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر پھنس گیا ہے اور خوب دولت لٹا رہا ہے۔ کچھ کرنا چاہئے ان کے لئے۔"

"آپ نے فیصلہ کر لیا ہے شاہ جی۔ بس سمجھ لیجئے ہم سب کا فیصلہ ہے۔ کیا نام ہے اس کا، بتائیں۔ چھینٹی لگا دیں گے۔ دو چار بار دھلائی ہو گی تو عشق کا بھوت سر سے اتر کر پیروں میں آ گرے گا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا ناں...... ایک چکر ہے اس میں۔"

"وہ کیا شاہ جی؟"

"بھائی! طوائفوں کے محلے میں رہ رہے ہو، ان کی دکانداری خراب کرو گے تو کون خوش رہے گا تم سے۔ اور پھر وہ نہیں ہو سکے گا جو دل میں ہے۔ ایک اور ترکیب سوچی ہے میں نے۔"

"تو بتائیے کیا کرنا ہے؟"

"ہمارا شیر اس کام کی ابتداء کرے گا۔ کیوں شہزادے؟" رب نواز نے اکرام کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ جو کچھ بھی کہیں گے کروں گا شاہ جی۔"

"حالانکہ ہم ابھی تمہیں میدان میں نہیں لانا چاہتے تھے۔ مگر کیا کریں، وقت سے پہلے آ گیا۔ تم جانتے ہو نعمان فضلی کو؟"

"جانتا ہوں شاہ جی۔"

"کیا جانتے ہو ان کے بارے میں؟"

"ہمارے ہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ ننوں ان کی بہت عزت کرتی ہیں اور...... اور......" اکرام کے چہرے پر جھجک پیدا ہو گئی۔

"نہ...... نہ...... میری جان، نہ...... تم تو پھول ہو گلاب کے۔ چاروں طرف بھی کانٹے ہی ہوتے ہیں گلاب کے پھول کے۔ اس میں گلاب کے پھول کا کیا قصور۔ تمہیں تو قینچی بننا ہے اور ایک ایک کر کے سارے کانٹوں والی شاخوں کو کاٹ کر پھینک دینا ہے۔ چلو خیر، اب تمہیں جو کچھ سمجھایا جائے اسے ذہن میں بٹھا لو اور اس پر کام شروع کر دو۔"

"جی شاہ جی......" اکرام کا چہرہ کھل اٹھا اور رب نواز اسے کچھ بتانے لگا۔

○●○

درحقیقت نعمان فضلی پھول ہی کی طرح مرجھا گئے تھے۔ کوچۂ جاناں کی حاضری برابر ہوتی تھی لیکن دل سہما سہما سا تھا۔ ماما جی کی باتیں یاد آتیں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ ماموں زاد بھائی سے ان کی بہن کی منگنی ہو چکی تھی اور بہرحال وہ اپنی بہن کو بہت زیادہ چاہتے تھے۔ باپ پہلے ہی مر چکے تھے، تمام ذمہ داری انہی پر تھی۔ بہنیں بھائی پر جان دیتی تھیں۔ اکلوتے بھائی کے لئے ان کے دل میں بڑا پیار تھا اور اس عمر پر پہنچتے ہوئے بھی نعمان فضلی نے اپنی بہنوں کی کوئی فرمائش نہیں ٹالی تھی۔ انہوں نے عزم کیا تھا کہ بہنوں کے دل سے باپ کا غم نکال دیں گے۔ لیکن بہرحال آستین کے خنجر نے سینہ چاک کر دیا تھا۔ بہن بری طرح یاد آ رہی تھی۔ شاید اتنے پریشان یا متاثر نہ ہوتے لیکن ماما جی جو کچھ کہہ گئے تھے اس سے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ ایسے تو نہیں سوچا تھا کبھی۔ منگنی ٹوٹی تو بہن بدنام ہو جائے گی۔ لوگ پوچھیں گے کہ ایسا کیوں ہوا تو کوئی کیا جواب دے گا۔ آنسو بہانے کے سوا اور

کچھ نہیں کر سکے گی۔ باپ کے مرنے کے بعد ویسے ہی اس کی دنیا ویران ہوگئی ہے۔ خدا خدا کر کے جینے کو راستے تلاش کیے لیکن یہ غم ماں کو کھا جائے گا۔

ایک طرف تو یہ صورتحال تھی اور دوسری طرف کوثر جہاں کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آتا تو ساری کائنات اس کے قدموں میں لٹا دینے کو جی چاہتا۔ اس کے لئے بہت کچھ چھوڑا جا سکتا تھا...... شدید کشمکش تھی۔ کوئی ایسا حل نہیں مل رہا تھا جس سے دونوں راستے ہموار ہو جاتے۔ ماما جی کے بارے میں سوچا کہ ان کی منت سماجت کریں کہ یہ بے رحم فیصلہ واپس لے لیں۔ قصور ان کا ہے، ان کی بہن کا تو نہیں۔ لیکن ماما جی بھی اپنی جگہ درست ہی تھے۔ آخر بات منظر عام پر تو آنی ہی تھی کہ نعمان فضلی نے ایک طوائف سے شادی کر لی ہے اور اس کے ساتھ لاہور میں آباد ہو گئے ہیں۔ کتنا مذاق اُڑے گا ماما جی کا۔ وہ ان الجھنوں سے شدید تنگ آ چکے تھے۔ کوثر جہاں کو بھی حقیقت نہیں بتا سکتے تھے۔

اس رات بھی وہ معمول کے مطابق شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر گئے۔ سب لوگ موجود تھے۔ شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کی محفلوں کے دیوانے۔ آج کوثر جہاں بھی بہت اچھے موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ نعمان فضلی کی پذیرائی تو ہمیشہ ہی ہوتی تھی۔

''اتنی دیر نعمان میاں!'' کوثر جہاں کی تو جیسے آنکھیں دروازے پر گڑھی تھیں۔

''ڈھنگ سے گا بھی نہیں پا رہی ہے...... جی کیا بات ہے، کچھ طبیعت خراب ہے کیا؟''

''معافی چاہتا ہوں کچھ دیر ہوگئی۔''

''چلو کوثر، چلو شروع کرو۔ اب تو آ گئے۔'' شمشیرہ بیگم کی باتیں بھی بڑے مزے کی تھیں۔ بس آدابِ محفل تھے ورنہ کون کسے یاد کرتا ہے۔ بہرحال کوثر جہاں گاتی رہی اور آخر کار محفل ختم ہوگئی۔ لوگ رخصت ہونے لگے اور آخر میں صرف نعمان فضلی ہی رہ گئے تھے۔ گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ شمشیرہ بیگم نے اشارہ کیا اور سازندے اپنے ساز و سامان باندھنے لگے۔ شمشیرہ بیگم بولیں۔

''کوثر جہاں! نعمان آج کچھ اُداس نظر آتے ہیں۔ ذرا ان سے پوچھو کیا بات ہے؟ ہمیں ان کی اداسی گوارا نہیں۔'' شمشیرہ بیگم کا اشارہ پا کر کوثر جہاں نعمان فضلی کو پچھلی بالکونی میں لے آئی۔ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا۔ نعمان فضلی بڑی بالکونی کے ایک گوشے سے ٹک گئے۔

''کیا بات ہے؟''

''میں بہت پریشان ہوں کوثر...... اپنی پریشانی کی تمہیں وجہ کیا بتاؤں۔ لیکن آج میں کچھ اور چاہتا ہوں کوثر! آج میں تمہارے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں کہاں ہوں۔'' کوثر ایک دم سنجیدہ ہوگئی اور اس نے کہا۔

''یہ خیال کیسے آیا آپ کو؟''

''مجھے اپنی حیثیت کا پتہ تو چلنا چاہئے...... میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہاری نگاہوں میں میرا کیا مقام ہے۔'' نعمان فضلی نے اپنے دونوں ہاتھ کوثر کے شانوں پر رکھ دیئے۔

بالکونی کے بغلی دروازے سے اچانک ہی اکرام نمودار ہوا اور اس کی آمد سے دونوں بری طرح چونک پڑے۔ اکرام کا انداز کچھ عجیب ہی سا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قریب پہنچا اور پھر اس نے نعمان فضلی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے ہٹنے کے لئے کہا۔ فضلی صاحب چونک کر اکرام کو دیکھنے لگے تھے۔ کوثر جہاں بھی سیدھی ہوگئی تھی۔ اکرام کی نیلی کنچوں جیسی آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ان میں ایک خونخوار سی کیفیت تھی۔ نعمان فضلی کے ہاتھ کوثر جہاں کے شانوں سے نہ ہٹے تو اکرام نے انہیں دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور نعمان فضلی لڑکھڑا گئے۔ کوثر جہاں نے اکرام کو گھورتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا حرکت ہے......''

ادھر نعمان فضلی بھی غصیلی نگاہوں سے اکرام کو دیکھ رہے تھے۔

''باہر چلئے فضلی صاحب!'' اکرام نے بلند آواز میں کہا جس کا لہجہ بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ اس میں وہ پہلے جیسی معصومیت اور بے بسی نہیں تھی۔ نجانے کیوں ایک دم سے فضلی صاحب کا دل دہل گیا۔ اس کے قدم وہاں نہ جمے اور پھر آہستہ آہستہ بالکونی سے باہر نکل آئے۔ اکرام بھی ان کے پیچھے پیچھے ہال کمرے میں آ گیا تھا۔ یہاں غلام شاہ، حاجو اور دوسرے سازندے بھی موجود تھے۔ شمشیرہ بیگم بھی وہاں آ گئی تھیں۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ادھر کوثر جہاں بھی پیچھے پیچھے ہال میں آ گئی۔ نعمان فضلی بڑی بے بسی سے اکرام کو دیکھ رہے تھے۔

''جانتے ہیں فضلی صاحب یہ کون ہیں؟'' اکرام نے کوثر جہاں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ فضلی صاحب کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی تھی۔ بس پریشان سی نگاہوں سے

اکرام کو دیکھتے رہے۔ اکرام نے پھر کہا۔

"یہ میری ماں ہے فضلی صاحب...... ماں ہے یہ میری۔ اور میں اتنا چھوٹا نہیں ہوں کہ آپ کو اس طرح اپنی ماں کے قریب دیکھ سکوں۔"

شمشیرہ بیگم چونک اٹھی۔ یہ بالکل نئی بات تھی۔ کوٹھوں کی دنیا میں شاید سب سے عجیب اور انوکھی بات۔ شمشیرہ بیگم کی اس وقت جو حالت ہو رہی تھی وہ ناقابل بیان تھی۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ اکرام ان کے گھر کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے خاموشی اختیار کی تھی آج اسی کے اوپر حملہ ہو گیا تھا۔ شمشیرہ بیگم برداشت نہ کر سکیں، بلبلا کر آگے بڑھیں اور اکرام کے کالر کو پیچھے کھینچتی ہوئی بولیں۔

"کتے کے پلّے، بے غیرت، کمینے، جانتا ہے یہ کون ہیں...... تُو ان سے بدتمیزی کر رہا ہے۔"

"نعمان میاں! یہ لڑکا بہت دن سے پاگل ہو رہا ہے۔ معاف کر دیں اسے۔ آج کے بعد اس کا پاگل پن ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ میں کہتی ہوں پیچھے ہٹ۔" شمشیرہ بیگم نے اکرام کو زور سے دھکا دیا لیکن خود ہی لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچیں۔ اکرام پتھر کے ستون کی مانند اپنی جگہ کھڑا رہا۔ شمشیرہ بیگم کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کمزور سے بچے کو جو انہی کے ٹکڑوں پر پروان چڑھا ہے اس قدر طاقت مل جائے گی کہ وہ اسے اس کی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکیں گی۔ انہوں نے خود کو سنبھالا اور پھر اکرام کی پشت پر دو ہتڑ مارا۔

"تیرا ستیاناس جائے۔ نکل جا یہاں سے ہمیشہ کے لئے۔ اس گھر میں اب تیری صورت نہ دیکھوں۔ میں کہتی ہوں نکل جا۔" شمشیرہ بیگم کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

"نکل جاؤں گا نوں، نکل جاؤں گا...... ذرا بات کر لوں اس شریف زادے سے۔ ہاں تو نعمان فضلی، تم مجھے میری ماں کے بدلے کیا دے سکو گے؟" نعمان فضلی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس لڑکے کو کیا جواب دیں۔ کہنا چاہتے تو کہہ سکتے تھے میاں جو قیمت لگا لو۔ یہاں تو یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ کب کسی شریف زادی کے شانے پر ہاتھ رکھے۔ یہ شانے اس ہر شخص کے لئے کشادہ ہوتے ہیں جس کی جیبوں میں دولت بھری ہو۔ لیکن بات کسی ایرے غیرے کی نہیں، کوثر جہاں کی تھی اور کوثر جہاں کو انہوں نے کبھی ایسی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔

اکرام نے پھر کہا۔

"اگر تم نہیں بتا سکتے تو میں تمہیں اپنی ماں کی قیمت بتا سکتا ہوں، کیا سمجھے؟ اگر تمہاری ماں زندہ ہے تو جاؤ، اسے لے آؤ اس کوٹھے پر۔ اسے یہاں چھوڑ دو۔ ماں کے بدلے ماں دی جا سکتی ہے۔ اس کے سوا ماں کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔ جب تمہاری ماں اس کوٹھے پر ناچے گی تو......تو......"

اچانک ہی نعمان فضلی کا پورا وجود غیظ وغضب میں ڈوب گیا۔ ان کے بدن میں لرزشیں پھیل گئی تھیں اور وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ شمشیرہ بیگم نے کہا۔

"غارت ہو جائے تُو...... غارت ہو جائے...... اے غلام شاہ، لاش گرا دو اس مردود کی۔ جان سے مار دو ابھی اسی وقت۔" شمشیرہ بیگم نے غرا کر کہا تو غلام شاہ دھاڑتا ہوا آگے بڑھا۔

"آج میں تیرا حساب ہی صاف کر دوں۔"

اچانک ہی اکرام نے پیچھے ہٹ کر نیفے میں ہاتھ ڈالا اور چاقو کی گراری گرر گرر کی آواز کے ساتھ کھل گئی۔ یہ چاقو بچوں کے کھیلنے کا نہیں تھا۔ اس کا پھل گیارہ انچ لمبا تھا اور دھار بے داغ۔ اکرام نے بڑے ماہرانہ انداز میں چاقو گھمایا اور پھر سیدھا کر کے بولا۔

"غلام شاہ...... پیٹ سے لے کر سینے تک چیر ڈالوں گا۔ یہ ماں بیٹے کا معاملہ ہے۔ تجھ جیسا بے غیرت یہ بات نہیں سمجھ سکے گا۔" یہ کہہ کر اس نے چاقو والا ہاتھ لہرایا تو غلام شاہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں لگا کہ جس انداز میں یہ چاقو لہرایا گیا ہے کوئی اناڑی پن نہیں ہے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ وہ ہارا مارا ہوا لڑکا اکرام نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہی ہے۔ وہ نروس ہو گیا تھا۔ ادھر کوثر جہاں ٹکٹکی باندھے اکرام کو دیکھ رہی تھی۔ شمشیرہ بیگم کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے تھے۔ نعمان فضلی کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ وہ بری طرح بدحواس ہو چکے تھے۔ جو الفاظ اکرام نے اپنے منہ سے ادا کئے تھے ان کے بدلے میں جان دی جا سکتی تھی۔

ان کی غیرت اس قدر مُردہ نہیں ہوئی تھی کہ کوئی ان کی ماں کو کوٹھے پر لانے کی بات کرے اور وہ اسے زندہ چھوڑ دیں۔ لیکن کیا کرتے، یہ تو جوابی کارروائی تھی۔ پہل انہوں نے کی تھی اور ایک ماں کے بیٹے کی غیرت جاگ اٹھی تھی۔ اس کے منہ سے جو کچھ نکلا تھا وہ بالکل فطری تھا۔ اپنی ماں کا پُرنور چہرہ نعمان فضلی کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہ مقدس

وجود جوان کے رویں رویں کے لئے دعائیں مانگتا تھا، آج اس مقدس وجود کو کوٹھے کے وجود کے ساتھ داغدار کر دیا گیا تھا اور یہ سب کچھ ان کی اپنی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ الفاظ اپنی ماں کے لئے کہلوانے والے وہ خود تھے۔ اگر وہ کوٹھے پر نہ آتے تو ان کی ماں کا مقدس نام اس طرح داغدار نہ ہوتا۔ ذہن کی چرخیاں اس برق رفتاری کے ساتھ چل رہی تھیں کہ پورا وجود گھوم رہا تھا اور انہیں اپنا گھر یاد آ رہا تھا۔ بہنیں، جنہیں انہوں نے بے سہارا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اذیت ناک طور پر یہ محسوس کر رہے تھے کہ میں بے ضمیر ہوں اور یہ لڑکا مجھ سے کروڑ درجے بہتر ہے۔ جب میں نے اس کی ماں کے بارے میں نہیں سوچا، جب میں نے اس کے رشتے کا احترام نہیں کیا تو وہ میرے رشتے کا کیوں احترام کرے۔ چند ہی لمحوں میں احساس کی اتنی مسافت طے کر لی تھی فضلی صاحب نے کہ ناقابل بیان۔ یہ بات ان کے لئے شرمندگی کا باعث بنی ہوئی تھی کہ اپنی ماں کے نام کی بے حرمتی کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔

پھر اس کے بعد ان کے قدم مڑے اور وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ پھر پاگلوں کی طرح سیڑھیاں اتر کر سڑک پر چلنے لگے۔ شمشیرہ بیگم کو ایسا احساس ہوا جیسے وہ سنہری سکوں کے ڈھیر سے پھسل کر نیچے آ گری ہوں۔ یہ سکے ایک ایک کر کے فضا میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔

غلام شاہ خاموش کھڑا تھا اور اس کے سارے ساتھی جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔ کوثر جہاں بھی سُن کھڑی رہ گئی تھی۔ غزالہ اور شبانہ بھی آ گئیں۔ انہوں نے یہ حیرت انگیز منظر اس طرح دیکھا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔

پھر سب سے پہلے شمشیرہ بیگم ہی ہوش میں آئیں۔ انہوں نے دوہتڑ سینے پر مارا اور زمین پر بیٹھ کر رونے لگیں۔ وہ بین کر رہی تھیں۔

''سارے مرد ہی ہیجڑے ہیں اس گھر کے۔ ارے ٹانگ برابر لڑکے کو قابو میں نہیں کیا جا سکا۔ تجھے موت آئے اکرام...... تجھے طاعون لے جائے...... کیڑے پڑیں تیری لاش میں...... اس سے پہلے کبھی خیال نہیں آیا کہ اس کوٹھے پر تیری ماں ناچ گا رہی ہے...... اس سے پہلے تیری غیرت کبھی نہیں جاگی؟ ہائے لٹوا دیا، ہائے برباد کر دیا...... ارے نکل جا یہاں سے...... نکل جا۔''

اکرام نے چاقو بند کر کے جیب میں رکھا، پھر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

کوثر جہاں کو نجانے کیا ہوا، ابھی تو گم صم کھڑی ہوئی تھی، اچانک آگے بڑھ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے ستار اٹھایا اور کمرے میں پہنچ گئی۔ شمشیرہ بیگم بدستور واویلا کر رہی تھی۔ انہوں نے نفرت سے غلام شاہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''اے غلامو...... اے حاجو...... تم پر خدا کی مار۔ لمبا چوڑا ہاتھی جیسا ڈیل ڈول لئے پھرتے ہو اور دو ہاتھ کے ایک لڑکے کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر سانپ سونگھ گیا۔''

''دو ہاتھ کا لڑکا......'' غلام شاہ زہریلی ہنسی ہنسا۔ پھر بولا۔ ''غلط فہمی میں ہو شمشیرہ بیگم...... وہ وقت سے پہلے بہت بڑا ہو گیا ہے۔ تم کیا جانو ان باتوں کو۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ سنبھالو کوٹھے کی عزت کو ورنہ سب کچھ گیا۔''

''کیوں گیا...... میں یہ پوچھتی ہوں کیوں گیا؟''

''یہ نہیں سوچا شمشیرہ بیگم! یہ چاقو اس کے ہاتھ میں آیا کیسے؟ پہلے بھی اس نے ایک بار چاقو گھمایا تھا مگر وہ چھوٹا چاقو تھا۔ اب یہ چاقو کتنا بڑا ہو گیا ہے، غور کیا آپ نے؟''

''ارے میں غور کرتی رہوں، تم سب حرام کی کھاتے رہو۔ تم نے کیوں نہیں غور کیا؟''

''کیا ہے شمشیرہ بیگم! اچھی طرح کیا ہے۔ تمہارے کوٹھے پر طبلہ بجانے والے معمولی سے کارندے ہیں، ہم کیا کریں۔ اگر تم کچھ کر سکتی ہو تو رب نواز کے خلاف کرو۔ وہ اس محلے میں بلاوجہ نہیں آیا۔ یقیناً اس کے دل میں کوئی منصوبہ چھپا ہوا ہے اور اسی منصوبے کے تحت اس نے اکرام کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہے۔ یہ چاقو اکیلا نہیں تھا شمشیرہ بیگم...... اس کے ساتھ بہت سے چاقو اور بھی ہیں۔ اور نجانے کون کون سے ہتھیار ہوں۔ اب آپ خود سوچ لیں۔ اتنے بے وقعت نہیں ہیں ہم کہ تھوڑے سے پیسوں کے لئے اپنی جان گنوا دیں۔ کوئی بھی اپنی جان دینا پسند نہیں کرے گا۔ بات صرف اکرام کے چاقو کی ہوتی تو نمٹ لیتے اس سے لیکن وہ دوسرے چاقو بھی اس کے آس پاس موجود ہیں۔''

غلام شاہ کی باتیں سن کر شمشیرہ بیگم کے چہرے کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

''کہتے تو تم ٹھیک ہو غلام شاہ...... یہ حرام کا پلّا اسی رب نواز کے بل پر اکڑ رہا ہے۔ مگر میں پوچھتی ہوں کہ کیا محلے والوں کو سانپ سونگھ گیا؟ ان سب کو فالج مار گیا...... کیوں نہیں سب مل کر ان لوگوں کو محلے سے نکال دیتے؟ آج ایک آدمی کوٹھے سے منہ موڑ کر گیا ہے،

کل دوسرے کوٹھوں کے ساتھ بھی یہی سب ہو سکتا ہے۔ تم سب کو بتائے دے رہی ہوں میں۔ ایک تحریک چلاؤ، ان کے خلاف تھانے میں رپٹ درج کراؤ اور کہو ہمیں اپنی زندگیوں کا خطرہ ہے، ہماری مدد کی جائے۔"

"سوچ لیں شمشیرہ بیگم! پولیس کو اطلاع دینے کا مطلب جانتی ہیں آپ؟" غلام شاہ نے کہا۔

"ارے کچھ کرو، چلو پولیس نہ سہی آخر وہ مردود کہاں مر گیا جس کا نام گوگیا ہے۔ پہلے بھی میں نے تم سے کہا تھا، کیوں اطلاع نہیں دیتے اسے تم؟ اور بھی تو کئی ہیں، وہ کیا نام ہے اس کا لکا...... لکا۔ کیا نہیں لے جاتے یہ لوگ ہم سے۔ اور اب سب کو لوکا لگ گیا۔ کہہ دو ان لوگوں سے جا کر کہ آئندہ انہوں نے محلے والوں سے کچھ مانگا تو ایک پیسہ نہیں ملے گا انہیں۔ ہماری کوئی حفاظت نہ ہو اور ہم پابندی سے اپنے گاڑھے خون پسینے کی کمائی سے انہیں رقمیں دیتے رہیں۔ تم کل ہی ان دونوں کے پاس جاؤ۔"

دفعتہً ان کے کانوں میں ستار کی آواز آئی اور وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ شمشیرہ بیگم کا منہ حیرت سے کھلا اور پھر بند ہو گیا اور پھر اس کی آنکھوں میں غصے کی چمک نظر آنے لگی۔

"ہاں، ہاں...... ٹھیک ہی تو ہے...... چین کی بنسی بج رہی ہے۔ ستار بجا رہی ہے بنو۔ ٹھیک ہی تو ہے، بیٹا جوان ہو گیا ہے۔ چاقو نکالنے لگا ہے ماں کے یاروں پر۔ ٹھیک ہے کوثر جہاں، ٹھیک ہے...... جان بوجھ کر اپنے سر پر بلا لے لی۔ ہائے ہائے، کوئی بھی نہیں ہے ہمارا۔" شمشیرہ بیگم بکتی جھکتی رہیں۔

"جاؤ، اکیلا چھوڑ دو مجھ دکھوں کی ماری کو...... جاؤ تم سب جا کر مرو۔" شمشیرہ بیگم ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ ان کے لئے یہ صدمہ قیامت سے کم نہیں تھا کہ نعمان فضلی وقت سے پہلے ہی چلے گئے۔ کیا کیا منصوبے بنائے تھے دل میں لیکن سب کے سب غارت ہو گئے۔ ہائے اس اکرام نے سب کچھ برباد کر کے رکھ دیا۔

○●○

کوثر جہاں کی انگلیاں ستار کے تاروں پر دوڑ رہی تھیں۔ نجانے کیا کیفیت طاری ہو گئی تھی اس پر۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ مسرت کا ایک طوفان جاگ رہا

تھا اس کے دل میں۔ بے اختیار اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی میدان میں نکل جائے جہاں اس کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ رقص کرے اور اتنا رقص کرے کہ اس کا بدن ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے۔ ستار بجانے کی کوئی تک نہیں تھی اس وقت لیکن اس کی انگلیاں ستار پر دوڑ رہی تھیں۔ ہر طرف فضا مہک رہی تھیں، بند کلیاں کھل گئی تھیں، آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی، ہر طرف سبزہ زار بکھرے ہوئے تھے، کھلا آسمان تھا اور وہ بادلوں میں اُڑی چلی جا رہی تھی۔ انہی بادلوں میں دھوئیں کے دائرے بننے لگے۔ وہ شخص نظر آیا جو اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ پھر اکرام کی شکل نگاہوں میں ابھری اور اچانک ہی لمبا قد نکالنے لگا۔ پھر وہ پورا جوان مرد بن گیا جس کا نام شمس تھا...... شمس...... شمس...... شمس...... یہ ساری شکلیں کوثر جہاں کے احساس پر چھاتی جا رہی تھی۔ وہ اس حسین وجود کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کنچوں جیسی نیلی گہری آنکھیں، چوڑی پیشانی، شہابی رنگ، ستواں پُر تمکنت ناک، حسین تراش کے بھرے بھرے ہونٹ، سیاہ بالوں سے بھرا ہوا چوڑا چکلا سینہ۔

پھر اچانک ہی ستار کے تاروں کی لے تبدیل ہونے لگی اور اس میں غم بستا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ غزالہ اور شبانہ دروازہ پیٹ رہی تھیں مگر اس کے کانوں تک کوئی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ بلکہ اس کے ہونٹوں سے مدھم مدھم سرگوشیاں ظاہر ہو رہی تھیں۔

"دیکھ لو...... دیکھ لو...... تمہاری ایک بھول نے ایک نئی زندگی جنم دی۔ مجھے ہی نہیں، اسے بھی چھوڑ دیا تم نے...... مجھے چھوڑ دیتے تو ٹھیک تھا، آج میں تنہا نہیں تڑپ رہی۔ ایک اور معصوم وجود بھی تمہارے ستم کا شکار ہے۔ وہ یہاں کا باشندہ نہیں ہے، وہ تمہاری دنیا کی آزاد فضا کا باسی ہے اور میں جس فضا میں رہتی ہوں یہ ایک غلیظ قید خانہ ہے۔ مجھے چھوڑ دیا، چھوڑ دیتے۔ مگر اسے تو نہ چھوڑتے۔ آ جاؤ، صرف ایک بار۔

کر چکے ہو تم دشت پیمائی
مجھ سے گھر بیٹھے خاک چھنوائی

ستار کی آواز بند ہوئی تو تسنیم کے رونے کی آواز کانوں میں پڑی۔ اس کی نگاہیں پالنے کی جانب اٹھ گئیں۔ تسنیم منہ بسور بسور کر رو رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ اس کے سینے میں ممتا کا کوئی جذبہ نہیں ابھرا۔ تسنیم کی ننھی ننھی آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ان

میں شکوہ تھا...... اس نے چونک کر دوبارہ تسنیم کی طرف دیکھا، اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قریب پہنچ گئی۔ کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک ہی اس نے آگے بڑھ کر گود میں اٹھالیا اور سینے سے بھینچ لیا۔

"نہیں...... نہیں...... رونے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے ہمارا رکھوالا بھیج دیا ہے۔ میرا رکھوالا، تیرا رکھوالا...... روؤ نہیں، اب ہم محفوظ ہیں۔" مگر خود اس کی آنکھوں سے جھرنے بہہ رہے تھے۔

ادھر جب اکرام باہر نکلا تو اس کے رویں رویں سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اسے بہت پہلے کرنا چاہئے تھا۔ یہ کرب تو نجانے کب سے اس کے وجود کو زخمی کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ تو اسے اس وقت برا لگتا تھا جب اسے برے بھلے کی تمیز نہیں تھی۔ جب باجی غزالہ رقص کرتی تو اسے شرم آتی۔ لوگ ایسے باجی غزالہ کو دیکھتے جیسے وہ قلاقند ہو اور وہ سب اسے کھا جانا چاہتے ہوں...... شبانہ جب کسی مرد کے سامنے بیٹھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی تو اسے ایسا لگتا جیسے اس مرد نے شبانہ کا گریبان پکڑ کر اس کا لباس پھاڑ دیا ہو۔

اور اس کا کلیجہ کٹتا تھا...... جی چاہتا تھا کہ کچھ سے کچھ کر دے۔ لیکن کیا...... یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا...... کوئی کہتا کہ ان تینوں کو اٹھا کر لے جاؤں۔ دوسرا کہتا۔

"اٹھانے کی کیا ضرورت ہے پیارے...... کسی رئیس زادے کی جیب صاف کر دو اور سارا مال لے کر آجاؤ۔ سب تمہاری ہیں۔"

اس طرح کے جملے اس کے کانوں میں زہر گھولتے تھے اور اس کا دل چاہتا تھا کہ ایک بڑا سا پتھر لے کر ان سب کا سر کچل دے۔ لیکن اس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھانے کی کوشش کی تھی تو وہ اس سے اٹھ نہیں سکا تھا۔ پھر اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جب میں یہ پتھر اٹھا سکوں گا تو ان لوگوں کے سروں کو ضرور کچل کر چھوڑوں گا۔ وہ اپنے دل کا بخار مختلف طریقوں سے نکالتا رہتا تھا۔ ایک دن اس نے ایک پان میں بہت سی مرچیں ڈال دی تھیں اور پان کھانے والا تھوتھو کر کے منہ پیٹتا پھرا تھا۔ پھر پان کھانے والے کی پان کھلانے والے سے ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی۔ احسان مغل کے چہرے پر اس نے ایک مرتبہ خوب گرم گرم چائے کی پیالی پھینک دی تھی اور ایک اور گاہک کی گدی میں ایک بہت بڑا کانٹا اڑس

دیا تھا اور وہ چوہدری صاحب تین مہینے تک ہسپتال میں رہے تھے کیونکہ کانٹا بڑا زہریلا تھا اور زخم بڑی نازک جگہ لگا تھا۔ غزالہ اور شبانہ کے گھنگھرو اکثر غائب ہو جایا کرتے تھے اور ان کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ پھر جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا، یہ احساس بھی جوان ہوتا گیا۔ اس نے کئی بار کوثر جہاں سے کہا تھا کہ وہ یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ پھر کوثر جہاں اسے پیار سے سمجھایا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی۔

"بیٹا! پھر ہم کہاں رہیں گے؟"

اس کے بہت عرصے کے بعد تسنیم پیدا ہوئی۔ یہ ننھی سی گڑیا اسے بہت پیاری لگتی تھی لیکن اس نے شمشیرہ بیگم کو لوگوں کی مبارکبادیں وصول کرتے ہوئے دیکھا تھا اور یہ جان کر اس کا دل ٹوٹ گیا تھا کہ تسنیم بھی بڑی ہو کر ناچے گی۔

وہ جب بھی تسنیم کو دیکھتا اس کے دل میں یہی خیال جاگ اٹھتا، کئی بار اس نے سوچا کہ وہ تسنیم کے پاؤں ہی کاٹ دے تاکہ وہ ناچ نہ سکے۔ لیکن یہ ساری سوچیں صرف سوچ کی حد تک تھیں اور آج پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ جو کچھ سوچتا رہا ہے وہ کر بھی سکتا ہے اور اس میں یہ قوت، یہ جذبہ بیدار کرنے والے رب نواز شاہ تھے۔ اس کے مرشد، اس کے نجات دہندہ، اس کے رہبر۔

راستہ طے کرتے ہوئے اس کی نگاہ اس پتھر کی طرف اٹھی جسے وہ کبھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس کے قدم اس پتھر کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوٹھے ویران ہو چکے تھے، روشنیاں بجھ چکی تھیں، تماش بین جا چکے تھے۔ وہ جھکا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے وزنی پتھر اٹھالیا...... اسے سر سے بلند کیا اور زور سے اچھال دیا۔ آج یہ پتھر اس کے سامنے بے حقیقت تھا۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ پھر جب وہ رب نواز کے ڈیرے پر پہنچا تو سب جاگ رہے تھے۔ شاہ جی برآمدے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ تمباکو کی خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ شاید اسی کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ چاروں ساتھی بھی ان کے آس پاس موجود تھے۔ اکرام کے اندر داخل ہوتے ہی شاہ جی نے حقے کی نے منہ سے نکالی اور کھڑے ہو کر ہاتھ پھیلا دیئے۔ اکرام فخر اور انکساری کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ ان کے پاس پہنچ گیا۔ رب نواز نے پیار سے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"جیتے رہو بیٹے، جیتے رہو...... دل ٹھنڈا کر دیا تم نے۔"

''وہ شاہ جی...... میں نے فضلی صاحب......''

''معلوم ہے، معلوم ہے...... سب معلوم ہے۔ وہاں اکیلے نہیں تھے تم...... اور خیال رکھنا، تم کہیں بھی اکیلے نہیں ہوتے۔ وہاں اگر تمہیں کوئی انگلی بھی لگاتا تو یقین کرلو کہ شمشیرہ بیگم کا کوٹھا خون سے سرخ ہو جاتا۔'' رب نواز شاہ نے پُرجوش لہجے میں کہا اور اکرام دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگا۔

پھر دوسری صبح سات بھی نہیں بجے تھے کہ شاہ جی کے مکان کے کھلے دروازے سے کوثر جہاں اندر آگئی۔ رب نواز صبح جلدی اٹھنے کے عادی تھے۔ باقی لوگ بھی جاگ گئے تھے۔ اچانک کوثر جہاں کو دیکھ کر سب بھونچکے رہ گئے۔ رب نواز نے سنبھل کر کہا۔

''آیئے، آیئے بی بی...... آیئے۔''

''وہ اکرم کیا یہاں ہے...... رات کو گھر واپس نہیں آیا۔''

''موجود ہے۔ سو رہا ہے آرام سے۔ وہ اپنے گھر میں ہے۔ آپ چاہیں تو اسے جگا دیجئے۔ آیئے میں آپ کو دکھاؤں۔'' اور وہ آگے بڑھ گئے۔ کوثر جہاں ان کے ساتھ اندر داخل ہوگئی تھی۔ اس نے مسہری کی طرف دیکھا، اکرام مخمل کی چادر اوڑھے گہری نیند سو رہا تھا۔ چند لمحے خاموشی رہی اور پھر کوثر جہاں نے سر اٹھایا تو شاہ جی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''آپ اس کی شکایت نہ کیجئے گا بی بی، وہ اب صحیح راستے پر چل رہا ہے۔''

''میں اس کا راستہ کبھی نہیں روکوں گی شاہ جی۔'' کوثر جہاں روہانسی ہوگئی۔

''اور کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟''

''ایک بات بتائیں گے شاہ جی؟''

''پوچھیئے۔''

''آپ کون ہیں؟ اس علاقے میں رہنا کیوں پسند کیا ہے آپ نے؟ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں آپ؟'' کوثر جہاں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''پاگل دیوانے ہیں ہم کوثر جہاں بیگم۔ کیا بتائیں کون ہیں ہم، کہاں سے آئے ہیں۔ چھوڑیئے ان باتوں کو۔ ہاں ایک بات آپ سے ضرور کہیں گے، ہمارے لائق کوئی خدمت ہوا کرے تو براہِ کرم بتا دیا کریں۔''

اچانک ہی کوثر جہاں جذباتی انداز میں آگے بڑھیں، رب نواز کا ہاتھ پکڑ کر اسے

ہونٹوں سے لگایا اور اس کے بعد تیزی سے باہر نکل گئیں۔ رب نواز بھونچکے رہ گئے تھے۔ کوثر جہاں ڈیرے کے دروازے سے باہر نکل گئی تو وہ چیخے۔

''ابے نور شاہ...... او دلبر خان، جلدی سے جانا ذرا لوٹا لے کر آؤ۔ ساتھ میں صابن بھی لے آنا۔''

تعمیل کی گئی اور شاہ صاحب اب رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھونے لگے۔

''کیا ہوا شاہ جی...... ہاتھ میں کیا لگ گیا؟'' نور شاہ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں یار۔ گندا ہو گیا ہے۔''

○●○

آخر کار اللہ نواز شاہ خود ہی گجرات پہنچ گئے۔ غیاث الدین صاحب نے مکمل خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں گھر پر کیا بیت رہی تھی۔ اللہ نواز شاہ نے تو ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی لیکن کہیں سے بھی رب نواز کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ اللہ نواز شاہ کا خیال تھا کہ وہ کراچی واپس چلے گئے تھے اور کراچی جیسے عظیم شہر میں کسی کا روپوش ہو جانا بڑی معمولی سی بات تھی۔ بہرحال اس گھرانے پر جو کچھ بیت رہی تھی وہ اس کے مکین ہی جانتے تھے۔ مرزا حیات بیگ ان واقعات سے اس قدر شرمندہ ہوئے تھے کہ پھر رک نہیں پائے تھے اور فوراً ہی واپس چلے گئے تھے۔ اللہ نواز شاہ نے جہاں جہاں ممکن ہو سکتا تھا، بیٹے کو تلاش کیا اور اس کے بعد تھک کر بیٹھ گئے۔ ادھر غیاث الدین کا خیال تھا۔ بے چارے غیاث الدین نے دوبارہ رابطہ تک قائم نہیں کیا تھا۔ بڑا ہی عجیب سانحہ ہوا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ نکاح ہو چکا تھا۔ اگر کوئی معمولی سی بات ہوتی تو شاید خاموشی سے حالات قابو میں کر لئے جاتے۔ لیکن اب ایک عجیب کیفیت تھی۔ ذکیہ بیگم نے ہی ملک صاحب سے کہا۔

''ادھر کی بھی کوئی خیر خبر لی آپ نے؟''

''کدھر کی......؟'' اللہ نواز شاہ نے غم آلود نگاہیں اٹھا کر بیوی کو دیکھا۔

''گجرات کی بات کر رہی ہوں۔''

''کیا خبر لوں، کچھ اتا پتہ چلتا تو ہمت بھی کرتا۔ خالی منہ پٹانے سے کیا فائدہ؟ کیا کہوں غیاث الدین صاحب سے، کس طرح انہیں دلاسہ دوں؟''

''پھر بھی، ہمارا اس طرح خاموش بیٹھنا بھی تو مناسب نہیں ہے۔''

"تو پھر بتاؤ کیا، کیا جائے؟"

"ہمیں وہاں جانا چاہئے۔"

"کہاں گم ہوگیا یہ شخص۔ میں نہیں جانتا تھا کہ زندگی میں کبھی کوئی ایسا مرحلہ بھی آئے گا۔ اور پھر ذکیہ بیگم آپ یقین کریں، اس سے زیادہ یقین کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے کہ میں نے یہ بات چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس یوں سمجھئے کہ اس بے چاری کی موت کے بعد میں نے یہ کتاب بند کردی تھی اور سوچا تھا کہ مکمل خاموشی ہی اختیار کرلی جائے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ بعض اوقات بہت اچھے دوست ہی آستین کا سانپ ثابت ہوتے ہیں۔ اپنی بے تکلفی میں ہمیں برباد کرگئے مرزا حیات بیگ۔"

"گجرات چلیں، میرا دل اس بچی کے لئے بہت تڑپ رہا ہے۔"

"چلو۔"

اور اس کے بعد اللہ نواز شاہ کی پجارو گجرات کی جانب چل پڑی۔ دل پر عجیب سا بوجھ طاری تھا لیکن بڑے لوگ جو سچ مچ بڑے ہوتے ہیں، صاحب ظرف بھی ہوتے ہیں۔ غیاث الدین صاحب نے پیشانی پر بل ڈالے بغیر دونوں میاں بیوی کا استقبال کیا تھا۔ بڑے نیک اور دین دار آدمی تھے۔ واقعی بڑے تھے۔ ملک صاحب کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ذکیہ بیگم کا بھی زنان خانے میں بڑا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ عرشیہ نے بڑے آداب سے سلام کیا تھا اور ذکیہ بیگم کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ انہوں نے عرشیہ کا سر سینے سے لگایا تھا۔ بڑے آدمی کی بڑی بیٹی تھی۔ آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے آنسوؤں کی نمی دھندلائی تھی لیکن بس ایک لمحے کے لئے...... اس کے بعد اس نے بڑے سلیقے سے ساس کی صحت وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔

ادھر غیاث الدین صاحب نے اللہ نواز شاہ کی بے حد پذیرائی کی۔

"میں خود حاضری دیتا، لیکن زمینوں کے مقدمات چل رہے تھے، ان کے سلسلے میں مصروف رہا۔"

"اور میری مصروفیت رب نواز کی تلاش تھی جس میں ابھی تک مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔"

"اللہ بہتر کرے گا...... ہم سب کی تقدیریں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔"

"غیاث الدین! میں اپنی شرمندگی کا اظہار نہیں کرسکتا۔"

"میں آپ کو کچھ سچائیاں بتانا چاہتا ہوں ملک صاحب۔" غیاث الدین نے کہا۔

"سچائیاں؟"

"ہاں۔"

"براہِ کرم مجھے بتائیے۔"

"دیکھئے ذرا سی غلطی آپ سے ہوئی ہے، کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہم لوگوں نے یہ رشتہ بھرپور اعتماد کے ساتھ کیا تھا۔ اگر یہ بات میرے علم میں آجاتی تب بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ کیونکہ اللہ نواز شاہ صاحب! میں آپ کو جانتا ہوں۔ بہرحال جب یہ واقعہ ہوگیا تو میں نے خود بھی تحقیقات شروع کی۔ یہ بات تفصیل سے میرے علم میں آگئی کہ نوجوانی کے زمانے میں آپ نے ایک طوائف سے رابطہ قائم کیا۔ معافی چاہتا ہوں یہ جملہ استعمال نہیں کرنا چاہتا لیکن برسبیل تذکرہ اور اس کے بعد ان سے شادی کرلی۔ جو رشتہ آپ کے والدین نے آپ کا ذکیہ بیگم سے طے کیا وہاں سے کوئی اولاد نہ ہوسکی۔ ان خاتون کو جن سے آپ نے نکاح کیا تھا آپ نے ایک الگ گھر لے کر رکھا اور وہاں انہوں نے ایک شریف زادی کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ پھر جب ان کا انتقال ہوگیا تو آپ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو ذکیہ بیگم کی گود میں ڈال دیا۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے رب نواز سے یہ بات چھپا کر غلطی کی یا نہیں لیکن آپ اگر مجھے بتا بھی دیتے تو کوئی حرج نہیں تھا۔ ہم لوگ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار رہتے بلکہ شاید میں آپ کو یہ مشورہ دیتا کہ رب نواز کو بھی اعتماد میں لے لیجئے۔ میرے آدمی خود بھی رب نواز کو تلاش کررہے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ میں آپ سے ایک بات صاف صاف کہوں، مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ بعض اوقات تقدیر ہمیں ایسے ہی الجھاتی ہے اور ہم ان الجھاووں کی سلجھن تلاش کرتے رہ جاتے ہیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں فتویٰ حاصل کروں تاکہ عرشیہ کے لئے طلاق مانگی جاسکے۔ لیکن میں نے ابھی اس حد تک جانے کا فیصلہ نہیں کیا۔ یہ میں آپ سے کہے دے رہا ہوں کہ اگر کہیں مسئلہ کسی شکل میں ہموار ہوجائے اور اگر آپ چاہیں اور رب نواز پسند کریں تو میں کسی بھی شکل میں اس سلسلے کو ختم کرنے کے بارے میں نہیں سوچوں گا۔"

اللہ نواز شاہ نے غیاث الدین کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے تھے۔

غیاث الدین نے فوراً ان کے شانے پکڑ کر انہیں سیدھا کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں ملک صاحب! یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ اگر جان بوجھ کر کوئی ایسا عمل کیا جاتا تو واقعی اختلاف کی بات تھی۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ بھی بے قصور ہیں۔"
اللہ نواز شاہ زار و قطار رو دیئے۔
"ہاں میں واقعی بے قصور ہوں...... بس میں گڑھے مُردے نہیں اکھاڑنا چاہتا تھا۔"

○●○

شمشیرہ بیگم نے اچھا خاصا کام کر لیا تھا۔ وہ محلے کے ایک ایک کوٹھے پر گئی تھیں اور انہوں نے کوٹھے والیوں کو سمجھایا تھا کہ محلے میں ایک غیر متعلق شخصیت آ گئی ہے جس کا نام رب نواز شاہ ہے۔ یہ کوئی بہت لمبا چکر چل رہا ہے اور آنے والے وقت میں کوئی بہت بڑی بات ہونے والی ہے چنانچہ سنبھل جائیں۔
اس کے علاوہ غلام شاہ، گوگیا کے پاس پہنچ گیا تھا۔ گوگیا پہلوان ایک باقاعدہ طاقت تھی۔ جب علام شاہ اس کے ڈیرے میں داخل ہوا تو گوگیا پہلوان ایک تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنے آدمیوں سے حساب کتاب کر رہا تھا۔
"ہاں بھئی، کون ہے تُو...... سپاری دینے آیا ہے کسی کی؟"
"آپ نے پہچانا نہیں مجھے پہلوان...... میں ہیرا منڈی سے آیا ہوں اور وہاں کے رہنے والوں کا ایک پیغام لایا ہوں آپ کے لئے۔"
"ہاں بول، کیا بات ہے؟"
"وہ پہلوان جی، ہیرا منڈی میں ایک آدمی نے ایک گھر بنایا ہے اور وہاں اپنے پاؤں جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ محلے والوں کو تنگ کر دیا ہے اس نے۔ تین چار لفنگے اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ شمشیرہ بیگم نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ سب کا خیال ہے کہ آپ ایک چکر لگا دیں اور اس بندے کو کان پکڑ کر باہر نکال دیں۔"
"ابے کمال کرتے ہو، تم نے خود دھلائی کیوں نہیں کر دی ان کی؟ الٹی سیدھی ہم خود دیکھ لیتے۔" اور پھر گوگیا پہلوان نے اپنے ایک ساتھی کو آواز دی۔
"ابے لوکے...... لکا کہاں ہے؟"
"کام پر گئے ہوئے ہیں لکا پہلوان۔"
"یہ میں کیا سن رہا ہوں، ہیرا منڈی میں کوئی بدمعاش آ گیا ہے اور ان لوگوں کو پریشان

کر رہا ہے۔ تم لوگ آنکھیں کھلی نہیں رکھتے؟"

"بہت دن سے ادھر سے گزر نہیں ہوا پہلوان جی۔"

"گزر لیا کرو...... گزر لیا کرو...... ورنہ کسی وقت خود گزر روں گا۔ ہماری جاگیر میں کوئی اور پاؤں جمانے کی کوشش کرے، کیا نام ہے بھئی تیرا۔" اس نے غلام شاہ سے پوچھا۔

"غلام ہوں پہلوان جی آپ کا۔ غلام شاہ نام ہے۔"

"ٹھیک ہے، جاؤ۔ ہم دیکھ لیں گے اسے۔ اور کیا کرتا ہے وہ محلے میں؟"

"بس جی تمام دکانداروں پر رعب ڈالتا رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جاؤ...... لیکن ٹھہرو...... لو کے......"

"جی پہلوان!"

"جاؤ، ان سارے دکانداروں سے کہہ دو کہ کوئی ان سے لین دین نہ کرے، کوئی ان سے واسطہ نہ رکھے۔ ہم خود کسی وقت آ کر انہیں دیکھ لیں گے۔ جا بھئی، تُو جا...... کیا نام لیا تُو نے اس کنجری کا جہاں سے تُو آیا ہے؟"

"شمشیرہ بیگم۔"

"کہہ دینا اس سے کہ کام ہو جائے گا۔"

بہرحال گوگیا پہلوان خود تو ہیرامنڈی نہیں گیا، اس کے گرگے دکانداروں کے پاس جا پہنچے اور انہوں نے ایک ایک دکان پر جا کر گوگیا پہلوان کی ہدایت ان تک پہنچا دی کہ رب نواز سے کسی قسم کا کوئی لین دین نہ کیا جائے۔ بس اس کی شامت آنے ہی والی ہے۔ لوکا وہ ڈیرہ بھی دیکھ گیا تھا اور اس کے بعد وہ واپس پہنچ گیا تھا۔

ادھر شمشیرہ بیگم کو جب غلام شاہ گوگیا پہلوان سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا رہا تھا تو کوثر جہاں نے بھی سن لیا اور ماں کے پاس پہنچ گئی۔

"آخر آپ کیوں خون خرابے پر تلی ہوئی ہیں؟"

"جو کچھ اس نے کیا ہے یا جس طرح اس نے تمہارے اس سپنولئے کو بگاڑا ہے کیا اس کے بعد انہیں معاف کیا جا سکتا ہے؟ بولو، کیا تمہارے نزدیک یہ کوئی بات نہیں ہے؟"

"میں کر بھی کیا سکتی ہوں اماں! تم بتاؤ میں کیا کروں؟ وہ کوٹھے کا لڑکا ہے۔ ایک بے کار شے، جس کا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔ کوٹھوں پر تو لڑکیوں کا راج ہوتا ہے، لڑکے تو یہاں

ڈیوڑھیوں میں پڑی جھاڑو کی مانند ہوتے ہیں جن سے لگنے والی ٹھوکر بھی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ مگر ہوتے وہ انسان کے بچے ہی ہیں۔ تم ان سے ان کا آدمی ہونا کیسے چھین سکتی ہو اماں! وہ کس طرح زندگی گزار رہا تھا۔ نہ اس کے تن کا خیال رکھا جاتا تھا اور نہ پیٹ کا۔ کسی سے اسے محبت ملی، وہ وہیں کا ہو رہا۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"اور کل کلاں کو اگر وہ پورا بدمعاش بن جائے تو...... جیل چلا جائے تو کیا تمہیں دُکھ نہیں ہوگا؟"

"ضرور ہوگا اماں...... مگر میں کیا کروں؟"

"بی بی! اسے سمجھانا چاہئے تھا تمہیں۔ اس کے بجائے تم اس کی کامیابی پر ستار بجانے بیٹھ گئیں۔ میں تمہیں بتائے دے رہی ہوں، رب نواز کی صحبت میں وہ کہیں کا نہیں رہے گا۔"

"تو پھر تم خود بتاؤ اماں! کوئی مستقبل ہے اس کا...... یہاں جوان ہوگا تو زیادہ سے زیادہ سارنگی بجائے گا، طبلہ ٹھونک لے گا، دلال بن جائے گا ہمارا اور کیا کرے گا۔ جبکہ تم جانتی ہو اماں! کہ وہ ایک شریف آدمی کا خون ہے...... وہ...... وہ......" کوثر جہاں کی آواز بھنچ گئی۔

"تو پھر اُسے اُس کے باپ کے حوالے کر دو۔" شمشیرہ بیگم نے کہا اور کوثر جہاں اچھل کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح تپنے لگا۔ وہ شمشیرہ کو گھور رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"کہاں ہے اس کا باپ اماں! کہاں ہے اس کا باپ؟"

"لو، میں کیا اسے چھپائے بیٹھی ہوں، تلاش کر لو، مل جائے تو اس سے کہو اپنی امانت سنبھالے۔ میں کہتی ہوں اگر یہ ہو جائے تو ہم مصیبت سے بچ جائیں گے۔ ورنہ بی بی کچھ ہوگا...... ضرور ہوگا۔"

"یہ بات تو بہت پہلے میں نے تم سے کہی تھی۔ اس وقت کہی تھی اماں جب وہ چلنے کے قابل ہوا تھا اور تم نے اس پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے تھے۔ میں نے تم سے کہا تھا اماں! کہ اسے اس کے حوالے کر دو جو اس کا ذمے دار ہے اور تم نے مجھے ہزاروں صلواتیں سنائی تھیں۔ آج تم وہی بات کہہ رہی ہو۔ میں تیار ہوں۔ بتا دو وہ کہاں ہے؟ میں اسے خود اس کے حوالے کروں گی۔ اور پھر اماں! میں وعدہ کرتی ہوں کہ وہ کبھی اس طرف نہیں آئے گا۔ میرا وعدہ ہے اماں...... میرا وعدہ ہے۔" کوثر جہاں کے ہونٹ خشک ہو گئے

تھے، آنکھیں چمکنے لگی تھیں، عجیب ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی تھی اس پر۔"

"لو بی بی! کسی کو اولاد کے بارے میں پتہ ہوتا ہے کہ وہ کس کی ہے...... میرا مطلب ہے ہیرا منڈی میں۔"

"اماں! مجھے پتہ ہے، میں جانتی ہوں اماں! مگر تمہیں چھان بین کرنا پڑے گی۔"

"پھر بھی، کون کون آتا تھا ان دنوں، کچھ یاد ہے؟"

"میں نہیں جانتی اماں! میں یہی تو نہیں جانتی۔ کاش! میں جانتی۔ وہ تو ویرانوں میں چلنے والی ہواؤں کا آوارہ جھونکا تھا جو بھٹک کر ادھر آنکلا تھا اور پھر فضاؤں میں تحلیل ہوگیا تھا۔ کہاں تلاش کروں اسے...... کہاں تلاش کروں۔" کوثر جہاں کی آواز رندھ گئی۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا...... ورنہ ہم تو برباد ہوجائیں گے۔ آہ، دیکھو کس طرح لاکھوں روپے کی آسامی نکال دی۔ ہائے، نعمان فضلی۔ کیا سوچا تھا، کیا ہوگیا۔ کوثر جہاں، اس کو کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کرلا، کم از کم ایک کوٹھی ہی مل جائے شاہدرے کی، نامکمل رہ گئی تو ہم خود اسے مکمل کرالیں گے۔ تُو خوشامد کرلینا، کہہ دینا بچے کی گستاخی کی معافی مانگتی ہوں۔ ہائے میرا کلیجہ کیسا بیٹھتا رہتا ہے یہ سوچ کر کہ وہ وقت سے پہلے نکل گئے اور یہ سب کچھ اسی موذی کا کیا دھرا ہے۔" شمشیرہ جہاں اپنی سنارہی تھیں لیکن کوثر جہاں کسی اور ہی دنیا میں کھو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں اور ہونٹ بڑبڑا رہے تھے۔

"ہم اس سے کہیں گے اماں! ہم تمہارے کچھ نہیں ہیں، لیکن اسے دیکھو، اس کا ہر نقش تمہارا ہے۔ اس کے ہونٹ، اس کی آنکھیں، اس کا ہر انداز تمہارا ہے...... یہ تمہارا ہے، ہم میں سے نہیں ہے، اسے لے جاؤ...... اسے لے جاؤ۔ ہم تو دیوار کی گھاس ہیں مگر اس میں تمہارا وجود ہے، ہمارے لئے نہ سہی اپنے اس وجود کے لئے تو آجاؤ۔ ایک بار...... صرف ایک بار۔" کوثر جہاں کچھ اور سوچ رہی تھی اور شمشیرہ بیگم کچھ اور۔ ابھی وہ کچھ اور ہی کہنے والی تھی کہ پوری قوت سے دروازہ کھلا اور حاجو نے اندر چھلانگ لگائی۔ دونوں چونک کر سنبھل گئیں۔ حاجو کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہورہا تھا، آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں، آواز بند تھی، بولنے کی کوشش کی تو حلق سے بطخ کی آواز کی طرح قیں قیں کی آواز کے سوا کچھ نہ نکلا۔ اس طرح سے اندر گھسا تھا کہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا اور شمشیرہ بیگم کے قریب آکر زمین پر گر پڑا۔ شمشیرہ بیگم نے جھلا کر لات ماری تو سیدھا کھڑا ہوگیا۔

"موت آئے تجھے حاجو...... جب مرتا ہے ایسے ہی مرتا ہے۔ ارے کیا ہوا ہے...... کیا طاعون پھیل گیا شہر میں یا بم پھٹ گیا...... تیرا بیڑا غرق، دل لرزا دیتا ہے۔"

"شش...... شش...... شش......" حاجو کے منہ سے نکلا اور شمشیرہ بیگم نے ایک اور لات رسید کرکے کہا۔

"ارے منہ سے تو کچھ بول مر۔"

"دد...... دد...... دد......"

"دادا مر گیا تیرا۔ دد...... دد...... کئے جارہا ہے، شش...... شش، دد...... دد اس کے علاوہ بھی کچھ نکلے گا تیرے منہ سے؟"

"دلدار گھوڑا......" حاجو کے منہ سے نکلا اور یہ نام سن کر شمشیرہ بیگم اچھل پڑیں۔ اسی وقت غلام شاہ بھی پوری جان سے کانپتا ہوا اندر پہنچا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"شمشیرہ بیگم! گھوڑا آگیا۔"

"میرے مولا خیر۔ کہاں سے آگیا وہ۔"

"بھگدڑ مچی ہوئی ہے ہیرا منڈی میں...... لوگ دکانیں بند کرکے بھاگ رہے ہیں۔"

"ہائے...... تو کیا وہ جیل سے نکل بھاگا...... جیل توڑ دی کیا اس نے؟"

"جیل کہاں توڑی۔ تین سال کی تو ہوئی تھی اسے سزا۔ پوری ہوگئی۔"

"ہائے میں مرجاؤں...... کیا ادھر ہی آرہا ہے؟" شمشیرہ کے چہرے پر بھی سفیدی دوڑ گئی۔

غلام شاہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی باورچی کرامت بھی اندر آگیا۔

"شمشیرہ بیگم! دلدار گھوڑا دولہا بنا ہوا ہے اور اپنے ہی جیسے ایک دوسرے گھوڑے پر سوار ہے۔ پندرہ بیس بندے بھی ساتھ ہیں۔ چھوارے اچھالتا ہوا اسی طرف آرہا ہے۔"

"ارے میرے مولا...... گئی میں تو۔ ارے کوئی پولیس کو خبر کردو۔ کوئی کچھ کرو، بچالو...... ہائے مجھے بچالو۔" شمشیرہ بیگم بین کرنے لگی۔

خبر غلط نہیں تھی۔ پندرہ بیس آدمیوں کے ساتھ ایک گھڑسوار ہیرا منڈی میں داخل ہوا تھا۔ زربرگ کی شیروانی، چوڑی دار پاجامہ، چوڑا چکلا کسرتی بدن، کنپٹی سے ٹھوڑی تک گہرے زخم کا نشان، سر پر سہرا بندھا ہوا، شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کی طرف آرہا تھا۔ اس کے

ساتھی چھواروں کے تھیلے اٹھائے مٹھیاں بھر بھر کے اچھالتے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ سب
بھی گلاب کے پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ نجانے کیوں ہیرا منڈی والے اس سے
خوفزدہ ہو رہے تھے۔ بارات شمشیرہ بیگم کے کوٹھے تک پہنچ گئی اور دولہا نیچے اتر آیا۔ پھر اس
کی دہاڑ سنائی دی۔

"کہاں مر گئے رے سارے کے سارے...... بارات آ گئی ہے اور حرامی سسرال والے
غائب ہیں۔ چلو بھئی، چلو اندر چلو...... یہ اپنی سسرال ہے۔"

اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور سارے کے سارے شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کی
سیڑھیاں طے کرنے لگے۔ اندر غلام شاہ، حاجو، شمشیرہ بیگم وغیرہ ایک قطار میں کھڑے
ہوئے تھے۔ ان سب کے چہرے پر دہشت منجمد تھی۔

"سلام صاحب جی! ہم آ گئے ہیں۔ دلہن تیار کر دو۔ قاضی جی ساتھ ہیں۔ کہہ گئے تھے
ہم تم سے کہ اب آئیں گے تو باراتی لے کر آئیں گے اور اپنی دلہن کو لے جائیں گے۔ کہاں
ہے ہماری دلہن؟"

شمشیرہ بیگم تھر تھر کانپ رہی تھی۔ کسی کے منہ سے آواز نہیں نکلی تھی۔

"ابے بیٹھ جاؤ...... کھڑے کیوں ہو...... چلو بے، دودھ ملائی کا بندوبست کرو۔ بیٹھو
قاضی جی! رجسٹر کھول لو۔ اے ساس جی، کھڑی ہوئی منہ کیا دیکھ رہی ہے، دلہن تیار کر۔"
اس نے شمشیرہ بیگم سے کہا۔

"دل...... دل...... دلدار، تُو...... تُو......"

"داماد کہہ بڑھیا! صرف داماد۔ ناک کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔ ارے سب کھڑے
ہوئے منہ کیا دیکھ رہے ہو، تیاریاں کرو۔"

اندر یہ ہو رہا تھا اور باہر جگہ جگہ مجمع لگا ہوا تھا۔ لوگ ٹولیاں بنائے کھڑے تھے۔
بالکونیاں بھر گئی تھیں۔ سب خوف بھری نگاہوں سے شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کی طرف دیکھ
رہے تھے۔ کسی کے منہ سے آواز نکلی۔

"ارے وہ...... وہ دیکھو گوگیا...... گوگیا پہلوان۔"

ایک بار پھر گردنیں گھوم گئیں۔ دس بارہ تانگے ہیرا منڈی میں داخل ہوئے تھے جن میں
گوگیا پہلوان اپنے آدمیوں کے ساتھ موجود تھا۔ گوگیا پہلوان کی اچانک آمد سے مزید سنسنی

پھیل گئی تھی۔ بس اب کچھ ہونے ہی والا تھا۔ ہیرا منڈی پر خون کے بادل لہرا رہے تھے۔
اصل میں دلدار گھوڑا بھی لاہور کے ایک علاقے کا بدمعاش تھا، خاصا نام تھا اس کا اور خوب
دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ پچیس تیس گرگے تھے اس کے جو مار پیٹ اور بدمعاشی میں پکے
تھے۔ اچھے کام کر لیا کرتا تھا۔ کتنی ہی بار پولیس کا سامنا ہوا تھا اور پولیس اسے نظر انداز
کرنے لگی تھی۔ سنا گیا تھا کہ اس کی پشت پر کسی وزیر کا ہاتھ ہے اور وزیر انہی لوگوں کی مدد
سے الیکشن میں کامیاب ہوا ہے۔ چنانچہ دلدار گھوڑا ہر آفت سے محفوظ تھا۔ لیکن کسی بات پر
وزیر اس سے ناراض ہو گیا اور وہ یہیں مار کھا گیا۔ وزیر سے بگاڑ کر کچھ دن بعد اس کا گزر
شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر ہوا اور وہ کوثر جہاں کی پُرسوز آواز کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔ عشق و
محبت کے گداز سے تو ناواقف تھا، ہر پسندیدہ شے پر ڈاکہ مارنے کا عادی تھا۔ چنانچہ اس
نے کوثر جہاں اپنے نام لکھ لی اور شمشیرہ بیگم سے اس کی قیمت پوچھی۔ شمشیرہ بیگم نے اسے
نرمی سے سمجھایا کہ کوٹھے آرٹ گیلری ہوتے ہیں، دکان نہیں۔ تم یہاں نوادرات کی زیارت
کر سکتے ہو، انہیں خرید نہیں سکتے۔ اس بات پر دلدار گھوڑا بگڑ گیا۔

"تم ہمیں جانتی ہو شمشیرہ بیگم! ہم آرٹ گیلریاں ویران کر دیتے ہیں۔ بیچو گی نہیں تو
لوٹ لیں گے۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہو گا دلدار! ایسی غلطی نہ کرنا۔ آتے جاتے رہو، لطف اٹھاؤ۔ ہر چیز
ملکیت نہیں بنائی جاتی۔ لوٹ سکتے ہو تو جاؤ، شاہی قلعہ لوٹ لو اور اپنے گھر لے جاؤ۔"

"شاہی قلعہ بھی ہمیں پسند آیا تو ہماری ملکیت بن جائے گا شمشیرہ بیگم! ہماری مانو، کوثر
جہاں ہمیں دے دو۔ عزت سے گھر میں ڈال لیں گے ٹکے ٹکے بکنے سے بچ جائے گی۔"

"تو کیا نکاح کرو گے اس سے؟"

"اتنی ہی دل کو بھائی تو نکاح بھی کر لیں گے۔ تم اس کے لئے پریشان نہ ہو۔"

"تو گھر جاؤ، بارات لے کر آؤ۔ ذرا ہم بھی تو تمہارا عشق دیکھیں۔ کوٹھوں کے آداب
سیکھ کر آؤ۔ دلدار! شرفاء کی صحبت اختیار کرو۔ جوانی منہ زور ہوتی ہے، اسے اس طرح تباہ
مت کرو۔ ہمیں تم پر ترس آتا ہے۔" شمشیرہ بیگم نے کہا۔ وہ درحقیقت دلدار گھوڑا کی مکمل
شخصیت سے واقف نہیں تھی۔

"ہماری جوانی اور تباہ ہو جائے، بھلا وہ کیسے؟"

"یہ تو وقت ہی بتائے گا تمہیں۔"

"وقت...... ٹھیک ہے شمشیرہ بیگم! اگر ہم اس وقت کوثر جہاں کو لے گئے تو سوچو گی کہ تمہیں موقع نہیں ملا۔ ہم تمہیں موقع دے رہے ہیں سوچنے کا...... اور اب جب آئیں گے تو بارات لے کر ہی آئیں گے اور تمہیں بارات بلانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔"

"اگر ایسا ہوا تو ہم پھولوں کے ہار لے کر تمہارا استقبال کریں گے۔" شمشیرہ بیگم نے کہا۔ دراصل ان دنوں پولیس کے سب سے بڑے افسر سے شمشیرہ بیگم کی بڑی دوستی تھی اور انہیں اس افسر پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔

بہرحال دلدار چلا گیا لیکن اس نے ایک عجیب طریقہ کار اختیار کیا اور ہیرا منڈی پر آفت آ گئی۔ دلدار گھوڑا کے گرگے آ کر کوٹھوں پر ہنگامہ کرتے، دُکانوں پر لوٹ مار کرتے، لوگوں کو مارتے پیٹتے اور مطالبہ کرتے کہ شمشیرہ بیگم کو مجبور کریں کہ وہ کوثر جہاں کو دلدار گھوڑا کے حوالے کر دے۔ ہیرا منڈی والے روز روز کے ہنگاموں سے تنگ آ گئے تھے۔ شمشیرہ بیگم کسی سے دشمنی نہیں چاہتی تھیں لیکن اب مجبوری ہو گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے کوششیں شروع کر دیں اور پھر انہوں نے ایک دن دلدار کو پیغام بھیجا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتی ہے۔ لیکن مقصد کچھ اور تھا۔ سادہ کپڑوں میں پولیس والے تیار تھے۔ جونہی دلدار ہیرا منڈی میں داخل ہوا تو پولیس والوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ اگر وہ وردی میں ہوتے تو شاید دلدار سنبھل جاتا مگر یہ سب کچھ ایک سازش تھی۔ چنانچہ دلدار نے تین پولیس والوں کو شدید زخمی کر دیا۔ زخمیوں کو پہلے سے خون میں رنگی ہوئی وردیاں پہنا دی گئیں اور اس طرح پولیس والوں کو زخمی کرنے کے الزام میں دلدار کو گرفتار کر لیا گیا۔ تھوڑا سا مقدمہ چلا اور اسے تین سال کی سزا ہو گئی۔

بہرحال دلدار کے پیچھے اب کوئی خفیہ ہاتھ بھی نہیں تھا۔ لیکن جیل جانے سے پہلے اس نے شمشیرہ بیگم سے کہلوا دیا کہ اب تو میں جیل جا رہا ہوں لیکن جیل سے چھوٹتے ہی بارات لے کر آؤں گا اور کوثر جہاں کو رخصت کر کے لے جاؤں گا۔ چالاک وہ بھی تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد اس نے جلد بازی نہیں کی بلکہ اپنے لوگوں کے ذریعے معلومات حاصل کرتا رہا۔ اسے معلوم ہوا کہ پولیس آفیسر کا کہیں اور تبادلہ ہو گیا ہے۔ اسے یہ بھی پتہ چلا کہ ان دنوں گوگیا پہلوان ہیرا منڈی کا نظام سنبھالے ہوئے ہے۔ لیکن وہ اسے خاطر میں نہیں

لاتا تھا۔ چنانچہ اس وقت پوری تیاریوں سے اس نے ہیرا منڈی کا رخ کیا تھا۔ لیکن بالکل اتفاق تھا کہ گوگیا پہلوان اپنے غنڈوں کے ساتھ شمشیرہ بیگم کی فریاد پر رب نواز کا دماغ درست کرنے کے لئے ہیرا منڈی آیا تھا۔ یہ لوگ تانگوں میں بھر کر آئے تھے اور ان کا خیال تھا کہ رب نواز کے تین چار آدمی اس کے گروہ کے آنے کی خبر سن کر اپنے گھر سے نکلنے کی جرأت بھی نہیں کریں گے۔ اس نے سوچا تھا کہ رب نواز کو سڑک پر نکال کر مرغا بنائے گا اور خوب بے عزت کرنے کے بعد ان کا سامان ان کے کندھوں پر رکھوا کر کہے گا کہ آئندہ ہیرا منڈی کا رخ نہ کریں۔ لیکن جب تانگے ہیرا منڈی میں داخل ہوئے تو اس نے جگہ جگہ لوگوں کے مجمعے دیکھے۔ دکانیں دھڑا دھڑ بند ہو رہی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

"لگتا ہے رب نواز نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ اسے پتہ چل گیا ہو گا کہ شمشیرہ نے اپنا آدمی ہمارے پاس بھیجا ہے۔"

"چلو...... شمشیرہ کے کوٹھے کے آگے تانگے روکو اور ذرا پکارو اس ماں کے یار کو۔" گوگیا پہلوان نے کہا اور تانگے آن کی آن میں شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کے سامنے آ رکے۔ اندر گھوڑا دھاڑ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"اب بلاؤ شمشیرہ بیگم! اپنے یاروں کو...... بڑی چال چلی تھی دلدار کے ساتھ۔ کہہ دیا تھا تجھ سے کہ دلدار جو سوچ لیتا ہے وہ کر کے دم لیتا ہے...... بارات آ گئی ہے۔ قاضی جی ساتھ ہیں۔ کہاں ہیں پھولوں کے ہار۔ مگر تُو تو کنجری ہے...... تیری زبان بھی کوئی زبان ہے۔ تیرا واسطہ آج تک شاید کسی مرد سے نہیں پڑا۔"

"دلدار تجھے خدا کا واسطہ۔" شمشیرہ بیگم ہاتھ جوڑتے ہوئے کانپتی ہوئی بولیں۔

"ارے واہ رے واہ...... یاروں کو یاد کرنے والی آج خدا کو یاد کر رہی ہے۔ ارے چیلو! کتیا کے پلو، جاؤ دلہن کو لے کر آؤ۔" اسی وقت دلدار گھوڑا کا ایک گرگا لپک کر اندر آیا۔

"استاد دس بارہ تانگے آ کر رکے ہیں وہ لکے کے آدمی ہیں کیونکہ لکا بھی ان کے ساتھ ہی ہے اور گوگیا پہلوان بھی۔"

"ارے ارے...... موت آئی ہے اس کتے کی جو ہمارے سامنے آیا ہے۔ کل تک سبزی بیچا کرتا تھا۔" دلدار گھوڑا تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے خونی نگاہوں سے شمشیرہ بیگم کو

دیکھا اور بولا۔

''مان گئے ری کنجری تجھے...... بڑی جلدی بلا لئے یار۔ مگر پرواہ مت کر۔ انہیں بہنوئی بن کر ہی دکھائیں گے۔ سنو بے، تم تین آدمی یہیں رکو۔ یہ بھاگنے نہ پائیں۔ اور یہ سسری اپنی جگہ سے ہلے تو ناک کاٹ دینا اس کی آؤ......'' دلدار گھوڑا نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور سب بھرا مار کر باہر نکل گئے۔ نیچے سے گوگیا کی گرج سنائی دے رہی تھی۔

''ابے او ماں کے جنو...... نیچے آؤ، ذرا باپ سے بھی مل لو۔ باپ نیچے کھڑا ہے اور تم اوپر لٹک رہے ہو۔''

''آ رہے ہیں کنجر...... آ رہے ہیں سالے ترکاریوں والے۔ باپ کی زندگی ترکاریاں بیچتے بیچتے گزر گئی اور بیٹا تھانیدار بنا ہے۔ ابھی تیری تھانیداری ختم کرتا ہوں۔''

گوگیا کے خواب میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اوپر سے کون برآمد ہوگا۔ دلدار کو دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا لیکن اسے سمجھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ دلدار کے ساتھیوں نے نیچے اترتے ہی گوگیا کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا۔ اور اب بات آن پر آ گئی۔ حملہ کرنے والوں کو بھلا جواب نہ دے کر کسے پیٹھ دکھانی تھی۔ چنانچہ سوچے سمجھے بغیر کہ جھگڑا کس سے ہے، کام شروع ہو گیا...... اور ویسے بھی اس وقت اپنی حیثیت کو قائم رکھنا تھا۔ کیونکہ بات ہیرا منڈی کی تھی۔ بہت بڑی آمدنی ہوتی تھی یہاں سے۔ رعب کے بل پر ہی تو پیسے ملتے تھے۔ ورنہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ چنانچہ گوگیا پہلوان کی لڑائی اس وقت مجبوری کی لڑائی تھی۔ اس کے ساتھی بھی کم نہیں تھے۔ زبردست جنگ کا آغاز ہو گیا...... ہیرا منڈی کے لوگ بھاگنے لگے۔ بہت سے کوٹھوں پر چڑھ گئے اور اس لڑائی کا نظارہ کرنے لگے۔ چٹانیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ دلدار نے سہرا اتار پھینکا اور آگے بڑھتا ہوا بولا۔

''ابے او ٹنڈے، کریلے بیچنے والے! سبزی کا ٹھیلہ لگاتے لگاتے بدمعاشی کرنے نکل پڑا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ بہنوئی کا نام دلدار گھوڑا ہے۔ سامنے آ سالے...... کدو کی طرح پھاڑ کر نہ رکھ دوں تو دلدار نام نہیں۔''

ان الفاظ پر گوگیا کو بھی طرارہ آ گیا اور اس نے چھرا نکال لیا۔ دلدار کے آگے آ کر وہ پینترے بدلنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا تھا۔ وہ ایک ہی وار میں دلدار کا

پیٹ پھاڑ دینا چاہتا تھا۔

دفعتہً گوگیا کے ایک ساتھی نے پیچھے سے دلدار پر وار کیا اور دلدار پلٹ پڑا۔ گوگیا نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی لیکن گھوڑے کے آدمی بھی اپنے استاد کی نگرانی کر رہے تھے۔ گوگیا اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا اور دلدار بال بال بچ گیا۔ لڑائی پورے شباب پر تھی اور کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا...... پوری ہیرا منڈی میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ سانس روکے دونوں گروہوں کی یہ خونی جنگ دیکھ رہے تھے۔ ایک شور مچ رہا تھا۔ طرح طرح کی آوازیں آ رہی تھیں اور یہ آوازیں سن کر ہی رب نواز شاہ باہر نکلا تھا۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ پھر اس نے ایک تختے کے نیچے چھپے ہوئے پھول والے کی ٹانگ پکڑ کر اسے باہر گھسیٹا۔

''ابے کہاں گھسا ہوا ہے گدھے...... یہ کیسا دنگل ہو رہا ہے؟''

''چھچھ...... چھوڑ دیجئے...... لل!...... لپیٹ میں آ گئے تو مارے جائیں گے...... خدا کے لئے چھوڑ دیجئے۔'' پھول والے نے کہا۔

''سن تو سہی پتر...... کون لڑ رہا ہے...... کیا ہندو مسلمانوں کا جھگڑا ہو گیا ہے؟''

''دلدار گھوڑا آ گیا ہے۔'' پھول والے نے کانپتے ہوئے کہا۔

''ایں...... گھوڑا...... ابے گھوڑا تو مجھے کہیں لڑتا ہوا نظر نہیں آ رہا۔ سیدھا کھڑا ہو جا، ذرا بات تو بتا، ہوا کیا؟ وہ تو لڑ رہے ہیں مگر تجھ پر لگ رہا ہے اس کا بھوت آ گیا ہے۔'' چیخ کی ایک دلدوز آواز نے شاہ جی کی توجہ ہٹا دی اور پھول والا اس کی گرفت سے نکل بھاگا۔

''بات کچھ لمبی ہی لگتی ہے شاہ جی۔''

''پتہ نہیں کون بھوتنی کے ہیں...... جاؤ ذرا دیکھو، ہماری ضرورت تو نہیں ہے؟'' رب نواز شاہ نے کہا اور ان کے آدمی صورتحال کا جائزہ لینے لگے۔ رب نواز نے کہا۔

''کچھ زیادہ ہی گڑبڑ لگ رہی ہے۔ سنو نور شاہ! دیکھتے ہیں کیا ہو رہا ہے۔ بڑے گھمسان کا رن چل رہا ہے۔''

پھر ساری تفصیل شاہ جی کو معلوم ہوئی کہ ایک بدمعاش شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر چڑھ گیا تھا۔ گوگیا کے گروہ نے اسے للکارا اور دونوں کے گروہوں میں زبردست چل رہی ہے۔''

''شمشیرہ کے کوٹھے پر؟'' رب نواز چونک پڑے۔

"جی۔"

"شہزادے......" رب نواز کی نگاہیں اکرام کی طرف اٹھ گئیں۔ "کون ہے یہ؟"

"جھگڑا بڑا ہے شاہ جی! کئی آدمی لمبے ہو گئے ہیں۔ گھوڑے کا پلّہ بھاری پڑ رہا ہے۔ لوگ یہی کہہ رہے ہیں۔"

"یہ ہے کون آخر؟" رب نواز شاہ نے بھنویں سکوڑ کر پوچھا۔

"دلدار گھوڑا ایک بدمعاش ہے۔ سزا کاٹ کر نکلا ہے اور کوثر جہاں کو لے جانے کی بات کرتا ہے۔ اسی کا دولہا بن کر اور بارات لے کر چھلانگیں لگاتا ہوا آیا ہے۔ گوگیا نے بروقت پہنچ کر اس کا راستہ روکا ہے ورنہ وہ کوثر جہاں کو لے کر چلا گیا ہوتا۔" اکرام کی بجائے شالے خان نے کہا جو معلومات حاصل کر کے آیا تھا اور رب نواز نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

"میری ماں کو اٹھانے آیا ہے وہ۔ میں...... میں اسے......" اکرام نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا اور نیفے سے چاقو نکال کر باہر کی طرف لپکا لیکن شاہ جی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے لٹکا لیا۔

"نہیں پتر! بری بات ہے۔ بڑوں سے مشورہ کرتے ہیں، دماغ کو ٹھنڈا رکھتے ہیں۔ جتنا دماغ گرم رکھو گے اتنا ہی نقصان اٹھاؤ گے۔ چلو فضل خان! ہتھیار نکالو۔ مجبوری ہے۔" اور فوراً ہی فضل خان، شالے خان اور دلبر خان اندر دوڑ گئے۔ صندوق کھولے گئے۔ کلہاڑے، برچھے نکال لئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی لمبے لمبے مخصوص قسم کے ڈنڈے اور پتلی چمکدار لاٹھیاں بھی نکالی گئیں۔ لاٹھیوں کے دونوں سرے آپس میں ملا کر ان کی لچک کا جائزہ لیا گیا اور خاص قسم کے ننچکو بھی نکال لئے گئے جن کے سروں پر کانسی کے دو لٹو بنے ہوئے تھے۔ آتشیں اسلحہ بھی تھا۔ لیکن کراچی یونیورسٹی کے تربیت یافتہ، جنگ و جدل کے ماہر رب نواز شاہ کو معلوم تھا کہ کون سے اسلحے کا استعمال کتنے سنگین جرم کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ جو اسلحہ ساتھ لیا گیا تھا وہ آتشیں نہیں تھا۔ ہاں اگر مقابل پارٹی کی طرف سے آتشیں اسلحے کا استعمال ہوتا تو پھر اس کا بھی معقول انتظام تھا۔

چنانچہ رب نواز کی آرمی تیار ہو گئی اور میدان میں آ گئی۔

"آؤ......" انہوں نے آہستہ سے کہا۔ اکرام بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ باہر بدستور قیامت مچی ہوئی تھی۔ دلدار کے آدمیوں نے گوگیا کے دس آدمی لمبے کر دیئے تھے اور اس کے ساتھی مسلسل پٹ رہے تھے۔ خود لکا کا سر پھٹ چکا تھا مگر وہ سر پر رومال باندھ کر مسلسل لڑ رہا تھا۔

لڑائی کا پلہ دلدار گھوڑے کے حق میں گیا تو وہ دوبارہ شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر چڑھ گیا اور اندر سے دوبارہ چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ رب نواز سب سے آگے تھا۔ اس کے ساتھ اکرام، باقی ساتھی پیچھے۔ بالکونیوں سے، دکانوں کے تختوں سے ہر جگہ سے ان لوگوں کو دیکھا گیا۔ رب نواز کی چال میں ایک انوکھا وقار تھا۔ وہ اس وقت کسی فوج کا جنرل لگ رہا تھا اور اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ لڑنے والوں کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس کی کڑک دار آواز تمام آوازوں پر چھا گئی۔

"رُک جاؤ کتے کے پلو...... کیا عورت کی طرح چیخ چیخ کر رہے ہو...... حرام زادو، میں تمہارا باپ تمہارے سامنے کھڑا ہوں...... اور تم اس کے سامنے کبڈی کھیل رہے ہو۔ کون سے ہیں گوگیا کے ٹٹو! جھگڑا چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں۔"

بات تھی کچھ آواز میں۔ اثر ہوا اور ایک لمحے کے لئے سب کے ہاتھ رک گئے۔ گردنیں گھوم گئیں اور لڑنے والے ادھر دیکھنے لگے۔

"اگر بات کانوں تک نہیں پہنچی تو دوبارہ سن لو، گوگیا کے آدمی سب ادھر کھڑے ہو جائیں۔ جلدی کرو کمین زادو ورنہ جو سامنے پڑے گا ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔" رب نواز کی آواز ابھری اور ساتھ ہی انہوں نے ایک سمت اشارہ کیا۔ آواز ہی کا سحر تھا کہ گوگیا کے بچے کھچے ساتھی پیچھے ہٹ گئے اور رب نواز کی بتائی ہوئی جگہ پر جا کھڑے ہوئے۔ خود گوگیا بھی کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ سب کی نظریں شاہ جی پر جمی ہوئی تھیں۔ رب نواز دلدار گھوڑے کے آدمیوں کو دیکھ کر بولا۔

"کہاں ہے وہ کتیا کا جنا جو دولہا بن کر اپنی ماں کے گھر آیا ہے...... کون ہے تم میں سے دلدار؟"

اسی وقت شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کی سیڑھیوں سے غلام شاہ لڑھکتا ہوا نیچے آ گرا۔ اوپر سے شمشیرہ بیگم کے بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر زینے کے اوپر سے دلدار نیچے اترا۔ وہ کوثر جہاں کی کلائی پکڑے ہوئے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چاقو لہرا رہا تھا۔ وہ کوثر

جہاں کو گھسیٹتا ہوا نیچے لا رہا تھا حالانکہ پہلے وہ نیچے ہی لڑ رہا تھا۔ لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ اس کے آدمی گوگیا کے آدمیوں پر چھا گئے ہیں اور گوگیا کی ترم خانی دم توڑ چکی ہے تو وہ اطمینان سے اوپر چڑھ گیا تھا اور کوثر جہاں کو اس کے کمرے سے گھسیٹ لایا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے غلام شاہ کی اچھی خاصی مرمت کر دی تھی۔ اور جب غلام شاہ نے دلدار کے پیروں سے لپٹ کر اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے لات مار کر اسے نیچے پھینک دیا تھا۔ دلدار گھوڑے نے نیچے اترنے کے بعد قہقہہ لگا کر کہا۔

"بارات لے کر آئے تھے شمشیرہ بیگم! رخصت کر کے لے جا رہے ہیں دلہن کو۔ اب جو کیا جائے کر لینا۔"

اکرام نے یہ منظر دیکھا تو طیش سے بے قابو ہو کر زینے کی طرف جھپٹا لیکن شاہ جی نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دلدار سے مخاطب ہو کر بولے۔

"ابا کھڑے ہیں تیرے...... باپ کی اجازت کے بغیر ہی شادی رچانے آ گیا۔"

تب پہلی بار خاص طور سے دلدار نے اسے دیکھا اور اس کے بعد اپنے آدمیوں کو اور اس کے بعد گوگیا کے الگ کھڑے ہوئے آدمیوں کو جو سب کے سب کٹے پھٹے تھے۔

"تمہیں موت کیوں آ گئی ہے۔ مارو، ہر اس آدمی کو مارو جو راستے میں آئے۔" دلدار گھوڑے نے حکم دیا اور اس کے آدمیوں میں جیسے زندگی دوڑ گئی۔ وہ سنبھلے ہی تھے کہ ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سب سے پہلا وار نور شاہ نے کیا تھا اور اپنا عجیب و غریب ہتھیار گھمایا تھا۔ پہلے ہی حملے میں دو کی کمر ٹوٹ گئی۔ دلبر خان نے زنجیر کھولی۔ کانسی کے گولے جس کے بھی پڑے وہ ڈھیر ہو گیا۔ فضل خان اور شالے خان کی لاٹھیاں گردش کرنے لگیں اور شائیں شائیں کی آوازوں سے ماحول گونج اٹھا۔

گوگیا کے آدمیوں نے ایک بار پھر آگے بڑھنا چاہا تو شاہ جی نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"خاموش کھڑے رہو، بیچ میں آئے تو کھوپڑیاں کھل جائیں گی۔" ان کے قدم ایک بار پھر رک گئے۔ شاہ جی کا کہنا بالکل درست تھا۔ کھوپڑیاں کھل رہی تھیں اور لاٹھیاں گھوم رہی تھیں۔ اس طرح گھوم رہی تھیں کہ نظر بھی نہیں آ رہی تھیں۔ اکیلے فضل خان نے چھ سات گرا دیے تھے۔ دوسروں کو زیادہ محنت ہی نہ کرنی پڑی۔ خود رب نواز نے تو ہاتھ بھی نہ ہلایا

تھا۔ دلدار اس افتاد سے گھبرا گیا۔ اس نے کوثر جہاں کا ہاتھ چھوڑا اور وہ جلدی سے اوپر بھاگ گئی۔

"آؤ...... ادھر آؤ دولہا میاں! ذرا ہم بھی نظر اتاریں تمہاری۔ نظر لگ جائے گی۔ آ جاؤ، منہ پر رومال رکھ کر آ جاؤ۔ بہت شرما رہے ہو۔" رب نواز نے مسکراتے ہوئے کہا اور دلدار اِدھر اُدھر کھسکنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس آدمی کے سامنے سب جی چھوڑ چکے ہیں اور صرف پٹ رہے ہیں۔ ایک بار پھر رب نواز نے انہیں دیکھا اور بولے۔

"جس کا پیٹ بھر گیا ہو وہ نیچے بیٹھ جائے۔ اور سنو فضل خان، جو نیچے بیٹھ جائے اسے مت مارنا۔ سن ابے او ماں کے یار! یہ جو چاقو تیرے ہاتھ میں ہے اس سے اپنا آدھا کان کتر کر سامنے پھینک دے اور چیخ چیخ کر ہیرا منڈی میں جتنی عورتیں رہتی ہیں ان سے کہہ دے کہ وہ سب تیری مائیں اور بہنیں ہیں...... فوراً کام شروع کر دے کمینے! ہماری کھوپڑی گھوم رہی ہے۔"

ایک لمحے کے اندر اندر دلدار گھوڑا کے تمام آدمی نیچے بیٹھ گئے اور مجبوراً رب نواز کے آدمیوں کو ہاتھ روکنا پڑے۔ دلدار گھوڑے نے رب نواز کی بات سن کر جلدی سے چاقو ہاتھ سے پھینک دیا۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اکرام غصے سے کانپ رہا تھا۔

"لاؤ اسے ہمارے سامنے نور شاہ! لاؤ اسے...... اور چل بے اکرام! چاقو نکال لے۔ چٹنی چٹا دے آج اسے۔" رب واز نے پھر کہا۔ لیکن دلدار کو ایک اور موقع مل گیا...... اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور دس پندرہ گز کا فاصلہ طے کر کے ایک دوسرے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ لیکن اسی وقت دلبر خان نے زنجیر گھما کر پھینکی۔ صرف ایک سیکنڈ کی دیر ہو گئی تھی ورنہ زنجیر لپٹ گئی تھی دلدار کے پیروں سے۔

کوٹھے پر پہنچ کر وہ اس کی چھت پر پہنچا اور وہاں پہنچ کر دوسری چھت پر، پھر تیسری پر اور پھر آن کی آن میں وہ نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ ہیرا منڈی کے لوگوں نے، کوٹھے والیوں نے زندگی میں پہلی بار اتنا عجیب و غریب تماشا دیکھا تھا۔ پانسہ ہی پلٹ گیا تھا۔ نہ گوگیا دلدار گھوڑے کا کچھ بگاڑ سکا تھا۔ اور اس کے آدمی الٹے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ نہ ہی اس کے بعد دلدار کے آدمی ٹک سکے تھے۔ صرف چار آدمیوں نے وہ کھیل دکھایا تھا

جو نا قابل یقین تھا۔

"سالے ہیجڑے......لڑنے آئے تھے۔ زنخوں سے لڑ کر اوزار گندے کیے۔" رب نواز نے منہ بنا کر کہا اور اکرام کا ہاتھ پکڑ کر واپس اپنے ڈیرے کی طرف چل پڑے۔ گوگیا عقب سے انہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پیچھے پلٹ کر بالکونی میں کھڑے لوگوں سے پوچھا۔

"کیا یہی رب نواز تھے......؟"

ہاں کی بہت سی آوازیں مختلف لوگوں کے منہ سے نکلی تھیں اور گوگیا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"مرو جلدی سے یہ گندگی اٹھاؤ......تانگوں میں بھرو، کہیں پولیس نہ آجائے۔"

ٹوٹے پھوٹے لوگ اپنے زخمی ساتھیوں کو ڈنڈا ڈولی کر کے اپنے تانگوں میں ڈالنے لگے اور سارے تانگے تھوڑی ہی دیر میں ہیرا منڈی سے باہر نکلنے لگے۔ اس کے بعد دلدار گھوڑے کے آدمی اپنے ساتھیوں کو سمیٹنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ساری صفائی ہو گئی لیکن ہیرا منڈی کے باسیوں نے دانتوں میں انگلیاں دبا رکھی تھیں۔ شاہ جی کو انہوں نے گھر کی مرغی سمجھا تھا لیکن آج جو رنگ سامنے آیا تھا وہ نا قابل یقین تھا۔ دلدار گھوڑا جلاد تھا۔ تین سال پہلے اس نے جس طرح ان پر مظالم ڈھائے تھے انہیں وہ آج تک نہیں بھول سکے تھے۔ گوگیا اور اس کے ساتھیوں کی شکست دیکھ کر ہیرا منڈی والوں نے سوچا تھا کہ برے دن آگئے۔ اب ہیرا منڈی چھوڑ کر ہی بھاگنا پڑے گا۔ لیکن اچانک شاہ جی نے چند لمحات میں کھیل ختم کر دیا۔ بڑے سکون اور اطمینان سے انہوں نے اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلایا تھا۔ بس کسی بڑے جرنیل کی طرح میدان کی نگرانی کر رہے تھے اور ان کی فارمین آرمی نے دشمن کو خاک و خون میں نہلا دیا تھا۔

"بلے بلے بھائی جی...... میں نے بڑی لاٹھیاں چلتی ہوئی دیکھی ہیں لیکن ایسا کمال پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ چاروں کسی بڑے خلیفہ کے شاگرد لگتے ہیں۔"

"خیر اپنی بھی نہیں ہے۔"

"کیوں ڈرا رہے ہو......ہم نے کیا، کیا ہے؟"

"کیا نہیں کیا؟ اس دن دعوت کی تھی شاہ جی نے ہماری۔ ہم نے محلے داری کا خیال بھی

نہیں کیا اور اس دعوت میں نہیں گئے۔ انہیں سینکڑوں لوگوں کا کھانا فقیروں کو کھلانا پڑا۔ کیا وہ ہم سے خوش ہوں گے؟"

"مگر اب ہوگا کیا؟"

"جو کیا ہے بھگتو۔"

"مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ اگر خود شاہ جی لاٹھی سنبھال لیتے تو دس بیس لاشیں ہی اٹھتیں یہاں سے۔"

"ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ تم اس گوگیا پہلوان کو دیکھو، کتے کے بچے نے چوڑے میں مروا دیا۔ اس کے آدمی کہہ کر گئے تھے کہ شاہ جی کا بائیکاٹ کیا جائے۔ انہوں نے ہی جان بچائی نہیں تو گھوڑا ٹھنڈا کر گیا تھا۔"

"ارے باتیں کیے جا رہے ہو...... یہ خون وغیرہ صاف کرو۔ ٹوٹ پھوٹ کے نشانات مٹا دو ورنہ پولیس گردن میں لٹک جائے گی۔"

"بات ٹھیک ہے......"

اور پھر سب نے مل کر جھگڑے کے نشانات مٹا دیئے۔ سڑک پر یہ باتیں ہو رہی تھیں اور کوٹھوں پر بہادری کے چرچے تھے۔ یہ بات سب نے محسوس کی تھی کہ شمشیرہ بیگم نے جن کے خلاف محاذ بنایا تھا آج انہوں نے ہی شمشیرہ بیگم کے گھر کو بچا لیا اور ہیرا منڈی کی عزت رکھ لی۔ خود شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر سکوت طاری تھا۔ غزالہ اور شبانہ سہمی ہوئی تھیں۔ کوثر جہاں اپنے کمرے میں پڑی رو رہی تھی۔ شمشیرہ بیگم سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ غلام شاہ فرش پر لمبے پڑے تھے۔ حاجو نے ان کی کمر اور گھٹنے میں ہلدی چونا لگایا اور دودھ میں پھٹکری ڈال کر پلائی تھی۔ کم بخت گھوڑے نے ایک ہی لات میں انہیں بال کی طرح اچھال دیا تھا۔ ایک اور بائی جی آئیں اور انہوں نے کہا۔

"شمشیرہ بیگم! کیا سوچ رہی ہو؟"

"مقدر کو رو رہی ہوں۔"

"نہیں...... یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اب یہ بتاؤ آگے کیا کرنا ہے۔ پولیس میں رپورٹ درج کراؤ گی؟"

"جیسا تم کہو۔"

"ہماری رائے ہے کہ ایسا نہ کیا جائے۔ اس وقت تو سچی بات یہ ہے کہ شاہ جی نے تم پر بڑا احسان کیا ہے۔ ورنہ گوگیا تو گھوڑے کے آگے چوپا نکلا، اس نے تو مروا ہی دیا تھا۔"

"ارے مجھے تو سب ملی بھگت لگتی ہے۔" شمشیرہ بیگم نے کہا۔

"کیسی ملی بھگت؟"

"تم ان بدمعاشوں کے چلتر نہیں جانتی۔ اپنے پیر جمانے کے لئے یہ ایسی ایسی چالیں چلتے ہیں کہ سمجھنا مشکل ہو جائے۔ ہوسکتا ہے یہ بھی ایک چال ہو۔"

"نہیں شمشیرہ بیگم! کم از کم اس معاملے میں تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ جو مار پڑی ہے دلدار گھوڑے کو اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ خیر اگر تمہیں پولیس میں رپورٹ کرانا ہے تو خبردار، گواہوں میں ہمارا نام نہ لکھوانا۔"

"تو کیا اکیلا چھوڑ دو گی تم سب مجھے؟"

"بابا سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ جو تمہارا دل چاہے تم کرو...... اور جو ہمارا دل چاہے گا ہم کریں گے۔"

"ٹھیک ہے...... جیسی تم لوگوں کی رائے۔ میں رپورٹ نہیں لکھواؤں گی۔"

پولیس آئی۔ سب نے ایک ہی بیان دیا کہ بدمعاشوں کے دو گروہ لڑ پڑے تھے۔ وہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے کسی کو کچھ نہیں معلوم...... اس طرح بات رفع دفع ہو گئی۔

○●○

"وقت تو بے شک گزر گیا تھا لیکن ہیرا منڈی میں موجود دکاندار اور ہر وہ شخص جس کا تعلق کسی کوٹھے سے تھا، کوئی سارنگی نواز، کوئی طبلہ نواز، گھروں کے باورچی، غرض جتنے افراد نے یہ ہنگامہ آرائی دیکھی تھی ان سب کا یہی خیال تھا کہ اب تو یہ کہنا پڑے گا کہ قدرت نے ہیرا منڈی کے لوگوں کی مدد کی ہے اور ایک ایسا مددگار بھیج دیا ہے جو بظاہر صرف پانچ افراد پر مشتمل ہے لیکن شاید وہ اپنی دلیری اور بہادری کی بنا پر پورے بریگیڈ کا کام کر سکیں۔ گوگیا اور دلدار گھوڑا نجانے کیا کیا منصوبے بنا کر آئے تھے۔ وہ آپس میں لڑ رہے تھے۔ یہ اندازہ نہیں تھا کہ دونوں میں سے کس کا پلہ بھاری ہے۔ لیکن جب شاہ جی کی انٹری ہوئی تو سب کے باجے بج گئے۔ ایسا رعب طاری ہوا کہ پھر کسی کی کچھ نہ چل سکی۔ دلدار گھوڑا جلاد تھا۔ اس جلاد کو سنبھالنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہاں تک کہ گوگیا

پہلوان کے آدمی پہلے ہی مرحلے پر شکست کھا گئے تھے اور بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ اگر اس میں کامیابی ہو جاتی تو کوثر جہاں تو گئی تھی شمشیرہ بیگم کے ہاتھ سے۔ لیکن شمشیرہ بیگم بھلا یہ احسان ماننے والی کہاں۔ حالانکہ بعد میں غلام شاہ نے ان سے کہا تھا۔

"میں کہتا ہوں شمشیرہ بیگم! آپ اسی وقت کچھ مٹھائی اور پھول لے کر شاہ جی کے پاس چلی جائیں۔"

"کیا......؟" شمشیرہ بیگم اچھل پڑیں۔

"اتنا تو کرنا ہی پڑے گا آپ کو شمشیرہ بیگم! بچا لیا انہوں نے اس دن کوثر جہاں کو۔ ورنہ لے گیا تھا۔"

"تم تو پاگل ہو گئے ہو غلام شاہ! پاگل پن کا علاج کون کرے تمہارا۔ اے میں کہتی ہوں شاہ جی نے میرے کلیجے میں خنجر گھونپا ہے اس کا تمہیں کچھ خیال نہیں ہے۔ ہائے نعمان فضلی کا غم بھلائے نہیں بھولتا...... ابھی ملا ہی کیا تھا ان سے۔ راوی کنارے والی کوٹھی مل جاتی تو کیا ہی بات ہوتی۔ سب لٹ گیا...... سب چھن گیا اور تم کہہ رہے ہو کہ میں جا کر اس موئے کا شکریہ ادا کروں۔"

"مگر اس سلسلے میں تو سارا قصور اکرام کا ہے۔"

"اور اکرام کو بگاڑنے میں کس کا قصور ہے؟" شمشیرہ بیگم ناک چڑھا کر بولیں۔

"وہ الگ بات ہے۔ شاہ جی اسے پکڑ کر تو نہیں لے جاتے۔ وہ خود ان کے پاس جاتا ہے۔ روک لے اسے۔"

"اور پیٹ میں چاقو اتروا لوں۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ فضلی کے بارے میں کیا، کیا جائے؟ کیسے ان سے ملیں؟ ہائے ہاتھ آئی دولت کا ڈھیر کیسے نکل گیا۔"

"اس سلسلے میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ سوائے کوثر جہاں کے۔"

"کوثر جہاں بھی اب کچھ نہیں کر پائے گی غلام شاہ! کرمو نے اسے بھی مجبور کر دیا ہے۔"

"بات تو کریں۔" غلام شاہ نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ شمشیرہ بیگم کو کچھ بتانے لگا۔ بات شاید شمشیرہ بیگم کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ حاجو کو بلایا اور مٹھائی کا ایک ٹوکرا منگوا لیا۔ مٹھائی جگہ جگہ تقسیم کی گئی اور پھر ایک پلیٹ میں مٹھائی رکھ کر وہ کوثر جہاں کے کمرے میں

داخل ہوگئی۔ کوثر جہاں تسنیم کو کپڑے پہنا رہی تھی اور غزالہ اس کی مدد کر رہی تھی۔

''کوثر! منہ کھولو ذرا۔'' شمشیرہ بیگم نے مٹھائی کی ڈلی انگلیوں میں دبا کر کہا۔

''کیا ہے اماں؟''

''مٹھائی ہے...... نیاز دلائی تھی داتا صاحب کی۔ اب کالے بکرے قربان کروں گی۔ اللہ نے میری بچی کو آفت سے بچایا ہے۔'' پھر انہوں نے غزالہ سے کہا۔

''غزالہ! جاؤ تسنیم کو باہر لے جاؤ، مجھے بات کرنی ہے۔''

غزالہ معنی خیز انداز میں مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ شمشیرہ بیگم نے کہا۔

''کوثر! نعمان فضلی کے بارے میں کچھ سوچا تم نے؟''

''میں کیا سوچوں اماں!''

''وہ کوٹھی تم نے دیکھی تھی۔ جو تمہارے لئے بنوا رہے تھے۔''

''ہاں دیکھی تھی۔''

''بیٹی! کیا اسے ہاتھ سے جانے دو گی؟''

''لو، تو میں کیا کروں اماں؟''

''ٹھنڈے دل سے ایک بات بتاؤ بیٹی! کیا اکرام نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا؟''

کوثر جہاں تھوڑی دیر تک سوچ میں ڈوبی رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ''یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکیں گی اماں!''

''ہاں بیٹی! ساری عمر ایسے ہی تو گزار دی ہے۔ کیا کہیں اور کیا نہ کہیں اکرام کے بارے میں۔ بس اتنا ہی کہیں گے کہ اولاد کسی کی بھی ہو مگر پیدا تو کوٹھے پر ہوا ہے۔ آج وہ ماں کے راستے کو بری نگاہ سے دیکھتا ہے مگر اسی ماں کی کمائی تو خون بن کر دوڑ رہی ہے اس کی رگوں میں۔ اور پھر ابھی وہ ہے کتنے برس کا۔ ماں کو پیشے سے روکے گا تو کیا کھلائے گا اسے، کہاں رکھے گا۔ بس یوں سوچو، اس کے ذہن میں بری سوچیں ڈال دی گئی ہیں بیٹی! جو کچھ ہوا ہے وہ اس کی اپنی سوچ نہیں ہے۔''

''تو پھر؟''

''بس...... کیا کہوں۔ اللہ کی مار پڑے اس پر۔ مرتے وقت کم بخت کو پانی نصیب نہ

ہو۔ بچے کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا۔ وہی زہر کی پڑیا ہے بیٹی! وہی زہر کی پڑیا ہے۔''

''شرم کرو اماں! کچھ شرم کرو۔ خدا نے تم سے تمہاری شرم بھی چھین لی ہے۔ یہ ہے اس کے احسان کا بدلہ؟''

''ارے اس کے پیچھے بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ وہ چاہتا کیا ہے یہ تو کچھ پتہ چلے۔ دس بیس ہزار روپیہ لینا ہے تو لے کر ہماری جان چھوڑے۔ آخر وہ یہ احسانات کیوں کر رہا ہے ہم پر...... میں تو بڑی پریشان ہوں۔ آگے نجانے کیا ہونے والا ہے۔''

دفعتہً ہی کوثر جہاں کے چہرے کے نقوش بدل گئے۔ ایک عجیب سی سنجیدگی اس کے چہرے پر چھا گئی اور اس نے کہا۔

''اس کی ایک ہی ترکیب ہے اماں۔''

''کیا......؟'' شمشیرہ بیگم چونک پڑیں۔

''اکرام کے باپ کو تلاش کرو اور اس کے حوالے کر دو اسے۔ سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ کوٹھے کی دولت کوٹھے پر رہے گی اور وہ جس کی دولت ہے اس کے پاس چلا جائے گا۔'' کوثر جہاں نے شمشیرہ بیگم کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور شمشیرہ بیگم کسی سوچ میں ڈوب گئیں۔ پھر انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ہاں...... کرتی ہوں...... کوشش کرتی ہوں...... ٹھیک کہہ رہی ہو۔ واقعی اگر ایسا ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہے...... بڑی اچھی بات ہے اگر ایسا ہو جائے تو۔ ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ واقعی ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''تو پھر کب یہ کام شروع کر رہی ہو اماں؟''

''بس اس کی ذمے داری تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم یوں کرو کہ نعمان فضلی کو ایک ایسا خط لکھ دو کہ کھنچے چلے آئیں۔ بس وہ کوٹھی مل جائے ہمیں، اس کے بعد بھاڑ میں جائیں۔ ان جیسے بہت سے آتے پھرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... دیکھتے ہیں اماں! تم ادھر وہ کام کرو اور ادھر میں کرتی ہوں۔''

اسی وقت غزالہ واپس آئی اور بولی۔ ''اماں! کچھ مہمان آئے ہیں۔''

''اس وقت کون ہے؟ کیا نعمان فضلی؟'' شمشیرہ بیگم نے اچھل کر کہا۔

''نہیں...... بالکل نہیں۔ وہ اصل میں رحمت خان صاحب ہیں۔ رحمت خان، وہ جو

شاید نواب شاہ سے آتے ہیں۔"

"اے بھاڑ پڑے ان کے منہ پر۔ چلو بلاؤ، دیکھیں کیوں آئے ہیں۔" شمشیرہ بیگم نے کہا اور غزالہ تسنیم کو کوثر کی آغوش میں دے کر باہر نکل گئی۔ شمشیرہ بیگم یاد کرتی رہیں کہ رحمت خان کون تھے۔ بہرحال اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی پرانے جاننے والے ہی ہوں گے۔ باہر نکل آئیں تو رحمت خان کی صورت تک یاد نہ آئی۔ لیکن اس طرح صدقے واری ہونے لگیں جیسے رحمت خان سے بڑی پرانی دوستی ہو۔

"کتنے بدل گئے آپ خان جی! اور کتنے عرصے کے بعد آئے ہیں۔ یاد کر کے آنکھیں بھی دھندلا گئیں۔ کہئے، کیسے مزاج ہیں؟"

"بس شمشیرہ بیگم! ٹھیک ہیں۔ آپ کی دعائیں ہیں۔ اللہ سائیں آپ کو خوش رکھے۔ آپ نے اتنے عرصے یاد تو رکھا۔ اس وقت ہم آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آئے ہیں۔"

"سر آنکھوں پر...... سر آنکھوں پر...... بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟"

"نواب شاہ کے خیر بخش حضوری کا نام تو آپ نے سنا ہی ہو گا۔"

"لیجئے، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اتنے بڑے لوگوں کو کون نہیں جانتا۔ ویسے ذرا کچھ ذہن سے اتر گئے ہیں۔"

"بس جی، گوٹھ حضوری جا کر دیکھیں، حیران رہ جائیں گی۔ ریگستان کو جنت بنا دیا ہے سائیں خیر بخش نے۔ بے شمار گاؤں کے مالک ہیں۔ سینکڑوں باغ اور کوٹھیاں ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے موسیقی سے عشق کرتے ہیں۔ ایک نقطہ پسند آ جائے تو لاکھوں لٹا دیں۔ بڑی شان ہے آپ کی دعا سے۔ آپ کے اس محبت کرنے والے سے بڑی اچھی دوستی ہے۔ اصل میں چھوٹے سائیں مراد بخش سخت بیمار ہو گئے تھے۔ اب ٹھیک ہوئے ہیں۔ ان کا جشن صحت منایا جا رہا ہے۔ پاکستان بھر سے گانے والیاں اور رقاصائیں بلائی جا رہی ہیں۔ میں ایک بار ادھر آیا تھا اور میں نے کوثر جہاں کی آواز سنی تھی۔ بس ذمے داری لگا دی گئی میری کہ سائیں رحمت اگر کوثر جہاں شریک نہ ہوئی تو کچھ بھی نہ ہوا۔ تو بس آپ یہ سمجھ لیجئے کہ لمبا فاصلہ طے کر کے لاہور آ گیا۔ ایک ہفتے کا جشن ہے۔ جو مانگیں گی وہ ملے گا۔"

"ایک ہفتہ......" شمشیرہ بیگم سچ مچ پریشان سی ہو کر بولیں۔ "ایک ہفتہ تو بہت ہوتا ہے

خان جی!"

"ہاں، یہ دو لاکھ روپے ہیں۔ پرسائی کے طور پر بھجوائے ہیں شاہ جی نے۔ آپ یہ رکھ لیں اور یہ سمجھیں پرسائی بھی نہیں ہے۔ یہ تو بس پاندان کے لئے ہے۔"

"ارے روپیہ تو ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔ اصل قیمت تو قدر دانی ہوتی ہے۔ بھلا پیسے کی کیا حیثیت ہے۔ ارے کوئی ہے، غلام شاہ، حاجو! مہمان آئے ہیں، کچھ لاؤ۔"

بہرحال مہمانوں کے سامنے شربت وغیرہ پیش کیا گیا اور اس کے بعد رحمت خان سارے معاملات طے کر کے تاریخ وغیرہ طے کر کے اٹھ گئے۔ شمشیرہ بیگم کہنے لگیں۔

"بس کیا، کیا جائے شاہ جی! یہ کوٹھے اسی لئے تو ہوتے ہیں۔ جسے دیکھو اپنا شوق پورا کرنے آتا ہے۔ دو دھاری گائے کے سینگ بھی سہنے پڑتے ہیں۔ کچھ جانتے ہو خیر بخش حضوری کے بارے میں؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ نواب شاہ اور اس کے آس پاس کی بہت بڑی شخصیت ہیں۔ کئی بار الیکشن میں بھی حصہ لے چکے ہیں۔ ایک بار کوئی بڑے سرکاری عہدیدار بھی رہ چکے ہیں۔ زمینداری تو کمال کی ہے۔"

"کوثر کے معاملے میں ذرا سی الجھی ہوئی ہوں۔ ان دنوں بڑی سرکشی آ گئی ہے دماغ میں۔" شمشیرہ بیگم نے دانت پیس کر کہا۔

"تم نے داؤ بھی تو ایسا مارا ہے شمشیرہ بیگم کہ چاروں خانے چت ہو گئی ہے۔"

"تم ایک کام کرو غلام شاہ! تمہیں یاد ہے، بہت عرصہ پہلے، بڑے سال گزر گئے، تم سمجھ لو کہ بارہ تیرہ سال پہلے کی بات ہے، ایک تماش بین آتے تھے ہمارے ہاں۔ نام شاید ظہیر الدین تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ظہیر الدین ہی اس لڑکے کو لے کر آئے تھے۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں۔ عورت ہوں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے۔ مجھے اچھی طرح اکرام کا چہرہ یاد ہے، اسی لڑکے کا ہم شکل ہے۔ مطلب یہ کہ اسی کی اولاد ہے۔ کہیں سے ظہیر الدین کو تلاش کرو۔ بات بہت اچھی ہو جائے گی۔ ویسے میں سوچتی ہوں کہ آ کر کسی کا نام ضرور بتاؤ کسی وقت کوثر جہاں کے سامنے اور یہ ظاہر کرو کہ ہم لوگ بڑی تندہی سے اس کام کو کر رہے ہیں۔"

"تو آپ اب ظہیر الدین کو تلاش کریں گی جو آپ کو اکرام کے باپ کا پتہ بتا دے۔"

"اچھا بھی ہے۔ لے جائے خاک پڑے کو۔ پاپ کٹے گا۔"

"ٹھیک ہے...... کرتا ہوں کوشش۔ ویسے بچے کا باپ مل بھی گیا تو ایک بات بتایئے، کیا ماں بھی اس کے ساتھ جانے کی کوشش نہیں کرے گی؟"

شمشیرہ بیگم ایک دم چونک کر ساکت ہوگئی تھیں۔ کچھ دیر تک خاموش رہیں اور پھر اس کے بعد پُرخیال انداز میں بولیں۔

"کہتے تو ٹھیک ہو۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔"

"سمجھ لیں ہاتھ ملتی رہ جائیں گی شمشیرہ بیگم۔ میری بات مانو تو اکرام کو برداشت کرو۔ تمہارا پورا مستقبل کوثر سے وابستہ ہے۔ اسے ہاتھ میں رکھنے کے لئے اکرام کا یہاں رہنا ضروری ہے۔"

"ہائے مگر اس کنجر کا کیا کروں جس کا نام رب نواز ہے۔ اس نے کیا چکر چلا رکھا ہے ذرا دیکھو، اکرام کیا سے کیا بن گیا ہے۔"

"بن رہا ہے تو بننے دو۔ چاقو باز بنے گا، بدمعاشی کرے گا، دو چار قتل کر کے جیل چلا جائے گا یا پھانسی ہوگی۔ تمہارا کیا بگڑے گا۔ جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔"

"ہاں...... وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میرے کلیجے میں جو چھری گھونپی ہے اس نے...... اس کے زخم کو کیسے بھولوں۔ اگر اسے رب نواز کا سہارا نہ ہوتا تو اس کی مجال تھی کہ اس طرح فضلی کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ اس سے پہلے کبھی اس نے ترکاری کاٹنے کا چاقو بھی ہاتھ میں نہیں پکڑا تھا۔ یہ سب اس شاہ جی کا کیا دھرا ہے۔ ہائے شاہدرے والی کوٹھی کو تو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ راتوں کو خوابوں میں دیکھتی ہوں اسے۔ ارے کیا نقصان کر دیا اس نے میرا۔"

"ایک بات بتاؤں، پوری پالیسی بدل دو۔ اکرام سے محبت کا اظہار کرو۔"

"کیا......؟" شمشیرہ بیگم کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"ہاں پالیسی...... پالیسی شمشیرہ بیگم۔ اکرام سے محبت کا اظہار کرو۔ کوثر جہاں نرم پڑ جائے گی۔ وہی کوشش کر کے نعمان فضلی کو دوبارہ اپنی مٹھی میں لے سکتی ہے۔"

"اس بارے میں اس سے بات تو ہوئی ہے لیکن اس نے ایک طرح کی شرط رکھ دی ہے کہ پہلے اکرام کے باپ کو تلاش کر کے اکرام کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔"

"اور تم تیار ہو گئیں۔" غلام شاہ ہنس کر بولا۔

"ہاں...... وعدہ تو کر لیا ہے میں نے۔"

"وہ تم سے زیادہ چالاک ہے شمشیرہ بیگم! خیر تم بھی اسی چالاکی سے کام لو۔ اور ہاں نواب شاہ جانے کی تیاریاں کرو۔ یہ جو پیغام آیا ہے تمہارے ہاں حضوری خاندان کا، بہت بڑے لوگ ہیں یہ۔ سمجھ لو شاید نعمان فضلی سے بھی بڑی پارٹی نکلے۔"

"اے سچ کہہ رہے ہو؟"

"جھوٹ بولنے کی مجھے کیا ضرورت ہے شمشیرہ بیگم! ظاہر ہے میری بھی روزی یہیں سے ہے۔"

"تو پھر یہ بتاؤ کیا، کیا جائے؟"

"بس تھوڑی سی مٹھائی اور کچھ ہار پھول کے لے کر شاہ جی کے پاس چلی جاؤ۔ کوثر جہاں پر اچھا اثر پڑے گا۔"

"ارے میرے مولا...... یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"کیوں؟"

"کل ہی کی بات ہے غلام شاہ! محلے میں اسی کے خلاف باتیں کرنے گئی تھی۔ لوگ کیا سوچیں گے؟"

"بس جو بھی سوچیں، تم سمجھتی نہیں ہو، سیاست اسی کو کہتے ہیں۔ تم ذرا ان سیاستدانوں کو دیکھو جو ملک پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ کوئی دین ایمان نہیں ہوتا ان کا۔ بس آج جس سے سب سے زیادہ دشمنی ہے کل اسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہوں گے۔ میری تو یہی رائے ہے کہ اب تم یہی کام کرو۔"

شمشیرہ بیگم خود بھی بہت چالاک خاتون تھیں چنانچہ انہوں نے حاجو سے مٹھائی کے ڈبے اور پھلوں کے ٹوکرے منگوائے اور اس کے ساتھ ہی پھولوں کے ہار بھی اور یہ تمام چیزیں ایک تھال میں رکھ کر کوثر جہاں کے پاس پہنچ گئیں۔

"خیریت اماں! یہ سب کیا چکر ہے؟"

"بس بیٹا...... دن رات تم سب کی بہتری کے لئے سوچتی رہتی ہوں۔ دیکھو زندگی کی انتہا تو موت ہی ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ اپنے بچوں کے لئے اتنا کچھ چھوڑ جاؤں کہ انہیں کبھی کوئی تکلیف نہ ہو۔ ورنہ اپنا کیا ہے، آج مرے کل دوسرا دن۔"

کوثر جہاں، شمشیرہ بیگم کی رگ رگ سے واقف تھی۔ سمجھ گئی کوئی اہم مسئلہ ہے۔ سوالیہ نگاہوں سے ماں کو دیکھتی رہی تو شمشیرہ بیگم نے کہا۔

”شاہ جی کے لئے ہمیشہ دل میں کینہ رہا اور اس کی بنیادی وجہ تم جانتی ہو۔ بس مجھے تو بچے کے بگڑنے پر افسوس تھا۔ مگر دیکھو وہ کمبخت گھوڑا آ گیا۔ نجانے وہ کیا سے کیا کر دیتا۔ ایسے موقع پر شاہ جی نے ہی ہماری مدد کی۔ ان کا یہ احسان بھولا تو نہیں جا سکتا۔ میں شروع سے ان کی مخالفت کرتی رہی ہوں چنانچہ اب کس منہ سے ان کے پاس شکریہ ادا کرنے جاؤں۔ بہت سوچنے سمجھنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے ذریعے اپنے شکریے کے جذبات ان تک پہنچا دوں۔ یہ چیزیں ان کے پاس لے جاؤ۔ میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کر دو۔“

کوثر جہاں ایک لمحے کے لئے چونک پڑی۔ دل تو اس کا بھی یہی چاہتا تھا کہ جا کر شاہ جی کے قدموں سے لپٹ جائے۔ شاہ جی تو اس کے لئے ایک ڈھال بنتے جا رہے تھے۔ کیا کچھ نہ کیا تھا انہوں نے۔ وہ نہ ہوتے تو نجانے کیا ہوتا۔

”ٹھیک ہے اماں...... آپ کہتی ہیں تو میں چلی جاتی ہوں۔“

”ہاں بیٹا! جس نے احسان کیا ہو اس کا احسان ماننا ضروری ہے۔“

”اکرام کے سلسلے میں آپ نے کیا، کیا؟“

”بس یوں سمجھ لو، سر دھڑ سے مصروف ہو گئی ہوں اور معلومات حاصل کر رہی ہوں۔“ شمشیرہ بیگم نے جان بوجھ کر ظہیر الدین کا نام نہیں لیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خود کوثر جہاں ظہیر الدین کی تلاش میں لگ جائے۔

○●○

بدمعاشوں کی بھی ایک دنیا ہوتی ہے۔ بے شمار مسائل ہوتے ہیں۔ لمحہ لمحہ زندگی اور موت کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ ایک طرف گوگیا پہلوان کی ساری ہوا اکھڑ گئی تھی اور اسے یوں لگا تھا جیسے ہیرا منڈی ہاتھ سے نکل گئی ہو تو دوسری طرف دلدار گھوڑے کو زندگی کی بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ساری ہوا اکھڑ گئی تھی۔ اس نے اپنا علاقہ ہی چھوڑ دیا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ کوثر جہاں کی محبت میں دیوانہ تھا۔ جیل کے تین سال اس نے کوثر جہاں کے تصور میں گزارے تھے۔ شمشیرہ بیگم نے اس پر طنز کیا تھا، اس لئے اس نے عہد کیا تھا

کہ کوثر جہاں سے نکاح کروا کر ہی چھوڑے گا۔ لیکن ان کم بختوں کے بارے میں اسے کچھ نہیں معلوم تھا جو چھلاوے تھے۔ صرف چار آدمیوں نے اس کے تمام ساتھیوں کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ اگر وہ ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو نجانے اس کے ساتھ کیا ہوتا۔ ان کے بارے میں اسے کچھ نہیں معلوم تھا حالانکہ اس کے ساتھیوں نے ہیرا منڈی کے بدمعاش گوگیا پہلوان کے آدمیوں کے نتھنے توڑ دیئے تھے لیکن وہ چھلاوے نجانے کیا تھے۔ بہرحال وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کے بعد کیا ہو گا۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے اپنا قیمتی سامان سمیٹا اور راتوں رات اپنے علاقے سے رفو چکر ہو گیا۔ ویسے بہت سے ٹھکانے تھے اس کے۔ اس طرح کے لوگ نجانے کس کس کے لئے کام کیا کرتے ہیں۔ اسے نواب شاہ یاد آیا جہاں کے ایک علاقے حضوری گوٹھ میں اس کے ایک کرم فرما رہتے تھے۔ ان کا نام خیر بخش حضوری تھا۔ بس وہاں پہنچ گیا اور نواب شاہ سے ایک تانگے میں بیٹھ کر حضوری گوٹھ چل پڑا۔ تانگے والا حضوری گوٹھ کا ہی رہنے والا تھا۔

”بابا سائیں! حضوری گوٹھ میں آپ کس کے گھر جاؤ گے؟“

”بڑے سائیں کے پاس جا رہا ہوں...... خیر بخش حضوری۔“

”اچھا اچھا...... آپ کو چھوٹے سائیں کے بارے میں تو معلوم ہو گا ہی۔“

”کون، مراد بخش؟“

”ہاں سائیں! چھوٹے سائیں تو مرتے مرتے بچے ہیں۔ بس اللہ سائیں نے بچا لیا۔ ورنہ سارے ڈاکٹر تو جواب دے گئے تھے۔“

”ارے کیا ہوا تھا انہیں؟“

”بس سائیں...... اللہ سائیں کی مرضی۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ مگر سائیں خیر بخش نے بھی جان کی بازی لگا دی تھی۔ اب اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہیں۔“

حضوری گوٹھ کے آثار نظر آنے لگے۔ بہت بڑی عید گاہ حضوری گوٹھ کا صدر دروازہ تھی۔ اس کے بعد ایک بہت شاندار باغ جو حضوری گوٹھ کی شناخت تھا۔ بہرحال وہ سائیں خیر بخش کے پاس پہنچ گیا۔ سائیں خیر بخش کوئی معمولی شخصیت نہیں تھے۔ اس وقت وہ اپنی مخصوص طرز کی کوٹھی کے لان پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ دلدار گھوڑے کو دیکھ کر پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ غور کرنے کے انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔ اور پھر ان کی آواز

ابھری۔

’’آہا......گھوڑے بابا! تمہیں گھوڑا کہتے ہوئے دل نہیں مانتا۔ کبھی تمہاری ریس نہیں دیکھی۔‘‘

’’سائیں حضوری نے کبھی اس کا موقع ہی نہیں دیا۔‘‘

’’بہت عرصے کے بعد آئے ہو......خیر تو ہے؟‘‘

’’سائیں جیل میں تھے۔‘‘

’’اچھا اچھا...... ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ۔ مردوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ کتنی کاٹی؟‘‘ خیر بخش نے پُرمزاح انداز میں کہا۔

’’تین سال۔‘‘

’’دھت تیرے کی......اس کا مطلب ہے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ تین سال کی بھی کوئی سزا ہوتی ہے؟ جاتے تو چودہ سال کے لئے جاتے۔ تین سال کی سزا تو بس لچے لفنگے کاٹتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے اب کے تمہیں پندرہ بیس سال کے لئے بھجوا دیں۔ کچھ بات تو بنے گی۔‘‘

’’سائیں جوتوں تلے ہوں آپ کے......غلام ہوں آپ کا......جیسی آپ کی مرضی ہو۔‘‘

’’نہیں دلدار گھوڑے...... ہمارے غلام جیل نہیں جاتے۔ کس کی مجال ہے کہ ہمارے کسی غلام کو ہماری اجازت کے بغیر جیل میں ڈال دے۔ تم جب تک ہماری غلامی میں تھے کسی نے آنکھ بھی ٹیڑھی نہیں کی تھی تمہارے ساتھ۔ مگر تم نے اپنا پٹا کھول پھینکا۔ ہم نے غور بھی نہیں کیا۔ اکثر ہمارے سرکش جانور زنجیر توڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ شکاری ہم سے پوچھتے ہیں تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ چارہ کھایا ہے ہمارا۔ جانے دو۔ ہمارے ہی ہاتھوں مارا گیا تو کیا فائدہ؟‘‘

’’بس سائیں! آپ کے قدموں میں معافی مانگنے ہی حاضر ہوا ہوں۔‘‘

’’چلو جو کام ہے وہ بتاؤ۔ چاپلوسی کی باتیں مت کرو۔‘‘

’’سائیں! آپ کی طبیعت کو جانتا ہوں۔ جو دل میں ہے وہ کہے دے رہا ہوں...... لاہور کی ایک طوائف زادی سے عشق ہو گیا ہے مجھے۔ اس کی ماں نے اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر سزا کرائی تھی۔‘‘

’’دھت تیرے کی۔ ڈوب کر مر جاتے دلدار گھوڑے۔ بہرحال داغدار گھوڑوں کو ہم جنگل کا راستہ دکھا دیتے ہیں۔ ہمارے اصطبل میں جھانک کر دیکھو، سارے گھوڑے بے داغ ملیں گے تمہیں۔ مگر کیا کرتے تم، دو پیسے کے کتے نکلے اور اب تم ایک طوائف کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہو کر ہمارے پاس آئے ہو۔ ایک طوائف کی کوشش پر تین سال کی سزا وہ بھی ہمارے کسی آدمی کو، نہیں......تم ہمارے آدمی ہی نہیں ہو۔‘‘

’’آخری بار معافی مانگتا ہوں سائیں! باقی آپ جو حکم دیں گے، چلا جاؤں گا۔‘‘

خیر بخش حضوری نے دلدار گھوڑے کی صورت دیکھی اور بولے۔

’’تو اٹھا لاؤ اسے......کیا مشکل ہے اس میں؟‘‘

’’یہی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔‘‘

’’تو پھر دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ تم ہمارے کام کے نہیں رہے۔ ناکام لوگوں سے ہمیں نفرت ہے۔ جا سکتے ہو۔‘‘ خیر بخش کے یہ الفاظ آخری ہوا کرتے تھے۔

پھر اس کے بعد دلدار گھوڑے کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ مراد بخش سے ملے۔ مراد بخش ایک انتہائی حسین نوجوان تھا۔ بیماری نے اسے توڑ دیا تھا لیکن اس کمزوری میں بھی حُسن بے مثال تھا۔ دلدار گھوڑے سے بہت اچھی طرح ملا اور دلدار گھوڑے نے اسے اپنی بپتا سنا دی۔

’’یار! کمال ہے، تم نے ایک معمولی سی بات کا ہوا بنا رکھا ہے۔ طوائف تو پیسے کی ہوتی ہے۔ قیمت ادا کرو اور خرید لو۔‘‘

’’یہی تو میں نہیں چاہتا چھوٹے سائیں! بلکہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن کچھ لوگ میرے راستے میں آ گئے ہیں۔ بڑے سائیں اگر میری سرپرستی کر دیں......‘‘

’’ہوں......تو تم چاہتے ہو کہ اسے شرافت کے ساتھ اپناؤ۔‘‘

’’ہاں سائیں! گھر تو ایسے ہی بسائے جاتے ہیں۔‘‘

’’اچھا تم ایک کام کرو، ہمارے آدمی رحمت خان سے مل لو۔ رحمت خان ان دنوں طوائفوں کو جمع کر رہے ہیں۔ ہمارا جشنِ صحت منایا جا رہا ہے۔ اسے بھی بلا لیں۔ آئے گی تو دیکھ لیں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے سرکار! آپ کی بڑی مہربانی۔‘‘ دلدار گھوڑے کو ایک راستہ نظر آ گیا تھا۔

○●○

حاجو ایسے کاموں کے لئے سب سے بہتر تھا۔ چنانچہ کوثر جہاں نے اسے ہی ساتھ لیا تھا۔ حاجو اور کوثر، شاہ جی کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ حاجو سر سے پاؤں تک لدا پھندا تھا۔ رب نواز نے کوثر جہاں کو دیکھا اور ان کے چہرے پر خشکی پھیل گئی۔

"یہ سب کیا ہے کوثر جہاں بیگم؟" انہوں نے سامان سامنے رکھے دیکھ کر کہا۔

"اظہارِ تشکر کے طور پر حاضر ہوئی ہوں شاہ جی! اس احسان پر جو آپ کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔" کوثر جہاں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"کیسا احسان؟ ہم نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ ہم نے تو کچھ کیا اپنے بچے کے لئے کیا۔ شکریہ ادا کر کے ہماری بے عزتی نہ کیجئے۔" شاہ جی نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا اور کوثر جہاں سکتے میں رہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے بھی شاہ جی نے اس سے طنزیہ ہی گفتگو کی تھی لیکن بہر حال وہ ان کے احسانوں تلے دبی ہوئی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح ان کا شکریہ ادا کرے۔ آج جب اس نے شمشیرہ بیگم کی شہہ پائی تو وہ فوراً ہی آ گئی۔ لیکن شاہ جی کے الفاظ نے اسے گنگ کر دیا۔ اس نے حسرت ناک لہجے میں کہا۔

"آپ نے مجھے دلدار گھوڑے سے بچایا تھا شاہ جی! کیا اس میں میرے لئے کوئی جذبہ ہمدردی شامل نہیں تھا؟"

"معاف کیجئے گا کوثر جہاں بیگم! اس طرح کی باتیں آپ لوگوں کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔ آخر عیاش لوگ آپ کے طبقے کی عورتوں کو داشتہ بنا کر رکھتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ وہ آپ کی قیمت ادا کر دیتے ہیں اور وہ لفنگا قیمت ادا کئے بغیر آپ کو لے جا رہا تھا بس اتنا ہی تو فرق تھا۔" شاہ جی کا لہجہ انتہائی زہریلا تھا۔ کوثر جہاں چند لمحے خاموش رہی، پھر اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے شاہ جی کو دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"کیا خوش بختی کہیں بازار میں بھی ملتی ہے شاہ جی؟"

"سمجھے نہیں ہم، آپ کون سی خوش بختی کی بات کر رہی ہیں؟ آپ کی خوش بختی تو آپ کے گھنگھروؤں کی جھنکار میں ہے۔ آپ کے گلے کے میٹھے سُروں میں ہے۔ آپ کی آنکھوں کے مست ڈوروں میں ہے۔ جدھر نگاہیں اٹھا دیں مقتولوں کے ڈھیر لگ جائیں۔ آپ اس بات سے ناواقف تو نہیں ہوں گی کہ خوش بختی بہت سے گھرانوں سے چل کر آپ

کے دروازے تک پہنچتی ہے اور وہ گھرانے بدبختی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اتنی معصوم باتیں نہ کیجئے کوثر جہاں بیگم! جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہم جس جگہ رہتے ہیں وہاں کم از کم لفنگوں کا راج تو نہیں ہونا چاہئے ورنہ پھر ہماری کیا آبرو رہ جائے گی۔ ہم جو اس دن وہاں پہنچے تھے اور اس لچے اور اس کے چیلوں کو للکارا تھا، اس کی وجہ یہی تھی کہ ہم خود اپنی آبرو بچانا چاہتے تھے۔ ہمیں معاف کیجئے گا، آپ کا اس وقت زحمت فرمانا ہمیں بالکل پسند نہیں آیا۔ اور ہم نہیں چاہتے کہ آپ آئندہ بھی یہاں آئیں۔ رہی بات اکرام کی تو کوثر جہاں بیگم اور شمشیرہ بیگم، آپ لوگ یہ سن لیجئے کہ آپ میں سے کوئی بھی ہمارے اور اس کے راستے میں آیا تو ہم آپ کو ہرگز اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ آپ کے قبیلے کا نہیں ہے، ہمارے قبیلے کا ہے۔ وہ ہمیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ کیوں؟ یہ بات آپ کی سمجھ میں کبھی نہیں آئے گی۔ اس کے علاوہ ہمیں آپ سے کچھ نہیں کہنا۔ اور یہ جو کچھ آپ لائی ہیں ہمیں اس سے گھن آ رہی ہے۔ اس مٹھائی کو ہم اپنے حلق سے نیچے اتار کر اپنے وجود کو گھناؤنا نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ یہ چیز آپ کی کمائی کی ہے۔ لے جائیے اسے اپنے ساتھ۔ ہم اس محلے میں ضرور رہ رہے ہیں لیکن آپ لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے۔"

حاجو پتھر کا بُت بنا ہوا کھڑا تھا اور ادھر کوثر جہاں کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے پیروں کے نیچے زمین نہ رہ گئی ہو۔ اس کی ٹانگیں بے جان ہوتی جا رہی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر دیکھ کر سہارے تلاش کر رہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرے، شاہ جی مڑ کر اندر جا چکے تھے۔ تب حاجو نے کوثر جہاں سے کہا۔

"چلئے۔"

اور وہ اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ لیکن اس کے پورے بدن میں آگ ہی آگ بھری ہوئی تھی۔ گھر آ کر وہ بستر پر گری اور سسکیاں لینے لگی۔ وہ شاہ جی کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہی تھی۔ بہر حال اس کے بارے میں حاجو ہی نے شمشیرہ بیگم کو سب کچھ بتایا اور شمشیرہ بیگم ہانپتی کانپتی اس کے پاس پہنچ گئیں۔ کوثر جہاں کی حالت دیکھ کر بولیں۔

"کیا ہوا میری بچی...... کیا ہو گیا؟ کچھ تو بول، میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔"

کوثر جہاں اچانک اٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ شمشیرہ

بیگم نے اس کے رخسار پر ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔
"ہائے میری بچی، تُو بخار میں جھلس رہی ہے۔ مجھے بتا تو سہی کیا سلوک کیا تیرے ساتھ شاہ جی نے؟"
"کیا بتاؤں میں تمہیں...... کیا سننا چاہتی ہو؟ جہنم میں ڈال کر مجھ سے پوچھتی ہو کہ کیا ہوا۔"
"کیا کہا اس نے؟"
"وہی جو انہیں کہنا چاہئے تھا۔"
"میں جانتی ہو کیا کہا ہوگا...... ذلیل کیا ہوگا تجھے۔"
"ذلیل انہیں کیا جاتا ہے اماں! جن کی اپنی کوئی عزت ہوتی ہے۔ کیا تم اتنی ہی بھولی ہو؟ کیا تم یہ بات نہیں جانتی ہو کہ شریف لوگ حرام کی کمائی سے خریدتے ہوئے تحفے قبول نہیں کرتے۔ کیا کہوں، وہ تم ہی ہو اماں! جس نے اپنی حرص اور اپنے غلیظ عیش و آرام کی وجہ سے مجھے اور میرے معصوم بچے کو جہنم میں جھونک رکھا ہے۔"
شمشیرہ جہاں تھوڑی دیر تک اس کے پاس رہی اور اس کے بعد تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔
بہر حال وہ کسی بھی طور کوثر جہاں کو ہاتھ سے نہیں نکلنے دینا چاہتی تھی۔ وہی تو اس وقت ہیرا منڈی کا سرمایہ تھی۔ سب سے مہنگی، سب سے قیمتی۔ بہر حال وہ ہر طرح سے کوثر جہاں کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ ویسے بھی ایک اور آسامی سامنے آئی تھی۔ اسے نواب شاہ روانہ ہونا تھا۔ بہت کچھ سمجھایا بجھایا اسے اور خاصا نرم کرلیا۔ کوثر جہاں کو کہنے لگیں۔
"بیٹی! جتنا جی چاہے تُو ذلیل کرلے مجھے، ظاہر ہے ماں ہوں تیری۔ لیکن مجھے ایک بات بتا دے جن شریفوں اور شریف زادوں کی زندگی کو تُو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہے تُو نے کبھی ان کے کرتوتوں کے بارے میں بھی سوچا ہے؟ وہ اتنے ہی شریف ہیں تو یہاں کیوں آتے ہیں؟ یہاں آکر وہ جن کی ناز برداریاں کرتے ہیں جن کی محبت میں آہیں بھرتے ہیں ان سے شادی کیوں نہیں کر لیتے کہ اس بازار کا نام ونشان ہی نہ رہے۔"
کوثر جہاں کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اسے کوئی یاد آ گیا...... وہ جو اس سے بچھڑ گیا تھا۔ شمشیرہ بیگم کہنے لگیں۔

"ہاں...... غلطی تو ہوئی ہے مجھ سے کہ میں نے تجھے بلاوجہ شاہ جی کے ڈیرے پر بھیج دیا۔ واقعی برا کیا انہوں نے...... بہت ہی برا کیا۔"
پھر رات کے کسی پہر کوثر جہاں سوتے ہوئے اکرام کے پاس پہنچ گئیں۔ اکرام جاگ رہا تھا، کوثر جہاں کو دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔
"ارے تُو جاگ رہا ہے؟"
"ہاں......"
"مجھ سے باتیں کرے گا؟"
"تمہیں فرصت ہے؟"
"کیوں نہیں...... اب تو تجھ سے باتیں کرنے کو ترس گئی ہوں میں۔"
"تعجب ہے باجی...... کچھ دن پہلے میں تم سے باتیں کرنے کو ترستا تھا۔"
"مجھ سے کیوں ناراض ہے تُو؟"
"تم مجھ سے ناراض نہیں ہو؟"
"نہیں...... بھلا میں تجھ سے ناراض ہو سکتی ہوں؟"
"اس دن میں نے نعمان فضلی کی بے عزتی کی اور وہ یہاں سے چلے گئے۔ اس دن سے تم نے مجھ سے کب بات کی ہے۔"
"نہیں میرے بچے، ایسا نہیں ہے۔ اب تُو یہاں رہتا کب ہے۔"
"تو پھر تم واقعی اس بات پر ناراض نہیں ہو؟"
"نہیں...... بالکل نہیں...... تجھ سے خوش ہوں کہ تُو نے میری حفاظت کی ہے۔ میں تو یہی چاہتی ہوں کہ تُو میری حفاظت کے لئے ایک طاقت ور جوان بن جائے۔"
"کیا تم واقعی یہی چاہتی ہو باجی...... کیا واقعی...... اگر یہ بات ہے تو تم کیوں گاتی ہو؟ کیوں لوگوں کے سامنے بن سنور کر آتی ہو۔ نوں اگر کہتی ہیں تو تم انہیں منع کیوں نہیں کرتیں؟"
"کیونکہ یہ میری تقدیر ہے اکرام۔"
"کیسی تقدیر؟"
"تُو پڑھ رہا ہے نا...... اور پڑھے گا تو یہ سب کچھ تجھے معلوم ہو جائے گا......" وہ کہتے

کہتے رک گئی۔

"بہت کچھ معلوم ہے مجھے۔ننوں تمہارے برابر تھی تو وہ بھی ناچتی گاتی تھی۔ وہ بوڑھی ہو گئیں تو تم جوان ہو گئیں۔غزالہ باجی اور شبانہ بھی جوان ہو گئیں۔تم بوڑھی ہو جاؤ گی تو تسنیم جوان ہو جائے گی۔ یقین کرو باجی! اب تو مجھے تسنیم بھی بری لگنے لگی ہے۔ کیونکہ وہ تمہاری ننوں کی ہے۔مگر میں ایک بات کہوں تم سے، وہ کبھی ایسا نہیں کرے گی جیسا تم، غزالہ اور شبانہ کرتی ہیں۔تم لوگ مجھ سے بڑے ہو لیکن تسنیم مجھ سے چھوٹی ہے۔"

کوثر جہاں حیرت سے اکرام کی باتیں سن رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"تجھے یہ باتیں کون سکھاتا ہے؟"

"شاہ جی۔"

"شاہ جی تجھ سے بہت محبت کرتے ہیں؟"

"ہاں......"

"وہ اور کیا کہتے ہیں تجھ سے؟"

"کہتے ہیں اکرام تجھے بہت پڑھنا، بہت بڑا آدمی بننا ہے۔کوٹھوں کی روایت بدلنی ہے۔ یہ لوگ جو کوٹھوں پر اپنے نطفے چھوڑ جاتے ہیں، پیدا ہونے والوں کی حفاظت نہیں کرتے۔لیکن تجھے ترمیم کرنا ہوگی۔ وہ مجھے اسکول میں داخل کرانے والے ہیں باجی۔ وہ مجھے اسکول میں داخل کرانے والے ہیں۔"

"ٹھیک ہے......اگر وہ ایسا کرنے والے ہیں تو تُو پڑھ لکھ کر بڑا ہو جا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تسنیم بڑی ہو کر ناچے گائے گی نہیں۔ چاہے مجھے اس کے لئے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔" کوثر جہاں کا لہجہ فیصلہ کُن تھا۔

○●○

شمشیرہ جہاں بیگم اپنی پوری ٹیم کے ساتھ قراقرم ایکسپریس سے نواب شاہ جنکشن پر اتریں۔غلام شاہ اونٹ کی طرح منہ اٹھا اٹھا کر اپنا استقبال کرنے آنے والوں کو دیکھنے لگا۔ یہ ڈیوٹی کیونکہ رحمت خان کی تھی اس لئے رحمت خان استقبال کے لئے موجود تھا۔فوراً ہی شمشیرہ بیگم کے قریب پہنچ گیا۔ شمشیرہ بیگم اسے دیکھ کر کھل اٹھیں۔ جس پجارو میں شمشیرہ بیگم کو حضوری گوٹھ لایا گیا اس میں بیٹھ کر ہی شمشیرہ بیگم کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ اتنی عظیم الشان گاڑی زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ ایک چلتا پھرتا ڈرائنگ روم سا تھا جس میں انتہائی خوبصورت سیٹیں لگی ہوئی تھیں، پردے پڑے ہوئے تھے۔ پھر حضوری گوٹھ کی وہ حویلی جہاں مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

شمشیرہ بیگم نے سرگوشی کے انداز میں غلام شاہ سے کہا۔"اے غلام شاہ! یہ تو کوئی شاہی محل معلوم ہوتا ہے۔"

"بس ذرا کوثر جہاں کو سنبھال لو شمشیرہ بیگم! ایسی ہی جگہوں پر تقدیریں کھلتی ہیں۔"

اور کوثر جہاں کو خوب سنبھالا گیا۔ پتہ نہیں اکرام سے ہونے والی گفتگو تھی یا کوئی اور احساس جس نے کوثر جہاں کو بڑے اچھے موڈ میں کر دیا تھا۔ بے شمار گانے والیاں آئی تھیں اور ایک ہفتے کا جشن تھا۔ سب کچھ ہوا لیکن مراد بخش کے پیروں میں جو زنجیر پڑی وہ کوثر جہاں کے حُسن و جمال ہی کی تھی۔ مجسم قیامت، حُسنِ بلاخیز کو پتھر بنے دیکھ رہے تھے۔ آج ان کی صحت کے سات روزہ جشن کی تقریب میں کوثر جہاں کے گانے کی باری تھی اور کوثر جہاں نے جس طرح آواز کا جادو جگایا اس نے مراد بخش کے ہوش و حواس چھین لئے اور مراد بخش دیوانے ہو گئے۔ پتہ نہیں کیا کیفیت ہوئی تھی۔ بہر حال کوثر جہاں یہاں بہت خوش تھیں۔ پتہ نہیں کیوں دل کو ایک عجیب سی خوشی کا احساس تھا۔ بہر حال یہ سب کچھ چل رہا تھا اور ادھر بیچارے مراد بخش پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ وہ بری حالت کا شکار ہو گئے

تھے۔ کئی بار ان کا دل چاہا کہ کوثر جہاں کے معاملے میں قدم آگے بڑھائیں لیکن ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ تب ان کے گہرے دوست اور دست راست ریاض حسین ان کے پاس آئے۔

ریاض حسین کے سوا دل کا حال کسے بتایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ریاض حسین کو ساری تفصیل سنائی اور ریاض حسین نے وعدہ کر لیا کہ اس حسینہ عالم کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔ بہرحال ریاض حسین کام کے آدمی تھے۔ تفصیلات معلوم کر کے پہنچ گئے۔

"سائیں مراد بابا! تمہارا کام کر دیا ہے ہم نے...... انعام تیار کر لو۔"

"کون ہے وہ ریاض حسین! جلدی مجھے بتاؤ۔ ایسی عجیب حالت ہو گئی ہے کہ میں خود اپنے آپ پر ہنس رہا ہوں۔"

"کوثر جہاں نام ہے۔ لاہور کی ہیرا منڈی کی رہنے والی ہے۔"

"کوثر جہاں......" مراد بخش نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ جشن کی چھ راتیں گزر چکی تھیں، ایک سے ایک ہنگامہ پرور۔ لوگ خوشی سے دیوانے ہو گئے تھے۔ آج کی رات آخری محفل ہونے والی تھی اور آس پاس کے بہت سے وڈیرے اس محفل میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ شام آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ مراد بخش کے دل میں آگ سی لگی ہوئی تھی اور وہ بڑی عجیب سی کیفیت کا شکار تھے۔ بہرحال محفل کا آغاز ہوا اور شمشیرہ بیگم جو اپنی تیز نگاہوں سے مراد بخش کا جائزہ لے چکی تھیں، کوثر جہاں سے بڑی پُر امید تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ کوثر جہاں آج بھی چاند ہی کی طرح جگمگا رہی تھی۔ اہل محفل کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ ہلکے سبز رنگ کا غرارہ زیب تن کئے ہوئے تھی۔ دوپٹہ سر سے ڈھلکا جاتا تھا۔ لباس پر تلے اور ستاروں کے کام نے اہل محفل کی نگاہیں خیرہ کر دی تھیں۔ حیرت کی بات تھی اگر کوئی اسے اس محفل سے الگ دیکھ لیتا تو سوچتا کہ کوئی انتہائی شریف زادی غلطی سے بھٹک کر ادھر آ گئی ہے۔ بھلا اس کا ان باتوں سے کیا تعلق۔ بہرحال تیاریاں ہوئیں اور اس کے بعد خاص طور سے کوثر جہاں نے ایک غزل شروع کی۔ غزل کچھ یوں تھی۔

"حُسن کو شوخیٔ رخسار مبارک ہووے
جشن صحت میرے سرکار مبارک ہووے"

لوگوں کے سینوں میں دل نہیں تھم رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ساری محفل کسی جادو کے زیر اثر آ گئی ہو...... بات کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ بہرحال گوٹھ حضوری میں ایک نئی کہانی کا

آغاز ہو گیا تھا۔ چنانچہ دوسرے دن صبح بھی پچھلی رات کے چرچے ہر زبان پر تھے۔ کوثر جہاں نے واقعی ہر زبان کا حق ادا کر دیا تھا۔

"کیا خیال ہے اماں! اب واپسی ہو گی یہاں سے؟"

"ہاں، ہاں...... ٹھہرنے کے لئے تھوڑی ہی آئے ہیں۔ ویسے تم یقین کرو، مجھے آج صبح سے اکرام اور تسنیم یاد آ رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیسے ہوں۔"

"مجھے بھی بچوں کی فکر ہے اماں! اب یہاں دل نہیں لگ رہا۔"

"چلو ٹھیک ہے، واپس تو جانا ہی ہے۔ اجازت لے لیتے ہیں بڑے سائیں سے۔"

اور شمشیرہ بیگم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بات کافی آگے بڑھ گئی ہے۔ انہوں نے سائیں مراد بخش کے چہرے پر بہت کچھ دیکھ لیا تھا اور ان کا اندازہ بالکل درست تھا۔ سائیں مراد بخش ان سے ملنے کے لئے آ گئے۔ ایسے حسین اور بانکے جوان کو دیکھ کر شمشیرہ بیگم کی آنکھیں خود بھی معنی خیز انداز میں چکرائی تھیں۔ بہرحال انہوں نے بڑی عزت اور احترام کے ساتھ سائیں مراد بخش کو خوش آمدید کہا اور بولیں۔

"بڑی بات ہے سائیں، آپ سارے کے سارے فرشتے ہی لگتے ہیں مجھے تو۔ آپ اس طرح ہمارے پاس آئیں گے ہم نے تو کبھی یہ خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔"

"شمشیرہ بیگم! آپ نے تو رات کو محفل ہی لوٹ لی۔ بڑے سائیں کا احترام کرتے ہیں ہم۔ آپ کو کچھ دینا چاہتے تھے، ادھر آ گئے۔" مراد بخش نے اپنی جیب سے سچے موتیوں کا ایک ہار نکالا اور شمشیرہ بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"یہ فن کی قیمت نہیں بلکہ فن سے عقیدت ہے۔"

"محبت ہے آپ کی۔ اس قدر عزت افزائی پر بندی آپ کی شکر گزار ہے۔"

"وہ جن کا نام ہمیں کوثر جہاں بتایا گیا ہے، واقعی اہل فن ہیں...... کیا ہم ان سے مل سکتے ہیں؟"

"حضور، وہ آپ کے پیروں کی خاک ہے۔ مگر اس وقت وہ بے خبر سو رہی ہے۔ رات بھر جاگتی جو رہی ہے، لیکن پھر بھی میں اسے جگائے دیتی ہوں۔"

"نہیں نہیں...... آپ انہیں سونے دیجئے۔ ہم دوبارہ ملاقات کر سکتے ہیں۔ بعد میں آئیں گے۔"

شمشیرہ بیگم کو اس بات پر بڑی خوشی تھی کہ اتنی بڑی شخصیت اس طرح جال میں پھنس رہی ہے۔ کاش یہ نعمان فضلی کا بدل ثابت ہو سکے۔ مردوں کی رگ رگ سے واقف تھیں۔ جان بوجھ کر کوثر جہاں کے سونے کا بہانہ کیا تھا۔ بہرحال وہ چاہتی تھیں کہ سائیں مراد بخش لاہور کے چکر لگانے لگیں۔ اور ادھر معصوم صفت مراد بخش بالکل ہی نوخیز تھا اور نہیں جانتا تھا کہ ہیرامنڈی کی گھاگ طوائف کس سوچ میں ہے۔

بہرطور ریاض حسین کے علاوہ اور کون تھا جو دل کا دلدار ہوتا۔ جشن صحت کی تقریبات ختم ہو گئی تھیں...... دوسرے دن سب لوگ واپسی کے لئے چل پڑے اور خود شمشیرہ بیگم بھی اس کے لئے تیار ہو گئی تھیں۔ کوثر جہاں ظاہر ہے ایک مہمان کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ایسے تماش بین تو اسے ہر جگہ ملتے تھے۔ خود لاتعداد خوبیوں کی مالک تھی اس لئے لوگوں سے عموماً پذیرائی ہی ملتی تھی۔ ذاتی طور پر اس نے کبھی کسی پر توجہ نہیں دی تھی۔ اتفاق کی بات یہ کہ روانگی سے پہلے مراد بخش کو کسی کام سے بھیج دیا گیا تھا۔

بہرحال واپسی کا بندوبست کر دیا گیا...... حضوری گوٹھ سے نواب شاہ تک کے لئے سواری مہیا کر دی گئی۔ رحمت خان ہی چھوڑنے گئے تھے۔ شمشیرہ بیگم نے رحمت خان کو سونے کی ایک انگوٹھی تحفتاً پیش کی۔

''ارے نہیں شمشیرہ بیگم، اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''بس نیاز مندی کی بات ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ کی مرضی۔''

''بس ذرا خیال رکھئے گا۔ آپ ہمیں بالکل اپنے اپنے لگتے ہیں۔''

''آپ بالکل اطمینان رکھیں۔''

شمشیرہ بیگم نے یہ بات بالکل بھانپ لی تھی کہ سائیں مراد بخش اب محدود نہ رہیں گے اور صرف رحمت خان ہی ہیں جو ان کی رہنمائی کریں گے۔ اور اندازہ بالکل درست ہی نکلا۔ لاہور کسی صاحب دل کو اجنبی نہیں محسوس ہوتا۔ اور ویسے بھی سائیں مراد بخش یہاں کئی سال گزار چکے تھے۔ تعلیم کے سلسلے میں وہ یہاں آ کر رہے تھے۔

بہرحال دل کی لگی دھوکہ دہی کے ساتھ لاہور لے آئی۔ کسی کو بتائے بغیر پہنچے تھے۔ ہیرا منڈی میں ہانپتے کانپتے داخل ہوئے۔ ضرورت ہر چیز کے لئے رہنمائی کر دیتی ہے۔ د

یہاں پہنچے تو انہیں احساس ہوا کہ وہ بہت اناڑی اور ناتجربے کار ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر نگاہ ان پر پڑ رہی ہو۔ بہرحال انہوں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ کسی سے کچھ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ نگاہ ایک بارہ تیرہ سال کی عمر کے ایک لڑکے پر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ لڑکا کچھ انوکھا ہی تھا۔ سائیں مراد بخش نے اس سے پوچھا۔

''وہ بھائی جی، شمشیرہ بیگم کا گھر کہاں ہے؟''

''اس گلی میں نہ کوئی گھر ہوتا ہے اور نہ ہی شمشیرہ بیگم۔'' لڑکے نے جواب دیا اور مراد بخش سر کھجانے لگے پھر انہوں نے کہا۔

''عجیب سی بات کہی آپ نے۔ کیا نام ہے آپ کا؟''

''یہاں نام بھی نہیں ہوتے۔'' لڑکے کا جواب اس کی عمر سے زیادہ تھا۔ وہ پھر جلدی سے بولا۔ ''آپ کو کیا کام ہے شمشیرہ بیگم سے......؟''

اب مراد بخش اسے کیا بتاتا کہ کیا کام ہے اسے شمشیرہ بیگم سے۔ اچانک ہی پیچھے سے آواز آئی۔

''حضور من! آداب بجالاتا ہوں۔''

مراد بخش نے پلٹ کر دیکھا تو ایک جانی پہچانی شکل نظر آئی۔ یہ ایک سازندہ تھا جو شمشیرہ بیگم کے ساتھ حضوری گوٹھ آیا تھا۔ غلام شاہ نام تھا اس کا۔ بہرحال مراد بخش کی مشکل غلام شاہ نے حل کر دی۔ مراد بخش نے پلٹ کر دیکھا تو اس لڑکے کی آنکھوں سے شعلے نکلتے ہوئے نظر آئے۔ ایک عجیب سی نفرت اس کی آنکھوں میں رچی ہوئی تھی۔ وہ مڑ کر واپس چلا گیا۔ برے حوال جب ایک اتنا بڑا شخص شمشیرہ بیگم کے کوٹھے میں داخل ہوا تو شمشیرہ سر سے پیروں تک خوشی کا پیکر بن گئیں۔ انہیں ایک حسین مستقبل نظر آنے لگا۔ انہوں نے مراد بخش کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

''کیا دیکھ رہی ہیں میری آنکھیں...... کیا دیکھ رہی ہیں۔ میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس طرح چاند میرے آنگن میں اترے گا۔ آپ نے غریب خانے کو رونق بخشی، عنایت ہے آپ کی۔ ہم تو اسے اپنی خوش بختی ہی سمجھتے ہیں۔''

''یہ آپ کے آرام کا وقت ہو گا۔ ہم نے ناحق تکلیف دی ہے لیکن بس یہاں آئے تھے۔ سوچا آپ کو سلام کرتے چلیں۔''

"سر آنکھوں پر...... سر آنکھوں پر...... اپنے گھر میں آنے کے لئے کیا اس طرح کا تکلف کرتے ہیں؟"

"بہت شکریہ۔"

"آیئے بیٹھئے۔"

بہر حال مراد بخش بیٹھ گئے۔ اندر سے دل کانپ رہا تھا۔ پیشانی پسینے سے تر تھی۔
بہر حال شمشیرہ بیگم نے بڑی چاپلوسی کے ساتھ کوثر جہاں سے بات کی۔ کوثر جہاں تو ان دنوں شمشیرہ بیگم کی مٹھی میں تھی۔ کیونکہ اس نے اس شخصیت کو تلاش کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی تھی جسے یاد کرتے ہوئے بارہ سال گزر گئے تھے۔ دل کے انتہائی تاریک گوشوں میں وہ ایک صورت روشن تھی۔ شاید ذہنی طور پر کوثر جہاں طوائف نہیں تھی ورنہ چہرے ایسے یاد کہاں رہتے ہیں۔ ان کے دن اور رات تو ہر شخص کے لئے ہوتے ہیں جو ان تک پہنچ جائے۔ بہر حال وہ شمشیرہ بیگم کے ساتھ چل پڑی۔ اس وقت سائیں مراد بخش ایک جاگیردار کا نہیں بلکہ ایک عاشق کا روپ دھارے ہوئے تھے۔ کوثر جہاں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ ان کے ذہن میں بھی یہ نہیں تھا کہ ان کے سامنے ایک عورت نہیں ایک طوائف ہے اور طوائف بھی کیا بلکہ تسکین دیدہ و دل، راحت جان، حاصل عمر رواں۔ کوثر جہاں سادگی کا مجسمہ بنی ان کے حضور کھڑی تھی۔ شمشیرہ بیگم لپک کر باہر نکل گئیں۔

"اے میں ابھی آئی۔" انہوں نے کہا اور مراد بخش اپنے محبوب کو اتنا قریب دیکھ کر ساکت ہو گئے تھے۔ کوثر جہاں نے آداب کر کے ان سے بیٹھنے کے لئے کہا اور خود دوزانو ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ مراد بخش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوثر جہاں سے کیا کہیں۔

"کب تشریف لائے آپ؟" کوثر جہاں نے خود ہی سلسلہ گفتگو شروع کیا اور مراد بخش کی جان میں جان آئی۔ الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے اور خاصی دیر تک یہاں بیٹھے رہے۔ پھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"دوبارہ کب آیئے گا؟" شمشیرہ بیگم دروازے کے اندر داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

"جب آپ بلائیں گی۔" یہ کہہ کر مراد بخش نے سونے کی انگوٹھی نکالی اور شمشیرہ بیگم کی طرف بڑھا دی۔

"آئیں گے...... جیسے ہی موقع ملا آئیں گے۔"

"ضرور تشریف لایئے گا...... ہم انتظار کریں گے۔" شمشیرہ بیگم نے کہا۔ انہوں نے اپنے آپ کو کوثر جہاں کی آواز بنا لیا تھا۔ بہر حال سائیں مراد بخش چلے گئے۔ شمشیرہ بیگم ان کی تعریفیں کرنے لگیں۔ انہوں نے بہت سی چکنی چپڑی باتیں کوثر جہاں سے کیں۔

ویسے تو ہیرا منڈی روزانہ ہی سجتی ہے۔ ہر کوٹھے پر حسب توفیق لوگ آتے ہیں، طوائفوں کی اپنی زندگی گزارنے کے لئے، ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اور اپنی ضرورتیں بھی پوری کرنے کے لئے۔ لیکن ہوشیار طوائفیں ہمیشہ کسی ایسے چہرے کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہیں جو ان کے وارے نیارے کر دے۔ شمشیرہ بیگم کا کوٹھا تو اپنی مثال آپ تھا بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ دوسرے کوٹھے والیاں ان سے حسد کرتی تھیں۔ اپنے احساس کا اظہار تو ذرا مشکل کام تھا کیونکہ سب کو ساتھ ہی رہنا تھا لیکن پھر بھی کہیں نہ کہیں سے اظہار ہو ہی جاتا تھا۔ لیکن شمشیرہ بیگم ان دنوں انگاروں کی سیج پر تڑپ رہی تھی۔ یہ رب نواز شاہ محلے میں کیا آئے تھے، انہوں نے اپنا رنگ ہی عجیب رنگ ڈالا تھا۔ رات کو بستر پر لیٹی لیٹی ایسی ترکیبیں سوچتی رہتی تھیں جن سے رب نواز کو اس محلے سے نکالا جا سکے۔ بدمعاشوں نے بدمعاشی کی تھی۔ خاص طور سے دلدار گھوڑا تو واقعی ان دنوں بہت خطرناک بن گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شمشیرہ بیگم اس بات کی قائل نہیں تھیں کہ شاہ جی نے غنڈوں کے دونوں گروہوں کو مار بھگایا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اور جو کچھ کر رہے تھے وہ تو قابل برداشت نہیں تھا۔

نعمان فضلی جیسے شکار کو تو صحیح معنوں میں شاہ جی نے ہی نکالا تھا۔ نعمان فضلی غائب ہو گئے تھے اور دوبارہ ان سے رابطے کی ہر کوشش ناکام ہونے لگی تھی۔ لیکن وہ اب مراد بخش کو ایسے کسی مسئلے کی نظر نہیں ہونے دے سکتی تھیں۔ ویسے انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ کوثر جہاں اور رب نواز شاہ کو راضی رکھنے کا ذریعہ ایک اکرام ہی ہے۔ کمبخت دو کوڑی کا لڑکا، دین کا نہ دنیا کا کس طرح آنکھوں میں سرمہ بن بیٹھ گیا ہے۔ بس چلے تو زہر دے دوں موذی کو۔ بہر حال دل میں کچھ، زبان پر کچھ تھا۔

سائیں مراد بخش کو بھلا چین کہاں۔ جانا ضروری ہوتا تھا لیکن دوسری رات پھر پہنچ گئے۔ محفل جمنے والی تھی۔ کوٹھا چمک دمک رہا تھا۔ کوثر جہاں آ کر بیٹھی تو ہلکے ہلکے سُر چھیڑے

جانے لگے اور پھر جیسے ہی سائیں مراد بخش پہنچے، وہ انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے دروازے پر آ گئی۔ مراد بخش بھی آج بڑے بنے سنورے تھے اور انہیں بڑے احترام سے بٹھایا گیا۔لیکن مراد بخش کی نگاہیں کوثر جہاں پر جم گئی تھیں۔کوثر جہاں نے جھک کر آداب کیا تو ان کے چہرے پر ایک رنگ دوڑ گیا۔

غزالہ اور شبانہ نے انہیں بڑے لبھانے والے انداز میں خاصدان پیش کیا اور اس کے بعد کوثر جہاں نے غزل چھیڑ دی۔ مراد بخش نجانے کتنی ہمتیں کرنے کے بعد یہاں پہنچے تھے، کچھ تجربہ تو تھا نہیں انہیں۔ البتہ یہ محفلیں انہوں نے اپنے گھر میں کافی دیکھی تھیں۔ سائیں خیر بخش خود بھی صاحبِ ذوق تھے اور اچھی خاصی محفلیں سجواتے رہتے تھے۔ بہر حال غزل جاری رہی۔ مراد بخش پر ایک سحر سا طاری تھا۔خوابوں کی آغوش میں پہنچ گئے تھے۔ پھر نجانے کس جذبے کے تحت انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر تھال میں رکھ دی۔ شمشیرہ بیگم کی نگاہوں نے تاڑ لیا کہ ان کی جیبیں اب بھی نوٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ آخر کار غزلیں جاری رہیں اور محفل ختم ہونے کا وقت قریب آ گیا۔کوثر جہاں کو شمشیرہ بیگم کے پینترے جھیلتے زمانہ گزر گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کے بعد بھی محفل جمے گی اور اس میں صرف مراد بخش کے گلے پر چھری پھیری جائے گی۔ ادھر مراد بخش کو تو جیسے دونوں جہان مل گئے تھے۔ اب کمرے میں ان کے اور کوثر جہاں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

”کہئے، ہماری گائی ہوئی غزلیں پسند آئیں؟“

”پسند کے علاوہ کاش کوئی اور لفظ ہوتا تو ہم آپ کو اس کا تحفہ ضرور پیش کرتے۔“ یہ کہہ کر مراد بخش نے اپنے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی سے اپنی انگوٹھی اتاری جس میں انتہائی قیمتی ہیرا چمک رہا تھا اور بڑی ہمت کر کے انہوں نے کوثر جہاں کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔انگوٹھی کوثر جہاں کی انگلی کی زینت بن گئی۔ وہ بولی۔

”آپ نے بہت زیادہ تکلف فرمایا ہے۔“

”نہیں، آپ کے ہاتھ میں پہنچ کر اس کی قسمت چمک اٹھی ہے۔ ہمیں انتہائی ناز ہے کہ آپ نے ہمارا انتہائی حقیر سا تحفہ قبول کیا۔“

”آپ کا وقت اس تحفے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ سب کچھ ہوتا ہی ہے

لیکن ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ کوئی سادہ لوح ہمارے چکر میں آ کر پھنسے۔“

مراد بخش کو یہ الفاظ بڑے عجیب لگے تھے۔ انہوں نے کہا۔”ہم آپ سے محبت کرتے ہیں کوثر جہاں۔“

”محبت کو صرف ایک لفظ نہ جانئے سائیں مراد بخش۔ محبت تو شاید زندگی بھر کی قربانی کا نام ہے۔“

”قربانی...... وہ قربانی ہم دیں گے۔ بولئے آپ ہم سے کیا چاہتی ہیں؟“

”میں جو کچھ چاہتی ہوں وہ آپ مجھے نہیں دے سکیں گے۔“

”بابا...... اللہ سائیں کے لئے اب مزید ہمیں مت آزمایئے۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کی ہر فرمائش پوری کریں گے۔“

”کیا واقعی آپ یہ وعدہ کر سکتے ہیں؟“ کوثر جہاں نے کہا۔

”آپ کی جان کی قسم۔“

”تو آپ آئندہ یہاں......“ اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ شمشیرہ بیگم عین اسی وقت کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ کوثر جہاں کو خوف ہوا کہ کہیں شمشیرہ بیگم نے اس کے الفاظ سن نہ لئے ہوں۔ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ شمشیرہ بیگم نے پتہ نہیں یہ الفاظ سنے تھے یا نہیں لیکن انہوں نے دیکھا کہ سائیں مراد کے چہرے پر شدید کشمکش کے آثار ہیں۔ بہر حال اس کے بعد شمشیرہ بیگم نے ان سے بہت کچھ کہا لیکن سائیں مراد بخش نے اپنی جیبیں خالی کیں اور دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ ان کے جاتے ہی شمشیرہ بیگم نے جلدی سے نوٹوں کی گڈیاں اٹھائیں اور تیزی سے کوثر جہاں کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ کوثر جہاں کی پیشانی کا بوسہ لیا اور پوچھنے لگیں۔

”یہ اچانک ہی ماحول کیسے بدل گیا...... کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں اماں...... کوئی خاص بات کیا ہوتی، وہی بات ہے جو مرد ہم جیسی عورتوں سے کرتے ہیں۔“

”کوثر جہاں! بڑی امیدیں لگا رکھی ہیں میں نے ان سے...... ہاتھ سے نہ نکلیں۔“

”میرے ہاتھوں میں تو سوراخ ہیں اماں! تم انہیں روکنے کی اور کوئی ترکیب کر لو۔“

”ایسی باتیں کر کے میرا دل نہ دُکھایا کرو...... تم پر سو جان سے فدا ہیں وہ۔“

"ترس آتا ہے مجھے ان پر...... ایک پوری زندگی ان کے سامنے ہے۔ یہاں آتے رہیں گے تو سب کچھ خاک میں ملا دیں گے۔"

"تو کیا ہم زندہ درگور ہو جائیں؟" شمشیرہ بیگم کے لہجے میں تھوڑا سا غصہ پیدا ہو گیا۔

"نہیں اماں...... میں نے یہ کب کہاں؟"

"بیٹی! کوٹھوں پر بیٹھ کر کوٹھے والیوں کی طرح سوچا کرو۔"

"کوئی گھر تو چھوڑ دینا چاہئے اماں۔ میں نے کہا نا مجھے ان پر ترس آتا ہے۔"

"گھوڑا گھاس سے یاری کرے گا تو کھائے گا کیا؟ ویسے ان سے کوئی الٹی سیدھی بات نہ کرنا۔"

"ہاں، سوچیں گے۔" کوثر جہاں نے کہا۔

بہرحال شمشیرہ بیگم تھوڑی دیر کے بعد واپس آ گئیں۔

ادھر سائیں مراد بخش کے سینے پر بوجھ ہی بوجھ تھا۔ کوثر جہاں کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا۔ نہ جانے کیا کیا سوچتے رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو۔ اس کے الفاظ کا مطلب تو یہی تھا۔ وہ کھل کر کہہ رہی تھی کہ سائیں مراد بخش! یہاں نہ آیا کریں۔ سب کچھ لٹا بیٹھیں گے۔ مگر کیوں...... آخر کیوں؟ ان سوچوں نے انہیں دیوانہ کر رکھا تھا۔ دل کا بوجھ ابھی تک کسی سے بانٹ بھی نہیں سکے تھے۔ ریاض حسین بہت گہرے دوست تھے اور تھوڑی بہت بھنک انہیں مل بھی گئی تھی انہی دنوں جب سائیں مراد بخش کا جشنِ صحت منایا جا رہا تھا اور کوثر جہاں وہاں مقیم تھی۔ لیکن اس کے بعد کوئی تفصیلی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ پھر کچھ ایسی دیوانگی سوار ہوئی تھی کہ حضوری گوٹھ سے سیدھے لاہور چلے آئے تھے اور اس وقت سے یہیں مقیم تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے بڑے بھائی کی اجازت کے بغیر حضوری گوٹھ سے باہر نواب شاہ تک نہیں جاتے تھے۔ جاتے بے شک کبھی کراچی، کبھی حیدر آباد، کبھی سکھر ہر جگہ تھے لیکن بھائی کے علم میں ہوتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ پہلے تو یہی سوچا تھا کہ لاہور کا چکر لگائیں گے، ہیرا منڈی میں اس جانِ سوز کو تلاش کریں گے، اس سے ملیں گے، واپس آ جائیں گے اور پھر دوبارہ جائیں گے۔ لیکن وہاں جا کر واپس آنے کے بعد نواب شاہ واپس جانے کو دل ہی نہیں چاہا تھا۔

چنانچہ لاہور ہی کے ایک درمیانہ درجہ کے ہوٹل میں مقیم تھے۔ یہ ہوٹل اس لئے منتخب کیا

تھا کہ بڑے ہوٹلوں میں تو شناسائیاں بھی نکل سکتی تھیں۔ تلاش میں بھی لوگ آ سکتے تھے۔ ایسے کسی ہوٹل میں اتنی بڑی شخصیت کا قیام لوگوں کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ بہرحال اس وقت بھی یہی سوچتے ہوئے جا رہے تھے کہ آخر کوثر جہاں کے الفاظ کا مقصد کیا تھا؟ اور یہ کہ اب وہاں جائیں یا نہ جائیں؟ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہاں نہ جائیں۔ دل کو چین کیسے آئے گا۔ انہی خیالات میں غلطاں سڑک پر چلے جا رہے تھے کہ بے خیالی میں سڑک کے بیچ و بیچ آ گئے۔ پیچھے سے ایک کار آ رہی تھی، وہ روندتی ہوئی چلی گئی...... دو تین قلابازیاں کھائی تھیں۔ کار میں چند نوجوان لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تو نکل بھاگے لیکن سائیں مراد بخش خون میں لت پت سڑک پر گر پڑے۔ فوراً چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے تھے اور انہیں ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔

○●○

خیر بخش حضوری شدید پریشانی کا شکار تھے۔ بغیر کسی اطلاع کے بھائی کی گمشدگی ناقابل فہم تھی۔ دو تین دن تک تو صبر کیا، برداشت کیا لیکن اس کے بعد قوتِ برداشت جواب دے گئی اور اس احساس کا شکار ہو گئے کہ کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔ چنانچہ ہر طرف ہاہا کار مچ گئی۔ پولیس کو بھی اطلاع دے دی گئی اور اپنے طور پر بھی تحقیقات کی جانے لگیں۔ ہر اس شخص کو جس سے ان کا تھوڑا بہت رابطہ تھا، طلب کر لیا گیا۔ انہی میں ریاض حسین بھی تھے۔ ریاض حسین ان کے بہت اچھے دوستوں میں شمار ہوتے تھے لیکن بہرحال ان کی اپنی مصروفیات بھی تھیں۔ پچھلے دنوں جشن کے سلسلے میں اپنے خاندان کے ساتھ گوٹھ حضوری میں ہی رہے تھے۔ ہر معاملے میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لیتے رہے تھے۔ تمام تفصیل انہیں معلوم ہوئی تو وہ خود بھی ششدر رہ گئے اور پھر انہیں وہ یاد آ گیا جس کا کسی کو پتہ نہیں تھا یعنی لاہور کی ہیرا منڈی سے آنے والی وہ طوائفیں جن سے مراد بخش بہت زیادہ متاثر نظر آتے تھے۔ تذکرہ تو کسی سے نہ کیا، خاموشی سے لاہور چل پڑے اور پھر معلومات کرتے کرتے ہسپتال پہنچ ہی گئے۔ واقعہ معلوم ہوا تو ششدر رہ گئے اور منہ چھپانے لگے۔

مراد بخش کی کیفیت بہتر تھی لیکن خاصے شدید زخمی ہوئے تھے۔ شروع کے کچھ روز تو بڑی عجیب و غریب کیفیت میں گزرے تھے۔ وہ تو شکر ہے کہ پرائیویٹ ہسپتال کے سب سے بڑے ڈاکٹر جو اس ہسپتال کا مالک بھی تھا، کو نجانے کیا رحم آ گیا اس حسین صورت پر کہ

اس نے ساری ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیں۔ اتنا تو انہیں بھی اندازہ تھا کہ ہوش میں آئیں گے تو سارے اخراجات نکل آئیں گے۔ صورت ہی سے پتہ چلتا ہے کہ صاحب حیثیت ہیں۔ لیکن بہرحال یہ بھی بہت بڑی بات تھی۔ اور پھر ریاض حسین کا کام بھی قابل فخر تھا کہ انہوں نے ہر چھوٹا بڑا ہسپتال چھان مارا تھا۔ لیکن اب جو یہ تمام تفصیل سنی تھی تو ششدر رہ گئے تھے۔ اس خاندان کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے۔ خیر بخش کا خاندان صدیوں سے حضوری گوٹھ میں آباد تھا۔ اس قدر دولت مند لوگ تھے کہ بے مثال۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اب کیا، کیا جائے۔

ادھر کئی دن گزرنے کے بعد شمشیرہ بیگم کی حالت بھی خراب ہونے لگی۔

ویسے تو بے شمار قدر دانوں نے ان کے کوٹھے کو آباد کر رکھا تھا۔ شام ہوتے ہی رونقیں بحال ہو جاتی تھیں اور ماحول نغمہ زار ہو جاتا تھا۔ کوثر جہاں بھی ان دنوں کچھ زیادہ ہی ٹھنڈی کیفیت کا شکار تھی۔ اور شمشیرہ بیگم کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ جہاں تک دل کے جلاپے کا تعلق تھا کمبخت اکرام ہی کافی تھا۔ دیکھتی تھیں تو خون جلتا تھا۔ جب بھی جھلک دکھاتا، ایسی تیکھی، کٹیلی باتیں کر کے جاتا کہ شمشیرہ بیگم جھلس کر ہی رہ جاتیں۔ لیکن شاہ جی کا منہ چڑھا ہوا تھا اور انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ جس طرف ان کی نگاہ ہو جائے وہاں کچھ اور کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ لیکن بہرحال یہ ساری باتیں اپنی جگہ، ایک بات جو دل کو لگ گئی تھی، مراد بخش دو تین دن سے نہیں آیا تھا۔ شمشیرہ جہاں کو کوثر جہاں کے الفاظ یاد تھے اور وہ انتظار کر رہی تھی کہ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ مراد بخش اگر سچے عاشق ہیں تو سر کے بل چل کر آئیں گے۔ لیکن ہر شام و ہر صبح دروازے کا طواف کرتی ہوئی نگاہوں کو اتنے دنوں تک مراد بخش کی صورت نظر نہیں آئی۔ آخر کار انہوں نے کوثر جہاں ہی سے رجوع کیا۔

”کوثر جہاں! یہ آخر کیا کہہ دیا تھا تم نے مراد بخش سے...... ایسے غائب ہوئے کہ پھر پلٹ کر ہی نہیں آئے۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہو گئی؟“

”اماں! غیرت دار صرف ایک بار سنتے ہیں۔ اگر غیرت ہوتی ہے تو گرہ میں باندھ لیتے ہیں، بے غیرت ہوتے ہیں تو انہیں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بہرحال میں نے جو کچھ کہا انہوں نے اسے سمجھ لیا۔“

شمشیرہ بیگم کا دل دھک سے ہو گیا۔ تھوڑی دیر سوچتی رہیں پھر بولیں۔

”اچھا کیا بیٹی...... بہت اچھا کیا۔ ایک ایک کر کے سب کو بھگا دو۔ کچھ دن کے بعد یہاں الّو بولیں گے۔ در و دیوار ویران پڑے ہوں گے۔ یہ ساری رونقیں اجڑ چکی ہوں گی۔ غیرت کا سبق صرف تمہارے پاس ہی تو ہے۔ ہیرا منڈی میں ایک تم ہی تو اعلیٰ درجے کی طوائف ہو جو اپنے قدر دانوں اور گاہکوں کو جوتے مار مار کر بھگاتی رہتی ہو۔ میں کہتی ہوں آخر تم ماں بیٹوں نے سوچا کیا ہے؟ تم اکیلی ہی تو نہیں ہو۔ پورا کنبہ پالنا پڑتا ہے ہمیں۔ غزالہ ہے، شبانہ ہے اور پھر تم نے بھی تو بیٹی ہی جنی ہے۔ ان سب کے مستقبل کے بارے میں سوچا کبھی۔ طوائف کے پاس آنے والے ہر شخص کو جس کی جیب میں دولت نظر آئے دل و جان سے چاہنا پڑتا ہے کہ رزق سے وفاداری ہی گھروں میں رونق کہلاتی ہے۔ اور تم ہو کہ رزق کو ٹھکراتی رہی ہو۔ آنے والی دولت کے انبار پر جوتیاں برساتی رہی ہو۔ میں کہتی ہوں کہ تم آخر کرو گی کیا؟“ کوثر جہاں نے شمشیرہ بیگم کی بگڑی ہوئی صورت دیکھی اور ایک دم اسے ہنسی آ گئی۔ شمشیرہ بیگم اس کے ہنسنے پر اور چراغ پا ہو گئیں۔

”ہاں ہاں...... ہنسو...... تمہارے ہنسنے کے دن ہیں اور ہمارے جلنے کے۔ تم نہ ہنسو گی ہم پر تو اور کون ہنسے گا۔ لیکن فکر مت کرو، کچھ دن گزر جانے دو۔ ابھی تو تم ہم پر ہنس رہی ہو پھر لوگ ہم پر خوب ہنسیں گے۔ محلے والیاں ہنسیں گی۔ ہماری طرف اشارہ کر کے کہیں گی کہ یہ شمشیرہ بیگم ہیں جن کے کوٹھے کی رونقیں کبھی بے مثال ہوا کرتی تھیں لیکن آخر کار ان کی بیٹی نے یہ رونقیں اجاڑ دیں۔“

”اماں! ایک بات کہوں تم سے...... کتنی عمر ہے تمہاری؟“

”بوڑھی ہو گئی ہوں بیٹے! ایک سو ساٹھ سال کی ہوں۔ بس مرنے کے دن قریب ہیں، قبر میں پاؤں لٹکے ہوئے ہیں۔ کیوں، تمہیں اس کی فکر کیوں ہوئی؟“ شمشیرہ بیگم نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

”عمر کا ایک بہت بڑا حصہ بڑی شان سے گزار چکی ہو تم اماں! جو کچھ تم نے جمع کیا ہے وہ اتنا ہے کہ گھر بیٹھ کر بھی کھاؤ گی تو وہ کم نہیں ہو گا۔ پھر بھی دولت کے لئے اتنی فکر مند ہو۔“

”تیرا ستیاناس کوثر جہاں! جو بات کہے گی ایسی ہی کہے گی۔ کمبخت منہ سے نحوست کی

باتیں نکالتی ہے۔ ہم اور بیٹھ کر کھائیں گے۔ جانتی ہو، طوائف کب بیٹھ کر کھاتی ہے؟ ارے کمبخت بولتے وقت تو کم از کم سوچا کر۔" شمشیرہ بیگم کی حالت خراب ہو رہی تھی لیکن نجانے کیوں کوثر جہاں کو ان کی اس کیفیت سے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ وہ ہنستی ہوئی پھر بولی۔

"غزالہ، شبانہ کے لئے تم پریشان ہو۔ میں کہتی ہوں کیا کمی ہے ان کے پاس۔ زیوروں کے انبار لگے پڑے ہیں، دولت ہے کہ بینکوں میں پڑی سڑ رہی ہے۔ ایک تم ہو کہ ہر رات اپنی ہوس کا پٹارہ کھول کر بیٹھ جاتی ہو۔"

"ہاں ہاں...... غزالہ ہے، شبانہ ہے...... اور اپنی جنی کا نام بھول گئیں، وہ بھی تو ہے۔ بٹھا کر کھلاؤ گی نا انہیں، شریف زادوں کے گھر کی رونق بناؤ گی۔ کیوں؟ ارے میں کہتی ہوں کوثر جہاں آج تُو شریف بننے کی کوشش شروع کر دے، میں دیکھتی ہوں کون شریف زادہ تجھے اپنے گھر کی رونق بنانے پر تیار ہوتا ہے۔ اور پھر تسنیم بھی تو ہے۔ اس کو بھی اچھی سے اچھی جگہ بیاہ دینا، کسی محل میں پہنچا دینا انہیں...... دھت تیرے کی، اے بی بی! طوائف ہے، طوائف رہ۔ شریف زادیوں کے سے خواب دیکھتی ہے۔ یہ تیری بڑائی کسی کام نہیں آئے گی تیرے۔"

"بولتی رہو...... بولتی رہو...... میں تمہاری بات کا جواب کب دیتی ہوں۔"

"ہاں ہاں...... واقعی کسی شریف زادی کی اولاد ہو تم...... کسی اچھے گھر کی فرد معلوم ہوتی ہو۔ آسمان سے براہِ راست اتری ہو۔"

"چاٹ لیا میرا دماغ...... بس اب بند کرو، میرے سر میں درد ہونے لگا ہے۔" کوثر جہاں نے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ شمشیرہ بیگم اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ غصے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اسی وقت تقدیر کا مارا بے چارہ غلام شاہ اندر آ گیا اور شمشیرہ بیگم کا چہرہ دیکھ کر مسکرا دیا۔

"کمال ہے شمشیرہ بیگم! جو تم نے اس عمر میں بھی میک اپ شروع کر دیا۔ ساری شکل سرخ کر لی ہے۔"

"ارے تم سب نمک حرام ہو...... تم نمک حرام ہو پورے غلام شاہ!"

"اوہو...... اچھا اب ہم نمک حرام ہو گئے شمشیرہ بیگم! بڑی خراب یادداشت ہے آپ کی۔ آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے چہرے کی یہ لالی ہمارے دل کا کیا حال کرتی ہے۔ اب

بھی کبھی پرانی باتیں یاد آتی ہیں تو دل مچل کر رہ جاتا ہے۔"

"اے بڑے میاں! ہوش کی دوا کرو...... اوقات بھول گئے۔ دلے ہو، دلے ہی رہو۔ عشق و محبت کی باتیں کرنا تو سب کو آتا ہے کوئی کام کر کے بھی دکھایا کبھی؟"

"اور کچھ گالیاں بھی دے لو...... اب تو گالیاں ہی ہماری تقدیر میں رہ گئی ہیں شمشیرہ بیگم۔" غلام شاہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"گھر کے حالات دیکھ رہے ہو۔ خود کبھی سوچا کہ آنے والا وقت کیسا گزرے گا...... یہ کمبخت کوثر جہاں برباد کرنے پر تل گئی ہے۔"

"کیا ہوا...... خیر تو ہے؟"

"آنکھیں کھلی رکھو تو کچھ پتہ چلے۔ عیش سے پاؤں پھیلا کر سوتے ہو۔ یہاں دیکھو، نہ دن چین سے گزرے نہ رات۔"

"ارے آخر ہوا کیا؟"

"میں کہتی ہوں مراد بخش کا کچھ پتہ ہے...... ذرا دیکھو تو سہی، محلے میں اتنا نام کمایا کہ بڑے بڑے لوگ یہاں آتے ہیں۔ لیکن باقی لوگ اس نام کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ تم خود سوچو غلام شاہ، سب کا مستقبل اس کوٹھے سے وابستہ ہے۔ تم لوگ بھی تو اسے حلال کرو۔ تم دیکھو نعمان فضلی ہاتھ سے نکل گیا۔ موئے نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور اب اس سے کہیں زیادہ بڑے یہ مراد بخش...... بس برداشت کر رہی ہوں۔ کوثر جہاں کو تو میں ایسا سنبھالوں گی کہ یاد کرے گی کمبخت۔ ایسی چار چوٹ کی مار دوں گی کہ ساری تیزی بھول جائے گی۔ بس یہ سوچ کر خاموش ہو جاتی ہوں کہ دولت کی کان ہے۔ معلوم تو کرو آخر یہ مراد بخش کو کیا ہوا۔"

"ہوں...... کوئی اتا پتہ ہے ان کا؟"

"ہاں ہاں...... میرے دل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ نکال لو ہاتھ ڈال کر۔" شمشیرہ بیگم نے اس انداز میں کہ کہ غلام شاہ ہنس پڑا، پھر بولا۔

"ایسی باتیں کرتی ہو کہ زبان خود بخود مچلنے لگتی ہے۔ دل میں ہاتھ ڈالنے کے لئے کہاں کہاں سے گزرنا پڑے گا، کچھ اندازہ ہے" غلام شاہ نے ہنستے ہوئے کہا پھر بولا۔ "اچھا چلو ٹھیک ہے...... ہوش میں آ گئے...... تو بات مراد بخش کی ہے۔ ٹھیک ہے، تلاش کرتے ہیں

انہیں۔"

پھر غلام شاہ چلا گیا۔ اس کی واپسی دوپہر کے بعد ہی ہوئی تھی۔ شمشیرہ بیگم اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں۔ غلام شاہ نے ان کا پاؤں ہلاتے ہوئے کہا۔

"سو گئیں شمشیرہ بیگم؟"

شمشیرہ بیگم نے خونخوار نگاہوں سے غلام شاہ کو دیکھا اور بولیں۔ "یہ بیل کی طرح کیوں گھسے چلے آتے ہو تم؟"

"خیر، چلو چھوڑو۔ بڑی خراب خبر لائے ہیں۔ سنو گی تو پریشان ہو جاؤ گی۔"

"تمہارے سڑے ہوئے منہ سے کبھی اچھی خبر سننے کو ملی ہے؟"

"سائیں مراد بخش زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایکسیڈنٹ ہوا ہے ان کا۔"

"ہیں......؟" شمشیرہ بیگم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں...... بڑی مشکل سے پتہ چلا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ اتفاق ہی تھا جو ہمیں معلومات حاصل ہو گئیں۔"

"ہوں...... زخمی کیسے ہوئے...... کچھ پتہ چلا؟"

"کوئی نامعلوم گاڑی مار کر چلی گئی۔"

"ہوں......" شمشیرہ بیگم کا دماغ بڑی برق رفتاری سے کام کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہیں، پھر بولیں۔

"اے غلام شاہ! کیا قدرت نے ہمیں ایک بہت اچھا موقع نہیں دیا؟"

"کیا؟"

"سنو...... اگر سائیں خیر بخش کو اس آدمی کے پیچھے لگا دیا جائے جس کا نام رب نواز ہے تو کیسا رہے گا؟ دونوں میں چلوا دی جائے۔ بہت بڑے آدمی ہیں سائیں خیر بخش۔ سندھ کے بہت بڑے جاگیردار اور وڈیرے۔"

غلام شاہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شمشیرہ بیگم کو دیکھنے لگا، پھر بولا۔ "شمشیرہ بیگم! بخدا اگر ہیرامنڈی کی نہ ہوتی تو بہت بڑی سیاست دان ہوتیں۔ کیا زبردست بات سوچی ہے۔"

"اے میں کہتی ہوں کہ اس سے اچھا موقع کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔" شمشیرہ بیگم آہستہ آہستہ غلام شاہ کو اپنے منصوبے کی تفصیل بتانے لگیں اور غلام شاہ آنکھیں بند کر کے گردن

ہلانے لگا۔ بڑا خوفناک منصوبہ تھا شمشیرہ بیگم کا۔

○●○

سائیں خیر بخش بڑی وحشت کے عالم میں وقت گزار رہے تھے۔ ساری معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ بھلا بات چھپائے کہاں چھپتی ہے۔ رحمت خان ان معاملات میں پیش پیش تھے۔ لاہور سے مراد بخش کو گوٹھ حضوری لے آیا گیا تھا۔ کافی بہتر حالت تھی۔ گوشہ نشینی سی اختیار کر لی تھی۔ سائیں خیر بخش سے آنکھ ملاتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ ایسے ہی آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال دیا تھا لیکن ریاض الدین کو ساری صورتحال معلوم تھی۔ خیر بخش کے علم میں بھی بہت کچھ آ چکا تھا اور اس وقت انتہائی وحشت زدہ تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ مراد بخش ان کے دل و جان تھے۔ اتنی محبت آپس میں شاید کسی نے کسی سے نہ کی ہو جتنی سائیں خیر بخش کو مراد بخش سے تھی۔ لیکن مراد بخش جس کیفیت کا شکار ہو گئے تھے وہ بڑی پریشان کن تھی۔ سائیں خیر بخش نے رحمت علی سے یہ بھی کہا تھا۔

"رحمت علی! کہتا ہے وہ کہ ایک اتفاقیہ حادثہ ہو گیا تھا۔ ایسے حادثے اتفاقیہ نہیں ہوتے۔ ان کا کوئی نہ کوئی پس منظر ضرور ہوتا ہے۔ جس عذاب میں وہ گرفتار ہوا ہے اس میں اس کے رقیب بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن میرے جانِ جگر کو اگر کسی نے اس طرح خون سے لت پت کر دیا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اسے بچنا نہیں چاہئے۔"

انہی سوچوں میں گم تھے کہ آخر کار شمشیرہ بیگم کے منصوبے کے مطابق غلام شاہ گوٹھ حضوری پہنچ گیا اور کوشش کر کے اس نے آخر کار خیر بخش تک رسائی حاصل کر ہی لی تھی۔ خیر بخش کے سامنے پہنچ کر زمین بوس ہو گیا۔

"کون ہیں آپ...... اور کیا کام ہے آپ کو ہم سے؟"

"سائیں! غلام ہوں آپ کا...... نمک خوار ہوں۔ لاہور سے آیا ہوں۔ شمشیرہ بیگم نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔"

"کون شمشیرہ بیگم؟"

"جی وہ جو سائیں مراد بخش کے صحت کے مجرے میں آئی تھیں اور بڑے سائیں سے بڑے انعامات لے کر گئی تھیں۔"

"ہوں...... ٹھیک ہے...... آگے کہیے۔ آپ ان کے کون ہیں؟"

''حضور ملازم ہیں۔''

''ہم سے کیا کام ہے؟''

''سائیں! پیشے کے لحاظ سے برے مانے جاتے ہیں...... پر کیا کریں، خدا نے انسانوں کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ دل بھی دیا ہے اور اس میں وفا بھی۔ اور پھر حضور کا نمک کھا کر گئے ہیں یہاں سے۔ جو خون میں دوڑ رہا ہے۔''

''دیکھئے...... جو کہنا ہے مختصر الفاظ میں کہئے۔''

''سائیں مراد بخش کے زخموں کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے آئے ہیں۔''

''کیا......؟'' خیر بخش اچھل پڑے۔

''ہاں...... ہم نے معلوم کرلیا ہے حضور کہ انہیں کس نے زخمی کیا ہے۔''

''آپ جانتے ہیں؟''

''جی حضور! مکمل معلومات کے بعد ہی ہمیں یہاں بھیجا گیا ہے۔''

''کون ہے وہ...... اور کیا یہ کوئی اتفاقیہ حادثہ نہیں تھا؟''

''بالکل نہیں سرکار! ہیرا منڈی میں ایک بلا آ گئی ہے۔ رب نواز شاہ نام ہے اس کا۔ چار خونخوار آدمیوں کے ساتھ انہوں نے ہیرا منڈی میں اندھیر مچا رکھا ہے۔ بڑے بڑوں کے منہ ٹیڑھے کر رکھے ہیں اور کوثر جہاں کو وہ اپنی جائیداد سمجھتے ہیں۔ حضور چھوٹا منہ بڑی بات مگر کیا کریں، سائیں مراد بخش نے ادھر آنا جانا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے ناراض ہو کر انہوں نے سائیں مراد بخش کی جان ہی لینے کی کوشش کی۔''

''تمہیں یقین ہے کہ اسی نے یہ کام کیا ہے؟''

''سو فیصدی حضور! گواہی دلوا سکتا ہوں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، ڈرا بیٹھا ہوا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں...... جب شمشیرہ بیگم کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ اس طرح تو یہ شخص ہیرا منڈی خالی کر دے گا۔ بڑی سرکار میں جاؤ اور انہیں ساری تفصیل بتاؤ۔''

''ہوں...... ذرا اس کا پتہ لکھوائیے۔''

''ہیرا منڈی میں اُڑنے والے مچھر بھی اسے جانتے ہیں حضور! مگر ایک درخواست ہے۔''

''ہاں بولو؟''

''حضور سائیں ہماری زندگی کی ضمانت دیں۔ نیکی کا صلہ بدی سے نہ ملے۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ ہم نے یہ اطلاع دی ہے تو ٹکڑے کر دیئے جائیں گے حضور! بس آپ کو یہ بتا دیا ہے۔''

''ہوں...... ایک بات بتاؤ، کوثر جہاں وہی لڑکی ہے جو بہت اچھا گاتی تھی؟''

''جی بالکل وہی جناب عالی۔''

''ٹھیک ہے...... دیکھ لیں گے انہیں۔ آپ اپنا یہ انعام رکھ لیجئے۔'' سائیں خیر بخش نے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر غلام شاہ کی گود میں ڈال دی۔

''حضور! نمک حلالی کا صلہ درکار نہیں ہے، سائیں کا ہی دیا کھاتے ہیں۔ تاہم تبرک ہے یہ ہمارے لئے۔'' غلام شاہ نے گڈی سنبھال کر رکھی اور وہاں سے نکل آیا۔ پاؤں زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔ گڈی کا وزن دل میں سرور پیدا کر رہا تھا۔ چھپّر پھاڑ کر ملا تھا۔ آخر کار واپس لاہور پہنچ گیا۔ نوٹوں کی گڈی بڑی سنبھال کر رکھی تھی۔ شمشیرہ بیگم شیطان کی نگاہ رکھتی تھیں، ان سے بچنا مشکل تھا۔ بہرحال شمشیرہ بیگم نے پوچھا۔

''کیا رے غلام شاہ؟''

''ہو آئے...... کام ہو گیا تمہارا۔''

''خیر بخش صاحب نے کچھ کہا؟''

غلام شاہ ساری تفصیل بتانے لگا۔ شمشیرہ بیگم کی باچھیں خوشی سے کھل گئی تھیں۔

''اس سے ہیرا منڈی خالی ہو جائے تو لڈو بانٹوں گی پوری ہیرا منڈی میں۔ داتا جی کے مزار پر سات دیگیں کروں گی۔ جی جلا کر خاک کر دیا ہے میرا۔ ارے اتنی دور رہ کر بھی پوری ہیرا منڈی پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اچھا اب یہ بتاؤ ہوگا کیا؟''

''بس جو ہوگا سامنے آ جائے گا۔'' غلام شاہ نے کہا اور شمشیرہ بیگم پُر خیال انداز میں گردن ہلانے لگیں۔

○●○

سائیں خیر بخش کے لئے یہ بات بس جوتے کے مافق تھی کہ کوئی لچا لفنگا مراد بخش کو اس طرح زخمی کر دے۔ خون کھول گیا تھا ان کا، دوہرے غم کا شکار تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ مراد بخش ان راستوں پر چل پڑے تھے جو تباہی کے راستے ہوتے ہیں۔ وڈیروں کے لئے بھلا

یہ کون سا مشکل کام ہے کہ کسی طوائف کو خرید کر بندی خانے میں ڈال دیں۔ یہ تو ان جاگیرداروں کا کھیل ہوتا ہے۔ شرم اور افسوس کی بات تو یہ تھی کہ مراد بخش نے اس طرح لاہور کی ہیرا منڈی کے چکر لگانا شروع کر دیئے اور وہاں کی ایک طوائف کے ہاتھوں لٹنے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ تو بڑا ہی ہولناک عمل تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مراد بخش ایک سادہ لوح انسان ہے اور کسی بھی طرح اس کے اندر وہ چالاکی نہیں ہے۔ خود خیر بخش حضوری ایک نیک نام انسان تھے اور ان کے نام کے ساتھ وڈیروں کی صفات وابستہ نہیں تھیں۔ چنانچہ اس طرح بھی بدنامی کا خدشہ تھا۔ آس پاس کے دوسرے گوٹھوں کے وڈیرے کھلم کھلا عیاشی کرتے تھے اور کھل کر خیر بخش کا مذاق اڑاتے تھے لیکن خیر بخش کے اعلیٰ کردار کی عزت بھی ان کے دلوں میں تھی۔ کبھی کسی بہت بڑے مسئلے میں اگر خیر بخش ہاتھ ڈال دیتے تو پھر سب کی نگاہیں انہی کے فیصلوں کا انتظار کرتیں۔ اعلیٰ حکام جو پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے تھے اور خود مرکزی وزراء ان کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ صاحب حیثیت بھی تھے اور صاحب اختیار بھی۔ اتنی بڑی شخصیت سے متعلق کسی عام آدمی کو بھی نقصان پہنچانے کی جرأت کسی میں نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر یہ رب نواز شاہ آخر ہے کون؟ ہو سکتا ہے اسے مراد بخش کے بارے میں علم ہی نہ ہو...... رحمت خان کی خبر لینے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ رحمت خان کو کم از کم اس طرح کے معاملات سے واقف ہونا چاہئے تھا۔ لیکن پھر یہاں بھی اپنی ہی انا آڑے آئی۔ رحمت خان کتنے ہی قابل اعتماد تھے لیکن تھے تو نوکر اور نوکروں کو راز دار بنانا اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔

بہت غور و خوض کے بعد سائیں خیر بخش نے ایک منصوبہ ذہن میں ترتیب دیا اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ منصوبہ یہی تھا کہ خاموشی سے لاہور جائیں۔ ایک نام ذہن میں آیا تھا جو قابل اعتبار بھی تھا اور صاحب اختیار بھی تھا اور یہ نام تھا راجہ ریاست راؤ کا۔ راجہ ریاست راؤ پنجاب کی ایک اعلیٰ شخصیت تھے اور بڑے اختیارات کے حامل تھے۔ باقاعدہ سیاست دان تو نہیں رہے تھے لیکن بڑی بڑی سیاسی شخصیتوں سے ان کا تعلق تھا۔ خود بھی بہت بڑے جاگیردار اور رئیس تھے۔ لاہور کے ایک نواحی گاؤں میں رہتے تھے اور یہ نواحی گاؤں انہی کے نام سے منسوب تھا۔ راجہ پور تھا اس کا نام۔

بہر حال انہوں نے ایک منصوبہ تکمیل دیا اور آخر کار راجہ پور پہنچ گئے۔ راجہ ریاست راؤ

نے انہیں اچانک دیکھ کر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور پُر مسرت لہجے میں بولے۔

"یار! ویسے یہ تمہارے اندر خوبی ہے کہ اچانک ہی حملے کرتے ہو اور حیران کر دیتے ہو۔ بڑی خوشی ہوئی ہے۔ کچھ تھکے تھکے سے نظر آ رہے ہو۔ کیا قصہ ہے؟"

"کچھ نہیں...... ظاہر ہے نواب شاہ سے یہاں تک کا سفر کوئی دو چار گھنٹے کا تو تھا نہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" ریاست راؤ نے سائیں خیر بخش کے آرام کا بندوبست کیا اور اس کے بعد تنہائی نصیب ہوئی تو ریاست راؤ نے کہا۔

"لوگوں کا کہنا ہے کہ اچھا دوست، دوست پر گہری نگاہ رکھتا ہے اور یہی اس کی اچھی دوستی کی پہچان ہے یار! ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ تمہارے بہت اچھے دوست ہیں اور تم پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ ہماری نگاہ کہتی ہے کہ کوئی چکر ضرور ہے، کچھ پریشان اور الجھے ہوئے ہو۔"

"اسی الجھن میں تو تمہارے پاس آیا ہوں ریاست راؤ۔"

"اوہو...... خوشی کی بات ہے کہ تم اس الجھن کو لے کر میرے پاس آئے۔"

"یار بہت بڑی الجھن ہے۔ اور سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ میں اسے کسی کو بتا نہیں سکتا۔"

ریاست راؤ نے پوری ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ گردن جھکائی اور بولا۔ "مجھے بتاؤ۔" اور سائیں خیر بخش نے انہیں تفصیل بتانا شروع کر دی۔

"تقریب میں تم بھی آئے تھے۔ رقاصائیں بلائی تھیں میں نے مجرے کے لئے بابا۔ اس سے پہلے بھی ہمارے ہاں طوائفیں آتی رہی ہیں، مجرہ ہوتا رہا ہے۔ مگر ہمارے ہاں کے بارے میں تم جانتے ہو، بندی خانے میں بہت سی پڑی ہوتی ہیں۔ بابا کرائے کی عورت تو کرائے کی عورت ہی ہوتی ہے اور یہ طوائفیں بھی بھاری معاوضے لے کر آتی ہیں۔ وہیں ایک گانے والی آئی تھی، کوثر جہاں نام تھا اس کا۔"

"ارے سائیں خیر بخش! اس نے تو دل ہی لوٹ لیا تھا۔"

"ہاں...... پکی لٹیرن تھی۔ چھنال کی جنی۔ بابا اپنے اوپر ڈاکہ ڈال دیا اس نے تو۔"

"ہیں، سائیں خیر بخش! سچ کہہ رہے ہو آپ؟"

”ادے یار! میری شکل دیکھ کر کہتا ہے کہ دبلے ہو رہے ہو اور کر رہے ہو مذاق۔“

”نہیں نہیں...... آپ یقین کرو انسان تو انسان ہی ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کتنے اچھے آدمی ہو۔ پر یہ کم بخت دل......“

”ادے یار! میری بات تو سن۔ میں اپنی بات نہیں کر رہا۔“

”نہیں کر رہے؟“

”تو اور کیا۔“

”تو پھر؟“

”مراد بخش کی بات کر رہا ہوں۔“

”اوہو...... چھوٹے سائیں؟“

”ہاں...... بچہ ہے، کچا ہے۔ بس پڑ گیا جال میں۔ اس کو بھی چھوڑو، ہیرا منڈی گیا۔ کوثر جہاں واقعی اتنا اچھا گانے والی ہے کہ اس کے چاہنے والوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ ہیرا منڈی ہی میں کوئی لچا لفنگا رہتا ہے...... رب نواز شاہ نام ہے اس کا۔ مراد بخش کو رقابت میں زخمی کر دیا۔ بابا مراد بخش میرے لئے جو کچھ ہے آپ جانتے ہو...... میری تو جان نکل گئی ہے۔ ابھی بیماری سے اٹھا ہے اور ابھی یہ حال ہو گیا ہے۔ اور پھر بعد کی باتیں تو بعد میں سنبھالوں گا، ظاہر ہے میں بالکل نہیں چاہوں گا کہ میرا جانِ جگر طوائف کے چکر میں پڑے۔ لیکن یہ سب بعد کی بات ہے...... پہلے اس حرامی کے بچے کو سنبھالنا ہے جس کا نام رب نواز شاہ ہے۔“

راجہ ریاست راؤ نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر بولے۔

”کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ابھی اٹھوا لیتے ہیں۔ الٹا لٹکوا کر تھوڑی سی ٹھکائی کروا دیتے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تھوڑی سی نہیں چاہتا، میں چاہتا ہوں کہ اسے بھی اتنا ہی زخمی کیا جائے جتنا مراد بخش کو کیا گیا ہے۔“

”اتنی دھنائی کرا دوں گا کہ پھر زندگی بھر کسی کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔“

”اپنی آنکھوں سے اس کی مرمت دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”جیسا پسند کرو گے...... ادھر بلوا لوں یا پھر پولیس ہیڈ کوارٹر چلو گے؟“

”نہیں ادھر ہی بلا لو۔“

”کرتا ہوں...... ٹائم لگے گا تھوڑا۔ ویسے تو بہت سے لوگ ہیں لیکن میرا انتہائی اعتماد کا بندہ ہے چوہدری شوکت گوریجہ، ایس پی ہے، اور اس وقت پورے لاہور پر دھاک بٹھا رکھی ہے اس نے۔ نام سے کانپتے ہیں لوگ۔ ویسے بھی بہت پرانا بندہ ہے۔ میں اسے فون کر کے بلاتا ہوں۔ لاہور سے یہاں پہنچنے میں تھوڑا ٹائم لگ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، بلا لو۔“ سائیں خیر بخش حضوری نے کہا اور راؤ ریاست ایس پی گوریجہ کو فون کرنے لگے۔ رابطہ قائم ہوا اور گوریجہ نے کہا کہ وہ ایک گھنٹے تک راجہ پور پہنچ جائے گا۔ اور راؤ ریاست اور سائیں خیر بخش ایس پی گوریجہ کا انتظار کرنے لگے۔

بہرحال راؤ ریاست کی حیثیت اتنی معمولی بھی نہیں تھی کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس آنے میں دیر لگاتا۔ گوریجہ ایک پُر وقار شخصیت کا مالک شخص تھا۔ ایس پی کی وردی اس پر بہت شاندار لگتی تھی۔ راجہ ریاست راؤ نے اس کا پُر تپاک خیر مقدم کیا اور پھر نواب شاہ سے آئے ہوئے خیر بخش حضوری کا اس سے تعارف کرایا۔

”سائیں کا نام تو بہت بڑا ہے، سندھ کے بہت بڑے لوگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ حضوری خاندان تو بڑی شہرت کا حامل ہے۔“

”سائیں بس اللہ سائیں کا کرم ہے...... مولا سائیں نے عزت قائم رکھی ہے۔ بس کبھی کبھی خرابی ہو جاتی ہے۔ بڑے سے بڑے انسانوں پر وقت آ پڑتا ہے۔“

”سائیں! ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کیجئے گا۔“

”میں نے آپ کو اسی لئے تکلیف دی ہے ایس پی گوریجہ! آپ کو ہمارا ایک ضروری کام کرنا ہے۔“

”جی سائیں...... آپ حکم کیجئے۔“ ایس پی گوریجہ نے نیاز مندی سے کہا۔

”گوریجہ صاحب! ہیرا منڈی میں، مطلب یہ کہ لاہور کی ہیرا منڈی میں ایک شخص آ کر آباد ہوا ہے۔ رب نواز شاہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ باقی تو ساری بات اپنی جگہ، آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اس نے ایک دشمنی کے تحت سائیں مراد بخش کو زخمی کیا ہے اور سائیں مراد بخش کے بارے میں آپ یہ سمجھ لیجئے کہ سائیں خیر بخش کے لئے زندگی کی طرح ہے۔ ایسے کسی

آدمی کو اس طرح آزاد نہیں رہنا چاہئے۔ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کو اس بندے کو الٹا لٹکانا ہے۔ ایسا سبق سکھانا ہے کہ زندگی بھر یاد بھی رکھے اور دوبارہ اس طرح کی کوئی جرأت نہ ہو سکے اسے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی سائیں۔'' ایس پی گوریچہ نے خیر بخش سے کہا۔ بہر حال راؤ ریاست، گوریچہ کو شاہ جی کے بارے میں تفصیلات بتاتے رہے اور ایس پی صاحب نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... آپ اطمینان رکھئے۔ میں بذاتِ خود اس کیس کو دیکھوں گا۔''

''آپ کی مہربانی بابا سائیں۔ ہمیں ذرا جلدی ہے۔ دیر نہ کیجئے گا۔ کام ختم کر کے ہی یہاں سے جانا ہوگا۔''

''فکر ہی نہ کریں۔''

''ٹھیک ہے۔''

اور پھر ایس پی گوریچہ رخصت ہو گئے۔

بہر حال راؤ ریاست نے بذاتِ خود یہ ذمہ داری سونپی تھی، گردن نہیں موڑ سکے تھے۔ فوراً ہی تیاریاں شروع کیں۔ پہلے تو دل میں سوچا تھا کہ کسی انسپکٹر کو بھیج کر تھانے بلوا لیتے ہیں، علاقے کے کئی تھانے ان کے زیرتحت تھے۔ لیکن پھر سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی گڑبڑ درمیان میں نکل آئے۔ رب نواز شاہ فرار ہو جائے، روپوش ہو جائے۔ راؤ ریاست کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ راؤ ریاست کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے کہ کس طرح صاحب اختیار ہے چنانچہ خود ہی ہیرا منڈی پہنچے تھے۔ پولیس کی کئی موبائل ساتھ تھیں، نفری بھی کافی تھی۔ اس احساس کے ساتھ اتنے انتظامات کئے تھے کہ کہیں رب نواز فرار نہ ہو جائے۔ بہر حال ہیرا منڈی میں ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ دکاندار فٹا فٹ دکانیں بند کرنے لگے۔ بہت سی طوائفوں کے کوٹھوں کے دروازے بند ہو گئے۔ ہر نگاہ میں خوف تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں پولیس ہیرا منڈی میں کیوں داخل ہوئی ہے؟ کوئی خطرناک قاتل، کوئی خوفناک گروہ تو داخل نہیں ہو گیا ہے؟

لیکن پھر رب نواز کے گھر کے گرد پولیس کو پھیلتے دیکھ کر لوگوں کے ذہنوں میں اور تجسس بیدار ہو گیا۔ رب نواز کے سلسلے میں ہر شخص کے دل میں ملا جلا تاثر تھا بلکہ اب زیادہ تر تعداد تو ان کے عقیدت مندوں کی ہو گئی تھی کیونکہ بدمعاشوں کے دو گروہ جو لاہور میں بری طرح

شہرت رکھتے تھے، خوف کا شکار ہو کر بھاگ گئے تھے۔ شاہ جی نے ان کی صحیح طرح سے دھلائی کر دی تھی۔

ادھر گوریچہ صاحب بڑے کروفر کے ساتھ خود اتر کر نیچے پہنچے تھے۔ دروازہ کھلوایا گیا اور اندر داخل ہو گئے۔ اتفاق کی بات کہ رب نواز سامنے ہی موجود تھے۔ انہوں نے تلخ نگاہوں سے ایس پی گوریچہ کو دیکھا۔ ادھر ایس پی گوریچہ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا...... بڑی شدت کے ساتھ آنکھیں پھاڑے رب نواز کو دیکھ رہے تھے اور پھر بولے۔

''چھوٹے شاہ جی......''

''تو تم یہاں تک پہنچ گئے ایس پی گوریچہ۔ میں بھی تمہیں جانتا ہوں۔ دو تین بار ابا جی کے پاس دیکھ چکا ہوں۔''

''شاہ جی آپ یہاں......؟''

''تم یہاں کیسے پہنچے...... ہماری بات چھوڑو۔''

''شاہ جی میں تو...... میں تو بس...... میں تو بس......''

''بات کہو...... بات کہو گوریچہ! یہ مت سمجھنا کہ ہمارا پتہ لگا کر تم یہاں تک آ گئے ہو تو ہمیں کوئی نقصان پہنچا سکو گے۔''

''شاہ جی میں تو آپ کو نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' گوریچہ کے لہجے میں عاجزی آ گئی۔

''تو پھر تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ خاموشی کے ساتھ یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ یہاں آنے سے پہلے کم از کم ہم سے معلوم تو کر لیتے کہ تمہیں یہاں آنا چاہئے یا نہیں۔ ہم تم سے کہتے کہ گوریچہ صاحب آؤ۔ مگر وردی میں مت آؤ۔ پولیس لائے ہو باہر؟''

''شاہ جی بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟''

''کیا مطلب...... سمجھنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''شاہ جی میں...... میں تو ایک دوسرے ہی مسئلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''تمہیں ملک اللہ نواز نے نہیں بھیجا ہے؟''

''نہیں شاہ جی! ہمارے پاس آپ کی تصویریں اور رپورٹ ضرور موجود ہے مگر میں اس وقت یہاں ان تصویروں اور رپورٹ کے سلسلے میں نہیں آیا ہوں۔''

''تو پھر؟''

''شاہ جی کیا کہوں......اب تو زبان نہیں کھلتی۔''

''کہو کہو...... جواب دو۔''

''شاہ جی ایک طوائف ہے یہاں شمشیرہ بیگم۔''

''ہاں ہے۔''

''اور ہو سکتا ہے آپ نے حضوری گوٹھ کے سائیں مراد بخش یا خیر بخش کا نام سنا ہو۔''

''کیوں......کیا یہ نام آسمان پر لکھے ہوئے ہیں؟''

''نہیں شاہ جی! مراد بخش یہاں شمشیرہ بیگم کے گھر آتا جاتا تھا۔ اس سے پہلے کسی نعمان فضلی کو آپ نے یہاں سے بھگا دیا۔ ادھر آپ نے مراد بخش کو بھی آنے سے منع کیا۔ جب وہ نہیں باز آیا تو آپ نے اسے زخمی کر دیا۔ شاہ جی! مراد بخش کا باپ خیر بخش بہت بڑا وڈیرا ہے۔ وہ یہاں راؤ ریاست کے پاس آیا اور اس نے درخواست کی کہ جن لوگوں نے مراد بخش کو زخمی کیا ہے انہیں سزا دی جائے۔ راؤ ریاست نے مجھے بلایا اور یہاں آپ کا حوالہ دیا۔ اس کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ آپ کتنی بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔''

''خیر اس کتیا کی جنی کو تو میں دیکھ لوں گا جس کا نام شمشیرہ بیگم ہے۔ آپ جائیے، خوامخواہ اپنا مستقبل خراب مت کیجئے گوریجہ صاحب! شاید آپ نہیں جانتے کہ مجھ سے دشمنی کا کیا نتیجہ ملے گا آپ کو۔''

''تصور بھی نہیں کر سکتا شاہ جی! آپ سے دشمنی یا آپ کے احکام کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ راؤ ریاست یا خیر بخش کیا حیثیت رکھتے ہیں آپ کے سامنے۔ آپ میری اس گستاخی کو تو معاف فرما دیجئے۔''

''شکریہ گوریجہ صاحب۔ آپ جا کے کوئی بھی بات بنا دیجئے، یہ آپ کا اپنا کام ہے۔ لیکن ایک بات ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں، آپ جیسے بھی یہاں آئے لیکن کسی کو کان و کان خبر نہیں ہونی چاہئے کہ ہم یہاں موجود ہیں۔ سمجھ لیا نا آپ نے؟''

''جی شاہ جی......آپ مطمئن رہیں۔''

''کچھ کھلائیں پلائیں آپ کو؟''

''شاہ جی بہت محبت ہے آپ کی۔ ایک اجازت دے دیجئے بس۔''

''حکم۔'' رب نواز کا لہجہ بھی نرم ہو گیا۔

''دوبارہ بھی کبھی آپ سے ملنے آ سکتا ہوں؟''

''وردی کے بغیر۔''

''جی شاہ جی......آئندہ وردی میں آنے کی یہاں تو کبھی ہمت نہیں کر سکوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ۔''

پھر پولیس جس طرح آئی تھی اسی طرح کان دبائے واپس چلی گئی۔ ہیرا منڈی کے لوگوں نے یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

○●○

اکرام کی تو کیفیت ہی بدل گئی تھی۔ وہ ہیرا منڈی کا محترم ترین آدمی بن گیا تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ شاہ جی کا منہ چڑھا ہے، سب ہی احترام کرتے تھے اور ویسے بھی شاہ جی کی حیثیت محلے بھر میں بہت اچھی ہو چکی تھی۔ ہر آڑے وقت میں وہ ہیرا منڈی کے لوگوں کے کام آتے تھے......اور مجال ہے کسی سے کبھی ایک پیسے کا بھی لالچ رکھا......اس کے علاوہ شمشیرہ بیگم نے شاہ جی کے خلاف جو مہم جوئی شروع کی تھی اس میں وہ اب بالکل اکیلی رہ گئی تھیں۔ ہیرا منڈی کی طوائفیں متفقہ طور پر یہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ جب سے شاہ جی آئے ہیں ہیرا منڈی میں غنڈوں کا راج ختم ہو گیا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ شمشیرہ بیگم ہمیشہ شاہ جی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں جبکہ ہیرا منڈی والیوں کو بہت سے فائدے پہنچے تھے۔ گوگیا پہلوان سے پیچھا چھوٹ گیا تھا اور اب کسی کو کچھ نہیں دینا پڑتا تھا۔ لچے لفنگے جو شراب پی کر کوٹھے پر آتے تھے اور غل غپاڑہ کرنے کی کوشش کرتے تھے، انہیں شاہ جی کے نام سے ہی ڈرا کر چپ کرا دیا جاتا تھا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی اور اس طرح کوٹھے والیوں کو بڑا تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن شمشیرہ بیگم تھیں کہ شاہ جی سے ان کا سینہ جلتا رہتا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ اکرام تھا۔

اکرام اب اعلیٰ قسم کے کپڑوں میں ملبوس نظر آتا۔ ایسے ایسے قیمتی لباس ہوتے تھے اس کے کہ شمشیرہ بیگم کے دل پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔ دن کے وقت کوٹھوں کے معمولات ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ یہ جاگتی راتوں کا شہر دن کی روشنی میں بے نور ہو جاتا ہے۔ یہی بے نوری اس وقت شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر پھیلی ہوئی تھی۔

کوثر جہاں اپنے کمرے میں تسنیم کا رخ تبدیل کر رہی تھی۔ آنکھوں میں سُرمہ اور ماتھے پر نظر کا ٹیکہ لگا رہی تھی۔ اکرام بھی اتفاق سے اس وقت اسی کمرے میں تھا۔ کسی کام سے اٹھا تو تسنیم پر نگاہ پڑی۔ تسنیم کے ننھے ننھے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی نگاہیں اکرام پر جمی ہوئی تھیں۔ کوثر جہاں نے بھی اکرام کا جائزہ لیا۔ اکرام پر کچھ ایسی محبت طاری ہوئی کہ اس نے آگے بڑھ کر تسنیم کو گود میں اٹھالیا۔ کوثر جہاں کی آنکھوں میں ایک نور سا اتر آیا تھا۔

"کیسی لگتی ہے یہ تجھے؟" اس نے اکرام سے سوال کیا۔

اکرام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحات اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر بولا۔ "ابھی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔"

"کیا مطلب؟" کوثر جہاں نے ایک حیران مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"اسے عقل آجائے اور یہ اس ماحول سے نفرت کا اظہار کرے تو میری اور اس کی دوستی پکی ہو جائے گی۔ اور اگر یہ نتوں کے رنگ میں ڈھل جائے تو میرا اور اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔"

یہ الفاظ انتہائی حیران کن تھے۔ کوثر جہاں کے حلق سے ایک سسکی سی نکل گئی۔ پھر اس نے کہا۔

"یہ تیری بہن ہے اکرام!"

"ہاں باجی...... سمجھنے دو۔ جب سمجھ لوں گا تو اسے اپنی بہن مان لوں گا۔"

"نہ جانے کیسی کیسی باتیں کرنے لگا ہے...... بہت زیادہ پڑھ گیا ہے نا۔" کوثر جہاں نے کہا۔ اس دوران تقدیر کی ماری شمشیرہ بیگم کوثر جہاں کے کمرے میں آگئیں۔ اکرام کی گود میں تسنیم کو دیکھا تو جل کر کباب ہوگئیں۔

"کمال ہے کوثر! بچی کو اس کلموئے کی گود میں کیوں دے رکھا ہے۔ برے اعمال، برے اثرات۔ لا ادھر دے مجھے۔ اسے کیوں خراب کر رہا ہے اپنی گود میں لے کر۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر کہا اور اکرام ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"اسے تو تمہاری ہی گود سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں نتوں! تمہارے ہاتھ جہاں بھی لگ جائیں گے ادھر گندگی ہی گندگی پھیل جائے گی۔"

"تجھ پر خدا کی مار...... میرے ہی گھر میں پلا بڑھا، میرا ہی کھایا۔ چار دن سے اس لچے لفنگے سے دوستی ہوگئی تو تیرے دماغ ہی ٹھکانے نہیں لگتے...... لا ادھر لا اسے ورنہ ٹھیک کر دوں گی سمجھا۔ اچھا نہیں ہوگا۔"

"اچھا یہاں ہوتا ہی کب ہے نتوں...... میں کوشش کروں گا کہ اسے تمہاری آغوش سے بچاؤں۔ ابھی باجی پوچھ رہی تھیں کہ یہ مجھے کیسی لگتی ہے۔ آج پہلی بار اس نے مسکرا کر مجھ سے تحفظ مانگا ہے تو میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ اسے بھی اپنی آغوش میں ہی لے لوں۔ شاہ جی کا سہارا اس کے لئے بھی بہت ضروری ہے۔"

"اے اللہ، اے اللہ...... موت آئے تجھے کمبخت مارے۔ ستیاناس ہو جائے۔ آج تو اس موئے شاہ جی کا ناپاک نام اس گھر میں لے لیا ہے۔ مگر اس کے بعد اس کا نام اس کوٹھے پر لیا تو تیری زبان ہی کھینچ لوں گی۔ میں کہتی ہوں کوثر! تُو اسے اپنے کمرے میں گھسنے ہی کیوں دیتی ہے؟"

"اماں! تمہیں تو بس لڑنے کا موقع ملنا چاہئے۔ بچوں کے منہ لگنا کیا اچھی بات ہے؟"

"بچہ ہے یہ؟ کمبخت سانڈ کا سانڈ ہو گیا ہے۔ چھ ہاتھ کا نکل آیا ہے۔ ابھی سے اس چھوٹی سی عمر میں لچھن دیکھو، چاقو باز بن چکا ہے۔ کون سا بچپن ہے اس کے اندر...... میں کہتی ہوں اس گھر میں اس کا آنا جانا ہی بند کر دے۔ مگر تُو کہاں مانے گی میری بات...... تم لوگوں نے میری حیثیت دو کوڑی کی کر کے رکھ دی ہے۔ دیکھو میں بتائے دیتی ہوں تمہیں، گھر میں کوئی ایسا حادثہ کرائے بغیر نہیں رہنے کا یہ جس پر سب کو سروں پر ہاتھ رکھ کر رونا پڑے۔"

"یہ تو ٹھیک کہا تم نے نتوں...... میں یہی سب کچھ تو چاہتا ہوں۔ ابھی تم دیکھ لینا، میں کسی قابل ہو گیا تو سب سے پہلے اپنی باجی اور تسنیم کو یہاں سے لے کر نکل جاؤں گا اور تمہارے کاروبار پر اُلّو بولیں گے۔ اور اُلّو بھی نہیں بولیں گے یہاں۔ اور جب تم سڑکوں پر بھیک مانگ رہی ہوگی نانتوں تو میں تمہیں رحم کھا کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔ گھر کی صفائی ستھرائی کے لئے ہمیں ظاہر ہے کسی کی ضرورت تو پیش آئے گی ہی۔ میں نے حاجو کے بارے میں بھی یہی سوچ لیا ہے کہ اسے بھی ساتھ رکھ لیا جائے۔ باقی لوگوں کی چھٹی کر دیں گے۔"

''خاک پڑے...... تیرے منہ پر خاک پڑے...... کیڑے پڑیں تجھ کو...... ایسی بدشگونی کی باتیں اس گھر میں تو ہی کرسکتا ہے۔ اور یہ سب تیری وجہ سے ہے کوثر! خدا کے لئے کچھ سوچ...... کچھ سوچ...... ارے تُو اس بچی کو مجھے دے رہا ہے یا نہیں؟''

''نہیں ننوں، نہیں...... میں تو اسے تمہاری گود سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور کر دینا چاہتا ہوں۔''

''دیکھ رہی ہے کوثر...... دیکھ رہی ہے کیسی کتر کتر زبان چلا رہا ہے۔ کوئی روکنے والا ہے اسے اس گھر میں؟''

''تم خود منہ لگ رہی ہو اس کے اماں...... کھڑا رہنے دو۔ تھوڑی دیر بعد لے لوں گی اپنی گود میں۔ کون سا وہ اسے لے کر بھاگا جا رہا ہے......؟''

اسی وقت حاجو پھدک کر اندر داخل ہوا اور بولا۔

''وہ سنتی ہو، رحمت خان آئے ہیں، کسی کام سے۔''

''رحمت خان...... ہائے ہوسکتا ہے کہ سائیں مراد بخش کا کوئی پیغام لائے ہوں......'' شمشیرہ بیگم نے کہا اور باہر نکل گئیں۔

○●○

راؤ ریاست مسلسل سائیں خیر بخش کو تسلیاں دے رہے تھے۔ سائیں خیر بخش آنے والے وقت کے لئے پریشان تھے۔ مراد بخش کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ یہ تو ساری باتیں اپنی جگہ ہیں لیکن اگر سائیں مراد اس معاملے میں زیادہ سنجیدہ ہوگئے تو کیا ہوگا۔

''سائیں خیر بخش! جیسا کہ ہم آپ کو بتا چکے ہیں کہ جوانی کے کھیل ہیں یہ...... جیسے جیسے عمر میں پختگی آتی ہے تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آپ اس کے لئے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ ایک طوائف کی حیثیت ہی کیا ہے، ایک کھلونے کی طرح ہوتی ہے۔ اگر بچہ کھیلنے کی ضد کر رہا ہے تو کھیلنے دو اسے۔ جب جی بھر جائے گا تو خود ہی اٹھا کر پھینک دے گا۔''

''وہ تو تم ٹھیک کہتے ہو بابا سائیں...... پر کھیلنے کے لئے کھلونوں کا انتخاب بھی تو خاندانی پیمانوں ہی پر کیا جاتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن چوہدریوں اور وڈیروں کا کھیل اور کیا ہوتا ہے، ذرا سوچو...... نوجوانی کی عمر میں ایسے ہی کھیل کھیلے جاتے ہیں۔''

''بابا ہم نے تو ایسا کھیل کبھی نہیں کھیلا۔''

''نکیل جو پڑی ہوئی تھی تمہاری ناک میں......'' وہ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ خاصا وقت گزرا اور اس کے بعد خود راؤ ریاست نے گوریجہ کو فون کیا اور انہیں اپنے پاس پہنچنے کی ہدایت کی۔ ایس پی گوریجہ ایک بار پھر راجہ پور پہنچ گئے۔

''کیا بات ہے گوریجہ جی...... بڑا انتظار کرایا آپ نے۔ کہہ کر تو اس طرح گئے تھے جیسے رب نواز کا سر ہمارے سامنے پیش کر دیں گے۔''

ایس پی گوریجہ نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔ ''کام اتنا آسان نہیں تھا راؤ صاحب۔''

''کیا مطلب...... ہیرا منڈی میں رہنے والے ایک شہدے کے بارے میں آپ ایسے بات کر رہے ہیں جیسے کسی بہت بڑے آدمی کی اولاد کے بارے میں بات کر رہے ہوں......

کیا ہوا، آخر ایسی کیا بات ہے؟"

"بس آپ ہمیں اس کے لئے معذور سمجھیں راؤ صاحب۔ ہم آپ کا یہ کام نہیں کر سکتے۔"

"جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"بس ہماری بھی زبان بند ہے۔ کچھ بتانے کے قابل نہیں ہیں آپ کو۔"

"کمال کرتے ہیں آپ...... آخر ایسی کیا بات ہے...... آپ گئے تھے وہاں؟"

"کہاں......؟"

"ہیرا منڈی۔"

"ہاں گئے تھے۔"

"وہ بدمعاش آپ کو ملا؟"

"ہاں ملا تھا۔"

"تو آپ نے اسے پکڑا کیوں نہیں؟"

"اس لئے راؤ صاحب کہ ہم اسے پکڑ نہیں سکتے تھے۔"

"کیوں...... آخر کیوں؟"

"افسوس ہے، یہ بھی نہیں بتا سکتے۔ سمجھ لیں کہ ہم یہ کام نہیں کر پائے اور اس کے لئے ہمیں بہت افسوس ہے۔"

"کہاں کی باتیں کر رہے ہیں آپ...... آخر آپ کو بتانا تو چاہئے کہ معاملہ کیا ہے؟"

"اگر یہی بتا سکتے تو آپ کا کام کر کیوں نہ ڈالتے۔"

"عجیب پریشانی میں ڈال دیا ہے آپ نے ہمیں۔ آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ آخر کوئی ہم سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے آپ کے لئے؟"

"نہیں...... بالکل نہیں۔"

"ٹھیک ہے، ہمارے پاس بہت سے ذرائع موجود ہیں...... اب آپ جا سکتے ہیں۔" راؤ ریاست نے شدید غصے کے عالم میں کہا اور گوریچہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے پھر بولے۔

"آپ کی ناراضگی بالکل ٹھیک ہے راجہ صاحب۔ لیکن جب آپ آگے قدم بڑھائیں گے تو آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ بات کیا تھی۔"

یہ کہہ کر گوریچہ خاموشی سے باہر نکل گئے۔ ادھر سائیں خیر بخش حیرت سے منہ کھولے بیٹھے ہوئے تھے اور راجہ ریاست غصے سے ہونٹ کاٹ رہے تھے۔ پھر غصے سے بولے۔

"کمال کی بات ہے...... اتنا بڑا عہدیدار اور اس طرح کی باتیں کرتا ہے۔ ہیرا منڈی میں رہنے والے ایک آدمی کو پکڑ کر نہیں لا سکا۔ کمال کا پولیس افسر ہے۔ ہم بھی دیکھیں گے کیا کر سکتے ہیں۔"

خیر بخش بھی گہری سوچ میں تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "تعجب کی بات ہے...... ایک پولیس افسر اس طرح کسی شخص کے بارے میں معذوری کا اظہار کرے۔ یہ بات میرے لئے باعث حیرت ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے...... وہ اگر کسی وجہ سے مشکل میں آ گیا ہے تو ہمارے پاس بھی ہزاروں ذرائع ہیں۔" یہ کہہ کر راؤ ریاست نے فون اٹھایا اور کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔ پھر اس کے بعد دوسری طرف رابطہ قائم ہوا تو انہوں نے کہا۔

"میری ملاقات کرامت جادو سے کراؤ...... ہاں ہاں، کرامت جادو سے...... ٹھیک ہے...... کہاں گیا ہے؟...... وہ جب بھی آئے، اس سے کہنا کہ راجہ ریاست راؤ اس سے ملنا چاہتا ہے، راجہ پور پہنچ جائے۔" یہ کہہ کر راؤ ریاست نے فون بند کر دیا۔ ان کی پیشانی پر گہری شکنیں پھیلی ہوئی تھیں۔

بہرحال ہر طرف سے صاحب اختیار تھے۔ کرامت جادو، راجہ پور پہنچا تو سائیں خیر بخش راؤ ریاست کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ کرامت لمبے چوڑے قد و قامت کا مالک تھا۔ صورت ہی سے کچھ نظر آنے والا تھا۔ بڑی بڑی نوکیلی مونچھیں، آنکھوں میں خون کی سرخی لہرا رہی تھی۔ دیکھنے ہی میں بڑا خطرناک لگتا تھا۔ ایسے لوگوں سے گھروں کے اندر ملاقاتیں نہیں کی جاتی لیکن اس وقت صورتحال ایسی ہی تھی۔ تاہم ایک الگ تھلگ حصہ میں راؤ ریاست نے اسے خوش آمدید کہا۔ راؤ ریاست نے کرامت جادو کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر گردن جھکائی اور بولا۔

"کہئے کیسے مزاج ہیں آپ کے راؤ صاحب؟"

"ٹھیک ہے...... تم سناؤ کیسا دھندا چل رہا ہے؟"

"آپ لوگوں کا سایہ سروں پر ہو تو دھندوں میں کیا خرابی ہو سکتی ہے...... سب ٹھیک

ہے۔ بتایئے کیسے یاد کیا؟''

''لاہور کی ہیرا منڈی کے بارے میں تم سے معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہاں کی کچھ خبریں ہیں تمہارے پاس؟''

''نہیں راؤ صاحب...... وہ اپنا مزاج نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ رنڈیوں کی کمائی ہم نے کبھی نہیں کھائی اور ایسے پیسے پر لعنت بھیجتے ہیں۔''

''وہ تو میں جانتا ہوں لیکن تمہیں اپنے پیشے کے لوگوں کے بارے میں تو معلومات رکھنی چاہئیں۔''

''کوئی خاص بات ہوگئی؟ بتایئے تو سہی۔''

''سنا ہے آج کل ہیرا منڈی صرف ایک آدمی کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ اس نے ہیرا منڈی کے رکھوالوں کو ڈنڈے مار مار کر بھگا دیا ہے۔ ہیرا منڈی اس وقت گوگیا پہلوان کے پاس تھی۔ دلدار گھوڑا بھی گوگیا پہلوان کے ساتھ رب نواز شاہ سے لڑنے گیا تھا۔ مار کھا کر آ گئے سارے۔''

''خیر جہاں تک گوگیا پہلوان جیسے لوگوں کا تعلق ہے راؤ صاحب تو یہ لوگ نام کے بدمعاش ہیں۔ اگر انہوں نے ہیرا منڈی کسی اور کے ہاتھ بیچ دی ہے تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ مگر آپ کا اس سے کیا واسطہ ہے؟''

''میں اس کے بارے میں پوری تفصیل معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''تفصیل وہ خود بتا دے گا...... ہم اس کی مُنڈی کاٹ کر آپ کے پاس لے آتے ہیں۔ خود اسی سے پوچھ لیں۔ اگر آپ کہیں تو اسے زندہ پکڑ لائیں؟''

''یہ کام بعد میں کیا جائے گا۔ پہلے مجھے اس کے بارے میں معلومات مہیا کر دو۔ یہ بتاؤ کہ وہ کون ہے؟ کیا حیثیت ہے اس کی؟''

''ارے تفصیلات ہی معلوم کرنی تھیں تو اس کے لئے کرامت جادو کی کیا ضرورت تھی۔ کسی بھی کھوجی کو لگا دیتے اس کے پیچھے۔''

''بعد میں تمہیں اس کے لئے کچھ اور بھی کرنا ہے۔''

''ہاں یہ ہوئی نا بات۔ چلئے کچھ کر لیتے ہیں۔ مگر ہمیں کچھ بڑے کام دیا کریں...... ایسے چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

''جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کر لو۔ جس کام کو میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں تم اسے چھوٹا کہہ رہے ہو؟''

''نہیں نہیں راؤ صاحب...... یہ بات نہیں۔ بہرحال ہم نے تو آپ کو پیشکش کی ہے کہ اگر آپ حکم دیں تو ہم آپ کے لئے اس کی گردن کاٹ کر لے آئیں۔ ٹھیک ہے، آپ کے حکم کے مطابق ہی سب کچھ ہوگا۔''

''لیکن بڑی ذمہ داری اور احتیاط سے۔''

''اس سے پہلے کبھی کوئی شکایت ہوئی ہے راؤ صاحب؟''

''ٹھیک ہے...... یہی کہنا تھا تم سے۔''

''ٹھیک ہے...... کام ہو جائے گا۔''

''بیٹھو...... کچھ کھاؤ پیو۔''

''نہیں...... کرامت جادو کام کرنے کے بعد ہی کچھ کھاتا پیتا ہے۔''

بہرحال وہ چلا گیا تو خیر بخش نے کہا۔

''بڑا لمبا چکر چل گیا ہے راؤ ریاست! میرا خیال ہے میں واپس ہی چلا جاؤں۔''

''نہیں سائیں خیر بخش! اس طرح ہم نہیں جانے دیں گے تمہیں۔ ویسے بھی بھائی کا مسئلہ ہے۔ اگر تم چاہو تو میں ہیرا منڈی کھدوا کر پھینکوا سکتا ہوں۔''

''بہرحال، دیکھ لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر سائیں خیر بخش بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

○●○

کرامت جادو نے کیا کرامت دکھائی اس کا تو کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ وہ تو بقول اس کے مُنڈی کاٹ کر لا رہا تھا لیکن تین دن گزر گئے۔ نہ خود آیا نہ مُنڈی کاٹ کر لایا۔

سائیں خیر بخش پر جو کچھ گزر رہی تھی وہ تو وہی جانتے تھے لیکن خود راؤ ریاست بھی پریشان تھے۔ آخر انہوں نے خود ہی کرامت جادو سے رابطہ قائم کیا تو وہاں سے اطلاع ملی کہ کرامت جادو لاہور چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور کسی کو اطلاع دیئے بغیر دوبئی چلا گیا ہے۔ مزید معلومات ہیرا منڈی سے حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ کرامت جادو کی ایک آنکھ پھوٹ گئی تھی اور اسے شاہ جی نے ٹنڈا کر کے بھیجا تھا۔

سائیں خیر بخش دوسرے دن ہی واپس نواب شاہ چلے گئے تھے۔ ان کی پریشانی آخری حد پر پہنچی ہوئی تھی۔ دوستوں سے مشورہ کیا اور اس کے بعد ایک فیصلہ کیا۔ ریاض الدین کو بلایا اور ریاض الدین نیاز مندی سے گردن جھکائے پہنچ گئے۔

"تمہارے ذریعے ایک اطلاع مراد بخش کو دینا چاہتا ہوں۔ وہ دربدر نہ بھٹکے، واپس حضوری گوٹھ آ جائے۔ ہم لوگ اپنی پرانی روایات دہرائیں گے۔ میں اس کے لئے روایتی وڈیرا بننے کو تیار ہوں۔ وہ لڑکی جس کا نام کوثر جہاں ہے، حضوری گوٹھ آ جائے گی۔ جب تک جی چاہے اسے رکھیں، انار والی کوٹھی ان کے لئے سجا دی جائے گی۔ شوق پورا کریں۔ بس اتنا احسان مجھ پر ضرور کریں کہ اس سے شادی نہ کریں۔ اگر اس کی اولاد پیدا ہو جائے گی تو ہم اس کا بھی معقول بندوبست کر دیں گے۔ یہ پیغام مراد بخش کو دے دو۔"

ریاض الدین پتے کی طرح کانپ گئے تھے۔ اتنا بڑا ایثار، اتنا بڑا کام بھلا کب کسی نے کیا ہوگا؟ وہاں سے تو چلے آئے مگر ہمت نہیں پڑی کہ مراد بخش کو اس فیصلے کی اطلاع دیں۔ ادھر سائیں خیر بخش نے رحمت خان کی ڈیوٹی لگائی اور رحمت خان شمشیرہ بیگم کے پاس پہنچ گیا۔

"شمشیرہ بیگم! پھر نہ کہنا کہ رحمت خان تم نے ہمارے لئے کچھ نہیں کیا۔ سائیں خیر بخش کا پیغام لایا ہوں تمہارے لئے۔ چپ چاپ کوثر جہاں کو نکال لے جائیں گے اور کچھ عرصے تک اسے سائیں مراد بخش کے پاس رکھا جائے گا۔ حضوری گوٹھ کی تم فکر مت کرنا۔ اب ان لوگوں کی ملکیتیں اور جاگیریں ایسی نہیں ہوتیں کہ لچے لفنگے وہاں جا کر کچھ کر سکیں۔ ہیرا منڈی کی بات کچھ اور ہے۔ باقی سارے معاملے سائیں خیر بخش پر چھوڑ دو۔"

"اے رحمت خان! دیں گے کیا؟"

"ایک کروڑ روپیہ نقد کے علاوہ لاہور کے کسی علاقے میں دس کنال کی کوٹھی اور باقی جو کچھ تم مانگو۔"

شمشیرہ بیگم پر تو غشی طاری ہو گئی تھی۔ کہنے لگیں۔ "رحمت خان! سبز باغ تو نہیں دکھا رہے ہو؟"

"پہلے یہ چیزیں لے لو، اس کے بعد فیصلہ کر لینا۔ یہ پچاس لاکھ روپے نقد لایا ہوں۔ ہاں کر دو تو باقی پچاس لاکھ روپے دو دن کے اندر اندر پہنچ جائیں گے۔" رحمت خان نے

ساتھ لایا ہوا بیگ شمشیرہ بیگم کے سامنے کھول دیا اور شمشیرہ بیگم جیسے برف پر گر پڑی ہوں۔ اتنی رقم کے لئے تو وہ جان بھی دے سکتی تھیں۔ رحمت خان چلے گئے اور شمشیرہ بیگم اس مہم کو سر کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

کوثر جہاں نے ٹھنڈے دل سے ساری باتیں سنی تھیں، سنجیدہ نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔ بہرحال اس وقت اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن جب شمشیرہ بیگم چلی گئیں تو کوثر جہاں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ بچی کو اٹھا کر اس نے سینے سے لگا لیا تھا۔ دل رو رہا تھا۔ یہ سب کچھ کیسا عجیب ہے...... میں جسم فروشی کرتی ہوں...... وہ کرتی ہوں جسے اپنا ضمیر بھی قبول نہیں کرتا۔ آہ، کاش میں بھی اسی دل و دماغ کی مالک ہوتی جس دل و دماغ کے لوگ کوٹھوں پر جی سکتے ہیں۔ میری زندگی اس طرح برباد ہو گئی۔ میرے معبود! جب مجھے یہ ماحول دیا تھا تو دل و دماغ بھی وہی کیوں نہ دیا...... سب کی طرح میں بھی خوش رہتی۔ جو کرنا پڑتا وہ کرتی۔ لیکن میری زندگی میں یہ زہر کیوں گھل گیا...... آہ میں اسے کیوں یاد کرتی ہوں...... کیوں یاد کرتی ہوں۔ داتا جی! پنجاب بھر سے لوگ اور نجانے کہاں کہاں سے اپنے دل کی مرادیں لے کر تمہارے دربار میں آتے ہیں۔ میرے داتا جی! تم نے میری بھی نہ سنی۔ تم نے میرے لئے کوئی دعا نہیں کی۔ کب تک میں اس دوزخ میں جلتی رہوں...... مجھے کب تک اس جہنم میں سلگنا ہوگا۔ خدا کے لئے مجھے جینے دو۔ میرا بیٹا، اس کا بیٹا جو ادھوری رات کے خواب کی طرح میری زندگی میں آیا تھا مجھے ناچتا نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس کا خون ایک شریف باپ کا خون ہے اور تم...... کیسے باپ ہو تم؟ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ جو کچھ تم اس کوٹھے پر چھوڑے جا رہے ہو وہ کتنے کرب سے گزرے گا۔ کہاں ہو تم...... کہاں ہو؟ کوئی تو میرا سہارا بنے۔

تسنیم روئی تو اس نے آگے بڑھ کر تسنیم کو گود میں اٹھا لیا پھر اسے چومتی ہوئی بولی۔

"جان دے دوں گی میں تیرے لئے...... اور تجھے وہ سب کچھ نہیں بننے دوں گی جو میں بنی ہوں۔ تجھ پر وہ نہیں بیتے گی میری بچی جو مجھ پر بیتی ہے۔ وہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ چاہے مجھے جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم سمجھ لینا تسنیم کو تمہارے ہاتھوں میں نہیں چھوڑوں گی۔ تم دنیا کی سب سے سنگدل عورت ہو جس کے سینے میں دل کی جگہ نجانے کیا چیز رکھی ہوئی ہے۔ دل میں اسے بھی جیتا نہیں چھوڑوں گی۔ نہیں اماں، ہرگز

نہیں......" وہ عجیب سوچوں کے حصار میں تھی اور آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ اس معاملے میں بھی اسے شاہ جی کا ہی سہارا لینا پڑے گا اور پھر اس خیال سے اسے ڈھارس کا سا احساس ہوا۔ اسے اپنے الفاظ پر دکھ کا احساس ہونے لگا۔ ہاں خدا خود تو زمین پر نہیں آتا۔ وہ انسانوں کے لئے سہارے ہی پیدا کرتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اسی کا کیا ہوتا ہے۔ اور کوثر جہاں کے لئے تو شاہ جی کا سہارا بہت تھا۔ خدا انہیں دنیا جہان کی مسرتوں سے ہمکنار کرے۔ ہمارا سہارا بن گئے ہیں...... آہ، ہم سے انہیں ملتا ہی کیا ہے۔ نہیں اماں...... تم اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکو گی۔ خدا نے ہم ماں بیٹی کے لئے شاہ جی کو ہیرا منڈی بھیج دیا ہے۔

بہرحال ابھی انہی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک ہی دروازے سے اکرام اندر داخل ہوا۔ اکرام کا آنا اس وقت حیران کن تھا۔ نجانے وہ کیسے آ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر کوثر جہاں کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے کہا۔

"آ...... اندر آ جا...... دروازہ بند کر دے۔"

"خیر تو ہے باجی؟"

"تجھ سے بات کرنی ہے۔"

"تو دروازہ بند کرنے کی کیا ضرورت ہے...... کسی کی مجال ہے جو اندر آئے۔"

"باتیں مت بنا...... جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ خاموشی سے سن اور احتیاط سے اس پر عمل کر۔"

اکرام دروازہ بند کر کے کوثر جہاں کے پاس آ بیٹھا۔

"کہو باجی۔"

"اکرام! ہم زندگی کے بڑے گہرے بھنور میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس بھنور سے نکلنے کے لئے ہمیں بڑی محنت سے کام کرنا ہے۔ ہم پر ایک مشکل آ پڑی ہے۔ تُو میرا ایک پیغام شاہ جی کے پاس لے جا۔"

"ہاں، ہاں...... بولو باجی؟"

"اماں نے مجھے بیچ دیا ہے اکرام! مجھے سندھ جانا پڑے گا۔ نواب شاہ...... نواب شاہ میں حضوری گوٹھ کے وڈیرے مراد بخش کے پاس۔"

"ہوں...... اور تم جانا نہیں چاہتیں۔"

"تھوکتی ہوں میں ان سب پر...... تھوکتی ہوں جو میری طرف بری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ میرا دل ان باتوں کو نہیں چاہتا میرے بچے مگر......"

"تو پھر یہ کوٹھا چھوڑ دو باجی! کون روکے گا تمہیں؟"

"ہاں بیٹا چھوڑ دوں گی میں یہ کوٹھا...... بس تُو اس قابل ہو جا کہ میرا سرپرست بن کر میرے گھر کا دروازہ کھولے۔ میں تیری قسم کھاتی ہوں کہ سب کچھ چھوڑ دوں گی۔"

"تو پھر مجھے بتاؤ کہ کرنا کیا ہے؟"

"شاہ جی سے کہنا کہ مجھے بچائیں۔ سائیں مراد بخش نے مجھے خرید لیا ہے اور کسی بھی دن رحمت خان مجھے لے جائے گا...... تسنیم کو یہیں رہنا پڑے گا۔ وہ لوگ مجھے کہاں لے جائیں گے میں نہیں جانتی۔ شاہ جی سے کہنا کہ مجھے ان کی مدد کی ضرورت ہے۔"

اکرام کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو گئیں۔ وہ بولا۔ "کوئی نہیں لے جائے گا تمہیں یہاں سے۔ اور کس کی مجال ہے کہ تسنیم کو تم سے جدا کر دے۔"

"میں جانتی ہوں کہ تُو بہت بہادر ہے...... پر میرے بچے! اکیلا یہ سب نہیں کر سکتا تُو۔ شاہ جی سے میری طرف سے ہاتھ جوڑ کر کہنا کہ میری مدد کریں...... میں نہیں جانا چاہتی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بات کر لوں گا۔"

"مگر احتیاط سے...... وہ سب تیری تاک میں ہوں گے۔"

"تم ان لوگوں کی فکر مت کرو باجی۔"

"تُو شاہ جی کے ہاں کھانا وغیرہ کھاتا ہے نا؟"

"ہاں، تو اور کہاں۔"

"میری بات غور سے سن۔ یہاں کی اب کوئی چیز مت کھانا میرے بچے۔ کوئی تجھے جو کچھ بھی دے، چاہے تبرک کہہ کر بھی دے، یہاں کے لوگوں کے ہاتھوں کا دیا بالکل نہیں کھانا۔ یہ سب تیری زندگی کے دشمن بن گئے ہیں۔ یہ تجھے زہر دے دیں گے۔"

"تم فکر ہی نہ کرو...... جو مجھے زہر دینے کی کوشش کرے گا وہ زہر میں اسی کے معدے میں اتار دوں گا۔ میرا نام اکرام ہے سمجھیں۔" اکرام نے اس طرح کہا کہ کوثر جہاں روتی ہوئی آنکھوں سے بے اختیار ہنس پڑی۔

"ہاں جانتی ہوں تیرا نام اکرام ہے۔"

"چلتا ہوں......" اکرام نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

کوثر جہاں کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اس کی پشت پر کسی نے مضبوط ہاتھ رکھ دیا ہو۔

○●○

ہر وہ جگہ جہاں انسان بستے ہیں ہزاروں کہانیوں کی حامل ہوتی ہے۔ ہیروں کی اس منڈی میں جنہیں صاحب نظر یا پھر یہ کہا جائے کہ ہوس پرست ہیرا کہتے ہیں نجانے کیسی کیسی المناک داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ بہر حال ان داستانوں میں ایک نیا اضافہ رب نواز شاہ کا ہوا تھا جو واقعی ایک ماورائی سی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ ہیرا منڈی کے رہنے والے جہاں اپنی اپنی کہانیاں رکھتے تھے یہاں موجود کوٹھوں کے بارے میں ان کے اپنے نظریات تھے۔ ہر کوٹھے والی کی مختلف داستان تھی۔ وہیں ان داستانوں میں شاہ جی کی داستان کا ایک اضافہ اور ہو گیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ شاہ جی نے یہاں بڑی نیک نامی کمائی تھی۔ جب سے اس محلے میں آ کر آباد ہوئے تھے محلے والیوں کے بہت سے مسائل حل ہو گئے تھے۔ یہاں ہزاروں کہانیاں جنم لیتی تھیں۔ بہر حال سب کی ایک رائے تھی۔ شاہ جی کوئی بگڑے ہوئے رئیس ہیں اور کسی حادثے کے تحت یہاں آ بسے ہیں۔ یقینی طور پر کوئی بڑے جاگیردار جن کی رگوں میں کسی شریف اور بڑے باپ کا خون ہے اور یہ خون ان کے ہر عمل سے جھلکتا تھا۔ وہ بروں کے دشمن تھے اور مظلوموں کے طرف دار۔ برائی کے مقابلے میں برے بن کر سامنے آنے والے اور فتح حاصل کرنے والے آتشیں ہتھیار نہیں استعمال کرتے تھے لیکن باقی ہتھیار ان کے ہاتھوں کا کھلونا تھے۔ کبھی کسی محلے دار کو تنگ نہیں کیا تھا حالانکہ اگر وہ چاہتے تو انہیں سبھی خوشی سے خراج پیش کر سکتے تھے لیکن کبھی کسی کا ایک پیسہ نہ چھوا۔ جدھر سے گزرتے، جھک جھک کر سلام لیتے اور نیاز مندی سے گردن جھکا کر جواب دیتے۔ مجال ہے کہ کسی کی طرف کڑی نگاہوں سے دیکھا ہو۔ ہاں جنہیں ان نگاہوں سے دیکھا وہ دوبارہ ہیرا منڈی میں داخل نہیں ہو سکا۔ چنانچہ ہیرا منڈی والے ان کی عقیدت سے سرشار ہوتے جا رہے تھے۔ صرف ایک شمشیرہ بیگم تھیں جو ان کی دشمن تھیں باقی کسی کو ان سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ ڈیرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بوسکی کا کرتا، بہت ہی خوبصورت لاچا، سرکنڈے کی پشت والے مونڈھے قرینے سے

پڑے ہوئے تھے انہی میں سے ایک پر وہ بیٹھے تھے۔ فوراً ہی ایک ملازم نے حقہ لا کر سامنے رکھ دیا اور شاہ جی حقے کے کش لینے لگے۔ اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی اور شاہ جی چونک کر اس طرف دیکھنے لگے۔

فوراً ہی دلبر خان اشارہ پا کر دروازے کی جانب دوڑ پڑا۔ کنڈی کھول کر باہر جھانکا اور پھر کنڈی بند کر کے اندر واپس آ گیا۔

"ایک لڑکا ہے شاہ جی...... بہت خوبصورت سا۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"تو بلاؤ...... دروازہ کیوں بند کر دیا؟"

"جی......" دلبر خان نے کہا اور کچھ دیر بعد ایک نوجوان اندر داخل ہو گیا۔ اچھے لباس میں ملبوس تھا، آہستہ آہستہ چلتا ہوا شاہ جی کے سامنے پہنچا، جھک کر سلام کیا۔

ان کے اشارے پر نوجوان ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ شاہ جی نے گہری نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اچھی شکل وصورت کا سادہ سا نوجوان تھا۔

"ہاں پتر کہو...... کیسے آنا ہوا...... کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام رزاق ہے۔ شاہ جی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"بہت بڑا نام ہے بھئی...... چلو تو مل لو شاہ جی سے۔ یہ سارے ہمیں ہی شاہ جی کہتے ہیں۔ رب نواز ہے ہمارا نام۔"

نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا اور شاہ جی کے پیروں میں آ بیٹھا تو وہ چونک کر جلدی سے بولے۔

"ارے نہیں نہیں...... بری بات۔ چلو اٹھو، بیٹھو...... سامنے بیٹھو۔"

نوجوان دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اٹھا اور سامنے والے مونڈھے پر دوبارہ جا کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"شاہ جی! آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے کہو...... جاؤ، تم لوگ پیچھے ہٹ جاؤ۔" شاہ جی نے اپنے آدمیوں سے کہا اور پھر بولے۔ "ہاں بولو۔"

"شاہ جی! ایک التجا، ایک فریاد لے کر آیا ہوں۔ آپ کے سوا میری مدد اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

’’اللہ سے ڈر بھائی، اللہ سے...... میں کیا اور میری اوقات کیا۔ جو کام ہے بتاؤ۔ اگر کر سکا تو ضرور کروں گا۔‘‘

’’شاہ جی میری بات کو گستاخی تصور نہ کریں۔ آپ مجھ سے بڑے ہیں۔ مجھے احترام کرنا چاہئے آپ کا۔ لیکن زبان کھولنے پر مجبور ہوں۔‘‘

’’اگل دو...... اگل دو جو بات منہ میں ہے۔ ساری باتیں بعد میں ہوں گی۔‘‘

’’شاہ جی میں یہاں ایک کوٹھے پر رہتا ہوں...... زرینہ بائی کا کوٹھا ہے اور وہاں چاندی نام کی ایک لڑکی رہتی ہے۔ شاہ جی! میں...... میں......‘‘

’’آگے بولو...... آگے۔‘‘

’’شاہ جی! میں چاندی سے محبت کرنے لگا ہوں۔‘‘

’’ٹھیک...... لگ رہا تھا مجھے۔ پھر۔‘‘

’’اور وہ...... وہ بھی...... شاہ جی وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ ہم دونوں زندگی بھر کے ساتھی بننا چاہتے ہیں۔‘‘

رب نواز شاہ بے اختیار ہنس پڑا پھر بولا۔ ’’پتر! انڈے سے نکلے ہوئے کتنے دن ہو گئے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش۔ اوّل تو تمہارا اس طرف آنا ہی برا ہے۔ ماں باپ بیچارے بے موت مر جائیں گے۔ اور پھر پڑے ہو اس چکر میں...... کسی بڑے سے تو پوچھ لیتے۔ کوئی نہ کوئی تو ہو گا تمہارا...... وہ ضرور بتا دیتا کہ طوائف کی دوستی کیا ہوتی ہے۔ سنو! ہمارے پاس آئے ہو تو صلاح دیں گے۔ ایسے کسی چکر میں پڑنے کی کوشش مت کرو۔ باپ نے اگر کچھ کمایا دھمایا ہے تو گنوا بیٹھو گے اور پھر بازاروں میں جوتیاں چٹخاتے پھرو گے۔ سب کچھ لے لیں گی وہ تمہارا...... اور جب جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہو گی تو کمر میں لات ماریں گی اور سیڑھیوں سے نیچے پھینک دیں گی۔ کس چکر میں پڑے ہو پتر، بری بات ہے۔‘‘

شاہ جی کے الفاظ پر رزاق نے نگاہیں اٹھا کر شاہ جی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور چہرے پر ملال کے آثار تھے۔

’’دکھ ہوا...... واہ میرے مٹی کے شیر...... آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ اچھا چلو آگے چلو۔ چاندی بھی تم سے پیار کرتی ہے اور تم اس سے؟‘‘

’’شاہ جی! میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اسے زندگی بھر کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں اور مجھے آپ کی ضرورت ہے۔‘‘

’’ابے ہم نے کوئی ہیرا منڈی کی ٹھیکیداری شروع نہیں کر دی ہے بھائی! کس نے تمہیں بتایا کہ یہ کام ہم کر سکتے ہیں۔‘‘

’’نہیں شاہ جی! کسی نے یہ بات نہیں بتائی۔ چاندی نے ہی مجھ سے کہا ہے کہ اگر میں شاہ جی کی مدد حاصل کر لوں تو ہمارا کام ہو سکتا ہے ورنہ...... ورنہ......‘‘

’’عجیب باتیں کر رہے ہو...... میں نے کب ہیرا منڈی میں ایسا دھندا کھیلا ہے۔ کسی نے تمہاری چاندی کو غلط مشورہ دیا ہے۔ نام تو سنا ہے میں نے، کبھی صورت نہیں دیکھی۔ لوگ کہانیاں بھی بہت سی بنا لیتے ہیں۔ مت پڑو اس چکر میں بیٹا، مت پڑو...... بڑے کی حیثیت سے میری بات مان لو جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ ٹھیک ہے۔ باقی تم جانو۔ یہ جوانی کے کھیل ہیں۔ اور پھر طوائف، توبہ توبہ...... کبھی کسی کی نہیں ہوتی۔ خیال رکھنا، ایک بار پھر کہہ رہا ہوں۔ بری موت مارے جاؤ گے اور ملے گا کچھ نہیں۔‘‘

یہ کہہ کر شاہ جی نے حقہ گڑگڑانا شروع کر دیا۔ رزاق چند لمحے گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر زمین میں جذب ہو رہے تھے۔ شاہ جی نے شاید پہلی بار ان زمین پر گرتے ہوئے موتی کے قطروں کی طرف دیکھا تھا اور پھر ان کے منہ سے حقے کی نے باہر نکل آئی۔

’’او بے وقوف، او گدھے...... مرد ہو کر ٹسوے بہاتا ہے...... بھوتنی کے، چپ ہوتا ہے کہ لگاؤں ایک لات...... آیا ہے میرے پاس کام سے اور بیٹھا رو رہا ہے۔ ابے چپ ہو جا، تجھے کس نے بتایا ہے کہ آنسو ہم سے برداشت نہیں ہوتے۔ او دلبر خان! اسے چپ کراؤ، ورنہ حقے کی نے سے کمر چھیل کر رکھ دیں گے۔‘‘

دلبر خان کو معلوم تھا کہ شاہ جی کو بے بسی سے بہتے ہوئے آنسو دیوانہ کر دیتے ہیں چنانچہ اس نے جلدی سے رزاق سے کہا۔

’’آنسو پونچھ لو۔ بری بات ہے۔ مردوں کو رونا نہیں چاہئے۔ مردوں کی آنکھوں سے تو آگ برسنی چاہئے۔ کون ہو تم...... کیا ہوا...... شاہ جی! یہ قصہ کیا ہے؟‘‘

’’دیکھو روئے جا رہا ہے...... روئے جا رہا ہے...... ابے دیکھو یہ مرد ہے بھی یا نہیں؟‘‘

دیکھواس سے کہو چپ ہو جائے ورنہ کھڑے ہو گئے تو مولا قسم ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔"

"کیا شامت آ رہی ہے...... چپ ہو جاؤ۔ ورنہ شاہ جی سچ مچ بہت ناراض ہو جائیں گے۔"

"بڑی امیدیں لے کر آپ کے پاس آیا تھا...... مر جاؤں گا، خدا کی قسم جیتا نہیں رہوں گا۔ آپ جو کچھ کہہ لیں، جتنا چاہیں مذاق اڑا لیں، چاندی کے بغیر زندگی ممکن نہیں ہے۔ یہاں سے سیدھا راوی جاؤں گا اور ڈوب کر زندگی دے دوں گا۔" نوجوان نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا اور شاہ جی ہذیانی انداز میں ہنس پڑے اور بولے۔

"پاگل ہو گیا ہے بھوتنی کا پاگل...... ہم نے کہہ تو دیا نا کہ ہم یہ سارے کام نہیں کرتے۔ کسی نے غلط کہہ دیا ہے تجھ سے۔ ہمارا تعلق زرینہ بائی سے ہے اور نہ چاندی سے۔"

"ٹھیک ہے...... کچھ نہ کریں...... جاتا ہوں میں۔"

"لے جاتا ہے...... راوی جائے گا؟"

"اور کوئی جگہ نہیں ہے میرے لئے۔" رزاق کے لہجے میں دیوانگی جھلک رہی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ شاہ جی نے کہا۔

"رک...... رک...... رک جا...... ادھر آ، بات سن۔" اور رزاق رک گیا۔

"ابے ادھر آ...... سنتا نہیں ہے؟" وہ غرائے اور رزاق ان کے پاس واپس آ گیا۔

"تو رزاق ہے تیرا نام۔"

"جی شاہ جی۔"

"باپ کون ہے؟"

"احمد حسن۔"

"کیا کرتا ہے؟"

"کاروبار کرتے ہیں۔"

"اور تُو اس کاروبار کو ختم کرتا ہے۔ کیوں؟ آخر کیا دیکھا تُو نے اس طوائف زادی میں؟"

"شاہ جی! محبت ان باتوں کو نہیں دیکھتی۔ یہ تو اچانک ہو جاتی ہے۔ اور پھر چاندی تو ہے ہی محبت کرنے کے لئے۔"

"واہ، سارا فلسفہ جانتا ہے محبت کا تُو...... زرینہ بائی کو تیرے اس چکر کا علم ہے؟"

"جی شاہ جی......" رزاق نے کہا اور شاہ جی چونک پڑے۔

"کیا پتہ ہے اسے؟"

"جی شاہ جی۔"

"تو کیا کہتی ہے وہ؟"

"پٹوایا تھا اس نے مجھے۔ کوٹھے پر میرا آنا جانا بند کر دیا ہے۔ چاندی چھپ چھپ کر مجھ سے ملتی ہے۔"

"واہ بھئی واہ...... کچھ تگڑا ہی لگتا ہے...... کہاں ملتی ہے تجھ سے چھپ چھپ کر؟"

"شاہ جی! رات کو ایک دو بجے جب یہ بازار سو جاتا ہے تو وہ پچھواڑے پُلیا کے کنارے میرے پاس آ جاتی ہے۔ کئی بار آ چکی ہے لیکن اب یہ راستہ بھی بند ہو گیا ہے کیونکہ زرینہ بائی کو اس کا علم ہو گیا ہے۔ زرینہ بائی نے ایک غنڈہ رکھا ہوا ہے اس نے پچھلے دنوں مجھے خوب مارا پیٹا تھا۔"

"ہوں...... تیرا باپ مان لے گا اس بات کو؟"

"میری ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی شاہ جی اور میرے ابا شوقین مزاج ہیں۔ نجانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے ہیں۔ گھر میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لاوارثوں کی طرح پلا بڑھا ہوں بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔"

"اور تُو عشق کرتا ہے اور شادی کرے گا اس طوائف زادی سے۔ ابے جانتا ہے کہ طوائف زادی کا پیٹ کتنا بڑا ہوتا ہے۔ نجانے ہاتھ پاؤں کہاں کہاں تک پھیلے ہوتے ہیں۔"

"چاندی ایسی نہیں ہے شاہ جی۔"

"سوچ لے...... سوچ لے...... اچھی طرح سوچ لے...... کہاں سے کھلائے گا اسے؟ کہاں سے پہنائے گا؟ چاندی سے بات بھی کر لے۔ اگر اس کے بعد بھی تم دونوں ایک دوسرے کی زندگی میں داخل ہونا چاہو تو پھر آ جانا ہمارے پاس۔ مگر چاندی سے بات ضرور کر لینا۔"

"میں نے اس سے بات کر لی ہے۔"

"ایک مرتبہ اور کر لے...... بتا دے کہ تیرے پاس کچھ نہیں ہے۔ کھلا پلا بھی نہیں سکے گا۔ اس کے باوجود اگر تیار ہے تو آ جانا ہمارے پاس۔ دیکھیں گے کہ کیا کر سکتے ہیں۔ چلو بھائی دلبر خان! یہ کیس بھی رجسٹرڈ کر لو۔" رب نواز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ رزاق نے عقیدت بھری نگاہوں سے رب نواز کی طرف دیکھا اور بولا۔

"میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ کسی دن چاندی کو لے کر ہی یہاں آؤں گا۔ آپ خود اس سے بات کر لیجئے۔"

"نہ، نہ...... ایک وہ چھنال کی جنی، وہ ہماری کون سی دوست بنی ہوئی ہے۔ تُو ایک اور سے ہمارا جھگڑا کرا دے...... ادھر مت لانا...... ہم خود دیکھ لیں گے۔ اگر کوئی بات ہوئی تو تجھے بتا دیں گے۔ سمجھ رہا ہے ناں؟ ہمارے پاس تو آ جانا مگر جھوٹ نہ بولنا ہم سے...... یہ بات ہم تجھے بتائے دے رہے ہیں۔ چاندی سے ایک بار پوری پوری بات کر کے ہمیں بتانا نکالیں گے کوئی ترکیب چوری چھپے۔ ہمیں بھی ادھر ہی رہنا ہے۔ اگر سب کو دشمن بنا لیا تو کیسے رہ سکیں گے؟"

رزاق نے گردن ہلا دی تھی۔ شاہ جی ایک دم ہنس پڑے اور بولے۔ "اور سن، آئندہ آنسو مت بہانا۔ مرد کی آنکھوں سے آنسو بہہ جائیں تو اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہتا۔ اس کی آنکھوں کے شعلے محفوظ رہنے چاہئیں۔ بس جا......"

رزاق خاموشی سے گردن جھکا کر باہر نکل گیا تھا اور شاہ جی کے چہرے پر ایک عجیب سا اضطراب نظر آنے لگا تھا۔ کافی دیر تک وہ اس طرح مضطرب بیٹھے رہے اور پھر فضل خان سامنے آئے۔

"خیریت شاہ جی! کون تھا وہ؟"

"او بس یار! یہ لونڈے ہیں آج کل کے۔ سسرے انڈے سے باہر نکلے، غنڑغوں، غنڑغوں کرنا بھی نہ سیکھا اور پہنچ گئے ہیرا منڈی۔ یہاں آ کر کسی طوائف زادی کے چکر میں پڑ گئے اور پھر......" شاہ جی نے ایک موٹی سے گالی دی تھی۔

اسی وقت اکرام دروازے سے اندر آتا نظر آیا۔ اکرام کی شخصیت شاہ جی کے لئے کچھ ایسی پُرکشش ہو گئی تھی کہ اسے دیکھ کر کتنا بھی بگڑا ہوا موڈ ہوتا، ٹھیک ہو جاتا تھا۔ دل کو لگ گئی تھی۔ یہ احساس تھا کہ یہ بھی ایک طوائف زادہ ہی ہے اور میں بھی اسی کا ایک ساتھی

ہوں۔ مجھے تو ایک رئیس کی قربت مل گئی۔ یہ تو بالکل بے سہارا ہے۔ پیار سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"آؤ اکرام...... کدھر سے گھوم پھر کر آ رہے ہو؟"

"بس شاہ جی! باجی کے پاس گیا تھا۔"

"کیسی ہے وہ تمہاری باجی؟ اور وہ تمہاری ننوں، اس کا تو زیادہ وقت ہمیں کوسنے دیتے ہوئے گزرتا ہوگا۔"

"بس شاہ جی کوئی نہ کوئی چال سوچتی رہتی ہے۔ ایک بار پھر اس نے باجی کی زندگی تنگ کر کے رکھ دی ہے۔"

"قصور تیری باجی کا بھی ہے...... کیوں نہیں چھوڑ دیتی کوٹھا۔ جا کر کہیں عزت سے رہے۔ ہم تو مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

"باجی کی کچھ مجبوریاں ہیں۔"

"کوئی اور خاص بات ہو گئی؟"

"ہاں بہت ہی خاص بات۔"

"کیا......؟" رب نواز سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"باجی کو کسی بدمعاش رئیس کے ہاتھ بیچ دیا گیا ہے جو حضوری گوٹھ کا رہنے والا ہے اور اب ننوں اس سے کہہ رہی ہیں کہ وہ اس کے پاس چلی جائے۔"

"ایں...... بیچ دیا ہے؟"

"ہاں...... وہ رحمت خان جو ہے اس نے ابھی تک اس گھر میں آنا جانا نہیں چھوڑا۔"

"ہوں، خیر...... زمین اللہ کی ہے۔ حکومت اس کی۔ مالک کسی کو آنے جانے سے تو کہیں سے نہیں روک سکتے۔ مگر یہ رحمت خان، اسے دیکھنا پڑے گا۔ ذرا یہ بیچنے باچنے والی بات کیا ہوئی ہے؟"

"بس انہوں نے باجی کو خرید لیا ہے۔"

"اور باجی سے پوچھے بغیر یہ سارا معاملہ طے ہو گیا...... میں کہتا ہوں یہ تیری باجی اس سے بولتی کیوں نہیں ہے کہ وہ ان کی مرضی پر نہیں چل سکتی۔"

"وہ لوگ باجی کو پریشان کرتے ہیں۔"

"تو پھر؟"

"باجی نے خود مجھ سے کہا ہے کہ اس وقت انہیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

شاہ جی کسی سوچ میں ڈوب گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد بولے۔ "یہ کتیا کی بچی کچھ نہ کچھ کر کے ہی رہے گی۔ بار بار سینہ نکال کر ہمارے سامنے آرہی ہے۔ لگتا ہے ہمارے ہی ہاتھوں دنیا سے رخصت ہوگی۔ اور وہ حرام کے جنے جو اپنی جیسی ہر کوشش کر چکے، اتنے جوتے کھا چکے ہیں مگر جان کو آئے ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"ادھر تو سارا انتظام ہوگیا ہے شاہ جی! رحمت خان کہہ کر گیا ہے کہ کسی بھی وقت باجی کو یہاں سے بلوالے گا۔ باجی بہت پریشان ہے۔"

"خیر جس کام سے تُو پریشان ہے وہ تو خیر ہونے کا ہی نہیں ہے۔ پرواہ مت کر، دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ چلو بھئی، بیٹھ جاؤ...... میٹنگ، میٹنگ، میٹنگ۔" شاہ جی نے کہا پھر بولے۔ "شمشیرہ بیگم کا کچھ کرنا ہی ہوگا...... ایسا کرو کہ پہلے تو ڈیوٹی دو تم لوگ۔ وہ کچھ نہ کچھ کر کے ہی رہے گی۔ کوئی چال ضرور چلی ہوگی اس نے مگر اس کی یہ چال ناکام بنانی ہے۔ اپنی اپنی ڈیوٹیاں بدلتے رہو اور ڈیوٹی پر ہوشیار رہو۔ کوئی بات آگے بڑھے تو فوراً ہمیں اطلاع دو روکیں گے اس مسئلے کو بھی۔ کیا سمجھے؟ اور تُو بیٹا بالکل پرواہ مت کر۔"

"میں نے بات آپ تک پہنچا دی شاہ جی! اب مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔" اکرام نے مطمئن لہجے میں کہا۔

○●○

رحمت خان کا کاروبار ہی یہی تھا۔ نوابوں اور جاگیرداروں کی مصاحبت میں زندگی گزاری تھی۔ اچھا خاصا کما لیتے تھے۔ دنیا کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ رئیسوں اور جاگیرداروں کی خوشیاں پوری ہو جائیں تو انہیں بہت کچھ مل جاتا تھا۔ ایک بار پھر انہوں نے ایک بہت بڑے بدمعاش سے رابطہ قائم کیا اور اسے تمام صورتحال بتائی۔ اس بہت بڑے بدمعاش کا نام چندو تھا۔ لاہور میں یہ بھی ایک خاص ادا ہے۔ علاقوں کی ذمہ داریاں سرکار کے ساتھ ساتھ مقامی گرہوں نے بھی سنبھال رکھی ہیں اور وہ ہر چھوٹے بڑے کام کر لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ تمام تر تفصیلات سننے کے بعد چندو نے کہا۔

"ٹھیک ہے، لڑکی کو صرف ڈیفنس والی کوٹھی تک پہنچانا ہے یا کچھ اور بھی کرنا ہے؟"

"ابھی تو فی الحال یہی کرنا ہے۔ بعد میں اگر کوئی اور حکم ملا تو تمہیں اطلاع کر دیں گے۔"

"تو پھر کب کرنا ہے یہ کام؟"

"آج۔"

"ٹھیک...... حکم کرو ہمارے لئے۔"

"چندو! تم اپنے آدمیوں کے ساتھ ہیرا منڈی جاؤ۔ میں اس سے پہلے شمشیرہ بیگم کے پاس جا کر انہیں خبر کئے دیتا ہوں۔ وقت تم بتاؤ، گاڑی تیار ملے گی۔ چنانچہ اسے وہاں سے اٹھاؤ۔ اور اگر مناسب سمجھو تو تھوڑے سے آدمی وہاں ہی چھوڑ دو کہ بعد میں بھی خیال رکھیں۔ دو چار دن کی تو بات ہے، اس کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ راؤ ریاست سے منہ مانگی رقم دلوانا میری ذمہ داری ہے۔ یہ ان کے بہت ہی گہرے دوست کا معاملہ ہے جو سندھ کے ایک بہت بڑے زمیندار ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... ہم کس وقت وہاں پہنچیں؟"

"رات آٹھ بجے کا وقت زیادہ مناسب رہے گا۔ میں شمشیرہ بیگم کو خبر کر دوں گا۔"

"کیا تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گے؟"

"تم تو یہ بات جانتے ہو کہ میں کمزور دل کا مالک ہوں۔ دل کی تکلیف میں مبتلا ہوں۔ انجائنا بتایا ہے ڈاکٹروں نے۔ زیادہ آگے بڑھ کر کام کروں گا تو دل کی دھڑکنیں تیز ہو جائیں گی۔ بس پھر سمجھ لو ہفتوں کے لئے بستر پر چلا جاتا ہوں۔ مجھے پیچھے ہی رہنے دینا۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں میرا تذکرہ ہی نہ آنے دینا۔"

چندو ہنس پڑا، پھر بولا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے...... ہم آٹھ بجے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"ہاں، گاڑی تیار ملے گی۔ یہیں کھڑی کر لینا۔"

"ٹھیک ہے...... گاڑی آگئی تو سمجھ لیں گے کہ تم نے شمشیرہ بیگم سے بات کر لی ہے اور اگر نہ آئی تو ہم سمجھیں گے کہ ہمارا کام نہیں ہوگا۔"

"بے فکر رہو، ایسا ہی ہوگا۔"

رحمت خان یہاں سے سیدھے چھپتے چھپاتے شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر پہنچے تھے۔ شمشیرہ بیگم خفیہ طریقے سے ان سے ملیں اور رحمت خان نے انہیں ساری تفصیل بتائی۔

"تم بے فکر رہو...... وہ تو اب ہمارے پاس تمہاری امانت ہے۔"

"چندو بدمعاش گاڑی لے کر آئے گا اور پھر کوثر جہاں تمہارے کوٹھے سے اتر کر وہاں پہنچ جائے گی۔"

"اے رحمت خان! ٹھیک بندوبست تو کر لیا؟ میں تو ہمیشہ اپنے وعدے پورے کرتی ہوں۔ تم دیکھ لو، میرا تو خیال تھا کہ خیر بخش حضوری ایک لفنگے کو ٹھیک کر کے رکھ دیں گے مگر وہ اس کے ہاتھوں بے بس ہو گئے۔ اور ہاں اگر لین دین کا معاملہ صاف ستھرا رہے تو اچھا ہے۔" شمشیرہ بیگم نے دل کی بات کہی۔

"بڑی بے صبری ہو تم شمشیرہ بیگم! جتنے بڑے ہیں راؤ ریاست اور خیر بخش حضوری تم سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"ارے نہیں نہیں...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میرے لئے تو رحمت خان تم بھی کسی رئیس سے کم نہیں ہو۔ بس ذرا خود خیال رکھنا۔"

"ہمارا خیال تمہیں رکھنا ہوگا۔ اگر تم نے ہمارا خیال رکھا تو مجال ہے کہ تمہیں ایک کوڑی کا بھی گھاٹا ہو جائے؟"

"وہ تو میں جانتی ہوں۔ جہاں تک تمہارا خیال رکھنے کی بات ہے تو ہمارے تمہارے بیچ پیسہ آیا کہاں ہے؟ تم جو کہو گے کر لوں گی۔"

"ہاں پیسہ ہمارے تمہارے بیچ پہلی بار آ رہا ہے۔" اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر رحمت خان خفیہ طور پر وہاں سے واپس چلے گئے۔

○●○

شاہ جی نے اکرام کو اس قدر تیز کر دیا تھا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کل کا بچہ اتنا ذہین ہو سکتا ہے۔ بہرحال شاہ جی کی ہدایت پر وہ سب بڑی باقاعدگی سے باری باری اپنی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ اکرام نے شاہ جی کو بتا دیا تھا کہ رحمت خان آج ہی رات کوثر جہاں کو لے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ادھر اس نے کوثر جہاں سے بھی کہا کہ وہ بے فکر رہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوثر جہاں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی تھی۔ سوچتی تو دل پانی پانی ہونے لگتا تھا...... کچھ وہ ہیں جو گھر کی چہار دیواری میں ہر طرح کے تحفظ رکھتی ہیں، انہیں کوئی خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ ان کے رکھوالے، ان کے نگہبان ان کے ساتھ ہوتے

ہیں...... لیکن وہ جو صرف اپنی یاد چھوڑ گیا تھا اس کی تلاش کی آرزو تھی۔ شمشیرہ بیگم نے اسے سبز باغ ضرور دکھائے تھے۔ لیکن اس نے بھی کوٹھے پر بہت طویل عمر گزار لی تھی۔ شمشیرہ بیگم کے سارے پینتروں کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ تقدیر کی ماری صرف جی رہی تھی اس آسرے پر کہ کبھی نہ کبھی اس بے وفا سے ملاقات تو ہو ہی جائے گی۔ اس کی ہونٹوں کی مسکراہٹ صرف اوروں کو دکھانے کے لئے تھی۔ اندر کے موسم کا حال خود اس کے سوا اور کون جان سکتا تھا۔ ایک بے بس، مجبور اور لاچار کمزور سی لڑکی جسے آج بھی کسی کے سامنے جانے کی آرزو تھی اس کے سامنے جو اس کی آنکھوں میں بسا ہوا تھا اور جو اس کا محبوب تھا اور جو اس کا اپنا تھا۔ دوسری طرف شاہ جی کی آرمی پوری طرح تیار تھی۔ اس طرح کے ہتھیار ساتھ لئے گئے تھے کہ اگر دوسری طرف سے آتش زنی کا مظاہرہ بھی ہو تو دیکھ لیا جائے ویسے یہ بھی ایک خاص خوبی ہے۔ جو ہیرا منڈی کے لوگ جانتے ہوں گے کہ وہاں آنے والے بدمعاش آتشیں اسلحہ استعمال نہیں کرتے۔ کیونکہ اس طرح پکڑے جانے پر ان کی بچت ممکن ہوتی ہے۔ ایک طرف یہ لوگ تیار تھے اور دوسری طرف اکرام اپنی جگہ مستعد تھا۔ یہ تیاری ہو گئی تھی کہ وہ حالات پر نگاہ رکھے اور جیسے ہی رحمت خان وہاں پہنچیں ایک مخصوص اشارے سے اطلاع دے کہ وہ آ گئے ہیں۔

بہرحال موٹر آ کر تھوڑے فاصلے پر رکی۔ چندو اپنے بہت سے گرگوں کے ساتھ آیا تھا جو ہتھیاروں سے لیس تھے۔ اس نے اپنے ایک گرگے کو شمشیرہ بیگم کے پاس بھیجا اور پیغام دیا کہ کوثر جہاں اگر تیار ہو تو اسے نیچے پہنچا دیا جائے۔ اور کوثر جہاں کو زبردستی نیچے لایا گیا۔

چندو نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تھا۔ کوثر جہاں کانپتے دل کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ لیکن ڈرائیور ابھی تک اپنی سیٹ پر نہیں پہنچا تھا کہ چندو نے اپنے سامنے چار افراد کو دیکھا۔ ساتھ میں اکرام بھی تھا۔ وہ سب اس طرح کھڑے تھے جیسے اس کا راستہ روکنا چاہتے ہوں۔ چندو ترنگ میں آگے بڑھا۔ اس کا انداز مست ہاتھیوں جیسا تھا۔ اس نے ان سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون ہو رے...... کون ہو تم ماں کے الّو...... ہمارے سامنے ایسے کیوں آ کھڑے ہوئے ہو؟"

"الّو کے پٹھے اگر موت ہی آئی تھی، خودکشی ہی کرنی چاہتا تھا تو راوی کیا بری تھی۔ تجھے

پتہ نہیں کہ یہ شاہ جی کا علاقہ ہے اور یہاں سے کسی کو اس کی مرضی کے خلاف جانے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔"

"اوئے، ہوئے، ہوئے، ہوئے...... تو تم شاہ جی کے آدمی ہو۔ میرے بارے میں معلوم تو کر لیتے کہ میں کون ہوں...... بن موت مرنے کے لئے میرے سامنے آنا ضروری تھا؟ میں تو تمہارے خون سے بھی ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔ چندو ہے میرا نام۔ اگر کبھی غنڈے بدمعاش رہے ہو تو کسی سے پوچھ تو لیا ہوتا کہ یہاں تمہارے باپ، دادا کون کون ہیں؟ رنڈیوں کے محلے میں رہ کر ان بے چاریوں کو اکڑ دکھانا دوسری بات ہے، بدمعاشوں کے سامنے آنا دوسری بات۔ اب ایسا کرو سیدھے سیدھے گھر جاؤ۔ آرام کرو، کھاؤ پیو۔ اگر کچھ اور زندگی ہے تو گزار لو۔ جاؤ، جو کہہ دیا کرو۔ ایک بار معاف کر دیا ہم نے۔"

"یہ چندو ہے...... اس کی چندیا پر اتنے جوتے لگاؤ کہ چندیا ہی باقی نہ رہے۔"

شالے خان آگے بڑھا اور ایک زوردار تھپڑ چندو کے منہ پر رسید کر دیا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "بدمعاشی کرنے آئے ہو...... موت گھیر رہی تھی تو ادھر ہی کا رخ کرنا لازمی تھا۔ ہمارے محلے کو خوامخواہ گندا کرنے آ گئے۔" چندو نے نجانے کتنی عمر کے بعد یہ تھپڑ کھایا تھا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا اس کے آدمی شالے خان پر دوڑ پڑے۔ شالے خان اچھل کر پیچھے ہٹے۔ بدن میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک خاص قسم کے دو ڈنڈے نکال لئے۔ نن چکو ٹائپ کی چیز تھی۔ زنجیریں کھل گئیں اور لٹو نیچے لٹک گئے۔ جیسے ہی چندو کے گرگے آگے بڑھے، شالے خان نے ایک جھکائی لی۔ کمر کو بھی نیچے جھکایا۔ لپک کر جھکے اور اس کے بعد سیدھے ہوئے تو زنجیریں تن گئیں۔ لوہے کے وزنی لٹو فضا میں گھومے۔ خوش قسمتی سے ان کی زد میں چندو کا صرف ایک ہی آدمی آیا۔ کمر پر لٹو پڑا تو دوہرا ہو گیا اور الٹے ہاتھوں سے ریڑھ کی ہڈی پکڑنے کی کوشش کی۔ دوسرے لوگ تو یہ بھی نہیں سمجھ پائے تھے کہ یہ کون سا ہتھیار ہے۔ مارشل آرٹ ویسے تو اب بہت زیادہ اجنبی نہیں رہا ہے لیکن یہ ہتھیار ذرا مختلف ہی قسم کا تھا۔ بہرحال ایک تو لڑھک ہی گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد باقی تمام لوگ بھی مصروفِ عمل ہو گئے۔ طرح طرح کے انوکھے ہتھیار جن سے وہ لوگ واقف بھی نہیں تھے۔ کراچی یونیورسٹی میں بھی ایک بار الیکشن کے دوران ایک مقابلہ ہوا تھا۔ وہ مقابلہ بھی تاریخی حیثیت رکھتا تھا۔ اخبارات ان نقاب

پوشوں کے بارے میں کافی دن تک لکھتے رہے تھے جنہیں انہوں نے ننجا کہا تھا۔ اور یہ کہا تھا کہ یہ مقامی ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ مارشل آرٹ کے مظاہرے انہوں نے جیسے جیسے ہتھیاروں کے ساتھ کئے تھے وہ کبھی نہیں دیکھے گئے تھے۔

عجیب لڑائی تھی۔ دکانیں تو خیر فٹافٹ بند ہی ہوتی چلی گئی تھیں۔ لیکن جو جنگ ہو رہی تھی وہ کمال کی تھی۔ ہیرا منڈی والے اس طرح اس جنگ کو دیکھ رہے تھے جس طرح کوئی بہت ہی دلچسپ تماشہ شروع ہوا ہو۔ شاہ جی کی یہی تو ایک ادا تھی۔ ہیرا منڈی کے معمولی سے معمولی دوکانداروں سمیت تمام لوگ یہاں تک کہ سڑکوں کی جھاڑو دینے والے کے سامنے گردن خم تھی۔ لیکن جو گردن تان کر ہیرا منڈی میں داخل ہوا اس کی گردن دوبارہ نہ اٹھ سکی۔ اس نے کبھی ہیرا منڈی کے بازار کو مجبور نہ کیا اور اب یہ چندو جی آئے تھے۔ بھاگنے والا کون تھا یہ تو پتہ ہی تھا لیکن بھگدڑ سے ہونے والے نقصان کا انتظام کیا گیا تھا۔

پریشانی صرف پولیس سے تھی جو اپنا فرض پورا کرنے کے لئے آتے تھے، پوچھ گچھ کرتے تھے، چیزیں اٹھا کر کھاتے تھے۔ بہرحال سب کے سب دکانوں کے تختوں پر کھڑے ہو گئے اور لڑائی کا منظر دیکھنے لگے۔ انہوں نے پہلی بار اکرام کو بھی دیکھا تھا جو ایک ایسے ہی ہتھیار سے مسلح تھا۔ چندو کے آدمی اس طرح مار کھا رہے تھے کہ دیکھنے والے واہ، واہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ہتھیار تو ان کے پاس بھی تھے لیکن استعمال کرنے کا موقع نہ ملتا۔ نئی نئی چیزیں سامنے آئی تھیں اور ہیرا منڈی والے جانتے تھے کہ شاہ جی کے پاس اور بھی بہت کچھ ہے۔ بہرحال یہ مقابلہ اس شکل میں ہو رہا تھا۔ چندو کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اسے ایک دم یہ احساس ہو گیا کہ یہ لوگ چھلاوے ہیں۔ اس کے آدمی گدھوں کی طرح پٹ رہے تھے۔ وہ خود بھی اس جنگ میں شریک تھا لیکن بڑا شرمندہ تھا کہ ابھی تک ان چار آدمیوں کو چھونے میں بھی ناکام رہا تھا۔ ادھر شاہ جی ہنس ہنس کر اپنے آدمیوں کو شہہ دے رہے تھے۔ ان کی آواز ابھری۔

"چندو جی...... میرے چاند...... یہاں آنے سے پہلے پوچھ لینا چاہئے تھا کہ مقابلہ کس سے ہو گا...... اب غنڈہ بننا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ تم لوگ گائے بھینس چرانے والے، غنڈہ گردی ایک علیحدہ چیز ہے۔"

ادھر بالکونیوں میں ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے تھے۔ شمشیرہ بیگم بھی حاجو اور غلام شاہ کے

ساتھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ادھر کوثر جہاں گاڑی میں بیٹھی ہوئی سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ شاہ جی نے واقعی قول نبھایا تھا۔ وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ ہو کیا رہا ہے۔ پھر اچانک ہی ایک غیر متوقع واقعہ ہوا۔ ہیرا منڈی کی لائٹ چلی گئی اور پوری ہیرا منڈی تاریکی میں ڈوب گئی۔ چیخنے پکارنے والوں کی آوازیں ایک لمحہ کے لئے رک گئی تھیں۔ لیکن اس خاموشی اور سناٹے میں ایک اور چیخ لہرائی تھی جس کے بارے میں اس وقت تو اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ لڑنے والوں کے ہاتھ رک گئے البتہ پینترے بدلنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اس موقع پر چاقو سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ شاہ جی کے تمام آدمی سنبھل گئے اور انہوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ چندو کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ لیکن مسئلہ بالکل ہی مختلف ہو گیا تھا۔ خود چندو اور اس کے ساتھی ہکا بکا رہ گئے تھے۔ روشنی چند لمحات کے بعد واپس آ گئی۔ لیکن جونہی روشنی آئی شالے خان نے چندو کے ٹخنے توڑ دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے روشنی کے بعد ہونے والی لڑائی کا نتیجہ بھی ظاہر ہو گیا۔ چندو کے ساتھی لمبے پڑے تھے۔ بہت سوں کے سر کھلے پڑے تھے اور وہ خون سے رنگین ہو رہے تھے۔ خود چندو ایک دیوار سے جا ٹکا تھا۔ جی دار اور اڑیل تھا، خود کو سنبھالے ہوئے تھا اس امید پر کہ ہو سکتا ہے اس کے ساتھی بھی خود کو سنبھال لیں۔ بہرحال تھوڑی دیر کے بعد یہ کھیل ختم ہو گیا۔ شاہ جی بھی اس اندھیرے سے اچانک حیران رہ گئے تھے۔ انہوں نے چیخ بھی سنی تھی لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ البتہ اچانک ہی ان کے ذہن میں خیال آیا اور انہوں نے گاڑی کی طرف دیکھا تو انہیں فوراً یہ احساس ہو گیا کہ گاڑی خالی ہو گئی ہے۔ ایک لمحے کے اندر اندر وہ بہت زیادہ محتاط ہو گئے۔ آخر کوثر جہاں کہاں غائب ہو گئی؟ ہو سکتا ہے کہ وہ گاڑی سے اتر کر کوٹھے پر چلی گئی ہو۔ سامنے ہی چندو بے بس پڑا ہوا تھا اور اس کے صحیح سالم ساتھی بھاگ جانے کی فکر میں تھے۔

''رک جاؤ بے ماں کے کتو! ہاں بھئی، کیا کہتا ہے؟'' شاہ جی چندو کی طرف بڑھے تو اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''مم...... مم معاف کر دیجئے...... معاف کر دیجئے شاہ جی، معاف کر دیجئے۔''

''چلو بھئی ٹھیک ہے، رک جاؤ۔ مرے ہوؤں کو کیا مارنا۔ چلو اٹھاؤ ان سب کو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے......''

لیکن پھر اچانک ہی شمشیرہ بیگم کے چیخنے پکارنے کی آوازیں ابھریں۔ وہ بری طرح واویلا کر رہی تھیں۔ شاہ جی اس کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔

''ہاں شمشیرہ بیگم! کوششیں کرتی رہو۔ جوتے کھاتی رہو۔ تمہاری تقدیر میں اب کوثر جہاں کی کمائی نہیں ہے۔ وہ تمہارے پاس ہماری امانت ہے۔ مشورہ دے رہے ہیں ہم تمہیں۔ کوٹھا قائم رکھو، ہوش میں آ جاؤ، کوثر جہاں سے واسطہ ختم کر دو۔ اسے کسی کام کے لئے مجبور نہ کرو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

پھر انہوں نے چندو کی طرف رخ کر کے کہا۔

''چندو! تجھ سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے لیکن پکا بدمعاش وہی ہوتا ہے جو آنکھیں کھلی رکھے۔ یہاں آنے سے پہلے تجھے معلوم کر لینا چاہئے تھا کہ یہاں ہم بھی ہیں۔ اپنے جیسے دوسروں سے کہہ دینا کہ شاہ جی ہیرا منڈی میں موجود ہیں، کوئی کام ہو تو پہلے ان سے ہدایت لے لیا کریں۔ آؤ اکرام! آؤ۔'' شاہ جی نے اکرام کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے واپس چلے گئے۔ جیسے ہی وہ وہاں سے دور ہوئے، شمشیرہ بیگم پھر دھاڑنے لگیں۔

''ہائے میری بچی کہاں گئی...... ہائے میری کوثر جہاں کہاں گئی...... دیکھو بھیا کیسا اندھیر ہے...... ارے ہیرا منڈی والو! ڈوب مرو، ایک آدمی نے تمہیں کتا بنا کر رکھ دیا ہے...... ہائے پولیس کہاں مر گئی۔ قانون بھی بے بس ہو گیا ہے...... کیا لاہور پر غنڈوں کی حکومت ہو گئی ہے؟''

شاہ جی تو آگے بڑھ گئے تھے، ان کے ساتھی بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ ادھر چندو اپنے آدمیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔ لاتیں مار مار کر انہیں اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خود اس کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی جسے وہ بری طرح گھسیٹ رہا تھا۔ زمین پر خون ہی خون پڑا ہوا تھا۔ شمشیرہ بیگم اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی چیختی رہیں۔ حاجو کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ لوگ جگہ جگہ مجمع بنائے ہوئے کھڑے تھے۔

''یہاں ویسے تو بہت سے کوٹھے ہیں مگر سارے ہنگامے شمشیرہ کے کوٹھے سے شروع ہوتے ہیں۔ انہوں نے ہیرا منڈی کو پتہ نہیں کیا بنا ڈالا ہے۔ جان عذاب میں ہے ان کی وجہ سے۔''

''مگر یہ کوثر جہاں کہاں غائب ہو گئی؟''

"وہ تو جہاں گئی ہو گی چلی گئی ہو گی مگر یہ شاہ جی اپنے محلے کی ناک بن گئے ہیں۔ قسم اللہ کی جو آیا جوتے کھا کر ہی گیا...... اور یہ چندو تو بڑی اونچی چیز تھی۔ بھئی کمال کر رہے ہیں یہ چاروں۔ سارے بھوتنی والوں کو مار مار کر بھوت بنا ڈالا ہے۔"

"تم نے اکرام کو نہیں دیکھا شیخ جی! اب تو اسے اکرام شاہ ہی کہنا پڑے گا۔ کیا ہاتھ چل رہا تھا اس کا، کمال ہے۔"

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تین لڑھکا دیئے تھے اس نے۔ ویسے بھائی ہیرا منڈی کا تو کھیل ہی بدل گیا ہے۔ اگر کبھی شاہ جی نے یہ محلہ چھوڑا تو اپنی یہ نشانی ہمارے لئے ضرور چھوڑ جائیں گے۔ ایک دن اکرام ہی محلے کا بدمعاش ہو گا۔"

بہرحال ساری باتیں اپنی جگہ، جتنے منہ اتنی باتیں۔ اصل مصیبت تو شمشیرہ بیگم پر ٹوٹی تھی۔ غزالہ اور شبانہ سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی تھیں۔ اندر سے حاجو ہاتھ میں چکلا بیلن لئے برآمد ہوا اور غرا کر بولا۔

"ایک ایک کو ختم کر دوں گا...... نہیں چھوڑوں گا...... خدا کی قسم سے کہتا ہوں مجھے غصہ آ گیا ہے۔"

غلام شاہ نے حاجو کو دیکھا اور منہ بنا کر بولا۔ "یہ بیلن تمہارے ہاتھ سے چھین کر اتنی زور سے ماروں گا سر پر کہ کھوپڑی خربوزے کی طرح کھل جائے گی۔ خوامخواہ تماشہ کر رہے ہو۔ دیکھ رہی ہیں شمشیرہ بیگم! اتنی دیر سے ان کا پتہ نہیں تھا، باورچی خانے میں گھسے ہوئے تھے۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ اب نکلے ہیں۔"

"تت...... تو کیا وہ بھاگ گئے؟" حاجو نے گردن ٹیڑھی کر کے کہا پھر بولا۔ "پتہ چل گیا ہو گا کہ میں آ رہا ہوں۔"

"ہاں ہاں...... پتہ چل گیا تھا۔ جاؤ ورنہ......" غلام شاہ نے کہا۔ شمشیرہ بیگم مسلسل بین کر رہی تھیں۔ غلام شاہ بولا۔

"اب روتی رہو گی یا پولیس کو بھی فون کرو گی کہ کوثر جہاں غائب ہو گئی ہے۔"

شمشیرہ بیگم نے ادھر دیکھا اور بولیں۔ "خدا تم لوگوں کو اٹھا لے...... اس دنیا سے غارت کر دے۔ ارے پولیس کو اطلاع دو گے تو کیا سائیں خیر بخش کی آن پر نہ بن جائے گی؟ پولیس ان کے پاس نہیں پہنچے گی کیا؟ اور پھر کیا ہو گا یہ جانتے ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے

کہ کوثر جہاں کو وہ ہی لے گئے ہوں۔ انہوں نے ہی صورتحال دیکھ کر بجلی بند کرائی ہو اور کوثر جہاں کو اپنے پاس بلوا لیا ہو۔ کسی اور میں یہ مجال ہے کہ وہ ایسا کام کرے اور ہم پولیس کو بیان دیتے پھریں۔"

"مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوثر جہاں ان کے پاس نہ ہو۔"

"تمہارے منہ میں گندی مٹی۔ جب بولو گے ایسے ہی بولو گے۔ کام کرو گے نہیں۔ جب تک سائیں جی کے پاس سے خبر نہ مل جائے پولیس کو کانوں کان بھنک نہیں پہنچنی چاہئے کوثر جہاں کی۔ ہائے میری پھول کنول پتہ نہیں کہاں چلی گئی۔ اور ویسے بھی اب سائیں خیر بخش کی ذمے داری ہے۔ انہوں نے اسے اپنی ذمہ داری پر ہی بلایا تھا...... ہمارے تو دام کھرے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں نہیں چھوڑیں گے انہیں۔ تم ایک کام کرو غلام شاہ۔"

"ہاں بولو۔"

"تم نواب شاہ چلے جاؤ۔ خبر تو دو انہیں جا کر۔ رے سارے کے سارے بس وہی ہیں۔ یہ رحمت خان اب ہمارے کام تھوڑی آئے گا؟"

"مم...... میں چلا جاؤں نواب شاہ؟"

"تو اور کون جائے گا۔ تم ہی تو ایک مرد ہو۔"

"اور اس حاجو کو تو تم نے اپنے پاؤں دبانے کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔"

"تت...... تو کیا ہمیں، نہیں شاہ جی! کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ہم میں ویسے ہی جان نہیں ہے۔ اگر ہم سے دوبارہ ایسی کوئی بات کہی تو ہم تو دنیا ہی سے چلے جائیں گے۔"

"تمہارا دنیا سے چلے جانا ہی ہم سب کے لئے اچھا ہے۔ تم کسی کام کے ہو بھلا۔ سارنگی بھی الٹی سیدھی بجاتے ہو۔ غلام شاہ تم تیاری کر لو۔ تمہارے سوا ہمارا ہے ہی کون؟"

"اور زندگی جو ہماری خطرے میں پڑے گی تو...... لگتا ہے تم شاہ جی کے ہاتھوں ہمارا جھٹکا ہی کرا کے دم لو گی۔"

"کس کا نام لے رہے ہو۔ کمبخت جس دن سے ہیرا منڈی میں آیا ہے ہم پر پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں...... ہائے میری بچی۔ ہے کوئی اس دنیا میں جو شمشیرہ بیگم کے دل پر ہاتھ رکھے۔"

بہرحال شمشیرہ بیگم کی حالت کافی خراب تھی اور وہ مسلسل اپنی تیگوم بازی میں لگی ہوئی

تھیں۔

حاجو باہر نکل آیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس آ گئی اور پولیس کی گاڑی دیکھتے ہی لوگ کھسکنے لگے۔ حاجو نے ہی سب سے پہلے شمشیرہ بیگم کو اطلاع دی تھی۔

''پولیس آ گئی۔''

''کیا......؟''

''ہاں......''

''ایک پولیس افسر شمشیرہ بیگم کے پاس ہی پہنچ گیا۔ ''یہ ہنگامہ تمہارے گھر سے ہی شروع ہوا تھا؟''

شمشیرہ بیگم کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

''کیا بتائیں بھائی جی! تقدیر میں یہی لکھا ہے۔ بیٹھ کر کھانے نہیں دیتے لوگ۔ زندگی خطرے میں ڈالیں، ذلیل کام کریں اور جوتے اوپر سے کھائیں۔ ان لچے لفنگوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہائے میری بیٹی کو اغوا کر لیا ہے۔ وہ پتہ نہیں اسے کہاں لے گئے۔''

''اپنا بیان لکھواؤ اور یہ رونا دھونا بند کرو۔'' پولیس افسر نے تڑک کر کہا۔

''کیا بتاؤں...... میری بچی نیچے جا رہی تھی کسی سے ملنے کے لئے کہ کچھ بدمعاش آ گئے۔ ہمارے ہاں ایک بہت بڑے تیس مار خان رہتے ہیں، ان کا نام رب نواز شاہ ہے۔ بس بھیا! کیا بتائیں۔''

''کسی پر شبہ ہے آپ کو؟''

''شاہ جی کے علاوہ ہمارا دشمن ہے ہی کون۔ اگر وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی تو ان کے گھر کی تلاشی لے لو۔ مل جائے گی۔ ہائے میرا تو خانہ خراب ہو گیا...... ہم تو مظلوم لوگ ہیں۔ ناچنے گانے والے، عزت گنوا کر پیٹ بھرنے والے۔ ہے اس دنیا میں ہمارا کوئی خبر گیر؟''

پولیس افسر باتیں کرتا رہا اور اس کے بعد باہر نکل گیا۔ شمشیرہ بیگم کے چہرے کی رونق بحال ہوئی اور بولیں۔ ''خدا کرے اس بار ایسے مروڑ کر لے جائیں وہ کہ پھر کبھی شاہ جی کی صورت اس محلے میں نظر نہ آئے۔''

بہرحال تھوڑی دیر کے بعد شمشیرہ بیگم کو ایک اور دلدوز خبر ملی۔ غلام شاہ اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے آ کر بتایا کہ پولیس والے واپس چلے گئے۔

''لے گئے شاہ جی کو؟''

''نہیں...... بس شاہ جی کو سلام کیا اور واپس چلے گئے۔''

''ہیں......؟'' شمشیرہ بیگم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ ''یہ کیا ہوا...... کیسے ہوا......؟''

کسی کے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا۔ سارے کے سارے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ حاجو، غلام شاہ، شمشیرہ بیگم...... وہ تو بار بار تڑپ اٹھتیں لیکن اس وقت سب کے سب دھک سے رہ گئے جب اچانک ہی دروازہ کھلا۔ دروازے سے سب سے پہلے جس شخص نے قدم رکھا اسے دیکھ کر حاجو اپنی جگہ سے اچھلا اور شمشیرہ بیگم کی گود میں جا بیٹھا۔ شمشیرہ بیگم نے دوہتڑ مارا تو حاجو، غلام شاہ پر جا پڑا۔ غلام شاہ جیسے دیوہیکل آدمی کے لئے یہ کام مشکل نہیں تھا کہ وہ حاجو کو اٹھا کر اس کی جگہ رکھ دے۔ لیکن آنے والے کو دیکھ کر اس کے بھی حواس گم ہو گئے۔ یہ شالے خان تھا اور اس کے پیچھے نور شاہ، فضل خان اور دلبر خان چاروں کے چاروں اندر آ گئے۔ انہیں دیکھ کر حاجو تو زمین پر لمبا لمبا ہی لیٹ گیا...... غلام شاہ نے گھبرا کر کھڑے ہونے کی کوشش کی، پاؤں لڑکھڑائے اور اس کے بعد وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ شمشیرہ بیگم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، شالے خان نے نرم لہجے میں کہا۔

''شمشیرہ بیگم! کوثر جہاں کہاں ہے؟''

شمشیرہ بیگم نے منہ کھولنے کی کوشش کی لیکن آواز نہ نکل پائی۔ حلق پھس پھس کر کے رہ گیا...... بمشکل تمام بولیں۔ ''مجھے کیا معلوم...... ہم تو خود اسے رو رہے ہیں۔ کہاں لے گئے ہماری بچی کو۔''

''وہ گھر پر نہیں ہے؟''

''تلاشی لے لو پورے گھر کی...... گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی کہ بتی چلی گئی۔ اور جب بتی آئی تو گاڑی میں نہیں تھی۔''

''ہوں...... چلئے اٹھئے آپ اور آپ کے یہ دونوں سازندے۔ شاہ صاحب نے اپنے احاطے میں انہیں بلایا ہے۔''

''ہیں...... ہمیں کیوں بلایا ہے...... ہم نے...... ہم نے کوئی پولیس بلائی تھی؟ ہم تو ویسے ہی تقدیر کے مارے ہیں۔''

"آپ فکر مند نہ ہوں...... شاہ جی نے آپ کو بلایا ہے اور آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے۔"

"میرے لئے یہ مشکل ہے...... بخار چڑھ رہا ہے۔ دیکھو میرا ہاتھ گرم ہے۔"

"اٹھ جائیے شمشیرہ بیگم! یہی آپ کے حق میں بہتر ہے۔"

"ارے نہیں جاتی۔ میں نوکر نہیں ہوں کسی کی۔ بالکل نہیں جاؤں گی، کہہ دیا میں نے۔" شمشیرہ بیگم نے بگڑ کر کہا۔

"ٹھیک ہے...... شالے، تم اپنا کام کرو۔" نور شاہ نے کہا اور شالے خان نے قریب ہی رکھا ہوا شیشے کا بہت بڑا گلدان لات مار کر گرا دیا۔ چھناکا گونجا اور شیشے کے ٹکڑے چاروں طرف بکھر گئے۔ شمشیرہ بیگم اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔

"ہائے ہائے...... یہ کیا کر رہے ہو؟ ہائے ہائے، سینکڑوں روپے کا تھا یہ گلدان...... ارے، ارے یہ میز...... ارے، ارے میرا پاندان......"

"شمشیرہ بیگم ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں، شاہ جی نے جو ہم سے کہا ہے وہی کر رہے ہیں۔ اس کے بعد اپنا کام شروع کریں گے۔ ایک منٹ...... ذرا ایک منٹ شالے خان۔"

غلام شاہ دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا حاجو جو لمبا لیٹا تھا، پھدک کر پھر کھڑا ہو گیا تھا اور پریشان نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ نور شاہ نے کہا۔

"شاہ جی نے کہا ہے کہ اگر آپ آنے پر تیار نہ ہوں تو اس کوٹھے کے سارے ساز و سامان کو توڑ کر چکنا چور کر دیا جائے، دیواروں کے پردے پھاڑ دیئے جائیں، قالین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ سارا سامان جو نظر آئے، اسے توڑ دیا جائے۔ تسنیم سمیت سب کو کوٹھے سے باہر لے جا کر کوٹھے کو آگ لگا دی جائے۔ سو اب مجبوری ہے۔ یہی کر رہے ہیں ہم۔"

"ارے ستیاناس...... ہائے ستیاناس...... چل رہی ہوں۔ ارے رک جاؤ...... ہائے میرے سینکڑوں روپے کا سامان توڑ دیا...... آگ لگا دو گے ہمارے گھر کو...... زندہ جلا دو گے۔"

"مم...... میں تو جا رہا ہوں۔" حاجو نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور راستے میں فضل خان نے اسے لپک لیا۔ حاجو، فضل خان کی گود میں کسی بچے کی مانند جھول رہا تھا۔

شالے خان نے تفریح لینے کے لئے اسے اچھالا تو وہ نور شاہ کی گود میں پہنچ گیا اور نور شاہ نے اسے دروازے سے باہر پھینک دیا۔ ادھر شمشیرہ بیگم نے جلدی سے چادر اوڑھ لی تھی۔ پھر یہ تینوں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے۔ شمشیرہ بیگم کے منہ سے اب آواز نہیں نکل رہی تھی۔ شاہ جی کا خوف دل لرزائے جا رہا تھا۔ ہیرا منڈی والے بھلا کہاں جاتے۔ سارے کے سارے قطار کی شکل میں شمشیرہ بیگم کی درگت دیکھ رہے تھے۔ شمشیرہ بیگم لرزتے قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں نجانے کتنے چلّے، وظیفے پڑھ ڈالے تھے۔ ڈیرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، سامنے ہی برآمدے میں شاہ جی مونڈھے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ہی حقہ رکھا تھا۔ تمباکو کی بُو پھیل رہی تھی۔ اکرام اس وقت موجود نہیں تھا۔

"آیئے شمشیرہ بیگم! تشریف رکھیے۔ خدا کی قسم اگر دوستی رکھتی ہم سے تو بڑی معلومات حاصل کرتے آپ سے۔ چھٹی ہوئی ہیں آپ۔ ہم نے آپ جیسی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

"شاہ جی! مجھے معاف کر دو...... مجھے معاف کر دو...... میری جاں بخشی کر دو۔"

"دیکھو ہماری ایک بات کان کھول کر سن لو، جو ہم پوچھ رہے ہیں وہ ہمیں بتاؤ۔ اگر کہیں بھی غلط بولا تو تمہارے سارے بال مونڈ کر سر پر کالونچ لگا دیں گے۔"

شمشیرہ بیگم دھم سے مونڈھے پر گر پڑیں۔ حاجو بھی مونڈھے کی طرف بڑھا لیکن پیچھے سے شالے خان نے گردن پکڑ کر کھینچ لیا اور وہ ان کے ہاتھ میں لٹک گیا۔ بہرحال شاہ جی کی آواز ابھری۔

"کوثر جہاں کہاں ہے؟"

"اسی کو تو رو رہی ہوں۔ مولا کی قسم! داتا صاحب کی قسم! دنیا دیکھنا نصیب نہ ہو اگر ہمیں اس کے بارے میں معلوم ہو۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے شاہ جی! کہ تم نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔"

"شمشیرہ بیگم! دیکھو ہمارا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اصل میں کوثر جہاں ہمارے اکرام کی ماں ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا سلوک ہو جیسا عام طوائفوں کے ساتھ ہوتا ہے تم ناچتی گاتی ہو، ہم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن جو چھوٹی چھوٹی

باتیں ہم کہہ دیا کرتے ہیں ان کا پورا ہونا ضروری ہے۔ ہم نے تم سے کہلوا دیا تھا کہ کوثر جہاں کو کہیں بھیجنے کی کوشش مت کرنا مگر تم نے کیا نہیں کیا۔ غنڈوں کو بلاتی رہیں اس محلے میں اور پٹواتی رہیں حرامیوں کو۔ سنو...... مجھے کوثر جہاں کا پتہ چاہئے۔ ورنہ اس کے بعد جو کچھ میں کروں گا تمہارے ساتھ اس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔''

''پھر شاہ جی! ہمیں بخش دو...... بخش دو ہمیں۔''

''یہ بتایئے آپ نے اسے سائیں مراد بخش کے ہاتھ فروخت کیا تھا؟''

''شاہ جی! طوائفیں فروخت کہاں ہوتی ہیں۔ وہ تو بس داشتاؤں کے طور پر جاتی ہیں۔ صدیوں کی ریت ہے۔ ہمیشہ جاتی رہی ہیں۔ کیا تم نے ان سب کو بچا لیا؟ ارے ہمارے ہی پیٹ پر لات کیوں مار رہے ہو؟''

''تمہاری دوسری بیٹیاں بھی ہیں۔ جہاں تک میرے علم میں ہے۔ اور پھر تمہارے پاس اتنا پیسہ ہے کہ اگر مزید پیسہ نہ آئے تو تم پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''طوائف سے یہ بات کہہ رہے ہو شاہ جی! کبھی طوائف کو جانا ہے تم نے...... کبھی سوچا ہے اس کے بارے میں...... کیا زندگی ہوتی ہے اس کی۔ اور ذرا ہمیں یہ تو بتا دو کہ ہم یہ سب کچھ خود تو نہیں بنتے۔ ارے تم ہی ہمیں یہ بناتے ہو۔ منہ نہ کھلواؤ شاہ جی! کہے بغیر نہ رہ سکیں گے اگر تم تماش بین نہ ہو تو ہم کوٹھوں پر کیوں رہیں۔ ہمیں بھی گھر ملے، ہم بھی گھر والی ہوں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو، سارا قصور ہمارا ہی تو نہیں ہے، لائن لگی ہوئی ہے کوٹھوں کی یہاں۔''

شاہ جی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ یہ الفاظ نجانے دل کے کون سے حصے سے ٹکرائے تھے۔ بہت دیر تک سناٹے میں بیٹھے رہے تھے اور ان کے چاروں ساتھی محسوس کر رہے تھے کہ اس وقت ان پر کیا گزر رہی ہے۔

○●○

کوثر جہاں کی کہانی ابھی تک صیغۂ راز میں تھی۔ اس وقت جب اسے شمشیرہ بیگم کے کوٹھے سے اتار کر کار میں بٹھایا گیا تو اس کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے طور پر بھی کچھ فیصلے کر رہی تھی اور اب اس نے سوچا تھا کہ ٹھیک ہے، ذرا مراد بخش سے بھی مل لیا جائے۔ ہوش و حواس درست کر کے رکھ دے گی اُن کے۔ ایسی سنائے گی کہ سنبھالے نہ سنبھل سکے گا۔ اس کی کیفیت بڑی عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب ذرا ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ کیوں نہ ایک تیر سے دو شکار کئے جائیں۔ شمشیرہ بیگم کے دل کی آرزو بھی پوری کر دی جائے اور مراد بخش سے مل کر بات بھی کی جائے۔ ایسے بہت سے خیالات تھے اس کے ذہن میں۔ کار میں بیٹھی ہوئی انہی سوچوں میں گم تھی کہ دفعتہً اس نے سامنے کا منظر دیکھا اور اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ جو لوگ اسے لینے آئے تھے وہ لوگ شکل وصورت سے اچھے آدمی تو نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ تعجب ہے کہ مراد بخش نے ایسے لوگوں کو اسے لینے کے لئے بھیجا ہے۔ وہ پریشان بھی تھی۔ اس نے کچھ لوگوں کو پہچان بھی لیا تھا۔ یہ بدمعاش تھے۔ اسے خوف ہوا کہ کہیں بات آگے نہ بڑھ جائے۔ یہ غنڈوں جیسی شکل والے لوگ جنہیں سائیں مراد بخش نے یا سائیں خیر بخش نے بھیجا ہے بڑے سرکش نظر آ رہے تھے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں شاہ جی سے ان کا جھگڑا ہو جائے۔ شاہ جی لازمی طور پر راستہ روکیں گے۔ اور وہی ہوا۔ کوثر جہاں نے دیکھ لیا کہ آنے والوں میں اور شاہ جی کے آدمیوں میں جنگ ٹھن گئی۔ کوثر جہاں شدید پریشانی میں ڈوبی وہوئی سامنے کا منظر دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی آنکھوں میں محبت کا سرور بھی پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ جنگ میں اس نے اکرام کو بھی دیکھ لیا تھا۔ اکرام اس کا لخت جگر، اس کی آرزوؤں کا مرکز، اس کے ماضی کی ایک ایسی یادگار جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اکرام کے لئے ہاتھ اٹھا لئے۔

''خدایا! میرے بچے کو دنیا کی بدنگاہوں سے بچائے رکھ۔ وہ اپنی ماں کی عزت کے

تحفظ کے لئے لڑ رہا ہے۔''

اچانک ہی چاروں طرف تاریکی پھیل گئی۔ غالباً ہیرا منڈی کی بجلی چلی گئی تھی۔ وہ یہ فیصلہ بھی نہیں کر پائی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ اتر کر واپس سیڑھیاں چڑھ جائے یا بیٹھی رہے؟ اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ دفعتہً گاڑی میں جنبش ہوئی، کوئی اسٹیئرنگ پر آ کر بیٹھا تھا۔ لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ دفعتہً کوئی اس کے بالکل قریب آ گیا۔ وہ آہستہ سے چیخی لیکن ایک چوڑا اور کھردرا ہاتھ اس کے منہ پر آ کر جم گیا اور ناک پر کوئی عجیب سی چیز آ پڑی۔ ایک تیز اور ناخوشگوار بُو کا احساس ہوا اور ایک لمحے کے اندر ہوش و حواس سے بے گانہ ہوگئی۔ اسے اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا...... یہ اندازہ بھی نہیں ہوا کہ ہوش کب آیا؟ اور یہ کون سی جگہ ہے جہاں وہ اس وقت موجود ہے۔ کسی نرم سی چیز پر پڑی ہوئی تھی اور آنکھوں کے سامنے مدہم سی پیلاہٹ چھائی ہوئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک تو ہوش و حواس ساتھ ہی نہ دے پائے پھر رفتہ رفتہ ہوش واپس آنے لگے۔ اس نے پیلی مدھم روشنی میں چھت کو دیکھا جس میں لکڑی کی کڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ نجانے کون سی جگہ ہے۔ رفتہ رفتہ اسے واقعات یاد آ گئے اور اس کے بدن میں چنگاریاں سی دوڑنے لگیں۔ اس نے ہاتھوں کو کسی غیر محسوس جگہ پر ٹکایا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن یہ کون سی جگہ ہے؟ آخر اس نے اپنے بستر کو دیکھا، کمرے میں صرف ایک ہی بستر تھا۔ کوئی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی۔ ہاں، چھت کے قریب تین گول گول سوراخ بنے ہوئے تھے جیسے روشندان ہوتے ہیں۔ انہی سوراخوں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی ورنہ شاید اس بند کمرے میں کافی گھٹن ہو جاتی۔ دیواروں کا پلاسٹک جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا تھا۔ نہایت بدنما ماحول تھا۔ اس مسہری کے علاوہ کمرے میں کوئی اور چیز موجود نہیں تھی۔ الٰہی! یہ کون سی جگہ ہے؟ میں کہاں آ پھنسی ہوں؟ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ باہر سے شاید کوئی تانگہ گزر رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ گئی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز مخصوص انداز میں سنائی دے رہی تھی۔ گہرا سناٹا اس بات کا اظہار کر رہا تھا کہ رات آدھی سے زیادہ بیت گئی ہے۔

''ہائے یہ مجھے کہاں لے آیا گیا...... کوئی ہے یہاں میری آواز سننے والا؟'' اس کے منہ سے مدھم سی آواز نکلی پھر وہ دروازے کے پاس پہنچی۔ دروازے کو دھکا دے کر دیکھا،

دروازہ باہر سے بند تھا۔ کواڑ بہت موٹی اور مضبوط لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ دروازے کو پیٹنے سے ہتھیلیوں میں تکلیف کا احساس ہوا۔ واپس پلٹ کر روشن دانوں کی طرف دیکھا، سیدھی اور سپاٹ دیوار سے روشن دان کی طرف پہنچنا ایک ناممکن کام تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کبھی کبھی اِکا دُکا آوازیں سنائی دے جاتیں جن میں زیادہ آوازیں تانگے والوں ہی کی تھیں۔

''آہ، آخر مجھے یہاں کون لایا ہے؟ مجھے تو سائیں مراد بخش یا خیر بخش نے اپنے آدمیوں کو لینے بھیجا تھا۔ شاہ جی نے راستہ روکا۔ لڑائی جھگڑا ہوا۔ اس لڑائی جھگڑے کا کیا نتیجہ نکلا معلوم نہیں لیکن میں کہاں ہوں؟''

بڑی پریشانی تھی۔ اسی پریشانی کے عالم میں وہ بڑے تھکے تھکے سے انداز میں بستر پر آ بیٹھی۔ سوچتی رہی۔ نجانے کیا کیا احساسات دل میں آ رہے تھے۔ کیا ہوگا...... اب کیا ہو گا؟'' آہ میرا اکرام......'' دل زور سے تڑپا۔ ''پتہ نہیں اسے کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟ آہ، کسی نے اندھیرا کر دیا تھا ہیرا منڈی میں...... مگر کس نے؟ کس سے پوچھوں، کس سے معلوم کروں؟'' بدن کچھ ایسا بے جان سا محسوس ہوا کہ بستر پر لیٹ گئی۔

پھر روشندانوں سے ہی روشنی کا احساس ہوا...... یہ سفید روشنی دن کے اجالے کی تھی۔ پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ ذہن کی کیفیت بھی عجیب و غریب تھی۔ روشندانوں سے آواز سنائی دے رہی تھی۔ جگہ کچھ ایسی ہی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ دوسری جانب سڑک تھی اور اس پر اچھی خاصی رونق بھی تھی۔ کاش میری آواز باہر سنی جا سکے...... کاش میں باہر سے گزرنے والوں کو اپنی بپتا سنا سکوں...... وقت کا کوئی صحیح تعین نہیں کیا جا سکا تھا۔ دن آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر دروازے پر آہٹ ہوئی اور ایک بوڑھی عورت جو میلا کچیلا لباس پہنے ہوئے تھی، اندر داخل ہوئی۔ ہاتھوں میں خوان سجا ہوا تھا۔ بڑی سی سینی میں کوئی چیز رکھی ہوئی تھی۔ کپڑا ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دو آدمی اندر آئے، لمبے چوڑے۔ دیکھنے ہی سے ڈر لگتا تھا۔ کوثر جہاں کا سانس رک گیا۔ عورت کا چہرہ بھی کافی کرخت تھا۔ اس نے سینی کوثر جہاں کے سامنے رکھی۔ دوسرے آدمی کے ہاتھ میں پانی کا لوٹا تھا اور ایک کٹورہ بھی تھا۔

''یہ لو بی بی! منہ ہاتھ دھو لو۔ اور اس کے بعد ناشتہ بھی کر لو۔''

کوثر جہاں نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق میں پھنس گئی۔ عورت نے ہمدردی سے اسے دیکھا اور بولی۔

"بیٹی! اس کونے میں جا کر منہ ہاتھ دھولو اور ناشتہ کرلو۔"

"جی نہیں چاہ رہا کچھ کھانے کو۔ آپ ان لوگوں کو باہر بھیج دیجئے۔ میں کمزور سی عورت ہوں، آپ کا کیا بگاڑ لوں گی۔ کچھ باتیں کرنی تھیں آپ سے۔"

"دیکھو بی بی! تمہیں صرف ناشتہ کرنا ہے، کوئی بات نہیں کرنی کسی سے۔ ہمیں حکم نہیں ہے کہ ہم تم سے باتیں کریں۔"

"کون ہو تم......؟ مجھے یہ تو بتا دو۔ آئندہ میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟"

"یہ ناشتہ رکھا ہوا ہے، اسے کھالو۔ ہم تم سے کوئی اور بات نہیں کر سکتے۔" عورت نے خشک لہجے میں کہا اور واپسی کے لئے پلٹ گئی۔

"سنو تو اماں...... سنو تو سہی...... میری بات سنو۔" اس نے مغموم لہجے میں کہا لیکن عورت باہر نکل گئی اور دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔ کوثر جہاں کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نجانے کیوں اسے رونا آ گیا تھا۔ جو کھانا لایا گیا تھا اس کی طرف دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بس خاموش بیٹھی ہوئی در و دیوار کو دیکھتی رہی۔ پانی کا لوٹا اور کٹورا بھی جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ بھوک بے شک لگ رہی تھی لیکن خوف اور پریشانی کے احساس نے اسے دبا رکھا تھا۔ دن گزر گیا، پتہ ہی نہ چلا۔ شام کا زرد چہرہ روشندان سے نمودار ہو گیا۔ مدھم مدھم روشنی اب بھی اندر آ رہی تھی۔

ایک بار پھر دروازے پر آہٹیں ہوئیں اور وہی عورت دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ غالباً چائے لائی تھی۔ اس نے چائے کے برتن ایک طرف رکھے اور اس تھالی کی طرف دیکھنے لگی جس میں صبح کو ناشتہ لائی تھی۔

"ارے کچھ کھایا نہیں تم نے...... صبح سے بھوکی ہو...... بلکہ رات سے۔"

"خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو...... خدا کے لئے اماں! مجھ پر رحم کرو...... کچھ تو بتا دو مجھے، میں یہاں کیوں لائی گئی ہوں؟ تمہیں معلوم نہیں، کوئی اولاد نہیں ہے تمہاری؟ اماں! میری ننھی سی بچی گھر پر بلک رہی ہو گی۔ مجھے کیوں لایا گیا ہے...... آخر کچھ تو بتا دو۔" عورت کے منہ سے کوئی آواز تو نہ نکلی لیکن اس کے چہرے سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس کی

کیفیت پر غم زدہ ہے۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"کچھ کھالو بیٹی ورنہ بھوک سے مر جاؤ گی۔"

"رحم کرو اماں...... مجھ پر رحم کرو...... کھانے کو میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ ان حالات میں کہیں کھانے کو سوجھتی ہے۔ مجھے میری بچی کے پاس واپس پہنچا دو۔ میری تسنیم...... میری تسنیم......" وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ عمر رسیدہ عورت سینے پر ہاتھ باندھے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد وہ کھانے کی تھالی اٹھا کر دروازے سے باہر چلی گئی۔ چائے کے برتن البتہ اس نے وہیں چھوڑ دیئے تھے۔ وہ پیچھے سے اماں، اماں پکارتی رہی لیکن دروازہ باہر سے بند ہو گیا تھا۔ کوثر جہاں سسکیاں لیتی رہی۔ انہی سسکیوں کے درمیان اس نے کہا۔

"میرے معبود! میری مدد کر دے میرے معبود...... میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ نجانے کون ہیں جنہوں نے مجھے اپنوں سے جدا کر دیا ہے۔ آہ...... میں وہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اکرام سے آس لگا لی تھی۔ جن راستوں پر وہ آگے بڑھ رہا ہے وہاں مجھے روشنی نظر آتی ہے...... لیکن یہ تاریکیاں میرے مقدر میں کہاں سے آ گئیں؟ میں کوٹھے پر اپنے شوق سے تو نہیں رہ رہی...... کچھ احساس ہے، کچھ آس ہے...... شاید ایک بار...... شاید ایک بار پھر وہ مجھ تک پہنچ جائے۔ ایک اسی کا تو خیال ہے جو مجھے کوٹھے پر روکے ہوئے ہے۔ کہاں ہو تم...... کون ہو تم؟...... نام تک نہ بتایا اپنا...... کچھ تو سوچو، ایک بار تو انسان بن کر سوچو کہ کسی کی زندگی حرام کر ڈالی ہے تم نے...... بہت کچھ چھوڑ گئے ہو تم اپنا میرے پاس۔ کچھ لینے نہیں آؤ گے...... کچھ بھی لینے نہیں آؤ گے...... تمہاری اسی آس نے تو مجھے...... مجھے......" اس کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازہ پھر کھلا، اس بار عمر رسیدہ عورت ایک اور اجنبی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ لمبا چوڑا بڑی بڑی مونچھوں والا بہت تنومند اور توانا نظر آتا تھا۔ وہ سہم گئی۔ یہ شخص اسے کافی خوفناک محسوس ہوا تھا۔

"تم نے کچھ کھایا نہیں؟" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"نہیں بھائی! میرا جی نہیں چاہتا۔ میری اس قید کی وجہ تو مجھے بتا دو۔ سنو بھائی...... تمہارا کوئی نہ کوئی تو ہوگا، ایک آدھ بہن بھی ہو گی تمہاری۔ اگر نہیں تو مجھے بہن کہہ کر پکار لو۔ بہت بری ہوں میں...... لیکن میرے سینے میں ایک بھائی کی طلب باقی ہے۔ میرے بھائی......

مجھے میرے گھر پہنچا دو...... وہاں میری ننھی سی بچی ہے۔ مجھے یہ تو بتا دو میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟''

''لڑکی! کھانا کھا لو...... میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ بس ہر شخص مجبور ہوتا ہے۔ چلو چائے پی لو۔ میں تمہارے لئے کھانا بھیجتا ہوں، کھا لو...... جو کچھ ہوگا اچھا ہی ہوگا۔'' اس شخص نے کہا۔

''تمہیں خدا کا واسطہ...... تمہیں اللہ کا واسطہ مجھے یہاں سے نکال دو۔ میں یہاں زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔''

''میں نے تم سے کہا ہے ناں، چائے پی لو...... جو کچھ ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ پرواہ مت کرو۔'' اس شخص کے لہجے میں ایک لرزش سی تھی اور پھر وہ اس طرح باہر نکل گیا جس طرح اس کے اندر گھبراہٹ پیدا ہوگئی ہو۔ کوثر جہاں دروازے کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی۔

''کتنے ظالم ہو چکے ہیں اس دنیا کے انسان۔ آہ...... میں کیا کروں...... کیا کروں میں...... آنسوؤں کے سوا میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ بند کمرہ اور تنہائی اور پھیلتا ہوا یہ اندھیرا...... کوئی روشنی کی کرن میرے سامنے نہیں ہے۔ اکرام! میرے اکرام! تو کہاں ہے...... شاہ جی، کہاں ہو تم...... آہ، تسنیم کا کیا حال ہو رہا ہوگا...... کیسی رو رہی ہوگی۔ اماں سنبھال لیں گی اسے...... میرے بغیر کیسے رہے گی وہ...... یہ سب کچھ میری توقع کے خلاف ہوا ہے۔ میں نے تو سوچا تھا......''

وہ انہی سوچوں میں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی اور شام آہستہ آہستہ رات کی تاریکی میں تبدیل ہونے لگی۔

○●○

خیر بخش حضوری بے شک خاندانی آدمی تھے لیکن حضوری گوٹھ کی روائتیں عام گوٹھوں کی روائتوں سے بہت ہٹ کر تھیں۔ بات خیر بخش حضوری کے دور ہی کی نہیں تھی بلکہ کئی پشتوں سے یہ خاندان نیک نام چلا آ رہا تھا اور خیر بخش حضوری بھی اس نیک نام خاندان کے ایک فرد تھے۔ اچھائیوں کی حفاظت بھی ہوتی ہے اور نیک نام زندگی کے کچھ انعامات بھی ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی کوئی ایسی مشکل بھی آ پڑتی ہے جو عام مشکلوں سے ہٹ کر ہوتی ہے اور

سائیں خیر بخش ان دنوں ایسی ہی مشکل کا شکار تھے۔

بڑے سے بڑا کام کبھی نہیں رکا تھا۔ ایک اشارہ ہوتا تو بات نجانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ لیکن مراد بخش کے مسئلے میں بہت سے لوگوں کو آزما چکے تھے۔ پتہ نہیں کیا قصہ تھا۔ ہیرا منڈی میں آ کر رہنے والے ان شاہ جی کا۔ ایس ایس پی گوریجہ جو بہرحال ایک بڑی اور معزز حیثیت رکھتا تھا کنی کترا گیا تھا اور اس نے بڑے پراسرار انداز میں معذرت کر لی تھی۔ پھر اس کے بعد اور بہت سے کردار یہاں تک کہ چندو، سارے کے سارے فیل ہو گئے تھے اور سائیں خیر بخش کو اس بات کا افسوس تھا کہ پہلی بار اپنی بات کسی کے کانوں تک گئی اور وہاں سے ناکامی ہوئی۔ ہیرا منڈی کے شاہ جی نے سب کی ناک کاٹ کر ان کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ چندو کے بارے میں بھی انہیں معلوم ہو گیا اور جادو کے بارے میں بھی۔ سب کی جادوگری بے کار ہو گئی تھی۔ چنانچہ سائیں خیر بخش نے اپنے ایک خاص ہرکارے خیرات علی کو اس کام کے لئے مخصوص کیا۔ خیرات علی کسی زمانے میں ایک نامی گرامی ڈاکو تھا لیکن ایک ایسے موقع پر جب اس کی موت یقینی ہو گئی تھی، سائیں خیر بخش نے اسے اپنی گدڑی میں پناہ دی تھی اور اس طرح اس کی جان بچائی تھی کہ کوئی خوابوں میں بھی نہ سوچ سکے۔ بس اس وقت سے خیرات ان کا مرید بن گیا تھا اور سائیں خیر بخش کی بات اس طرح مانتا تھا جیسے وہ اس کے مرشد ہوں اور اسی خیرات علی سے سائیں خیر بخش نے کوثر جہاں کو اٹھوا لیا تھا۔ مراد بخش پر جان چھڑکتے تھے۔ مراد بخش کی ہر خواہش بچپن سے لے کر آج تک پوری کی تھی بہرحال وہ چاہتے تھے کہ مراد بخش زندہ و سلامت رہے، دکھ اور غموں کا شکار نہ ہو جائے۔ چنانچہ گوٹھ حضوری کی حویلی صبح محل کو پوری طرح تیار کر دیا گیا اور یہ ذمہ داری ریاض حسین کو سونپی گئی تھی کہ وہ مراد بخش کو وہاں لے آئیں۔ چنانچہ ریاض حسین مراد بخش کو لے کر صبح محل چل پڑے۔

''خیریت...... یہ آپ کو صبح محل کی کیوں سوجھی؟''

''بس کچھ دن آپ کو وہاں قید رکھنا ہے۔''

''قید؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟''

"بس بابا سائیں کا حکم ہے۔"

"جھوٹ بول رہے ہو۔"

"کبھی جھوٹ بولا ہے آپ سے؟"

"قید رکھنا ہے؟"

"بھئی قید نہیں رکھنا لیکن تمہیں رہنا وہیں ہے۔ کچھ ذمہ داریاں سنبھالنی ہوں گی۔"

"کمال ہے یہ...... بابا سائیں نے اس کے لئے تمہیں کیوں تیار کیا؟"

"یار اب جو کچھ بھی ہے تم کم از کم مجھے میری ذمہ داریاں تو پوری کرنے دو۔"

بہرحال مراد بخش وہاں بڑے بے چین تھے۔ ریاض حسین تو چلے گئے تھے لیکن مراد بخش یہاں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ اس وقت بھی شام کے سناٹے پھیلتے چلے گئے تھے۔ پھر رات کا اندھیرا اترنے لگا۔ ملازموں نے محل کے بیرونی حصے میں روشنی کر دی تھی کیونکہ اس وقت مراد بخش وہیں بیرونی حصے میں صوفے پر بیٹھے ہوئے بڑے پھاٹک کو دیکھ رہے تھے۔ نگاہوں کی آخری حد تک اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ کافی دیر وہ اس طرح بیٹھے پھاٹک کو گھورتے رہے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ صبح محل کے گیٹ کے سامنے کوئی موٹر آ کر رکی ہے۔ وہ بری طرح اچھل پڑے۔

کون ہو سکتا ہے یہ؟

بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ چند قدم آگے بڑھے اور دروازہ کھلا اور وہاں دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا۔ مدھم تاریکیوں میں اس کو پہچان تو نہ سکے مگر جسامت اور انداز دیکھ کر احساس ہو گیا کہ کوئی شناسا نہیں ہے اور یہ اندازہ بھی ہوا کہ آنے والا کوئی مرد نہیں عورت ہے۔

عورت بڑے گیٹ کے سامنے کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مراد بخش اپنی جگہ سے آگے بڑھے اور کافی فاصلہ طے کر کے وہ آخر کار اس عورت کے قریب پہنچ گئے۔ اس دوران عورت جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی، مراد بخش کی طرف مڑی اور اس کے قدم مراد بخش کی طرف بڑھے۔ مراد بخش نے اسے پہچان لیا۔ ایک لمحے کے لئے ان کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی۔ آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا...... تصویرِ حیرت بن کر رہ گئے تھے۔ بھلا کیسے یقین کر لیتے کہ جس کے لئے دل میں لاکھوں

امنگیں اور آرزوئیں سجائے انتظار کرتے رہے تھے اور مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوبتے چلے گئے تھے وہ اچانک ہی سامنے آ جائے گا۔ وہ کوثر جہاں ہی تھی۔ لٹی لٹی، پریشان حال۔ پیشانی پر بال بکھرے ہوئے، چہرہ اترا ہوا، آنکھوں کے گرد سرمئی حلقے پھیلے ہوئے، ہونٹ سوکھے پتوں کی طرح خشک، بدن پر ہلکی ہلکی کپکپاہٹیں۔ مراد بخش کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کئی رنگ بدلے اور اس کے بعد ان میں ایک عجیب سی کیفیت بیدار ہو گئی۔ ایک تیز سی چمک، ایک تیکھا سا انداز...... مراد بخش کے تو جیسے بدن کا سارا خون رگوں میں جم گیا ہو...... جسم میں سنسناہٹیں ہو رہی تھیں۔ ذہن اس طرح ہلکا ہلکا لگ رہا تھا جیسے ہوش و حواس ہی گم ہونے جا رہے ہوں۔ آنکھیں بمشکل کھلی ہوئی تھیں ورنہ پلکوں کے پپوٹے ایک دوسرے میں پیوست ہونے کے لئے بے چین تھے۔ تبھی کوثر جہاں کی آواز ابھری۔

"آپ...... کیا میں اپنی آنکھوں پر یقین کر لوں...... کیا یہ واقعی آپ ہی ہیں؟"

مراد بخش کے بدن کو جھرجھری سی آئی اور وہ سنبھل گئے۔ ان کے منہ سے بھی اسی انداز سے نکلا۔

"آپ...... کوثر جہاں آپ؟"

"ہوں......" کوثر جہاں کے انداز میں تیکھا پن پیدا ہو گیا۔ وہ کمر پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"ہوں، سائیں بابا بڑے لوگ ہیں آپ۔ اور پھر سندھ کے وڈیروں کے یہ کھیل تو بہت سی بار کھیلے جا چکے ہیں اور ان کی کہانیاں تو درجنوں بار منظر عام پر آ چکی ہیں۔"

"کھک...... کھیل......؟" مراد بخش کے حلق سے سرسراتی آواز نکلی۔

"اب ایسے انجان تو نہ بنیں...... یہ تو ہونا ہی چاہئے تھا...... واقعی ہم ہمیشہ ہی غلط سوچتے رہے ہیں۔"

"آپ اندر تو آئیے...... بہت دن کے بعد آپ کو دیکھا ہے۔"

"غلام ہیں آپ کے...... آپ حکم دیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل نہ کی تو کیا جی سکیں گے؟"

"آئیے......" بمشکل تمام مراد بخش اسے لے کر اندر آئے۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ہوش و حواس پر قابو پانا مشکل ہوا جا رہا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اندر سے خوشی ابھر رہی تھی۔ دل اور آنکھیں بے چین تھیں اسے دیکھنے کے لئے اور مایوسیاں

انتہا کو پہنچ چکی تھیں کہ اچانک ہی وہ سامنے آ گئی تھی۔ بڑے آرام سے اس نے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کوثر جہاں بیٹھ گئی۔ خود بھی بھوکی پیاسی تھی۔ بدن میں نقاہت تھی۔ اچانک ہی وقت بدل گیا تھا۔ اس قید خانے سے نکال کر موٹر میں بٹھایا گیا تھا اور پھر یہاں لا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اندر آتے ہوئے وہ بے حواس تھی۔ یہاں مراد بخش نظر آئے اور وہ ان کے حکم پر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آپ اچانک اس طرح یہاں پر آ جائیں گی ہم نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا۔''

''ایسی باتیں نہ کریں...... دوسرا حکم دیں۔'' کوثر جہاں کی آواز لڑکھڑا گئی۔

''آپ نجانے کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔''

''ہوں، سائیں واقعی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ حالانکہ اماں ہمیشہ یہی کہا کرتی تھی کہ یہ بڑے لوگ بڑے آگے ہوتے ہیں اور ان کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ اماں کہتی تھیں کہ کوثر جہاں اپنے آپ کو کسی سے نہ بچاؤ۔ بیکار باتیں ہیں۔ کوئی بھی ہو، صرف تمہارا چاہنے والا ہونا چاہئے۔ سب کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے...... مگر میں اماں کی باتوں کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔ اصل میں تجربہ جو نہیں تھا۔ ہم نے آپ سے بڑی دل سوزی اور محبت سے کہا تھا کہ سائیں خدارا آپ یہاں تشریف نہ لایا کریں۔ اُس میں کوئی ریاکاری نہیں تھی، ایک محبت تھی سائیں مراد بخش! اور کوئی جذبہ نہیں تھا۔ ہمیں آپ کے چہرے میں وہ معصومیت اور سادگی نظر آئی تھی کہ ہمارا دل بے اختیار یہ چاہ اٹھا تھا کہ آپ طوائف کے چکر میں نہ ہی پڑیں۔ طوائفوں کے کوٹھے تو بڑی منحوس جگہ ہوتے ہیں اور وہاں آنے والے قدم اپنا مستقبل کھو بیٹھتے ہیں۔ ہم آپ کے مستقبل کو اپنی ہوس کی شکار گاہ نہیں بنانا چاہتے تھے سائیں مراد بخش! لیکن آپ نے میری محبت کا اچھا صلہ نہیں دیا۔ خیر جس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہی دے سکتا ہے۔ آپ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے، آپ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ آپ کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ شاہ جی نجانے کون ہیں لیکن اہل دل ہیں۔ جو زبان دے دیتے ہیں کسی کو، اس کی تکمیل کے لئے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ آپ نے ان کے بارے میں بالکل ٹھیک اندازہ لگایا...... انہیں آپ کا راستہ روکنا ہی تھا۔ اور یہ دوہری چال بہت خوب ہے...... ہم آپ کی ذہانت کی داد دیتے ہیں ذہانت ہی آپ لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ آپ جیسی ذہانت بھلا عام لوگ کہاں سے لا سکتے ہیں؟''

مراد بخش بڑے غور سے کوثر جہاں کی باتیں سن رہے تھے۔ ایک لمحے کے اندر دل میں ایک خیال ابھرا اور آتا ہی چلا گیا اور وہ خاصی بہتر حالت میں ہو گئے تھے۔ کوثر جہاں کی باتیں احساس دلا رہی تھیں کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ چنانچہ کہنے لگے۔

''کوثر جہاں بیگم! آپ کے الفاظ کچھ عجیب سا احساس دلا رہے ہیں۔ آپ یقین کریں آپ کے بارے میں خبریں مل رہی تھیں، دعائیں مانگتے مانگتے زبان نہیں تھکتی تھی ہماری۔ لیکن آپ کی باتیں اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ آپ ہم سے برہم ہیں۔ آپ نے بے شک ہمیں کوٹھے پر نہ آنے کے لئے کہا تھا اور دیکھ لیجئے ہم نے بھی وعدہ خلافی نہیں کی۔ لیکن آپ یقین کیجئے اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں ہمارا قصور نہیں ہے...... بابا سائیں نے ہی جو کچھ کیا ہے کیا ہے۔ آپ صرف ہمیں اتنا بتا دیجئے کہ آپ ہم سے ناراض کیوں ہیں؟''

کوثر جہاں بھر گئی۔ زہریلے لہجے میں بولی۔

''کمال ہے سائیں مراد بخش...... کمال ہے۔ یقین نہیں آتا کہ آپ کے اندر اتنی گہرائیاں موجود ہیں۔ ہم نے آپ کو سادہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ لیکن کیا کریں، اتنے ذہین نہیں دِکھتے جتنے آپ ہیں۔''

''ہم آپ کی غلط فہمی کس طرح دور کریں۔''

''چھوڑیئے ان باتوں کو...... آخر کار ہمیں آپ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ آپ بتایئے ہمیں کیا کرنا ہے...... ہم تو ہیں ہی نیلام ہونے والی چیز...... ہر رات ہماری نیلامی ہوتی ہے۔ اہل ذوق آتے ہیں، اہل زر ہمیں خرید لیتے ہیں بس اور اس کے بعد ہمارا وجود تو ہے ہی پامال ہونے کی چیز...... جو کچھ آپ کریں گے وہ کوئی اجنبی بات نہیں ہو گی۔''

یوں لگا جیسے مراد بخش کے سینے میں ایک گھونسا سا لگا ہو۔ اس نے کہا۔

''تب پھر ہمارے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں ہے جو آپ کے دل سے اپنے بارے میں غلط فہمی دور کر سکیں۔''

''یہ بھی نہ سوچا آپ نے کہ ہماری ننھی سی ایک بچی ہے۔ اس کا ہمارے بغیر کیا بنے گا۔ ہم تو آپ کی خدمت میں آ ہی رہے تھے۔ آپ نے نجانے یہ سب کچھ کیا کیا۔ یہ شبہ کیوں ہوا آپ کو کہ ہم آپ کے حکم سے فروخت نہیں ہوں گے۔ آپ نے ہماری بچی کا بھی خیال

نہیں کیا۔"

"خدا کے لئے آپ مجھے بتائیے تو سہی ہوا کیا ہے...... بابا ہم نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

کوثر جہاں کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ کیا واقعی یہ شخص اس معاملے میں بے قصور ہے؟ لیکن پھر کیا ہوا ہے، کوئی بات تو سمجھ میں آتی۔ اسے وہاں سے اٹھا لیا گیا، قید خانے میں ڈال دیا گیا اور جب یہ اطمینان ہو گیا کہ رب نواز شاہ اس کی تلاش میں ناکام ہو گیا ہو گا تو پھر احتیاط کے ساتھ اسے یہاں پہنچا دیا گیا۔ اور اب یہ معصوم صورت بنائے اس طرح کی باتیں کر رہا ہے۔ ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہو گا سائیں! کہ آپ اپنا حکم ہمیں عطا فرما دیں۔ ہم آپ کے غلام ہیں۔ ہماری ماں کو ہماری قیمت ادا کر دی گئی ہے۔ باقی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔"

"ہم بھی تو نہیں سمجھ پا رہے...... ہم نے بھی تو آپ کے لئے رسوائیاں مول لی ہیں۔ ہم بھی تو دیوانگی کی حد میں داخل ہو گئے ہیں۔ جو کچھ کیا ہے ہم نے اس کا بچپن سے لے کر اب تک تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا...... حضوری گوٹھ مشہور تھا کہ یہ بہت اچھے لوگوں کی بستی ہے، لیکن...... لیکن...... ہم نے...... ہم نے......" مراد بخش کی آواز بھرا گئی۔ اس نے پھر کہا۔ "ہم نے بھی تو سائیں خیر بخش کا غصہ مول لیا۔ آپ نہیں جانتیں کوثر جہاں بیگم وہ ہم پر زندگی نچھاور کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی ہمیں کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے جتنا کچھ کیا ہے ہمارے لئے کوئی انسان کسی کے لئے نہیں کر سکتا۔ کیا کہیں ہم آپ سے...... کیا کہیں...... آپ کو پتہ نہیں کہ ان کو کتنا صدمہ ہوا ہماری اس دیوانگی سے۔ ہم نہیں جانتے کہ باقی سب کچھ کیسے ہوا ہے...... ہم تو بس...... ہم تو بس آپ کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔" مراد بخش کی آواز بھرا گئی۔

"نجانے کیوں اب کوثر جہاں کو یہ شک سچا محسوس ہونے لگا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"ہم ہر اس شخص کو جسے ہم محسوس کرتے ہیں کہ لمحوں نے اسے بھٹکا دیا ہے، کوٹھوں کی تاریکیوں سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے پیشے میں یہ سب کچھ شامل نہیں ہے۔ عزت کی زندگی ہمیں آخری سانس تک نہیں ملتی۔ ہم ان شریف لوگوں میں کبھی

شامل نہیں ہو سکتے جو شاید کسی محلے کے گندے سے چھوٹے گھر میں پیدا ہو جائیں۔ لیکن ان کا وقار، ان کی عزت الگ ہوتی ہے۔ ہم اس عزت اور وقار سے محروم ہوتے ہیں۔ کہیں بھی کوئی اچھا مقام نہیں ملتا۔ چاہے ہم دیوانے ہی کیوں نہ ہو جائیں...... پاگل کیوں نہ ہو جائیں۔ آپ کو تو ہم نے صرف اس لئے منع کیا تھا کہ خوامخواہ آپ کا لباس ہماری غلاظت میں لپٹ کر خراب ہو جائے گا۔ ورنہ تماش بین تو کوٹھوں پر آتے ہی رہتے ہیں۔ جہاں تک شاہ جی کا تعلق ہے تو وہ بہت عجیب انسان ہیں...... انہوں نے ہماری ذات کے گرتے ہوئے ستون کو سنبھال لیا ہے۔ آپ شاید ہمارے بیٹے اکرام کو نہ جانتے ہوں گے، وہ جاننے کی چیز ہے بھی نہیں۔ کسی نے بھی کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ طوائفوں کے کوٹھے پر اگر بیٹا پیدا ہو جاتا ہے تو وہاں صف ماتم بچھ جاتی ہے۔ وہاں پیدا ہونے والے بیٹوں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا...... سوائے یہ کہ طبلہ بجائے، سارنگی پر گز پھیرے۔ لیکن لوگ یہ نہیں سوچتے کہ کوٹھوں پر اپنی بھول چھوڑ جانے والے اچھا خون بھی رکھتے ہیں اور یہ اچھا خون اگر اپنی ذات میں منتشر ہو جائے تو اس کی تکمیل کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ وہ بھی ایک عجیب و غریب شخص تھا۔ ہماری زندگی میں پہلی بار آیا اور ہمیں ہمارے محور سے ہٹا گیا۔ ہم انتظار کرتے رہے، ہم اسے تلاش کرتے رہے، وہ دوبارہ کبھی نہیں آیا۔ ہاں اپنی تصویر اکرام کی شکل میں چھوڑ گیا اور یہ تصویر ہم آج تک اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

اس تصویر کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا کہ ہم اسے کسی ایسے فریم میں سجا دیتے جہاں وہ محفوظ رہتی۔ ہم یہ نہ کر سکے لیکن شاہ جی نے ہمارے اکرام کو سہارا دیا۔ انہوں نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ ہمیں ان سے بڑی عقیدت ہے کیونکہ انہوں نے ہماری آبرو کو بچا لیا ہے۔ اس آبرو کو جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں...... وہ ان برائیوں کو روکتے ہیں جن سے کسی کی دل آزاری ہو۔ آپ یقین کریں کہ ہمارے سلسلے میں انہوں نے جو کچھ کیا اکرام کے کہنے پر کیا۔ وہ نہیں چاہتے کہ اکرام کا دل کچلے اور اس کی ماں اس کی نگاہوں کے سامنے رسوا ہوتی رہے۔ جتنی رسوائی ہمارا مقدر تھی اسے نہ اکرام ٹال سکتا تھا اور نہ ہی شاہ جی ٹال سکتے ہیں۔ لیکن وہ سب کچھ جو اکرام نہیں چاہتا، شاہ جی اسے ہی روکتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔

"تو آپ کوٹھا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں کوثر جہاں! ہم آپ کو اتنا احترام دیں گے کہ آپ

تصور بھی نہیں کر سکتیں...... آپ ہمیں بتائیے، آپ کوٹھے سے جدا کیوں نہیں ہو جاتیں؟''

''یہ بھی ہماری ایک مجبوری ہے۔''

''مجبوری؟''

''ہاں۔''

''بتانا پسند کریں گی؟''

''ہاں...... ہمیں انتظار ہے کسی کا۔ ہم نے اپنے دل کے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ ہم اپنی دعاؤں میں صرف ایک چیز مانگتے ہیں وہ یہ کہ اے کاش وہ کبھی واپس آ جائے۔ وہ جو ہمارے دل کے راستے ہمارے وجود میں اتر چکا ہے...... ہم اسے نہیں بھولتے۔ ہمیں معاف کرنا، قیامت تک...... حشر کے دن تک...... اپنی سانسوں کے آخری دن تک ہم اس کے علاوہ کسی کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتے۔''

کوثر جہاں کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اس آواز میں اتنا دکھ، اتنا سوز تھا کہ مراد بخش کے دل و دماغ میں ہیجان برپا ہو گیا۔ لیکن آج دل کی حسرت پوری ہو گئی تھی۔ کوثر جہاں سے کھل کر تنہائی میں بات ہوئی تھی۔ لیکن اس گفتگو نے بہت سے راستے کھول دیئے تھے، بہت سے راستے بند کر دیئے تھے۔ پھر وہ آہستہ سے بولے۔

''ہمیں بتائیے، ہم کیا کریں کوثر جہاں بیگم؟''

''آپ مان لیں گے ہماری بات؟''

''ہاں......''

''ہمیں دل سے نکال دیں۔ ہم ایک اچھے دوست کی حیثیت سے آپ کو صحیح مشورہ دے رہے ہیں۔ ہمارے دل پر پہلے ہی ایک نقش ہے اور ہم اس نقش کو کھرچ نہیں سکتے۔ وہ نقش اوّل ہمیں اپنی نشانی اکرام کی صورت میں دے دیا گیا ہے۔ وہ ہمارے دل میں کسکتا ہے...... ہم اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں کہ ایک بار...... صرف ایک بار ہمیں اس کے قدموں میں جانے کا موقع مل جائے۔ ہم اس سے دل کی بات کہہ دیں، بالکل اس طرح جیسے آپ نے اپنا دل ہم پر کھول دیا...... بس اس سے آگے ہماری کوئی طلب نہیں ہے...... ہم بارہ سال سے دروازے پر نگاہیں جمائے بیٹھے ہیں...... مگر بس......''

کوثر جہاں کی آواز ایک بار پھر آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ مراد بخش غور سے اسے دیکھ رہا

تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''واقعی...... آپ ٹھیک کہتی تھیں...... ہمیں معاف کر دیجئے...... ہم...... ہم...... واقعی ہم سے غلطی ہو گئی۔''

''آپ سمجھ داری سے کام لیجئے۔ ہمیں جب بھی حکم دیں گے ہم ایک اچھے دوست کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ کہیں سے ہمیں عزت ملے، احترام ملے۔ کاش آپ ہمیں یہ دے سکیں۔''

مراد بخش بدستور کوثر جہاں کو دیکھتا رہا، پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا اور کہنے لگا۔ ''بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں ہم سے...... بہت سے لوگوں کے مجرم بن گئے ہیں ہم...... ہمارے بہت ہی محترم سائیں خیر بخش جنہوں نے ہمارے ساتھ فرشتوں جیسا سلوک کیا ہے۔ بہرحال کوثر جہاں بیگم! غلطی ہو گئی۔ آپ کی عزت، آپ کا احترام آج سے ایک الگ شکل اختیار کر گیا ہے ہمارے دل میں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ ہم ہر قدم پر آپ کا ساتھ دیں گے۔''

''تو پھر ہمیں کھانا کھلائیے۔ ہم چوبیس گھنٹے سے بھوکے ہیں۔'' کوثر جہاں نے کہا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اوہو...... اوہو......'' سائیں مراد بخش جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ گئے تھے۔

○●○

شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر ویسے ہی اُلّو بول رہے تھے۔ غزالہ اور شبانہ نے یہ دن سنبھالے تھے لیکن تماش بین تو کوثر جہاں کے لئے آتے تھے۔ بہت سوں کو پتہ چل گیا تھا کہ ہیرا منڈی میں ہونے والی غنڈہ گردی کا شکار کوثر جہاں ہوئی ہے، حالانکہ شمشیرہ بیگم نے بات بنانے کی کوشش کی تھی لیکن جو ہوا تھا وہ سب کے سامنے تھا۔ شمشیرہ بیگم کو البتہ اس بات کا پورا پورا یقین تھا کہ اکرام کے کہنے پر رب نواز شاہ نے ہی کوثر جہاں بیگم کو غائب کیا ہے۔ ظاہر تھا کہ اکرام نہیں چاہتا تھا کہ کوثر جہاں کہیں جائے۔ اٹھتے بیٹھتے، صبح شام اکرام کو کوستی رہتی تھیں۔ یہ بھی انہیں یقین تھا کہ سائیں مراد بخش کے زخمی ہونے میں بھی اکرام اور شاہ جی کا ہی ہاتھ ہے۔ لیکن یہ بھی پتہ چل چکا تھا انہیں کہ پولیس کے بڑے بڑے افسر آئے تھے اور اس طرح کان دبا کر چلے گئے تھے جیسے وہاں آ کر غلطی ہو گئی ہو۔ اکثر حاجو سے بات ہوتی رہتی تھی۔

"نکمے ہو، ناکارہ ہو تم لوگ...... تمہارا بیڑہ غرق ہو...... تمہیں آج تک پتہ نہیں چلا کہ آخر یہ موا ہے کون؟"

"تم خود پتہ لگا لو شمشیرہ بیگم...... اتنی دولت ہم نہیں کماتے یہاں سے کہ جان جوکھوں میں ڈال دیں۔"

"اے فٹے منہ تمہارا...... پتہ نہیں اور کیا کماؤ گے۔ زندگی بھر تو کھا کھا کر گزار دی۔ اے میں کہتی ہوں کوئی ہے جو ہماری خبر گیری کرے...... بس اب لگ رہا ہے کہ برے دن آ گئے ہیں۔ پتہ نہیں میری بچی کہاں ہوگی۔"

اسی وقت رحمت علی ہانپتے کانپتے اندر چلے آئے اور اتفاق سے سیدھے اسی کمرے میں داخل ہوئے جہاں یہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

"ہائے...... ہائے...... یہ تمہاری ناک کس نے کاٹ لی اور سر پر بندھی ہوئی پٹی...... تم تو بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ گئے۔"

"ایسا ہی ہونا تھا شمشیرہ بیگم! بس ایسا ہی ہونا تھا۔" رحمت علی دراز ہوتے ہوئے بولے۔ ان کا ذریعہ معاش ہی یہی تھا۔ بڑے بڑے رئیسوں، جاگیرداروں اور پولیس افسروں کے ایجنٹ تھے اور ان کے لئے سارے کام کر دیا کرتے تھے۔ بس ایسی ہی ترکیب تھی۔ شمشیرہ بیگم نے کہا۔

"کہاں سے آرہے ہو رحمت علی؟"

"شمشیرہ بیگم! دیکھ رہی ہیں آپ...... دودھ میں ہلدی ڈال کر پلوا دیجئے تھوڑی سی۔ ورنہ سمجھ لیں کہ ختم ہو گئے ہم۔"

"ہوا کیا؟"

"بس شاہ جی نے پکڑوا کر بلوا لیا تھا۔ تمہاری ہی طرف آرہے تھے۔ شاہ جی کے آدمی کبوتر کی طرح پکڑ کر لے گئے اور چار چوٹ کی مار لگائی۔ اب یہ بات تو ہم بھی جانتے ہیں کہ اس کے خلاف ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ پٹ پٹا کر پٹی بندھوا کر سیدھے آرہے ہیں تمہارے پاس۔"

"کیوں مارا تمہیں؟"

"وہی پوچھ رہے تھے کہ کوثر جہاں کہاں ہے...... کون لے گیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ شاہ جی ڈبل چال چل رہے ہیں۔ ارے ان کے علاوہ کون لے جا سکتا ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے شمشیرہ بیگم۔"

"کیا مطلب؟"

"میں جانتا ہوں کوثر جہاں کہاں ہے۔"

"ہیں......؟" شمشیرہ جہاں کا منہ حیرت سے پھٹے کا پھٹا رہ گیا۔ لیکن اسی وقت حاجو جو باہر چلا گیا تھا، پھدک کر اندر داخل ہوا اور شمشیرہ بیگم اچھل پڑیں۔

"آ گئیں...... آ گئیں......" حاجو نے کہا اور شمشیرہ بیگم خونخوار نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"کیا تمہاری موت آ گئی؟ کون آ گیا؟"

"کوثر جہاں...... کوثر جہاں......"

"ہیں......؟" شمشیرہ بیگم اچھل پڑیں۔ کوثر جہاں اندر داخل ہو گئی تھی اور کوثر جہاں کو دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکیں۔

"میری بچی...... میری روح...... میری زندگی...... میری جان...... کہاں چلی گئی تھیں تم؟"

کوثر جہاں نے کہا۔ "اماں رکیں تو سہی...... یہ ڈرامہ نہ کریں۔ تسنیم کہاں ہے؟"

تسنیم پہنچ گئی اور پھر کوثر جہاں نے تسنیم کو سینے سے لگا لیا۔ بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ کوثر جہاں بڑی دیر تک تسنیم کو چومتی رہی۔ شمشیرہ بیگم نے ہزار سوال کئے اور پوچھتی رہیں کہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ لیکن کوثر جہاں، تسنیم کو لے کر باہر نکل گئی تھی۔

"دیکھو کیا ہو رہا ہے یہ رحمت علی...... ماں ہوں میں اس کی۔ اصل میں یہ شاہ جی کا جادو ہے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے ماں اور بیٹے پر کہ بتا نہیں سکتی۔ دو کوڑی کی عزت ہو کر رہ گئی کوٹھے کی۔ نہ کوئی پوچھنے والا نہ کوئی سننے والا...... ہائے مولا کیا لکھ دیا تو نے ہمارے مقدر میں......"

بہرحال یہ ساری ہنگامہ آرائی ہوتی رہی۔ کوثر جہاں نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

○●○

شمشیرہ بیگم کے دل میں پنکھے لگے ہوئے تھے۔ کوثر جہاں تو تسنیم کے ساتھ اپنے کمرے میں جا بند ہوئی تھی اور اس نے مزید کوئی بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن شمشیرہ بیگم کو چین کہاں؟ مجلس مشاورت میں غلام شاہ، حاجو موجود تھے۔ رحمت علی چلے گئے تھے۔ بڑے سے پان کا بیڑہ منہ میں دبائے شمشیرہ بیگم سوچوں میں گم ہو گئیں۔ غلام شاہ نے کہا۔

"کیا سوچ رہی ہو شمشیرہ بیگم؟"

"اے غلام شاہ! خدا تمہارا بھلا کرے، ذرا سوچو، یہاں تو کس طرح جان پر بنی ہوئی ہے۔ بیگم صاحبہ آئیں تو ایسے جیسے پہاڑ کی سیر کو گئی ہوں اور خوش و خرم واپس آ گئی ہوں...... کہاں گئی تھیں، کون لے گیا تھا، وہ مردار رحمت علی بھی نک کٹا ہو کر آ گیا۔ تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ دفع ہو گیا۔ کہنے لگا مجھے پتہ ہے کہ کہاں گئی تھی۔ اب کیسے پتہ چلے کہ کہاں گئی تھی۔ اے غلام شاہ! کچھ کرو۔ بزرگوں، ولیوں کے مزاروں پر چادریں چڑھاؤ، دعائیں مانگو کہ اس کوٹھے کی آبرو سلامت ہو جائے۔ جو لٹ گیا ہے وہ واپس مل جائے۔ ہائے کیا کیا کچھ نہ کیا۔ ایک بات بتاؤ غلام شاہ! میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کوثر جہاں اس طرح سے باتیں کر رہی ہے جیسے اس کی گمشدگی میں شاہ جی کا ہاتھ نہ ہو...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اب تم خود بتاؤ۔ کہہ تو رحمت علی بھی یہی رہا تھا کہ اسے پتہ ہے۔ کیا کروں کیا نہ کروں...... ارے اتنے بڑے بڑے لوگ آ رہے ہیں اور سارے کے سارے ہاتھ سے نکل رہے ہیں۔ میں تو دعوے سے کہہ رہی ہوں کہ ساری کی ساری ملی بھگت ہے۔ اور یہ کوثر جہاں بھی اس میں شریک ہے۔ میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ ارے پہلے سے کوئی انتظام ہو گا ان دونوں کے درمیان۔ ہیرا منڈی کی بتی بجھا دی اور لے اُڑے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کوثر جہاں شاہ جی کے گھر میں ہی چھپی ہو۔ اب کیا کروں کیا نہ کروں...... ایک وہ کمبخت سانپ کا سنپولیا ہے جس نے دل ہلا کر رکھ دیا ہے اور دوسری یہ اس کی اماں جان ہیں۔ لیکن جانتی نہیں ہے یہ شمشیرہ بیگم کو...... میں ناگن ہوں ناگن...... سارے کئے دھرے پر مٹی ڈال رہی ہیں۔ میں اگر زہر اُگلوں تو پتہ بھی نہ چلے۔"

"نہیں شمشیرہ بیگم! سمجھداری سے کام لینا...... جلد بازی تمہارا ہی نقصان کر دے گی۔" غلام شاہ نے کہا اور شمشیرہ بیگم سوچ میں ڈوب گئیں۔ بہر حال دوسری صبح ہی کوثر جہاں سے بات چیت ہوئی تھی۔ شمشیرہ بیگم نے کہا۔

"اب تم یہ بتاؤ ان کا کیا کریں؟"

"کس کا اماں؟" کوثر جہاں نے پوچھا۔

"اے بی بی وہی بے چارے سائیں مراد بخش۔ سندھ سے آتے ہیں اتنا فاصلہ طے کر کے۔ دیکھو دیانت داری ہماری سب سے پہلی شرط ہوتی ہے۔"

"بے فکر رہو اماں! اب ان کے گھر سے کوئی نہیں آئے گا۔"

"کیوں؟"

"میری ان سے بات ہو گئی ہے۔"

"تم سے؟"

"ہاں۔"

"تم سے کب ملے؟"

"کل رات......"

"کک...... کک...... کیا......؟"

"ہاں۔"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"بس اماں جو کہہ رہے تھے وہ چھوڑو۔"

"مگر بی بی! سائیں خیر بخش نے تو......"

"ساری باتیں ختم ہو گئیں اماں!" کوثر جہاں نے کہا اور شمشیرہ بیگم کا دل جیسے بیٹھنے لگا۔ وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"اور باقی ساری باتیں...... وہ لینے دینے کی جو باتیں تھیں۔"

"ختم کرو اماں...... گا بجا کر تمہاری ضرورتیں پوری کرتی رہوں گی۔ میں نے کب منع کیا ہے...... ویسے ایک بات کا خیال رکھنا۔ اب میرا سودا کسی سے مت کرنا۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں...... ورنہ آنے والا وقت ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے تمہارا یہ گھر چھوڑنا ہی پڑے۔"

"ہاں بی بی...... جانتی ہوں کہ کس کے بل پر بول رہی ہو۔ اب سے پہلے تمہارے منہ سے کوئی ایسی بات نہیں سنی تھی۔"

''تو اب سن لی اماں! جو کچھ سنا اس کا خیال رکھنا۔''

''جھاڑو پھیر دی تم نے ہمارے کوٹھے پر...... جلنے والیاں ہنسنے کے علاوہ اور کیا کر سکتی ہیں...... دوسرے کوٹھوں کو دیکھو، دولت برس رہی ہے۔لڑکیاں بالیاں ہیں کہ تماش بینوں کے دل مٹھی میں لئے ہوئے ہیں۔اب تو یہاں آنے جانے والے بھی منہ بنا کر یہاں سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ میں نے بھی شاید غلطی ہی کی ہے۔غزالہ اور شبانہ کو آگے بڑھانا چاہئے تھا۔ بے کار تم پر بھروسہ کیا...... آج اس غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں اماں...... میں گاؤں گی...... سب کچھ کروں گی...... آپ دیکھئے گا، تماش بین ایک بار پھر یہاں مجمع لگا لیں گے۔مگر میں نے جو کہا ہے اس کا خیال رکھئے گا ورنہ آپ کو نقصان ہوگا۔''

''ہائے اور کیا نقصان ہوں گے...... نعمان فضلی اور سائیں مراد بخش، توبہ توبہ...... سب کچھ چھن ہی گیا۔سب کچھ چھن گیا۔''

دن کے کوئی ڈھائی بجے ہوں گے جب اکرام کوثر جہاں کے کمرے میں داخل ہوا۔کوثر جہاں اسے دیکھ کر مسکرا کر کھڑی ہوگئی۔ اکرام کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔کوثر جہاں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے مگر اکرام اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

''ناراض ہے مجھ سے...... بتائے گا نہیں میرا کیا قصور ہے؟''

''کہاں گئی تھیں تم؟'' اکرام نے سوال کیا اور کوثر جہاں شکایتی نگاہوں سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔

''میں خود گئی تھی کہیں؟''

''تو پھر؟''

''تُو بھی تو اس وقت موجود تھا جب لوگ میری میت کو اٹھانے آئے تھے۔'' کوثر جہاں نے کہا۔

''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

''اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔''

''مجھ سے سچ بولو باجی۔''

اچانک ہی کوثر جہاں کا چہرہ تمتما گیا، پھر وہ بولی۔''تو اب تم میری زبان پر بھی شک کرو

گے۔ٹھیک ہے اکرام، جینا بیکار ہو جائے گا میرے لئے...... ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے، شک کرو۔''

''مجھے شاہ جی کو جواب دینا ہے باجی۔''

''تیری اور تسنیم کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ وہ لوگ کون تھے...... مجھے بے ہوش کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد چند روز مجھے قید رکھا گیا۔اور جب میری آنکھ کھلی تو مجھے سائیں مراد بخش کے پاس پہنچایا گیا...... سائیں مراد بخش کو اللہ سلامت رکھے، میں نے ان سے کہا کہ میرے بچے میرا انتظار کر رہے ہوں گے تو انہوں نے مجھے فوراً ہی یہاں واپس پہنچا دیا۔اور سن میری بات کو۔اگر تُو نے جھوٹ سمجھا تو خودکشی کرلوں گی۔''

''نہیں...... میں تمہاری بات پر یقین کرتا ہوں باجی۔لیکن پھر تم سے کہہ رہا ہوں کہ یہ گھر چھوڑ دو۔شاہ جی ہمارے لئے سارا انتظام کر دیں گے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے میرے دل کو بہت برا لگتا ہے۔''

''تجھے مجھ پر یقین ہے نا اکرام! میں ایک بار پھر تیری اور تسنیم کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ایک مجبوری مجھے یہاں روکے ہوئے ہے۔ ورنہ کسی کی مجال نہیں کہ میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دے۔ جب چاہوں گھر چھوڑ دوں۔ کچھ وقت گزر جانے دے۔ جب آس کے سارے چراغ بجھ جائیں گے تب میں تیرے ساتھ تیرا ہاتھ پکڑ کر یہاں سے کہیں چل پڑوں گی۔نجانے کیوں آس کے یہ چراغ نہیں بجھتے۔ایک شمع روشن ہے۔ ہر طرف سے ہواؤں کے جھکڑ چلتے ہیں مگر یہ شمع جل رہی ہے۔ پتہ نہیں کب تک جلتی رہے گی۔''

''لیکن ایک بات تو بتاؤ مجھے باجی! اگر تمہیں یہاں بہت دیر لگی تو تسنیم کا کیا ہوگا؟ کیا تُو اسے وہ سب کچھ بنانے کی کوشش نہیں کرے گی جو اس نے تمہیں بنا دیا ہے؟ ایک بات یاد رکھنا باجی! اگر میری تسنیم کی طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو ان آنکھوں کو دوبارہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں چھوڑوں۔'' اکرام کا چہرہ تمتمانے لگا اور کوثر جہاں وارفتہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھی اور الماری میں رکھی ہوئی کاجل کی ڈبیہ اٹھائی، اس کا ڈھکن کھول کر انگلی چھوائی اور کاجل کا کالا ٹیکا اکرام کے رخسار پر لگا دیا۔یہ تمتماتے ہوئے گلابی رخسار اسے دنیا کا سب سے حسین منظر محسوس ہوتے تھے۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولی۔

"تسنیم تیری امانت ہے...... جس دن وہ اپنے پیروں سے چلنے کے قابل ہو جائے اسے اپنے ساتھ لے جانا، میں تجھے کبھی منع نہیں کروں گی۔ اور ہو سکتا ہے میں بھی تیرے پیچھے پیچھے چل پڑوں۔ جیتی رہوں تو میری مرضی سے لے جانا اور اگر اس دنیا میں مجھے نہ پائے تو اپنی تسنیم کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنا۔ بھلا اسے تجھ سے کون چھین سکتا ہے۔"

اکرام خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "باجی! شاہ جی مجھ سے یہ سب کچھ پوچھیں گے۔ میں انہیں کیا بتاؤں؟"

"تم نہیں، میں خود بتاؤں گی۔ میں خود ان سے کسی وقت ملوں گی۔" کوثر جہاں نے جواب دیا۔

○●○

کوثر جہاں اپنا وعدہ نبھانے چل پڑی۔ شاہ جی کے پاس جانے کے لئے وہ تیاریاں کر رہی تھی کہ شمشیرہ بیگم اس کے پاس پہنچ گئیں۔

"کہیں جا رہی ہو کیا؟"

"ہاں اماں! راستے میں ٹوکا نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے...... اب ہماری یہ قدر ہو گئی کہ ہم کوئی سوال بھی نہ کریں۔"

"شاہ جی کے پاس جا رہی تھی۔" کوثر جہاں نے سرد لہجے میں کہا۔

"ک ک...... کیا...... رب نواز کے پاس؟"

"ہاں اماں......"

"کیوں......؟"

"یہی تو آپ کی بری عادت ہے...... سوال پر سوال کئے جاتی ہیں۔"

"میں کون ہوں تمہاری، کبھی دل میں سوچا ہے...... کیا سارے رشتے ختم کر دیئے؟"

"اماں! جاتے وقت میں ان بے کار باتوں کا کوئی جواب نہیں دینا چاہتی۔" کوثر جہاں نے کہا اور غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔ اسے اندازہ تھا کہ شمشیرہ بیگم تو شاہ جی کے نام ہی سے بل کھاتی ہیں۔ بہر حال گلی سے گزر کر شاہ جی کے ڈیرے پر پہنچ گئی۔ کنڈی بجائی تو کسی نے دروازہ کھول دیا۔

"شاہ جی کو بتایئے کہ کوثر جہاں آئی ہے۔"

اجازت مل گئی اور اسے شاہ جی کے پاس پہنچا دیا گیا۔

"اوہو...... کوثر جہاں بیگم...... آیئے آیئے، کہئے کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"اکرام کہاں ہے؟"

"اسکول میں داخل کرا دیا ہے اسے۔ پڑھنے گیا ہوا ہے۔ آپ بتایئے، کیسے آنا ہوا؟"

"میں نے اطلاع کرائی تھی کہ میں حاضری دینا چاہتی ہوں۔"

"ہاں پتہ چل گیا تھا...... کہئے ہمارے لائق کوئی خدمت؟"

"ویسے تو آپ نے مجھ پر احسانات کے اتنے بوجھ لاد دیئے ہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے قابل نہیں رہی ہوں۔"

"آپ کا شکریہ ادا کرنا بے کار ہے کوثر جہاں بیگم! ہم نے تو اپنا کام کیا ہے۔ آپ کا ہمارا کہیں کوئی حساب نہیں بنتا۔"

"فراخ دلی ہے آپ کی۔ جو عنایتیں آپ مجھ پر کر رہے ہیں بھلا انہیں کیسے بھول سکتی ہوں؟"

"خیر باتیں تو ہمیشہ آپ کی اچھی ہی ہوتی ہیں۔"

"شاہ جی! میں نے ہمیشہ آپ کا بڑا ہی احترام کیا ہے۔ لیکن میں نے ہمیشہ یہ بھی محسوس کیا ہے کہ آپ کا دل کبھی میری طرف سے صاف نہیں ہوا۔"

"ہمارے دل میں تمہاری طرف سے کوئی بات نہیں ہے کوثر جہاں بیگم۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے لئے بھی آپ کے دل کا کوئی گوشہ اسی طرح نرم ہو جائے جس طرح اکرام کے لئے ہوا ہے؟"

"کوئی کام ہو تو ہمیں بے دھڑک بتایئے۔"

"نہیں، بس آپ کی آنکھوں میں اپنے لئے تھوڑی سی عزت چاہتی تھی۔"

"عزت......" شاہ جی کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا...... ان کے لہجے میں تلخی آ گئی اور وہ بولے۔ "عزت حاصل کی جاتی ہے کوثر جہاں بیگم! خود بخود نہیں ملتی۔ عزت کے لئے لڑنا پڑتا ہے، مسائل سے عیش و عشرت کی زندگی تو بڑی آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے، اس کے لئے عزت کو ہی قتل کرنا پڑتا ہے۔ ان تمام احساسات کو قتل کرنا پڑتا ہے جو آگے بڑھ کر عزت میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ آپ طوائف کے کوٹھے پر پیدا ہوئی ہیں، آپ نے وہی

سب کچھ سیکھا ہے۔ لیکن بدنصیبی سے اکرام بھی آپ ہی کے گھر پیدا ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ شمشیرہ بیگم کی بیٹی ہیں اور آپ کی بیٹی تسنیم ہے۔ تسنیم بڑی ہو گی، اس کا مستقبل ابھی سے تعمیر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ لیکن کیا آپ مجھے اس بچے کے مستقبل کے بارے میں بتا سکتی ہیں؟ اکرام کا کیا مستقبل ہے؟ وہ بھی اسی کوٹھے کی مخلوق ہے۔ زیادہ سے زیادہ آگے بڑھ کر وہ کیا بن سکتا ہے، طبلہ بجانے والا، سارنگی بجانے والا یا گلی میں کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنی بہن کے گھر کا راستہ دکھانے والا...... یہی سب ہے ناں اس کا مستقبل؟ بتائیے، یہ بھی کسی اچھے آدمی کی اولاد ہو سکتی ہے؟ اسے اپنے ضمیر کو قتل کرنا پڑے گا اور ضمیر کو قتل کرنے کے بعد ہی یہ جی سکے گا۔ اگر ضمیر زیادہ طاقتور ہوا تو ان حالات سے تنگ آ کر خودکشی کرے گا ورنہ پھر ضمیر کی موت کے بعد ہی جی سکتا ہے۔ آپ مجھے بتائیے کوثر جہاں بیگم! کبھی آپ نے ایک ماں بن کر اپنی بیٹی کے ساتھ ساتھ اپنے بیٹے کے بارے میں بھی سوچا؟ مجھے جواب چاہئے۔ یہ تن آسانی کی زندگی جو گا بجا کر آپ کو حاصل ہو گئی ہے، کیا آپ کے بیٹے کو بھی کچھ دے سکتی ہے؟ بیٹی تو آپ کے مستقبل کا سہارا ہے، بیٹا بے مقصد۔ میں آپ کی عزت کر سکتا ہوں، میرے دل کے گوشے آپ کے لئے نرم ہو سکتے ہیں مگر شرط یہی ہے کہ آپ کے اپنے دل کے گوشوں میں بھی کوئی نرمی پیدا ہو۔ چھوڑ دیجئے اس عیش و عشرت کی زندگی کو۔ بھول جائیے یہ سب کچھ، کانٹوں میں رہ کر گزارا کیجئے، اپنے بچوں کی پرورش کیجئے۔ کوثر جہاں بیگم! ٹھیک ہے کہ طوائف کے کوٹھے پر پیدا ہونا دنیا کی نظر میں ایک گالی ہے لیکن آپ اپنے حالات کو بدل سکتی ہیں۔ آپ خود سوچ سکتی ہیں۔ جب سوچنے کے لئے وقت مل جاتا ہے اور دل میں یہ احساسات پیدا ہوتے ہیں کہ عزت کا کوئی مقام کسی کے دل میں پیدا ہو جائے تو اس کے لئے مشکلات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ آپ اپنی عیش و آرام کی زندگی چھوڑ دیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والا وقت آپ کو بھول جائے۔ یہ بات نظر انداز کر دی جائے کہ آپ نے طوائف کے کوٹھے پر جنم لیا تھا...... لیکن یہ سب چھوڑنے کے بعد آپ کو پریشانیاں اور مصیبتیں اٹھانا پڑیں گی۔ در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں گی اور ایسا کون کرے گا اکرام کے لئے...... کون کرے گا...... جبکہ آپ کے سامنے آپ کا مستقبل موجود ہے۔ زبان مت کھلوائیے کوثر جہاں بیگم! ہم ٹھہرے لچے لفنگے آدمی، ہمیں اس بات پر مجبور مت کیجئے کہ ہم اپنی زبان بدل لیں۔ بڑی مشکل سے ہم نے یہ الفاظ بڑی

احتیاط سے استعمال کئے ہیں۔“

کوثر جہاں کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو رخسار پر لکیریں ڈال رہے تھے۔ اسے ان کا احساس بھی نہیں تھا۔ بمشکل تمام وہ بولی۔

”میں آپ کے دل میں اپنے لئے کوئی عزت نہیں چاہتی شاہ جی! میں تو شکریہ ادا کرنے آئی تھی کہ خدا نے آپ کو اکرام کا سہارا بنا دیا ہے...... ہم تو سچ مچ ماں ہو کر اس کے لئے کچھ نہ کر سکے لیکن اللہ تعالیٰ ہر ایک کے لئے آسمان سے ایک نہ ایک سہارا اتارتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ ہمارے لئے بہت بڑا ایثار کر رہے ہیں۔ جو کچھ آپ نے کہا ہم آپ کی ایک ایک بات پر ایمان کی طرح یقین رکھتے ہیں۔ ہماری ایک مجبوری ہے شاہ جی! خدا کے لئے ہمیں اپنی اس مجبوری تک کے لئے معاف کر دیں...... ایک مشکل ہے ہمارے ساتھ، ایک پریشانی ہے...... ورنہ خدا گواہ ہے کہ اپنے اکرام کے لئے کسی چٹائی یا بانس کی بنی ہوئی جھونپڑی میں بھی گزارہ کر لیتے۔ تسنیم بھی ہماری زندگی کا دوسرا حصہ ہے، ہم اسے بھی عزت کی زندگی دینے کے خواہش مند ہیں۔ مگر آپ کی عنایتوں اور خدا کی نوازشوں نے اکرام کو ایک اچھا مستقبل بخش دیا۔ تو ایک وعدہ ہم آپ سے ضرور کرتے ہیں کہ تسنیم کے پیروں میں گھنگھرو نہیں بندھیں گے۔ آپ صاحب اختیار ہیں، خدا نے آپ کو عزت دی ہے۔ ہم آپ کو اس وقت یہ اجازت دے رہے ہیں کہ اگر کبھی تسنیم کے پیروں میں گھنگھرو دیکھیں تو آپ ہمیں اور اسے الٹی چھری سے ذبح کر دیں۔ با خدا ہم آپ کو یہ لکھ کر دے دیں گے کہ ہم نے اس کے لئے آپ سے یہ درخواست کی تھی۔“ کوثر جہاں کے لہجے میں ایک عجیب سی تمتماہٹ آ گئی اور شاہ جی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ کچھ دیر اسی طرح اسے دیکھتے رہے پھر ان کے لہجے سے ایک نرمی کا احساس ہوا۔

”آپ کو کوئی مشکل درپیش ہے؟“

”ہاں شاہ جی...... ایک بہت بڑی مشکل...... جس کے لئے ہم یہاں رہنے پر مجبور ہیں۔ انتظار ہے ہمیں کسی کا...... انتظار کر رہے ہیں ہم شاہ جی! جس کے آنے پر ممکن ہے ہمیں ہماری جنت مل جائے۔ ہمیں تھوڑا سا موقع دے دیں۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو ٹھیک ہے، ورنہ آپ کی جوتیاں سیدھی کرنا اپنی زندگی سمجھیں گے۔ آپ ہمارے لئے بہت محترم ہیں...... ہمارے دل میں کوئی برائی نہیں ہے ایک عورت کی حیثیت سے۔ لیکن

ہم آپ کی خدمت کر کے اپنی زندگی کو ایک بہت بڑی حیثیت بخش دیں گے۔ ایک تھوڑا سا وقت درکار ہے ہمیں۔"

"ایسی باتیں نہ کریں کوثر جہاں بیگم! خیر اکرام کے سلسلے میں ہمیں آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

"حکم کریں۔"

"آپ اسے خود سے دور کر سکتی ہیں۔"

"ہم سمجھے نہیں شاہ جی۔"

"میں اسے اس ماحول سے دور لے جانا چاہتا ہوں۔ لوگوں کے ذہنوں سے یہ بات مٹا دینا چاہتا ہوں کہ اکرام آپ کا بیٹا ہے، اس بازار کا بیٹا ہے۔ بتایئے آپ اسے خود سے دور کر سکتی ہیں؟"

کوثر جہاں کی آنکھیں بدستور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔"

"سوچ لیجئے۔"

"ہم تو بہت کچھ سوچ چکے ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... اگر آپ کو کوئی مشکل پیش آئے تو ہمیں بتا دیجئے، آپ اکرام کی ماں ہیں۔ ہمیں آپ کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔"

"آپ نے ہمیشہ ہی مجھے عزت بخشی ہے۔ جب مجھے میری مجبوری کا حل ملے یا نہیں ملے گا تو میں آپ کو بتا دوں گی کہ کیا مجبوری تھی۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ خلوصِ دل سے مجھے معاف کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے...... ہمیں منظور ہے......" تھوڑی دیر کے بعد کوثر جہاں اپنی جگہ سے اٹھی تو شاہ جی نے فضل خان کو آواز دے کر کہا۔

"جاؤ انہیں عزت و احترام کے ساتھ ان کے گھر کے دروازے تک چھوڑ آؤ۔"

○●○

شمشیرہ بیگم ان خواتین میں سے تھیں جو اپنے دل پر اگر کوئی بوجھ نہ پالے رہیں تو ان کی دلداری ہی نہیں ہوتی۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب سے رب نواز شاہ ہیرا

منڈی میں آئے تھے باقی لوگ تو بڑے مطمئن ہو گئے تھے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اب دوسری کوٹھے والیاں شمشیرہ بیگم کو ہی برا بھلا کہتی تھیں کہ بلاوجہ انہوں نے شاہ جی سے دشمنی پال لی ہے ورنہ شاہ جی تو صحیح معنوں میں یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اس محلے کے رکھوالے ہیں۔ بے غرض، بے لوث۔ نہ کوٹھوں پر آنے جانے کے شوقین۔ حالانکہ نجانے کس کس کی خواہش تھی کہ یہ بانکا سجیلا جوان ان کے کوٹھے پر آئے، ان سے راہ و رسم بڑھائے لیکن شاہ جی کبھی اس طرف توجہ بھی نہیں دیتے۔ صرف ایک شمشیرہ بیگم تھیں جو ڈیرے کی طرف رخ کر کر کے کوستی تھیں اور اب پھر ان کے دل پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ شاہ جی کے نام سے تو انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ نام سنتے ہی منہ میں کڑواہٹیں گھل جاتی تھیں۔ بہرحال اس وقت حاجو اور غلام شاہ اندر داخل ہوئے تھے۔ شمشیرہ بیگم نے ان کا چہرہ دیکھا اور ان پر برس پڑیں۔

"کیسا اطمینان دے دیا ہے اللہ نے تمہیں...... میری کمائی کھا رہے ہو اور عیش کر رہے ہو۔ ارے تم دونوں کو کبھی کوئی فکر ہوئی۔ کب سے میرے جوتے چاٹ رہے ہو۔ اب تو زمانہ بھی یاد نہیں رہا، کبھی جو وفاداری کا ثبوت دیا ہو۔"

"کیسی وفاداری چاہتی ہیں آپ شمشیرہ بیگم! ساری زندگی تو لٹا دی آپ پر۔" غلام شاہ بولا۔

"جھاڑو پھرے تمہاری اس بے کار زندگی پر۔ کبھی کوئی ڈھنگ کا کام کیا؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں...... گھر کے مرغے ہیں، دال برابر نہ سمجھو گی تو اور کیا سمجھو گی۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ کوثر جہاں بیگم شاہ جی کے ڈیرے پر گئی ہیں۔"

"معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اسی لئے تمہارا پارہ چڑھا ہوا ہے۔"

"کیا ہوگا اس کوٹھے کا...... سب کچھ ہی برباد ہو گیا۔"

"آپ ماں ہے کوثر جہاں بیگم کی...... آخر آپ پوچھتی کیوں نہیں۔ جہاں تک ہم لوگوں کا معاملہ ہے تو آپ کے اشارے پر ہم ہمیشہ ہی گردن کٹانے کو تیار رہتے ہیں۔" حاجو نے کہا۔

"ہاں، اب تو یہی سوچ رہی ہوں کہ آخری بات کر لوں۔ ذرا دیکھو تو کس دھڑلے سے شاہ جی کے پاس آنا جانا ہے، کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مگر من مانی نہیں کرنے

دوں گی۔ ایک کر دوں گی اپنی اور اس کی جان۔ چھوڑ دوں گی لاہور۔ کہیں اور جا مروں گی۔ دیکھوں گی شاہ جی کہاں تک ہمارا پیچھا کرتے ہیں۔''

''سکھر چلیں......'' حاجو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''کیوں...... کیا وہاں تمہاری اماں کی قبر ہے...... سکھر چلیں۔'' شمشیرہ بیگم نے دانت پیس کر کہا اور حاجو کا چہرہ اتر گیا۔

''ایک تو اچھے مشورے دیتا ہوں، اوپر سے وہی گالیاں۔ آخر تمہاری زبان کب میٹھی ہو گی؟'' حاجو نے کہا۔

''دیکھو، تم یہاں سے چلے جاؤ حاجو! کہیں میرے ہاتھوں سے تمہاری موت نہ لکھی ہو۔'' شمشیرہ بیگم نے کہا اور پاندان کا ڈھکنا کھول لیا۔ حاجو اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''ایک تو تمہاری یہ ہاتھا پائی کی عادت ابھی تک نہیں گئی۔'' اس نے اتنی دور ہٹتے ہوئے کہا کہ اگر پاندان کا سروتہ اس کے سر پر پڑے تو اس سے بچ سکے۔ مگر بات ٹل گئی کیونکہ کوثر جہاں اسی وقت آتی ہوئی نظر آئی تھی۔

''آ گئیں۔'' غلام شاہ نے سرگوشی کی۔

''آج اس سے بات کر کے فیصلہ کروں گی۔ آخر اس گھر کا کیا ہو گا۔'' شمشیرہ بیگم نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کوثر جہاں کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ کوثر جہاں پُرسکون تھی، مسکرا کر بولی۔

''کوئی کام ہے اماں......؟''

''ہاں بی بی! غیروں سے ایسے ہی پوچھا جاتا ہے۔''

''آپ اور غیر؟''

''تمہارا سلوک تو غیروں سے بھی بدتر ہے ہمارے ساتھ۔''

''آپ کو اپنا خون جلانے کی عادت ہے۔ صحت خراب کر بیٹھیں گی۔ اللہ نہ کرے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ آخر کیوں اپنا دل جلاتی رہتی ہیں۔''

''میں جلاتی ہوں؟''

''تو پھر......؟''

''تم ماں بیٹے۔''

''اس بے چارے کے پیچھے تو آپ بلاوجہ ہی پڑی رہتی ہیں۔ آپ خود سوچیں، آپ کی اولاد کو کوئی برا بھلا کہے آپ برداشت کر لیں گی؟''

''ارے ہم تو خیر ہیں ہی کون، مگر یہ بتا دو کہ ہم نے اس کے ساتھ کون سی برائی کی ہے۔''

''تو اس نے آپ کے ساتھ کون سی برائی کی ہے۔ ننوں، ننوں کہہ کر اس کا منہ تو سوکھا جاتا ہے۔''

''اس کے کرتوت نہیں دیکھتی تم؟''

''خیال ہے تمہارا اماں...... تمہیں تو ہر ایک پر کیچڑ اچھالنے کی عادت ہے۔ اب کوئی کیا کرے۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔''

''ویسے آپ کی باتیں میری سمجھ میں کبھی نہیں آتیں۔ آخر آپ پر مشکل کیا پڑی ہے؟''

''جو کچھ گنوا چکی ہو کوثر جہاں بیگم اب اس کی واپسی کیسے ہو گی؟ نعمان فضلی کو کس نے ہاتھ سے نکالا، سائیں مراد بخش بھی ہاتھ سے نکل گئے۔ کسی نے کوئی خبر لی پلٹ کر؟ تمہیں تو کوئی خبر ہی نہیں ہے، کوٹھا ہے تو ویران ہو رہا ہے۔ آنے والے آتے ہیں اور منہ لٹکا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اور تمہاری آواز ہے نہ انداز ہے۔''

''تو پھر کوٹھا سجا لیں اماں! میں گاؤں گی۔ میں نے کب منع کیا ہے۔''

''اور وہ جو راستے روکنے والے آتے ہیں، ان کا کیا ہو گا؟''

''میرا خیال ہے اب کوئی راستہ نہیں روکے گا۔''

''کیوں...... کیا بات ہوئی؟''

''وہ بے چارے ہمارے معاملات میں ٹانگ کہاں اڑاتے ہیں۔''

''تو پھر تم گانا شروع کرو گی۔''

''ہاں اماں! گاؤں گی۔ کیوں نہیں گاؤں گی۔''

''آج گاؤ گی؟''

''ہاں...... آج بھی گاؤں گی۔''

شمشیرہ بیگم کا چہرہ کھل گیا۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ نئے سرے سے کوششیں کی جا

سکتی ہیں۔ خدا کرے کوثر جہاں سنبھل جائے۔ اور آج انہوں نے نئے سرے سے کوٹھے کی تزئین کرائی۔ شام ہوئی تو چاروں طرف گھنگھروؤں کی جھنکار گونجنے لگی۔ کوثر جہاں کے گانے کی خوشبو پھیلی اور کھیاں نہ چلی آئیں، ایک کے بعد ایک پہنچنے لگے۔ کوثر جہاں کے نام کی شہرت کی گئی تھی۔ ہال بھر گیا۔ شبانہ اور غزالہ گھنگھرو باندھے دلنوازی کے ساتھ آ گئیں۔ غلام شاہ نے طبلہ سنبھال لیا، حاجو نے سارنگی۔

"یہ حقیقت ہے شمشیرہ بیگم! آپ کے کوٹھے کی رونقوں کو نظر لگ گئی تھی۔ جب سے کوثر جہاں کی آواز صحرا میں گم ہوئی تھی، کوٹھا قبرستان بن گیا تھا۔ آج دل شاد ہو گیا۔"

"چلئے شروع ہو جائیں۔ کہاں ہیں ہماری کوثر جہاں بیگم؟"

چند لمحات کے بعد کوثر جہاں داخل ہوگئی، کوٹھے کی روائتوں کے مطابق حسین لباس میں ملبوس۔ مگر چہرے کی سادگی کو کون چھین سکتا تھا۔ ستار کے تار چھیڑے، ان تاروں سے اس کے دل کا گہرا تعلق تھا۔ یہ تار ہمیشہ سے ہی دل میں نہ جانے کون سے احساسات جگاتے تھے۔ پھر اس نے آہستہ سے سُر ملائے۔ غلام شاہ نے طبلے پر تھاپ دی اور کوثر جہاں کی پُرسوز آواز ابھرنے لگی۔

○●○

شاہ جی اور کوثر جہاں کے درمیان ایک طرح سے ایک باعزت سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ ادھر شاہ جی اکرام کے لئے وہ سب کچھ کر رہے تھے جو کیا جا سکتا تھا۔ اصل میں بات وہی تھی، دل کو لگی ہوئی تھی۔ بس ایک جنون تھا جو دل و دماغ پر سوار ہو گیا تھا حالانکہ ملک اللہ نواز نے شاہ جی کی والدہ سے باعزت طریقے سے شادی کی تھی، انہیں اپنی شاندار حویلی میں جگہ بھی دی تھی۔ وہیں ان کا انتقال بھی ہوا تھا اور ملک اللہ نواز کی دوسری بیگم جو اولاد کی نعمت سے محروم تھیں انہوں نے رب نواز کو اپنی سگی اولاد کی مانند پرورش کیا تھا لیکن بس ایک غم، ایک غصہ، ایک شدت کہ انہیں ان کی اصل حیثیت سے روشناس کیوں نہیں کرایا گیا اور یہ بات دوسروں کی زبانی کس طرح ان کے کانوں تک پہنچی کہ وہ ایک طوائف زادے ہیں، بس دماغ کو چڑھ گئی جس کے نتیجے میں وہ ڈیرے پر موجود تھے۔ اس قدر صاحب اختیار تھے کہ گوریجہ جیسے پولیس آفیسر کی ہمت نہ پڑی کہ کسی کو ان کے بارے میں بتائے۔ گوریجہ کو اتفاق سے یہ بات معلوم تھی کہ رب نواز شاہ کس قسم کا انسان ہے، کسی کی جان کے پیچھے پڑ جائے تو اس وقت تک گردن نہ اٹھائے جب تک کہ اس کی تباہی کے سامان مکمل نہ ہو جائیں۔

اور رب نواز شاہ ہیرا منڈی آ گیا۔ پھر اس نے اپنے ہی جیسے ایک بچے کو دیکھا جو حُسن و جمال میں بے مثال تھا اور ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ انہیں تو خیر اس طرح پروان چڑھا لیا گیا لیکن اس بچے کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ چنانچہ ان کا ہاتھ اکرام کے سر پر پہنچ گیا اور انہوں نے اس کے لئے سارے بندوبست کرنا شروع کر دیئے۔ ایک اعلیٰ درجہ کے سکول میں اس کا داخلہ کرا دیا گیا اور اکرام ایک رئیس زادے کی طرح تعلیم کے حصول کے لئے سکول جانے لگا۔ ولدیت میں شاہ جی نے اپنا نام ہی لکھا تھا اور اب وہ اس کے لئے ایک شاندار کوٹھی کا بندوبست کر رہے تھے تاکہ اس پر سے ہیرا منڈی کی چھاپ اتر جائے۔

اس کے اور ان کے معاملات میں بڑا فرق تھا۔ بہر حال ادھر یہ ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی اور ادھر ہیرا منڈی میں کوثر جہاں نے جھنڈے گاڑھ دیئے تھے۔

پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ ہیرا منڈی میں بہت سے کوٹھے تھے اور بہت سی گانے والیاں تھیں۔ ان سب کا اپنا ایک مقام تھا لیکن جب سے کوثر جہاں نے محفل غزل سنبھالی تھی، رُت ہی بدل گئی تھی۔ پروانے تھے کہ شمع پر نثار ہونے کے لئے آ جاتے تھے...... پچھلے دنوں جو سیاہیاں چھا گئی تھیں انہوں نے مسلسل آنے والوں کو بددل کر دیا تھا۔ کوثر جہاں کی آواز ہی شامل محفل نہ ہوتی تو پھر لطف ہی کیا آتا۔ لیکن کوثر جہاں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ شاہ جی سے اجازت ملنے کے بعد محفل غزل سجانے میں کوئی حرج نہیں تھا اور کوثر جہاں کے لئے یہ اجازت بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ شمشیرہ بیگم کے گلے شکوے بھی مٹانے تھے۔ بیماری کے بعد سے اب تک جب سے شاہ جی کا نزول ہیرا منڈی میں ہوا تھا، ہنگامے ہی ہنگامے چل رہے تھے اور کوثر جہاں کو شمشیرہ بیگم کی بے چینی کا پورا پورا احساس تھا۔ کوٹھوں کی رونق تو تماشبین ہی ہوا کرتے ہیں اور تماشبینوں کے دلوں کی طلب کوثر جہاں کی حسین آواز تھی۔ چنانچہ اب کوثر جہاں نے شام کی محفلوں میں پوری پوری دلچسپی لینی شروع کر دی اور اس کے پرستار اس کے بارے میں بڑی بڑی کہانیاں سنانے لگے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو نئے نئے لوگوں کو لاتے تھے۔ شمشیرہ بیگم خوش ہو گئیں۔ دولت ایک بار پھر آسمان سے برسنے لگی۔ کوثر جہاں غزل سرا ہوتی تو نوٹوں کے انبار لگ جاتے۔ اٹھائے نہ اٹھ پاتے اور دینے والے تھے کہ جی کھول کر دیتے۔ کوثر جہاں اپنی آواز سے ہی انہیں بے خود کر دیتی تھی۔ ایک نشہ ہوتا جو آسمان سے برستا اور ہر اس شخص پر چھا جاتا جس کے کان غزل آشنا ہوں۔ اور اس وقت بھی محفل اسی طرح جاری تھی۔ ایک حسین غزل کوثر جہاں کے ہونٹوں سے ادا ہو رہی تھی۔ اس کی غزل سرائی میں یہی ایک خوبی تھی کہ غزل کا جو مفہوم ہوتا اسے جسم کی، چہرے کی اور آنکھوں کی کیفیتوں سے ادا کرتی اور دیکھنے اور سننے والا خود پر یہ تمام کیفیتیں محسوس کرتا۔ وہ ڈوب کر گاتی تھی اور اس کا یہی ڈوبنا سننے والوں کو ڈبو دیتا تھا۔ شاید اس وقت بھی یہی کیفیت تھی۔ کچھ نئے لوگ بھی آئے تھے جن میں ایک صاحب کا خاص طور سے ذکر کیا جا سکتا ہے۔ غزل کا مقطع ادا نہیں ہوا تھا کہ اس کی نگاہ ان صاحب پر پڑی۔ ایک بجلی سی کوندی...... کچھ لمحوں کے لئے غزل رک گئی اور وہ کھو سی گئی۔ اور پھر

اچانک ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس کے انداز میں کچھ اضمحلال سا پیدا ہو گیا تھا...... اس نے فوراً ہی غزل کا مقطع پیش کیا اور غزل ختم کر کے بیٹھ گئی۔ ادھر آنے والے صاحب جس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی کا ایک حسین کردار ہوں گے، جوانی کے نقوش اب تک چہرے پر منجمد تھے۔ چوڑا چکلا، کلا ٹھلا، شاندار، کسا ہوا ورزشی جسم حالانکہ عمر اچھی خاصی تھی لیکن اب بھی بے مثال شخصیت کے مالک تھے۔ یہی سمجھے کہ مغنیہ ان کی شخصیت سے متاثر ہو گئی ہے۔ دفعتہً ہی وہ صاحب بولے۔

”بی شمشیرہ بیگم! ان کا جو بھی نام ہے ہمیں یاد نہیں رہا۔ لیکن غزل تو مکمل نہیں ہوئی۔ مقطع وقت سے پہلے پیش کر دیا گیا۔“

”ہاں...... میں پوچھتی ہوں جناب عالی۔ کیوں کوثر جہاں، خیر تو ہے؟“

”ایک ذرا دم لینے رک گئی تھی اماں! اگر حکم ہے تو باقی اشعار بھی پیش کر دوں گی۔“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔“ شمشیرہ بیگم نے کہا اور آنے والے صاحب سے بولیں۔

”حضور کا تعارف نہیں ہو سکا۔“

”راجہ شرافت علی ہیں ہم۔ بس اس سے زیادہ تعارف اب کیا کرائیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کے اس کوٹھے کے پرانے شناسا ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ برسوں کے بعد ادھر آئے ہیں۔“

”بہت خوشی ہوئی راجہ صاحب آپ سے مل کر۔ اور یہ بھی اچھی بات ہے کہ آپ ہمارے پرانے شناسا ہیں۔“

لوگوں کی آوازیں ابھرنے لگیں تو شمشیرہ بیگم نے غزالہ اور شبانہ سے کہا۔ ”چلو، تم شروع ہو جاؤ۔“

بہر حال لوگ انہی دونوں سے مطمئن ہو گئے۔ البتہ شمشیرہ بیگم کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ راجہ شرافت علی کو دیکھ کر نجانے کیوں کوثر جہاں پر ایک عجیب سا تاثر قائم ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ راجہ شرافت علی بڑی اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ آگے بڑھ کر راجہ صاحب کے پاس جا بیٹھیں۔

”جی راجہ صاحب! یہ بتائیے کہ کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“

”بس شکر ہے خدا کا...... آپ کی ان محفلوں کے پجاری ہیں۔“

''بڑی خوشی ہوئی۔ اگر چاہیں تو کچھ قیام فرمائیں۔''

''نہیں...... پھر آئیں گے۔ ویسے واقعی یہ لڑکی بہت اچھا گاتی ہے۔''

''ضرور آیئے گا...... انتظار کریں گے۔''

ادھر کوثر جہاں نے خود کو سنبھال کر حاجو کو اشارہ کیا اور حاجو اس کے قریب پہنچ گیا اور کان جھکا لیا۔

''کہئے کوثر بیگم کیا بات ہے؟''

''وہ جو صاحب بیٹھے ہیں ناں اماں کے پاس؟''

''جی، جی...... اچھی طرح دیکھ رہے ہیں۔''

''حاجو! آپ ذرا ان کے بارے میں معلومات کیجئے۔ یہاں سے اٹھیں تو آپ بھی اٹھ جایئے گا۔ ذرا اتا پتا دیجئے، آپ کو پانچ سو روپے دوں گی۔''

''اطمینان رکھئے۔ یہ بھی پتہ چلا لیں گے کہ کہاں پیدا ہوئے اور کیوں ہوئے۔'' حاجو نے کہا۔

محفل چلتی رہی۔ غزالہ اور شبانہ نے فوراً ہی صورتحال سنبھال لی تھی۔ ادھر کوثر جہاں کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ صاحب جنہیں دیکھ کر وہ چونکی تھی، کچھ سننے پر آمادہ ہیں چنانچہ انہیں مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ غزالہ اور شبانہ نے جب اپنی غزل ختم کر لی تو کوثر جہاں نے فوراً ہی ان کی فرمائش پوری کرنے کے لئے تیاریاں کیں اور ایک حسین غزل شروع کر دی۔

''میری فریاد دوسرا نہ سنے تم سنو اے بتو خدا نہ سنے
راز اپنا کبھی کہا نہ کہے حال میرا کبھی سنا نہ سنے
خوبرو وہ جسے زمانہ کہے گفتگو وہ جسے زمانہ سنے
ہجر میں جو دعائیں مانگی ہیں کوئی اللہ کے سوا نہ سنے''

حسین غزل...... حسین ادائیگی...... محفل وجد میں آ گئی۔ ہر کوئی جھومنے لگا۔ اور شمشیرہ بیگم آنکھوں ہی آنکھوں میں کوثر جہاں کی بلائیں لینے لگیں۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ کوثر جہاں رونق محفل ہے۔ جو کچھ بھی گاتی ہے، سماں باندھ دیتی ہے۔ لیکن کس کی نظر لگ گئی تھی اس کوٹھے کو۔ کمبخت شاہ جی کی نظر لگ گئی تھی۔ ورنہ کیا مجال تھی کہ جو ایک بار ادھر کا رخ کر لے، دوسری طرف چلا جائے۔ ادھر راجہ شرافت علی پرانے شکاری، کوٹھوں کے آداب سے

آشنا، کوٹھوں سے پوری طرح واقف لیکن یہ شمشیرہ بیگم کے کوٹھے ہی کا کمال تھا کہ کسی کو آخری دم تک روکے رکھے۔ چنانچہ درمیان میں اٹھنے کا نام نہ لیا۔ کوثر جہاں نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ حاجو کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ محفل کے اختتام تک اجنبی شخص کو روکے رکھے۔

چنانچہ اس نے بھی سماں باندھنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہاں تک کہ وقت ختم ہوا، مہمان رخصت ہونے لگے۔ حاجو کے لئے یہ وقت بہت مناسب تھا۔ سارنگی ایک طرف رکھ کر باہر نکل گیا جیسے کوئی ضروری حاجت پوری کرنے جا رہا ہو۔ آنکھوں میں پانچ سو روپے کا نوٹ ناچ رہا تھا۔ ان صاحب کا اتا پتہ لینا تھا اور اس کے لئے ضروری تھا کہ شمشیرہ بیگم کی گرفت سے نکل جائے۔ نجانے کس کام سے لگا دے۔ ادھر راجہ شرافت علی نے بہت بڑی رقم شمشیرہ بیگم کو پیش کی تھی اور شمشیرہ بیگم نثار ہوئی جا رہی تھیں۔

''حضور! یہ تو سب ثانوی چیزیں ہیں، ہم تو بس قدر دانوں کے قدموں کی آہٹوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ دوبارہ کب تشریف لائیں گے؟''

''ابھی تو لاہور میں ہوں۔ دیکھئے مصروفیت کب اجازت دیتی ہے۔ ویسے یہاں آنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ حاضری دوں گا۔''

''انتظار کریں گے۔'' شمشیرہ بیگم نے کہا۔ کوثر جہاں گردن جھکا کر اندر چلی گئی تھی۔

راجہ شرافت علی کچھ عجیب سا احساس دل میں لئے وہاں سے اترے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کوثر جہاں نے ان پر اثر ڈالا تھا لیکن خود کوثر جہاں کی جو کیفیت ہوئی تھی وہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ساتھ میں کچھ دوست بھی تھے جن سے باتیں کرتے ہوئے کوٹھے سے نیچے اترے۔ حاجو، جو انتظار کر رہا تھا، لپک کر قریب پہنچ گیا۔ جھک کر سلام کیا تو راجہ شرافت علی اسے چونک کر دیکھنے لگے۔ حاجو نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''تسلیم عرض کرتا ہوں۔''

''عرض کر چکے ہوں تو اب سیدھے ہو جایئے ورنہ زیادہ جھک گئے تو سر کے بل نیچے گر پڑیں گے۔''

حاجو جس نے لکھنوی انداز میں سلام کیا تھا چونک کر سیدھا ہو گیا۔ راجہ صاحب کے ساتھ موجود دوست ہنس پڑے تھے۔ راجہ صاحب نے حاجو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی فرمائیے؟''

''وہ شاید حضور عالی نے مجھے پہچانا نہیں۔ ابھی آپ جہاں سے نیچے اترے ہیں وہاں سارنگی بجا رہا تھا۔''

''جی ہاں ہم نے دو سارنگیاں ایک ساتھ دیکھی تھیں، ایک تو آپ تھے سارنگی کے طور پر۔ اور دوسری یقیناً سارنگی ہی ہوگی جو آپ کے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔''

''بہت بڑا اعزاز عطا فرمایا ہے سرکار عالی نے۔''

''لکھنؤ کے ہیں؟''

''نہیں، ہیں تو یہیں کے لیکن آپ جیسے معززین کی خدمت میں رہ کر کچھ سیکھ لیا ہے۔''

''اچھا اب فرمائیے، ہم کیا خدمت کریں آپ کی؟''

''بس ذرا ایک لمحہ چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ معذرت۔'' حاجو نے کہا۔

''تنہائی میں؟''

''جی۔''

''ٹھیک ہے...... آئیے۔'' راجہ صاحب نے کہا اور دو قدم آگے بڑھائے۔ دوست دلچسپی کی نگاہوں سے حاجو کو دیکھ رہے تھے۔ حاجو نے کہا۔

''حضور! آپ نے کوثر جہاں بیگم کو دیکھا تھا؟''

''وہی جو غزل گا رہی تھیں؟''

''جی۔''

''ہاں...... تو دیکھے بغیر ان کی غزل تھوڑی ہی سنی تھی۔''

''اور آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ گاتے گاتے آپ کو دیکھ کر ذرا دیر کے لئے رک گئی تھیں۔ انہوں نے ہم سے کہا ہے کہ آپ کا اتا پتہ معلوم کریں۔''

''ارے کیوں...... خیریت...... کیا یہاں آنے والے سارے مہمانوں کا اتا پتہ معلوم کیا جاتا ہے؟'' راجہ صاحب کو ایک عجیب سی مردانگی کا احساس ہوا تھا۔

''حضور یقیناً انہوں نے آپ میں ضرور کوئی ایسا ہی نمایاں فرق دیکھا ہوگا جس کی بنا پر کوثر جہاں کو ہمارا سہارا لینا پڑا۔''

''اتا پتہ تو ہمارا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں دوستوں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کوثر

جہاں بیگم کو ہمارا یہ پیغام دے دیجئے کہ کل خاص طور پر ہم ان کے لئے آئیں گے اور ذرا دیر سے آئیں گے۔ تاکہ ایک دو غزلیں سننے کے بعد کچھ وقت ان کے ساتھ بھی گزار لیں۔ پھر ہم اپنا اتا پتہ خود ہی دے دیں گے۔ ویسے یہ کس قسم کی خاتون ہیں؟''

''آپ ملاقات کریں گے تو اندازہ ہو جائے گا۔ مجال ہے کہ کسی کی جانب آنکھ اٹھائیں۔ بڑے بڑے رئیس، جاگیردار ان کے چکر میں رہتے ہیں۔ مجروں میں بھی اپنی پسند ہی سے جاتی ہیں۔ جہاں صاحب ذوق ہوں، وہاں غزل سناتی ہیں۔ ورنہ کیا مجال ہے۔ بہرحال حضور نے کوئی ایسا جادو کیا کہ غزل بھی مکمل نہ کرسکیں۔ ہم نے دیکھا تھا کہ آپ کو دیکھ کر تصویر حیرت بن گئی تھیں اور اس کے بعد غزل رک گئی تھی۔''

''ٹھیک ہے...... کل ہم ان سے ملاقات کریں گے۔''

حاجو نے سلام کیا اور واپس پلٹ گیا۔ راجہ شرافت علی مسکرا رہے تھے۔ دوستوں کے قریب پہنچے تو دوست مدح سرائی کرنے لگے۔

''یار تم نے نجانے کتنے گھر خراب کئے ہوں گے، ہمیں اندازہ ہو گیا ہے۔''

''بس جی کیا کہیں، ان لڑکیوں نے زندگی خراب کر دی ہے۔ چلو یہاں سے آگے تو بڑھو۔''

''کیا تقدیر پائی ہے۔ واقعی کچھ لوگ اپنی تقدیریں سونے کے قلم سے لکھوا کر لاتے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ کسی کی نگاہِ التفات کے لئے عمر گزار دی۔ اور ایک یہ ہیں کہ جہاں چلے جائیں وہاں دلوں کے انبار لگ جائیں۔''

''بات صرف ان طوائفوں کی ہی نہیں ہے، نجانے کہاں کہاں پریشان ہونا پڑتا ہے۔ ویسے کیا کہتے ہیں آپ ان خاتون کے بارے میں جن کا نام کوثر جہاں ہے؟''

''ہم تو آپ کی خوش قسمتی پر ناز کر رہے ہیں۔''

''نہیں بھائی، تفریح صرف تفریح ہوتی ہے۔ ہم تماش بین تو بن سکتے ہیں، عاشق یا محبوب نہیں۔ اور پھر طوائفوں کے محبوب توبہ توبہ...... یہ تو کھال اتار کر رکھ دیا کرتی ہیں۔ دیکھیں گے محترمہ کیا چاہتی ہیں۔ ویسے جو کچھ ہے وہ تو ہم سمجھ چکے ہیں مگر پھیر میں نہیں آئیں گے۔ ہم بھی ٹھہرے گھاگ۔ شادی نہیں کی، اس لئے کہ کسی ایک خاتون کے ہو کر رہ پڑے تو زندگی عذاب ہو جائے گی۔'' راجہ صاحب لسانیہ ہانکنے لگے۔

○●○

شمشاد آراء جو سامنے والے کوٹھے پر رہتی تھیں، شمشیرہ بیگم سے باتوں میں مصروف تھیں۔ ان کی بیٹی اچھی گلوکارہ مانی جاتی تھی۔ شمشیرہ بیگم کو مبارکباد دیتی ہوئی بولیں۔

"شمشیرہ بیگم! پچھلے دنوں تو تمہارے کوٹھے کو نظر کھا گئی تھی۔ ہم لوگ بھی سوچتے تھے کہ کیا ہوا، بات ہی پتہ نہ چلتی تھی۔ تم نے تو کبھی اپنا ہی نہ سمجھا، نہ کبھی دل کی بات کہی، نہ سنی۔ لیکن یقین کرو ہم دعائیں کرتے تھے تمہارے لئے۔ خوش ہونے والیاں خوش ہوتی ہوں گی تو ہوں گی، بلکہ ان میں سے کچھ تو تالیاں پھٹکار پھٹکار کر کہتی تھیں کہ شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کی رونق اجڑ گئی۔ شمشیرہ بیگم خیال رکھا کرو، بہت سے ایسے لوگ تعویذ گنڈے بھی کراتے ہیں، بہت سی جلتی ہیں تم سے۔ مگر دیکھو خدا کی نظر سیدھی ہو تو بندہ بے اثر ہوتا ہے۔"

"تو اور کیا شمشاد آراء...... کوؤں کے کوسنے سے کہیں ڈھور مرتے ہیں۔ ہم نے تو کبھی کسی کے لئے برا نہ سوچا، کچھ نہ کہا۔ حالانکہ ہمارے علم میں کیا نہیں ہوتا۔ بہت سے کوٹھے تو ایسے ہوتے ہیں جہاں آنے والے گالیاں بکتے ہوئے چلے جاتے ہیں کہ گلے میں سُر نہیں اور چلی ہیں بھینس کی طرح ڈکرانے۔"

"بالکل، بالکل۔"

"ہمارا کیا بگاڑ لیا۔ داتا جی کے سائے میں ہیں، بزرگوں اور ولیوں کا کرم ہے، بگڑی ہوئی بات بن جاتی ہے۔ بس پریشان ہوں تو میں ان شاہ جی سے۔ انہیں تو کوئی کوسنا بھی نہیں لگتا۔ اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے ان کی وجہ سے ہوتا رہا ہے۔"

"کوثر جہاں کو اغوا کر لیا گیا تھا...... کچھ پتہ تو چل گیا ہوگا کہ کون تھا۔"

"ارے بس ایک شاہ جی ہیں جو ہماری جڑیں کاٹنے کی فکر میں رہتے ہیں۔"

شمشاد آراء کافی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ شاہ جی کے خلاف تو خیر کوئی بھی نہیں تھا لیکن دوسروں کے دل کا حال لینے کی خواہش ہر شخص کے دل میں ہوتی ہے۔ ان کے جانے کے بعد کوثر جہاں دیر تک سوچتی رہیں۔ اسی وقت حاجو اور غلام شاہ اندر داخل ہوئے تھے۔ شمشیرہ بیگم کی توجہ ان کی طرف ہوئی، انہوں نے دونوں کو تیکھی نظر سے دیکھا تو حاجو دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

"سس...... سنبھالنا غلام شاہ مجھے...... دیکھو یہ تیر مجھ پر برس رہے ہیں۔ کوئی شمشیرہ

بیگم کو سمجھائے کہ حاجو کی جان ہی کتنی ہے۔ اتنے کمزور بدن پر یہ تیر اندازی...... جینے دو شمشیرہ بیگم! جینے دو۔"

"ارے غلام شاہ! ذرا اٹھائیو میری جوتی، دس لگا دوں تو اس کے دماغ کے کیڑے بیٹھ جائیں گے۔"

"آپ کو شمشیرہ بیگم! پتہ نہیں ہے، آج حاجو بڑا خوش ہے۔ خرچہ کرنے پر آمادہ ہے، جیب میں نوٹ نظر آ رہے ہیں۔" غلام شاہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ کہاں سے مارے تم نے...... ذرا ادھر جیب دکھاؤ۔" شمشیرہ بیگم بولیں۔

"آپ کیا سمجھتی ہیں شمشیرہ بیگم! کیا دولت آپ ہی کی غلامی کرتی رہے گی؟"

"ادھر آتے ہو یا میں اٹھوں؟"

"ارے ارے غلام شاہ! جب بھی کہتے ہو ایسی بے تکی ہی کہتے ہو۔ ذرا سے مزاج بہتر نظر آئے تو تم نے بیچ میں رگڑا لگا دیا۔ دیکھ لو شمشیرہ بیگم! جیب میں جو کچھ بھی ہے تمہارا ہی ہے۔ یہ غلام شاہ ایسے ہی چھوڑتا رہتا ہے۔ ایک تو اس کو کھلاؤ پلاؤ، اوپر سے چوری کا الزام بھی برداشت کرو۔"

"اس وقت تم دونوں آ کہاں سے رہے ہو؟"

"بس ایسے ہی ذرا گھومنے پھرنے گئے تھے۔"

"بڑا مان کرتی تھی تم پر...... خدا کی قسم کسی کام کے نہ نکلے۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہے تمہارے پاس کہ ان شاہ جی پر جھاڑو پھر جائے...... یہ محلہ چھوڑ دیں۔ خدا خدا کر کے کوثر جہاں راستے پر آئی ہے تو جی خوش ہوا ہے۔ ذرا سا اطمینان ہوا ہے۔ مگر ڈر لگا رہتا ہے ہر وقت۔ کسی وقت کام بگڑ گیا تو کیا ہوگا۔"

"آج کل تو سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوثر جہاں پر پھر سے بہار آ گئی ہو۔"

"اللہ رکھے، نظر کیوں لگاتے ہو۔"

"کہاں نظر لگاتے ہیں...... اور پچھلی رات تو کوثر جہاں نے کمال ہی کر دکھایا۔"

"کیا......؟" شمشیرہ بیگم دانت نکال کر بولیں۔

"لو، ایسے ہی بن رہی ہو جیسے کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ وہی گُر آزمائے ہیں جو طوائفوں

کے گُر ہوتے ہیں۔ غزل گاتے گاتے رک گئیں، حیران نگاہوں سے راجہ شرافت علی کو دیکھا اور یوں لگا جیسے کھو گئی ہوں...... ارے جاگیرداروں کو پھنسانے کے یہی تو گُر ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد یہ سسرے مرغوں کی طرح کُکڑوں کوں، کُکڑوں کوں بولتے ہوئے سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"اے ذرا آواز نیچی کرو۔ کوئی سن لے گا۔ تمہارا منہ کھل جائے تو کوئی روکنے والا ہی نہیں ہوتا۔"

"سچ کہہ رہا ہوں، بڑی خوشی ہوئی دیکھ کر کہ کوثر جہاں آہستہ آہستہ راستے پر واپس پلٹ رہی ہے۔ تم بھی ذرا خیال رکھو۔ دودھ دینے والی گائے کی لات کھا لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔"

"تو تمہارا بھی یہی خیال ہے غلام شاہ کہ بات بن رہی ہے۔"

"ہاں...... وہ مرغا تو حلال ہو گیا۔" غلام شاہ نے گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کچھ پتہ چلا ہے کیا چیز ہے؟" شمشیرہ بیگم نے رازداری سے پوچھا۔

"ابھی تو کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ معلوم ہو ہی جائے گا۔"

"کیسے؟"

"ہم تو اپنا فرض پورا کرتے ہیں۔ یاد نہیں، نیچے اتر گئے تھے اور پتہ پوچھا تھا ان سے۔ کہنے لگے آج پھر آئیں گے۔ پتہ پوچھ کر کیا کرو گے۔"

"ارے واقعی...... پھر تو کام ہو گیا۔"

"اور بات بھی پتہ چل گئی کہ یہ حاجو کی جیب میں نوٹ کہاں سے نظر آ رہے ہیں۔" غلام شاہ بولا۔

"فالتو باتیں مت کرو۔"

"تم دونوں تو اکبر بادشاہ کے دربار میں ہوتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ تمہارے سامنے ملا دوپیازہ اور بیربل کو کان سے پکڑ کر نکال دیا جاتا۔"

"ارے ہم کیا ہماری اوقات کیا۔ ویسے یہ راجہ شرافت علی رئیس معلوم ہوتے ہیں۔"

"یہاں آنے والے رئیس ہی بن کر آتے ہیں۔ اب دیکھو، ہاتھ تو ڈالا ہے، کیا بات بنتی ہے۔"

"کوثر جہاں سے بات ہوئی؟"

"نہیں...... میں تو بس کان دبا کر رہتی ہوں۔ ذرا سی دیر میں آگ بگولہ ہو جاتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ ذرا خاموش رہوں، دیکھوں تو سہی آگے کیا قدم بڑھاتے ہیں۔"

غلام شاہ نے حاجو کو آنکھ ماری تھی اور حاجو برا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ کوثر جہاں بھی ان دنوں تر و تازہ نظر آنے لگی تھی۔ اب شمشیرہ بیگم کو کیا معلوم تھا کہ ڈیرے پر کیا بات ہوئی تھی۔ ویسے اس کے بعد سے شاہ جی کا رویہ بھی ذرا نرم ہو گیا تھا۔ یہ ساری باتیں تھیں۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ راجہ شرافت علی کیا چیز نکلتے ہیں۔

اس شام بھی معمول کے مطابق محفل سجی۔ ہال کمرہ درست ہو گیا۔ ساز سنبھل گئے۔ حاجو دھلا ہوا کرتا پاجامہ پہن کر میدان میں اتر آیا۔ غلام شاہ نے طبلوں کی ساری کلیں درست کیں۔ غزالہ اور شبانہ تیار ہو کر محفل میں آ بیٹھیں۔ کوثر جہاں اس وقت آتی تھی جب محفل شباب پر آ چکی ہوتی تھی۔ شمشیرہ بیگم کی عظیم الشان پٹاری کھل گئی تھی۔ پان تیار تھے۔ چاندی کے ورق میں لپٹے ہوئے۔ خود شمشیرہ بیگم رونق محفل ہوا کرتی تھیں۔ لباس ہمیشہ اعلیٰ سے اعلیٰ استعمال کرتی تھیں۔ سارے آداب سے واقف تھیں۔ غرض یہ کہ محفل کا آغاز ہوا۔ یہ خاص انتظام راجہ شرافت ہی کے لئے کیا گیا تھا۔

بہر حال محفل سجنے لگی۔ روز کے شوقین ان میں بہت سے تو ایسے تھے جو صرف دعاؤں سے کام چلاتے تھے لیکن اس سے بھی شمشیرہ بیگم کا کام چلتا تھا۔ نئے نئے لوگوں کو گھیر کر لاتے تھے۔ سو آج بھی کچھ نئے چہرے رونق محفل ہوئے اور شمشیرہ بیگم نے ان کا اس طرح استقبال کیا جیسے یہ محفل آج تک ان کے بغیر سونی پڑی رہی ہو۔ تعارف کی رسمیں ادا ہوئیں۔ یہ محفل عام نہیں تھی۔

بہر حال شبانہ نے غزل چھیڑی۔ غزالہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے رقص کے بھاؤ بتائے اور سلیقے سے اس محفل کا آغاز ہو گیا۔ جن لوگوں نے کوثر جہاں کو نہیں سنا تھا وہ شبانہ ہی کی آواز کے دلدادہ ہو گئے۔ نوٹ برسنے لگے۔ شمشیرہ بیگم کی دلی خواہش تھی کہ ان لڑکیوں میں سے کوئی ایسی نکل آئے جو اس محفل کو سنبھالنے کی صلاحیت پیدا کر لے۔ شبانہ بہت اچھا گا رہی تھی۔ اس کی آواز میں بھی سوز تھا لیکن فطرت میں شوخی۔ کبھی کوئی سنجیدہ غزل اس سے نہ

گائی جاتی۔ جب محفل کو طرب کی ضرورت ہوتی تو عموماً اسی سے گوایا جاتا۔ ہاں جب کوثر جہاں غزل سرا ہوتی تو کیفیت دوسری ہو جایا کرتی تھی اور یہ کیفیت صرف صاحب دل افراد کے لئے ہوتی تھی۔ کئی غزلیں پیش کی گئیں، فرمائشیں ہوئیں، پھر اچانک ہی راجہ شرافت علی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ تین افراد ساتھ تھے۔ ابھی تک ان کے بارے میں کوئی صحیح صورتحال سامنے نہیں آئی تھی۔ چہرے کی بناوٹ بتاتی تھی کہ سخت گیر فطرت کے مالک ہیں۔ لباس بہت ہی اعلیٰ ہوتا تھا۔

بہر حال شمشیرہ بیگم نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ وہ خصوصی جگہ جو ان کے لئے خالی رکھی گئی تھی وہ پُر ہو گئی اور شمشیرہ بیگم خود ان کے پاس آ بیٹھیں۔

''کچھ دیر ہو گئی۔''

''ہاں شمشیرہ بیگم! لاہور میں اتنی مصروفیات ہیں کہ پیچھا ہی نہیں چھٹتا۔ حالانکہ جی بڑا چاہتا تھا کہ جلد پہنچ جائیں۔ یہاں تو محفل خوب شباب پر ہے۔''

''لیکن وہ نظر نہیں آ رہیں۔''

''پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔ پیغام بھیجا تھا میں نے۔ کہنے لگیں کہ راجہ صاحب کو آ جانے دیں۔''

''اوہو...... اچھا، بڑی بات ہے۔''

پھر کچھ دیر کے بعد کوثر جہاں کمرے میں داخل ہوئی۔ بال بال موتی پروئے ہوئے تھے، قیامت کا سماں پیش کر رہی تھی۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی مانند تھی۔ سلیقے سے اندر داخل ہو کر جھکی اور اہل محفل کو آداب کیا۔ پھر شمشیرہ بیگم بھی کرسی پر جا بیٹھی۔ راجہ صاحب گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ کوثر جہاں کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی تھی جس سے اہل محفل کو یہ خیال ہو کہ وہ خصوصی طور پر راجہ صاحب کی شخصیت میں دلچسپی لے رہی ہے۔ آخر کار اس نے پہلی غزل کا آغاز کیا اور وہ لوگ جواب تک صرف شبانہ کو سنتے رہے تھے، دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ گئے۔ خوبصورت تلفظ، خوبصورت ادائیگی۔ محفل میں سناٹا پھیل گیا۔ صرف کوثر جہاں کی آواز تھی جو فضا پر اپنا راج قائم کئے ہوئے تھی۔

غزل ختم ہوتے ہی اہل محفل پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ فرمائشوں کے انبار لگ گئے۔ کوثر جہاں نے گردن خم کر کے شکریہ ادا کیا۔ بار بار آداب کرتی رہی۔ شمشیرہ بیگم کی خوشی آسمان پر پرواز کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کی رونقیں واپس آتی جا رہی تھیں اور یہ کوٹھا پھر ہیرا منڈی میں ممتاز ہو چکا تھا۔

کوثر جہاں ایک کے بعد دوسری غزل گاتی رہی۔ پھر جب وہ تھک گئی تو غزالہ کو صورتحال پیش کی گئی۔ غزالہ کی غزل کے ساتھ ہی شمشیرہ بیگم نے محفل کے اختتام کا حکم دیا۔ وقت بھی ہو گیا تھا۔ محفل بے مثال تھی۔ آخر کار راجہ شرافت علی نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔

''کیا آپ بھی جا رہے ہیں راجہ صاحب؟''

''حکم فرمایئے۔''

''کچھ دیر ٹھہرتے۔ کوثر جہاں شاید آپ کو روکنا چاہتی ہے۔''

''جی راجہ صاحب! اگر زحمت نہ ہو تو آیئے ہمارے ساتھ۔ کچھ اپنے اور کچھ آپ کے بارے میں باتیں ہو جائیں۔'' کوثر نے نغمہ بار آواز میں کہا۔

''آپ کی دعوت ہو اور ہم اسے قبول نہ کریں۔''

''کوثر جہاں! راجہ صاحب کو ذرا کھلی ہوا میں لے جاؤ۔ کھلاؤ، پلاؤ۔ مہمان بڑے نفیس لگ رہے ہیں یہ۔ پھر ہم بھی ان سے بات چیت کریں گے۔ اب تو راجہ صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔''

شرافت علی خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اپنے دوستوں کو واپس بھیجتے ہوئے اس نے کہا۔ ''آپ لوگ جایئے...... ہم ذرا رکیں گے۔''

''ٹھیک ہے...... ہم کار چھوڑے جا رہے ہیں۔ یہ چابی رکھ لیجئے۔'' دوستوں نے کہا۔

راجہ شرافت علی نے چابی ان سے لی اور پھر کوثر جہاں کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ شمشیرہ بیگم پُر مسرت انداز میں انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور سرگوشی کے انداز میں بولیں۔

''میرے مولا! میری جو دو کوٹھیاں نکل گئی ہیں ان دونوں کی واپسی کرا دے۔''

کوثر جہاں، راجہ شرافت علی کو لئے ہوئے اسی کمرے میں آئی جہاں بالکونی سے سرد ہواؤں کے جھونکے اندر آتے تھے۔ اس نے انہیں بیٹھنے کی پیشکش کی اور راجہ صاحب بیٹھ

گئے۔

''ہم سمجھے نہیں کوثر جہاں کہ ہماری یہ خصوصی عزت افزائی کس لئے ہے؟''

''آپ سے کچھ باتیں کرنے کو جی چاہا سو آپ کو یہ زحمت دی۔''

''نہیں، زحمت کی کیا بات ہے۔ کہئے آپ کے کیا مزاج ہیں؟''

''آپ فرمائیے، کیا پینا پسند کریں گے؟''

''نہیں...... ضرورت نہیں ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ اس قدر حسین غزلیں گانے کے علاوہ اس وقت آپ کے کیا کیا مشاغل ہیں؟''

''ہمارے بھلا کیا مشاغل ہو سکتے ہیں۔ اصل میں ہمیں آپ کی صورت کچھ ایسی آشنا لگی کہ کل بھی ہم نے آپ کے لئے پیغام بھیج دیا۔''

''ہماری صورت آشنا لگی؟''

''ہاں...... کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جو ایک ہی نگاہ میں اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔ پتہ نہیں آپ ہمیں بھول گئے یا تجاہل سے کام لے رہے ہیں آپ پہلے بھی تو اس کوٹھے پر آئے تھے۔''

''پہلے......؟'' راجہ شرافت نے پیشانی پر شکنیں ڈال کر سوچتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں...... تقریباً بارہ ساڑھے بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ ماہ اوپر نیچے ہو گئے ہوں۔ بھئی واہ...... کیا یادداشت ہے آپ کی۔ آپ کو یہ یاد رہا کہ ہم بارہ سال پہلے بھی یہاں آچکے ہیں۔''

''آپ بتائیے، ہم نے غلط سوچا؟''

''نہیں، جھوٹ نہیں بولیں گے، اللہ کو منہ دکھانا ہے۔ کوٹھوں کی تماش بینی میں تو عمر ہی گزر گئی ہے۔ پاکستان کا کون سا شہر ہے جہاں کے کوٹھے ہم نے نہیں دیکھے۔ نہ صرف پاکستان بلکہ لکھنؤ، بریلی، آگرہ، جہاں جہاں نامور گانے والیاں موجود ہیں وہاں راجہ شرافت کا نام ناشناس نہیں ہے۔ جہاں سے دل چاہے معلوم کرلیں۔ یہاں ہیرا منڈی میں بھی آتے رہے ہیں اور بارہ سال پہلے ہی نہیں، اس سے بہت پہلے بھی آتے رہے ہیں۔''

''ہمارے ہاں تو آپ شاید صرف ایک ہی بار آئے تھے۔''

''اسی لئے ذہن سے نکل چکا ہے...... یقیناً آئے ہوں گے۔''

''اور اس وقت ہم نے آپ کے سامنے غزلیں بھی پیش کی تھیں۔''

''بلاشبہ آپ نے ٹھیک جانا۔ ہم کاروباری مسئلوں میں الجھے رہتے ہیں اور جب روح کی شگفتگی کی ضرورت ہوتی ہے تو آپ لوگوں کے سائے میں پناہ لیتے ہیں۔''

''جب آپ آئے تھے تو آپ کے ساتھ کچھ اور افراد بھی تھے۔''

''کیوں نہیں...... دوست احباب کے بغیر تو محفلیں بے مقصد ہی ہو جایا کرتی ہیں۔''

''ان میں ایک صاحب تھے جن کا نام میں نہیں جانتی۔ شاید آپ کے ذہن میں ہو۔''

راجہ شرافت علی ہنس پڑے، پھر بولے۔ ''بہت سے دوست، بہت سے احباب...... پتہ نہیں آپ کس کی بات کر رہی ہیں۔ اگر نام آپ کو یاد ہوتا تو شاید ہمیں بھی یاد آجاتا۔''

''وہ آپ کے دوست نہیں تھے؟'' کوثر جہاں کی آنکھوں کی روشن قندیلیں بجھنے لگیں۔

''ضرور دوست ہوں گے...... بس جب ایسی جگہوں کا رخ کیا جاتا ہے تو شناسا بھی دوستوں ہی کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ہمارے کسی دوست کے دوست ہوں۔ ہمارے ذاتی دوست نہ ہوں۔''

''آپ کو یاد ہے راجہ صاحب! کہ اس وقت آپ کن کن دوستوں کے ساتھ رہا کرتے تھے؟''

''دس بارہ سال پہلے یہاں لاہور میں حاجی الیاس تھے، جاوید صاحب تھے، نواب منصور تھے۔ ایک اور صاحب تھے جن کا نام غالباً ظہیر الدین تھا۔ صحیح یاد نہیں ہے سب کچھ۔''

''کیا اب بھی آپ ان لوگوں سے ملے۔ میرا مطلب ہے......''

''ہو سکتا ہے...... مگر بات وہی آجاتی ہے نا۔''

''اور ظہیر الدین صاحب؟''

''ظہیر الدین غالباً شیخوپورہ کے بڑے زمینداروں میں سے تھے۔ بڑے اچھے تماش بین آدمی تھے۔ مگر اسی وقت ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہم ولایت چلے گئے۔ پھر کچھ پتہ نہیں چل سکا ان کا۔''

''ظہیر الدین صاحب کیا اب بھی شیخوپورہ ہی میں رہتے ہیں؟''

''ہم نے عرض کیا نا کہ اس کے بعد ہماری معلومات بالکل نہیں رہیں۔ ویسے وہ وہاں

کے بہت بڑے جاگیردار اور پشتنی ہیں۔ تقسیم سے بہت پہلے سے ان کا خاندان وہاں موجود ہے۔ انہوں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی ہو گی۔ مگر آپ ان لوگوں کے بارے میں اتنی تفصیلات کیوں معلوم کر رہی ہیں؟''

''یونہی...... جن شناساؤں سے عرصے کے بعد ملاقات ہو جائے ان سے باتیں کرنے کو جی تو چاہتا ہی ہے۔''

''جی، جی...... بہرحال مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکا۔ دراصل وہی نام والی بات آ جاتی ہے۔ نام پتہ چلتا تو شاید کچھ یادداشتیں زندہ ہو جاتیں۔ خیر چھوڑیئے اب ان کی باتیں۔ ہماری باتیں کیجئے۔ یہ بتایئے ہمارے لئے کیا حکم ہے؟''

''آپ یقین کیجئے راجہ صاحب! ہر دل میں کچھ امنگیں، کچھ خواہشیں ہوتی ہیں۔ بس آپ کا چہرہ شناسا لگا اور یادداشت پر زور دیا تو پتہ چلا کہ آپ ضرور یہاں آئے ہوں گے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ دل نے چاہا کہ آپ سے ملیں۔''

''چلئے ٹھیک ہے...... آپ کا دل شاد ہو گیا، اتنا ہی کافی ہے۔''

''اب تو آپ کچھ پی لیجئے۔''

''نہیں، جو ہماری ضرورت تھی آپ کے سامنے کر دی۔ جو کچھ پئیں گے ان آنکھوں سے پئیں گے۔ ہاں اگر اجازت ہو تو آج آپ کے ساتھ طویل نشست ہو جائے۔''

''گانے کا وقت تو ختم ہو گیا ہے۔ کل حکم دیں گے تو خدمت کروں گی۔''

''کیا مطلب...... ہم یہاں قیام نہیں کر سکتے؟''

''ضرور کر سکتے ہیں...... مگر بے مقصد ہو گا۔ میرا مطلب ہے اب آپ کی آواز سے تو خدمت نہ کر سکوں گی۔''

''آواز کی خدمت تو ہو چکی۔ اب تو بس آپ کے ساتھ کچھ وقت گزاریں گے اور اس کے بعد اجازت طلب کر لیں گے۔''

کوثر جہاں ایک لمحے کے لئے کچھ بوکھلا سی گئی۔ ذہن میں تو کچھ اور ہی تھا لیکن یہ راجہ صاحب تو پکے آدمی نکلے۔ تاہم اس نے خود کو سنبھال لیا اور بولی۔

''میں جلدی سونے کی عادی ہوں...... رات کو دیر تک جاگ نہیں سکتی۔ آپ سے یونہی دل چاہا تھا باتیں کرنے کو سو پیغام دے دیا۔''

''آپ کا مقصد کیا ہے...... کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔'' شرافت علی نے کہا۔

''بس کچھ لوگوں سے خوامخواہ کی اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے یہ یاد آیا تھا، کچھ عرصے پہلے ہماری آپ کی ملاقات ہوئی۔ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ آپ وہی ہیں۔''

''اور اس کے لئے آپ نے اتنا اہتمام کیا، کئی سازندوں کو نیچے بھیجا اور ان سے فرمائش کرائی کہ آج آئیں۔ اور یہاں آئے تو ہم نے محسوس کیا کہ بڑا خصوصی اہتمام ہے ہمارے لئے۔ اور اس کے بعد آپ اس بے اعتنائی کا اظہار کر رہی ہیں۔ دیکھئے کوثر جہاں بیگم! بات اصل میں یہ ہے کہ بہت کم لوگ ہمیں پسند آتے ہیں اور جب پسند آتے ہیں تو ہماری ملکیت بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور اتفاق سے آپ ہمیں پسند آ گئی ہیں۔ یہ بے رخی کی گفتگو ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''میں نے اپنے دل کی بات آپ پر بیان کر دی۔''

''اتنا ہی سا مسئلہ تھا کہ آپ ہم سے تھوڑی دیر باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ گویا ہم آپ کے خادم ہوئے کہ آپ نے ہمیں حکم دیا اور اب دوسرا حکم دے رہی ہیں کہ ہم واپس جائیں۔''

''نہیں...... میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں؟ آپ کے قدموں میں بیٹھی رہوں گی۔ آپ صرف اتنا بتا دیجئے کہ اور کیا خدمت کروں؟''

''کون سی، بات اب اپنی زبان سے کہیں۔ یہ بتایئے آپ۔ آپ کے ساتھ وقت گزاری چاہتے ہیں اور اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں۔ آن بان والے ہیں، کبھی کوئی فیصلہ کیا تو اس سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹے۔''

''میں آپ سے پہلے ہی عرض کر چکی ہوں راجہ صاحب کہ میں صرف آواز سے آپ کی خدمت کر سکتی ہوں۔''

''کمال کی بات ہے کوثر جہاں بیگم! بیٹھی ہیں آپ کوٹھے پر اور باتیں کر رہی ہیں آپ پارساؤں جیسی۔ آواز سے تو خدمت ہو چکی۔ آپ نے آخر ہمیں تنہائی میں بلایا تھا۔''

''بار بار عرض کر کے کچھ افسوس سا ہوتا ہے کہ آپ کچھ سمجھ نہیں پا رہے۔''

''آپ اپنے مطلب کی باتیں کیجئے کوثر جہاں بیگم! کسی عبادت گاہ میں نہیں بیٹھی ہوئی ہیں آپ۔''

"وہ تو آپ نے درست فرمایا لیکن......"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ قیمت بڑھا رہی ہو اپنی۔ بولو، کیا چاہیے؟ تم کیا سمجھتی ہو...... راجہ شرافت علی ہے میرا نام۔ کیا چاہیے، جواب دو۔ جو کہو گی منہ پر مار دیں گے۔"

"خادمہ ہوں آپ کی۔ بس آپ سے اجازت چاہتی ہوں کہ مجھے سونے کی اجازت دیں۔"

"گویا ہم جائیں؟"

"جی......" کوثر جہاں سرد لہجے میں بولی۔

"میرا خیال ہے آپ نے اچھا نہیں کیا۔ بات کیونکہ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی اب تک اس لئے ہم نے اپنے ذہن کو قابو میں رکھا ہوا ہے۔ ورنہ اتنی بات پر تو بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ ہم آپ سے پھر کہہ رہے ہیں جو دل میں ہے، بیان کریں۔"

"آپ جا سکتے ہیں راجہ صاحب!" کوثر جہاں کا لہجہ انتہائی درجے سرد ہو گیا۔

"ہوں...... اور کوئی بات نہیں۔ ایک مشغلہ دے دیا ہے آپ نے ہمیں۔ ہم بھی راجہ شرافت علی خان ہیں۔ اگر آپ اپنی قیمت بڑھانا چاہتی ہیں تو اپنی زبان سے کہہ دیجئے۔ ورنہ ان سے باتیں کر لیں گے جو آپ کی سرپرست ہیں اور اگر آپ ہم سے گریز کر رہی ہیں تو اب یہ گریز آپ کے لئے ممکن نہیں ہو گا۔ انسان کو انسان شناس ہونا چاہئے۔"

"جی خدا حافظ...... جائیے......" کوثر جہاں نے کہا اور راجہ شرافت علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ کھڑے ہوئے خونی نگاہوں سے کوثر جہاں کو دیکھتے رہے۔ پھر تیز تیز قدموں سے واپس پلٹے اور بڑے ہال میں آ گئے۔ سب لوگ جا چکے تھے۔ ساز تقریباً لپیٹے جا چکے تھے۔ حاجو سارنگی کی ناز برداریاں کر رہا تھا۔ شمشیرہ بیگم راجہ شرافت علی کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ پھر مسکرا کر بولیں۔

"ارے ارے...... راجہ صاحب کہئے، خیریت...... کسی شے کی حاجت ہے؟"

"آپ کا نام شمشیرہ بیگم ہے نا؟"

"جی جی...... خیریت؟"

"یوں لگتا ہے شمشیرہ بیگم کہ آپ لوگوں نے ہماری بے عزتی کا کوئی منصوبہ بنایا تھا۔"

"جی......؟" شمشیرہ بیگم کا منہ بھاڑ سا کھلا رہ گیا۔

"جی۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں راجہ صاحب؟ ہم اور آپ کی بے عزتی کریں۔ آپ ہی کے دم سے تو یہ کوٹھے آباد ہیں اور کوٹھے پر راجہ صاحب کی بے عزتی ہو۔ لیکن براہ کرم ہمیں یہ تو بتائیے کہ ہوا کیا؟"

"وہ آپ کی کوثر جہاں بیگم بتاتی ہیں کہ جلدی سو جانے کی عادی ہیں اور صرف آواز سے ہماری خدمت کر سکتی ہیں اس سے آگے کچھ ناممکن ہے۔ لیکن ناممکن ہی کو ممکن بنانا ہمارا شوق ہے شمشیرہ بیگم! ہم تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ کوثر جہاں بیگم اپنی قیمت بڑھا رہی ہیں۔ ان کی قیمت آپ بتائیے۔"

شمشیرہ بیگم کا دل دھک سے ہو گیا...... اتنی دیر میں نجانے کیا کیا خواب دیکھ ڈالے تھے لیکن اب یہ خواب ایک دم ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ انہوں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"لگتا ہے کوثر جہاں پاگل ہو گئی ہے...... میں بات کرتی ہوں۔" شمشیرہ بیگم اپنی جگہ سے اٹھیں تو راجہ صاحب جلدی سے بولے۔

"ابھی نہ کریں...... کل دن میں آرام سے بات کر لیں۔ ہم بھی جلد بازی کے عادی نہیں ہیں۔ اس طرح خواہ مخواہ بات بڑھ جائے گی۔ کیا فائدہ؟ اور کل کی محفل صرف ہمارے لئے ہونی چاہئے۔ آپ معاضہ سوچ لیجئے دل میں۔ جو کچھ کہیں گی پیش کر دیں گے۔"

"راجہ صاحب! آپ کل ضرور تشریف لائیے، میں آپ کو دعوت دے رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، چلتے ہیں...... لیکن ایک خیال رکھئے گا۔ ہم نے اپنے طور پر کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ کل آئے تھے، گانا سن کر چلے گئے۔ بلایا گیا ہمیں، پیغام بھجوایا گیا، یہ جو چھوٹا سا آدمی پھدک رہا ہے یہ نیچے پہنچا تھا۔ پوچھئے اس سے، کہا تھا اس نے ہم سے یا نہیں؟" راجہ صاحب نے حاجو کی طرف اشارہ کیا۔ الفاظ ایسے استعمال کئے تھے کہ حاجو غصے میں آ گیا۔ راجہ صاحب نے کہا۔

"پوچھئے ان سے۔"

"ہاں...... ہم گئے تھے۔ لیکن یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... ذرا زبان سنبھال کر گفتگو

کیجیے۔"

"سب بگڑے ہوئے ہیں...... دیکھ لوں گا ایک ایک کو۔ تم لوگوں نے خود ہی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے۔ اب اس کے بعد نتائج کا انتظار کرنا۔" راجہ صاحب تیزی سے مڑے اور سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔ شمشیرہ بیگم ارے ارے کرتی رہ گئیں۔ حاجو میاں اس دوران کئی بار پھدک چکے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"اجی چھوڑیئے شمشیرہ بیگم! بدتمیز آدمی لگتا ہے۔ کوٹھے پر آنے والے تو لچے لفنگے بھی اپنے آپ کو تیس مار خاں ہی سمجھتے ہیں۔ جانے دیجیے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے حاجو! یہ کوثر جہاں نے پھر وار کر دیا میرے سینے پر...... کیوں آخر...... یہ سب کیا ہے؟ ارے تم لوگ آخر کرو گے کیا؟ کوثر جہاں...... اے کوثر جہاں!" شمشیرہ بیگم غصے سے پھنکارتی ہوئی باہر نکل آئیں۔ یہ تو وہی مثال ہوئی کہ الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ راجہ شرافت علی کا تو شرافت سے کوئی تعلق نہ نکلا۔ ویسے ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا اس کی حالت تو ایسی ہی ہونی چاہیے تھی۔ ایک بار پھر شمشیرہ بیگم کے دل کو آس لگی تھی لیکن ایسی تقدیر کہاں۔ بہرحال وہ دہاڑتی رہیں اور کوثر جہاں کے نزدیک پہنچ گئیں۔

"کیا ہوا...... کیا ہوگیا کوثر جہاں...... یہ راجہ شرافت علی انگارے چباتے کیوں گئے ہیں؟"

"گھٹیا انسان تھے اماں! شکل وصورت سے اتنے گھٹیا نہیں لگتے تھے مگر اندر سے بڑے گندے نکلے۔"

"ہوا کیا؟"

"اماں! شکل سے ذرا ڈھنگ کے لگے تھے، میں نے سوچا کچھ باتیں کروں۔ ہوسکتا ہے تمہاری آرزو پوری ہو جائے۔"

"تو پھر......؟" شمشیرہ بیگم بولیں۔

"مجھے تو ننگے لگتے تھے۔ اوپر کی ٹیپ ٹاپ ہے، اندر سے کچھ بھی نہیں۔ ذرا سی دیر میں پھسل گئے جیسے کوئی برف پر سے پھسل جاتا ہے اور لگے بے تکی باتیں کرنے۔ اب تم خود سوچو اماں! کیا ہم لوگ اتنے ہی گھٹیا ہیں کہ یہاں ایسے ویسے آنے لگیں؟"

"یہ کوٹھا ہے کوثر جہاں! ہر طرح کے لوگوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مگر تم نے ذرا ڈھنگ کی سنائی کہ وہ ننگے بھوکے ہیں...... آخر کیا کہہ رہے تھے؟"

"اماں! ساری باتیں ابھی بتا دوں آپ کو...... میں نے یہ سوچا تھا کہ ذرا ڈھنگ کے آدمی ہوں گے۔ تھوڑے دن تک آنا جانا رہے گا۔ ہوسکتا ہے تمہارا ہی کوئی کام بن جائے۔ مگر وہ اچھے آدمی نہیں تھے اماں!"

"بڑی دھمکیاں دے کر گئے ہیں کوثر جہاں!"

"اماں! یہاں تو سب ہی تیس مار خاں آتے ہیں اور دھمکیاں دے کر چلے جاتے ہیں۔"

"پھر بھی کوثر جہاں! خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

"تو پھر مجھے بتایئے، کیا کروں؟"

"کچھ نہیں...... کل آئے تو بات کروں گی۔" شمشیرہ بیگم نے کہا۔ کوثر جہاں انہیں دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر گردن جھٹکی۔ چہرے پر افسردگی کے آثار پھیل گئے۔ پھر اس کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔

"اپنا ہی جنوں ہے...... غیروں کا کیا قصور۔"

○●○

راجہ شرافت علی خاں اچھے خاصے رئیس آدمی تھے۔ کافی زمینیں تھیں، اچھا کاروبار بھی تھا، والدین کی اکلوتی اولاد تھے اور اکلوتا ہونے کی وجہ سے بری طرح بگڑ گئے تھے۔ باپ کے انتقال کے بعد تو بالکل جنگلی بیل کی مانند ہوگئے تھے۔ ماں بے چاری کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ کبھی خاطر میں نہ لاتے۔ دوسرے اہل خاندان صرف حاشیہ بردار تھے۔ کون انہیں ان کی رنگ رلیوں سے روکتا۔ خاصے بگڑ چکے تھے۔ لچے لفنگوں سے تعلقات تھے۔ پاکستان بھر میں جگہ جگہ مارے مارے پھرتے تھے۔ اول تو زمینوں سے کافی آمدنی تھی اور جائیدادوں سے خوب روپیہ وصول ہوتا تھا۔ ملک سے باہر بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ خوب لٹاتے تھے لیکن شکر تھا کہ ابھی تک بھرم قائم تھا اور ابھی تک کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی جس سے نام ڈوب جائے۔ حالانکہ انہوں نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ کوٹھوں کے رسیا تھے۔ نجانے کہاں کہاں کی طوائفوں سے شناسائی تھی۔ بڑی ملک بھی آتے جاتے

رہتے تھے البتہ مزاج کے اوچھے ہی تھے اور ہمیشہ ایسی حرکتیں کیا کرتے تھے جس سے ناپسندیدہ شخصیتوں میں شمار ہوتے۔ لاہور میں بھی خاصی جان پہچان تھی اور کئی ایسے ساتھی تھے جو ان کے ہم نوالہ، ہم پیالہ تھے۔ البتہ برے لوگوں کے برے ہی ساتھی ہوتے ہیں۔ لاہور کے ایک پوش علاقے میں کوٹھی خریدی ہوئی تھی جس میں ان کے ایک دوست مستقل رہا کرتے تھے۔

بہر حال راجہ شرافت علی خان جو بالا خانوں کی سیر کے رسیا تھے اس وقت کچھ عجیب سے حالات کا شکار ہو گئے تھے۔ کوثر جہاں اچھی خاصی خوبصورت اور پُرکشش عورت تھی۔ وہ انہیں پسند آئی تھی۔ آواز بھی کمال کی تھی اور راجہ شرافت علی خان نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ خاصی رقم لے کر آئے تھے۔ لیکن پھر انہیں کوثر جہاں کا پیغام ملا اور چونکہ یہ پیغام دوستوں کے سامنے ملا تھا اس لئے راجہ شرافت علی خان خوشی سے پھول گئے۔ ان کی پسندیدہ شخصیت نے ان پر توجہ دی تھی۔ دوستوں میں الگ گردن اونچی ہوئی تھی۔ لیکن کوثر جہاں ایک پراسرار شخصیت اختیار کر گئی تھی۔ اس نے اتنی چاہت سے انہیں بلایا اور اس کے بعد جو گفتگو کی وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ سمجھنے سے قاصر رہے تھے لیکن بعد میں جو باتیں ہوئی تھیں انہوں نے غصے سے دیوانہ کر دیا تھا۔ یہ بات تو ذہن میں آئی ہی نہیں تھی کہ کوثر جہاں نے انہیں چالاکی سے اس لئے بلایا تھا کہ وہ ایک نام کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھی جو خود اسے بھی یاد نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوثر جہاں نے اپنی ذہانت سے راجہ شرافت علی خان کو اپنا مقصد نہیں سمجھنے دیا تھا۔ بہر حال وہ اسے دھمکیاں دیتے ہوئے واپس آ گئے تھے۔ پھر وہ اپنی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ ان کے دوست جاگ رہے تھے۔ ان میں ایک خاص آدمی نواب دین تھا۔ اس نے حیرانی سے راجہ شرافت علی کو دیکھا اور کہا۔

"ارے اتنی جلدی؟"

"ہاں......"

"کیوں، کوئی بات نہیں ہوئی کیا؟"

"سو جاؤ نواب دین! دماغ مت خراب کرو۔" راجہ شرافت علی نے کہا اور نواب دین تعجب بھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

راجہ شرافت علی لباس تبدیل کر کے لیٹ گئے لیکن نواب دین جب تک جاگتا رہا یہ

دیکھتا رہا کہ وہ کروٹیں بدل رہے ہیں۔ صبح بھی راجہ صاحب کا چہرہ اُترا اُترا سا تھا۔ اس وقت ان کے ایک اور دوست حیات خان نے کہا۔

"رات کو سنا ہے تم بہت جلدی واپس آ گئے تھے۔"

"ہاں۔"

"کیوں، کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

"یار کوئی عجیب سی بات ہوئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔" راجہ صاحب نے آخر کار دوستوں کو رازدار بنا لینا ضروری سمجھا۔

"خیر تو ہے...... کیا ہوا؟" حیات خان نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔

"بس کچھ عجیب سی صورتحال رہی۔ جس کے بارے میں، میں خود کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی اصلیت کیا تھی۔"

"آخر کار کیا ہوا؟"

"اس حرام زادی نے میری بے عزتی کر دی۔ وہی جس نے مجھے روکا تھا۔ مگر میں جانتا ہوں اچھی طرح۔ قیمت بڑھا رہی ہے...... اپنی دانست میں میری آتش شوق کو بھڑکا رہی ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ میں نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے...... اسے کیا خاطر میں لاؤں گا۔ لیکن اب بات آن پر آ گئی ہے۔ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔"

"کیا؟" نواب دین نے پھر درمیان میں دخل دیا۔

"خریدوں گا اسے...... اور خریدنے کے بعد میں اس کے منہ پر تھوکوں گا۔"

دوست جمع ہو گئے تھے اور طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔

"اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اس نے ایسا کیا کیوں؟"

"میں اسی کے منہ سے پوچھوں گا...... میرا بھی یہ آخری فیصلہ ہے۔"

"ہاں ہاں...... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ مگر یہ بتاؤ کرو گے کیا؟"

"تم بے فکر رہو۔ جو کچھ بھی کروں گا تمہارے سامنے ہی کروں گا۔"

بہر حال طے یہ پایا کہ شام کو پھر شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر جایا جائے۔ نوٹوں کی گڈیاں جیبوں میں بھر لی جائیں اور منہ مانگی قیمت پر کوثر جہاں کو ایک یا ڈیڑھ ہفتے کے لئے خرید لیا

جائے۔ دوستوں نے ایک رہائش گاہ بھی پیش کر دی تھی جو خالی پڑی ہوئی تھی۔ بہر حال شام پانچ بجے تمام تر تیاریاں مکمل کرنے کے بعد یہ لوگ ہیرا منڈی چل پڑے۔ کار ایک جگہ روک لی اور سب کے سب ہیرا منڈی میں شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کا فاصلہ طے کرنے لگے۔ ابھی یہاں رونقوں کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ چاروں طرف تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اتفاق سے حاجو میاں بیچ میں مل گئے اور راجہ شرافت علی نے ان کو روک لیا۔

”سنو، کیا نام ہے تمہارا...... پہچان لیا نا مجھے؟“

”حضور کیسی باتیں کر رہے ہیں...... آپ جیسی بڑی شخصیت کو نہ پہچانیں گے؟“

”کچھ بات کرنی ہے آپ سے۔“

”جی فرمائیے۔“

”یہ کوثر جہاں کس طرح کی عورت ہے؟“

”بہت اچھی طرح کی عورت ہے...... کیوں کیا ہوا ہے؟“

”کیا وہ پاگل ہے؟“ راجہ شرافت علی خان نے کہا اور حاجو حیرت سے منہ دیکھنے لگا پھر بولا۔

”خدا نہ کرے...... ایسی بری باتیں منہ سے نہ نکالئے۔ اس کے دم سے تو ہیرا منڈی کی رونق ہے۔“

”اسی لئے غالباً وہ بہت مغرور ہو گئی ہے۔“

”نہیں جناب...... غرور تو ان میں نام کو نہیں ہے۔ کوئی ناراضگی ہو گئی کیا؟“

”کیا کر رہی ہے اس وقت؟“

”کچھ نہیں...... ابھی کیا وقت ہوا ہے۔ آرام کر رہی ہوں گی۔“

”اور شمشیرہ جہاں کیا کر رہی ہے؟“

”اگر حضور کا حکم ہو تو آنے کی اطلاع دوں؟“

”آؤ......“ راجہ شرافت علی نے کہا اور حاجو کو لے کر چل پڑے۔ پھر انہوں نے انہیں کمرے میں لا کر بٹھا دیا۔ شمشیرہ بیگم کو اطلاع دی گئی اور شمشیرہ بیگم آئیں تو انداز وہی تھا۔ چہرے پر پھول کھلے ہوئے تھے، دانت نکلے ہوئے تھے۔ راجہ صاحب کے سامنے بڑے احترام سے آئیں اور بولیں۔

”آپ کی اس وقت آمد میرے لئے بڑی خوشی کا باعث ہے۔ لیکن پریشان بھی ہوں۔ خیر تو ہے؟“

”جی، جی...... آپ کا نام شمشیرہ بیگم ہے ناں؟“

”لیجئے، کچھ عجیب انداز سے پوچھ رہے ہیں۔ خیریت؟ کوئی شک ہو گیا ہے کیا ہم پر؟“

”آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”جی، جی...... حکم فرمائیے۔“

”یہ کچھ رقم ساتھ لائے ہیں ہم...... مگر جو کچھ ہم کہنے جا رہے ہیں اسے غور سے سن لیجئے۔“

”حضور حکم تو دیں...... کلیجہ نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیں گے۔“

”پرسوں سے ایک دن پہلے ہم یہاں آئے تھے تو آپ کی ان کوثر جہاں بیگم نے ہمیں ان صاحب کے ذریعے پیغام دیا تھا کہ وہ ہم سے ملنا چاہتی ہیں۔ کل ہم تنہائی میں ان سے ملے تو اس نے ہم سے عجیب وغریب باتیں کیں اور...... اس کے بعد ایک طرح سے ہمیں باہر نکال دیا۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا...... اپنی قیمت بڑھانے کے لئے یا پھر......؟“

”توبہ، توبہ شرافت صاحب! وہ دیوانی ہے، بیمار رہ چکی ہے۔ حکیموں کا کہنا ہے کہ دماغ میں تھوڑا سا خلل واقع ہو گیا ہے۔ عام حالات میں تو بالکل ٹھیک رہتی ہے لیکن کبھی کبھی ایسی باتیں کرتی ہے جو اپنوں کی سمجھ میں بھی نہ آئیں۔ میں اس کے لئے آپ سے معافی چاہتی ہوں۔“

”ہمارا خیال مختلف ہے شمشیرہ بیگم! ہمارا خیال ہے کہ وہ اپنی قیمت بڑھانے کی خواہش مند ہے۔ ہم یہ رقم لے کر آئے ہیں۔ گن لیجئے، آپ کی توقع سے بہت زیادہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک ڈیڑھ ہفتے کے لئے اسے ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ ہر طرح کی ضمانت دینے کو تیار ہیں۔ ایک عمدہ قسم کے مکان میں رکھیں گے اسے۔ اور جب یہاں سے لے جائیں گے تو اسے واپس یہاں پہنچا کر جائیں گے۔“

شمشیرہ بیگم سنک گئیں...... نوٹوں کی گڈیوں کو دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں اندازہ لگایا اور اندر ہی اندر خوفزدہ ہو گئی۔ بہت بڑی رقم تھی...... ایک بار پھر بڑی رقم آئی تھی۔ کہیں کوثر

جہاں اس بار بھی کوئی بے وقوفی کا کام نہ کر ڈالے۔ تاہم بولیں۔
"دولت تو آنی جانی شے ہے راجہ صاحب! اصل چیز قدر دانی ہے۔ اور پھر اس کی مجال کہ حضور کی غلامی میں آنے سے گریز کرے۔ میں بات کرتی ہوں اس سے۔"
"شمشیرہ بیگم! اس کی عمر تو اچھی خاصی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دلکشی میں بے مثال ہے۔ خیر آپ بات کیجئے اس سے۔"
شمشیرہ بیگم اٹھ گئیں لیکن باہر نکلتے ہوئے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بات کوثر جہاں کی تھی اور کوثر جہاں ہمیشہ کی سرپھری تھی۔ نجانے کیا کیا کچھ ٹھکرا چکی تھی۔ کہیں یہ نوٹوں کی گڈیاں بھی واپس نہ چلی جائیں۔ ایسے دن رات ذرا کم ہی آتے ہیں جو ایک دن میں اتنا دے جائیں۔ کوثر جہاں اندر موجود تھی۔ تسنیم سو رہی تھی۔ کوثر جہاں کے گنگنانے کی آواز ابھر رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا اس کا موڈ اچھا ہے۔ شمشیرہ بیگم کو دیکھ کر پلٹی اور بولی۔
"خیریت اماں...... کیا بات ہے؟"
"بیٹی ایک بھیک مانگنے آئی ہوں تم سے۔"
"واہ...... ماں، بیٹی سے بھیک مانگے۔ حکم دیجئے کیا بات ہے؟"
"وہ آئے ہیں۔"
"کون؟"
"اے وہی راجہ شرافت علی۔"
"اس وقت...... کیوں خیریت ہے؟"
"ایک بات بتاؤ کوثر! تم نے انہیں کوئی پیغام دیا تھا؟"
"ہاں...... حاجو سے بلوایا تھا۔"
"کیوں؟"
"کچھ پوچھنا تھا ان سے۔"
"مگر وہ تو کچھ اور ہی سمجھے تھے۔"
"مجھے معلوم ہے...... پچھلی رات مجھ سے بکواس کر رہے تھے۔ میں نے اصل بات کی اور ان سے معذرت کر لی۔"
"وہ تو ٹھیک ہے...... مگر دیکھو ناں کوثر جہاں! یہاں جو کوئی بھی آتا ہے نہ جانے کیا کیا

تصورات دل میں لے کر آتا ہے۔ مہمانوں کی خواہشوں کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے...... یہی کوٹھے کی ریت ہوتی ہے۔" کوثر جہاں کا چہرہ آہستہ آہستہ پتھرا گیا اور پھر اس نے سرد لہجے میں کہا۔
"دماغ میں پھر کیڑا کاٹ رہا ہے اماں! تم خود مجھے ٹھیک نہیں رہنے دیتیں، میں کیا کروں؟"
"نہیں کوثر! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ باقی اچھے خاصے آدمی ہیں، آتے جاتے رہیں تو ہمارا بھی کام چلتا رہے۔ دیکھو یہاں آنے والوں کی ضرورتیں ہوتی ہیں، انہیں پورا کرنا پڑتا ہے۔ یہی ہمارا کام ہے۔"
"آپ کے کاروبار کے لئے میں بہت کچھ کر رہی ہوں۔ ہر رات ہی محفل سجاتی ہوں اور اتنا کما کر دیتی ہوں کہ آپ کو مزید کی ضرورت نہ باقی رہے۔ آپ انہیں ٹال دیجئے۔ کہہ دیجئے کہ کوثر جہاں صرف آواز فروخت کرتی ہے، جسم نہیں۔"
"بڑے عجیب و غریب انداز سے آئے ہیں وہ...... مجھ سے یہ سب کچھ کیسے کہا جائے گا۔"
"تو میں خود بات کر لیتی ہوں۔"
"کوئی ترکیب نکالو بیٹی۔"
"جاؤ اماں! مجھ سے اب بکواس مت کرو۔"
شمشیرہ جہاں کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ جوتی اتاریں اور اتنی ماریں اس کے منہ پر کہ منہ لہولہان ہو جائے۔ لیکن کیا کرتیں، مجبور تھیں۔ کوثر جہاں صحیح معنوں میں اس کوٹھے کی رونق تھی اور ان دنوں وہ واقعی تعاون کر رہی تھی۔ اور پھر سب سے بڑا مسئلہ اس اکرام کا تھا جوان شاہ جی کی مصاحبت میں آ کر نجانے کیا سے کیا بن گیا تھا۔ ابھی سوچ ہی رہی تھیں کہ کوثر جہاں نے کہا۔
"تم چلو اماں! میں آ کر اس لفنگے سے خود بات کرتی ہوں...... خود کو کیا سمجھتا ہے۔"
شمشیرہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہنے کے لئے اب رہا ہی کیا تھا...... ٹھنڈی سانس لے کر واپس پلٹیں۔ کمرے میں داخل ہونے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ بہرحال پہنچیں کسی نہ کسی طرح۔ منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کہنے لگیں۔

"راجہ صاحب! اس پر اس وقت پھر دماغی دورہ پڑا ہے۔ حواس میں نہیں ہے۔ خدا کے لئے آپ کوئی بات محسوس نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے شمشیرہ بیگم! آپ یہ رقم قبول کرلیں۔ ہم اسے لے جارہے ہیں، اس کا علاج کرالیں گے۔ ہم بھی آن بان والے ہیں، جو فیصلہ کرلیا اس سے ٹلنے کے نہیں ہیں۔"

راجہ صاحب نے کہا۔ اتنی دیر میں کوثر جہاں کمرے میں اندر داخل ہوگئی۔ چہرے پر تمکنت تھی۔ آنکھوں میں غصے کی جھلکیاں...... ان لوگوں کو دیکھ کر طنز سے مسکرائی۔

"فرمایئے راجہ صاحب! کیسے آنا ہوا؟"

"ہم نے آپ کی اماں سے بات کرلی ہے۔ آپ کو ہمارے ساتھ ایک یا ڈیڑھ ہفتے کے لئے چلنا ہوگا...... یہ رقم پڑی ہوئی ہے جو آپ کی قیمت ہے۔"

"کاغذ کی ان گڈیوں کو جیب میں ڈالئے اور یہاں سے دفع ہو جایئے...... ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں، جسے چاہتے ہیں منہ لگاتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں سر سے اٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ آپ اس قابل نہیں ہیں کہ ہم آپ کو کوئی حیثیت دیں۔ پہلے تمیز سیکھئے، جایئے۔ یہی آپ کے حق میں بہتر ہے۔"

"بڑی شریف زادی بن رہی ہے...... کوٹھے پر پیدا ہوئی ہے، کوٹھے پر ہی رہ رہی ہے۔"

"میں جو کچھ کہہ چکی ہوں وہ شاید آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔"

"زبردستی کروانا چاہتی ہو؟" نواب دین نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"جی...... آپ...... آپ یہ بھی نہ کرسکیں گے۔ آپ جیسے لچے لفنگے چار پیسے لے کر اکثر یہاں آجاتے ہیں اور ایسی ہی شیخیاں ہانکتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ عزت سے واپس چلے جایئے۔ کوٹھے کے دروازے رات کو کھلتے ہیں ہر شخص کے لئے۔ اس وقت ایک سڑک صاف کرنے والا بھی یہاں آسکتا ہے۔ ہماری نگاہوں میں اس کی حیثیت بھی آپ جیسی ہی ہوتی ہے۔ آنا چاہیں تو رات کو آیئے گانا سننے اور شرافت سے واپس چلے جایئے۔ آپ جیسوں کے لئے ہمارے پاس معقول انتظام ہے۔" کوثر جہاں نے کہا۔ شمشیرہ بیگم کلیجہ پکڑے بار بار حسرت بھری نگاہوں سے نوٹوں کی ان گڈیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ سب کی نگاہیں کوثر جہاں کا چہرہ تک رہی تھیں۔

اچانک ہی حاجو زور سے اچھلا اور شمشیرہ بیگم کی گود میں چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ شمشیرہ بیگم نے سر پر دوہتڑ رسید کیا تو غلام شاہ پر جا پڑا۔ غلام شاہ نے اسے بازوؤں میں دبوچ کر ایک جانب کھڑا کردیا۔ حاجو منہ سے کتے کے پلّے کی طرح کوں کوں کررہا تھا اور خوفزدہ نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس انداز پر سب ہی نے دروازے کی طرف پلٹ کر دیکھا، اکرام کھڑا ہوا تھا اور اس وقت جو بات ہورہی تھی اس کے لئے سب سے بڑا خطرہ اکرام ہی تھا اس کا احساس شمشیرہ بیگم کو بھی ہوگیا۔ دل بری طرح پھڑپھڑانے لگا کہ اب کچھ ہونے والا ہے...... ضرور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ لگ رہا تھا کہ اکرام نے نواب دین کی بات سن لی ہے۔ نواب دین اس وقت یہی الفاظ کہہ رہا تھا کہ وہ کوثر جہاں کو چوٹی سے پکڑ کر کھینچ لے جائے گا۔ اکرام کی آنکھوں میں خون کی جھلکیاں نظر آرہی تھیں۔ کوثر جہاں نے بھی اسے دیکھا۔ وہ اس کا بھبھوکا چہرہ دیکھ کر لرز گئی۔ اکرام کی نیلی آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہورہی تھیں۔ ادھر راجہ شرافت علی بھی غصے سے بے قابو ہوگئے تھے۔ جو بے عزتی اس کوٹھے پر ہوئی تھی وہ زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کی تھی انہوں نے۔ وہ جانتے تھے کہ یہاں نوٹ ہی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے اور نوٹوں کے سامنے ساری قوتیں سرد پڑ جاتی ہیں۔ اکرام کی آمد سے جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں وہ کسی سے بھی چھپی نہیں رہی تھیں۔ اس وقت شرافت علی خان کے ساتھ نواب دین اور باقی تین آدمی اور تھے۔ اس نوعمر لڑکے کو دیکھ کر ان پر تو کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ حیرانی کا شکار ہوگئے تھے۔ پھر اکرام آگے بڑھا اور اس کے منہ سے سرد آواز نکلی۔

"اس کوٹھے سے کون حرام کا جنا چوٹی سے پکڑ کر کسے لے جائے گا؟ تم میں سے کون ہے؟" اس نے باری باری ان لوگوں کے چہرے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کون کتیا کا پلّا ہے؟" راجہ شرافت علی نے کہا۔

"کتیا کا پلّا نہیں، بلکہ تمہارا باپ ہوں...... اپنے باپ کو پہچانو حرامی اور سیدھے اس دروازے سے باہر نکل جاؤ ورنہ ناک کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے نیفے سے چاقو نکال لیا۔ چاقو کی کھڑکھڑاہٹ گونجی اور راجہ شرافت علی نے حیران نگاہوں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر بولے۔

"شمشیرہ بیگم! اپنا محافظ بڑا چھوٹا سا رکھا ہے۔ کیا بات ہے، اس کی جان کی دشمن کیوں

ہوئی ہو؟''

راجہ شرافت علی تو یہ باتیں کر رہے تھے لیکن نواب دین اور فضل داد کچھ اور ہی دیکھ رہے تھے۔ اکرام کے ہاتھوں میں چاقو جس طرح گردش کر رہا تھا وہ اس کی مشاقی کا نمونہ تھا اور یہ اندازہ ایک نگاہ میں ہی ہو جاتا تھا کہ لڑکا زبردست چاقو باز ہے۔ اکرام نے کہا۔

''باجی! یہ کتا کس کے لئے یہ بات کہہ رہا تھا...... کیا تمہارے لئے؟''

کوثر جہاں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن آواز نہ نکل سکی۔

''بے غیرت کے بچو! ابھی تک یہاں مر رہے ہو...... باہر کیوں نہیں نکلے۔''

''اگر تیری موت ہی آ گئی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟'' شرافت علی نے غراتے ہوئے کہا اور جیب سے ریوالور نکال لیا...... ریوالور ہمیشہ ان کے پاس ہی رہتا تھا۔ ابھی تک کسی کی جان تو نہ لی تھی لیکن یہ بھی دوسروں کی خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے موقع نہیں دیا تھا ورنہ شرافت علی کے لئے یہ کام بھی مشکل نہیں تھا۔ دولت مند تھے اور دولت کے بل پر اپنا بچاؤ بھی کرنا جانتے تھے۔ لیکن جیسے ہی ریوالور ان کے ہاتھ میں نظر آیا اور اکرام کی طرف سیدھا ہوا! اسی وقت اکرام کے ہاتھ سے چاقو ایک زبردست سنسناہٹ کے ساتھ نکلا اور راجہ شرافت کی کلائی کے عین درمیان میں پیوست ہو گیا۔ راجہ شرافت اپنی بے اختیار چیخ کو روک نہیں سکے تھے۔ ایک لمحے میں ہاتھ بے جان ہو گیا۔ پستول نکل کر نیچے جا گرا لیکن ان میں سے کسی کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ سامنے کھڑا ہوا یہ لڑکا بجلی سے زیادہ پھرتیلا ہے۔ ساتھ ہی اکرام نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور دوسرے ہی لمحے اس نے پستول اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حاجو کے حلق سے مرغے جیسی قیں قیں کی آوازیں نکلیں اور وہ عجیب سے انداز میں اچھل کر ایک سمت جا پڑا۔ ادھر باقی لوگ بھی حیرت زدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ راجہ شرافت علی کی ہتھیلی سے خون کی نالی بہہ رہی تھی اور انہوں نے دوسرے ہاتھ سے اپنی کلائی تھام رکھی تھی۔ نواب دین نے اِدھر اُدھر دیکھا، اکرام نے ریوالور اس پر تان رکھا تھا۔ رحمت خان نے فوراً ہی پسپائی اختیار کی اور کہا۔

''ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ٹھیک ہے ہم شریف لوگ ہیں، طوائفوں کے کوٹھے پر ہلڑ بازی نہیں کر سکتے۔''

مگر اس دوران نواب دین راجہ شرافت علی کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے دانت بھینچ کر چاقو راجہ شرافت علی کی کلائی سے کھینچا اور اسے ایک سمت پھینک دیا۔ اکرام بھوکی نگاہوں سے ان کی ہر جنبش کو دیکھ رہا تھا اور اس کا ہاتھ ریوالور کے ٹرائیگر پر تھا۔ جلدی جلدی گڈیاں سمیٹی گئیں اور اس کے بعد وہ سب ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے وہاں سے نکل گئے۔

شمشیرہ بیگم تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ کوثر جہاں ساکت کھڑی ہوئی تھی۔ غلام شاہ بھی ہکا بکا نظر آ رہا تھا۔ دروازے میں رک کر راجہ شرافت علی نے کہا۔

''شمشیرہ بیگم! تم نے دشمنی کی بنیاد ڈال دی ہے۔ فیصلہ بہت جلد ہو گا......'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ اکرام انہیں مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ شمشیرہ بیگم اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جب وہ لوگ نکل گئے تو ان کے منہ سے لمبی سی ہائے نکلی اور پھر انہوں نے اکرام اور کوثر جہاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں ماں بیٹا آخر کیا کراؤ گے؟ ارے موذی ان کی پستول تو واپس کر دیتا۔''

اکرام ایک دم پلٹا تو ہاتھ میں تھمے ہوئے پستول کا رخ شمشیرہ بیگم کی جانب ہو گیا۔ شمشیرہ بیگم کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ ایک طرف سرک گئیں۔

''ستیاناس...... ارے اس کا رخ تو بدل لے۔ اگر گولی چل گئی تو میرے سینے ہی میں اتر جائے گی۔ لگتا تو یہی ہے، تیرے ہاتھوں ہی ہماری موت لکھی ہے۔ ارے کوثر جہاں! یہ ریوالور چھین لو اس سے۔ اس کے سر پر تو خون سوار ہو گیا ہے۔ ہائے یہ موذی کیا کرے گا اس کوٹھے پر...... ہائے تم دونوں ماں بیٹے مل کر میرا گھر اجاڑ دو گے۔ ارے میں برباد ہو گئی...... لاکھوں روپیہ چلا گیا۔ ہائے تمہارا ستیاناس۔'' شمشیرہ بیگم نے بیٹھ کر سینہ پیٹنا شروع کر دیا۔ اکرام نے ریوالور ایک طرف ڈالا اور غلام شاہ دو قدم اچھل کر پیچھے ہٹ گیا کیونکہ ریوالور اسی کے پیروں کے نیچے گرا تھا۔

''یہ کوئی لوہے کا ٹکڑا نہیں ہے اکرام جسے ایسے ہی پھینک دو...... اور پھر یہ تو ایک جرم ہے۔ اور شمشیرہ! اگر یہ پستول ہمارے کوٹھے سے برآمد ہو گیا تو ہم سب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگ جائیں گی اور چوری کے الزام میں گرفتار بھی ہو سکتے ہیں۔''

''سب کچھ ہو گا غلام شاہ...... سب کچھ ہو گا۔ تم سب نے اس لڑکے کے سامنے چوڑیاں پہن لی ہیں...... اس کا جو جی چاہے کرے گا۔ اور پھر پولیس آئے گی، ایک ایک

شخص کو گھسیٹتی ہوئی لے جائے گی۔ پھر غنڈے آئیں گے۔ اس گھر کو آگ لگائیں گے اور ہر چیز توڑ دیں گے۔ یہی ہوگا...... یہی ہوگا۔''

''وہ لوگ تم سے یہ بکواس کیوں کر رہے تھے باجی؟''

''اکرام! تُو بہت بدتمیزی کرنے لگا ہے۔ تُو نے اس شخص کی کلائی میں چاقو اتار دیا۔ یہیں سے سیدھا پولیس اسٹیشن بھی جا سکتا ہے وہ۔ ہمارے خلاف رپورٹ درج کروائے گا اور ہم سب پکڑے جائیں گے۔''

''مگر میں تم سے بھی تو کچھ کہتا ہوں۔ تم لوگ سنبھلتے کیوں نہیں ہو؟ اس وقت میری بات کیوں نہیں مان لیتے؟''

''اب یہ بک بک بند کر۔ چاقو اٹھا کر صاف کر۔ اس پر خون لگ گیا ہے...... اور یہ پستول جا کر شاہ جی کو دے دے۔ یہاں اس کا رہنا خطرناک ہے۔''

''تم لوگ بالکل بے فکر رہو...... میں نے اس شخص کی باتیں سن لی ہیں۔ اس کے فرشتے بھی آئندہ ادھر کا رخ نہیں کر سکتے، سمجھ رہے ہیں آپ لوگ۔'' اکرام نے چاقو بند کر کے نیفے میں رکھا اور اس کے بعد ریوالور سنبھالے ہوئے باہر نکل گیا۔ شمشیرہ بیگم کی زبان اس کے جاتے ہی پوری طرح کھل گئی۔ دہائیاں دے رہی تھیں، رو پیٹ رہی تھیں۔ کوثر جہاں کو ہزاروں کوسنے دے ڈالے تھے۔ تسنیم کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ کوثر جہاں بلبلا کر باہر نکل گئی۔ حاجو اس طرح لمبا پڑا ہوا تھا۔ غلام شاہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابے حاجو! کیا چل بسا......؟''

حاجو نے کوئی جواب نہیں دیا تو غلام شاہ نے کہا۔ ''ذرا ان کو تو دیکھو شمشیرہ بیگم! دل کی حرکت بند تو نہیں ہوگئی؟''

''ہاتھ مت لگانا...... ہاتھ مت لگانا مجھے۔ نہیں تو بخدا اچھا نہیں ہوگا۔'' حاجو نے کہا۔

''ابے ابھی زندہ ہے۔ مگر تجھے ہوا کیا یار؟''

''اچھل کے گرا تو میری چکھی اتر گئی۔''

''وہ تو میں ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں۔'' غلام شاہ نے کہا اور حاجو بری طرح چیخ پڑا۔

''دیکھو غلام شاہ! میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر حاجو نے آہستہ سے اپنی جگہ بدلی تو شمشیرہ بیگم کی نگاہیں بھی اس کی طرف اٹھ گئیں۔ پھر غلام شاہ نے گردن ہلاتے

ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... بنیئے کا بیٹا کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے حاجو! کچھ چکر ضرور ہے۔ ذرا اٹھو۔''

''دیکھو غلام شاہ! تمہیں خدا کی قسم، ہلانا مت مجھے...... ہلانا مت۔''

''چک تو سنبھالنی ہی ہے تمہاری ورنہ چک چک کرتے پھرو گے۔'' غلام شاہ نے اپنے مضبوط بازوؤں میں حاجو کو بھرا اور فوراً اٹھا لیا۔ حاجو نے ہاتھ پیر ہلانے کی بہت کوشش کی لیکن بات بن نہیں سکی تھی۔ بات ساری جو تھی وہ سامنے آ گئی۔ اس کے نیچے دبی ہوئی نوٹوں کی گڈی صاف نظر آ رہی تھی۔ حاجو نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ جب ادھر جھگڑا شروع ہوا تو اس نے نوٹوں کی گڈیوں میں سے ایک کو لات ماری اور جیسے ہی وہ دیوار کے سہارے گری، حاجو اس پر جا گرا اور اس وقت سے وہیں کا وہیں پڑا ہوا تھا۔ خیال یہی تھا کہ جب ہنگامہ ختم ہو جائے تو گڈی اپنی تحویل میں لے لے۔ مگر خدا غارت کرے اس غلام شاہ کو، ساری پول کھول دی۔

غلام شاہ کے حلق سے قہقہہ نکل گیا۔

''کہا تھا ناں ہم نے شمشیرہ بیگم کہ بنیئے کا بیٹا کچھ دیکھ کر ہی گرا ہوگا۔ دیکھ لیجیے۔''

''ارے تم لوگوں کو مذاق سوجھ رہا ہے ایک دوسرے سے۔ ٹھیک ہے، جس کے دل کو لگتی ہے وہی جانتا ہے۔ ارے ایسی ہزاروں گڈیاں ملنے والی تھیں مگر خدا غارت کر دے...... ہائے وہ کون سا دن تھا جب سانپ کے اس بچے نے گھر میں جنم لیا تھا۔ ارے میں لٹ گئی...... میں برباد ہوگئی۔ کوئی تو میری سننے والا ہوگا۔ اوئے حاجو، کیا کر رہا ہے...... تیرے باپ کا مال ہے کیا...... کیوں جھپٹ رہا ہے بار بار گڈی پر...... لا، ادھر لا۔'' شمشیرہ بیگم نے نوٹوں کی گڈی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی بھلی تھی۔ اچھی خاصی بڑی رقم تھی یہ بھی۔ مگر حاجو کا غصے سے برا حال تھا۔

○●○

اکرام، شاہ جی کے ڈیرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں سب جمع تھے اور اکرام کو دیکھتے ہی سب کے منہ سے آوازیں نکلی تھیں۔

"لیجئے...... دولہا میاں آ گئے۔"

"آؤ، میرے بچے کی نظر اتارو سات مرچوں سے۔ اکرام! آج تم ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے والے ہو۔"

"میں سمجھا نہیں شاہ جی؟"

"بس بیٹا! تمہاری کوٹھی تیار ہو گئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں کے ماحول میں پروان چڑھو۔ اب تم شہزادوں کی سی زندگی گزارو گے۔ کار بھی خرید لی گئی ہے تمہارے لئے۔ ڈرائیور بھی ہے۔ سکول بھی اسی میں آیا جایا کرو گے۔ ارے یہ ہاتھ میں کیا ہے؟"

"پستول ہے شاہ جی۔"

"نہیں بیٹا...... یہ خطرناک چیز ہے۔ کہاں سے ملا یہ تمہیں؟"

"وہی تو آپ کو بتانے جا رہا ہوں۔ ایک بے وقوف آدمی آیا تھا۔ مسئلہ وہی باجی کا تھا۔ اس کا نام راجہ شرافت علی تھا۔ دو تین آدمیوں کو ساتھ لے کر آیا تھا، باجی کو لے جانا چاہتا تھا۔ باجی نے منع کیا تو کہنے لگا چوٹی پکڑ کر گھسیٹ لے جائے گا۔"

"ارے واہ...... پھر؟"

"میں نے پوچھا ارے کون مائی کا لال باجی کو چوٹی سے پکڑ کر لے جائے گا؟ تو الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ مجبوراً مجھے چاقو نکال لینا پڑا۔ اس نے پستول نکالا تو میں نے چاقو اس کی کلائی میں ترازو کر دیا۔ بس بھاگ گئے سارے۔"

"ابے...... کب کی بات ہے یہ؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے کی۔"

"کتنے تھے وہ؟"

"پانچ تھے۔"

"ایک اور جسم تیار ہو گیا...... ارے فضل خان! یہ لڑکا تو بار بار مجبور کر دیتا ہے کہ اس کی نظر اتاری جائے۔ ایک سے ایک بڑا کارنامہ سرانجام دے رہا ہے۔ پھر کیا ہوا، بھاگ گئے سسرے؟"

"ہاں، پھر کہاں رکتے؟"

"تو اس کی کلائی زخمی ہو گئی تھی۔ مگر یہ راجہ شرافت علی ہے کون؟"

"ہو گا کوئی لفنگا۔ یہاں تو کئی لفنگے آتے جاتے رہتے ہیں۔"

شاہ جی تھوڑی دیر سوچ میں ڈوبے رہے پھر بولے۔ "میں تو تجھے ان لوگوں سے بچانا چاہتا ہوں مگر تیری باجی...... لیکن خیر اس کی بھی کوئی مشکل ہی ہے۔ میں سمجھ چکا ہوں، جب انسان مشکل کا شکار ہوتا ہے تو نجانے کس کس کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ چلو خیر، شالے خان! یہ پستول لے جا کر اندر رکھ دو۔ خطرناک چیز ہے، بچے کے پاس نہیں رہنی چاہئے۔ ویسے تُو نے اچھا کیا کہ گولی نہیں چلائی۔ پرواہ بالکل مت کرنا۔ اگر کبھی ایسی نوبت آ ہی جائے تو گھبرانا مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہاں بھئی تو بات ہو رہی تھی تمہاری کوٹھی کی۔ اب تم سنو، تم سکول جاؤ گے اپنی کوٹھی سے۔ کار لے کر جائے گی تمہیں۔ چھٹی ہو گی تو اس کار میں واپس آؤ گے۔ ایک ڈیڑھ بجے تک گھر پہنچو گے۔ چار بجے وہاں سے چل کر ہمارے پاس پہنچو گے اور اس کے بعد آٹھ نو بجے تک ہمارے ساتھ رہا کرو گے۔ اپنی باجی کے پاس بھی جایا کرو گے۔ ننوں کے سینے پر مونگ بھی تو دلنی ہو گی۔ بس اس کے بعد کار تمہیں لے کر گھر پہنچ جائے گی۔ ہم نے یہ پروگرام بنایا ہے تمہارے لئے۔ کوئی اعتراض تو نہیں ہے تمہیں؟"

"نہیں شاہ جی! دل تو چاہتا ہے کہ باجی اور تسنیم کو بھی یہاں سے لے جاؤں اور آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔"

شاہ جی تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر بولے۔ "تمہاری باجی جس دن تیار ہو جائے گی ناں اسی دن اسے لے کر کوٹھی چلے جانا۔ ہمیں اعتراض نہیں ہو گا۔ مگر ہمارا مسئلہ دوسرا ہے۔"

"آخر کیوں شاہ جی؟"

"بس ہم نے ہیرا منڈی میں ہی رہنے کی قسم کھائی ہے۔" شاہ جی نے کہا اور پھیکے سے انداز میں ہنس پڑے۔ اکرام انہیں گہری نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔

○●○

راجہ شرافت علی ابھی تک پہاڑ کے نیچے نہیں آئے تھے لیکن تقدیر انہیں اسی سمت لے جا رہی تھی۔ اس دن جوان کی درگت بنی تھی وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ دوستوں کے سامنے آنکھیں اس طرح نیچی ہوگئی تھیں کہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ ٹانگ برابر لڑکے نے عزت ملیا میٹ کر دی تھی یہاں تک کہ ان کی پستول بھی چھین لی گئی تھی۔ ان کے دوست الگ نگاہیں چرا رہے تھے۔ وہ رومال جوان کی کلائی میں بندھا ہوا تھا، خون میں تر ہوگیا تھا۔ خون تھا کہ مسلسل ٹپکے جا رہا تھا۔ سب سے پہلے یہ ضرورت تھی کہ کسی ہسپتال پہنچ کر مرہم پٹی کرائی جائے۔ بہرحال کلائی کے زخم کو بمشکل ٹانکے لگا کر سیا گیا۔ ڈاکٹروں کو معاوضہ ادا کرنے کے بعد وہ سب گھر کی جانب چل پڑے تھے۔ راجہ صاحب کا چہرہ تکلیف سے زیادہ غصے میں ڈوبا ہوا تھا۔ گھر پہنچ کر انہوں نے کہا۔

"چائے بنواؤ۔"

دوسرے دوست قریب بیٹھ گئے۔

"کلائی میں زیادہ تکلیف تو نہیں ہے؟" نواب دین نے سوال کیا۔

"کلائی میں تو تکلیف نہیں ہے البتہ دل میں ہے۔"

"میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں راجہ صاحب!" رحمت خان نے کہا۔

"ہوں...... کہو؟"

"آپ حکم دیں تو اس لڑکے کی لاش منگوا کر آپ کے قدموں میں ڈال دوں؟ یہ میرے لئے مشکل نہیں ہوگا۔ یہ مت سمجھیں کہ ہم لوگ بزدل ہیں۔ لاہور میں ہم اتنا کچھ کر سکتے ہیں کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آپ کہیں تو ہیرا منڈی میں آگ لگوا دوں۔ اس کوٹھے پر جو جو موجود ہے ان سب کو زندہ جلوا دوں...... لیکن ہم اس لئے خاموش رہے کہ بعد میں آپ کی یہاں موجودگی کا اندازہ ہو جائے گا۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"لیکن اس کے باوجود ہم خاموش تو نہیں بیٹھیں گے۔ بے عزتی کی بات ہے کہ ہم

طوائف کے کوٹھے سے پٹ کر آئے ہیں۔ ہمارا پستول ہم سے چھین لیا گیا۔"

"میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گا راجہ صاحب! اس کوٹھے کو اجاڑنا بہت ضروری ہے۔"

"خاص طور سے وہ دو افراد، انہی سے نمٹنا ضروری ہے۔ وہ لڑکا کمبخت کون تھا؟ وہ تو چاقو بازی کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ چاقو سے کھلونوں کی طرح کھیل رہا تھا۔ اس نے جس پھرتی کا مظاہرہ کیا اس کی ہمیں توقع نہیں تھی۔ بہرحال اچھا ہی ہوا، ورنہ کمبخت ہمارے ہاتھوں مارا جاتا۔ کم از کم ہم ایک طوائف کے کوٹھے پر تو قاتل نہ کہلاتے۔ لیکن اب جو کچھ ہوگا وہ بالکل مختلف ہوگا اور خاص طور سے ہم اس دوسرے شکار کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ وہ کوثر جہاں ہے، طوائفوں کے کوٹھوں پر حُسن ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم نے بھی کتیا کی طرح اسے تلوے چاٹنے پر مجبور نہ کر دیا تو راجہ شرافت علی نام نہیں ہے۔"

"پتہ نہیں کس بات پر اکڑتی ہے۔"

"اب بات بتایئے راجہ صاحب! خون کھول رہا ہے۔ میرا خیال ہے ان دونوں کو اٹھوا لیا جائے۔" نواب دین بولا اور راجہ شرافت علی سوچتے رہے۔ پھر بولے۔

"میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہوگا۔"

"آخر کیوں؟"

"یار سمجھا کرو۔ جو کچھ کیا جائے براہِ راست نہ کیا جائے۔ اگر یہی کچھ کرنا تھا تو ابھی کر ڈالتے۔ طوائفوں کے کوٹھے پر غنڈہ گردی کرنا کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ ایسا تو چار پیسے لے کر لچے لفنگے بھی کر لیتے ہیں۔ کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے لطف آ جائے۔"

"آپ یہ سمجھ لیجئے کہ ہماری جان آپ کے لئے حاضر ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو دوسرے بندے بھی مل سکتے ہیں۔"

"پہلے یہ بتاؤ بلکہ پتہ چلاؤ کہ وہ لڑکا کون ہے اور کس کے بل پر اکڑتا ہے؟ بہرحال اب خاموش تو بیٹھ نہیں سکتے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کوئی منصوبہ بندی کرنا پڑے گی۔"

"منصوبہ کیا ہو؟"

"مثلاً یہ کہ کوئی خوبصورت سی کوٹھی کرائے پر حاصل کرو۔ کچھ دن وہاں رکنے کے بعد کوثر جہاں کو مجرے کے لئے طلب کیا جائے کچھ نئے لوگوں کے ذریعے۔ اور پھر جب وہ مجرا کرنے آئے تو سارا کھیل وہیں ختم کر دیا جائے۔"

"ارے واہ...... قسم اللہ کی کیا دماغ پایا ہے آپ نے راجہ صاحب۔"

"بالکل...... اجنبی نام سے کوٹھی کرائے پر لیتے ہیں اور وہاں خوب شان وشوکت کا مظاہرہ کریں گے۔ روپے پیسے کا تو تم جانتے ہی ہو اللہ کے فضل سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بس ایک بار وہ لوگ ہمارے گھر پہنچ جائیں، اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"منصوبہ تو بہت اچھا ہے لیکن ذرا لمبا ہے۔"

"فکر مت کرو...... ہم اپنا کام آسانی سے کرلیں گے۔ اس وقت تک کلائی کا زخم بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

بہر حال یہ منصوبہ بنتا رہا اور پھر طریقہ کار منتخب کرلیا گیا کہ کس طرح کوٹھی لی جائے اور سارے معاملات مکمل کیئے جائیں۔ بہت دیر تک یہ تمام دوست گردنیں ہلا ہلا کر منصوبہ بندیاں کرتے رہے تھے۔

○●○

دن کے پیچھے رات اور رات کے پیچھے دن بھاگتے رہتے ہیں۔ موسموں کی رت بدلتی رہتی ہے۔ انسان کے اپنے معاملات اپنی جگہ، موسم کا اپنا کھیل الگ ہوتا ہے۔ بسنت آ گئی تھی۔ بہار کا موسم...... گہرے اندھیرے کی چادر چھٹی اور سنہری کرن نے جھانک کر دیکھا...... اپنی ہم جولیوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھی۔ اس کے چمکیلے جھرمٹ میں اندھیرا سمٹنے لگا۔ کائنات نے انگڑائی لی۔ مشرق میں شہاب پھیلا۔ شبنم نے کلیوں کا منہ دھلایا۔ نسیم نے گدگدایا تو پھول ہنس پڑے۔ چمن میں بہار آ گئی۔ چاروں طرف پیلی ہی پیلی زندگی دوڑ گئی...... درودیوار سے نغمے پھوٹ پڑے۔ فضا میں گلاب گھل گیا...... خشک زمین کا سینہ کونپلیں اگلنے لگا...... چمن مہکنے لگے...... سبزے کا فرش اس طرح پھیل گیا جیسے کسی نے گہرا سبز قالین کھول دیا ہو۔ زندگی میں سرمستیاں دوڑ گئیں۔ لاہوریئے تو ٹھہرے ہمیشہ کے دل والے اک ذرا سا کھیل ہوا اور دل لٹا ڈالے۔ زمین نے بسنتی جوڑا پہنا، موروں کی آوازیں فضا میں گونجیں...... کوئل نے نغمے چھیڑے تو لاہوریوں نے آسمان پتنگوں سے سجا دیا۔ ہر طرف زندگی ہی زندگی دوڑ گئی۔ بسنت کی بسنتیاں لہریں لینے لگیں۔ ایک ہنگامہ آرائی تھی۔ زندگی کا کھیل بہت ہی عجیب وغریب ہو گیا تھا۔

بہر حال خوب ہنگامہ آرائیاں ہو رہی تھیں۔ شمشیرہ بیگم بھی بظاہر اپنے آپ کو سنبھالے

ہوئے تھیں۔ حالانکہ اندر ہی اندر سخت پریشان۔ بسنت آتی تھی۔ وہ بھی بسنت مناتی تھیں لیکن اس بار کچھ بجھی بجھی سی تھیں۔ پریشانیاں تو خیر ان کے مقدر میں تھیں ہی، کبھی انہیں دکھ اس بات کا ہوتا تھا کہ کوثر جہاں نے ان کے بڑے بڑے لوگوں کو نظر انداز کر دیا جن کے ذریعے اتنی آمدنی کی امید تھی کہ وارے نیارے ہو جائیں۔ مگر یہی نہیں، ساتھ ساتھ دھڑکے بھی لگے رہتے تھے کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ ان دنوں وہ راجہ شرافت علی کے خوف سے پریشان تھیں۔ زخمی ہو کر گیا تھا، معمولی بات نہیں ہے۔ بس جو ہوا وہ عجیب تھا۔ ادھر غلام شاہ نے جو سنایا تھا اس نے تو کمر ہی توڑ کر رکھ دی تھی۔ غلام شاہ اس دن کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ نجانے کہاں سے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں کوئی سواری نہیں ملی تھی۔ اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہا تھا کہ دور سے اسے ایک بہت ہی اعلیٰ درجے کی کھلی چھت والی کار نظر آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک تانگہ بھی چلا آ رہا تھا۔ کار کی رفتار بھی ایسی تھی کہ جیسے کار والا سڑکوں پر سیاحت کر رہا ہو۔ غلام شاہ کی نگاہ سڑک پر کار اور اس کے پیچھے تانگے پر جمی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔ کار قریب سے گزری اور اس میں غلام شاہ نے جو کچھ دیکھا اس نے اس کا دل ہلا دیا۔ انتہائی شاندار کار میں اکرام بڑی شان وشوکت سے بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیور وردی پہنے ہوئے تھا۔ اکرام کا رخ کیونکہ اس طرف نہیں تھا اس لئے اس نے تو غلام شاہ کو نہیں دیکھا لیکن غلام شاہ نے اسے اچھی طرح پہچان لیا۔ یہ کار تو بس خوابوں کی جنت تھی...... غلام شاہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جو تانگہ آ رہا تھا اسے اس نے اشارے سے روکا اور اچک کر اس میں جا بیٹھا۔

"ذرا اس گاڑی کے پیچھے پیچھے چلو۔" اس نے تانگے والے سے کہا۔

"جی حضور...... گھوڑے میں انجن نہیں لگا ہوا۔ یہ بھلا اس کا پیچھا کہاں سے کر سکے گا؟"

"میاں جتنا چل سکتے ہو چلو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی کار کی رفتار بہت سست ہے۔"

یہ بات تانگے والے نے بھی محسوس کی تھی۔ بہر حال وہ چل پڑا اور پھر وہ کار جس شاندار علاقے میں داخل ہوئی وہ عالیشان کوٹھیوں کا علاقہ تھا۔ لاہور کے بڑے بڑے لوگوں کا علاقہ اور انہی میں سے ایک شاندار کوٹھی کے سامنے کار رکی تو چوکیدار نے دروازہ کھول دیا۔ کار اندر داخل ہو گئی۔ غلام شاہ پر تو حیرتوں کے دورے پڑ رہے تھے۔ قصہ ہی

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تانگے والے کو روکا اور تانگے سے اتر کر کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا۔ کوٹھی کے سامنے جو پیتل کی بڑی سی تختی لگی ہوئی تھی اسے دیکھ کر اس کا دل پھر سے حلق میں آ گیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔

"شہزادہ اکرام احمد۔"

غلام شاہ کے ذہن پر ہتھوڑے چلنے لگے...... کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بڑے سے گیٹ کو آہستہ سے بجایا اور لمبے چوڑے بدن والے چوکیدار نے دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے...... کس سے ملنا ہے؟"

"وہ اصل میں کچھ معلومات کرنے حاضر ہوا ہوں۔ یہ ابھی جو شہزادے اندر داخل ہوئے ہیں یہ کون ہیں؟"

"وہ شہزادہ اکرام ہیں۔"

"کیا وہ یہیں رہتے ہیں؟"

"ہاں...... مگر تم کون ہو؟"

"ان کا ایک پرانا نمک خوار ہوں...... بہت عرصے ان کا نمک کھایا ہے۔ پھر وہ چلے گئے تھے۔ بہت عرصے کے بعد نظر آئے ہیں۔ ان سے معلومات حاصل کرنے چلا آیا۔"

"ان سے ملنا چاہتے ہو؟"

"ابھی نہیں...... پھر حاضری دوں گا کسی وقت۔ وہ یہیں رہتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"یہ آ کہاں سے رہے ہیں؟"

"سکول سے۔"

"کیا صبح کو بھی وہ یہیں سے سکول جاتے ہیں؟"

"او بابا اور کیا تمہارے گھر سے جائیں گے۔" چوکیدار نے کہا۔

"نہیں...... میرا مطلب ہے ان کے والدین وغیرہ؟"

"وہ ادھر نہیں رہتے۔ بس اب ہمارا زیادہ مغز مت کھاؤ۔"

غلام شاہ کو اندازہ ہو گیا کہ چوکیدار اکھڑ ہے اور زیادہ باتیں نہیں بتائے گا۔ بہر حال تانگے میں بیٹھ کر ہیرا منڈی پہنچا اور ہانپتا کانپتا شمشیرہ بیگم کے سامنے آ گیا۔ شمشیرہ بیگم

معمول کے مطابق اپنے کمرے میں بیٹھی چھالیا کاٹ رہی تھی۔ غلام شاہ کو دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

"کہاں سے جھاڑو پھیرتے آ رہے ہو...... لگ رہا ہے جیسے لُو لگ گئی۔ ہو کیا گیا؟"

"بڑی اہم خبر لایا ہوں۔ سنیں گی تو اچھل پڑیں گی۔"

"اب تم بھی مجھے اچھالنے لگے۔ اس کام کے لئے تو وہ حاجو ہی کمبخت کیا کم ہے۔"

"سن تو لیجئے شمشیرہ بیگم! جو کام ماں نہ کر سکی وہ بیٹے نے کر دکھایا۔"

"کون ماں، بیٹا...... کیا کوئی گرم چیز کھا گئے ہو؟"

"آپ کی صاحبزادی اور نواسے کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیوں، کیا ہوا ان دونوں کو؟"

"شمشیرہ بیگم! ایسی عالیشان کوٹھی ہے کہ دیکھو گی تو آنکھیں پھٹی رہ جائیں گی۔"

"کہاں ہے؟" شمشیرہ بیگم نے جلدی سے سروتہ نیچے رکھ کر پوچھا اور غلام شاہ کوٹھی کا جائے وقوع بتانے لگا۔

"وہ تو ٹھیک ہے...... مگر ہے کس کی؟"

"شہزادہ اکرام احمد کی۔"

"شہزادہ اکرام احمد...... یہ کون ہیں؟"

"محترمہ کوثر جہاں کے صاحبزادے۔" غلام شاہ نے کہا اور شمشیرہ بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"بک کیا رہے ہو تم...... سروتہ اٹھا کر تمہارے منہ میں ڈال دوں گی۔"

"کوٹھی کی شان و شوکت دیکھیں گی تو سروتہ اپنے منہ میں ڈال لیں گی۔ میں نے تو صرف باہر سے نظر دوڑائی ہے۔ صاحبزادے جس کار میں سکول سے واپس آ رہے تھے وہ لاکھوں روپے قیمت کی ہوگی۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو ساز و سامان سے ایسی آراستہ تھی کہ کسی جاگیردار کی کیا ہوگی۔ اس کار میں بڑی شان و شوکت سے اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ پھر وہ کار کوٹھی کے اندر داخل ہو گئی۔ وہیں رہتے ہیں...... دروازہ ایک چوکیدار نے کھولا تھا۔ بڑی ہمت کر کے میں نے اس کا سامنا کیا اور اس سے پوچھا کہ یہ کوٹھی کس کی ہے تو اس نے بتایا کہ شہزادہ اکرام کی ہے۔"

"اے کیا بکے جا رہے ہو...... لگتا ہے تم تو بالکل ہی پاگل ہو گئے ہو۔ تم پر خدا کی مار۔ دماغ تو قابو میں ہے۔ یا موسم بہار میں بھیجہ اپنی جگہ سے کھسک گیا؟"

"شمشیرہ بیگم! بھیجہ تو تمہارا کھسک جائے گا جب اس کوٹھی کو دیکھ لو گی۔ کوٹھی شہزادہ اکرام کے نام ہے۔"

"ارے وہ حرام کا پلّہ کہاں سے شہزادہ بن گیا؟"

"شاہ جی کا کام ہے...... انہوں نے ہی یہ کوٹھی اسے خرید کر دی ہے اور کار بھی۔"

"ہائے کیا یہ سچ ہے؟" شمشیرہ بیگم نے سینہ پکڑ کر کہا پھر بولیں۔ "اگر یہ اتنا دولت مند ہے تو آخر ہیرا منڈی میں کیوں آ کر مرا ہے؟"

"بس تم اسی چکر میں پڑی رہو۔"

"کیا کروں...... تقدیر میں کچھ ہے ہی نہیں۔"

"میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہا ہوں شمشیرہ بیگم۔"

"کیا؟"

"کوئی بہت ہی گہری اور بہت ہی بڑی سازش ہو رہی ہے۔"

"سازش...... ہیں...... کس کے خلاف؟" شمشیرہ بیگم نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"خلاف تو کسی کے بھی نہیں لیکن یوں لگتا ہے جیسے کوثر جہاں بیگم پَر تول رہی ہوں۔ فاختہ بن جانے کے چکر میں لگ رہی ہیں۔"

"فاختہ......؟" شمشیرہ بیگم نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"بس، بس...... یہ میرا خیال ہے۔ ابھی تصدیق نہیں ہو سکی۔"

"آخر اس نے اکرام کو کوٹھی خرید کر کیوں دی ہے؟ وہ اس کی اتنی للّو چپّو کیوں کر رہا ہے۔"

جواب میں غلام شاہ معنی خیز انداز میں ہنسنے لگا تھا۔ شمشیرہ بیگم آگ بگولا ہو گئیں۔

"ٹھیک ہے شاہ جی...... ٹھیک ہے۔ یہ سب بھی تمہارے کارنامے ہیں۔ خدا تمہیں غارت کرے۔"

"ارے اگر اس نے ہمیں غارت کر دیا شمشیرہ بیگم! تو تمہارا کیا بنے گا؟"

"جواب بن رہا ہے...... میرے لئے تم نے کیا کر لیا۔ جو خبر لاتے ہو، ایسی ہی دل

جلانے والی لاتے ہو۔ خدا غارت کرے اس اکرام کو۔ خدا غارت کرے تجھے۔ تُو نے ہمارے حق پر ڈاکہ مارا ہے۔"

"یہ تو اپنی اپنی تقدیر ہے شمشیرہ بیگم! جو کام اماں جان نہ کر سکیں وہ بیٹے نے کر دکھایا۔ آخر کوٹھی کا مالک ہے۔ شہزادہ بن گیا ہے۔ اور اب جانتی ہیں کیا ہو گا؟ اب یہ ہو گا کہ کچھ عرصے کے بعد ہی شہزادے صاحب مادر ملکہ کو کوٹھی میں طلب کر لیں گے۔ ماں بیٹے عیش کریں گے اور غلام شاہ طبلہ ٹھونکتا رہے گا...... حاجو میاں سارنگی بجاتے رہیں گے اور شمشیرہ بیگم ان دو بندریوں کو نچاتی رہیں گی۔" غلام شاہ کا اشارہ غزالہ اور شبانہ کی طرف تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید شمشیرہ بیگم مار مار کر اس کا منہ لال کر دیتیں لیکن اس وقت دل پر چوٹ لگی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ سسکیاں لینے لگیں۔

"شمشیرہ بیگم! آپ جیسی آہنی عورت کی آنکھوں میں تو ہمیشہ ہم نے بجلیاں کوندتی دیکھی ہیں، چنگاریاں اُڑتی ہوئی دیکھی ہیں اور آج ان آنکھوں میں بے بسی کے یہ آنسو...... نہیں شمشیرہ بیگم! انہیں تو شعلوں ہی سے سجا رہنے دیجئے۔"

"دل مت دکھاؤ غلام شاہ! زندگی میں جو کچھ کیا اس کا کوئی صلہ نہیں ملا مجھے۔"

"مصیبت تو یہ ہے کہ دل کی بات زبان پر لائیں تو خطرہ ہوتا ہے کہ زبان کاٹ لی جائے گی۔" غلام شاہ نے کہا اور ان کے ان الفاظ پر شمشیرہ بیگم نے چونک کر انہیں دیکھا اور بولیں۔

"مطلب......؟"

"مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ کہیں گے تو تمہاری ناراضگی کا خطرہ رہے گا۔"

"ہاں...... جیسے میں تو تمہیں توپ سے باندھ کر اُڑا دوں گی۔"

"توپ سے اُڑا دو تو اتنا دکھ نہ ہو جتنا تمہاری باتوں سے ہوتا ہے۔"

"تو بابا میں نے کیا بگاڑ لیا تمہارا؟"

"ان ساری باتوں سے زندگی نہیں گزر جاتی۔"

"لو، اپنی لے کر بیٹھ گئے۔ آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"ہم اگر جان کی بازی لگا دیں تمہارے لئے تو صلہ کیا ملے گا، وہی لگا بندھا جو ہمیشہ ملتا ہے۔ اور ہمارے بارے میں تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تن کو ہے تو پیٹ کو نہیں، پیٹ کو ہے تو

تن کو نہیں۔ کہیں سے دولت کے انبار مل جائیں تو تمہاری ملکیت اور جوتے، گالیاں پھٹکار پڑے تو غلام شاہ کی تقدیر۔ بس آدمی سوچ سمجھ کر ہی کچھ کرتا ہے۔‘‘

شمشیرہ بیگم اب اتنی معصوم بھی نہیں تھیں کہ غلام شاہ کی بات نہ سمجھ پاتیں۔ بہت دیر تک خاموش رہیں، پھر بولیں۔ ’’اچھا یہ بتاؤ تم کیا کر سکتے ہو اس سلسلے میں...... اور کیا چاہتے ہو، یہ بھی کھل کر مجھے بتاؤ۔‘‘

’’اور یہ وعدہ بھی کریں گی آپ کہ جو کچھ ہم کہیں گے اسے ٹھنڈے دل سے سنیں گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے...... وعدہ کرتی ہوں۔‘‘

’’رب نواز شاہ پر ہم اپنا ہر داؤ آزما چکے ہیں اور ناکام رہے ہیں۔ اس کی دشمنی ہمیں کچھ نہیں دے سکی۔ کیوں نہ اس سے دوستی کی جائے۔‘‘

’’دوستی......؟‘‘ شمشیرہ بیگم پہلو بدل کر بولیں۔

’’ہاں دوستی۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے کہ تمہارا دماغ بھی ختم ہو ہی گیا۔ ارے اس کمینے سے دوستی ہو سکتی ہے؟‘‘

’’شمشیرہ بیگم! دشمنی نے جو کچھ نہیں دیا وہ تمہارے سامنے ہے۔ خدا کی بندی یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ ہر طرح سے وہ مکمل ہے۔ جب وہ اپنے منظور نظر کو اتنے اعلیٰ درجے کی کوٹھی خرید کر دے سکتا ہے تو تمہیں کیا نہیں دے سکتا۔ آج تک تم نے اس سے دشمنی پر ہی کمر باندھے رکھی ہے۔ بھلا دشمن بن کر بھی کوئی کسی سے کچھ لے سکتا ہے؟ بتاؤ، جواب دو۔‘‘

شمشیرہ بیگم کے دماغ پر بات کھٹ سے لگی تھی۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہیں، پھر بولیں۔ ’’ہم اس کے ساتھ جو کچھ کر چکے ہیں اس کے بعد وہ ہم سے دوستی کرے گا؟‘‘

’’دوستی تو کرنی ہی پڑے گی۔‘‘

’’مگر کیسے؟‘‘

’’یہی تو سوچ رہا ہوں...... تمہاری یہ غزالہ اور شبانہ جو ہیں ناں، یہ تو کسی کام کی ہیں نہیں۔ ابھی تک بچیاں بنی ہوئی ہیں۔ حالانکہ خوبصورتی میں کم نہیں ہیں۔ لیکن تم بتاؤ کہ آج تک انہوں نے کسی کو اپنی نظروں کا نشانہ بنایا؟‘‘

’’غلام شاہ! تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں خود بھی یہی کچھ سوچ رہی ہوں۔

حالانکہ کوثر جہاں بھی میری ہی ہے۔ آخر اس میں کیا بات ہے کہ چاروں طرف اسی کی کہانیاں کہی جاتی ہیں۔ میں خود بھی سوچتی ہوں کہ آخر یہ دونوں لڑکیاں اتنی ناکارہ کیوں ہیں۔‘‘

’’وجہ ہے...... اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کوثر جہاں دو بچوں کی ماں بن چکی ہے لیکن اس کے بارے میں یہ بات بڑی بے تکلفی سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا حسن جہاں سوز ہے۔ ایک ایسا سلگتا سا گداز ہے اس میں کہ انسان کی نگاہ اس پر آ کر ٹھہرتی ہے۔ اور تم ہو کہ ہر ایک کے سامنے کوثر جہاں ہی کو لاتی ہو۔ شبانہ اور غزالہ کو بنا سنوار کر وہی تربیت دو جو تم نے کوثر جہاں کو دی ہے۔ ایک ایک کر کے تماش بینوں کے سامنے پیش کرو۔ تاکہ کسی کی نگاہ ان پر بھی ٹھہرے۔ ایک کوثر جہاں ہی ہے جس نے تمہارے کوٹھے کو سنبھال رکھا ہے۔ اور کوثر جہاں جو سلوک تمہارے ساتھ کر رہی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اپنی اہمیت کا احساس ہو چکا ہے۔ معاف کرنا شمشیرہ بیگم! غلطی تمہاری بھی ہے۔ تم نے غزالہ اور شبانہ کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کر رکھا ہے۔‘‘

غلام شاہ خاموش ہوا تو شمشیرہ بیگم کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔

’’کہتے تو تم ٹھیک ہو غلام شاہ...... مگر قسم لے لو مجھ سے کہ میرے دل میں تینوں بیٹیوں کے درمیان کوئی فرق ہو۔ بس چونکہ وہ بڑی ہے اس لئے ذمہ داری اسی کو سونپی تھی اور سوچتی تھی کہ رفتہ رفتہ ان لڑکیوں کو بھی سامنے لاؤں گی۔ بڑی بہن سے بہت کچھ سیکھ سکیں گی اور اس کے بعد اپنا راستہ تلاش کریں گی۔ ایک طرح سے تمہارا کہنا بھی ٹھیک ہی ہے۔ میں نے انہیں کافی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ ان کے سامنے بھی ان کا مستقبل پڑا ہے۔ مگر مجھے بتاؤ اب میں کروں کیا؟‘‘

’’فی الحال اس مسئلے کو ذرا دور رہنے دو۔ یہ بات ہم بعد میں طے کریں گے۔ کسی ماہر استاد کو رکھنا ہو گا جو انہیں بھید بھاؤ سکھائیں گے اور اس قابل بنائیں گے کہ محفلوں کو لوٹنا سیکھ لیں۔ فی الحال بات شاہ جی سے دوستی کی ہو رہی تھی۔ اس میں ان دونوں کا تذکرہ بھی نکل آیا۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ شاہ جی ہیں شوقین آدمی۔ اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں۔ اللہ جانے دولت کے حصول کا ذریعہ کیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ دولت ان کے قدموں میں پڑی ہے۔ اگر وہ کسی لڑکی کے جال میں پھنس جائیں تو کیا کچھ نہیں کر سکتے۔‘‘

''اب تم بے وقوفوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ موئے مردوں کے شوق بھی نرالے ہوتے ہیں۔ ابھی تک تو شاہ جی نے کسی لڑکی کی طرف توجہ نہیں دی۔ ہیرا منڈی میں ایک سے ایک حسین لڑکی پڑی ہوئی ہے۔ لیکن تم نے کبھی سنا ہے کہ شاہ جی کو کسی کوٹھے سے لگاؤ پیدا ہوا یا کسی کے گھر آنے جانے لگے۔ میں دعوے سے کہتی ہوں کہ ہیرا منڈی کا ہر کوٹھا ان کا انتظار کرتا ہے۔ سب کی نگاہیں دیکھ رہی ہوں، پاگل نہیں ہوں، دنیا دیکھی ہے میں نے۔ شاہ جی کبھی کسی کے حُسن کی جانب متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ میں تو کئی بار یہ کوشش بھی کر چکی ہوں کہ اگر وہ کوثر جہاں کے متوالے ہیں تو اس کی طرف توجہ دیں۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں تم بھی دیکھ رہے ہو، ہم بھی دیکھ رہے ہیں اور دنیا بھی دیکھ رہی ہے۔''

''کچھ بھی ہو، تم ایسا کرو شبانہ اور غزالہ کو ان سے دوستی کے لئے آگے بڑھاؤ۔''

''دونوں کو؟''

''کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یا پھر ایسا کرو کہ ایک بار ان کو اپنے کوٹھے پر بلاؤ، ان کے لئے خصوصی اہتمام کرو اور ذرا ان کی نظر کا جائزہ لو۔ اب ساری عمر گزار دی ہے تم نے، اتنا تو اندازہ لگا سکتی ہو کہ شاہ جی کی نگاہ کدھر ٹھہرتی ہے۔ اگر شاہ جی ان راستوں کے راہی نہ نکلے تو ان کے ساتھیوں میں سے تو کوئی ہوگا۔ اس کا اندازہ تو تمہیں ہو ہی چکا ہے کہ شاہ جی اپنے ساتھیوں کو برابری کا درجہ دیتے ہیں۔ پانچوں ایک جان دو قالب رہتے ہیں بلکہ ایک جان پانچ قالب۔ کبھی دیکھا تم نے، کوئی دوسرے سے الگ راستے پر نکل جائے؟ شمشیرہ بیگم! دشمن اگر طاقتور ہو تو اسے طاقت سے نہیں عقل سے مارا جاتا ہے۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ ان لوگوں سے دوستی بڑھاؤ۔ اگر ایک بھی لڑکی کامیاب ہو گئی تو سمجھ لو کہ وارے نیارے ہو جائیں گے۔ ان کے ساتھیوں میں سے ہی کوئی کسی لڑکی کے ہتھے چڑھ جائے تو ان میں آپس میں پھوٹ ڈلوائی جا سکتی ہے۔ اور بس یوں سمجھ لو کہ پھوٹ کیا چیز ہوتی ہے۔ وہ جو پہیلی کہی جاتی ہے ناں پھوٹ کے بارے میں کہ کھیت میں ہو تو ہر کوئی کھائے اور گھر میں وہ سب کو کھا جائے۔''

شمشیرہ بیگم توجہ سے غلام شاہ کو دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔ ''یہ بات پہلی بات سے زیادہ وزن دار ہے۔ اگر خود شاہ جی ہمارے جال میں نہ پھنسے اور ان کے ساتھی آ گئے تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جو ہم نہیں کر پائے۔''

''اور اب بھی غلام شاہ کو دو کوڑی کا قرار دو گی؟''

''نہیں خیر، دو کوڑی کا تو کبھی نہیں کہا۔'' شمشیرہ بیگم مسکرا کر بولیں۔

''تب پھر نکالئے پانچ ہزار روپے۔''

''ہیں......؟'' شمشیرہ بیگم کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''وعدہ کر چکی ہیں۔ اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں مذاق نہیں ہے۔ پانچ ہزار روپے کی اشد ضرورت ہے...... اور سارے کے سارے میری ذات پر خرچ نہیں ہوں گے بلکہ اس کھیل کو بڑھانے کے لئے میں اور بھی بہت سے کام کروں گا۔ ان کے لئے بھی پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ لائیے پانچ ہزار روپے۔''

شمشیرہ بیگم آگ بگولا ہو گئیں۔

''جوتی اٹھاؤں گی اور پچاس ماروں گی تمہاری کھوپڑی میں...... ہائے توبہ، غور تو کرو۔ پانچ ہزار روپے...... ڈاکہ ڈال لو، لوٹ مار شروع کر دو، گردنوں پر خنجر پھیر دو ہمارے اور جو کچھ ہے لے جاؤ اٹھا کر۔''

غلام شاہ غصے میں کھڑا ہو گیا اور غرا کر بولا۔ ''اسی لئے تو کبھی کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی ہمیں۔ میں تو پہلے ہی کہہ چکا تھا، ہم تمہارے سامنے لاکھوں کے انبار لگا دیں، خود ہاتھ پھیلائیں گے تو جوتی ہی رکھو گی ہاتھ پر۔ واہ، پاگل سمجھ رکھا ہے۔ ہماری جوتی کو غرض پڑی ہے...... ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے، تمہارا مسئلہ ہے خود نمٹو۔ ہمارا کیا ہے، کہیں بھی بیٹھ کر طبلہ ٹھونک لیں گے۔ پیسے کی بات کی تو آنکھیں ٹیڑھی کر لیں۔ ہمیشہ سے تمہارا یہی رویہ رہا ہے۔'' غلام شاہ اٹھ کر دروازے کی طرف چلا تو شمشیرہ بیگم نے لپک کر اس کا دامن پکڑ لیا، آنکھوں میں محبت کے آثار پیدا کئے، ہونٹوں پر لگاوٹ بھری مسکراہٹ اور تیر اندازی کرتی ہوئی بولیں۔

''غلام شاہ! ساری باتیں بھول گئے...... سب کچھ بھول گئے...... کبھی تو تمہارے چہرے پر محبت کے علاوہ اور کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی تھی۔ دم بھرتے تھے شمشیرہ بیگم کا اور اب چار پیسوں کے لئے ایسی بے رخی اختیار کر لی۔''

''بس تمہاری ہی صحبت میں رہے ہیں...... بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ یہ لگاوٹ بھری مسکراہٹ اور آنکھوں سے تیروں کی بارش کس موقع پر ہوتی ہے یہ مجھ سے زیادہ اور کون

جان سکتا ہے۔ مگر اس وقت تم ان تمام چیزوں کو رہنے دو شمشیرہ بیگم! رقم کی بات کرو، رقم کی۔"

شمشیرہ بیگم کے چہرے پر پھر تاریکی پھیل گئی۔ ہونٹ سکیڑ کر بولیں۔ "کچھ کم میں کام نہیں چل سکتا؟"

"بالکل نہیں چل سکتا۔ ساری زندگی میں پہلی بار تمہارے آگے ہاتھ پھیلایا ہے اور پھر خرچہ بھی تو ہوگا...... یہ ذمہ داری تو ہمیں دے دو۔ تم تو اس سلسلے میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھا سکتی ہو۔"

"اور کام نہیں بنا تو؟"

"تو اللہ کی مرضی۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"جھاڑو پھرے تمہارے منہ پر...... پانچ ہزار سیدھے سیدھے ہضم کر جاؤ گے۔"

"دیکھو آج ہم تمہارے سامنے گردن نہیں جھکائیں گے۔ پانچ ہزار روپے دو، ان کے نقصان کا خطرہ مول لو۔ تب ہم اپنا کوئی قدم اٹھائیں گے۔ ارے ہم بھی تو جان کی بازی لگانے پر تلے ہوئے ہیں۔ شاہ جی سے یاری کرنا کوئی معمولی کام تو نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، لاتی ہوں۔ کھا لو، لوٹ لو۔ تباہی تو میرا مقدر بن چکی ہے۔" شمشیرہ بیگم بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں اور غلام شاہ کی مسکراتی نگاہیں ان کے تھرتھراتے بدن کو پیچھے سے دیکھتی رہیں۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ پانچ ہزار روپے کا انتظار کرنے لگا تھا۔

○●○

راجہ شرافت علی کو ابھی صورتحال کی سنگینی کا احساس ہی نہیں ہوا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اب تک کی زندگی نہایت کامیاب رہی تھی۔ جو چاہا حاصل کر لیا۔ بہر حال اس وقت تو دل کو لگ گئی تھی اور جو کچھ کر رہے تھے وہ صرف جنون کے عالم میں کر رہے تھے۔ اپنی دانست میں وہ کوثر جہاں بیگم کو شکار کرنے کے لئے بہترین تیاریاں کر رہے تھے۔ کوٹھی حاصل کر لی گئی تھی جو دیکھنے دکھانے سے تعلق رکھتی تھی اور اس وقت وہ ٹہلتے ہوئے پھولوں کے ساتھ ساتھ گردش کر رہے تھے۔ بھینی بھینی خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے گردش کر رہے تھے۔ کوٹھی بہت حسین تھی۔ ہر چند کہ عارضی طور پر حاصل کی گئی تھی، انتہائی معقول کرایہ ادا کر کے لیکن جگہ ایسی پُر فریب تھی کہ جو ایک بار یہاں آ

جائے اس کا جانے کو جی نہ چاہے۔ کوئی محبوب نظر ساتھ ہو تو ان پھولوں کا حُسن دوبالا ہو جائے اور یہ موسم شراب برسانے لگے۔ ذہن میں کوثر جہاں کا خیال آیا لیکن اس خیال کے ساتھ عشق و محبت کا کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ اس خیال کے ساتھ ان کے زخم چیخنے لگتے تھے۔ ایک طوائف کی یہ مجال کہ راجہ شرافت علی جیسے شہنشاہ صفت انسان کو ٹھکرا دے۔ ادھر تو راجہ صاحب کوٹھی کا جائزہ لے رہے تھے اور اُدھر کچھ فاصلے پر نواب دین رحمت خان سے باتیں کر رہا تھا۔ ان کی نگاہیں راجہ صاحب پر لگی ہوئی تھیں۔ دونوں یہیں اس کوٹھی پر تھے، باقی دوستوں کو کسی کام سے بھیجا گیا تھا۔ نواب دین نے کہا۔

"یار رحمت خان! موسم واقعی بڑا خوبصورت ہے۔ ایسی صورت میں اس احاطے میں قید ہو کر بیٹھنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔"

"چھوڑو یار...... ہم لوگوں کی زندگی قیدیوں کی سی ہے۔ آزاد کہاں ہیں، قیدی جرم کر کے جیل کی چار دیواری میں قید ہو جاتے ہیں۔ ہمارا جرم ہماری ضرورت ہے اور ہم اپنی ضرورت کے تحت اپنے آپ کو کسی بھی جگہ قید کر لیتے ہیں۔ اب دیکھ رہے ہو راجہ صاحب کو، کتنا روپیہ خرچ کیا ہے انہوں نے اس کوٹھی پر اور کتنے زیورات بنوائے ہیں اس طوائف زادی کو دینے کے لِئے۔ اس سے اندازہ لگا لو کہ وہ طوائف راجہ صاحب کی نگاہوں میں کتنی حیثیت رکھتی ہے۔ لاکھوں لٹا رہے ہیں اس پر۔ کوٹھی موتیوں سے سجا دی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس بات کے خواہش مند ہوں کہ ہر چیز اسے مہیا کر دی جائے۔ دیکھو ذرا ان دولت والوں کا ذہن۔ وہ ایک طوائف زادی ہے، غیر ہے۔ اس سے ہلکی سی شناسائی ہوئی تھی اور راجہ صاحب کو اپنی توہین کا احساس ہوا اور اس توہین کا انتقام لینے کے سلسلے میں انہوں نے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ مجھے یہ بتاؤ نواب دین! ہم میں سے کسی شخص کو اگر اتنی سی ضرورت پیش آ جائے کہ ہماری زندگی پر بن جائے تو کیا راجہ صاحب خزانوں کے منہ اس طرح کھول سکتے ہیں؟"

"کہاں بھائی...... ہم پر جو خرچ کیا جاتا ہے اس کا اندازہ تو ہم دونوں ہی کو ہے۔ ہم تو ہاتھ پھیلانے والوں میں سے ہی ہیں۔ دوست کا نام دے دیا گیا ہے ہمیں لیکن ہماری حقیقت کیا ہے یہ ہم ہی جانتے ہیں۔"

"دوستی کے نام کا تو مذاق اُڑایا گیا ہے۔"

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیوں سمجھیں ان کو اپنا دوست۔ نوکر ہیں، تنخواہ لیتے ہیں اور بس۔“

”یار ہمیں تو تنخواہ بھی باقاعدگی سے نہیں ملتی۔ بس دوستی کے نام پر احسانات کئے جاتے ہیں۔“

”تو پھر ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گے؟“

”یار کیا برا مانوں گا؟“

”وہی جو ہاتھ لگ جائے ہمارا۔ کیسی دوستی، کاہے کے رشتے، اپنا اپنا الّو سب سیدھا کر رہے ہیں۔“ نواب دین خوشی سے اچھلتا ہوا بولا۔

”تو پھر ملاؤ ہاتھ۔“

راجہ شرافت علی مسلسل کوثر جہاں کو نیچا دکھانے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور اس سلسلے میں کوئی کچا کام نہیں کرنا چاہتے تھے اور یہ کوٹھی گمنام طریقے سے حاصل کی گئی تھی۔ یعنی اگر یہ لوگ چلے جاتے اور کوٹھی کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتیں تو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اصل کرائے دار کون تھا۔ راجہ صاحب اس طرح کی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں میں سے تھے۔ ایک دوست کو حیدر آباد بھیجا گیا تھا۔ اب ان راجہ صاحب کا شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر جانا تو ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ دھمکیاں دے کر آئے تھے اور جانتے تھے کہ شمشیرہ بیگم جیسی چالاک عورت کبھی دوبارہ ایسے چکر میں نہیں پھنسے گی اور نہ ہی کوثر کو کوٹھے سے الگ کرے گی۔ اس کے لئے ایک نیا کردار پیدا کیا جانا تھا جسے ایک جاگیردار کی حیثیت سے شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر بھیجنا تھا۔ ایسے سبز باغ دکھائے جاتے کہ شمشیرہ بیگم موم کی طرح پگھل جاتیں اور اس کے بعد خود ہی سازش کر کے کوثر جہاں کو اس کی کوٹھی تک پہنچا دیتیں۔ ایسا کردار ادا کرنے کے لئے کوئی ایسی شخصیت موجود نہیں تھی اس لئے حیدر آباد کے ایک خاص آدمی کو تیار کیا جانا تھا اور اس کے بارے میں بھی حیدر خان نے بتایا تھا اور حیدر خان بھی راجہ صاحب کے دوستوں میں سے تھا۔ جس شخص کو اس سلسلے میں بلایا جا تھا وہ ایک ٹی وی آرٹسٹ تھا اور اس کے فن کے بارے میں کچھ اس طرح بتایا گیا تھا کہ راجہ شرافت علی بہت متاثر ہو گئے تھے۔

بہر حال حیدر خان کو وہاں بھیج دیا گیا تھا اور ان دنوں شہزادہ سلطان کی آمد کا انتظار ہور

تھا۔ یہ نام راجہ شرافت کو بتایا گیا تھا۔ پھر اچانک ہی راجہ صاحب نے رحمت خان اور نواب دین کو اشارہ کیا اور وہ دونوں ان کے قریب پہنچ گئے۔

”یار تم لوگ کیا کر رہے ہو...... وقت دیکھا تم نے؟“

”بہت برا وقت ہے راجہ صاحب!“

”فضول باتیں مت کرو...... تیز گام آنے والی ہوگی۔ حیدر خان اسی سے آ رہا ہے۔“

”بس جا رہے ہیں۔“

”ہاں جلدی جاؤ...... اور پھر ذرا ان لوگوں پر رعب بھی ڈالنا ہے۔“

”بس جناب چلتے ہیں ہم۔“

”ہم نہیں، نواب دین! تم خود چلے جاؤ۔“

”ٹھیک ہے......“

نواب دین تو کار میں بیٹھ کر چلا گیا، راجہ صاحب نے رحمت خان کو دیکھا اور بولے۔

”بھئی بڑی محنت کرنی پڑ رہی ہے رحمت خان!“

”بس جناب، یہ بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ان طوائفوں کو یہ پتہ نہیں تھا کہ کس سے پنگا لے رہی ہیں۔“

”بس کیا کہوں، وہ عورت حسین ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ انتہائی پُرکشش ہے۔ حالانکہ جہاں تک میرے علم میں آیا ہے، دو بچوں کی ماں ہے۔ بخدا اگر مجھے اس سے عشق ہو جاتا تو ہر قیمت پر اسے خرید لیتا اور اتنا کچھ دیتا کہ وہ کسی اور چیز کی ضرورت مند نہ رہتی۔ لیکن اب تو میں اس کی صورت پر صرف تھوکنا چاہتا ہوں۔ اس نے میری توہین کی ہے اور اس توہین کا بدلہ لینے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔ ورنہ کوئی اور بات ہوتی تو اب تک نجانے کیا کچھ ہو گیا ہوتا۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں راجہ صاحب! آن بان پر تو زندگی بھی قربان کی جا سکتی ہے۔“ رحمت خان نے کہا اور راجہ صاحب خلا میں گھورنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں خون کی سرخی لہرا رہی تھی۔

○●○

کوثر جہاں پر ان دنوں عجیب سی بیت رہی تھی۔ نجانے کیسے کیسے اثرات نے گھیر رکھا

تھا۔ وہ انسان تھا یا چھلاوہ...... ایک رات کے لئے آیا، دل و دماغ خریدے اور اس طرح گم ہو گیا کہ خلاؤں میں بھی اس کا نشان نہ ملے۔ چھوڑ گیا تھا تو بس یادیں جو ساتھ نہیں چھوڑتی تھیں۔ نجانے کیسے کیسے خواب دیکھتی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی ایسی ہی کیفیت تھی۔ دل کو بے چینی کا احساس ہوا تو اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور باہر نکل کر بالکونی میں جا کھڑی ہوئی۔ باہر تاروں بھرا آسمان پھیلا ہوا تھا۔ چاند البتہ ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ گہری تاریکیوں میں ٹمٹماتے ستارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ ستارے امیدوں کا روشن چراغ ہیں...... لیکن یہاں چاند کا وجود کہیں نہیں ہے۔ نجانے کہاں کھو چکا ہے میرا چاند...... کب تک انتظار کروں...... کب تک تجھ سے آس لگائے رکھوں...... کیا دنیا کا کہنا غلط ہے کہ تاریخ واقعی اپنے آپ کو دہراتی ہے...... کیا زمین گول ہے؟ کیا تُو ستاروں کے ساتھ ایک بار پھر گردش کرتا ہوا میری کائنات میں داخل نہیں ہو سکتا؟ کیا کوئی ایسا لمحہ آئے گا؟ کون ہے تُو...... کتنا بڑا ساحر ہے...... اپنا سحر تو چھوڑ گیا مجھ پر اور وہ بھی مجھ جیسی عورت پر جو دو ٹکے کی اوقات رکھتی ہے۔ ساحر تھا تو کسی ایسی شہزادی پر اپنا اثر پھونکتا جو تیری تلاش میں اپنی پوری سلطنت کو مصروف کر دیتی۔ میرا تو کوئی نہیں ہے...... مجھ سے تو کوئی تدبیر بھی نہیں ہوتی۔

یہ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ پھر صبح ہو گئی اور وہ باہر نکل آئی۔ باورچی خانے میں کام ہو رہا تھا۔ سازندے باتیں کر رہے تھے۔ وہ باورچی کے پاس پہنچ گئی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے صبح ہی صبح؟“

”گنے کے رس کی کھیر پک رہی ہے۔ رات کو طیب علی نے گنے کا رس بھجوایا تھا دیگ بھر کے اور شمشیرہ بیگم نے اس کی کھیر چڑھا دی۔ رات بھر تو دھیمی آنچ پر پکتی رہی ہے۔ اب تیار ہونے کے قریب ہے۔“

”کچھ چائے وغیرہ کا بھی بندوبست ہو جائے گا؟“

”ابھی ہو جاتا ہے جی۔“

”بنا دو......“ کوثر جہاں نے کہا اور غسل خانے کی جانب چل پڑی۔ طبیعت پر سخت کسل مندی طاری ہو رہی تھی۔ بدن ٹوٹ رہا تھا۔ غسل نے طبیعت بحال کر دی۔ لیکن جب باورچی چائے لے کر آیا تو دو پیالیاں ٹرے میں رکھی ہوئی تھیں۔

”یہ دو پیالیاں کیوں لے آئے؟“

”شمشیرہ بیگم بھی آ رہی ہیں۔ ابھی آئی تھیں، پوچھ رہی تھیں آپ کا۔ میں نے جواب دیا، چائے کے لئے کہہ کر نہانے گئی ہیں۔ کہنے لگیں میری چائے بھی انہی کے پاس پہنچا دینا، ابھی آ رہی ہوں منہ پر پانی کا چھینٹا مار کر۔“

تھوڑی دیر کے بعد شمشیرہ بیگم کمرے میں داخل ہو گئیں۔ چہرے پر محبت کا نور بکھرا ہوا تھا، آنکھوں سے مامتا ٹپک رہی تھی۔ کوثر جہاں کے قریب پہنچ کر پیشانی پر بوسہ دیا اور سامنے بیٹھ کر چائے کی پیالی اٹھا لی۔

”یہ آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں...... نیند نہیں بھری کیا؟ میں سمجھ گئی، تسنیم نے تنگ کیا ہو گا۔ میں کہتی ہوں تم اسے میرے پاس سلا دیا کرو مگر تم نہیں مانتی۔ نیند کالی ہو جاتی ہے۔ سر میں درد بیٹھ جائے گا۔ کل سے اسے میرے پاس چھوڑ دیا کرو۔“

”نہیں اماں! اسے پاس سلانا اچھا لگتا ہے، عادی ہو گئی ہوں۔“ کوثر جہاں نے کہا اور شمشیرہ بیگم کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ چائے کی پیالی سے نکلتی ہوئی بھاپ کو گھورتی رہیں، پھر بولیں۔

”اللہ محبتوں کے رشتے اتنے مضبوط کیوں کر دیتا ہے۔ وقت انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ محبتیں تو سب ایک ہی جیسی ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اولاد کی محبت ایک ایسا تجربہ ہوتا ہے جو انسان نے کبھی نہیں کیا ہوتا۔ جب تم اتنی سی تھیں، سب یہی کام ہوا کرتے تھے۔ میں مجرا کرتی تھی اور کبھی کانوں میں تمہارے رونے کی آواز پہنچ جاتی تو قدم لڑکھڑانے لگتے تھے۔ استاد ٹوکتے تھے لیکن کون انہیں بتاتا کہ اس وقت دل کہاں رقص کر رہا ہے۔ پیروں کا دل سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔“

کوثر جہاں نے شمشیرہ بیگم کو دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ”ہاں اماں! ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”چائے پیو، ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ شمشیرہ بیگم نے کہا اور کوثر جہاں چائے کے گھونٹ لینے لگی۔ شمشیرہ بیگم بولیں۔

”ایک بات کہوں، اگر دل نہ توڑنے کا وعدہ کرو، مذاق نہ اڑاؤ، ذلیل نہ کرو؟“

”نہیں اماں! خدا نہ کرے۔ آپ ایسا کیوں سمجھتی ہیں؟ بس میری بدنصیبی ہے کہ آپ کو مجھ سے ہزاروں شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ورنہ آپ کے تو بڑے حقوق ہیں مجھ پر۔ کاش

وقت مجھے ان حقوق کو پورا کرنے کا موقع دیتا۔"

"دیکھو، میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، میری نیت پر شک کیے بغیر سننا۔"

"کہیے...... کہیے ناں۔"

"یہ رس کی کھیر پکائی ہے۔ تمہیں اس بات کا پتہ ہے کہ جب بھی میں کبھی رس کی کھیر پکاتی تھی تو کون میرے ساتھ بیٹھ کر کھاتا تھا۔"

"اکرام۔" کوثر جہاں نے جواب دیا۔

"شوق میں پکا تو لی لیکن اب کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد پک کر تیار ہو جائے گی مگر میں نہیں چکھوں گی۔"

"کیوں اماں؟" کوثر جہاں تعجب سے بولی اور شمشیرہ بیگم سسکیاں لینے لگیں۔ کوثر جہاں جلدی سے اٹھی اور ان کے قریب پہنچ گئی۔

"اماں! تمہیں میرے سر کی قسم چپ ہو جاؤ...... اگر میرے تھوڑے بہت اختلاف سے تم یہ سوچنے لگی ہو کہ میں نے تم سے ماں کا درجہ چھین لیا ہے تو یہ غلط ہے۔ بتاؤ تو سہی، آخر بات کیا ہے؟"

"اکرام یاد آ رہا ہے...... میں نہیں کھاؤں گی یہ کھیر اس کے بغیر۔"

"اماں......"

"کہہ دیا بس میں نے...... جب وہ میرے سامنے پلیٹ میں لیے بیٹھا ہو گا اور کہے گا نوں کتنی مزے دار ہے، تبھی میں بھی چکھوں گی۔" شمشیرہ بیگم نے اس طرح درد بھرے لہجے میں کہا کہ کوثر جہاں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

"لو، یہ بھی کون سی ایسی بات ہے۔ کان پکڑ کر بلوا لیجیے اسے۔ شاہ جی کے گھر ہو گا۔ بلکہ آج تو چھٹی ہو گی اس کی سکول سے۔ حاجو کو بھیج دیجیے۔ کہہ دیجیے نوں نے بلوایا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو کوثر جہاں! وہ کہیں اور رہتا ہے۔ اب یہاں کہاں ہوتا ہے۔ اور پھر جب ہمارا پیغام پہنچے گا تو پہلے ساری تحقیقات ہو گی۔ کہا جائے گا کہ کون ہے جسے اکرام کی طلب ہے۔ ہزاروں سوال کیے جائیں گے اس کے بارے میں۔ اور پھر فیصلہ کیا جائے گا کہ اسے یہاں بھیجا جائے یا نہ بھیجا جائے۔"

کوثر جہاں نے شمشیرہ بیگم کی طرف غور سے دیکھا پھر بولی۔ "آپ ایسا کریں حاجو کو

بلائیں۔ میں بھیجتی ہوں شاہ جی کے پاس۔ اپنے نام سے بلواؤں گی، کیسے نہیں آئے گا۔"

"ٹھیک ہے......" شمشیرہ بیگم نے گردن ہلا دی اور کوثر جہاں نے خود ہی حاجو کو آواز دی۔

"حاجو! تمہیں پتہ ہے گھر میں کیا پکا ہے؟"

"رس کی کھیر۔" حاجو نے آنکھیں بند کر کے جھومتے ہوئے کہا۔

"انہیں کیا ہو گیا اماں؟"

"کمبخت جیسی منحوس صورت ہے ویسی ہی منحوس عادتیں بھی ہیں۔ رات کو کچھ دیر جاگ لیا تھا تھوڑی دیر رس کی کھیر پکانے کے سلسلے میں بس موت آ گئی۔"

"کتنے ظلم کرو گی شمشیرہ بیگم! کتنے ظلم؟ ظلموں کا بھی ایک حساب ہوتا ہے۔ اور یومِ حساب دور نہیں ہے۔" حاجو نے کہا۔

"تو غارت کیوں نہیں ہو جاتے...... تم تو چار گھڑی سو بھی لئے، باقی بے چارے تو کھیر ہی گھوٹتے رہے۔ آخر تم نے کیا، کیا ہے؟"

"کچھ کیا ہوتا تو اس طرح تمہارے در پر پڑے ہوتے؟"

"دفعان ہو جاؤ اپنی یہ منحوس صورت لے کر...... کوثر جہاں! تُو نے اسے کیوں بلا لیا؟"

"حاجو! ہوش میں آ جاؤ۔ چائے پیو۔ تمہیں کچھ کام کرنا ہے۔"

"بی بی ایک بجے تک سارنگی گھسیٹتے رہے، اس کے بعد تقدیر ہمیں گھسیٹتی رہی۔ کوئی کام ہو تو بتا دو، ہم تو حکم کے غلام ہیں۔"

"شاہ جی کے پاس جانا ہے تمہیں۔" کوثر جہاں نے کہا اور حاجو کی آنکھیں کھل گئیں۔ اپنی جگہ سے دو فٹ اونچا اچھلا۔

"شش...... شش...... شاہ جی...... شاہ جی...... کون سے شاہ جی؟"

"ارے وہی رب نواز شاہ کے پاس۔"

"ارے...... بب...... باپ رے...... کیا ہو گیا؟" حاجو نے گھگیا کر کہا۔

"ان کے پاس جانا ہے تمہیں...... سمجھ رہے ہو نا...... ہوش میں آ جاؤ۔"

"کک...... کیا کرنا ہے وہاں جا کر؟"

"اکرام کو بلا کر لانا ہے۔ کہنا میں نے بلایا ہے۔"

حاجو نے چھت کی طرف دیکھا، آنکھیں گھمائیں اور اس کے بعد گھوم گیا اور پھر بولا۔

"موت سے پہلے ایک پیالی چائے تو انسان کا حق ہے...... کیا ہمیں بھی مل جائے گی؟"

"میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ ایک پیالی چائے پی لو، تاکہ آنکھیں کھل جائیں۔ اماں! اپنی پیالی میں چائے دے دیں آپ حاجو کو۔ دوسری پیالی کہاں سے منگواتی پھریں گی۔"

"انہی کا جھوٹا تو کھالیا تھا جو آج یہ حالت ہوگئی۔ ٹھیک ہے، دے دو۔"

"دیکھو میرا جی نہ جلاؤ حاجو! جھاڑ لوں گی اور سات ماروں گی تمہارے سر پر۔ میرا جھوٹا کھا لیتے تو شکل وصورت سے مرد نظر آتے۔ لگتے ہو ہیجڑے کے ہیجڑے۔" شمشیرہ بیگم نے کہا اور حاجو نے آنکھیں پھاڑ دیں۔ پھر ایک دم ہنس پڑا اور بری طرح قہقہے لگانے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

"خیر جو آپ منہ سے کہہ گئی ہیں وہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ یعنی آپ کا جھوٹا کھانے سے لوگ صورتوں سے مرد نظر آتے ہیں۔ سن رہی ہو کوثر جہاں بیگم! اب تو اردو کی بھی غلطیاں ہونے لگی ہیں۔"

شمشیرہ بیگم نے چائے کی پیالی اٹھا کر حاجو کی طرف پھینکنی چاہی لیکن کوثر جہاں نے ہاتھ روک دیا۔

"اس کا تو دماغ خراب ہے اماں! چلو، چائے پیو اور دفع ہو جاؤ۔"

حاجو نے چائے کا پہلا ہی گھونٹ منہ میں لیا تھا کہ ساری کی ساری چائے منہ سے باہر آگئی۔ دروازے میں اکرام کھڑا ہوا تھا۔ شمشیرہ بیگم حیرت سے منہ کھول کر رہ گئی تھیں۔ پھر انہوں نے گہری نگاہوں سے اکرام کا جائزہ لیا۔ اس وقت بھی وہ شہزادوں جیسے لباس میں تھا۔ چہرے پر بجلیاں کوند رہی تھیں۔ نیلی آنکھوں میں مسکراہٹیں رقصاں تھیں۔ شمشیرہ بیگم کا کلیجہ کباب ہوگیا۔ لیکن فوراً اپنے آپ کو تبدیل کیا۔ اکرام کی آنکھوں میں ہمیشہ ہی شرارت ہوا کرتی تھی۔ ماحول کو دیکھتا ہوا بولا۔

"خوب، خوب..... یہ کیا ہو رہا ہے..... حکومتِ وقت کچھ ست سی نظر آرہی ہے۔"

"اکرام! آتے ہی نوں کے پیچھے نہ پڑ جایا کر۔ یاد کر کے رو رہی تھیں تجھے اور تُو نے انہیں چھیڑنا شروع کر دیا۔"

"اب الفاظ میں تبدیلی کرنا پڑے گی باجی! بہرحال حاضر ہوگیا ہوں۔ چھٹی کا دن ہے۔ شاہ جی نے ناشتے کے لئے بلالیا تھا۔ ناشتہ کر کے آرہا ہوں۔"

"ارے..... ناشتہ کرلیا؟" شمشیرہ بیگم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اماں! رس کی کھیر کا سن کر تو یہ خود ہی پاگل ہو جائے گا اور تمہارے گلے لگ جائے گا۔" کوثر جہاں نے اکرام کو اشارہ کیا اور اکرام مسکرانے لگا۔

"ہوں..... تو رس کی کھیر پکی ہے۔"

"ہاں..... تجھے یاد نہیں کہ جب بھی رس کی کھیر پکتی تھی اماں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا تھا تُو۔ تم دونوں ہی کو سب سے زیادہ شوق تھا۔"

"ہمارے لئے کیا حکم ہے؟" حاجو نے کہا اور چائے کی پیالی واپس رکھ دی۔

"بس ذرا اندر آجاؤ، دو چار جوتے کھا کر جاؤ منحوس کہیں گے۔" شمشیرہ بیگم بولیں۔

"نہیں، نہیں..... اب جوتے کھانے کی کیا ضرورت ہے..... اب رس کی کھیر تو تیار ہو ہی گئی ہے۔" حاجو نے کہا اور باہر نکل گیا۔

"اماں تجھے بری طرح یاد کر رہی تھیں۔ صبح ہی صبح روتی ہوئی میرے کمرے میں آگئیں۔ دیکھ اکرام! تُو اماں کی عزت کیا کر۔ ورنہ میں تجھ سے بولنا چھوڑ دوں گی۔"

"ارے باپ رے..... گھر کا ماحول تو اس طرح تبدیل ہوگیا ہے جیسے سیاسی تبدیلیاں ہوتی ہیں، دنیا کے جغرافیے کی مانند۔ شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر چلو۔ بات اگر کھیر کی ہے تو کوئی تلخی زبان سے نہیں نکلنی چاہئے ورنہ کھیر کی مٹھاس میں کمی ہو جاتی ہے۔"

کوثر جہاں نے شمشیرہ بیگم کی طرف دیکھا اور بولی۔ "چار دن سے سکول جانے لگا ہے، ذرا باتیں تو سنو، مفکر اعظم بن گیا ہے۔"

شمشیرہ بیگم پوری طرح اداکاری کے موڈ میں تھیں۔ اکرام کو دیکھنے لگیں اور پھر دیکھ کر کھڑی ہوئیں۔ دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور اکرام کی جانب قدم بڑھا کر لپکیں تو اکرام ایک قدم پیچھے چلا گیا اور بولا۔

"رکو باجی..... رکو۔ محبتیں جب اچانک نفرتوں کی حدود سے نکل کر ایسی وسعتیں اختیار کرتی ہیں تو اس کے پس پردہ فطرت نہیں ہوتی۔"

"کیا بک بک لگا رکھی ہے تُو نے؟"

”بہت کچھ سیکھ لیا ہے میں نے اس دوران شاہ جی سے...... یہ نُنوں جو ہیں ناں ان کے بارے میں شاہ جی کا تجزیہ یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے شیش ناگ، دوسری اس کی مادہ ہوتی ہے۔ شیش ناگ تو بہت شریف ہوتا ہے لیکن یہ مادہ جو ہوتی ہے ناں وہ سانپوں کے پورے قبیلے پر حکمرانی کرتی ہے۔ بہت ہی چالاک اور بہت ہی زہریلی ہوتی ہے۔ تو ہماری جو نُنوں ہیں ناں، درحقیقت شیش ناگ کی مادہ ہیں۔“

شمشیرہ بیگم کے ہاتھ رک گئے۔ شاہ جی کا نام سنتے ہی آنکھوں میں آگ روشن ہوگئی۔ لیکن اس وقت کمزور نہیں پڑنا تھا۔ اس وقت کمزور پڑنے کا مطلب یہ تھا کہ جو منصوبہ ذہن میں بنایا تھا وہ سب چوپٹ ہو جائے۔ یہ رس کی کھیر اور یہ سارا ہنگامہ صبح ہی صبح بے مقصد نہیں تھا۔ اس کے لئے ایک باقاعدہ منصوبہ ذہن میں آیا تھا۔ کہنے لگیں۔

”دیکھا کوثر جہاں! کتنا بہکا دیا ہے اسے شاہ جی نے ہمارے خلاف۔“

”اماں تم اس کی باتوں کی بالکل پرواہ نہ کیا کرو...... چلو کھیر نکلواؤ، میں بھی چکھوں گی۔“

شمشیرہ بیگم مرے مرے قدموں سے باہر نکل گئی تھیں۔ کوثر جہاں، اکرام کو سمجھانے لگی۔ ”بری بات ہے اکرام! انسان، انسان تو ہوتا ہی ہے بیٹا۔ کبھی کبھی دل میں ماضی جاگ اٹھتا ہے۔ وہ تمہاری نانی اور میری ماں ہیں۔“

”باجی! تم ان کے فریب میں آ جاؤ تو تمہاری مرضی...... لیکن میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ نُنوں درحقیقت شیش ناگ کی مادہ ہیں۔“

”اور اگر کوئی تیری ماں کو ایسا کہے تو؟“ کوثر جہاں نے اکرام کو گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”تُو یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ وہ میری بھی ماں ہیں؟“

”سنو، ایک بات کہوں باجی! کھیر تو میری پسند کی ہوتی ہے۔ میں کھاؤں گا اسے۔ لیکن ایک پلیٹ میں نکلے گی۔ اور اگر تم بھی ساتھ ہوگی تو ٹھیک ہے۔ مگر پہلا چمچہ نُنوں اٹھائیں گی۔ اور جب چار پانچ چمچے وہ کھا لیں گی تب میں اور تم کھیر کی پلیٹ میں ہاتھ ڈالیں گے۔ یہ شرط ہے میری۔“

”ارے ارے...... کیوں؟“

”بس ہے...... کیوں کا کیا سوال ہے۔“

”میں نُنوں سے اس بات کی توقع بھی رکھتا ہوں کہ وہ کھیر میں زہر ملا کر مجھے دے دیں۔“

”خدا کی پناہ...... تیرا دل اتنا برا ہو چکا ہے؟“

”ہاں باجی! تم ہی سمجھتی رہو، مجھے مجبور مت کرنا۔“ اکرام نے ایسے لہجے میں کہا کہ کوثر جہاں کو خاموش ہونا پڑا۔ بہرحال ڈرامہ جاری رہا۔ کھیر کھائی گئی۔ اکرام کے کہنے کے مطابق ہی عمل ہوا تھا۔ اس کے کہنے سے ہٹ کر اس نے کھانے ہی سے انکار کر دیا تھا۔ پھر اکرام تو چلا گیا لیکن شمشیرہ بیگم کوثر جہاں کے پاس بیٹھ کر ٹسوے بہانے لگیں۔ کوثر جہاں کی آنکھوں میں ہمدردی ابھر آئی تھی۔ ماں تھیں آخر، کچھ بھی تھا، کہنے لگی۔

”تم اس کی باتوں کا ضرورت سے زیادہ احساس کرنے لگی ہو اماں! تم سے مذاق کر لیتا ہے۔ وہ اس کا شروع ہی سے عادی ہے۔“

”نہیں بس، ایسی ہی باتیں سوچ رہی تھی کہ آنسو نکل آئے۔“

”وہ کیا اماں؟“

”جب سے شاہ جی ہمارے محلے میں آئے ہیں اور انہوں نے اکرام کے سر پر ہاتھ رکھا ہے کتنی تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے کوٹھے کا ڈنکا بجتا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کوٹھے کو چار چاند تم نے لگائے کوثر جہاں! مگر اب میں یہ سمجھ رہی ہوں کہ تم دونوں ہی کو پتہ نہیں کیا ہوگیا۔ دیکھو کوثر جہاں! یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم لوگ کیا ہیں...... ہمارے ہاں رونق مہمانوں سے ہوتی ہے۔ یہاں صرف ساز و آواز کی سوداگری ہوتی ہے۔ ساز و آواز سے رشتے توڑ دو گی بیٹا تو خود سوچو کہ ہم کہاں جائیں گے؟ ہمیں کوئی عزت دار، عزت نہیں دے سکتا۔ کوئی بھی نہیں ہوتا ہمارا۔ پتہ نہیں یہ شاہ صاحب ہماری زندگی چھین لینے پر کیوں تل گئے ہیں۔“

”مگر اماں! وہ ہمارے معاملے میں کب آڑے آتے ہیں۔“

”ہائے یہی تو تمہاری معصومیت ہے۔ ابھی تم نے دنیا دیکھی کہاں ہے...... کچھ نہیں سمجھتی تم...... کچھ نہیں سمجھتی۔“

”ہم اپنے کوٹھے پر مجرا کرتے ہیں اماں! شاہ جی ہمیں اس سے کہاں روکتے ہیں؟“

”مگر وہ ہمارے معاملات میں مداخلت کرتے کیوں ہیں؟ ہمارا ان سے کیا رشتہ ہے آخر؟ یہاں اور بھی تو کوٹھے والیاں ہیں، شاہ جی نے کبھی ان پر تو ہاتھ نہیں ڈالا۔“

’’چھوڑیں، آپ بھی پتہ نہیں کیسی کیسی پریشانیاں خود پر سوار کر لیتی ہیں۔‘‘

’’کیسے چھوڑ دوں...... تم لوگوں کا مستقبل ہے۔ اور اب تو یہ ننھی سی جان بھی سامنے آ گئی ہے۔ تم نے تو خیر عمر گزار لی ہے۔ لیکن اب کوٹھوں کا ماحول بدل گیا ہے۔ ادھر وہ غزالہ اور شبانہ ہیں کہ کچھ کر کے ہی نہیں دیتیں۔ بتاؤ ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟‘‘

’’خیر اس کی فکر مت کرو۔ میرا دل بھی نہیں چاہتا اماں کہ تسنیم جوان ہو کر کوٹھے والی بنے، ناچ گانا کرے۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ اکرام کسی قابل ہو جائے تو دال روٹی میں ہی سہی، گزارہ کر لوں۔‘‘

’’نہیں جینے دے گی بیٹی دنیا...... ہاں، اگر کوئی دولت مند ہاتھ آ جائے، عزت داری سے اپنا کوئی مقام بنا لو تو شاید کوئی بات بن جائے۔ ورنہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ہمارے جاننے والے ہمیں کبھی عزت کا مقام نہیں دیں گے۔ یہی سمجھیں گے کہ کوٹھے چھوڑ کر اب ہم گھروں میں آ بیٹھے ہیں نئے شکار کرنے کے لئے۔‘‘

’’تو پھر یہ بتایئے آخر کریں کیا؟‘‘

’’دیکھو، جو حاصل ہو سکے، اسے حاصل کرو۔ وقت بار بار نہیں آتا۔ لوگ آتے ہیں، ایک سائی آئی ہے ہمارے پاس۔ ایک صاحب ہیں، نام ہے شہزادہ سلطان۔ کہتے ہیں کہ کوثر جہاں بیگم سے تنہائی میں ملاقات کرا دی جائے، جو مانگیں وہ دینے کو تیار ہیں۔ کہہ رہے ہیں کوٹھی لینا چاہو کوٹھی لے لو۔ دولت لینا چاہو دولت لے لو۔ سونے کے زیورات بھیجے ہیں۔ آنکھ کے اندھے، گانٹھ کے پورے ہیں۔ کیا کہتی ہو؟‘‘

’’تنہائی میں ملاقات سے کیا مراد ہے اماں؟‘‘

’’وہ اپنی کوٹھی میں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’واہ اماں، واہ...... سارے بت توڑ دیئے ایک لمحے کے اندر اندر۔‘‘

’’نہیں، نہیں...... غلط سمجھ رہی ہو۔ بہت پاکیزہ ماحول میں ملنا چاہتے ہیں وہ۔‘‘

’’واہ اماں، واہ...... آغاز آواز اور جسم سے کیا تھا۔ ایک چیز واپس لے لی اس میں سے آواز تو دے دی ہے آپ کو، جسم پامال نہ کریں تو کون سی ایسی مشکل پیش آ جائے گی۔ میرا اب دل نہیں چاہتا بدن فروشی کو اماں! تسنیم کو دیکھتی ہوں جو میرے سینے سے لپٹتی ہے اکرام جوان ہو گیا ہے۔ خدا کے لئے میری بات مان لیں۔ میری آواز کا سودا جہاں چاہے

کر لیں، جسم کا سودا نہ کریں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔‘‘

’’اور اگر میں نے تیری مرضی مان لی تو تُو میری مرضی مان لے گی؟‘‘

’’میں سمجھی نہیں اماں!‘‘

’’مطلب یہ ہے کہ شہزادہ سلطان اگر تجھ سے تھوڑی دیر ملاقات کرنا چاہیں تو کرے گی؟‘‘

’’جب چاہو انہیں کوٹھے پر بلا لو۔‘‘

’’نہیں، یہی تو گڑبڑ ہے...... نہیں آ سکتے۔ بہت ہی باعزت گھرانے سے ہیں۔ ماضی میں ان کے باپ دادا ہندوستان میں بہت بڑے رئیس تھے اور اب بھی ان کے شناسا ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں کب بھیس بدل کر کوٹھے پر آئے تھے، ہمیں تو پتہ بھی نہیں چل سکا۔ تمہاری آواز کے جال میں پھنس گئے اور اب تنہائی میں تھوڑی دیر کے لئے ملاقات چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ تم سے کوئی جسمانی رابطہ قائم نہیں کریں گے، بس اپنی اصل حیثیت سے تمہیں سنیں گے۔‘‘

’’تم نے ان سے وعدہ کر لیا ہے؟‘‘

’’تم سے پوچھے بغیر وعدہ کیسے کر سکتی تھی؟ پھر بھی کہہ دیا ہے کہ کوشش کروں گی۔ شرط یہ ہے کہ میری کوثر جہاں کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ ہو۔ قسمیں کھائی گئی ہیں اور کہا گیا ہے جس طرح چاہو اعتماد اور اعتبار کر لینا۔‘‘

’’کب جانا ہے؟‘‘

’’آج دوپہر کو بیٹی۔‘‘

کوثر جہاں گردن جھکا کر سوچ میں ڈوب گئی۔ سمجھ تو سب کچھ گئی تھی، بے وقوف نہیں تھی۔ لیکن ماں نے جو انداز اختیار کیا تھا اس سے جال میں پھنس گئی۔ کہنے لگی۔

’’ٹھیک ہے اماں...... جیسے تم پسند کرو۔ کس وقت جانا ہوگا؟‘‘

’’بس دو ڈھائی بجے تک وہاں پہنچ جانا ہے۔ مگر کوثر جہاں! وہی مشکل درپیش ہے۔ کیا شاہ جی راستہ نہیں روکیں گے؟‘‘

’’اب تم بتاؤ، اس کے لئے میں کیا کروں اماں؟‘‘

’’ذہن میں ایک ترکیب ہے میرے؟‘‘

’’بولو!‘‘

"دیکھو، حاجو یا غلام شاہ تو نگاہوں میں آچکے ہیں، تم باورچی کے ساتھ دوائی کی شیشی لے کر تانگے میں نکل جاؤ۔ کہنا مزنگ والے حکیم صاحب کے ہاں جارہی ہو۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد میں بھی تانگے میں بیٹھ کر آجاؤں گی۔ ہم تم دونوں شاہی مسجد کی سیڑھیوں پر مل لیں گے۔ پھر وہاں سے ہم چل پڑیں گے جہاں طلب کیا گیا ہے۔"

"جیسا تم چاہو اماں!"

"ذرا کپڑے ڈھنگ کے پہن لینا اور برقعہ اوڑھ لینا۔ وہاں جا کر برقعہ اتار لیں گے۔"

"ٹھیک ہے اماں۔" کوثر جہاں نے کہا اور شمشیرہ بیگم اسے تھوڑی دیر تک اونچ نیچ سمجھاتی رہیں، پھر باہر نکل آئیں۔ باہر حاجو اور غلام شاہ موجود تھے۔ شمشیرہ بیگم نے انہیں دیکھا اور ایک لمحے کے لئے سکتے میں آگئیں۔ پھر بولیں۔

"آؤ ذرا میرے کمرے میں۔"

کمرے میں پہنچ کر انہوں نے دروازہ اندر سے بند کرلیا اور بولیں۔ "کیا کر رہے تھے تم دونوں وہاں۔"

"انعام لینے کی تیاریاں۔" حاجو نے کہا۔

"میری جان پر جس طرح بنتی ہے، میں ہی جانتی ہوں...... اور تم ہو کہ کتے کے پلوں کی طرح کیاؤں کیاؤں کرتے رہتے ہو۔"

"ہر کام میں ہماری دعائیں شامل رکھا کرو شمشیرہ بیگم۔"

"تھو ہے تم پر اور تمہاری دعاؤں پر...... بھلا تمہارے جیسے گندے منہ سے دعائیں پوری ہوتی ہوں گی؟ فضول باتیں کرتے ہو۔"

"اب جو بھی کہو، ہمارا انعام بیچ میں سے نکال دینا۔ ورنہ نقصان ہی اٹھاؤ گی۔"

"اے حاجو! کبھی موت نے تمہاری طرف رخ نہیں کیا؟"

"لو، ایسی کیا بات ہے...... اس وقت بھی تم ادھر ہی منہ کئے ہوئے کھڑی ہو شمشیرہ بیگم۔" حاجو نے کہا۔

"نکلو...... چلو نکلو یہاں سے۔" شمشیرہ بیگم نے غلام شاہ اور حاجو کو دھکے دے کر ہال سے باہر نکال دیا تھا۔

○●○

کوثر جہاں آئینے کے سامنے آبیٹھی۔ چہرے کو درست کرنے والی تمام اشیاء نکالیں اور میک اپ کرنے لگی۔ آنکھوں میں درد سمٹا ہوا تھا اور ہونٹوں پر ایک زخمی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ کتنا مشکل کام ہے چہروں سے انسانوں کو دھوکا دینا...... کمال ہے۔ ڈریسنگ ٹیبل دروازے کے عین سامنے تھی۔ ہلکی سی جھری پیدا ہوئی۔ شمشیرہ بیگم نے متجسس نگاہوں سے اندر جھانکا اور اسے مصروف دیکھ کر پھر سے پیچھے ہوگئیں۔ کچھ لمحے باہر رہیں، پھر ایک بار دوبارہ جھری پیدا ہوئی اور اس بار وہ اندر آگئیں۔ مصری کی ڈلی بنی ہوئی تھیں۔ کہنے لگیں۔

"بہت دیر ہوجائے گی بیٹا! ذرا جلدی ہاتھ چلالو۔"

"ہاں اماں...... بس ابھی اٹھ جاتی ہوں۔" کوثر جہاں نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ماں کے چہرے پر بھی آرزوئیں تڑپ رہی تھیں۔ گو ان آرزوؤں کا رنگ مختلف تھا۔ پتہ نہیں کیوں رحم سا آرہا تھا۔ جلدی جلدی میک اپ کیا، کھڑی ہوگئی، بولی۔

"کیسی لگ رہی ہوں اماں؟"

"مجھ سے پوچھ رہی ہو بیٹا، کیسی لگ رہی ہو؟ جاؤ تسنیم پر نظر ڈال لو۔" شمشیرہ بیگم سارے جذباتی گر آزمارہی تھیں۔ لوہا اتنا نرم ہوجائے گا، تصور میں بھی نہیں تھا۔ کوثر جہاں آہستہ سے ہنسی، پھر بولی۔

"آصف خان تیار ہے؟"

"ہاں نیچے تانگے میں بیٹھا ہوا ہے۔" شمشیرہ بیگم نے جواب دیا۔

"تم کتنی دیر میں آؤ گی اماں؟"

"بس بیٹی! میں نے دوسرا تانگہ منگوا لیا ہے۔ جیسے ہی تمہارا تانگہ ہیرا منڈی سے نکل جائے گا، میرا تانگہ دروازے سے آلگے گا اور میں بھی پیچھے چلی آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے اماں...... اچھا چلتی ہوں۔" کوثر جہاں نے برقعہ اوڑھا اور دروازے سے لگے تانگے کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئی۔ دوپہر کا وقت تھا، ہیرا منڈی سو رہی تھی۔ شاہ جی کے

ڈیرے پر بھی خاموشی ہی طاری تھی۔ اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے کوثر جہاں نے احاطے کے دروازے پر تالا لگا ہوا دیکھا اور دل ہی دل میں مسکرا دی۔ اماں نے اتنا بڑا کھیل بیکار ہی کھیلا، یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر خاموشی سے اسی طرح نکل جاتیں تو خوامخواہ اتنی خجالت برداشت نہ کرنا پڑتی۔

تانگہ سڑکوں پر دوڑتا رہا اور کوثر جہاں نقاب کی جالی سے قرب و جوار کے مناظر دیکھتی رہی۔ شاہی مسجد کا فاصلہ تھا ہی کتنا؟ وہ شاہی مسجد پہنچ گئی۔ پھر چند ہی لمحوں بعد شمشیرہ بیگم کا تانگہ بھی قریب ہی آ گیا۔ شمشیرہ بیگم نے تانگے کو آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ فاصلے ختم ہوئے اور اس کے بعد تانگہ جس کوٹھی کے پاس جا کر رکا، شمشیرہ بیگم اس کی شان و شوکت دیکھ کر منہ پھاڑ کر رہ گئیں۔ دل میں نجانے کتنی حسرت آمیز دعائیں ابھری تھیں۔ باورچی سے کہنے لگیں۔

''چلو ذرا آگے بڑھ کر بات کرو۔''

باورچی آصف نے دروازہ بجایا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ ایک لمبے چوڑے بدن کا آدمی دروازے پر موجود تھا۔ اسی نے شہزادہ سلطان کا پیغام شمشیرہ بیگم کو دیا تھا۔ وہ احترام سے انہیں اندر لے گیا۔ کوٹھی کی شان و شوکت کوثر جہاں کے دل کو بھا رہی تھی، آرزو تھی کہ کاش شہزادہ سلطان اتنا ہی دل کا غنی نکلے کہ یہ کوٹھی انہیں دے جائے۔ ملازم نے برقعہ اتار کر بیٹھنے کے لئے کہا اور اندر چلا گیا۔ شمشیرہ بیگم نے کوثر جہاں کو ہمت دلائی۔

''گھبرانا بالکل نہیں بیٹا! میں یہیں موجود رہوں گی۔ آصف باہر رہے گا۔''

کوثر جہاں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔ کچھ لمحوں کے بعد ملازم آیا اور بولا۔

''آپ اندر تشریف لے آیئے۔'' اشارہ کوثر جہاں کی طرف تھا۔ کوثر جہاں آہستہ قدموں سے اس دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ شمشیرہ بیگم پہلو بدل کر رہ گئی تھیں۔ دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد ملازم نے کہا۔

''بس سیدھی چلی جایئے۔ سامنے جو دروازہ نظر آئے گا اسی میں جانا ہے آپ کو۔'' وہ واپس مڑا اور دروازہ بند کر کے شمشیرہ بیگم کے پاس آ بیٹھا۔ پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد دروازے سے شہزادہ سلطان باہر نکلا۔ کیا شاندار شخصیت تھی۔ اتنی اعلیٰ کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ شمشیرہ بیگم جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ شہزادہ سلطان نے آگے بڑھ کر شمشیرہ بیگم

کی طرف دیکھا اور بولا۔

''آپ کیسی ہیں شمشیرہ بیگم؟''

''حکم کی غلام ہوں...... بالکل ٹھیک ہوں...... حکم پر حاضر ہو گئی۔''

''ہاں شمشیرہ بیگم! عجیب ہے یہ دنیا اور عجیب ہیں یہ تماشے۔ کبھی کبھی دولت کے حصول کے لئے ایسے ایسے کھیل کھیلنا پڑتے ہیں کہ شاید زندگی بھر ضمیر ملامت کرتا رہے۔ پتہ نہیں تم لوگ کیسے ہو، کون ہے وہ لڑکی، کیا نام ہے اس کا، کوثر جہاں...... وہ اس زمین کی بیٹی نہیں ہے شمشیرہ بیگم! وہ تو سُر ساگر کی جل پری ہے۔ ایسے حسین سُر پائے ہیں اس نے کہ لوگ سوچ بھی نہ پائیں۔ کاش ساز و سنگ یکجا نہ ہوتے۔ سنگیت کی یہ بے حرمتی مار رہی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا شمشیرہ بیگم کہ تم اس کی آواز فروخت کرتیں۔ اس آواز کے مرکز کو تباہ نہ کرتیں۔''

''بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔''

''ہمارا کام ختم ہو گیا ہے شمشیرہ بیگم...... ہماری ڈیوٹی یہیں تک تھی۔''

''میں سمجھی نہیں...... عجیب سی باتیں کر رہے ہیں آپ شہزادہ صاحب۔''

''شہزادہ صاحب؟'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

''تو پھر؟''

''کرائے کے شہزادے ہیں ہم...... بلکہ کرائے کے ٹٹو ہیں۔ نام تو ہمارا شہزادہ سلطان ہی ہے مگر قوم کے بھانڈ ہیں، دو کوڑی کے بھانڈ۔ بہروپ بدلتے ہیں، سوانگ بدلتے ہیں، پیسے کماتے ہیں۔ بدقسمتی سے خاندان ہمارا بھانڈوں کا ہی ہے۔ راجہ، مہاراجہ اور نوابوں کو خوش کیا جاتا ہے۔ مگر اس بار ہمیں ایک ایسے شخص کو خوش کرنا پڑا ہے جو کسی کی عزت کے درپے ہے۔''

''اے بھیا کیا کہہ رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''شمشیرہ بیگم! اندر سرخ اعمال ہو رہے ہیں، کیا کریں۔ سنگیت سے واقفیت رکھتے ہیں، اس کی بلندی کو سمجھتے ہیں۔ ہم نے کوثر جہاں کو سنا ہے۔ پہلے تو ہم خوشی سے اس کام کے لئے تیار ہو گئے تھے، لیکن اب ہمارے دل میں کچوکے پڑ رہے ہیں۔ وہ اپنی خوشی سے نہیں آئی ہو گی، اسے تو کسی اور نے بلایا ہے ہمارے ذریعے۔''

''کک...... کیا...... کس نے؟'' شمشیرہ بیگم کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

شہزادہ سلطان نے دکھ بھری نگاہوں سے شمشیرہ بیگم کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"راجہ شرافت علی کو تو جانتی ہیں نا آپ؟"

"ہاں...... کیوں نہیں؟"

"وہ اندر موجود ہیں...... انہوں نے ہی ہم سے یہ ناٹک کرایا تھا۔"

"یہ...... یہ...... یہ کوٹھی...... ہائے غضب...... یہ غضب...... ہائے کہاں ہے میری بچی...... ہائے کیا ہو رہا ہے۔"

"بس کیا کریں۔" شہزادہ سلطان نے کہا اور شمشیرہ بیگم اس دروازے کی جانب بھاگیں جسے باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔

"اے مردتم...... تمہارا ستیاناس...... میری بچی...... کیا ستم ہو رہا ہے اس پر...... اسے دھوکا دیا گیا ہے...... ہائے ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے...... ہائے دھوکا......" شمشیرہ بیگم معمول کے مطابق بین کرنے لگیں۔

دوسری طرف کوثر جہاں نے اس عالیشان کوٹھی میں داخل ہوتے ہی دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ ویسے بھی اسے احساس ہو گیا تھا کہ جو کچھ کرتی رہی ہے اور شاہ جی نے اس سلسلے میں جس طرح مداخلت کی ہے وہ شمشیرہ بیگم کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک کا ماحول اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ ایک رات نہ آ جاتی جو ایک اجنبی کے ساتھ گزاری تھی تو اب تک شاید کوثر جہاں ملک کے گوشے گوشے میں دھوم مچا چکی ہوتی۔ لیکن وہ آیا اور چلا گیا اور دل پر ایک ایسا نقش چھوڑ گیا کہ جو مٹائے نہ مٹتا تھا۔ اب تو بہت سے سال گزر چکے تھے لیکن کوثر جہاں کوششوں کے باوجود نیلی آنکھوں کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکی تھی۔

بہر حال وہ اندر داخل ہو گئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا، وہ شہزادہ سلطان کا انتظار کر رہی تھی۔ دروازے غالباً بند ہو چکے تھے۔ لیکن ایسے دروازے کوثر جہاں کو پریشان نہیں کرتے تھے۔ البتہ جب سامنے کے دروازے سے ایک شخصیت اندر داخل ہوئی تو ایک لمحے کے لئے کوثر جہاں کا دل لرز گیا تھا...... بھلا راجہ شرافت علی کو نہ پہچانتی؟ راجہ شرافت علی کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ چہرے پر تلوار کی کاٹ جیسا طنز۔

"کوثر جہاں بیگم! بیٹھو...... کیا بیٹھنے کے لئے کوئی موزوں جگہ نہیں مل رہی؟"

"آپ......؟" کوثر جہاں نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"جی...... راجہ شرافت علی ہے ہمارا نام۔ غلطی ہوئی، آپ ذرا سی معلومات کرا لیتیں ہمارے بارے میں تو کسی پریشانی کا شکار نہ ہونا پڑتا۔ بہر حال......"

"آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی ہے۔ یہاں پر ایک صاحب شہزادہ سلطان تھے جنہوں نے مجھے یہاں طلب کیا ہے۔"

"بھیجا تھا بھئی تمہاری اماں جان کے پاس۔ بات اصل میں یہ ہے کہ طوائف کو طوائف ہی رہنا چاہئے، شریف زادی نہیں بننا چاہئے۔ بھلا رنڈی کی بھی کوئی پسند ہوتی ہے؟ اس کی پسند تو سونے کا زیور اور کرارے نوٹ ہونے چاہئیں۔ جو بھی دکھائے وہ اس کا محبوب۔ لیکن تم نے عجیب ہی چولا پہن لیا۔ شریف زادی بن گئیں...... اگر کوئی کوٹھے پر رہے تو اسے اپنا مذاق خود نہیں اُڑانا چاہئے۔ کیونکہ کوٹھوں پر آنے والے ان جیسے نہیں ہوتے۔ ان میں شریف بھی ہوتے ہیں اور شوقین مزاج بھی۔ اگر کوئی رنڈی شریف زادیوں جیسے کپڑے پہن کر چہرے پر مکاری پیدا کرے، ان کے سامنے شریف زادی بن کر آئے تو ان کی نگاہوں سے نہیں چھپ سکتی۔ یہ تم کوٹھے پر کیوں رہنے لگیں کوثر جہاں بیگم؟"

"آپ سخت ناراض معلوم ہوتے ہیں شرافت علی صاحب!"

"کس نے تربیت دی ہے تمہیں...... چہرے کی مسکراہٹ کا مصنوعی پن بھی نہیں چھپا سکتیں۔ اب آ پھنسی ہو تو لہجہ نرم کر لیا...... ایک معیار تو رکھنا چاہئے انسان کو اپنا۔ جن الفاظ میں تم نے اپنے گھر میں ہمارا خیر مقدم کیا تھا، وہی لہجہ ہوتا تو ہم سمجھتے کہ کچھ تو جی داری ہے۔ مرد تو خیر مرد ہوتا ہی ہے، لیکن کوثر جہاں بیگم! عورت بھی عورت ہوتی ہے۔ عورت اگر عورت نہ ہو تو کچھ نہیں ہوتی۔ مرد تو خیر ڈھک چھپ جاتا ہے مگر عورت نہیں۔ میں تو تمہیں نہ عورت قرار دیتا ہوں۔"

"میں عرض کر چکی ہوں کہ آپ سخت ناراض ہیں۔ ہاں، ہو سکتا ہے کہ اس میں میری ہی غلطی ہو۔ لیکن راجہ صاحب! آپ نے جو بہت سی باتیں میرے بارے میں کہی ہیں، ان میں غلط ایک بھی نہیں ہے۔ اختلاف کروں تو کون سی بات سے کروں؟"

"بیٹھ جاؤ...... بیٹھ جاؤ۔"

"شکریہ......" کوثر جہاں صوفے پر بیٹھی، پھر بولی۔ "تو وہ شہزادہ سلطان......"

"کرائے کا شہزادہ تھا...... کرائے کا بادشاہ تھا...... کرائے کا ٹٹو، ایک اداکار۔ تم ڈرامے نہیں دیکھتی ہو؟ بس تمہاری ہی نسل کا ایک آدمی تھا، چند پیسوں سے خریدا ہوا اور یہ خرید و فروخت راجہ جیسا آدمی ہی کر سکتا ہے بی بی۔ زندگی گزار دی ہے رنڈی بازی میں۔ ایسے کھیلا ہے یہ کھیل جیسے لوگ کبوتر بازی کرتے ہیں۔"

"میں پھر عرض کرتی ہوں راجہ صاحب! میں تو حکم کی بندی ہوں۔ بس کچھ عوامل ایسے ہو گئے تھے اُس وقت کہ لہجہ کچھ سخت ہو گیا...... آپ بھی شاید ذہنی طور پر برگشتہ تھے، کسی بات پر ناراض ہو گئے اس لئے ذرا غلط سمجھ بیٹھے۔ مگر آپ نے یہ خوب سنائی کہ وہ شہزادہ سلطان صرف ایک تماشہ تھے۔ خوب۔"

"جی ہاں...... بات اصل میں یہ ہے کہ جب ہم پتنگ کا دھاگہ توڑ دیں، اس پتنگ کا جو ہماری مرضی کے بغیر غوطہ کھا جائے تو پھر آپ جانتی ہیں کہ پتنگ لوٹنے والے اپنا حق استعمال کرتے ہیں۔ مگر آپ کو یہ سن کر ہنسی آئے گی کوثر جہاں بیگم! کہ ہماری توڑی ہوئی پتنگ کو بھی لوٹنے والے ہمارے نامزد کئے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس پتنگ کی ڈور راجہ شرافت علی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور جسے راجہ شرافت علی کا ہاتھ چھو جائے اسے کوئی اور ہاتھ اس وقت تک نہیں چھوتا جب تک کہ راجہ شرافت علی کی اجازت نہ ہو۔ آپ ہماری پسند تھیں کوثر جہاں بیگم! ہم نے آپ کو جس عزت سے حاصل کرنا چاہا آپ کو وہ راس نہیں آئی۔ اتنا دے دیتے آپ کو کہ آپ خود حیران رہ جاتیں کہ کیا آپ کی اتنی قیمت ہو سکتی ہے...... مگر کیا، کیا جائے...... وہ آپ کی قسمت میں نہیں تھا۔ اور جو آپ کے لئے مخصوص کیا تھا ہم نے، وہ دوسروں میں بانٹ دیا...... اور پھر دوسروں کو ہم نے یہ حق دیا کوثر جہاں بیگم! آپ کی قیمت ادا کر دی گئی ہے۔ اور اب ہمارے ان پتنگ لوٹنے والوں سے جو یہاں آنے کے بعد آپ کو لوٹیں گے، مل لیں۔ آ جاؤ بھئی...... آ جاؤ...... حصہ بانٹ لو۔ آ گئی ہیں کوثر جہاں بیگم۔"

کوثر جہاں کا تنفس تیز ہو گیا۔ اس شیطان نے اپنی کہانی پوری سنا دی تھی۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ بہت خوفناک لگ رہا تھا۔ اس نے پھر جدوجہد کی اور بولی۔

"راجہ صاحب! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو کیا وہ غلطی قابل معافی نہیں ہے؟ آپ نے مجھے طلب کیا ہے، حاضر ہوں۔ لیکن میری تذلیل تو نہ کریں۔"

"تذلیل...... ارے بی بی! تمہاری عزت ہی کیا ہے جو تمہاری ذلت ہو۔ ہم تو سارے عیش پورے کر چکے ہیں، ایک سے ایک پری ذوق ہمارے پہلو میں آ چکی ہے۔ تم کیا اور تمہاری صورت کیا۔ اپنی عمر نہیں دیکھتیں؟ وہ تو بس تمہاری آواز کا گداز تھا جس نے تمہاری شخصیت کو نظر انداز کر کے ہمیں تمہاری جانب متوجہ کیا تھا۔ کمال ہے۔ بہرحال کوثر جہاں! آپ کو یہ دن ہر دن یاد آئے گا۔ راتیں تو آپ کی خیر جیسی ہوتی ہوں گی، ہوتی ہوں گی...... لیکن آج کا دن آپ کے لئے ایک یادگار دن ہو گا۔"

"نہیں راجہ صاحب! آپ جو کہہ رہے ہیں، ایسا ممکن نہیں ہو گا۔"

"ہو گا...... ہو گا...... جو پہلے ممکن نہیں ہوا تھا وہ اب ممکن ہو گا۔ اور جسے اب آپ ناممکن سمجھ رہی ہیں وہ بھی ابھی ممکن ہو جائے گا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہم آپ کو یہاں بلاتے اور آپ کی ناک چوٹی کاٹ کر آپ کے ہاتھ پر رکھتے اور دھکے دے کر یہاں سے نکال دیتے۔ پہلے یہی ارادہ تھا لیکن ہمارے بچے ہم سے یہ کہنے لگے کہ نہیں راجہ صاحب! آپ کا جھوٹا تو کھاتے رہے ہیں، آج وہ کھا لیتے ہیں جو آپ کو پسند نہیں۔ ہم نے کہا چلو یار...... کھاؤ، عیش کرو۔ اور اس کے بعد کوثر جہاں بیگم کو کوٹھی سے باہر نکال دینا۔ پھر دیکھ لیں گے کہ ان کے ہاتھوں کی لمبائی کتنی ہے۔ سزا ہلکی کر دی ہے کوثر جہاں بیگم! خوش ہو جائیے۔ ورنہ جو شکل لے کر آپ کوٹھے پر واپس جاتیں اسے دیکھ کر کتے بھی آپ کی طرف منہ کر کے نہ روتے۔"

راجہ شرافت علی کی آوز میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں اور کوثر جہاں ان آہٹوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

نواب دین، رحمت خان، اور حیدر خان وغیرہ اندر داخل ہو گئے تھے۔ غالباً شراب پی تھی انہوں نے...... ان کی آنکھوں میں بھوکے کتوں جیسی چمک تھی اور یہ بھوکے کتے کوثر جہاں پر جھپٹ پڑنے کے لئے تیار تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے...... اس وقت وہ بے بسی کی آخری منزل میں داخل ہو چکی تھی۔ اور راجہ شرافت علی ہنس کر یہ کہہ رہا تھا۔

"یہ تینوں دیکھ رہی ہیں ناں...... آپ ذرا ان کے جسموں کو غور سے دیکھئے، یہ سب آپ کے لئے مخصوص کر دیئے ہیں ہم نے...... چلو بھئی، آج ہم سے شرم کیسی...... ہم بھی تماشہ دیکھیں گے۔" راجہ شرافت نے کہا...... لیکن اسی وقت کچھ ہوا...... دروازے پر پہلے

زوردار گڑگڑاہٹ ہوئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔

شمشیرہ بیگم ہانپتی کانپتی ہائے میری بچی، ہائے میری بچی کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوگئیں...... وہ سب ایک لمحے کے لئے شمشیرہ بیگم کی طرف متوجہ ہوئے اور کوثر جہاں بیگم نے موقع غنیمت جان کر کھلے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی...... شمشیرہ بیگم بھی چیختی ہوئی اس کے پیچھے لپکی تھیں......!

○●○

جو کچھ ہوا تھا، اچانک ہی ہوا تھا۔ راجہ شرافت علی نے غراتے ہوئے کہا۔

”پکڑو حرام زادی کو...... پکڑو اسے......“ اور وہ تینوں گردش میں آ گئے۔ راجہ شرافت علی نے بھی دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی تھی۔ ان سب نے شمشیرہ بیگم کو نظر انداز کر دیا تھا۔ شمشیرہ بیگم بھی بری طرح باہر کے دروازے کی طرف دوڑی تھیں۔ دروازے سے باہر نکلیں تو انہوں نے کوثر جہاں کو بڑے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ تینوں درندے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ شمشیرہ بیگم بھی دوڑتی ہوئی باہر نکل آئیں اور جب وہ باہر نکلیں تو انہوں نے کوثر جہاں کو تھوڑے فاصلے پر موجود ایک کوٹھی کے گیٹ سے اندر گھستے دیکھا...... وہ دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی تھی اور یہ لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ خود شمشیرہ بیگم کی حالت بری ہو رہی تھی۔ قرب و جوار بالکل سنسان پڑے ہوئے تھے۔ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ خود بھی اس کوٹھی کے اندر داخل ہوگئیں۔

کوثر جہاں بری طرح بھاگ رہی تھی اور ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ اس کے دانت بھنچے ہوئے تھے، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ عظیم الشان کوٹھی تھی۔ بہت وسیع لان بنا ہوا تھا جس میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ چند افراد ان پھولوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ بھاگنے کی آواز سن کر انہوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ غالباً کوٹھی کے مکین تھے۔ حیرانی سے ان لوگوں کو دیکھتے رہے۔ کوثر جہاں نے بھی ان لوگوں کو دیکھا تو ایک لمبا چکر کاٹ کر ان کی جانب دوڑ پڑی اور ان کے قریب پہنچ گئی۔ اس کا سانس بھونپو بنا ہوا تھا...... وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر مدد کے لئے پکارنا چاہتی تھی لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ البتہ جو کچھ دیکھا اسے دیکھتے ہی جسم تھرا گیا...... آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں...... یقین نہیں آ رہا تھا کہ فرشتے اس طرح آسمان سے براہِ راست نیچے اتر آتے ہیں۔

سامنے کھڑے ہوئے لوگ رب نواز اور اس کے ساتھی تھے۔ اکرام بھی تھا...... شمشیرہ بیگم گیٹ سے سیدھی وہیں پہنچ گئی تھیں۔ رحمت خان، نواب دین اور حیدر خان شرافت علی کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے اندر پہنچے تھے اور پھر برق رفتاری سے آگے بڑھ کر وہ کوثر جہاں کے قریب آ گئے اور قریب پہنچ کر انہوں نے کوثر جہاں کو بری طرح جکڑ لیا۔ کوثر جہاں نے بے بسی کی نگاہوں سے شاہ جی کو دیکھا جو سرد نگاہوں سے اس منظر کا جائزہ لے رہے تھے۔ پیچھے راجہ شرافت علی خان بھی دوڑ کر قریب آ گیا۔

”اٹھا لو کتیا کی جنی کو...... مار مار کر بے ہوش کر دو...... چہرے کے نقوش بگاڑ دو...... سر کے بال نوچ لو اور کندھے پر لاد کر لے چلو۔“ راجہ شرافت علی نے غراتے ہوئے کہا۔ تب شاہ جی دو قدم آگے بڑھے اور بولے۔

”ارے او...... او چمار کی اولادو...... کس گدھی نے جنا تھا تمہیں حرامیو! تمہارے باپ کا گھر ہے جہاں دنگا فساد کرنے چلے آئے؟“ شاہ جی نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا اور راجہ شرافت علی چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

”ہم معافی چاہتے ہیں جناب! لیکن آپ یہ کیسی زبان استعمال کر رہے ہیں؟ آپ کو پتہ نہیں اصل واقعہ کیا ہے۔“

”واقعہ تو حرامی کے بچے مجھے پتہ چل ہی جائے گا۔ لیکن ایک منٹ کے اندر اندر اسے چھوڑ دو۔ اگر ایک منٹ اور تم نے اس کے بدن پر ہاتھ رکھا تو تم ان ہاتھوں سے دوبارہ کچھ کرنے کے قابل نہیں رہو گے۔“

پتہ نہیں یہ کیسی آواز تھی اور اس آواز میں کیا جادو تھا کہ جن لوگوں نے کوثر جہاں کو پکڑا ہوا تھا ان کے ہاتھ ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ کوثر جہاں دو قدم آگے بڑھی اور ساکت ہوگئی۔ اکرام اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے نواب دین، حیدر خان اور رحمت خان کو دیکھ رہا تھا اور اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور آنکھیں آہستہ آہستہ سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ راجہ شرافت علی نے کہا۔

”یہ آوارہ عورتیں ہماری کوٹھی میں گھس آئی تھیں اور وہاں سے چوری کر کے بھاگی ہیں۔ ہم انہیں نہیں چھوڑیں گے۔ آپ سے ایک بار پھر معذرت چاہتے ہیں کہ بغیر اجازت آپ کی کوٹھی میں گھس آئے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ پہلے یہ گھسی تھیں۔“

"کتیا کے پلّے! شریف زادہ بننے کی کوشش کر رہا ہے ہمارے سامنے...... حرامی! اپنی شکل تو سنبھال نہیں سکا ٹو۔ اس شکل پر شرافت کا نام ونشان ہے؟"

"دیکھو، تم جو کوئی بھی ہو بہت بدتمیزی کر رہے ہو۔ مجھے نہیں جانتے میں کون ہوں؟ وہ سلوک کروں گا تمہارے ساتھ کہ کوٹھی بھول جاؤ گے۔"

شاہ جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"واہ...... سنا تم لوگوں نے افضل خان، شاملے! سنا تم لوگوں نے بھیا! ہماری کوٹھی میں گھس آیا ہے یہ حرامی اور ہمیں ہی غصہ دکھا رہا ہے۔ ان عورتوں کو آوارہ کہہ رہا ہے۔ کیا لے کر بھاگی ہیں تیرا پتر؟"

"تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ بہت بدتمیزی کر رہے ہو تم...... یہ تمہارا گھر ہے، اس لئے خاموش ہوا جا رہا ہوں۔ ورنہ جواب دیتا تمہیں۔"

"اے بھیا! جواب میں ہی تو مزہ آتا ہے۔ چلو بڑی بی! تم بھی یہاں آ جاؤ۔ لڑکی! تم بھی۔ ہم اس کا جواب سن لیں ذرا۔"

کوثر جہاں کو تو جیسے سانپ ہی سونگھ گیا تھا۔ پورا بدن پتھرا کر رہ گیا تھا۔ شاہ جی اور اس کوٹھی میں؟ ساتھ میں اکرام بھی تھا اور شاہ جی کے آدمی بھی۔ لیکن شمشیرہ بیگم کے بدن میں اچانک جنبش پیدا ہوئی۔ یہ تو خیر بعد کی بات ہے کہ ان لوگوں کی موجودگی یہاں کیا معنی رکھتی ہے اور اس وقت یہ فرشتے بن کر کیسے پہنچ گئے؟ فی الحال تو راجہ شرافت علی سے جان چھڑانی تھی۔ جلدی سے آگے بڑھیں اور رب نواز شاہ کے پاؤں پکڑ لئے۔

"بچاؤ شاہ جی ہمیں...... بچاؤ ان موذی ماروں سے۔ دھائی ہے شاہ جی! بچا لو ہمیں ان سے۔ ورنہ مارے جائیں گے ہم۔"

راجہ شرافت علی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور ان لوگوں نے لمبے لمبے چھرے نکال لئے۔ اب ذرا دوسری زبان استعمال کرنی تھی۔ ان کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ سامنے کون لوگ موجود ہیں...... چھرے لہراتے ہوئے خونخوار نگاہوں سے سامنے کھڑے لوگوں کو دیکھنے لگے۔ اکرام بالکل خاموش کھڑا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لئے۔ شاہ جی نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور بولے۔

"لو بھئی...... یہ تو واقعی مرد لگ رہے ہیں...... اب کیا کریں...... دے دیں ان دونوں کو

انہیں؟"

شاہ جی کے آدمی صورتحال کو سمجھ چکے تھے۔ غیر مسلح وہ بھی نہیں تھے، چاقو بھی موجود تھے کمر پر اور بھی کچھ بندھا ہوا تھا۔ چاقوؤں کا کھیل تو اس وقت مناسب نہیں تھا کیونکہ کسی کو جانے پہچانے بغیر زخمی کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ البتہ انہوں نے اپنی کمر سے وہ خصوصی ہتھیار کھول لئے۔ ان لوگوں کو احساس تھا کہ وہ اس وقت بڑی نازک پوزیشن میں ہیں۔ راجہ شرافت علی بے وقوف آدمی نہیں تھا۔ بہرحال انہوں نے خونخوار نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور تینوں پینترے بدلنے لگے۔ شاہ جی پیچھے ہٹ گئے تھے۔ شمشیرہ بیگم بھی دوڑ کر کوثر جہاں کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ کوثر جہاں کا جسم اب بھی بے جان تھا۔ وہ کسی پتھر کے مجسمے کی مانند کھڑی ان تمام معاملات کو دیکھ رہی تھی۔ راجہ شرافت علی نے ایک بار پھر ہاتھ اٹھائے۔ پھر بولا۔

"دیکھئے جناب! ہم بے شک آپ کے گھر میں آپ کی اجازت کے بغیر گھس آئے ہیں لیکن یہ ایک حادثہ ہے۔ آپ ان دونوں عورتوں کو ہمیں لے جانے دیجئے۔ ہم آپ سے معافی مانگ کر چلے جائیں گے۔"

"ساری باتیں بعد میں کر لیں گے۔ ذرا ان جوانوں کی خنجر زنی دیکھ لیں، مزہ آئے گا۔" شاہ جی نے کہا اور پھر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ یہ اشارہ تھا اپنے ساتھیوں کے لئے۔ شاہ جی نے کہا۔

"سنو! تین چاقو، تین آدمی سامنے آئیں گے۔ تم چار ہو گئے تو پھر عزت چلی جائے گی۔ تین پر تین، ایک پر ایک ہو گا تو مزہ آئے گا۔"

نواب دین اور رحمت خان نے پینترے بدل کر چاقوؤں کے وار کئے لیکن دوسرے ہی لمحے رسیوں میں بندھے ہوئے لوہے کے لٹو اُن کی کمر میں پڑے اور وہ ٹیڑھے ہو گئے۔ دوسرا وار ان کے ہاتھوں پر ہوا اور تیسرا پیروں پر...... وہ اچھلنے کودنے لگے۔ چاقو کئی بار لہرائے لیکن ان کی پہنچ ان کے جسموں تک نہ ہو پائی۔ سارے وار خالی جا رہے تھے۔ ادھر وہ لوگ تھے کہ ہلکی ضربیں لگا رہے تھے۔ کیونکہ ایک بھی بھاری ضرب ان لوگوں کو اچھا خاصا سبق دے سکتی تھی۔ وہ سب کے سب جانتے تھے کہ کس صورتحال میں کیا کرنا ہے۔ چنانچہ بس ان کی ہلکی پٹائی کی جا رہی تھی۔ لیکن جہاں بھی ضرب پڑتی، ان کے حلق سے چیخیں نکل

پڑتیں۔ ایک ہی منٹ میں یہ اندازہ ہو گیا کہ واسطہ لڑاکوں سے پڑا ہے اور مار کھانے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ سب سے پہلے نواب دین نے چاقو پھینک کر مارا اور شالے خان نے بڑی مہارت سے اسے اپنی مٹھی میں پکڑ لیا۔

"ابے خستی! اس کھیل میں تو ساری زندگی گزر گئی ہے اور تم یہ کھیل ہمارے ساتھ کھیل رہے ہو سالو...... ہیجڑے ہی ہو پورے کے پورے...... ابے پستول نہیں ہے تم میں سے کسی کے پاس؟"

اسی وقت راجہ شرافت علی کو کچھ خیال آیا، اس نے بڑی پھرتی سے اپنے لباس کی اندرونی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ لیکن اسی وقت ایک بلا اس کے ہاتھ سے آ لپٹی۔ دور کھڑے ہوئے آدمی نے وہ ہتھیار پھینک کر مارا اور اس کا ایک گولہ راجہ شرافت علی کی انگلیوں کی انوں پر لگا۔ پستول نکل کر دور جا گرا۔ یہ پھرتی بھی قابل دید تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ ایک بار پہلے بھی ایک چاقو اس کی کلائی میں پیوست ہو گیا تھا اور اس نے ایک لمحے کے اندر اندر یہ بھی پہچان لیا تھا کہ چاقو مارنے والا لڑکا اس وقت بھی اس کے سامنے موجود ہے۔ شالے خان نے کہا۔

"اب تو اجازت ہے شاہ جی! یہ بھی لڑائی میں شامل ہو جائے؟"

اس سے پہلے کہ کوئی اور آگے بڑھتا، اکرام سامنے آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر شالے خان کو روکا اور شاہ جی ہنس پڑے۔

"ٹھیک ہے یار! اسے اس بچے ہی سے لڑنے دو تا کہ اس کتیا زادے کو اپنی اوقات کا پتہ چل جائے۔"

اکرام آہستہ آہستہ راجہ شرافت علی کو گھورتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ راجہ شرافت علی نے اکرام کو اچھی طرح پہچان لیا تھا اور اس کے دماغ میں حیرانی بھی تھی اور غصہ بھی۔ اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔

"ایک بار پھر کہتا ہوں کہ یہ بدتمیزی بند کی جائے۔ میرا نام راجہ شرافت علی ہے، ایک ہزار غنڈے پال رکھے ہیں۔ تم لوگوں کے نام و نشان کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔ یہ سب کچھ جو......"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اکرام نے اچانک پلٹ کر پاؤں اوپر اٹھایا اور اس کی

لات راجہ شرافت علی کے جبڑے پر پڑی۔ راجہ شرافت علی الٹ کر پیچھے جا گرا تھا۔ اکرام آگے بڑھا اور اس نے راجہ شرافت علی کے بال پکڑ لئے۔ راجہ شرافت علی نے گھونسے چلائے لیکن اکرام نے اپنے بدن کو جنبش دے کر اس کے یہ وار خالی کئے اور اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔ جیسے ہی راجہ شرافت علی کھڑا ہوا، اکرام کا تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور راجہ شرافت علی کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔ پھر اس کی کمر پر ایک لات پڑی اور وہ کئی قدم دوڑتا چلا گیا اور پھر اس کے بعد اوندھے منہ گھاس پر گر پڑا۔ اکرام اچھل کر اس کی کمر پر جا کھڑا ہوا۔ اس نے دو تین لاتیں راجہ شرافت علی کے بدن کے پچھلے حصے پر ماریں اور اسے اٹھنے کے لئے کہا۔ راجہ شرافت علی اب صرف جان بچانے کے لئے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ یہ لڑکا تھا کہ آفت...... کہیں دال ہی نہیں گلنے دے رہا تھا۔ راجہ شرافت علی بھی معمولی تن و توش کا آدمی نہیں تھا لیکن اپنی تمام تر کوششوں میں ناکام رہ کر وہ اکرام کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکا تھا اور اکرام گھوم گھوم کر اس کی مرمت کر رہا تھا۔ دو تین منٹ کے بعد راجہ شرافت زمین پر چت پڑا ہوا تھا۔ ادھر ان لوگوں کے چاقو ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ چکے تھے اور وہ صرف پٹ رہے تھے۔ جو ضربیں ان کے جسموں پر لگ چکی تھیں وہ اتنی تھیں کہ ان سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ حلیے بگڑ چکے تھے۔ جسم کے کئی حصوں سے خون چھلکنے لگا تھا۔ راجہ شرافت علی بری طرح اکرام کے ہاتھوں پٹ رہا تھا۔ اچانک ہی اس نے چیخ کر کہا۔

"تمہارا ستیاناس جائے کم بختو! رک جاؤ، ہم جا رہے ہیں...... ہم یہاں سے جا رہے ہیں...... رک جاؤ...... اسے روکو...... ہائے اس آفت کو روکو...... کمبخت جن کا بچہ ہے کیا؟"

اکرام نے راجہ شرافت علی کے پورے کپڑے تار تار کر دیئے تھے اور اب وہ تقریباً برہنہ ہو گیا تھا۔

"چھوڑ دے بیٹا، چھوڑ دے...... کافی ہے اس کتیا زادے کے لئے۔ اب ذرا دوسرا کھیل کھیلیں گے۔ رک جا اکرام! رک جا...... مرنہ جائے، رک جا میرے لال! تیری منت کرتا ہوں میں۔" اور اکرام نے راجہ شرافت علی کے منہ پر تھوکا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ باقی افراد بھی اب پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے اور شاہ جی مسکرا کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے جو زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

"ہاں تو بتا دے کہ کیا چرا کر بھاگی ہیں یہ تیرے گھر سے...... ذرا حساب کتاب بتا

دے۔ تلاشی لے لیں گے ان کی۔ جو کچھ تیرا ہے وہ تجھے ضرور دلوا دیں گے۔ بولے گا کچھ؟''

''جو کچھ ہو چکا ہے اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔'' راجہ شرافت علی اٹھتے ہوئے بولا۔

''واہ رے واہ...... کسی بہت ہی کھاجو کتے کی اولاد لگتا ہے۔ رسّی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔ چل تھوڑا سا اور سہی...... اکرام! ذرا سنبھال اس کو۔''

اکرام دو قدم آگے بڑھا تو راجہ شرافت علی نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑا کر گر پڑا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ''رک جاؤ...... تمہیں خدا کا واسطہ رک جاؤ۔ میری بات تو سن لو۔''

''رک جا...... خدا کا واسطہ دے رہا ہے بیٹا! رک جا، بری بات ہے۔'' پھر شاہ جی آگے بڑھے اور بولے۔

''ہاں بھئی...... کیا بات سنا رہا تھا پوری؟''

''یہ دونوں...... یہ دونوں طوائفیں ہیں۔ بہت بڑی رقم دی ہے ہم نے انہیں۔ رقم لے کر باقاعدہ ہمارے گھر آئی ہیں اور اس کے بعد وہاں سے نکل بھاگیں۔ ہم صرف اس لئے ان کے پیچھے نکل آئے تھے کہ یہ ہمارے گھر سے نکل بھاگی تھیں اور ہم انہیں اپنے گھر پکڑ کر لے جا رہے تھے۔''

''لے، تُو نے تو بیان ہی بدل لیا...... ابھی تو یہ دونوں عورتیں چور تھیں اور تیرے گھر سے کوئی چیز اٹھا کر بھاگی تھیں۔ نہ بھئی نہ، جھوٹے کو ہم نہیں چھوڑتے۔''

''دیکھئے صاحب! آپ ہماری بات تو سن لیجئے...... ہم چلے جاتے ہیں اور انہیں بھی چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر آپ نے یہ ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔''

''ابے، اب بھی اچھا نہیں کیا...... چھرے تو تیرے آدمیوں نے ہی نکالے تھے۔ انہیں ہماری پناہ میں چھوڑ دیتا اور نکل بھاگتا۔ ہم کچھ نہ کہتے۔ تم لوگ کسی کی کوٹھی میں باؤلے کتوں کی طرح گھسے چلے آئے، باؤلے کتوں کو تو پتھر مار کر بھگا دیا جاتا ہے لیکن تم تو چاقو نکال کر کھڑے ہو گئے۔ بتاؤ کیا کرتے ہم؟''

''اس کا حساب کتاب بعد میں ہم آپ سے سمجھیں گے۔ بعد میں ہو جائے گا۔''

''پھر وہی باتیں......؟'' شاہ جی نے گھوم کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولے۔ ''ایسا کرو، جو ہم بتائیں انہیں تھوڑا سا سبق دے دو اور یہاں سے چلتا کر دو۔ ہم اپنی کوٹھی میں کہاں قبریں بناتے پھریں گے۔ خوامخواہ باغ کا ایک گوشہ قبرستان بن

جائے گا، اگر بتیاں بھی جلانی پڑیں گی۔ ہیں تو مسلمان بچے ہی۔ تو پھر یوں کرو، سر مونڈو، بھنوئیں اور مونچھیں بھی صاف کر دو۔ گھر جائیں گے، مہینے دو مہینے تو چندیا پر بال ہی نہیں آئیں گے۔ یاد رکھیں گے کہ غلطی کی تھی کہ کسی کے گھر میں جا گھسے تھے۔ جب ٹھیک ٹھاک ہوں گے تو بعد میں پھر دیکھ لیں گے۔ میرا خیال ہے ایسا ہی کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے شاہ جی!'' شالے خان نے کہا اور اندر جانے والے راستے پر چل پڑا۔

راجہ شرافت علی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''جا رہے ہیں...... جا رہے ہیں ہم لوگ۔ زیادہ بدتمیزی مت کرو تم لوگ۔''

لیکن نور شاہ نے پھر وہی جان لیوا ہتھیار نکال لیا اور راجہ شرافت علی کی طرف منہ کر کے بولا۔ ''رک جاؤ...... ورنہ اس بار لوہے کا یہ گولا تمہارے سر میں پڑے گا اور تمہارا سر خربوزے کی طرح پھٹ جائے گا۔''

''ارے واہ! زبردستی...... زبردستی کر رہے ہو تم۔''

''تو اور کیا کریں؟ ہم تمہاری کوٹھی میں تو نہیں گھسے ہیں، تم ہماری کوٹھی میں گھسے ہو۔ رک جاؤ...... کیوں اپنی اس چندیا کے پیچھے پڑے ہو۔ پھٹ جائے گی، پاگل بھی ہو سکتے ہو۔ بھاگتے پھرو گے لاہور کی سڑکوں پر...... رک جاؤ...... یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔''

نواب دین، رحمت خان اور راجہ شرافت علی کی حالت کافی خراب ہو رہی تھی۔ وہ بار بار اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اٹھ نہیں پا رہے تھے۔ حواس ساتھ چھوڑ گئے اور اوقات پر آ گئے۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگنے لگے مگر شاہ جی نہیں مانے تھے۔

''نہ...... نہ...... بڑی گیدڑ بھبکیاں دی ہیں تم نے۔ ہم ایسے نہیں چھوڑیں گے۔ تم ہمارے مہمان ہو اور میزبانوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ مہمانوں کے ساتھ جو جی چاہے سلوک کریں۔ کم از کم ہمارا یہ دستور ہے۔ ابے کہاں مر گئے شالے خان! جلدی کرو، بچوں کو دیر ہو رہی ہے۔'' شاہ جی پوری طرح موڈ میں تھے۔ ادھر شمشیرہ بیگم اور کوثر جہاں خاموش تھیں۔ شمشیرہ بیگم کوثر جہاں کے قدموں میں بیٹھی ہوئی تھیں اور کوثر جہاں اس طرح پتھرائی ہوئی نگاہوں سے اس ماحول کو دیکھ رہی تھی جیسے ہوش و حواس سے عاری ہو گئی ہو۔ شاہ جی نے یہ جملے مذاق میں نہیں کہے تھے جس کا ثبوت شالے خان کے ہاتھ میں نظر آنے والے تیز دھار کے اُسترے سے مل گیا۔ اُسترا دیکھ کر نواب دین اور حیدر خان بری طرح چلانے

لگے۔ لیکن ان لوگوں نے انہیں نہ چھوڑا۔ دو تین بار انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن یہ عجیب وغریب ہتھیار جو زمانہ قدیم کے ہتھیار تھے لیکن نئے دور میں ان کی حشر سامانیاں نئی نسل نے بھی دیکھی تھیں، اب تک جتنے معرکے ہوئے تھے پتہ نہیں کیوں شاہ جی نے ان میں یہی ہتھیار استعمال کئے تھے۔ اصل میں ان کا نظریہ بھی ذرا مختلف تھا۔ آتشیں ہتھیار تو جگہ جگہ استعمال ہوتے ہیں اور ان کے نتائج بھی سنگین ہی نکلتے ہیں۔ لیکن ان ہتھیاروں سے بس انسانوں کو ناکارہ تو کیا جا سکتا ہے، ہلاک نہیں۔

چنانچہ انہوں نے اپنے آدمیوں کو انہی کی مشق کرائی تھی۔ کراچی یونیورسٹی میں بھی انہی ہتھیاروں کی دھوم تھی اور لوگوں کی ہوا گم ہو جاتی تھی انہیں دیکھ کر۔ چنانچہ نواب دین اینڈ سنز جب بھی کھڑے ہوتے کوئی نہ کوئی گولا ان کے بدن کے مختلف حصوں پر پڑتا اور وہ بری طرح بلبلانے لگتے۔ اب ذرا بھی سکت نہیں تھی کہ وہ ایک بھی ضرب کھا سکیں۔ البتہ راجہ شرافت علی نے آخری کوشش کی اور اچھل کر باہر کی سمت بھاگا لیکن اکرام نے ہوا میں اُڑتے ہوئے اس کی کمر پر ایک لات رسید کی اور وہ منہ کے بل گرا اور اس کے بعد سب سے پہلے اسی کی ٹنڈ کی گئی۔ راجہ شرافت علی کا سر گنجا کیا گیا، مونچھیں مونڈ دی گئیں اور بھنویں تک صاف کر دی گئیں۔ عجیب انڈے جیسی شکل نکل آئی تھی۔ استرے کے سامنے جنبش کرنے کا مطلب جانتا تھا کہ اگر کہیں ہاتھ غلط پڑ گیا تو نصاب کتاب بھی صحیح ہو جائے گا۔ خود نور شاہ نے ان کے حجام کی خدمت سرانجام دی تھی۔ وہ بیچ بیچ میں بولتے بھی جا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”دیکھو! ناک اور کان کی حفاظت کرو اور ہلو مت۔ اگر اُسترا ہل گیا تو کوئی نہ کوئی چیز صاف ہو جائے گی۔ کن کٹے بکرے کہلاؤ گے۔“

راجہ شرافت علی نے بڑی خاموشی سے یہ کام کرایا۔ اس کے بال اس کے چہرے کے حُسن میں بے پناہ اضافہ کرتے تھے اور ان بالوں پر بھی اس نے لاکھوں روپے خرچ کئے تھے۔ بڑے بڑے ماہرین کے مشوروں سے ان بالوں کی یہ شکل بنی تھی لیکن اب ان کا نام و نشان نہیں تھا۔ رحمت خان بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ باقی لوگ پھر بھی ذرا ہمت سے کام لے رہے تھے۔ جب چاروں صفاچٹ ہو گئے تو شاہ جی قہقہے لگانے لگے۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اب ذرا ماں کے لالو! شیشے میں جا کر اپنی شکل دیکھو۔ مالک کی قسم ایسی چاند جیسی صورتیں نکل آئی ہیں کہ جو دیکھے گا دل پر ہاتھ رکھ کر رہ جائے گا۔ اب جاؤ، کھاؤ پیو، عیش کرو۔ اور ہاں، آگے کی کیا کہیں تم سے، جب دل چاہے آ جانا، ہم تمہارا استقبال اسی طرح کریں گے۔ یہاں خاطر مدارت کا بڑا معقول انتظام ہے۔ ابے چلو یا پھر اور مار کھاؤ گے؟“ اس بار شاہ جی نے راجہ شرافت علی کا پستول سیدھا کر لیا۔ راجہ شرافت علی نے ایک نگاہ ان سب کو دیکھا، شمشیرہ بیگم اور کوثر جہاں کو دیکھا اور اس کے بعد باہر کی جانب چل پڑا۔ پیچھے سے ان لوگوں کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ ابھی تک ان لوگوں نے شمشیرہ بیگم یا کوثر جہاں کی طرف نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا البتہ شمشیرہ بیگم خاص طور پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس عظیم الشان کوٹھی کو دیکھ رہی تھیں۔ غلام شاہ کے الفاظ انہیں یاد آ رہے تھے کہ شاہ جی نے اکرام کو ایک کوٹھی خرید کر دی ہے۔ اگر یہی کوٹھی ہے تو بس کیا، کیا جائے۔ یہ تو شاید کروڑوں تک کی ملکیت تک جا پہنچی تھی۔ لیکن اس وقت تو صورتحال ہی مختلف تھی۔ اگر یہ لوگ یہاں نہ ہوتے تو نجانے کیا ہو جاتا...... یہ سب کچھ ہوا تھا لیکن کوثر جہاں کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ شاہ جی نے ان سب کو باہر نکلتے دیکھ لیا تو شمشیرہ بیگم کی طرف رخ کر کے بولے۔

”ہاں شمشیرہ بیگم! اور کوئی خدمت ہے ہمارے لئے؟“

”شاہ جی! اللہ تمہیں خوش رکھے۔“

”تو پھر اللہ بیلی۔“ شاہ جی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ہماری حالت بہت خراب ہو گئی ہے...... بری حالت ہو گئی ہے۔ ایک گلاس پانی بھی نہیں ملے گا؟“

”نہیں شمشیرہ بیگم! یہ ایک پاک اور متبرک جگہ ہے۔ تمہیں پانی یہاں سے نہیں ملے گا۔ خدا حافظ۔“

شمشیرہ بیگم نے مایوس نگاہوں سے کوثر جہاں کو دیکھا۔ پہلی بار کوثر جہاں کے جسم میں جنبش پیدا ہوئی۔ اس کی نگاہیں زمین سے نہیں اٹھی تھیں، نیچے ہی نیچے دیکھتے ہوئے وہ کوٹھی کے گیٹ کی جانب چل پڑی۔ شمشیرہ بیگم خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی تھیں۔

دونوں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر نکلیں۔ شمشیرہ بیگم نے ایک مرتبہ پھر پلٹ کر شاہ جی کو

دیکھا اور بولیں۔

”کہیں وہ ہمیں باہر نہ مل جائیں شاہ جی۔“

”بس کوٹھی سے نکلو اور کسی اور کوٹھی کی طرف دوڑ لگا دو۔ ویسے وہ سیدھے اپنے گھر ہی گئے ہوں گے۔ کہاں رہتے ہیں...... کیا ان کی کوٹھی بھی یہیں آس پاس ہی موجود ہے۔“

”جی ہاں...... وہ تو سیدھے ہاتھ پر ہے۔“

”تو تم الٹے ہاتھ پر چلی جاؤ“ شاہ جی نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ کوثر جہاں نے قدموں کی رفتار تیز کر دی تھی اور شمشیرہ بیگم بھی بادل نخواستہ اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکلیں تو آصف کھڑا نظر آ گیا۔ اس نے ان دونوں کو دیکھا اور بولا۔

”کک...... کک...... کیا ہوا تھا؟ یہ چاروں گنجے کون تھے؟ لگ تو وہی رہے تھے...... لیکن حلیہ بدل گیا تھا، بالکل چھیلے ہوئے انڈے لگ رہے تھے۔“

”وہ باہر نکلے تو تُو کہاں تھا؟“

”لو، میں یہاں کھڑا ہوا تھا۔ ان کم بختوں نے میرے منہ پر گھونسے مارے۔ میں گرتے گرتے بچا۔ کون تھے یہ چاروں؟“

شمشیرہ بیگم آصف کے پاس پہنچ گئیں۔ اچانک ان کا ہاتھ گھوما اور پوری قوت سے ایک تھپڑ آصف کے منہ پر پڑا۔ آصف ایک بار پھر گرتے گرتے بچا تھا۔

”خدا تجھے کتے کی موت مارے...... جلدی سے کہیں سے تانگہ پکڑ۔ جلدی کر۔“

آصف بری طرح بھاگا۔ تانگہ اتفاق سے قریب ہی مل گیا۔ اور جب وہ تانگے میں بیٹھ گئیں تو ان کی کیفیت کچھ بہتر ہوئی۔ اچانک ہی چونک کر بولیں۔

”اے کوثر جہاں بٹیا! برقعے تو ادھر ہی رہ گئے۔“

کوثر جہاں نے گردن گھما کر شمشیرہ بیگم کو دیکھا اور پھر اچانک ہی اس کے حلق سے ایک قہقہہ ابل پڑا۔ شمشیرہ بیگم ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔ کوثر جہاں نے کہا۔

”اماں! اب برقعوں کی کیا ضرورت ہے؟“

”گھر تو جانا ہے نا بٹیا۔“

”تو پھر...... تانگے میں بیٹھ کر گھر جا رہے ہیں۔ کمر میں زنجیریں تو نہیں بندھی ہوئی ہیں

ہماری۔ تم تو صرف شاہ جی سے پردہ کرتی ہو نا...... شاہ جی یہاں موجود تھے۔ اب وہاں اور کون ہو گا؟“

شمشیرہ بیگم غور کرنے لگیں کہ کوثر جہاں طنز کر رہی ہے یا یہ بات سچائی سے کہہ رہی ہے۔ ویسے حقیقت بھی یہی تھی کہ برقعے تو شاہ جی کی وجہ سے ہی اوڑھے گئے تھے۔ لیکن وہ شاہ جی، اکرام اور ان کے باقی ساتھی اور پھر وہ عالی شان کوٹھی۔ شمشیرہ بیگم نے آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

بہر حال خدا خدا کر کے کوٹھے پر پہنچیں۔ چہرہ ہونق ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی بے بسی کے آثار تھے۔ جو بیتی تھی، کسی کو سنانے کے قابل بھی نہیں تھی۔ پھر بھی سمجھنے والے تو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ غلام شاہ اور حاجو ایک دوسرے کے کانوں میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ حاجو سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔

”شاہ جی! لگ رہا ہے جیسے کوئی ناگہانی آ پڑی۔ شمشیرہ بیگم کے چہرے پر تو لعنت برس رہی ہے۔“

”ہو سکتا ہے کوئی اور ہی بات ہو۔“

”نہیں شاہ جی! ہم نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور دنیا کی نگاہ پہچانتے ہیں۔ اور پھر شمشیرہ بیگم کی تو ہر چیز ہم پہچانتے ہیں۔ سب پتہ چل جاتا ہے۔“

”ابے تو میرے کان کیوں کھا رہے ہو؟ جاؤ، خوشیاں مناؤ، ان سے پوچھو کہ کیا ہوا؟“

”یار! تم تو جلے کٹے ہی رہتے ہو۔ چلو ٹھیک ہے، ہمارا کیا، خود اپنا خون جلا رہے ہو۔ وہ جو کہتے ہیں نا، کیا کہتے ہیں یار، پتہ نہیں۔“

ادھر شمشیرہ بیگم کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ کمرے میں گھسیں اور بے جان سی ہو کر بستر پر گر پڑیں۔ کوثر جہاں تسنیم کو گود میں لے کر کمرے میں آ گئی تھی۔ شمشیرہ بیگم جن کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں ایک دم سے دیکھ کر آنکھیں بند کر کے ساکت ہو گئیں۔ سمجھ گئیں کہ اب وہ طنز کے تیر برسائے گی۔ کوثر جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہ اماں نہ...... میں نے آپ کی آنکھیں کھلی دیکھ لی ہیں۔ مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے سے کیا ہو جائے گا۔“

”ناک تو نہیں کٹائی ہے تمہارے سامنے جو تمہیں دیکھ کر آنکھیں بند کر لوں گی۔ ارے

ہاں، جسے دیکھو میرے ہی منہ لگنے چلا آ رہا ہے...... کیا سمجھتے ہو آخر تم لوگ مجھے؟“

”ہم لوگ......“ کوثر جہاں نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر ٹھٹھہ مار کر ہنس پڑی۔ ”اماں! کیا سمجھیں ہم لوگ آپ کو؟“

”تُو کیا کہنے آئی ہے...... مذاق اُڑانے آئی ہے میرا؟ جوتے لگانے آئی ہے؟ اتار چپل، لگا دے دس بیس۔ اب یہی وقت تو آ گیا ہے تم لوگوں کے جوتے کھاؤں۔“

”آپ سے تو اب بات کرنا بھی محال ہو گیا ہے۔“

”بس زندگی کے آخری دن کاٹ رہی ہوں۔ تھوڑا سا صبر اور کر لو، کسی دن چٹ پٹ ہو جاؤں گی، پھر خوشیاں منا لینا، مگر ایک بات کان کھول کر سن لو بی بی! تمہارا تجربہ کچھ بھی ہو لیکن عمر مجھ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کوٹھے سے آگے بڑھ کر سوچو گی تو نقصان اٹھاؤ گی۔ یہ کوٹھا ہے اور دنیا جانتی ہے کہ تم اس کوٹھے پر پیدا ہوئی ہو۔ اپنے چہرے پر کتنی روشنی پھیلا لو، دیکھنے والے جب بھی تمہیں دیکھیں گے طوائف ہی کہیں گے، شریف زادی کوئی نہیں کہے گا، سمجھیں۔ چاہے اپنے اندر شرافتوں کے خزانے بھر لو۔“

”تو میں کب کہتی ہوں اماں کہ مجھے شریف زادی سمجھا جائے؟“

”مگر اپنے آپ سے غداری تو کر رہی ہو۔“

”یہی آپ کو بتانے آئی ہوں۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ کیا بات کہوں آپ سے۔ اب آپ کہتی ہیں کہ میں اپنے آپ سے غداری کر رہی ہوں۔ کون سا دن ایسا ہوتا ہے کہ میں اپنا فرض پورا نہیں کرتی؟ ناچتی ہوں، گاتی ہوں، آپ کے لئے ادائیں بیچتی ہوں۔ جھوٹی نگاہوں سے آنے والوں کو دیکھتی ہوں، انہیں جو میرے شناسا بھی نہیں ہوتے۔ اس کے بعد مجھے اور کیا کرنا چاہئے؟ اگر کوئی بات دل میں ہے تو بتا دو۔“

”شروع میں سکھایا جاتا ہے یہ سب کچھ...... میں نے سب کچھ سکھایا تھا تمہیں اور ایک زمانہ تھا کہ یہاں سے تماش بینوں کی نگاہیں نہیں ہٹتی تھیں۔ آخر اب یہ تماش بین کیوں بھاگنا شروع ہو گئے ہیں کوثر جہاں! خدا نے تمہیں چاند سا چہرہ دیا ہے۔ جسے چاہو دیوانہ بنا سکتی ہو۔ لیکن ایسے انداز اختیار کر لئے تم نے جیسے مارے باندھے نچایا جا رہا ہو۔ ایسے تو مداری کے ہاتھ میں بندر بھی نہیں ناچتا جیسا کہ تم اظہار کرتی ہو۔ نہ ادائیں ہیں اور نہ دل لبھانے والی حرکتیں۔ نہ وہ ناز و انداز ہیں جنہوں نے ایک زمانے میں کوثر جہاں کے کوٹھے

میں دھوم مچا دی تھی۔ جسے دیکھو کوثر جہاں، کوثر جہاں پکارتا ہوا اس جانب رخ کرتا تھا۔ اور اب کوثر جہاں نجانے کہاں چلی گئی؟“

کوثر جہاں مسلسل ہنس رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ”اماں! عمر بھی تو آگے بڑھ گئی ہے۔ بیٹا جوان ہو رہا ہے اور تھوڑے دنوں کے بعد اس تسنیم کو بھی دیکھ لیجئے گا۔ اب اس عمر میں بھی ادائیں دکھاؤں؟“

”عمر...... عمر کیا ہوتی ہے؟ تمہاری عمر کی لڑکیاں تو ابھی، اب کیا کہوں...... ارے وہ کمبخت غزالہ اور شبانہ ہیں، ارے ان لڑکیوں کا تو میں ایسا شو کروں گی کہ دیکھنے والے دیکھیں گے۔ بارہ گھنٹے نہ نچاؤں تو شمشیرہ بیگم نام نہیں ہے۔ انہوں نے بھی تو اپنے آپ کو چھوڑ دیا ہے۔ کچھ کر کے ہی نہیں دکھاتیں۔“

”چلئے اماں! چھوڑیئے۔ جو ہوا سو ہوا۔ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟ ہمارے ہاں تو یہ سب کچھ ہوتا ہی ہے۔ اب آپ دیکھ لیجئے، میں نے خلوصِ دل سے آپ کی بات پر عمل کیا تھا۔ سب کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ ذرا غور کریں، شاہ جی کیا سوچ رہے ہوں گے۔ کتنی حقارت سے انہوں نے ہمیں اپنی کوٹھی سے نکال دیا۔ ایک گلاس پانی بھی نہ پلایا۔ اور سچی بات ہے کون اپنے پاک برتنوں کو گندا کرنا چاہتا ہے۔ ہم تو گندگی کی پوٹ ہیں اماں۔“

”اور تمہارا بیٹا...... جو تمہارے پیٹ سے پیدا ہوا؟“

”اماں! بات بہت آگے بڑھ جاتی ہے۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ دیکھو میں ہمدردی سے تمہارے پاس آئی ہوں۔ جو کچھ ہم پر بیتی ہے وہ بہت بری تھی۔ لیکن آگے کے لئے سوچو۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟ اگر تم کہتی ہو کہ میں اپنی اداؤں کو پھر سے تازہ کروں تو ٹھیک ہے، بوڑھے منہ مہاسے والی بات ہو گی۔ چلو کر کے دیکھ لیتی ہوں۔ یہ بھی تمہارے لئے۔ جو آ گئی ہو، تم سنبھالنا، میں انکار نہیں کروں گی۔“

”دیکھو کوثر جہاں! کوئی ایسی ترکیب کرو کہ ہماری رونقیں پھر سے بحال ہو جائیں۔ اپنے بیٹے کو اس شاہ جی کے چکر سے نکال لو۔ ارے غنڈہ بن جائے گا۔ لچا لفنگا بن جائے گا۔ پورے لاہور میں بدمعاشیاں کرتا پھرے گا۔ تم خود سوچو کہ اگر اس نے بدمعاشیوں کا اڈہ قائم کر لیا تو کیا ہو گا...... کسی وقت کوئی گولی اسے چاٹ جائے گی۔“

”اسے چھوڑو اماں! بلکہ اگر تم کہو تو میں اسے یہاں آنے سے بھی منع کر دوں۔ ویسے

بھی اچھا نہیں لگتا اس کا یہاں آنا۔ جب بھی آتا ہے کچھ نہ کچھ کر کے جاتا ہے۔ لیکن ایک بات تم دیکھ لو، کم از کم آج کے واقعہ میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم لوگ تو خود ہی بھاگ کر برابر والی کوٹھی میں جا گھسے تھے۔ وہاں وہ ہمارے لئے تو نہیں آیا تھا۔"

"تمہیں خدا کا واسطہ کوثر جہاں! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میری حالت خراب ہو رہی ہے۔ پھر بات کروں گی۔"

کوثر جہاں چلی گئی۔ لیکن شمشیرہ بیگم کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہوتی چلی گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ حاجو کسی کام سے اندر آیا تو اس نے شمشیرہ بیگم کا چہرہ دیکھا، چھو کر دیکھا تو شدید بخار میں مبتلا تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر حاجو کو دیکھا اور بولی۔

"کیا کر رہے ہو تم یہاں؟"

"کتنا تیز بخار ہو رہا ہے تمہیں...... میں کہتا ہوں آخر ہوا کیا؟ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

"حرام کے جنے، ہوش میں ہے یا نہیں؟ کس لہجے میں بات کر رہا ہے مجھ سے...... ارے میں پوچھتی ہوں کیا سمجھتے ہو تم لوگ مجھے؟"

"میں یہ پوچھ رہا تھا کہ ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے...... تم سب کی موجودگی میں یہ سب نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔"

حاجو ایک لمحہ دیکھتا رہا، پھر باہر نکل آیا۔ باہر غلام شاہ مل گیا تھا۔

"یار غلام شاہ! شمشیرہ بیگم سخت بیمار پڑی ہوئی ہیں۔"

"کیا بات ہے حاجو...... کیا جوانی کی یادیں پھر سے تازہ ہو رہی ہیں؟"

"یار! تم تو وہ ہو جس تھالی میں کھاتے ہو اسی میں سوراخ کرتے ہو۔ بہر حال ہم نے ان کا نمک کھایا ہے۔"

"تو پائنتی جا کر بیٹھ جاؤ اور بین کرنا شروع کر دو۔ تمہارا خاندانی کام ہے۔" غلام شاہ نے کہا اور حاجو اسے گھورنے لگا۔

○●○

راجہ شرافت علی اپنے تینوں ساتھیوں کے ساتھ کوٹھی سے باہر نکلا۔ کوٹھی سے چند ہی فاصلے پر انہیں باورچی آصف کھڑا ملا جس نے راستے میں آنے کی کوشش کی تو نواب دین نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور آخر کار وہ لوگ بھاگتے ہوئے اپنی کوٹھی میں

داخل ہو گئے کہ کہیں راستے میں کچھ اور لوگ نہ مل جائیں۔ ان کے چہرے انتہائی مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ پٹائی اتنی ہوئی تھی کہ باقی حلئے کو نظر انداز کرنا پڑا تھا۔ اس وقت راجہ شرافت علی کی شکل تو دیکھنے کے قابل ہو گئی تھی۔ بس چھیلا ہوا آلو لگ رہا تھا۔

اندر پہنچ کر وہ بے سدھ ہو کر صوفے پر گر پڑا۔ باقی تینوں ساتھیوں نے اس وقت بھی آداب کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ راجہ شرافت نے تھکی تھکی سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے تم لوگوں کی دوستی پر فخر ہے۔ جو کچھ بھی ہوا ہے میری وجہ سے ہوا ہے۔ لیکن زندگی میں ایسے واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر وقت نے ہمیں ایک دوسرے دور میں داخل کر دیا ہے۔ یہاں معاملہ ایک عورت کے حصول کا نہیں بلکہ اب یہ سب کچھ انا کا مسئلہ بن گیا ہے۔ بس اس لئے میں تم لوگوں کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔"

حیدر خان، رحمت خان اور نواب دین خاموشی سے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ دل تو بھی چاہ رہا تھا کہ جوتا اٹھائیں اور راجہ شرافت علی پر پل پڑیں۔ لیکن ظاہر ہے کوئی بھی یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا اور انہیں ہر حالت میں راجہ شرافت علی کی دوستی کا بھرم رکھنا تھا۔ چنانچہ وہ خاموش ہی رہے۔ راجہ شرافت علی بھی کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"بہت سی ایسی چیزیں سامنے آئی ہیں جن کا کوئی حل نہیں مل رہا دماغ کو۔ مثلاً یہ کہ وہ کمبخت لڑکا اس دن بھی کوٹھے پر ملا تھا غالباً جب ہم دوسری بار گئے تھے اور اس نے میری کلائی زخمی کر دی تھی۔ چاقو پھینک کر پستول چھین لیا تھا۔ وہ لڑکا یہاں اس کوٹھی میں کیسے؟ نمبر دو، وہ عورتیں آخر ہیں کیا بلا؟ میں انہیں مکمل طور پر تو قصوروار قرار نہیں دے سکتا کیونکہ طوائفیں ہیں۔ دولت کی جھلک دیکھی تو کتے کی طرح دم ہلاتی یہاں تک چلی آئیں۔ لیکن یہ کوثر جہاں کچھ پراسرار عورت ہے۔ آخر وہ اپنے پیشے سے اتنا انحراف کیوں کرتی ہے؟ اور پھر وہ کمبخت چاروں کی گفتگو اور لہجے سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ کوثر جہاں اور شمشیرہ بیگم کے شناسا ہیں۔ لیکن یہاں اس عظیم الشان کوٹھی میں وہ کیا کر رہے تھے؟"

"وہ تو ساری باتیں ٹھیک ہیں راجہ صاحب! لیکن بتائیے اب ہم کیا کریں؟"

"اب ہم جو کچھ بھی کریں گے وہ ایسا نہیں ہوگا......" اس بار راجہ شرافت علی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ دو تین مہینے تک تو ہم اس قابل ہی نہیں ہو سکیں گے کہ اپنی شکل کسی کے سامنے لا سکیں۔ کونوں کھدروں میں گھس کر بیٹھنا پڑے گا، گھر والوں تک سے منہ چھپانا پڑے گا۔"

"یہ سب کے ساتھ ہوا ہے۔ تمہارا مسئلہ تو خیر یہ بھی ہے کہ گھر میں بند ہو کر بیٹھ جاؤ گے۔ خرچے پانی کی تمہیں فکر نہیں ہو گی، جو دل چاہے مجھ سے لے سکتے ہو۔ لیکن یہ بتاؤ میں کیا کروں؟ کیا میرے لئے یہ مشکل کام نہیں ہے؟ مجھے تو سبھی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں تو گھر واپس نہیں جا سکتا۔ بات بہت دور تک اُڑ جائے گی۔ اور اس کوٹھی میں بھی نہیں رہا جا سکتا۔ کوئی نہ کوئی ترکیب تو کرنی پڑے گی۔ میں تو سوچ رہا ہوں کیوں نہ گمنامی کی کیفیت میں کسی دوسرے شہر چلا جاؤں اور اس وقت تک وہاں رہوں جب تک چہرے کی اصلیت سامنے نہ آ جائے۔ لیکن تم دیکھ لینا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے نوٹ کر لینا۔ اگر کتوں کی طرح ان کو سڑکوں پر نہ لے آؤں تو میرا نام بھی راجہ شرافت علی نہیں ہے۔ وہ انتقام لوں گا ان سے کہ موت کے بعد بھی کمبخت یاد رکھیں گے۔"

"راجہ صاحب! میری گھر والی کا کیا ہو گا؟ اسے کیا جواب دوں گا میں؟ آپ میرے سسر کو نہیں جانتے۔ وہ تو پہلے ہی میرے کردار کی طرف سے مشکوک رہتا ہے۔"

"او بے وقوف! ہر چیز کا حل پیسہ ہے۔ جتنے پیسے چاہو مجھ سے لے لو اور اس وقت کو گزار لو۔ میں اپنے انتقام کی آگ کو سرد نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تو اب ہمارے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے۔"

حیدر خان نے فوراً ہی درمیان میں مداخلت کی اور بولا۔ "سبھی کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ہے۔ اب تو صرف یہ ہے کہ تھوڑا سا وقت گزارنے کے بعد ہمیں ان لوگوں کے بارے میں تحقیقات کرنی ہو گی۔ جہاں تک میرا دماغ کام کرتا ہے، وہ لڑکا انہی طوائفوں کا ہے۔ فی الحال یوں کریں گے کہ ڈھاٹے باندھ لیتے ہیں اور کام چلاتے ہیں۔"

"ہاں، ڈھاٹے باندھ لیں اور ڈاکو کی حیثیت سے پکڑے جائیں۔" نواب دین نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایک بات بتایئے راجہ صاحب! کیا اس عمارت کو چھوڑ دیا جائے؟"

"جہنم میں جھونکو اس عمارت کو۔ ہم نے کیا اسے شہد لگا کر چاٹنا ہے؟ اب اس سے ہمارا

کیا تعلق رہے گا۔ جو کچھ بھی ہو گا، حساب کتاب کر لیتے ہیں۔ یوں کرتے ہیں رات تک تو انتظار کریں گے۔ رات کی تاریکی میں نکلیں گے گھر سے۔ تم لوگوں کو میں تمہارے گھر چھوڑ دوں گا اور خود اپنے منصوبے کے مطابق کہیں نکل جاؤں گا۔ بعد میں مل کر فیصلہ کریں گے کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔"

بہر حال اب تین مہینے تک کی تو چھٹی ہو گئی تھی۔

ادھر تو ان لوگوں پر یہ بیت رہی تھی اور اُدھر شاہ جی اور ان کے ساتھی مزے لے رہے تھے۔ شاہ جی نے شمشیرہ بیگم اور کوثر جہاں کو بھی باہر نکال دیا تھا جبکہ اکرام سکتے کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ سب کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اب اتنا نا سمجھ نہیں رہا تھا کہ اس واقعہ کے پس منظر پر غور نہ کر سکے۔ راجہ شرافت علی کو بھی پہچان لیا گیا تھا۔ شاہ جی کچھ دیر تک دروازے کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے نظریں گھما کر اکرام کو دیکھا، آگے بڑھے اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"تُو ایسے کیوں کھڑا ہے پتر! کیا سوچ رہا ہے...... کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی ہم سے؟"

"نہیں شاہ جی!" اکرام نے مدھم لہجے میں کہا۔

"تو پھر اتنا افسردہ کیوں نظر آ رہا ہے...... کیا سوچ رہا ہے اپنے دل میں؟ کہیں ننوں کی بے عزتی سے برا تو نہیں مان گیا؟"

"نہیں شاہ جی۔"

"تو ہنس بول، خوشی سے قہقہے لگا۔ ہمارے لئے تو تُو نے خوشیاں ہی پیدا کر دی ہیں۔ کیا مار لگائی ہے، قسم اللہ کی جی خوش کر کے رکھ دیا ہے۔ ارے بھوتنی جنا کون تھا، جانتا ہے تُو اسے؟"

"وہی راجہ شرافت علی۔ اس کے بارے میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"ہاں ہاں...... نام تو سنا ہوا لگ رہا ہے۔ دیکھو یادداشت کیسی خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اچھا اب چلو، اب بھلا ان بھوتنی والوں کو اتنی ہمت کہاں کہ وہ یہاں تک آئیں۔ آ جاؤ......" شاہ جی نے کہا اور اندر چل پڑے۔

"میں تو اماں اور ننوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"بیٹا جہاں کا خمیر ہے وہیں خوش رہتا ہے۔ وہ وہیں ہی بالا خانے کی مٹی، ہیرا منڈی کی تخلیق۔ تُو سوچ، انہوں نے بچپن سے اب تک کا وقت وہیں گزارا ہے، وہاں کے آداب کیسے بھول سکتی ہیں؟ پتہ نہیں میری ماں کیسی ہو گی۔" یہ آخری جملے شاہ جی نے انتہائی مدھم سرگوشی کے انداز میں کہے تھے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکے تھے۔ اندر پہنچ کر شاہ جی نے کہا۔

"وہ لوگ بہت برے ہیں...... ہزار منع کیا تُو نے بھی، میں نے بھی اور سب نے بھی مگر باز نہیں آئے۔ وہیں کی رہنے والیاں ہیں، وہیں رہ سکتی ہیں۔"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس سلسلے میں کون سی ایسی کارروائی کی جائے جس سے کم از کم اماں کا دل وہاں سے پھر سکے۔ میری مراد باجی سے ہے۔"

"وہ کسی بات سے مجبور ہے۔ بس اس سے آگے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"نہیں شاہ جی! کوئی فیصلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

شاہ جی کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر بولے۔ "نہیں...... نور شاہ! میرا خیال ہے کچھ دن تک اکرام کو یہاں چھوڑنا مناسب نہیں ہو گا۔ وہ کتیا کا پلّہ ہمارے پیچھے کوئی کارروائی نہ کرے۔"

"آپ بے فکر رہیں...... میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" اکرام نے مردانگی سے کہا۔

"ہاں...... یہ تو ہم جانتے ہیں۔ اچھا خیر، تم ایک کام کرو نور شاہ! تم یہیں رہ جاؤ۔ کچھ دن تک یہاں رہو۔ اور ویسے بھی میں چاہتا ہوں کہ اکرام کا تعلق وہاں سے ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ ہمارا کیا ہے، جب دل چاہے گا دیکھنے کو یہاں آ جایا کریں گے۔ اور شہزادے! تُو بھی ہماری بات مان لے۔ اب اس بازار سے اپنا تعلق ختم کر دے۔ تیری باجی کے دل میں تیری محبت ہو گی تو سوچے گی اس بارے میں۔ اور دیکھ، ویسے تو ہم انہیں چٹیا سے پکڑ کر گھسیٹ کر لا سکتے ہیں مگر یہ کوئی بات نہ ہوئی۔ جب آدمی کے دل میں خود ہی اپنا مقام پیدا نہ ہو تو اسے کہیں بھی لے جا کر رکھ لو، رہے گا وہی کا وہی۔ ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ بس تُو ہیرا منڈی کا آنا جانا چھوڑ دے۔ کوثر جہاں اگر واقعی ماں ہیں جیسا کہ ظاہر کرتی ہیں تو ان کے دل میں تڑپ اٹھے گی تیری۔ اور پھر دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... جیسا آپ کا حکم شاہ جی۔"

"اور ایک اور کام کر لیتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک ایک آدمی کی ایک ایک دن کی ڈیوٹی ہو گی۔ اور یہ ڈیوٹی بدلتی رہے گی۔"

"آپ کا جیسا حکم۔"

"ٹھیک ہے...... اور ہاں نور شاہ! اب تم باقاعدہ اس کی ورزش کا بھی انتظام کر دو۔"

"ٹھیک ہے شاہ جی! جیسا آپ کا حکم۔"

"ایک بات میں اور کہنا چاہتا ہوں شاہ جی!" اکرام نے کہا۔

"ہاں، بول۔"

"میں تسنیم کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"ہاں، اس کا کیا مسئلہ ہے؟"

"شاہ جی! میں اسے اماں اور نوں کے راستے پر نہیں چلنے دوں گا۔"

"لعنت ہے جو کبھی ایسا بھی سوچا ہو۔ مر جائیں جو اسے ان راستوں پر چلائیں۔ لیکن بیٹے! ایک بات کہوں تجھ سے۔"

"ہاں شاہ جی۔"

"ننھی سی جان کو ماں کی گود سے الگ رکھنا اچھا نہیں ہو گا۔ ہم اس کے لئے ہزاروں نوکرانیاں رکھ دیں جو اس کی پرورش کریں مگر ماں کی آغوش کہیں نہیں ملتی۔ ویسے کوثر جہاں کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ہزار بہانے کرتی رہتی ہیں۔ لیکن ابھی میرے خیال میں تسنیم کو ان کی گود میں پلنے دو۔ اور میری بات سنو، جس دن اس نے اپنے منہ سے بسم اللہ کہہ دیا، بس سمجھ لو کہ ہماری ہو گئی۔ کوئی بھی ماں کا لال اسے اپنے کوٹھے پر نہیں رکھ سکتا۔ یہ ہم کہہ رہے ہیں، سمجھے۔ فی الحال تم اسے ماں کے پاس رہنے دو۔ ورنہ کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔"

اکرام نے تڑپ کر کہا۔ "نہیں شاہ جی! میرا بھی یہ مقصد نہیں ہے۔"

"تُو فکر مت کر...... ہم ہیں ناں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تو پھر اب یہ بات طے ہوئی کہ اب تُو ہیرا منڈی نہیں آئے گا۔"

"اور اگر باجی یہاں آ گئی تو؟"

"آجائے...... وہ بعد کی بات ہے۔"

"مجھے اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہوگا؟"

"بختی کا سلوک۔ مجبوری ہے۔ اگر وہ یہاں آنا چاہے تو کون اسے روکتا ہے۔ عزت سے رہے گی۔ لوگ آہستہ آہستہ بھول جائیں گے کہ کہاں سے آئی تھی۔ یہاں ہماری اپنی ہو گی۔ تیری ماں ہوگی۔ ہم لوگ بھی اس کی عزت کریں گے۔ مگر عزت کا مطلب اس کی سمجھ میں آئے تب کی بات ہے نا۔"

"ٹھیک ہے...... اس کی مجبوری میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔"

"بس اب تُو بھول جا، اپنا کام جاری رکھ۔ پڑھ لکھ، عیش کر۔ اپنے یار دوست جو بھی ہوں انہیں یہاں لا۔ کھانا کھلا۔ باتیں کر۔ جو تیرا جی چاہے کر۔ یہاں تجھے پوری آزادی ہے۔ کیا سمجھا؟"

"جی شاہ جی! جیسا آپ کا حکم۔" اکرام نے جواب دیا۔ شاہ جی غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"کس سوچ میں ڈوب گئے تم اکرام؟"

"باجی ہی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"کیا؟"

"پتہ نہیں اسے کیا مجبوری ہے۔"

"ایک تجربہ ہمارا بھی ہے شہزادے!"

"کیا شاہ جی؟"

"ہے کسی دکھ کی ماری۔ تھوڑی بہت شرافت ہے اس کے اندر۔ ہم نے اندازہ لگایا ہے۔ مگر بات وہی ہے جو ہم کہنا نہیں چاہتے۔"

"کیا شاہ جی؟" اکرام نے کہا۔

"اس نے پرورش تو آخر شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر پائی ہے۔ اپنی مشکل ہمیں بتا دے تو ہوسکتا ہے ہم اس کی مدد کرسکیں۔"

اکرام کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

○●○

شمشیرہ بیگم زمانے کی کنجوس۔ کوئی بھی ان سے خوش نہیں رہتا تھا۔ پائی پائی کو دانتوں سے پکڑتی تھیں۔ حالانکہ زندگی بھر کمایا تھا۔ لٹانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بس کوٹھے پر جو کچھ خرچ ہو جاتا وہ تو کاروباری مد میں ہوتا تھا۔ حاجو، غلام شاہ اور دوسرے تمام سازندے بس اتنا ہی حاصل کر پاتے تھے جتنا مقرر تھا۔ ہاں کسی من چلے نے اگر کچھ مہربانی کردی تو کردی۔ لیکن شمشیرہ بیگم اتنی گھاگ تھیں کہ بات کہیں آگے بڑھنے نہیں دیتی تھیں۔ سب کے سب سوچوں میں ڈوبے رہتے تھے کہ کس طرح شمشیرہ بیگم پر چھری پھیریں۔ جس کا بھی داؤ لگ جائے وہ چوکتا نہیں تھا۔ حاجو اس دن کہیں سے گزر رہا تھا کہ ایک درخت کے نیچے ایک رنگ سیار کو دیکھا۔ بہرحال رک گیا۔ لمبے لمبے بال بکھرائے کالی کفنی پہنے بیٹھا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ حاجو برا سا منہ بنائے آگے سے گزرا تو فقیر نے ایک زوردار آواز لگائی۔

"رک جا...... آگے بڑھا تو موت تیرا انتظار کرے گی۔ واپس چلا آ...... الٹے پاؤں واپس چلا آ۔" حاجو نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی اور آس پاس تو تھا نہیں۔ اس کا مطلب ہے اسے ہی مخاطب کیا جارہا تھا۔ فقیر سامنے جا کھڑا ہوا۔

"ہاں بولو؟"

"پانچ روپے زندگی کا صدقہ۔ ورنہ آگے تباہی کھڑی ہے۔"

"ہوں...... پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔"

"کون پہنچا ہوا ہے اور کون نہیں، یہ بات اوپر والا جانتا ہے۔ تجھ سے جو کہہ رہا ہوں وہ کر۔"

"یار ایک بات کہوں تجھ سے...... ڈرامہ تو تُو اچھا کر رہا ہے۔ پر ہم تجھ سے بڑے ڈرامہ باز ہیں۔ میری جیب کٹ گئی ہے سمجھے۔ اور اس وقت ایک پیسہ بھی نہیں ہے میرے

پاس۔‘‘

’’کس نے کاٹی ہے تمہاری جیب؟‘‘

’’بس تمہارے ہی جیسے کسی پہنچے ہوئے نے۔‘‘

’’گستاخی کر رہا ہے...... زندگی سے اکتا گیا ہے؟‘‘

’’بابا! اگر کھوپڑی میں گودا ہے تو کام کی بات کر۔ میں تیرے ساتھ شامل ہو سکتا ہوں اور ایسا کام کر سکتا ہوں جسے تُو یاد رکھے گا۔‘‘ فقیر نے آنکھیں کھولیں، اسے دیکھا اور بولا۔

’’ہاں بول، کیا بات ہے؟‘‘

’’میں ایک بائی جی کا سازندہ ہوں۔ بائی جی بڑی کنجوس اور لالچی ہیں۔ ان سے ایک سودے بازی کرنی ہے۔ خاصی رقم ہاتھ لگ جائے گی۔ آدھی آدھی بانٹ لیں گے۔‘‘

’’سوچ سمجھ کر بات کر رہا ہے بچہ؟‘‘

’’ہاں...... مگر تم بھی دھوکا نہیں دو گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے...... بابا مکھن شاہ کبھی دھوکے بازی نہیں کرتا۔‘‘

’’بس تو پھر سمجھ لے کہ میرا اور تیرا معاہدہ پکا...... کہاں رہتا ہے تُو؟‘‘

’’یہیں پیچھے جھونپڑی ہے۔ وہ جو ادھر سامنے درخت نظر آ رہا ہے اس کے پاس۔‘‘

’’ٹھیک ہے...... اب تُو ذرا تفصیل سن لے۔ ان بائی جی کا نام شمشیرہ بیگم ہے۔ تین بیٹیاں ہیں ان کی غزالہ، شبانہ اور کوثر جہاں۔ ہیرا منڈی میں کوٹھا ہے۔ کوثر جہاں کے دو بچے ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام اکرام ہے اور بیٹی بہت چھوٹی ہے۔ اس کا نام تسنیم ہے۔ شمشیرہ بیگم ان دنوں رب نواز شاہ نامی ایک آدمی سے پریشان ہے اور اسے اپنے جال میں پھانسنا چاہتی ہے مگر وہ پھنستا نہیں ہے۔ بس یہ بنیادی باتیں ہیں جو تم ذہن نشین کر لو۔ ظاہر ہے شمشیرہ بیگم چاہتی ہے کہ بیٹیوں کے ذریعے لاکھوں کمائے۔‘‘

مکھن شاہ پُر خیال انداز میں گردن ہلاتا رہا، پھر بولا۔ ’’ٹھیک ہے...... ایک بار مجھے اس سے ملا دو۔ میرے قابو سے نکل جائے تو مکھن شاہ کے بجائے نام بدل کے رکھ دینا۔ مگر شرط وہی ہے کہ جو مال ملے گا وہ آدھا آدھا ہو گا۔ اس کے بعد میرا اور تمہارا کاروبار مستقل۔ تم آسامیاں گھیر گھیر کر لانا اور میں انہیں اُسترے سے مونڈوں گا...... کیا سمجھے۔ ملاؤ ہاتھ......‘‘ مکھن شاہ نے کہا اور دونوں نے ہاتھ ملا لیا۔

’’پھر کب آ رہے ہو؟‘‘

’’بس گھیر کر لاؤں گا۔ میرے ساتھ برقعہ پہن کر آئیں گی۔ تانگے سے اتروں تو ہوشیار ہو جانا۔‘‘

حاجو نے بڑی اچھی ترکیب سوچی تھی۔ واپسی پر راستے میں تانا بنتا بُنتا رہا تھا۔ معمول کے مطابق دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور شمشیرہ بیگم کے کمرے میں پہنچ گیا۔

’’تیرا ستیاناس حاجو! جب بھی آتا ہے دل جلاتا ہوا آتا ہے۔ ارے دستک تو دے دیتے کبھی دروازے پر۔‘‘

’’چھوڑو شمشیرہ بیگم! زیادہ پرانی بات نہیں ہے، تم نے ہی کہا تھا کہ حاجو تُو دروازہ بجا کر آتا ہے تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔‘‘

’’گھونسا مار کر دانت توڑ دوں گی۔ ہوش میں آ اور مطلب کی بات کر۔‘‘

’’بس تمہاری انہی باتوں سے جان جلتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ تمہارے لئے کچھ نہ کچھ کیا جائے۔‘‘

’’ہاں، بڑے تیر مار رہے ہو میرے لئے ناں...... کیا کر دکھایا تم لوگوں نے۔ کام کے نہ کاج کے۔ بس پال رہی ہوں تمہیں۔ اگر پرانی یادیں نہ ہوتیں تو کان سے پکڑ کر باہر نکال دیتی۔‘‘

’’ٹھیک ہے...... اس بار تم ایسا ہی کر لو...... کان سے پکڑ کر باہر نکال دو۔ کچھ تو غیرت آئے ہمیں۔ ہمیشہ ہی تمہارے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔‘‘

’’اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ...... کیسے مرے ہو اس وقت؟‘‘

’’بس تمہارے ہی پاس آئے تھے۔‘‘

’’پاس آنے سے کیا فائدہ...... میرے لئے کچھ کرو بھی تو سہی۔‘‘

’’یہی تو کرتے پھر رہے ہیں۔‘‘

’’تم پر خدا کی مار ہو...... خدا تمہیں موت دے۔‘‘

’’جب اسے دینا ہو گی وہ دے دے گا۔ اس وقت تو کام کی بات کرنے آئے ہیں۔‘‘

’’کوئی کام کی بات آج تک کی ہے تم نے؟‘‘

’’ایک دوست سے ملاقات ہوئی تھی۔ بس کیا بتائیں، چیتھڑے لگائے پھرتا تھا لاہور کی

سڑکوں پر۔ بھیک مانگنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ ہم بھی دس پانچ روپے اسے دے دیا کرتے تھے۔ لیکن اب جو اسے دیکھا تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ آج لوہاری گیٹ سے گزرتے ہوئے اس پر نظر پڑی۔ کیا شاندار کار میں سوار تھا۔ واہ، ہم تو بس دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ پوچھا کہ بھائی یوں وارے نیارے کیسے ہو گئے تو مسکرا کر بولے۔ مکھن شاہ سے۔ اور پھر اس نے ہمیں مکھن شاہ کے بارے میں بتایا۔ پھر اس نے پورا قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ ایک دن وہ بڑی مشکل سے کہیں سے دو روٹیاں لے کر آیا تھا۔ درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھا اور یونہی روکھی سوکھی کھانے لگا کہ پیچھے سے مکھن شاہ آ گئے۔ کہنے لگے کہ اکیلے اکیلے کھا رہا ہے۔ بانٹ کر کھا۔ بس اسے نجانے کیا سوجھی، ایک روٹی بابا مکھن شاہ کو دے دی۔ بابا صاحب نے روٹی کھائی اور بولے۔ جا، آج سے تیرے سارے دلدر دور ہو گئے۔ بس کیا بتائیں شمشیرہ بیگم! کہنے لگا وہاں سے چلا آیا اور اس کے بعد قسمت تو ایسی بدلی کہ دیکھنے والے دیکھتے رہیں۔ پیسہ ایسے برسنے لگا جیسے آسمان سے بارش ہوتی ہو۔ اور اب اس نے ایک انتہائی خوبصورت کوٹھی خریدی ہے۔ مجھے بھی ساتھ لے جا کر کوٹھی دکھائی۔ کیا بتاؤں، کیا شان ہے اس کی۔''

''اے واقعی...... سچ کہہ رہے ہو؟''

''پھر وہی دل جلانے والی باتیں؟''

''بس یقین نہیں آتا ہے تم لوگوں پر...... اچھا تم یہ بتاؤ کہ تم نے مکھن شاہ کا ٹھکانہ معلوم کیا؟''

''ٹھکانہ معلوم کیا۔ دیکھ کر آئے ہیں ان کا گھر...... بیٹھنے کی جگہ۔''

''تمہیں اللہ کی قسم سچ سچ بتاؤ، واقعی دیکھ کر آئے ہو؟''

''ہاں...... پاؤں چھوئے تھے ان کے...... اور تھوڑی دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا تھا۔ میرے ذہن میں تمہارے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا...... ہمارے آگے پیچھے کون ہے، جو کچھ سوچتے ہیں، تمہارے بارے ہی میں سوچتے ہیں۔''

''تمہی لوگ تو میرا سہارا ہو...... تمہارا سہارا بھی چھن جائے تو بھلا جینے کے لئے کیا رہ جائے گا۔'' شمشیرہ بیگم نے فوراً ہی پینترا بدل لیا تھا۔ پھر بولی۔ ''تو پھر کب چلو گے؟ میری مراد پوری ہو جائے گی ناں؟''

''چلو...... اپنے دل کی بات خود ان سے کر لینا۔''

''کب چلو گے؟''

''کل دوپہر کا وقت مناسب رہے گا۔''

''آج کیوں نہیں چلتے؟''

''جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ بہر حال ایک بات ضرور کہیں گے، ان پیروں فقیروں کی بات دنیا والوں سے چھپانی پڑتی ہے۔ کسی سے تذکرہ مت کرنا۔''

''بالکل نہیں کروں گی۔ تم بے فکر رہو۔'' شمشیرہ بیگم نے کہا۔

○●○

چودہ پندرہ دن گزر چکے تھے اکرام کی صورت دیکھے ہوئے۔ بہر حال ماں تھی، دنیا چاہے کچھ بھی کہے، حالات کیسے بھی ہوں ماں کے دل سے اولاد کی تڑپ کہاں جاتی ہے۔ شمشیرہ بیگم کو تو شاید کبھی خیال بھی نہ آیا ہو لیکن کوثر جہاں کا دل اداس ہونے لگا تھا۔ شمشیرہ بیگم کے پاس پہنچیں اور وہ اس کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''اماں! اکرام نہیں آیا ہے بہت دن سے۔''

شمشیرہ بیگم اکرام کا نام سنیں اور زبان پر کھجلی نہ ہو، چہرے پر طنز کے آثار پھیل گئے، کہنے لگیں۔

''پہلے ہی کہا تھا کوثر جہاں بیگم! جو بوؤ گی، وہ کاٹو گی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا اماں؟''

''خود تو آوارہ کر دیا ہے اسے، دوسروں کے ہاتھ میں دے دیا۔ میری ایک نہ چلنے دی۔ دیکھا نہیں تھا تم نے اپنی آنکھوں سے؟ اب اسے ہماری کیا ضرورت ہے۔ کیا باؤلے کتے نے کاٹا ہے اسے کہ ہماری طرف رخ کرے۔ کار ہے، کوٹھی ہے۔ واہ بی بی واہ، جو کام تم نہ کر سکیں وہ اس نے کر دکھایا لڑکا ہو کر۔ شوقین تو نہ جانے کیا کیا کر ڈالتے ہیں اپنے شوق کی تکمیل کے لئے۔''

''تم پر اللہ کی لعنت اماں...... کیسی گندی فطرت کی مالک ہو تم۔'' کوثر جہاں بری طرح جھلا گئی تھی۔ اس سے پہلے اس نے شمشیرہ بیگم کے سامنے ایسی بدزبانی نہیں کی تھی۔ لیکن شمشیرہ بیگم کے جملوں کو وہ برداشت نہیں کر سکی تھی۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی کہ شاہ

جی، اکرام کو اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ لیکن شمشیرہ بیگم کی گندی فطرت اور گندا ذہن ان باتوں کو نہیں سوچ سکتا تھا۔ شمشیرہ بیگم ایک لمحے کے لئے منہ کھول کر رہ گئیں۔ پھر ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

"کوثر جہاں! کیا تُو بالکل ہی پاگل ہو گئی؟ ذرا دوبارہ تو منہ سے کہہ کر دیکھ یہ جملے۔ زبان باہر نکال کر پھینک دوں گی۔ واہ بھئی واہ...... میری ہی جنی، میرے ہی منہ کو آتی ہے۔ ارے تُو نے کیا سوچ کر یہ بات کہی مجھ سے؟"

"تمہاری گندی ذہنیت پر سو بار خدا کی لعنت...... وہ لاکھ درجے اچھا ہے یہاں سے۔ اس گندگی کے ڈھیر میں غلاظتوں کے سوا ہے کیا جو کوئی اس طرف کا رخ کرے۔"

"ہاں، ہاں...... کیوں نہیں۔ گندگی کی ہی پوٹ تو تم بھی ہو۔ یہیں ٹیوں ٹیوں کرتی ہوئی پیدا ہوئی تھیں، یہیں پلی بڑھیں، اور آج جو یہ بدن سجا ہوا ہے ناں یہ اسی گندگی کی بدولت ہے اور اسی گندگی کے ڈھیر میں ہزاروں گندے آتے ہیں۔ قصور میرا ہے۔ شروع ہی سے دبا کر رکھتی تو آج تمہاری یہ جرأت نہ ہوتی۔ لیکن اولاد کی محبت سے مجبور ہو گئی۔ تم کیا سمجھتی ہو، سونے کا تاج پہن کر پیدا ہوئی تھیں۔"

"میں بھی تو اولاد ہی کی محبت کی بات کر رہی ہوں اماں! اکرام میرا کون ہے؟"

"جو کچھ بھی ہے، تم بھی جانتی ہو، زمانہ بھی جانتا ہے۔"

"تو ہے...... غلطی میری ہی ہے۔ نہ گندگی میں پتھر پھینکا جائے اور نہ چھینٹیں اڑیں۔"

کوثر جہاں اپنے کمرے کی طرف واپس چل پڑی۔ کبھی کبھی دل پر بڑا ہیجان طاری ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی یہی کیفیت ہوئی۔ تسنیم فراک پہنے بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرائی اور کوثر جہاں سنجیدہ نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"تسنیم! اماں کی نظر میں تیرا مستقبل تو بنا ہوا ہے۔ لیکن اللہ میرے بچے کا مستقبل بنانا چاہتا ہے۔ میں تجھے اتنا پیار نہیں دے سکوں گی جتنا میں اکرام کو دے رہی ہوں۔ تیرا اور اس کا مقابلہ ہی کوئی نہیں ہے۔ تُو تو وقت کی تخلیق ہے اور وہ میری محبت کی۔ یہ ایک بہت بڑا سچ ہے تسنیم کہ تیرا اور اکرام کا کوئی مقابلہ نہیں۔ شاید زندگی میں پہلی بار...... شاید تاریخ میں پہلی بار کوئی ماں اپنی اولاد میں تفریق کر رہی ہے۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں تجھے اکرام سے زیادہ نہیں چاہ سکوں گی۔ لیکن تُو اکرام کی چاہت ہے اور میری بھی۔ ہائے،

اکرام مل جاتا تو کیا تھا...... کون تیرا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ اللہ نے تجھے تو ایک مضبوط سہارا دے دیا ہے، ایک ہم ہیں کہ ہماری کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔ داتا دربار میں نجانے کہاں کہاں سے لوگ آتے ہیں، نجانے کیا کیا لے جاتے ہیں ان کے قدموں سے اٹھا کر۔ لیکن ہماری دعا تو انہوں نے بھی نہیں سنی۔ ہماری منت تو انہوں نے بھی پوری نہیں کی۔ ہائے داتا جی...... کتنے سنگدل ہو گئے ہو تم...... سب کی سُن لیا کرتے ہو، سب کے لئے دعائیں کرتے ہو تم اللہ سے۔ ہمارے لئے تمہاری دعائیں بھی نہ رہیں۔

کوثر جہاں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ تسنیم جو مسکرا رہی تھی، ماں کو روتا دیکھ کر منہ بسورنے لگی۔ کوثر جہاں آہستہ آہستہ آگے بڑھی، اسے گود میں لیا اور سینے سے لگا لیا۔ طبیعت پر بڑا بوجھ تھا۔ بہت دیر تک سوچتی رہی، پھر یہی فیصلہ کیا کہ شاہ جی سے جا کر اکرام کی خیریت پوچھے۔ فوراً ہی چادر اوڑھی۔ ابھی ہیرا منڈی کی رونق نہیں جاگی تھی۔ بڑی سی چادر اوڑھے وہ سیڑھیوں سے نیچے اتری اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ جاتے ہوئے نوکرانی کو تسنیم کو سنبھالنے کے لئے کہہ گئی تھی۔ شمشیرہ بیگم سے کچھ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ بہر حال شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کو پھر سے سجا دیا تھا اس نے۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ شمشیرہ سے دشمنی نہ کی جائے۔ اور پھر شاہ جی سے اجازت بھی لے لی تھی۔ لیکن کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا ہو جاتا تھا۔ پچھلے ہی دنوں کی بات تھی جب راجہ شرافت علی کا حادثہ ہوا تھا۔ شاہ جی کو اب کون سمجھانے جاتا کہ اصل کیفیت کیا تھی۔ کہتی تو جھوٹ سمجھتے۔ اس کے بعد ہمت نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال جھجکتی ہوئی ان کے احاطے پر پہنچی۔ ہیرا منڈی کے رہنے والے شاہ جی سے خوش تھے کہ بدمعاش ہو تو ایسا، غنڈہ ہو تو ایسا کہ محلے بھر کی حفاظت اپنے کاندھوں پر لے لی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ جب ہیرا منڈی میں ہر تیسرے دن جھگڑے ہوتے تھے، ہتھیاروں کا استعمال ہوتا تھا اور غنڈے تھے کہ دندناتے پھرتے تھے۔ لیکن اب یہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ یہاں سے گزرنے والے اپنے آپ کو محتاط کر لیا کرتے تھے اور یہ بھی ایک دلچسپ بات تھی کہ ہیرا منڈی میں داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ پر شاہ جی کا ڈیرہ پڑتا تھا اور اسے دیکھتے ہی بگڑے ہوئے حواس سیدھے ہو جایا کرتے تھے۔ کوثر جہاں نے دروازے پر دستک دی اور شالے خان نے دروازہ کھولا۔ کوثر جہاں کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ اکرام کی حیثیت سے اس کا احترام بھی کیا جاتا تھا۔ چنانچہ فوراً ہی

اسے اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔

"شاہ جی سے ملنا ہے......مل سکتی ہوں؟"

"جی......جی......ہم انہیں اطلاع دیتے ہیں۔ آپ ادھر آ جایئے۔"

پھر شاید شاہ جی نے اسے اندر بلا لیا تھا۔ شاہ جی کچھ حساب کتاب کر رہے تھے۔ کوثر جہاں کو دیکھ کر مسکرائے پھر بولے۔

"بیٹھو کوثر جہاں بیگم! کیسے آنا ہوا؟"

"معاف کرنا شاہ جی! آپ کے اس گھر کو میں کبھی اپنے قدموں سے گندا نہیں کرنا چاہتی مگر دل سے اٹھتے ہوئے طوفان اس طرف رخ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور آپ کی طرف چلی آتی ہوں۔"

"تازہ طوفان کیا اٹھا ہے تمہارے دل میں؟"

"چودہ پندرہ دن ہو گئے، اکرام میرے پاس نہیں آیا۔ میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔"

"بری نگاہوں سے محفوظ کر دیا ہے ہم نے اسے۔ کہہ دیا ہے کہ اس گندگی میں نہ آیا کرے۔ اسے آپ کیا سمجھتی ہیں کوثر جہاں بیگم! میرا بچہ نہیں ہے وہ؟ میرا دل نہیں تڑپتا اسے دیکھنے کے لئے؟ مگر میں بھی اسے یہاں نہیں بلاتا۔ سختی سے پابندی تو نہیں لگائی ہے، اس سے کہہ دیا ہے کہ جب اس کا دل تڑپے آ جایا کرے۔ مگر وہ بھی جانتا ہے کہ عزت بنانے کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ آپ لوگوں کا تو خیر مسئلہ ہی نہیں ہے کوئی۔"

"تو کیا آپ نے بھی اسے چودہ پندرہ دن سے نہیں دیکھا؟" کوثر جہاں نے پوچھا۔

"ایسی بات نہیں ہے بی بی! ہم تو مر جائیں اگر اسے اتنے دن تک نہ دیکھیں تو۔"

"شاہ جی! میں بھی تو اس کی ماں ہوں۔" کوثر جہاں کا لہجہ عاجزی اور بے چارگی سے بھرپور تھا۔ ایک لمحے کے لئے شاہ جی کے چہرے کا رنگ بدلا، پھر بولے۔

"ہاں بی بی......بعض مرتبہ سوکھے درختوں میں بھی پھل نکل آتے ہیں۔ اب اس میں پھلوں کا کیا قصور۔"

"نہیں شاہ جی! ایسی بات نہیں ہے۔ اگر سوکھے درختوں میں پھل نکل آتے ہیں تو وہ ان پھلوں کو پروان تو چڑھاتے ہی ہیں۔ انہیں اپنا خونِ جگر پلا کر سینچتے تو ہیں۔ اگر سوکھے

درخت اپنے آپ نکلنے والے پھلوں کو نیچے گرا دیں تو آپ خود سوچئے کہ وہ پھل کہاں سے پروان چڑھیں گے۔"

"اچھی باتیں کر رہی ہو بھئی۔ اچھا یہ بتاؤ، کیا پلائیں تمہیں؟"

"صرف مجھے اس کی خیریت کی خبر دے دیں......اور اگر دل میں رحم آ جائے تو صرف ایک جھلک دکھا دیں اس کی۔ آپ نے تو اسے دیکھ لیا ہوگا۔ لیکن میری آنکھیں اس کے لئے ترسی ہوئی ہیں۔"

"پتہ تو تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے کوثر جہاں بیگم! چلی جایا کرو اس سے کبھی کبھی ملنے کے لئے۔ لیکن ذرا احتیاط سے۔ پاس پڑوس والوں کو یہ نہیں پتہ چلنا چاہئے کہ تم اس کی ماں ہو۔"

کوثر جہاں کی گردن جھک گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کچھ دیر تک گردن جھکائے آنسو بہاتی رہی، پھر بولی۔

"نہیں......میں اپنے اس ناپاک وجود کو اس پاک جگہ نہیں لے جا سکتی۔ اگر دل زیادہ تڑپا تو آپ ہی سے آ کے خیریت معلوم کر لیا کروں گی۔ بڑے احسانات ہیں آپ کے مجھ پر......اور میں آپ کو قسم کھا کر یقین دلاتی ہوں کہ آپ کے لئے میرے دل میں بڑی عقیدت کے جذبے ہیں۔ کبھی بھول کر بھی نہ سوچیں کہ میرا دل کبھی آپ کی طرف سے میلا ہو سکتا ہے۔ آپ طنز کرتے ہیں مجھ پر، ٹھیک کرتے ہیں......غلط تو نہیں ہے۔ آپ میرے بچے کو معلوم نہیں کیا سے کیا بنا رہے ہیں۔ بے لوث اور بے غرض۔ یہ بات میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ کو زحمت دی اس کے لئے معافی چاہتی ہوں۔"

کوثر جہاں اپنی جگہ سے اٹھی۔ شاہ جی اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سلام کر کے واپس پلٹی تو شاہ جی کی آواز ابھری۔

"ذرا سنو!"

کوثر جہاں رک گئی۔

"ذرا بیٹھو تھوڑی دیر......اب ہم اتنے برے انسان بھی نہیں ہیں۔"

"برے آپ نہیں ہیں شاہ جی، ہم ہیں۔ مجھے اپنی برائیوں کا احساس ہے۔"

"بیٹھو......بیٹھ جاؤ۔" شاہ جی کا لہجہ نرم تھا۔ وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔

"ان ستم آراء بیگم کو بتا کر آئی ہو میرے پاس؟" شاہ جی نے کہا اور کوثر جہاں کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کہنے لگی۔

"نہیں شاہ جی! بتانے کی ضرورت تو نہیں تھی کہ آپ کے پاس آ رہی ہوں۔"

"ویسے انہوں نے ہری مرچیں چبا کر اپنی زندگی کی ابتدا کی ہے...... کبھی سیدھی بات ہی منہ سے نہیں نکلتی۔ ویسے وہ بڑی شاطر عورت ہے۔ ہم نے اتنی شاطر عورت پہلی بار دیکھی ہے۔ شالے! شربت لاؤ دو گلاس۔"

کوثر جہاں نے گردن خم کر دی تھی۔

"ہاں، تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ تمہیں یاد ہے تم نے ہم سے کچھ باتیں کہی تھیں۔ اصل میں ہمیں یہ نہیں معلوم کہ تمہاری مجبوری کیا ہے...... دیکھو، بہت بری باتیں کر رہے ہیں ہم۔ اس سے پہلے ہم نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں۔ ہمارا جذبہ سچا ہے۔ تمہارا مسئلہ کیا ہے...... تم کہتی ہو کہ کوٹھے پر رہنا ایک مجبوری ہے۔ دیکھو، ہم تمہیں بتا دیں، ہم غیر شادی شدہ ہیں، ہمیں اولاد کا تجربہ نہیں ہے مگر اکرام کو ہم اولاد کی طرح چاہتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ اسے دیکھ کر ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ ہمارا بیٹا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ہم ایک مرتبہ پھر تم سے کہہ رہے ہیں کہ ذرا ہمیں اس کے بارے میں کچھ بتاؤ تو سہی۔"

کوثر جہاں نے شاہ جی کو غور سے دیکھا پھر بولی۔

"شاہ جی! میں گندگی کی پیداوار ہوں...... اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ میں بالکل نہیں جانتی کہ میرا باپ کون تھا۔ ہمارے ہاں رشتے ماؤں سے چلتے ہیں، باپ سے نہیں۔ اور جو ذہنی طور پر مکمل طوائف بن جاتی ہیں وہ یہ بات نہیں سوچتیں کہ وہ جس بچے کو جنم دے رہی ہیں اس کا باپ کون ہے...... یاد بھی نہیں رکھتیں۔ یاد رہ بھی نہیں سکتا انہیں شاید۔ لیکن جب تک اونٹ پہاڑ تلے نہیں آتا اپنے آپ ہی کو سب سے اونچا سمجھتا ہے۔ شاہ جی، میں انتہائی معذرت کے ساتھ آپ کی عظمت کو داغدار کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے آپ کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ آپ ان میں سے نہیں ہیں جو......" کوثر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔ شاہ جی غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اس وقت ان کے چہرے پر وہ کرختگی نہیں تھی جو عموماً چھائی رہتی تھی۔ کوثر نے کہا۔

"میں اس وقت زندگی کے بہت سے رموز سے واقف نہیں تھی جب وہ میری زندگی میں آئے۔ مجھے پتہ تھا وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو عیاشی کی غرض سے طوائفوں کے کوٹھے کا رخ کرتے ہیں۔ وہ یقیناً کوئی بھٹکے ہوئے انسان تھے، کسی ایسے حادثے کا شکار جس سے وہ ذہنی طور پر منتشر تھے، الجھے الجھے۔ دوستوں کے ساتھ آئے اور مجھے خرید لیا۔ شاہ جی! بکنا تو میری تقدیر تھی اور کسی نہ کسی دن یہ ہونا ہی تھا۔ سو میں بک گئی۔ پر ان کے ہاں بکنا تو مجھے برا نہ لگا۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ جذباتی طور پر بھٹکے ہوئے تھے اور ہم تک انہیں لانے والے ان کے دوست تھے۔ وہ شاید کبھی ہم تک آنے کا فیصلہ نہ کرتے لیکن وہ آ گئے اور اپنی زندگی کا ایک گہرا نشان میرے وجود میں چھوڑ گئے۔ وہ چلے گئے لیکن میں زندگی کے کسی بھی لمحے انہیں بھلا نہیں سکی۔ تیرھواں سال ہے، اکرام کی عمر سے اندازہ لگا لیجئے۔ پھر کبھی پلٹ کر نہیں آئے وہ۔ آہ...... وہ برے انسان نہیں تھے۔ اگر انہیں میری حیثیت اور میرے احساسات کا اندازہ ہو جاتا تو شاید وہ بھی مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کی کوشش کرتے۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو میں ساری دنیا سے جنگ کر کے ایک باعزت زندگی کا آغاز کر دیتی۔ شاہ جی! ہر انسان فطری طور پر معصوم ہوتا ہے اور اب میری بچی تسنیم ہے۔ پیدا تو ہو گئی ہے اس گھر میں لیکن اسے کسی اچھی جگہ پروان چڑھایا جائے تو آپ یقین کریں کہ اس کی فطرت بھی اس اچھی جگہ کی طرح ہو گی۔ مجھے بھی اگر ایک اچھا گھر مل جاتا تو میں بھی ایک اچھی عورت کی طرح زندگی بسر کرتی۔ اس احساس کو میں کبھی دل سے نہیں نکال سکتی۔ اور شاید میرے جیسی اور بھی بہت سی ہوں گی جو سوچتی ہوں گی کہ کاش وہ اس بازار میں پیدا نہ ہوتیں۔ اگر وہ کسی عزت کی جگہ پیدا ہوتیں، چاہے وہ ایک چھوٹا سا بے سروسامان گھر ہوتا جس میں عزت کی زندگی ہوتی، ماں باپ ہوتے، بہن بھائی ہوتے، بس اس کے بعد شوہر ہوتا، بچے ہوتے، ان کی خدمت کر کے زندگی گزارتی اور جس طرح بھی بن پڑتا موت کی وادیوں تک چلی جاتی۔ لیکن بعض لوگوں کی تقدیریں بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں جیسے میں اگر پیدا ہوئی تھی تو کوٹھا ہی میرے ذہن میں سمایا ہوتا، گھنگھرو ہی مجھے ہر چیز سے زیادہ بہتر لگتے۔ لیکن ایسا ذہن نہ ملا مجھے۔ آج تک اسے یاد کرتی ہوں، دل میں بس ایک آرزو لے کر جی رہی ہوں کہ مل جائے...... ایک بار نظر آ جائے۔ اپنا واسطہ دوں، خدا کا واسطہ دوں، اکرام کا واسطہ دوں...... پھر کہوں کہ مجھے کوئی ایسا گوشہ دے دے

جہاں اکرام اپنے باپ کے نام سے منسوب ہو جائے۔ میں اپنے شوہر کے نام سے پہچانی جاؤں۔ اس کے بعد چاہے قیامت تک میری صورت نہ دیکھے، وہیں مر جانے دے مجھے۔ لیکن عزت سے ایک گوشہ دے دے۔ یہی میری آرزو ہے اور اسی امید پر جی رہی ہوں، اسی امید پر کوٹھے پر آباد ہوں۔ اس نے کہا تھا شاہ جی! اس نے کہا تھا مجھ سے کہ تم بے شک طوائف ہو لیکن نجانے کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں یہاں سے نکال دوں...... اور کسی اور جگہ لے جاؤں جہاں تم ایک طوائف کی زندگی نہ گزارو۔ شاہ جی! یہ الفاظ اتنے گہرے کندہ ہیں میرے سینے پر کہ میں انہی کے سہارے زندگی گزار رہی ہوں۔ جبکہ میں جانتی ہوں کہ لاتعداد انسان بعض چیزوں کی آرزو کرتے کرتے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ ان کی آرزو پوری ہو یا نہ ہو وہ الگ بات ہے۔ لیکن کیا انسان آرزو بھی نہ کرے؟"

کوثر جہاں کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ اسی وقت شالے خان شربت لے آئے تھے۔ شاہ جی نے کہا۔

"لو...... شربت پیو...... رونے دھونے سے دنیا میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ عمل کرنا پڑتا ہے۔ آنسو ہر آنکھ میں ہوتے ہیں، لیکن ان کی حفاظت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ رو دیئے تو سب کچھ گیا...... کچھ نام پتہ نہیں معلوم تمہیں ان کا جن کا تم تذکرہ کر رہی ہو؟"

"یہی تو سب سے بڑی بھول ہوئی تھی شاہ جی! نام نہیں پوچھا تھا ہم نے۔"

"آگے پیچھے کچھ؟"

"کچھ نہیں معلوم۔"

"کہتی ہو دوستوں کے ساتھ آئے تھے۔ کون دوست تھے وہ؟"

"میں کچھ بھی نہیں جانتی...... اماں مجھے بلیک میل کرتی رہتی ہے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے۔ پچھلے دنوں کہہ رہی تھیں کہ کچھ پتہ چلائیں گی۔ مگر میں جانتی ہوں کہ وہ مخلص نہیں تھیں۔"

"ہوں...... تیرہ برس پہلے کی بات تھی۔"

"جی۔"

شاہ جی کچھ دیر تک رخسار کھجاتے رہے، پھر بولے۔ "کاش! ہمیں کوئی اشارہ ملا ہوتا۔ بہرحال وعدہ تو نہیں کرتے مگر تم یہ سمجھ لو کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ضرور تلاش کریں گے۔

اور اب اگر اس نے تمہیں قبول کر لیا تو یقین کرو دنیا کو یہ بھلا دیں گے کہ تم نے کوٹھے پر کتنا وقت گزارا ہے۔ ہمارے اکرام کی زندگی بھی سنور جائے گی۔ ہم خود یہی چاہتے ہیں کہ وہ ایک باعزت لڑکا کہلائے، کوئی اسے میلی نگاہ سے نہ دیکھے۔ بہت خوش ہے وہ...... بہت سے دوست بنا لئے ہیں اس نے...... اور وہ سب کے سب بڑے خاندانوں کے بچے ہیں۔ اس کے بارے میں تم بالکل فکر مت کرو۔ لیکن ہم بندوبست کر دیں گے کہ وہ ہفتے پندرہ دن میں ایک بار تمہارے پاس آ جایا کرے مگر چوری چھپے۔ اب ہم یہ نہیں چاہتے کہ دیکھنے والے اسے یہاں دیکھیں اور پہچان لیں کہ اس کا تعلق اس کوٹھے سے ہے۔"

کوثر جہاں کی آنکھوں سے آنسو برستے رہے۔ شربت اس نے احترام سے پی لیا۔ اس کے بعد اٹھ گئی۔ "جا سکتی ہوں شاہ جی؟"

"ہاں...... اور سنو، ہم جو وعدہ کرتے ہیں وہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے اس لئے ہم دعویٰ نہیں کرتے لیکن ہم اسے تلاش کرنے کے لئے کام کریں گے۔ اور ہو سکتا ہے کہ ہمارا کبھی تمہارے کوٹھے پر بھی آنا ہو۔ کیونکہ وہ شاطر عورت، مجھے معاف کرنا جو تمہاری ماں ہے، اس سے بہت کچھ اگلوانا بہت مشکل کام ہوگا۔ ہمارے اوپر کوئی شبہ مت کرنا بلکہ ضرورت سمجھنا وہ ہماری۔"

کوثر جہاں کو یوں لگا جیسے تاریکیوں میں روشنی پھوٹنے لگی ہو۔ اس کے منہ سے ایک آواز نکل رہی تھی۔

"ایک بار...... صرف ایک بار...... تمہاری تو دنیا ہی بدل گئی ہوگی۔ جانتی ہوں کہ میرا تصور تک تمہارے ذہن میں نہ آتا ہوگا۔ مگر ایک بار مل لو، اپنے اکرام کے سر پر ہاتھ رکھ دو، اسے اپنی اولاد تسلیم کر لو۔ شاید اسی سے مجھے نجات مل جائے...... شاید......!"

○●○

حاجو نے بڑی سمجھداری سے کام لیا تھا...... سب سے بڑا دشمن غلام شاہ تھا اور حاجو چاہتا تھا کہ غلام شاہ کو اس ساری کارروائی کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہئے۔ یہ پیر مکھن شاہ بڑی زبردست کام کی چیز تھے...... اگر بات بن گئی تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ بہرحال ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب تھے۔ شمشیرہ بیگم کو چونکہ سمجھا دیا تھا کہ پیروں فقیروں کے حضور جب حاضری دی جاتی ہے تو اس کا ڈھول نہیں پیٹا جاتا بلکہ کام جتنا خفیہ رہے زیادہ

اچھا ہے۔

چنانچہ جب گھر سے نکلے تو اس سے پہلے چھوٹا سا ڈرامہ کیا گیا۔ شمشیرہ بیگم نے دوسروں کو سنانے کے لئے کہا۔

"ارے حاجو! ذرا بازار چلنا ہے مجھے...... کچھ سودا سلف خریدنا ہے۔ تیار ہو اور تانگہ لے آؤ۔"

"ٹھیک ہے شمشیرہ بیگم!"

کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اکثر ایسا ہو جاتا تھا۔ غرض یہ کہ حاجو کے ساتھ نیچے اتریں اور تانگے میں بیٹھ کر چل پڑیں۔ حاجو کو بھی اطمینان تھا۔ کسی کو کوئی شبہ نہیں ہو سکا تھا۔ تانگہ سفر کرتا رہا اور آخر کار اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں پیر مکھن شاہ صاحب جلوہ افروز تھے۔ آس پاس سکوت پھیلا ہوا تھا اور کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ وقت بھی ایسا منتخب کیا گیا تھا کہ زیادہ چہل پہل نہ ہو۔ تانگے سے اترنے کے بعد تانگے والے سے کہا گیا کہ وہ تھوڑی دور جا کر انتظار کرے، اسے پورا پورا معاوضہ دیا جائے گا۔ چنانچہ تانگے والا ایک درخت کی چھاؤں میں جا کر کھڑا ہو گیا...... حاجو نے شمشیرہ بیگم کو اشارے سے بتایا کہ وہ دیکھو مکھن شاہ صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ مکھن شاہ پالتی مارے آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں ہزارہ تسبیح ہل رہی تھی، چہرے پر جلال تھا۔ شمشیرہ بیگم نے سرگوشی کے عالم میں کہا۔

"حاجو! میرا تو دل کانپ رہا ہے...... نجانے کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا شمشیرہ بیگم! دعا مانگو۔ اگر مرشد کی نظر ہو گئی تو یوں سمجھو کہ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ دل کی ساری باتیں کہہ دینا۔" اور آہستہ آہستہ دونوں پیر صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ مکھن شاہ کی آنکھیں اسی طرح بند تھیں، جاہ و جلال کچھ اور زیادہ ہو گیا تھا۔ دفعتہ انہوں نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھولیں اور غصیلے انداز میں بولے۔

"کیا بات ہے...... کیوں آئے ہو تم لوگ؟ ہیرا منڈی کی شمشیرہ ہمارے پاس کیسے آ گئی؟ یہ رقص و موسیقی کی دنیا یہاں کیوں آباد ہو رہی ہے؟ درویشوں کے پاس اس کا کیا کام؟"

شمشیرہ بیگم کا دل تو دھک سے رہ گیا تھا...... جو الفاظ پیر جی کے منہ سے نکلے تھے سمجھ

میں آتے تھے۔ گویا بند آنکھوں ہی سے پہچان لیا تھا کہ کون ہو سکتا ہے۔ شمشیرہ بیگم دوزانو بیٹھ گئیں۔ حاجو نے بھی یہی کیا۔ مکھن شاہ نے غصیلی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا اور کہنے لگے۔

"ہم نے سوال کیا تھا...... جواب نہیں ملا۔"

"حضور! حاجت مند ہی آپ کی خدمت میں حاضری دے سکتے ہیں۔ خواہ وہ کہیں سے بھی آئیں۔ ضرورت مند ہیں اور انسان ہیں تو درویشوں ہی کی خدمت میں پہنچیں گے۔"

"مطلب پرستی...... صرف مطلب پرستی...... اپنے مطلب سے آئے ہو۔ ستائے ہوئے ہو...... شمشیرہ بیگم بڑی رونق ہے تمہارے دم سے...... کہو کیا حال ہے تمہاری بیٹیوں کا...... تینوں کی تینوں سرکش ہیں تم سے۔ تینوں کی تینوں باغی ہیں، ایک اپنی محفل الگ سجائے ہوئے ہیں اور دو ہیں کہ تمہاری سنتی ہی نہیں۔ اور تم ساز بجانے والے! کیوں آئے ہو میرے پاس؟ چلو ٹھیک ہے، مطلب بتاؤ اور جاؤ یہاں سے۔"

شمشیرہ بیگم دو قدم آگے کھسکیں۔ وہ بہت زیادہ متاثر ہو گئی تھیں۔ جو کہا جا رہا تھا معمولی بات نہیں تھی۔ گویا سارا کچا چٹھا بیان کیا جا رہا تھا۔

"فاصلہ...... فاصلہ قائم رکھو۔"

"حضور! درِ دولت پر حاضری دی ہے تو کچھ لے کر ہی جاؤں گی۔ ہٹوں گی نہیں یہاں سے۔"

"ہٹی ہوئی ہو، جانتے ہیں...... کون نہیں جانتا۔ لو، الائچیاں کھاؤ۔" پیر صاحب نے گدڑی سے الائچیاں نکالیں اور دو الائچیاں دونوں کو دیں جنہیں بڑی عقیدت کے ساتھ قبول کر کے منہ میں رکھ لیا گیا۔ پیر صاحب بولے۔

"یہی تو چاہتی ہو نا تم کہ رونقیں بحال ہو جائیں اور وہ جو دشمنی پر آمادہ ہیں غلام بن جائیں۔ کیوں یہی بات ہے نا...... پانچ دشمن راستہ روکے ہوئے ہیں...... کیوں، غلط کہا میں نے؟"

"نہیں حضور! نہیں مرشد! نہیں پیر باکمال! آپ نے تو جیسے مجھے اندر تک دیکھ لیا ہے۔"

"ارے ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے تمہیں اندر سے دیکھنے کی...... باہر سے بات کرو۔ اور وہ لڑکا نواسا ہے نا تمہارا...... کیوں سلگ رہی ہو اس کے تصور سے۔ سب ٹھیک ہو جائے

گا...... لیکن ٹھیک ہونے کے لئے بھی تمہیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔''

''صدقے جاؤں حضور! صدقے جاؤں۔ کیسے باکمال بزرگ ہیں آپ...... اے حاجو! مجھے پہلے یہاں کیوں نہ لے آئے۔''

''لو، وقت سے پہلے کیسے آسکتا تھا؟ آتا تو جل کر راکھ نہ ہو جاتا؟ ہر چیز کا ایک وقت ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''ہوں، تو پانچ دشمنوں سے نمٹنا چاہتی ہو یا اور بھی کوئی دشمن ہیں؟''

''حضور! وہی پانچ ہیں۔ مگر میں تو کچھ اور ہی چاہتی ہوں۔''

''بیان کرو اپنی زبان سے۔ ہم سنیں گے۔''

''حضور! رب نواز شاہ ہے ایک کا نام۔''

''باقی تو چار غلام ہیں ان کے۔ غلاموں کی کیا بات کرتی ہو۔ غلام تو آقا کے اشارے پر ناچتے ہیں۔''

''واری جاؤں، صدقے جاؤں، کس زبان سے آپ کی تعریف کروں۔ ارے کیا نہیں جانتے آپ۔''

''بس بس...... تعریف کرنے کی بجائے ان کی تعریف کرو۔ نواسا ہے تمہارا...... مگر اس سے تمہیں لگاؤ کہاں ہے...... بس روا روی کی بات ہے۔ ٹھیک ہے، تم جو کچھ چاہو گی ہو جائے گا۔''

''حضور میں چاہتی ہوں کہ رب نواز شاہ، کوثر جہاں کا دم بھرنے لگیں۔ اس کے تلوے چاٹنے لگیں۔ جو کچھ اس کے بیٹے کو دیا ہے وہ کوثر جہاں کے حوالے کر دیں اور حضور کوثر جہاں کے جتنے متوالے ہیں وہ غزالہ اور شبانہ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ حضور بس کچھ ضرورتیں پوری ہو جائیں، بیڑا پار ہو جائے گا۔''

''سب ضرورتیں پوری ہو جائیں گی اور جن کی ضرورتیں پوری ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا ان کی ضرورتیں کس طرح پوری ہوں گی۔''

''حضور میں سمجھی نہیں...... سمجھا کر کہیں تو زیادہ عنایت ہوگی۔''

''سمجھا دیں گے...... سینکڑوں یتیم، سینکڑوں بیوائیں، سینکڑوں ضرورت مند ایسے پڑے

ہیں جنہیں روٹی درکار ہے، لباس درکار ہے۔ کچھ دو گی تو کچھ پاؤ گی۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟''

''شمشیرہ بیگم۔''

''اور تم سازندے ہو ان کے...... تمہیں اتنا احساس نہیں ہے کہ جب پیروں فقیروں کے پاس جایا جاتا ہے تو کچھ نظریں گزاری جاتی ہیں، کچھ دیا جاتا ہے...... کیا یہ ہمیں درکار ہیں...... کیا اس درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ہو...... جن کا حق ہے انہیں پہنچاؤ...... حق ہے حق ہے...... حق......''

شمشیرہ بیگم نے گھبرا کر حاجو کی طرف دیکھا اور حاجو نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''کچھ لائی ہو شمشیرہ بیگم؟''

''ارے پہلے سے کچھ کہتے تو لے آتی۔''

''کمال کی ہو...... سچی بات تو یہی ہے کہ نظر نیاز کے لئے تو کچھ کرنا ہی تھا۔''

حاجو میاں ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ''حضور سائیں مکھن شاہ! بس مرادیں پوری ہو جائیں، آپ حکم فرماتے رہیں۔ بتایئے کیا پیش کیا جائے؟''

''جو کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔ یہاں ایک قریبی گھرانہ ہے، سیّد لوگ ہیں وہ لوگ۔ پیسے پیسے کو ترسے ہوئے ہیں، بیماریوں نے گھر دیکھا ہوا ہے۔ بیس ہزار روپے وہاں پہنچانے ہیں۔ پتہ ذہن میں رکھ لو۔ اس کے علاوہ ایک یتیم خانہ ہے، پندرہ ہزار روپے یتیم خانے کو دینے وہیں۔ ایک ایسی جگہ ہے جہاں بیواؤں کی پرورش ہوتی ہے، پندرہ ہزار روپے وہاں پہنچاؤ۔ جب یہ رقم وہاں پہنچ جائے گی تو ہم اپنے عمل کا آغاز کر دیں گے۔ دوا کے ساتھ دعا بھی درکار ہوتی ہے۔ دوائیں پہنچیں تو دعا کارگر ہو۔''

''پپ...... پپ...... پپ پچاس ہزار...... پچاس ہزار؟'' شمشیرہ بیگم کا کلیجہ ایک بار پھر منہ میں آگیا تھا۔

''تم نے سنا، جاؤ...... جو چاہو گی وہ ہو جائے گا اور نتیجہ کچھ ہی دنوں میں ظاہر ہو جائے گا۔ لیکن اس وقت جب دعائیں پہنچیں گی۔ دعائیں اول ہیں دعائیں آخر ہیں...... حق ہے...... حق ہے...... حق ہے۔'' مکھن شاہ نے آنکھیں بند کر لیں اور تسبیح پر ورد شروع ہو گیا۔

حاجو نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے...... دل کو کچھ اطمینان ہوا؟"

"ہاں......" شمشیرہ بیگم نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"تو آؤ واپس چلیں۔"

"چلو......" شمشیرہ بیگم اٹھ گئیں۔ حاجو آہستہ آہستہ تانگے کی طرف بڑھ رہا تھا اور شمشیرہ بیگم کو چور نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ آخر کار دونوں تانگے میں جا بیٹھے۔ تانگہ ہیرا منڈی کی طرف چل پڑا۔ حاجو نے کہا۔

"خرچہ کچھ زیادہ بتا دیا پیر مکھن نے۔ چھوڑو شمشیرہ بیگم! کہاں پچاس ہزار روپے خرچ کرتی پھرو گی...... پتہ نہیں یہ کام ہو یا نہ ہو۔"

"ارے حاجو! زبان کو لگام دو...... تم نے دیکھا نہیں کیسے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں اور میرے منہ سے تو کچھ بھی نہ نکلا اور انہوں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے شمشیرہ بیگم! لیکن خرچہ کچھ زیادہ نہیں ہے؟ کوئی رعایت نہیں مانگی جا سکتی تھی؟"

"میں کہتی ہوں زبان بند رکھو...... خرچ تو کرنا ہی پڑیں گے ہائے پچاس ہزار روپے۔ مگر اس کے بدلے میں لاکھوں روپیہ آ جائے تو کیا حرج ہے۔"

"ٹھیک ہے...... جیسی تمہاری مرضی۔"

"ہماری کیا مرضی۔ ہم تو تمہارے ہی بھلے کو سوچتے ہیں۔"

"مجھے لگ رہا ہے میرا بھلا اسی میں ہے حاجو کہ میں پچاس ہزار روپے خرچ کر دوں اور پچاس لاکھ کما لوں۔"

"بالکل صحیح کہہ رہی ہو...... لیکن ہمارا بھی تو کچھ خیال کر لیا کرو۔"

"زبان بند رکھنا حاجو! کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ جو پیر صاحب نے کہا ہے وہ کر دینا۔ ارے بڑے باکمال آدمی ہیں۔ میں تو پاگل ہو گئی ہوں۔"

حاجو شانے ہلا کر خاموش ہو گیا لیکن دل ہی دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ چاروں طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی تھی۔ آدھے آدھے پر معاملہ طے ہوا تھا مکھن شاہ سے۔ پچیس ہزار...... گویا پورے پچیس ہزار۔ اور حاجو پر نشے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ بس ایک ہی دعا تھی اس کی کہ خدا اس کا یہ عمل غلام شاہ کی آنکھوں سے محفوظ رکھے۔ ادھر شمشیرہ بیگم بھی

گہری سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پیر صاحب نے جس طرح روشن ضمیری کا مظاہرہ کیا تھا وہ تو بے مثال تھا۔ خدا کرے یہ سب کچھ ہو جائے...... رب نواز شاہ جال میں پھنس جائے پھر تو ہرے ہی ہرے ہیں۔

○●○

شاہ جی نے اکرام کو جس سکول میں داخل کرایا تھا وہ لاہور کے معیاری سکولوں میں شمار ہوتا تھا جس کی جانب نچلے طبقے کے لوگ دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بات صرف لاہور کے امراء کی نہیں تھی، بلکہ دور دراز مقامات سے بڑے بڑے چوہدریوں اور جاگیرداروں کے بچے اسی سکول میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بہت وسیع و عریض علاقے میں سکول قائم تھا۔ شاندار ہاسٹل۔ سکول کو چلانے کے سلسلے میں بڑے بڑے لوگ متعین کئے گئے تھے۔ ان کا معیار انتہائی بلند تھا اور اس سکول میں آنے والے کسی بھی بچے کے بارے میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی تھی کہ وہ کسی اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ اکرام اسی سکول میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اس کی انتہائی قیمتی کار خود اس کی شخصیت قیمتی لباس سے آراستہ، حسین ترین، سبک نقوش والا چہرہ جو نیلی آنکھوں سے سجا ہوا تھا اور دیکھنے والے کی نگاہ ایک بار اس پر اٹھتی تو بار بار دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔ اس کا معیارِ زندگی انتہائی بلند کر دیا گیا تھا اور کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی اچھے خاندان یا پھر کسی بڑے جاگیردار کا بیٹا نہیں ہے۔ ولدیت میں رب نواز شاہ کا نام لکھا ہوا تھا اور دیکھنے والے یہ سمجھ جاتے تھے کہ جس شان اور جس سج دھج سے وہ سکول میں داخل ہوتا ہے اس سے یقینی طور پر اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ کسی بہت بڑے جاگیردار کا بیٹا ہے۔

بہر حال یوں تو شناسا اور دوستوں میں بہت سے لوگ شامل تھے لیکن ایک لڑکے علی شاہ سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ علی شاہ خود بھی ایک بہت بڑے چوہدری کا بیٹا تھا اور اس کے باپ نادر شاہ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ کئی بار علی شاہ نے اکرام کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی اور اکرام نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ کسی مناسب وقت پر وہ اس کے گھر ضرور چلے گا۔ علی شاہ نے درجنوں بار اپنے اہل خاندان سے اس خوبصورت لڑکے کی بات کی تھی جس کا نام اکرام تھا۔ بہت سے دوسرے لڑکے بھی شامل تھے اور بچپن کی جو ایک مخصوص عمر ہوتی ہے اور اس عمر کے جو مسائل ہوتے ہیں وہ ان کے ساتھ بھی موجود تھے۔

بہت سے لڑکے ان دونوں کی دوستی سے جلتے بھی تھے جن میں سب سے نمایاں نام ایک چوہدری کے بیٹے راجہ سخاوت کا تھا۔ راجہ سخاوت پورے سکول میں سب سے زیادہ قد آور، چوڑا چکلا نوجوان تھا اور یہ دیکھ کر دوسرے لوگ ہنستے اور مسکراتے تھے کہ وہ اس تن و توش کے ساتھ تعلیم کے معاملے میں بالکل صفر تھا اور کئی بار اس سلسلے میں اس پر نقطہ چینی بھی ہو چکی تھی۔ اس کی عمر بے شک اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن قد و قامت بڑھ گیا تھا اور اس کی وجہ بھی راجہ دلاور یعنی اس کے باپ کی بے پناہ محبت تھی۔ کیونکہ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔

اکرام کسی سے بھی پرخاش نہیں رکھتا تھا۔ ہر ایک سے اچھے انداز میں ملنا اس کی فطرت تھی۔ مجموعی طور پر اس کی طبیعت میں شوخی بھی تھی اور جملے بازی سے دریغ نہیں کرتا تھا لیکن شرافت کے دائرے میں اس کی تربیت جس طرح کی جا رہی تھی اس کے تحت جب بھی چاہتا کسی سے جھگڑا لے لیتا لیکن سکول کی تاریخ میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں تھا جہاں اکرام کو ایک بد اخلاق انسان پایا گیا ہو۔ البتہ راجہ سخاوت اس پر چوٹیں کرتا رہتا تھا اور ان چوٹوں کا جواب بھی شائستہ پیرائے میں اسے مل جاتا تھا۔ لیکن راجہ سخاوت کی یہ جلن کم نہیں ہوتی تھی۔ پھر نادر شاہ نے ایک تقریب کی جو اس کے بیٹے علی شاہ کے سلسلے میں ہی تھی تو خصوصی طور پر اس میں اکرام کو مدعو کیا گیا اور علی شاہ نے اکرام سے کہا کہ وہ اس تقریب میں ضرور شرکت کرے۔ بات شاہ جی تک پہنچی تو شاہ جی نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور ایک انتہائی قیمتی تحفہ بھی اسے خرید کر دے دیا گیا جو کسی جاگیردار کی شایانِ شان تھا۔ ایک انتہائی شاندار کار اور اس پر انتہائی حسین لباس میں ملبوس اکرام جب نادر شاہ کی کوٹھی کے دروازے پر اترا تو سینکڑوں نگاہوں نے اس کا طواف کیا۔ شان ہی نرالی تھی۔ اتنا حسین لگ رہا تھا کہ اس کے بعد چراغوں کی روشنی کم ہو گئی تھی۔ بڑی سی حویلی کے بڑے سے دروازے کے اندر کے حصے میں مہمانوں کے لئے بندوبست کیا گیا تھا اور بہت شاندار اہتمام نظر آ رہا تھا۔ علی شاہ نے آگے بڑھ کر اکرام کو گلے لگایا اور دور بیٹھے ہوئے کسی شخص نے اکرام کے بارے میں پوچھا۔

"یہ بچہ کون ہے؟"

"پتہ نہیں...... کسی اچھے گھرانے کا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"اکیلا آیا ہے؟"

"ہاں...... ہو سکتا ہے پنجاب کے کسی نواحی شہر سے آیا ہو اور ہاسٹل میں رہتا ہو۔"

لوگ تبصرے کرتے رہے۔ اکرام سبھی کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔ ادھر راجہ دلاور بھی اپنے بیٹے کے ساتھ آیا تھا اور تقریب بڑی دلچسپی سے چل رہی تھی۔ راجہ سخاوت نے اپنے باپ کو بتایا۔

"وہ اکرام ہے۔"

"کون اکرام؟"

"ہمارے سکول میں ہی پڑھتا ہے۔"

"اچھا اچھا...... وہ نیلی آنکھوں والا لڑکا...... کہاں کا رہنے والا ہے؟ بہت بڑے آدمی کا بیٹا معلوم ہوتا ہے۔ رہتا کہاں ہے؟"

"یہیں لاہور میں۔"

"اچھا اچھا...... باپ کا نام کیا ہے؟"

"رب نواز شاہ۔"

"نام تو سنا ہوا نہیں لگتا مگر بچہ بہت خوبصورت ہے۔"

"میری اس سے چلتی ہے۔"

"ارے کیوں؟"

"بس وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"تیرا اور اس کا کیا مقابلہ بیٹے! تیرے سامنے تو واقعی کوئی بھی اچھا نہیں لگتا۔" راجہ دلاور نے کہا۔ علی شاہ، اکرام کے آ جانے کے بعد دوسرے لڑکوں سے بالکل الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ تقریب مکمل ہو گئی۔ سب ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرنے لگے۔ اتفاق کی بات یہ کہ اس وقت راجہ دلاور، نادر شاہ کے پاس ہی موجود تھا جب اکرام اور علی شاہ ٹہلتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے۔ نادر شاہ نے اکرام کو آواز دے لی۔

"بیٹے! ادھر آؤ...... بات تو سنو۔ بیٹھو بھئی، کچھ ہم سے بھی باتیں کرو۔"

اکرام ادب سے آ کر بیٹھ گیا۔ علی شاہ بھی قریب بیٹھ گیا تھا۔

"بیٹے! آپ کے والد صاحب کا نام رب نواز شاہ ہے؟"

"جی۔"

‘‘تقریب میں وہ نہیں آئے؟’’

‘‘ان کا خیال تھا کہ یہ تقریب صرف بچوں کے لئے ہے۔’’

‘‘اوہو...... اچھا، دعوت نامے میں وضاحت نہیں کی گئی۔ تمہاری والدہ ہیں؟’’

‘‘جی ہاں...... اللہ کے فضل سے۔’’

‘‘بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔ اور کیا کرتے ہو؟’’ راجہ دلاور نے بھی گفتگو میں دخل دیا اور پھر بول پڑے۔

‘‘ویسے ایک بات ہے نادر شاہ صاحب! شیر کا بیٹا شیر اور باقی میں کیا کہوں۔ لڑکوں میں جان نہیں ہے آج کل۔ لڑکیاں بنے پھرتے ہیں، نرم و نازک۔ مرد کی تو شان یہ ہے کہ جہاں کھڑا ہو جائے، نگاہیں اس کی جانب اٹھ جائیں۔ اب تم راجہ سخاوت کو دیکھ لو۔ ویسے تو میرے پاس چار سو بھینسیں ہیں لیکن ایک سب سے بڑی اور سب سے اچھی بھینس میں نے اس کے لئے چھوڑ دی ہے۔ ورزش کرتا ہے۔ جان بنائی ہے میں نے اپنے بیٹے کی۔’’

‘‘اس میں کوئی شک نہیں۔ اس بھینس نے اسے بھینسا بنا دیا ہے۔ لیکن بھینسے اور انسان میں فرق ہوتا ہے۔’’ نجانے کیوں یہ الفاظ علی شاہ کے منہ سے نکل گئے اور راجہ سخاوت نے بھی یہ الفاظ سن لئے۔ باپ کی طرف رخ کر کے بولا۔

‘‘سن رہے ہیں آپ باجی! کیا کہہ رہا ہے مجھے یہ۔’’

‘‘کیا ہوا؟’’

‘‘کہہ رہا ہے کہ بھینسے اور انسان میں فرق ہوتا ہے۔ بھینس آدمی کو بھینسا ہی بنا سکتی ہے۔’’

‘‘خیر یہ تو بری بات کی ہے اس نے۔ اپنے گھر میں بلا کر ایسی بات تو نہیں کرنی چاہئے۔’’

‘‘کیا فضول بکواس کر رہے ہیں آپ علی شاہ، صحیح کہہ رہے ہیں راجہ صاحب۔’’

‘‘نہیں ابو جان! ہم تو ایسے ہی آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔’’

‘‘کسی دن اسی ہنسی مذاق کا بہت برا نتیجہ نکلے گا، یہ میں تم سے کہے دیتا ہوں علی شاہ۔’’ راجہ سخاوت نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

‘‘نہیں بیٹا نہیں...... برا نہیں مانتے۔ چلو علی شاہ، معافی مانگ لو۔’’

‘‘اس کا دماغ بہت گرم ہے نادر شاہ! بچوں کو سمجھا دیجئے۔ اتنا تیز دماغ اور اتنا طاقتور بدن کبھی کبھی بڑا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں راجہ سخاوت کے بارے میں۔ اس کے استاد کہتے ہیں کہ اگر اس کے ہاتھ میں لاٹھی دے دی جائے تو سمجھ لو کہ دس پانچ بڑی عمر کے آدمیوں کی بھی خیر نہیں ہو گی۔’’

‘‘لاٹھی اور چاقو بھلا اس سے کہاں چلیں گے۔’’ علی شاہ نے جلی ہوئی آواز میں کہا۔

‘‘کیوں......؟’’ راجہ دلاور بولا۔

‘‘اتنے بدن کے ساتھ پھرتی کبھی نہیں آ سکتی۔ لاٹھی کسی ایسے ویسے کے ہاتھ میں تھما دی جائے تو وہ کیا چلائے گا۔’’

‘‘نہیں بیٹا! ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ سے توبہ کرنا کہ کبھی تمہیں راجہ سخاوت کی لاٹھی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔’’ راجہ دلاور نے دوہری مار ماری۔ یعنی ایک طرف محبت کا اظہار دوسری طرف اپنے بیٹے کی تعریف۔

‘‘خیر یہ لاٹھی وغیرہ ہر ہاتھ میں نہیں سجتی۔ اندازہ ہمیں بھی ہو رہا ہے۔’’ ایک اور صاحب درمیان میں بول پڑے۔

‘‘کیا مطلب ہے آپ کا؟’’

‘‘بس جی...... یہ کام کرنے والے ذرا الگ ہی ہوتے ہیں۔’’

‘‘یہ کیا ہو رہا ہے نادر شاہ صاحب! کیا آپ نے ہمیں بے عزت کرنے کے لئے بلایا تھا؟’’

‘‘بھئی یہ تو دلچسپ باتیں ہیں جو ہو رہی ہیں دوستوں کے درمیان۔ اس میں بے عزتی کا کیا سوال ہے۔’’

‘‘اگر ایسی ہی کوئی بات ہے تو کسی دن راجہ سخاوت کے ہاتھ دیکھ لیں آپ۔’’

‘‘ارے نہیں نہیں...... یہاں دنگل تو نہیں ہو رہا۔’’

‘‘دنگل بھی ہو سکتا ہے...... رکھ لیجئے کسی دن۔’’ ان صاحب نے کہا۔

‘‘تو پھر آپ ایسا کریں کہ کل ہی آ جائیں۔ شام کو چار بجے استاد آتے ہیں اور بہت سے ہنر سکھاتے ہیں۔ آ جائیے آپ کل شام کو۔’’

‘‘ضرور...... ضرور آئیں گے اور دیکھیں گے۔’’

"آپ کیوں ناراض ہو رہے ہیں بھائی؟"

"یار! ناراضگی کی تو کوئی بات نہیں ہے، اب دیکھئے نا بچے پر مسلسل چڑھائی ہو رہی ہے۔ بھئی بچوں کی بات بچوں میں رہنے دی جائے۔"

"آپ آیئے تو سہی، کل آپ کو ہم تماشہ دکھاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، آ رہے ہیں ہم۔"

بہرحال باپ بیٹے بری طرح جھلائے ہوئے تھے اور یہ بات خود نادر شاہ نے بھی محسوس کر لی تھی لیکن علی شاہ بھی جھلا گیا تھا۔ اس نے اکرام سے کہا۔

"اکرام! کل ضرور چلنا ہے۔ ذرا دیکھیں گے کہ یہ بھینسا کس طرح لاٹھی کے کمالات سیکھ رہا ہے۔"

اکرام ہنس کر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کے اپنے نزدیک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔ ویسے شاہ جی کی طرف سے اسے آزادی ملی ہوئی تھی کہ جہاں چاہے آ جا سکتا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن جب وہ صاحب جن کا نام غیاث احمد تھا ان لوگوں کے پاس پہنچ گئے تو اکرام کو بھی علی شاہ کے ساتھ چلنا پڑا۔ اور پھر یہ لوگ راجہ دلاور کی حویلی کی طرف چل پڑے۔ راجہ صاحب انتظار کر رہے تھے۔ اندر کا منظر بڑا دلچسپ تھا۔ راجہ سخاوت نے لنگوٹ کسا ہوا تھا اور بائیں طرف جو جگہ ورزش وغیرہ کے لئے بنائی گئی تھی وہاں موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے استاد بھی تھے۔ یہ اسے فنونِ حرب سکھایا کرتے تھے۔ اور پھر راجہ دلاور نے جو اس دن خاصا بگڑ گیا تھا ان سے تعارف کرایا تو استاد کہنے لگے۔

"بھئی راجہ صاحب! کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ کہاں اپنا سخاوت اور کہاں یہ لوگ۔ کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے دونوں بازوؤں میں ان دونوں کی گردنیں دبا کر انہیں مار سکتا ہے۔"

"واہ استاد واہ...... کیا آپ اپنے شاگرد کو قتل و غارت گری سکھا رہے ہیں؟"

"نہیں صاحب! جو میں کہہ رہا ہوں صحیح کہہ رہا ہوں۔ جب دماغ گرم ہو جاتا ہے تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔" اکرام نے کہا۔

"یہ لاٹھی کا کھیل کھیلتا ہے یا چاقو کا؟"

"دونوں۔"

"ہم بڑے کھائے کھیلے آدمی ہیں بیٹے! ہر فن جانتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو چاقو کے کارنامے بھی دیکھ سکتے ہو۔ چاقو ہمارے ہاتھوں میں کھلونا ہوتا ہے۔ جس طرف بھی لہرا دیں، کاٹتا ہوا نکل جائے اور پتہ بھی نہ چلے۔"

"ٹھیک ہے......" اس نے علی شاہ سے کہا۔

"اب ذرا مجھے مقابلہ کرنے دو اس راجہ سخاوت سے۔ میں نے اس کی راج گدی نہ چھین لی تو میرا نام اکرام نہیں ہے۔"

علی شاہ ہنس پڑا تھا پھر اس نے کہا۔ "بس ذرا دیکھ لو...... نقصان نہ پہنچ جائے۔"

"اللہ مالک ہے۔" اکرام نے کہا اور استاد نے اکرام کو غور سے دیکھ کر کہا۔

"بیٹا! نقصان پہنچا تو ذمہ دار تم خود ہو گے۔"

"ٹھیک ہے...... مقابلے میں تو نقصان پہنچتا ہی ہے۔"

ادھر راجہ سخاوت خوش تھا۔ موقع مشکل ہی سے ملتا، لیکن آج موقع مل گیا تھا۔ چونکہ خود بھی بڑے آدمی کا بیٹا تھا اور چاہتا تھا کہ ساری شان و شوکت اسی کی نظر آئے لیکن اکرام اس سے کہیں زیادہ شان و شوکت سے رہتا تھا۔ چنانچہ وہ دل ہی دل میں اس سے حسد بھی کرتا تھا۔ سکول میں تو خیر اس طرح کے موقعے مل نہیں سکتے تھے لیکن آج قدرت نے ایک اچھا موقع دے دیا تھا۔ دوسروں کے دلوں میں کچھ بھی ہو لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اکرام کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اسے کچھ عرصے کے لئے سکول سے چھٹی کرا دے گا۔

ادھر استاد اپنے شاگرد پر بڑا فخر کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک شاندار لاٹھی راجہ سخاوت کو دی اور دوسری اکرام کی طرف اچھال دی۔ لاٹھی اس طرح اچھالی تھی کہ اکرام اسے ہاتھ میں نہ پکڑ سکے اور وہ زمین پر گرے۔ لیکن اکرام نے جس طرح لپک کر لاٹھی کو پکڑا اس سے استاد کا چہرہ اتر گیا۔ پہلے ہی مرحلے میں انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ لاٹھی پکڑنے کا انداز بڑا ماہرانہ ہے۔ کوئی اناڑی ہوتا تو کبھی لاٹھی نہیں سنبھال سکتا تھا۔ لیکن لاٹھی لپکنے سے ہی پتہ چل گیا تھا کہ مدمقابل کا معاملہ کیا ہے۔ اکرام نے لاٹھی سنبھالی اور پھر اسے دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر اس کا سرا زمین پر ٹکا کر اس کی لچک کا جائزہ لیا تو استاد بدحواس نظر آنے لگے۔ یہ لڑکا تو بڑی آگے کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے دل میں سوچا لیکن اب کیا کر سکتے تھے۔ خود ہی پھنسا دیا تھا انہوں نے اپنے شاگرد کو۔ لیکن راجہ دلاور اپنے بیٹے کے تن و

توش پر بڑا ناز کرتا تھا۔ پینترے بدلے جانے لگے اور دونوں ایک دوسرے پر نظریں جمائے، ایک دائرے میں گھومنے لگے۔ پھر راجہ سخاوت نے اپنے بدن کو ہلکی سی جنبش دی، کمر جھکائی، پلٹی کھائی اور لاٹھی کا بھرپور وار اکرام پر کیا۔ علی شاہ کے منہ سے ایک ڈری ڈری آواز نکلی لیکن سخاوت کی لاٹھی اکرام کی لاٹھی کے درمیان میں پڑی اور اکرام نے آسانی سے وار خالی دے کر مسکرا کر سر کو جنبش دی اور بولا۔

"یہ کیا...... ذرا مردوں والے وار کرو تاکہ مزہ بھی آئے۔ اور سنو، تمہاری کوئی رعایت تمہیں خود ہی نقصان پہنچائے گی۔"

سخاوت نے پلٹی کھا کر ایک بار پھر لاٹھی کا وار کیا اور اس کے بعد وہ مسلسل وار کرنے لگا۔ استاد اتنے جذباتی ہو گئے تھے کہ وہ راجہ سخاوت کو ہدایت بھی دیتے جا رہے تھے، اسے وار کرنے کے طریقے بتا رہے تھے۔ لیکن پھر اس وقت ان کے چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا جب انہوں نے دیکھا کہ ہر بار ہر وار اتنی آسانی سے رد کر دیا جاتا ہے کہ بڑے سے بڑے ماہر بھی یہ نہ کر سکیں تو انہوں نے راجہ سخاوت کو خوف زدہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ادھر راجہ سخاوت اپنی تمام تر کوششیں اس بات پر صرف کر رہا تھا کہ ایک لاٹھی اکرام کے بدن سے لگا دے۔ بس ایک لاٹھی۔ اس میں کام ہو جائے گا۔ لیکن اکرام کسی بھی طرح اس کی لاٹھی اپنے بدن تک نہیں پہنچنے دے رہا تھا۔ یہ بات استاد نے خود بھی دیکھی تھی کہ اکرام کو بے شمار بار اس بات کا موقع ملا تھا کہ اگر وہ چاہتا تو راجہ سخاوت پر وار کر سکتا تھا لیکن اس نے بڑی لاپرواہی سے اسے ٹال دیا تھا اور مسلسل راجہ سخاوت کو تھکا رہا تھا۔ آخر کار اس نے سر سے لاٹھی بلند کر کے ایک ایسا وار راجہ سخاوت کی لاٹھی پر کیا کہ راجہ سخاوت کی لاٹھی درمیان سے ٹوٹ گئی اور اکرام نے لاٹھی پیچھے سے اس کی گردن میں ڈال کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کے بعد ایک زوردار لات اس کی کمر پر ماری اور راجہ سخاوت تین قلابازیاں کھا کر سیدھا گر پڑا۔ یہاں جتنے لوگ تھے وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اکرام کو دیکھ رہے تھے۔ اکرام نے گردن خم کی اور کہا۔

"جی استاد......"

استاد تو کچھ نہ بولے، راجہ دلاور نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ سکھایا ہے تم نے اس بیل کے پٹھے کو؟" اشارہ راجہ سخاوت کی طرف تھا۔

"بات یہ نہیں ہے راجہ صاحب! بلکہ یہ بچہ کسی اچھے استاد کا سیکھا ہوا ہے۔ ہم پیسے ضرور لیتے ہیں آپ سے لیکن اب جب بات سامنے آئی ہے اور جو کچھ ہم نے دیکھا ہے تو یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے کہ یہ لڑکا بہت بڑا ہے۔"

"بکواس کرنے میں تو آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔"

"چھوڑیئے استاد صاحب۔ اب اگر کوئی اور فن آزمانا چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں۔" اکرام نے کہا۔

"ہوں...... جی تو چاہتا ہے۔ کیا خیال ہے راجہ صاحب؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ اور لڑکے! تم اور کیا دکھانا چاہتے ہو؟" راجہ دلاور نے کہا۔

"استاد نے چاقو کے بارے میں بات کی تھی۔ چاقو کا مجھے بھی شوق ہے۔"

"ہاں، ہاں...... ذرا دیکھیں کتنا جانتے ہو تم اس بارے میں۔" استاد نے اپنے لباس سے دو چاقو نکالے اور سامنے رکھ دیئے۔

"ارے، ارے...... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ راجہ سخاوت کو تو آپ نے چاقو ابھی ٹھیک سے سکھایا ہی نہیں ہے۔" راجہ دلاور نے پریشان لہجے میں کہا۔

"نہیں...... چاقو کا کھیل سخاوت نہیں دکھائے گا، بلکہ ہم ہی سنبھالے ہوئے ہیں۔"

استاد کو یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ اب نوکری گئی۔ اس وقت جو کچھ ہوا تھا وہ سب نے ہی محسوس کر لیا تھا۔ یہ خوبصورت سا لڑکا اگر چاہتا تو چند لاٹھیوں میں راجہ سخاوت کے ہاتھ پاؤں توڑ کر پھینک دیتا لیکن اس نے جان بوجھ کر کوئی ایسا وار نہیں کیا تھا۔ جب کہ راجہ سخاوت جنونیوں کے انداز میں اس پہ وار پر وار کر رہا تھا اور وہ بڑی حلیمی سے یہ وار خالی دیتا رہا تھا۔ چاقو درمیان میں رکھے گئے۔ استاد نے خود اپنی کمر سے پٹکا باندھا اور ایک چاقو اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ دوسرا چاقو انہوں نے اکرام کے حوالے کر دیا تھا۔ اکرام نے چاقو ہاتھ میں پھرکی کی طرح گھمانا شروع کیا اور استاد کی نگاہیں اس کے ہاتھوں پر جمی رہیں۔ انہوں نے گردن خم کی، اپنا چاقو بند کر کے جیب میں رکھا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے۔

"کلیجے سے لگ جاؤ...... دیکھ لیا، چاقو تیرے ہاتھ میں پہنچا تو ہم نے دیکھ لیا۔ مگر اب تُو بتا دے میرے بچے، میری جان! کہ استاد کون ہے تیرا؟"

اکرام ہنس کر خاموش ہو گیا۔ علی شاہ بری طرح اچھلنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

"اب چلتے ہیں ابو جان! اب تو آپ کو اندازہ ہو گیا کہ اکرام کیا ہے۔"

نادر شاہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔ ادھر راجہ دلاور اس طرح گھن کھا گیا تھا کہ اس نے اخلاقاً بھی ان لوگوں سے رکنے کے لئے نہیں کہا۔ البتہ استاد ساتھ ہی ساتھ باہر نکل آئے تھے۔ انہوں نے ہنس کر کہا۔

"روٹی کپڑا دینا تو اللہ کا کام ہے لیکن آج جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم نے غلط لڑکے کو مرد بنانے کی کوشش کی تھی۔"

"لگتا ہے راجہ صاحب آپ سے ناراض ہو گئے۔"

"ہو جائیں۔ اب کیا ناراض ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہماری گردن پکڑ کر ہمیں باہر نکالتے ہم خود چلے آئے۔ فن کے سوداگر نہیں ہیں بیٹا بلکہ فن کے قدر دان ہیں۔ جیتے رہو، اللہ تمہیں لمبی زندگی دے کہ تمہارے ماں باپ کا جی خوش رہے۔ کبھی جی چاہے تو ہمارے پتے پر آ جانا۔ بہت جی خوش کیا ہے تم نے۔" واپسی میں نادر شاہ نے کہا۔

"اکرام! تم جتنے پیارے بچے ہو آج تم نے ہمیں اتنا ہی حیران بھی کر دیا ہے۔ کسی وقت تمہارے والد سے ملاقات کریں گے، سمجھے۔ بھئی علی شاہ! کسی دن اکرام کے گھر چلیں گے۔ ذرا ان کا پتہ وغیرہ معلوم کر لینا۔"

علی شاہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔

○●○

حاجو بڑا گہرا داؤ کھیل رہا تھا۔ بات چھوٹی موٹی رقم کی نہیں تھی۔ پچاس ہزار میں سے پچیس ہزار تو کھرے ہی تھے۔ شمشیرہ بیگم کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر خود مکھن شاہ کو پچاس ہزار دینے کا شور مچا دیتا اور کہہ دیتا کہ اس پہنچے ہوئے بزرگ کو یہ رقم دینا غلط نہیں ہوگا تو شمشیرہ بیگم یقیناً بھاگ جاتیں اور کام نہ بنتا۔ لیکن حاجو بڑی چالاکی سے اپنا پروگرام آگے بڑھا رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ شمشیرہ بیگم کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پچاس ہزار کی رقم تو خیر کوئی ایسی نہیں تھی کہ شمشیرہ بیگم کسی کو دے دیتیں لیکن مکھن شاہ خود بھی بہت چالاک آدمی تھا اور جس چالاکی سے اس نے شمشیرہ بیگم کے دماغ کو اپنی مٹھی میں جکڑا تھا وہ کمال تھا اور اس سے شمشیرہ بیگم پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ پچاس ہزار روپے اپنے پاس تیار کر چکی تھیں۔ البتہ عادت کے مطابق یہ رقم دیتے ہوئے انہیں تردّد ہو رہا تھا۔ کہنے لگیں۔

"حاجو! کسی پیر فقیر کے بارے میں کوئی غلط بات سوچنا تو گناہ ہوتا ہے۔ اور پھر مکھن شاہ کو تو میں دیکھ چکی ہوں...... کیا جاہ و جلال ہے، کیا انداز ہے۔ صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ کام ہوگا یا نہیں ہوگا۔"

"شمشیرہ بیگم! تم بھی بہت عجیب ہو۔ دینے پر آتی ہو تو ہزاروں کی پرواہ نہیں کرتیں اور اگر نہیں دیتیں تو ایک روپیہ بھی دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں تم سے، اب بھی سوچ لو۔ یہ بات تو خیر بالکل ٹھیک ہے کہ یہ رقم مکھن شاہ کے لئے بالکل بے حقیقت ہے وہ جہاں بیٹھ جائیں وہیں ان کا مسکن بن جاتا ہے۔ یہ رقم یتیموں اور بیواؤں کو جائے گی۔ لیکن پچاس ہزار کم نہیں ہوتے۔ خود میرا دل بھی ڈرتا ہے اور سوچتا ہوں کہ اگر کام نہیں بن سکا تو کیا ہوگا۔"

"تمہارے منہ میں خاک...... کبھی ڈھنگ کی بات بھی سوچو۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ

کام بن ہی جائے گا۔“

”ارے بابا! ہم تو بہت کچھ سوچتے ہیں، تم بھی تو کبھی سوچو۔ وہ جو کہتے ہیں کہ میٹھا میٹھا ہپ، کڑوا کڑوا تھو۔ ہم پر تو کبھی تم نے بھروسہ کیا ہی نہیں ہے، ہمارے خلوص پر، ہماری محبت پر، ہماری وفاؤں پر۔“

”تمہارا منہ کالا ہو...... اس وقت تمہاری محبت اور تمہاری وفا کہاں سے بیچ میں آ ٹپکی۔“

”مطلب یہی ہے کہ ہم نے کیا کیا دعائیں نہیں کیں تمہارے لئے۔ مگر تم نے کبھی ہم پر بھروسہ ہی نہیں کیا۔“

”بک بک اپنی لگائے رکھو گے۔ اب بتاؤ کیا کریں؟“

”جو تم مناسب سمجھو۔ ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہتے۔“

”ارے واہ، مکھن شاہ کو تلاش تو تم نے ہی کیا ہے، اب ایک کام اور کرو۔ کسی کو اس بات کی کانوں کان خبر نہ ہو...... اور تم خاموشی سے یہ رقم مکھن شاہ کے حضور پیش کر دو اور جیسا کہیں ویسا کر دو۔“

”نہ بی بی نہ...... یہ کبھی نہیں ہوگا۔“ حاجو اچھل کر بولا۔

”کیوں؟“

”رقم اپنے ہاتھ سے خود چل کر دو۔ یہ پیسے کا معاملہ ہے۔ ہاں بعد میں جو ذمہ داری تم میری لگاؤ گی وہ میں دیکھ لوں گا بے شک۔ لیکن پیسہ بڑی پاپی چیز ہے، اچھے اچھوں کے دل خراب کر دیتا ہے۔“

”باقی کام تو تم کر لو گے ناں؟“

”ارے تو انکار کس نے کیا ہے؟“

”ٹھیک ہے......“ شمشیرہ بیگم تیار ہو گئیں۔ بار بار جانا مناسب نہیں تھا۔ حاجو کو ہدایت دی گئی۔ وہ پہلے سے مکھن شاہ کے پاس پہنچ گیا اور ان سے کہا۔

”ہاں شاہ جی! یہ بتاؤ اب کیا سوچا ہے تم نے اس کے بارے میں؟“

”کس بارے میں حاجو؟“

”ایک بات بتاؤں، تمہاری اوقات کا مجھے پتہ ہے۔ دو چار پانچ روپے لوگ دے جاتے ہیں، بھرم قائم ہے ورنہ تم جیسے رنگ سیار بہت دیکھے ہیں میں نے۔ ہم نے بھی ہیرا

منڈی میں وقت گزارا ہے، ایک سے ایک اونچی چیز آتی ہے وہاں پر...... ہم نے تمہارے لئے ایک موقع پیدا کر دیا ہے۔ رقم لینا اور یہاں سے پھوٹ لینا۔ اگر لاہور میں نظر آئے تو ہمارا نام بھی حاجو ہے، پچاس غنڈے پالے ہیں ہم نے۔ آدمی کو اس طرح پھڑکا دیتے ہیں کہ نام و نشان نہیں ملتا۔ یہی کرتے اور کھاتے چلے آئے ہیں۔ اسامی پھانسی ہے اور آسانی سے آدھی رقم دینے کو تیار ہیں۔ کیا سمجھے؟“

”بابا ہم تو غلام ہیں آپ کے۔ جیسے ہی پیسے ملیں گے، لاہور سے نکل لیں گے۔ دوبارہ نظر آ جائیں تو جو دل میں آئے کرنا۔ مگر رقم کب تک مل جائے گی؟“

”بس لے کر آ رہے ہیں تمہاری اسامی کو۔ وہی جاہ و جلال اور وہی انداز اختیار کئے رکھنا، اس کے بعد ہم سے کہنا کہ آپ کو رکنا ہوگا حاجو۔ ہم رک جائیں گے اور اپنا مال لے کر ہی ٹلیں گے۔ تم اپنا مال لے کر یہاں سے رفو چکر ہو جانا۔“

”اور کیا کہیں گے ہم آپ سے...... ذرا بتا دیجئے۔“ مکھن شاہ نے کہا۔

”صرف یہ کہنا کہ حاجو آپ کہاں چلے۔ اس رقم کو ٹھکانے کون لگائے گا...... ہم آپ کو پتہ بتائے دیتے ہیں۔ آپ کو فلاں فلاں جگہ جانا ہے۔ شمشیرہ بیگم کو جانے دیجئے۔ بس یہ بات کرنی ہے تمہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“

پوری طرح تیاریاں کرنے کے بعد شمشیرہ بیگم کے پاس پہنچ گئے۔ شمشیرہ بیگم انتظار کر رہی تھیں۔ کہنے لگیں۔ ”کہاں مر گئے تھے...... چلنا نہیں ہے کیا؟“

”تیاریاں تو کر لو...... چلو ہم بھی کپڑے بدل کر آتے ہیں۔“

بہرحال اس کے بعد شمشیرہ بیگم اور حاجو، مکھن شاہ کی تلاش میں چل پڑے۔ شمشیرہ بیگم نے پچاس ہزار سینے سے لگا رکھے تھے۔ زندگی میں پہلی بار کسی ایسے کام کے لئے اتنی بڑی رقم داؤ پر لگانے جا رہی تھیں۔ لیکن مکھن شاہ کا تصور آتا تو دل میں امید کی کرنیں روشن ہو جاتیں۔ حاجو نے کئی بار چور نگاہوں سے ان کا جائزہ لیا تھا اور دل ہی دل میں اس بات پر بہت خوش ہو رہا تھا کہ اس بار بہت بڑے اژدھے کو چت کیا ہے۔ آخر مکھن شاہ کے تکیے پر پہنچ گئے۔ دور ہی سے دیکھ لیا تھا، دھونی رمائے بیٹھے ہوئے تھے، چہرے پر جاہ و جلال تھا۔ تانگہ رکوا لیا گیا تھا اور حاجو نے سہارا دے کر شمشیرہ بیگم کو نیچے اتارا۔ شمشیرہ بیگم کے پاؤں

کانپ رہے تھے۔ پتہ نہیں مکھن شاہ کے جاہ وجلال سے یا پچاس ہزار کے جانے کے خیال سے۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا، آخر کار مکھن شاہ کے پاس پہنچ گئیں۔ مکھن شاہ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا اور بولے۔

''ہم سے زیادہ تیری تقدیر تجھ پر واری صدقے ہو رہی ہے۔ جو کچھ تُو چاہتی ہے اس کا وقت آنے والا ہے لیکن دعائیں حاصل کر لے ان کی جو تیرے مقصد کی تکمیل کے منتظر ہیں۔ رقم لے آئی؟''

''جی شاہ جی...... آپ کے قدموں میں نثار کر رہی ہوں۔''

''خبردار...... خبردار...... یہ ناپاک کاغذ کے ٹکڑے ہمیں چھونے نہ پائیں۔ اے شخص! تُو دیکھ رہا ہے تو اس کی مدد کیوں نہیں کرتا...... یہ اپنے پاس رکھ لے، تجھے ہماری ہدایت کے مطابق یہ کاغذ کے ٹکڑے اس جگہ تک پہنچانے ہیں جہاں ان کی ضرورت ہے۔ عورت! یہ سمجھ لے کہ تُو نے جس کام کے بارے میں سوچا اس کی تکمیل ہو جائے گی۔ اس وقت جب یہ کاغذ کے نوٹ ان ضرورت مندوں کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اور کچھ چاہئے تو بتا۔''

''حضور عالی مرتبت، بس میرے دن پھیر دیجئے۔ دو بیٹیاں ہیں اور ہیں بھی نکمی، کچھ بھی نہیں جانتیں۔ بس ہنسی ٹھٹھے میں لگی رہتی ہیں۔ کوئی کام نہ دھندہ۔ اتنا خرچ کیا ان پر مگر سب کچھ ڈبو کر رکھ دیا۔ کوثر جہاں نہ ہوتی تو کوئی کوٹھے کا رخ بھی نہ کرتا۔ لیکن حضور وہ کب تک ہمارا ساتھ دے گی۔ ان دونوں کو بھی اپنا مستقبل بنانا ہے۔ ان دونوں کے لئے بھی دعا فرمایئے۔''

''بے شک...... بے شک...... تُو جا۔ اور اے شخص! کیا تجھے بھی واپس جانا ہے؟''

''جی پیر صاحب!'' حاجو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''نہیں...... ہرگز نہیں...... تجھے رُکنا ہے۔ عورت کو جانے دے۔ ہم تجھے اس جگہ روانہ کریں گے جس جگہ یہ کاغذ پہنچانے ہیں۔''

حاجو نے پریشان نگاہوں سے شمشیرہ بیگم کی طرف دیکھا اور بولا۔

''آپ اکیلی چلی جائیں گی؟''

''تو کیا مجھے کتے کاٹ لیں گے؟'' شمشیرہ بیگم نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے\ شاہ جی حکم دے رہے ہیں کہ میں یہاں پر رکوں تو رک جاتا ہوں۔''

''میرے لئے کوئی اور ہدایت پیر صاحب؟''

''ابھی کوئی اور ہدایت نہیں۔ اگر کوئی اور ہدایت ہوئی تو ہم تجھ تک ضرور پہنچائیں گے۔''

''مجھے اجازت......؟''

''جا...... خدا حافظ۔''

شمشیرہ بیگم تانگے کی طرف بڑھ گئیں۔ حاجو انہیں گھورتا رہا اور جب تانگہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو واپس مکھن شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

''کہو استاد! کیسی رہی؟''

''رقم پوری ہے ناں؟''

''بالکل پوری ہے...... مگر یہاں بیٹھ کر گنو گے کیا؟''

''پرواہ نہیں ہے کوئی...... آس پاس کون ہے؟''

''ٹھیک ہے...... لیکن ایک بات سن لو۔ جیسا ہم نے کہا ہے ویسا ہی ہونا چاہئے۔ اگر دوبارہ لاہور میں نظر آئے تو بڑے نقصان سے دوچار ہو جاؤ گے۔ یہاں سے سیدھے اسٹیشن جاؤ اور جو پہلی گاڑی نظر آئے اس میں بیٹھ کر دفع ہو جاؤ۔''

''ایسا ہی ہو گا...... آپ فکر ہی نہ کریں۔''

بہرحال روپوں کی تقسیم ہوئی اور مکھن شاہ وہاں سے کھسک گئے۔ اب بری حالت حاجو کی تھی۔ خود اس کے باپ دادا نے بھی پچیس ہزار روپے اکٹھے نہیں دیکھے تھے اور اس وقت پچیس ہزار روپے اس کی اپنی ملکیت تھے۔ غلام شاہ اپنے آپ کو بڑا تیس مار خاں سمجھتا تھا۔ شمشیرہ بیگم کو بری طرح کاٹتا رہتا تھا اور حاجو کی دال نہیں گلنے دیا کرتا تھا اور اب حاجو نے بھی ہاتھ مارا، اس طرح کہ غلام شاہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال اب اور بہت سے مرحلے درمیان میں آ جاتے تھے۔ کسی بھی طرح شمشیرہ بیگم کو یہ پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ حاجو نے اس رقم میں سے کوئی کمیشن لیا ہے۔ اس کے علاوہ ان روپوں کو نہایت مناسب طریقے سے محفوظ کرنا تھا۔ اب ان کے اپنے مسائل رہ گئے تھے۔ باقی رہا شمشیرہ بیگم کا معاملہ تو وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ ہو سکتا ہے دوبارہ مکھن شاہ کی تلاش میں اس طرف کا رخ کریں۔ اب ٹھیکہ تو نہیں لیا ہوتا ان پیروں بزرگوں کا کسی نے۔ بہرحال چاروں طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ذہن میں خیالات لئے کافی دور تک پیدل چلتا

رہا۔ پھر ایک تانگہ روکا اور اس میں بیٹھ کر کسی نامعلوم سمت چل پڑا۔

○●○

راجہ دلاور کے دل میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا تھا۔ اکرام نے جس طرح اس کے بیٹے کو کتا بنا کر چھوڑ دیا تھا اس نے راجہ دلاور کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی۔ بہرحال بعد میں اس نے راجہ سخاوت کی بھی مرمت کی تھی اور اسے بہت برا بھلا بھی کہا تھا۔

''سارا کھایا پیا ڈبو دیا تُو نے...... بہرحال اس لڑکے کو نیچا دکھانے کے لئے میں اتنا خرچ کروں گا کہ دیکھنے والے دیکھیں گے۔''

''اس کے ساتھ یہ سب کچھ ہونا چاہئے ابا۔''

''ابا کے بچے! اگر ایسی بات تھی تو اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔''

وقت گزرتا رہا۔ راجہ دلاور کے دل میں اونٹ جیسا کینہ بھرا ہوا تھا۔ بہرحال اصل کام اس وقت بنا جب ایک اور تقریب میں اکرام شریک ہوا۔ یہ تقریب بھی سکول کے ایک لڑکے ہی کی تھی اور وہ بھی ایک جاگیردار ہی کا بیٹا تھا۔ یہاں ایک بار پھر اسے راجہ دلاور نے دیکھا اور پھر اچانک ہی اس کے دل میں کوئی خیال آیا تو اس نے کہا۔

''سخاوت! کیا اکرام کے ماں باپ بھی اس تقریب میں آئے ہیں؟''

''نہیں ابا! وہ یہاں نہیں، کہیں اور رہتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' راجہ دلاور چونک کر بولا۔

''وہ اس کوٹھی میں نہیں رہتے۔''

''تو پھر کہاں رہتے ہیں؟...... اور یہ تو تُو نے عجیب بات بتائی۔ اکرام کسی کوٹھی میں رہتا ہے۔''

''جی ابا۔''

''اکیلا رہتا ہے؟''

''نوکر چاکر ہیں۔''

''کیا نام بتایا تھا اس کے باپ کا تم نے؟''

''رب نواز شاہ۔''

''رہنے والا کہاں کا ہے یہ رب نواز؟''

''یہ نہیں معلوم۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ راجہ دلاور، اکرام کی سج دھج سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اکرام اس وقت بھی سب سے منفرد نظر آ رہا تھا۔ لڑکوں میں گھلا ملا، سب سے حسین، سب سے شاندار۔ اس دن کے واقعے نے راجہ دلاور کو اس طرح متاثر کیا تھا کہ اس کے دل میں دشمنی جڑ پکڑ گئی تھی۔ وہ اپنے بیٹے پر بڑا ناز کرتا تھا اور ہر طرح سے وہ اسے ممتاز کرنا چاہتا تھا، ہر فن سکھانا چاہتا تھا۔ استادوں کو بہترین معاوضہ دے کر اس نے اپنے بیٹے کو مختلف علوم سکھائے تھے لیکن اس دن اکرام نے وہ لٹیا ڈبوئی تھی کہ سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے اور وہ صرف حسد کی آگ میں جل رہا تھا۔ اتفاق سے اسی تقریب میں رحمت خان بھی موجود تھا۔ اس کی بھی راجہ دلاور سے شناسائی تھی۔ اس نے راجہ دلاور کو دیکھا اور اس کے پاس آ گیا۔

''اوہو...... راجہ صاحب بھی موجود ہیں۔ کہئے راجہ جی، کیسے حال ہیں آپ کے؟''

''رحمت خان! کہو، کیسے ہو؟'' راجہ دلاور نے روا روی سے کہا۔

رحمت خان کوئی صاحب حیثیت آدمی نہیں تھا، بس بڑے لوگوں کی ہاشا برداری میں اس نے زندگی گزار دی تھی۔

''مہربانی ہے آپ کی...... آپ کی بادشاہی میں جی رہے ہیں۔''

''یار رحمت خان! ایک بات بتاؤ۔''

''جی مائی باپ، پوچھئے۔''

''یہ رب نواز شاہ کا نام کبھی سنا ہے تم نے؟''

کوئی اور نام یاد آ جاتا اسے تو رحمت خان کبھی نہ چونکتا لیکن رب نواز شاہ کا نام تو اسے خوابوں میں بھی ڈراتا تھا۔ فوراً ہی سہم کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا اور بولا۔

''کک...... کک...... کہاں ہیں؟''

''کون؟''

''شاہ جی۔''

''یہاں موجود نہیں ہے۔ مگر تمہاری حالت کیوں خراب ہو گئی؟'' راجہ دلاور نے پوچھا۔

''مم...... میری حالت کب خراب ہوئی ہے؟''

''ہو تو گئی ہے...... اچھا یہ بتاؤ تم رب نواز شاہ کو جانتے ہو؟''

''آپ بتائیے، بات کیا ہے؟'' رحمت خان نے سنبھل کر پوچھا۔

''وہ اُدھر دیکھو۔'' راجہ دلاور نے ایک طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''وہ لڑکوں کے بیچ ایک لڑکا نظر آرہا ہے...... وہ اس طرف، نیلی آنکھوں والا۔''

رحمت خان ایک بار پھر بری طرح چونک پڑا۔ ''یہ یہاں کیسے......؟'' راجہ دلاور گہری نگاہوں سے رحمت خان کا جائزہ لے رہا تھا، پھر اس نے کہا۔ ''ارے بابا! ہم کسے نہیں جانتے۔ مگر آپ کو اس سے کیا دلچسپی پیدا ہوگئی؟'' رحمت خان نے سنبھل کر کہا۔ تجربے کار آدمی تھا، اُڑتی چڑیا کے پَر گن لیا کرتا تھا۔ وجہ تو نہیں جان سکا تھا مگر یہ احساس ضرور ہوگیا تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔

''رحمت خان! کام کی بات کرو۔ ذرا یہ بتاؤ یہ ہے کون؟''

''بات اصل میں یہ ہے جی کہ میں کاروباری آدمی ہوں، جو کام بھی کرتا ہوں پہلے اس کا سودا کرتا ہوں اور پھر اس کے بعد زبان کھولتا ہوں۔ آپ کو کیا دلچسپی ہے اس لڑکے سے؟''

''عجیب آدمی ہو...... اس میں سودے کی کیا بات ہے؟''

رحمت خان ہنسنے لگا، پھر بولا۔ ''استادوں نے یہی سکھایا ہے جناب کہ جو کچھ بھی کرو، لین دین کی بات طے کر کے کرو۔ اس لڑکے سے ایک کہانی وابستہ ہے، سنیں گے آپ تو حیران رہ جائیں گے۔ مگر سودا پہلے۔''

''بھئی بہت ہی گھٹیا آدمی ہو یار۔''

''ٹھیک ہے، دنیا میں اگر گھٹیا انسان نہ ہوں تو پھر بڑھیا کی پہچان کیسے ہو۔ ہم گھٹیا، آپ بڑھیا۔ ہر گھٹیا کا کام بڑھیا سے اور بڑھیا کا کام گھٹیا سے نکلتا ہے۔ گھٹیا آدمی ہی بڑھیا آدمی کے کام آتا ہے۔ ضرور کوئی دلچسپی ہے آپ کو۔ ایک بات سمجھ لیجیے کہ اگر جی نہ خوش ہو جائے اس کی کہانی سن کر تو ہماری محنت کا محنتانہ نہ دیں۔ یہ آپ سے وعدہ ہے۔ اور اگر جی خوش ہو جائے تو معاوضہ ہماری پسند کے مطابق۔''

''آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''اس لڑکے کی کہانی بہت مزے دار ہے۔ اور بھی بہت کچھ بتائیں گے آپ کو۔''

''اچھا...... کیا جانتے ہو اس کے بارے میں، یہ بتاؤ۔''

''اکرام ہے جی اس کا نام۔'' رحمت خان نے مسکرا کر کہا۔

''کل ٹھیک گیارہ بجے آجانا میرے پاس کوٹھی پر۔ بات کروں گا تم سے۔ حالانکہ اس میں سودے کی مجھے کوئی بات نظر نہیں آتی لیکن خیر کل بات ہوگی۔''

رحمت خان مسکراتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ گیا لیکن اس کے الفاظ راجہ دلاور کے ذہن میں چبھتے رہے تھے۔ بہر حال دوسرے دن رحمت خان نے راجہ دلاور سے ملاقات کی۔

''ہاں بتاؤ، کون ہے وہ لڑکا؟''

''معاوضہ کیا ہوگا راجہ صاحب...... یہ بتائیے۔''

''دیکھو، اس کے بارے میں، میں جانتا ہوں کہ اس کا نام اکرام ہے اور یہ اسی سکول میں تعلیم حاصل کر رہا ہے جس میں میرا بیٹا۔ باپ کا نام رب نواز شاہ ہے۔ وہ لاہور میں نہیں رہتا، بیٹے کی تعلیم کے لئے کوٹھی لے کر دی ہے اور اس کوٹھی میں اس کا بیٹا ملازمین کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے آگے کی کچھ بات تم بتاؤ تو پھر معاوضے کی بات ہو۔''

''پانچ ہزار لوں گا پورے۔ اور کام کی بات نہ ہو تو پیسے واپس کر دوں گا اور بعد میں دو ہزار روپے ایک نئی بات کی قیمت لوں گا۔''

''ٹھیک ہے...... لیکن بات پتے کی ہونی چاہئے۔''

''معاوضہ ادا کر دیجئے، کام کی بات بھی ہوئی تو آپ کہہ دیں گے کہ آپ تو پہلے سے جانتے تھے۔''

بہر حال رحمت خان نے پانچ ہزار روپے لے ہی لئے اور پھر کہا۔ ''اکرام کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں آپ؟ سنئے، وہ طوائف زادہ ہے۔ ہیرا منڈی کی ایک طوائف کوثر جہاں کا بیٹا ہے، شمشیرہ بیگم کا نواسہ۔ اور رب نواز شاہ جو اس کے رشتے کے باپ بھی نہیں ہیں۔ کون ہیں، کیا ہیں، یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہیرا منڈی میں ایک گھر لے کر رہتے ہیں۔ چار لڑکے ان کے ساتھ ہیں۔''

''کک...... کک...... کیا؟''

''غلط ہو تو پانچ ہزار کے دس ہزار لے لیجئے گا۔ ہمارا سودا کھرا ہوتا ہے۔''

''وہ طوائف زادہ ہے؟''

"جی۔"

"اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو میں پانچ ہزار روپے اور دوں گا تمہیں۔"

"جیتے رہیں..... پھر نکال لیجئے۔"

"جس سکول میں وہ پڑھتا ہے ناں، وہاں تو بڑے راجوں اور نوابوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ بڑا اسٹینڈرڈ ہے اس سکول کا۔ اور مالکان اچھی نسل والوں کو وہاں تعلیم دیتے ہیں۔ لیکن ایک بات بتاؤ، یہ رب نواز شاہ آخر ہیں کیا چیز؟ کیا وہ اس کی ماں کے عاشق ہیں؟"

"اب یہ ساری باتیں بے کار ہیں۔ ایسی کوئی بات بھی کبھی نہیں سنی ہم نے۔"

"ہوں۔ اس بات کی رقم الگ ہوگی..... اچھا ایک بات بتاؤ، اگر تمہاری بات جھوٹی نکلی تو؟"

"تو رائفل تو ہوگی ہی آپ کے پاس۔"

"ہوں۔" راجہ دلاور نے کہا اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے آثار نظر آنے لگے۔

"تو پھر وہ دو ہزار روپے والی بات۔"

"شرم کرو رحمت خان! میں تم سے وعدہ کر رہا ہوں کہ اگر تمہاری بات سچ نکلی اور میرا کام بن گیا تو میں تمہیں پانچ ہزار روپے اور دوں گا۔"

"ایک بات اور کہیں..... اگر آپ کو ہمارے ذریعے کوئی کام کرنا ہو تو ہمیں ضرور اطلاع دیجئے۔ آپ کو پتہ نہیں ہے کہ ہم کیا چیز ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے....."

"ایک بڑی بات مفت میں بتائے جا رہے ہیں، وہ یہ کہ سچ ہے کہ اکرام کوثر جہاں نامی طوائف کا بیٹا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ جس طوائف زادے کو رب نواز شاہ نے نواب زادہ بنا رکھا ہے۔ مگر یہ بھی بہت بڑا سچ ہے کہ شاہ جی بہت بڑے بڑے بدمعاش ہیں، جب سے ہیرا منڈی میں آئے ہیں وہاں کا قانون بدل دیا ہے۔ بڑے بڑے تیس مار خان ان کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ اگر ان کے خلاف کوئی کام کرنے کا ارادہ ہو تو سوچ سمجھ کر کریں۔ خدا حافظ۔"

رحمت خان کے جانے کے بعد راجہ دلاور بہت دیر تک شدید سنسنی کا شکار رہا اور اس کے بعد اس نے ایک نوکر کو آواز دے کر کہا۔

"ہمت خان کے گھر چلا جا۔ وہ مل جائے تو اس سے کہنا کہ میں نے بلایا ہے اور نہ ملے تو اس کی گھر والی سے کہہ کر آنا۔"

بہر حال ہمت خان راجہ دلاور علی کے پاس پہنچ گیا۔ صورت سے ہی بدمعاش لگتا تھا۔ مکاری چہرے پر چپکی ہوئی تھی، گنگناتا ہوا اندر داخل ہوا۔ "میں وہ بلا ہوں شیشے کو پتھر سے توڑ دوں۔"

"میرے سامنے ذرا ہوش میں رہا کرو ہمت خان۔"

"اوہ، کیا کریں راجہ جی! ماں باپ نے نام ہمت خان رکھ دیا تھا۔ بس ہمت ہی ہمت ہے، ہر ایک کے سامنے جو دل چاہتا ہے کہہ دیا کرتے ہیں۔ پر سناؤ کیسے بلوالیا ہمیں؟"

"ہیرا منڈی کی ایک طوائف کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں ہم۔"

"کون ہے..... نام بتا دو..... ہیرا منڈی میں ہم کسے نہیں جانتے؟"

"شمشیرہ بیگم ہے کوئی؟"

"بہت پرانی ہے۔"

"اس کی بیٹی کوثر جہاں کو جانتے ہو؟"

"کون نہیں جانتا اسے؟ ہیرا منڈی کی مانگ کا سندور ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ پوری ہیرا منڈی کی رونق ہے۔"

"ایک بیٹا بھی ہے اس کا۔"

"ہاں اکرام..... ماں سے زیادہ کمائی کر رہا ہے وہ۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک شاہ جی رہتے ہیں، رب نواز شاہ محلے میں۔ انہوں نے پال رکھا ہے اسے۔ لاکھوں لٹا رہے ہیں اس پر۔ پوری ہیرا منڈی میں دھوم مچی ہوئی ہے۔"

"ہوں..... یہ شاہ جی ہیں کون؟"

"جو کوئی بھی ہیں، مگر آفت ہیں آفت۔ ہیرا منڈی کے پرانے ٹھیکیدار کی کھال اتار دی تھی انہوں نے۔ ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہیں آیا۔ پھر دلدار گھوڑا نامی ایک بدمعاش کو انہوں نے کانوں سے اڑا دیا۔ اس کے بعد چندو جیسے نامی گرامی بدمعاش کو، جس کا لاہور میں ڈنکا بجتا تھا، انہوں نے لاہور ہی سے آؤٹ کر دیا۔"

"بہت بڑا گروہ ہے کیا اس کا؟"

"گروہ تو کوئی چار آدمیوں کا ہے جی...... مگر یہ چار، چالیس پر بھاری ہیں۔ ایک آدھ لڑائی تو میں نے بھی دیکھی ہے۔ ہیرا منڈی میں بدمعاشوں کی تاریخی جنگ تھی وہ۔"

"ہوں...... تو یہ بات ہے۔" راجہ دلاور کی سمجھ میں اب اکرام کی مہارت آ گئی تھی۔

"پر بات کیا ہے؟"

"بس یہ معلومات ہی چاہتے تھے تم سے۔ ٹھیک ہے...... لو یہ تھوڑے سے پیسے رکھ لو۔"

"شکریہ جناب!"

ہمت خان کے جانے کے بعد راجہ دلاور دیر تک سوچتے رہے، پھر آہستہ سے بولے۔

"اس کا مطلب ہے کہ ذرا سوچ سمجھ کر کام کرنا پڑے گا۔ مگر ناک کی بات ہے، ناک تو اونچی رکھنی ہی پڑے گی چاہے کچھ بھی کرنا پڑے۔"

○●○

حاجو کی صورت ہی بدل گئی تھی اور غلام شاہ کسی قدر سمجھ گیا تھا، کچھ ہوا ضرور ہے۔ حاجو بلا وجہ ہی عیش نہیں کر رہا۔ پڑوس کے ایک دوست نے کہا۔

"غلام شاہ جی! یہ حاجو آج کل بہت اونچا اُڑ رہا ہے...... پتہ ہے پرسوں کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

"یہاں کھڑے شرطیں لگا رہا تھا۔ دو سو روپے ہار گیا مگر پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔"

"چھوڑو، کہاں کی باتیں کر رہے ہو؟"

"یقین کرو، جھوٹ نہیں بول رہے۔"

غلام شاہ نے اس وقت تو کوئی توجہ نہیں دی تھی مگر جب دوسرے دن شام کو حاجو نے سارنگی سنبھالی اور نئے کپڑے پہن کر سامنے آیا تو غلام شاہ حیران رہ گیا۔ بوسکی کا کُرتا اور ہزارے کے لٹھے کا پاجامہ، اوپر سے بڑا ہی قیمتی عطر لگایا تھا۔ پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ یہ کُرتا اور پاجامہ نیا تھا۔ غلام شاہ کو اس وقت اس دوست کی بات یاد آئی۔ اس کا مطلب ہے کہ حاجو واقعی عیش کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ ٹوہ میں لگ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ پھر وہ تین دن تک حاجو کا پیچھا کرتا رہا۔ حاجو واقعی عیش کر رہا تھا۔ کھاتا پیتا رہتا تھا دن بھر۔ آخر یہ رقم کہاں

سے آ رہی ہے؟ شمشیرہ بیگم تو اتنا دینے سے رہی۔ بہر حال غلام شاہ کو سازشیں کرنا خوب آتی تھیں۔ حاجو کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوئی اور آخر کار چوتھے دن غلام شاہ نے حاجو کا خزانہ تلاش کر لیا۔ کوٹھڑی میں جہاں ان دونوں کا سامان رکھا رہتا تھا، زمین کے نیچے ایک صندوقچی رکھی ہوئی تھی، لکڑی کی بنی ہوئی پرانی صندوقچی جس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس دن حاجو کوٹھڑی میں گیا اور اس کے بعد چپ چاپ باہر نکل آیا جبکہ غلام شاہ روشن دان سے اس کی یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ جب وہ دور چلا گیا تو آہستہ آہستہ غلام شاہ واپس پلٹا اور کوٹھڑی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا اور لکڑی کی اس صندوقچی کو تلاش کیا۔ کھولا اور یہ دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ اس میں تو ہزاروں کے نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ یہ حاجو اتنی دولت کا مالک؟ غلام شاہ کا تو سانس رکتے رکتے رہ گیا۔

بہر حال یہ رقم حاجو کے پاس کیسے رہ سکتی تھی۔ کہیں سے بھی آئی ہو، اس کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ سارے نوٹ سنبھال لئے اور چوروں کی طرح باہر نکل آیا۔ خود اس کا اپنا مسئلہ بھی اتنا ہی ٹیڑھا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ حاجو کے پاس اتنا خزانہ آیا کہاں سے۔ دوسری بات یہ کہ اب جب یہ سب کچھ اس کی تحویل میں آ چکا ہے تو چھپا کر کہاں رکھا جائے۔ غلام شاہ کے مسائل بھی ایسے ہی تھے۔ سب سے پہلے صورتحال کے بارے میں مکمل تفتیش کرنے کے لئے باتھ روم کی جانب چل پڑا، دروازہ بند کیا اور سارے نوٹ گن ڈالے۔ خدا کی پناہ، چوبیس ہزار سات سو روپے۔ گویا پچیس ہزار میں صرف تین سو کم ہوئے تھے۔ اتنے عرصے میں حاجو نے جو عیاشی کی تھی وہ اتنی ہی تھی۔

بہر حال اس انداز میں خرچ نہ کرتا تو شاید کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ رقم آئی کہاں سے۔ بہر حال اب خود اس کے لئے اس رقم کو چھپانے کا مسئلہ ہو گیا تھا۔ حاجو کو بھی اچھی طرح جانتا تھا، زمانے بھر کا چالاک آدمی تھا، کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پھر ایک ہی ترکیب ذہن میں آئی، طبلے کو بیچ میں سے پھاڑ دیا اور شمشیرہ بیگم کو دکھاتے ہوئے بولا کہ دیکھو طبلہ پھٹ گیا ہے۔

"تو پھر بنوا لو جلدی سے۔ رات کو تو کسی کے گھر سے مانگ تانگ کر کام چلا لینا۔ یہ تو اہم ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے...... میں ذرا لے کر جا رہا ہوں۔ کوئی دس بیس روپے ہوں تو دے دو۔"

شمشیرہ بیگم نے بیس روپے دے دیئے تھے۔ بہرحال غلام شاہ نے کام کرا لیا۔ رقم طبلے میں منتقل ہو گئی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حاجو کی محنت کی کمائی اب اس طبلے میں پوشیدہ ہو گئی۔ شام کو جب محفل بجی اور غلام شاہ طبلہ ٹھونکتا تو بار بار توجہ نوٹوں کی طرف منتقل ہو جاتی اور طبلے پر کوئی نہ کوئی ہاتھ غلط پڑ جاتا۔ شمشیرہ بیگم نے کئی بار کڑی نگاہوں سے غلام شاہ کو دیکھا اور غلام شاہ سنبھل گیا۔

بہرحال بات یہیں تک نہیں رہی تھی۔ حاجو جب معمول کے مطابق دو بجے کوٹھڑی میں پہنچا اور صندوقچی کو ہاتھ لگایا تو دھک سے رہ گیا...... صندوقچی خالی تھی۔ بالکل خالی۔ حاجو پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ ابھی تو اس رقم میں سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ سوچنے لگا کہ آخر کون ڈاکو ہو سکتا ہے۔ غلام شاہ کے علاوہ کسی کی مجال نہیں تھی۔ بہرحال حاجو کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ قسم اللہ کی چھوڑوں گا نہیں...... میرا نام بھی حاجو ہے۔ اور اگر غلام شاہ نے یہ کام کیا ہے تو ایسی منہ کی کھانی پڑے گی اسے کہ دیکھنے والے دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔

بہرحال حاجو نے اپنے طور پر ہر طرح کی تلاشی لے ڈالی۔ غلام شاہ کی آسودہ مسکراہٹ سے باقی شبہ بھی پورا ہو گیا تھا۔ آخر کار دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے۔ نگاہ طبلوں کی جوڑی پر جا پڑی۔ بس یہ آخری ہی چیز تھی۔ چنانچہ جوڑی کی طرف بڑھ گیا۔ طبلہ اٹھایا، ہلا جلا کر دیکھا، اندر کوئی چیز بجنے کی آواز سنائی دی تو طبلہ پھاڑ دیا اور دل دھک سے رہ گیا۔ طبلے میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔

"غلام شاہ! تیرا ستیاناس ہو کتے...... اب یہ رقم چھپانی کہاں چاہئے؟ سوچتے سوچتے اچانک ہی حاجو کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ واہ...... اسے کہتے ہیں چور کی چوکیداری۔ خاموشی سے رقم کپڑے میں لپیٹی، تھوڑے سے روپے نکال کر اپنے پاس رکھ لئے اور پھٹا ہوا طبلہ اس کی جگہ رکھ دیا۔ چھت کی ایک کڑی کے پیچھے ایک بڑا خلاء تھا، اس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ غلام شاہ پورے گھر میں تلاشی لے ڈالے گا، اپنے کمرے کی طرف اس کا خیال ہی نہیں جائے گا۔ بھلا کوئی سر پھرا ہی چیل کے گھونسلے میں ماس چھپائے گا۔

بہرحال خوب چوٹ دی تھی اس نے غلام شاہ کو...... پھٹا ہوا طبلہ دیکھ کر ہی پسینے چھوٹ جائیں گے۔ پچھلی رات اسی لئے غلط طبلہ بجا رہا تھا۔ بہرحال سیٹی بجاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ شمشیرہ بیگم نظر آ گئیں۔

"اے حاجو! کہاں سو رہے ہو؟ اتنی دیر سے تلاش کر رہی ہوں۔"

"وہ بس ایسے ہی۔"

"دیکھو ذرا، شبانہ بیمار ہو گئی ہے۔ حکیم صاحب کو جا کر حال بتاؤ اور دوا لے آؤ۔"

"یہ گئے اور وہ آئے۔"

"یہ پوچھا نہیں کہ کیا بیماری ہے۔"

"سب سے بڑی بیماری جوانی ہے شمشیرہ بیگم! کہہ دیں گے حکیم صاحب سے کہ جوانی کا بخار ہو گیا ہے۔"

"کتے کی موت مرو...... جھاڑو پھرے تمہارے منہ پر...... بڑی مستی آ رہی ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔" شمشیرہ بیگم نے معمول کے مطابق برا بھلا کہتے ہوئے کہا اور حاجو مسکراتا ہوا ان کے پیچھے چل پڑا۔

ادھر تو یہ صورتحال جاری تھی اور اُدھر غلام شاہ کی خوشیوں پر پانی پھر گیا تھا۔ اسی دن شام میں طبلہ دیکھا تھا اور پھٹا ہوا طبلہ دیکھتے ہی دم نکل گیا تھا۔ طبلہ تو خیر دوبارہ ٹھیک کرا لیا گیا لیکن غلام شاہ کے سینے پر جو غم کا بوجھ پڑا تھا تو ہٹائے نہیں ہٹ رہا تھا۔ رقم دوبارہ حاجو کے پاس پہنچ چکی تھی۔

بہرحال ٹوہ میں لگا رہا، کیا کرے کیا نہ کرے۔ اس وقت بھی شمشیرہ بیگم حاجو سے گفتگو کر رہی تھیں۔ غلام شاہ نے دیکھا اور چھپ کر ان کی گفتگو سننے لگا۔ شمشیرہ بیگم کہہ رہی تھیں۔

"اے حاجو! پیر صاحب سے ملاقات ہوئی؟"

"نہیں شمشیرہ بیگم! آپ کے سامنے ہی انہوں نے منع کر دیا تھا کہ انہیں تنگ نہ کیا جائے۔"

"کام ابھی تک کچھ بنا نہیں۔" شمشیرہ بیگم پُر خیال لہجے میں بولیں۔

"وقت تو لگتا ہی ہے۔ لیکن ایک بات ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں، کام ہو گا ضرور۔"

"میرا تو دل ڈر رہا ہے۔"

"کیوں شمشیرہ بیگم؟"

"اے پچاس ہزار کی رقم دی ہے میں نے...... پورے پچاس ہزار کی۔ کہیں رقم ڈوب نہ جائے۔"

"دیکھو! سب سے بڑی چیز عقیدہ ہوتا ہے۔ عقیدے کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ ان پر شک کرنا اچھی بات نہیں ہے۔"

"دیکھو کب تک انتظار کرنا پڑتا ہے، لیکن ایک بات کہوں حاجو! اگر کام نہ بنا تو؟"

"تو گردن اتار کر پھینک دیں گے مکھن شاہ کی۔ ہماری رقم ہضم کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے۔"

غلام شاہ نے ساری باتیں سنیں اور پورے بدن میں شعلے بھڑک اٹھے۔ اب پتہ چلا تھا کہ پچیس ہزار کی یہ رقم کہاں سے آئی اور یہ حاجو میاں عیش کہاں سے کر رہے تھے۔ مٹھائیوں کے ڈبے کے ڈبے آ رہے ہیں، ربڑی آ رہی ہے، لباس بھی اچھے سے اچھا...... یہ ساری باتیں غلام شاہ کے سینے پر تیر چلاتی تھیں۔ اب اندازہ ہوا تھا کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ چنانچہ انتظار میں لگا رہا۔ غور کیا تو اندازہ ہوا کہ اگر حاجو کی رقم نکلوا بھی دی جائے تو اسے کیا فائدہ ہوگا؟ ہاں اگر حاجو خود ہی سودا کر لے تو بہتر ہے۔ کم از کم شمشیرہ بیگم کو اس کا اندازہ نہ ہونے پائے۔

بہرحال ایک دن اس وقت جب حاجو ہیرا منڈی میں کہیں باہر سے داخل ہو رہا تھا، غلام شاہ نے اسے راستے میں روک لیا۔ حاجو تو غلام شاہ کو دیکھ کر ہی اچک گیا تھا، ہاتھ میں مٹھائی دبی ہوئی تھی۔

"کیا لے آئے حاجو؟" غلام شاہ نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"وہ بس داتا صاحب کی نیاز کے لئے مٹھائی لایا ہوں۔"

"داتا صاحب کی نیاز کے لئے یا مکھن شاہ کی نیاز کے لئے؟" غلام شاہ نے بھرپور وار کیا اور حاجو کے ہاتھ سے مٹھائی گرتے گرتے بچی۔

"کک...... کون مکھن شاہ؟"

"آؤ، کہیں بیٹھ کر بات کریں۔ ہم سے اڑ رہے ہو حاجو! کامیاب نہیں ہو سکو گے کبھی۔"

"بب...... بکواس کر رہے ہو۔"

"آ جاؤ...... آ جاؤ...... اکیلے میں بیٹھ کر حساب کتاب کر لیں۔ ورنہ بس سمجھ لو کہ کام ختم ہونے جا رہا ہے۔ ہمارے بغیر گاڑی چل نہیں سکتی۔"

"ارے تم کیا چلاؤ گے گاڑی۔ ہر وقت دھمکیاں دیتے رہتے ہو۔"

"ٹھیک ہے...... پھر سمجھ لو کہ مکھن شاہ کا سارا راز فاش ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے غلام شاہ! جو تمہارا جی چاہے کرو۔ میں بھی دیکھوں گا۔"

غلام شاہ حیرت سے منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ دل ہی دل میں اس نے کہا کہ بیٹے یہ بات تو طے ہے کہ تمہیں آسانی سے یہ سب کچھ ہضم نہیں کرنے دوں گا۔ بہرحال اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دال نہیں گلے گی۔ غلام شاہ حاجو کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ چلا گیا تھا۔ چنانچہ موقع ملتے ہی وہ شمشیرہ بیگم کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے غلام شاہ...... بڑے تنتے ہوئے ہو۔"

"بس چھوڑو شمشیرہ بیگم!...... دنیا میں کوئی کسی کے لئے کچھ بھی کرے، ملتا کچھ بھی نہیں ہے۔"

"معدے میں گڑبڑ ہو گئی ہے کچھ؟"

"نہیں، معدے میں گڑبڑ نہیں ہوئی۔ بات یہ ہے کہ کسی انسان کو اگر وفادار مل جائے تو وہ اس کی قدر نہیں کرتا، دنیا لفظوں کی بنی ہوئی ہے۔"

"اب کتے کی طرح بھونکے جاؤ گے یا بات سمجھاؤ گے؟"

"بس شمشیرہ بیگم! کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"ارے میں کہتی ہوں کچھ منہ سے پھوٹو گے یا یونہی دیوداس بنے رہو گے؟"

"یہ حاجو کے رنگ ڈھنگ نہیں دیکھ رہیں آپ آج کل؟"

"کیسے رنگ ڈھنگ؟"

"کچھ غور نہیں کیا...... عیش کر رہا ہے۔ لباس دیکھو بدن پر، لگ رہا ہے کہیں کا جاگیردار آ رہا ہے...... اور پھر ہر وقت یہ کھانے پینے کے عیش۔"

"تو تم پر کیوں مصیبت نازل ہو رہی ہے...... اچھی خاصی لوٹ مار کر لیتے ہو تم لوگ۔"

لوگ یہ سوچ کر دیتے ہیں کہ بھوکا مرتا ہو گا بے چارہ۔"

"جی نہیں...... یہ بات نہیں ہے۔ آپ اندھی بن جائیں تو بن جائیں ہم اندھے نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں ایسا کون سا چکر چلایا ہے اس نے جس کی وجہ سے اس کے پاس ہزاروں کی رقم آ گئی ہے۔"

"ہزاروں کی رقم؟"

"جی......قریب قریب پچیس ہزار۔"

"خدا تمہیں......بس اور کیا کہوں، پچیس ہزار اور حاجو کے پاس؟"

"ہاں...... یہ مکھن شاہ کا کیا چکر ہے؟"

شمشیرہ بیگم پھٹی پھٹی نگاہوں سے غلام شاہ کو دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔ "تمہیں کیسے معلوم؟"

"اب اتنا بھی بیوقوف مت سمجھو شمشیرہ بیگم!"

"وہ تو ٹھیک ہے......مگر مجھے کچھ بتاؤ تو سہی، تمہیں کیا پتہ کہ میرے دل کی کیا حالت ہو رہی ہے۔"

"آپ بتائیے، آپ نے کوئی رقم دی حاجو کو؟"

"دی تو ہے......مگر حاجو کو نہیں، مکھن شاہ کو۔"

"اور یہ مکھن شاہ کون ہے؟"

"ارے وہ لوہاری کے پیچھے ایک چھوٹا سا میدان آتا ہے، وہاں ایک درخت کے نیچے سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ اندازہ تو میں نے خود لگا لیا ہے۔"

"تو ہم نے بھی اندازہ لگایا ہے شمشیرہ بیگم! واقعی سیانا کوا ہمیشہ......"

"تم بک کیا رہے ہو...... ذرا کھل کر تو کہو۔"

"بس یوں سمجھ لو کہ حاجو نے اور اس نے مل کر تمہیں بیوقوف بنایا ہے۔ کس سلسلے میں دی ہے تم نے یہ رقم اسے؟"

"اے غلام شاہ! بس کیا بتاؤں، منع کر دیا ہے مجھے۔"

"صرف غلام شاہ کو بتانے کے لئے؟"

"نہیں کسی کو بھی بتانے کے لئے۔"

"ٹھیک ہے شمشیرہ بیگم! جو مرضی میں آئے کرو۔ تمہاری رقم ہے، تم خوب لٹاؤ۔ حاجو نے واقعی تمہیں بڑی کامیابی سے بیوقوف بنایا ہے۔"

"خون پی جاؤں گی حاجو کا...... کبوتر کی طرح گردن مروڑ کر پھینک دوں گی اگر میرا کام نہ ہوا۔"

"ارے چھوڑو، تمہارا کام...... ذرا ان مکھن شاہ صاحب کا بھی صحیح پتہ بتا دو مجھے۔"

"ہاں ہاں...... میں پتہ بتا دیتی ہوں، تم ذرا معلوم کرو۔"

"ٹھیک ہے...... ویسے میں تمہیں بتائے دیتا ہوں، پہلے ہی سے بتائے دیتا ہوں کہ سب چکر چلایا ہوا ہے۔"

"ایسی جگہ ماروں گی اس حاجو کو کہ پانی بھی نہ ملے۔ بدنسلا، خدا کروٹ کروٹ کیڑے نصیب کرے۔ میری رقم کھائی تو بدن سے پھوٹ پھوٹ کر نکلے گی۔ کوڑھی ہو جائے گا۔ آنکھوں کی بینائی چلی جائے گی۔ پیٹ میں ہاتھ ڈال کر نکال لوں گی، قے کرا دوں گی۔ کیا سمجھا ہے اس نے مجھے غلام شاہ! ارے تم لوگ میرے کسی کام بھی آ سکتے ہو؟ مشکل پر مشکل کھڑی کر دیتے ہو میرے لئے۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ دل کے زخموں پر مرہم رکھا ہوتا۔"

"خیر نیکی اور گناہ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ خود پھنستی ہو لچے لفنگوں کے ہاتھوں۔ پیروں فقیروں کے چکر میں پڑ کر تو اچھے خاصے فنا ہو جاتے ہیں۔"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"چھوڑو، اب کیا مطلب۔"

"اے حاجو! دیکھتی ہوں تجھے۔"

"ابھی نہیں، ابھی نہیں...... ذرا تحقیقات کر لوں۔"

"نہیں چھوڑوں گی...... تم نے کانوں میں بات ڈال دی ہے، اب ذرا میں بھی تو دیکھوں حاجو کتنے پانی میں ہے۔" شمشیرہ بیگم کا رنگ بار بار بدل رہا تھا۔ کبھی زرد، کبھی سفید اور کبھی سرخ۔

○●○

بات کچھ بھی نہیں تھی لیکن راجہ دلاور بڑا کینہ پرور انسان تھا۔ ابھی تک رب نواز شاہ

سے کوئی مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی لیکن صرف اکرام کی وجہ سے وہ رب نواز شاہ کا بھی دشمن بن گیا تھا۔ بدقسمتی تھی اس کی کہ اس نے ہیرا منڈی میں داخل ہو کر رب نواز شاہ کے بارے میں ابھی معلومات حاصل نہیں کی تھیں۔ پانچ ایسے بڑے بڑے رئیسوں کو تیار کر چکا تھا جن کے بچے اس سکول میں پڑھتے تھے، جہاں اکرام اور خود راجہ دلاور کا بیٹا راجہ سخاوت پڑھتا تھا۔ ان میں کئی بڑے جاگیردار تھے جنہوں نے اس سکول کو زبردست مالی امداد دی تھی۔ اور جب راجہ دلاور کی زبانی انہیں یہ معلوم ہوا کہ اسی سکول میں ایک طوائف زادہ بھی پڑھتا ہے تو وہ سب بری طرح بگڑ گئے۔

"حالانکہ اس بات کا خیال سکول کی انتظامیہ کو رکھنا چاہئے تھا کہ اتنے بڑے سکول میں اس طرح کے لوگ نہ آنے پائیں۔ یہ تو ایک جرم ہے۔ ہم نے تو بڑی بڑی رقمیں ادا کی ہیں، کیا اس لئے کہ ہمارے بچے طوائف زادوں کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں؟"

پھر ان سب نے طے کیا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی بہت ہی سنجیدہ قدم اٹھائیں گے۔ ادھر راجہ دلاور اپنی حماقت سے یہ ساری کارروائی کر رہا تھا اور ادھر شاہ جی ان دنوں ذرا خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نور شاہ سے کہنے لگے۔

"بھئی نور شاہ! تم لوگوں سے کچھ چھپا ہوا تو ہے نہیں۔ یہ کوثر جہاں بیگم جو کہہ گئی ہیں، انہیں ذرا دیکھنا ہے۔ اکرام کے باپ کی بات ہے۔ اگر اس کا باپ مل جائے تو ہمارا بھی بوجھ ہلکا ہو جائے۔ ہمارے باپ نے اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہمارا بوجھ بالکل ہی ہلکا رکھا لیکن ہم نے اکرام کو کسی ایسے حادثے کے لئے تیار کیا جو اسے ذہنی طور پر دیوالیہ کر دے۔ اب ایک کام کرنا پڑے گا، وہ یہ کہ ذرا شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کا چکر ہی لگایا جائے۔ اس سے ایک فائدہ حاصل ہوگا ہمیں، وہ یہ کہ ممکن ہے وہیں سے اکرام کے باپ کا کچھ پتہ مل جائے۔ بڑی گنوں سے بھری ہوئی ہیں یہ شمشیرہ بیگم...... ایسی بدمعاش عورت ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔ آفت کی پرکالہ ہے۔ کیا کیا چالیں نہیں چلیں اس کتیا کی اولاد نے۔ مگر خیر، ہمارا کیا بگڑا۔"

"جی...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہ جی۔"

"یار بڑی عجیب وغریب بات ہے، اسے کہتے ہیں بغل میں بچہ، شہر میں ڈھنڈورا۔ چلو ٹھیک ہے، آج سے شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر جانا شروع کر دیتے ہیں۔ تھوڑی سی رقم ہی

خرچ کرنا پڑے گی۔ مگر کام لگتا ہے ہمارا وہیں سے بنے گا۔" چاروں دوست مسکرانے لگے تھے اور سوچ رہے تھے کہ شمشیرہ بیگم غلط آدمی سے ٹکرائی ہیں۔

بہر حال شام ہو چکی تھی اور بڑے ہال میں سجاوٹیں کی جا رہی تھیں۔ حاجو سارنگی کی تار درست کر رہا تھا۔ غلام شاہ اندر نہیں آیا تھا مگر شمشیرہ بیگم آتش فشاں بنی ہوئی تھیں۔ ہال کمرے میں داخل ہوئیں اور حاجو شامت کا مارا ہاتھ لگ گیا۔ شمشیرہ بیگم کو دیکھ کر مسکرایا تو شمشیرہ بیگم کا آتش فشاں کھول اٹھا۔ خونی نگاہوں سے حاجو کو دیکھا اور پھر اس پر نظر ڈالی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چہرے پر نکھار آ گیا تھا۔ نوٹوں کی طاقت ایسی ہی ہوتی ہے، چہرے کا رنگ بدل دیتی ہے۔ آنکھوں میں سُرمے کی لکیریں، منہ میں قوام کا پان، انگلی میں ایک سونے کی انگوٹھی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ نئے کامدار جوتے ایک طرف رکھے ہوئے تھے اور یہ ساری چیزیں چیخ چیخ کر بتا رہی تھیں کہ غلام شاہ کی بات میں وزن ہے اور حاجو نے خود کسی بہروپئے کو پیر مکھن شاہ بنا کر ان کے سامنے پیش کیا ہے۔ پچاس ہزار کا گھونسا شمشیرہ بیگم کے سینے پر پڑا تھا۔ ہائے کیسی پاگل ہوئی تھی میں...... کس طرح اس کمینے کے فریب میں آ گئی۔ آگے بڑھیں اور حاجو کے سامنے پہنچ گئیں۔

"کتے کے بچے! کوڑھی ہو جائے...... خدا کرے اندھا ہو کر جائے اس دنیا سے...... فنا کر دے اللہ تجھے۔ سارے جہاں کو موت آئی، تجھے نہ آئی۔"

حاجو نے سارنگی کی تار پر چوٹ لگاتے ہوئے کہا۔

"ارشاد...... ارشاد...... مکرر ارشاد۔"

"ارشاد کے بچے...... یہ سارنگی اٹھا کر اس طرح تیرے سر پر پھوڑوں گی کہ بھیجہ ناک کے راستے بہہ جائے گا۔"

"کیا حسین منظر ہوگا...... لوگ ہمیں کشتہ شمشیر کہیں گے...... واہ، کیا لقب ملے گا، کشتہ شمشیر، شمشیرہ تو بعد میں۔"

"میں کہتی ہوں موت آئی ہے تیری۔"

"لو، کوئی آج کی بات ہے...... موت ہی تو آئی تھی جو اپنے قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا تمہارے کوٹھے پر آ گیا...... وہ جو مصرعہ ہے ناں "ہمیں تو موت ہی آئی تھی شباب کے بدلے"

"بے غیرت ہے...... کوئی تو تیرے جیسا بے حیا ہو...... میں کہتی ہوں کیا کھا کر جنا تھا ماں نے...... کوئی شرم وحیا چھو کر بھی نہیں گزری۔"

"ہاں ہاں...... کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ انسان شرم وحیا کا دامن تار تار کر دیتا ہے اور یونہی گالیاں سنتا ہے۔ لیکن آج یہ گالیت نامہ ہماری خدمت میں کیوں پیش کیا جا رہا ہے...... اس وقت یہ عزت افزائی کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟"

"توبہ توبہ...... کمینہ پن تو تجھ پر ختم ہے۔ آنکھوں میں دھول جھونک دی میری...... پچاس ہزار...... ارے میں کہتی ہوں کٹ کٹ کر نکلیں گے...... کلیجے کے ٹکڑے منہ سے نکلیں گے۔ دیکھنے والے دیکھیں گے اور عبرت حاصل کریں گے۔"

"ہائیں...... ہائیں...... یہ پچاس ہزار کہاں سے آن ٹپکے شمشیرہ بیگم؟"

"بن رہے ہو بڈھے کھوسٹ...... چالاکی تو چہرے پر کتاب کی طرح نظر آتی ہے۔ میں کہتی ہوں واپس کر دے میرے پچاس ہزار روپے ورنہ جیل میں چکی پسواؤں گی...... پوری زندگی کے لئے جیل بھجوا دوں گی۔ اب ایسی بے سہارا بھی نہیں ہوں۔"

"اب تو یہی کہنا پڑے گا شمشیرہ بیگم کہ خدا تمہیں غارت کر دے۔ نہ بابا نہ...... گالیاں بھی کھائیں، ذلیل، بے غیرت، بے شرم، بے حیا بھی کہلائیں اور اس کے بعد تم سے محبت کرتے رہیں، تمہارے لئے مٹتے رہیں۔"

"مٹ گئے ہوتے کسی دن...... نام ونشان تو نہ ہوتا...... قبر بنوا دیتی تمہاری۔ قوال بٹھا دیتی حاجو! ایسے دھوکا دے گا تو، تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔" شمشیرہ بیگم بیٹھ گئیں۔

"شمشیرہ بیگم کبھی کوسا نہیں تھا تمہیں، آج منہ کھل ہی گیا، اتنا دل دُکھایا ہے تم نے، ارے میں کہتا ہوں کیا مار پڑی ہے تم پر...... کون سے پچاس ہزار میری جیب میں ڈال دیئے ہیں تم نے اپنے ہاتھ سے...... اپنی پھوٹی آنکھوں سے دیکھا، میرے پاس وہ پچاس ہزار روپے کہاں سے آئے تھے؟ میں کہتا ہوں شمشیرہ بیگم کب انسان بنو گی؟ گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ...... کوئی سر پاؤں بھی ہے تمہارا؟"

"سر پاؤں چھوڑو...... ہائے......"

"کرتی رہو ہائے ہائے۔ تمہاری تقدیر میں یہی لکھا ہے۔"

"ارے لوٹ لیا سب نے مل کر...... میں کیا جانوں کون پیر ہے، کون نہیں۔"

"پیر مکھن شاہ کو ان الفاظ میں یاد کر رہی ہو...... انہیں جو تمہارے لئے چلّہ کھینچ رہے ہیں کہیں پہاڑوں میں بیٹھے بھوکے پیاسے......؟"

"چلّہ کھینچ رہے ہیں وہ اور مزے کر رہے ہو تم...... یہی بات ہے نا...... میں کہتی ہوں یہ سارے عیش وعشرت کہاں سے ہو رہے ہیں؟ کہاں سے آ رہا ہے یہ سب کچھ۔ نئے جوتے، نئی واسکٹ۔ ذرا دکھاؤ تو سہی، جیب میں کیا ہے؟"

حاجو غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "لعنت ہے تم پر شمشیرہ بیگم! زندگی میں کبھی وفاؤں کا صلہ نہیں دیا۔ غیروں نے کان بھرے اور تم آ گئیں دوستی جھاڑنے۔ ٹھیک ہے، جا رہا ہوں تمہارے کوٹھے سے۔ آئندہ واپس نہیں آؤں گا۔ سارنگی پر گز ہی گھسنا ہے تو کہیں بھی بیٹھ جاؤں گا، دو روٹیاں مل جائیں گی۔ یہ عزت دی ہے تم نے زندگی بھر کی محبت کی۔"

"ایسے نہیں جانے دوں گی تجھے...... حلق میں انگلیاں ڈال کر پہلے اپنی دولت نکلواؤں گی، پھر چھوڑوں گی۔ ذرا آ تو...... جیبوں کی تلاشی دو۔" شمشیرہ بیگم آگے بڑھ آئیں۔ حاجو نے اِدھر اُدھر دیکھا، بھاگنے کی ضرورت نہیں تھی ورنہ شمشیرہ بیگم کی مجال کہ اسے پکڑ سکتیں۔ ایک چھلانگ میں دروازے سے باہر ہوتا۔ لیکن یہ تو مشکوک کرنے والی بات تھی۔ خوش قسمتی سے جیب میں اس وقت دس بارہ روپے پڑے ہوئے تھے۔ احتیاط کرتا تھا ہمیشہ اور پھر ضرورت بھی نہیں تھی۔ اب تو شام کا وقت تھا، کہیں نہ کہیں سے بخشش مل ہی جاتی تھی۔ تماش بین آتے تھے اور کچھ نہ کچھ ان کی جیب میں بھی پڑ جاتا تھا۔ کھڑا رہا۔ شمشیرہ بیگم نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے، دونوں جیبیں ٹٹولیں، واسکٹ کی اندرونی جیبیں ٹٹولیں، بغلی جیبیں اور پھر نیفے میں پیسے تلاش کرنے لگیں۔

"اور کہوں کچھ...... خوامخواہ منہ سے مندی بات نکل جائے گی۔"

شمشیرہ بیگم نے حاجو کے سینے پر دوہتڑ مارا اور حاجو دیوار سے ٹکرایا۔ پھر دیوار کے سہارے ہی پھسلتا زمین پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

"توڑ دی پسلیاں...... خدا کی قسم، کیا جان ہے ہاتھوں میں...... اور کیا جان ہے زبان میں...... مگر اب تو منہ سے بددعا ہی نکلتی ہے۔ یہ عزت رہ گئی ہے اب...... یہ حال ہے آپ کے کوٹھے پر ہمارا...... پولیس والوں کی طرح جیبوں کی تلاشی لی اور پھر ہم چوروں کی مانند کھڑے رہے۔ ٹھیک ہے شمشیرہ بیگم! ٹھیک ہے...... خوب صلہ دیا تم نے، خوب صلہ دیا۔

اب تو ہم بھی ہاتھ پھیلا کر کہتے ہیں کہ خدا تمہارے دل کی مراد کبھی پوری نہ کرے۔ جس نے دوستوں سے وفا نہ کی وہ بھلا اپنی مراد کیا پا سکتا ہے؟"

حاجو کی جیبیں خالی دیکھ کر شمشیرہ بیگم ایک لمحے کے لئے سٹپٹائی تھیں مگر غلام شاہ نے جو کچھ کہا تھا وہ اتنا معمولی نہیں تھا، ہاتھ ہلا کر بولیں۔

"کہاں چھپائی ہے وہ رقم؟"

"دیکھو شمشیرہ بیگم! اب باز آ جاؤ، پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔"

"اے تو میں کہتی ہوں کیا، کیا آج تک مکھن شاہ نے ہمارے لئے۔"

"ہتھیلی پر سرسوں تھوڑی جمتی ہے۔ چلّہ کر رہے ہیں بے چارے آج کل۔ ملا تھا ان سے ایک دن۔ کہنے لگے کچھ ضروری امور نمٹا رہے ہیں۔ اس کے بعد شمشیرہ بیگم کے لئے چلّہ کریں گے اور دیکھ لینا، کام ہو جائے گا۔"

"کب گئے وہ چلّہ کرنے؟"

"کئی دن ہو گئے۔"

"تم جھوٹ تو نہیں بول رہے حاجو؟"

"اب کیا کہیں اور کیا نہیں کہیں...... تم نے تو پچاس ہزار وصول کر لئے اپنے۔"

"ہیں...... لک...... کس سے وصول کر لئے؟" شمشیرہ بیگم چونک کر بولیں۔

"ہماری بے عزتی کر کے...... جامہ تلاشی لے کر اور سینے پر دوہتڑ مار کر...... آج تو سارنگی بھی نہیں بجا سکیں گے۔ ساری پسلیاں درد کر رہی ہیں۔"

"مگر دیکھو تو حاجو! پریشان تو مجھے ہونا ہی چاہئے اتنی بڑی رقم دے کر۔"

"چھوڑیئے شمشیرہ بیگم! بس ہمارا کام ختم ہو گیا۔"

"نہیں نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔"

"ارے ہے ایسی بات...... آپ ہمیں کیا سمجھتی ہیں۔ جانتی ہیں ہمارا دشمن کون ہے؟ غلام شاہ نے آپ کے کان بھرے ہیں۔"

"کیا کہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا...... بہت بڑی رقم خرچ کی ہے میں نے حاجو! اگر میرا کام نہ ہوا تو......"

"گالیاں دیجئے مکھن شاہ کو...... یہ کہئے کہ کہاں مر گیا مکھن شاہ؟ اور اس کے بعد آپ

کی مرادیں پوری ہوں گی۔ سمجھ لیں کیا ہونے والا ہے۔"

"ارے نہیں بھئی نہیں...... ایسی باتیں مت کرو۔ میری عادت تو جانتے ہی ہو۔ پھر دل کو لگی ہوئی ہے۔ ایک ایک پل گن گن کر کاٹ رہی ہوں۔ الٰہی وہ دن کون سا آئے گا جب میرے بھی دن پھریں گے۔ ہائے کیسا جی چاہتا ہے کسی شاندار کوٹھی کا مالک بننے کے لئے۔ ایک وہ کمبخت مارا ہے، وہ فتنہ، خدا اسے غارت کرے کہ اس نے ایک کوٹھی بھی حاصل کر لی۔ ہم سے تو وہ ہی اچھا رہا۔ نہ ممتا کسی کام آئی اور نہ غزالہ اور شبانہ۔ رہ گئیں کوثر جہاں بیگم تو وہ ہیں ہی فرشتی۔ نہ کسی سے کچھ لیں گی نہ کسی کو کچھ دیں گی۔ کتنی آسامیاں ہاتھ سے نکال دیں انہوں نے، ہائے ہائے...... سوچتی ہوں تو دل کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ کیسے بڑے بڑے لوگ آئے اور سب کچھ لٹانے پر تل گئے۔ کس کس کا غم کروں۔ خیال آتا ہے تو سینے پر سانپ لوٹتے ہیں۔ بس ایک دفعہ دل کی مراد پوری ہو جائے۔"

"ہو جائے گی۔"

"اچھا چھوڑو، لو پان کھاؤ۔" شمشیرہ بیگم نے پان دان سامنے گھسیٹ لیا۔ حاجو منہ پھیلائے بیٹھا رہا۔ بہر حال بات ٹل گئی۔

محفل جم گئی اور تماش بین آنے لگے۔ محفل آہستہ آہستہ جمتی گئی اور پھر ایک ایسا منظر سامنے آیا کہ شمشیرہ بیگم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ رب نواز شاہ ہی تھے جو اپنے چاروں ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ اتنا خوبصورت لباس پہن رکھا تھا کہ شہزادے لگ رہے تھے۔ شمشیرہ بیگم کا منہ حیرت سے کھل گیا، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ شاہ جی جس موڈ میں نظر آ رہے تھے اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ تماش بین بن کر آئے ہیں۔ شمشیرہ بیگم انہیں جھک جھک کر آداب کرنے لگیں اور فوراً ہی وہ الفاظ یاد آ گئے جو مہمانوں کے لئے کہے جاتے ہیں۔

"اے حضور شاہ جی! یہ میری آنکھیں اندھی تو نہیں ہو گئیں...... جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ کوئی خواب تو نہیں ہے؟ یعنی آپ ہمارے گھر میں آئے ہیں؟"

"بیٹھئے شمشیرہ بیگم بیٹھئے۔ آخر ہم بھی انسان ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھئے کہ آپ کو پریشان کرنے آئے ہیں۔"

"حضور! رونق بڑھ گئی ہے شمشیرہ کے کوٹھے کی اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں پریشان

ہوں گی؟ میں تو اپنی تقدیر پر جس قدر ناز کروں کم ہے۔“

شمشیرہ بیگم نے خود گاؤ تکیہ اس طرف کھسکا دیا۔ اس وقت دو تین خیال ذہن میں تھے، کہیں کسی خطرناک ارادے سے تو نہیں آئے؟ یا پھر یہ پیر مکھن شاہ کی کرامت ہے کہ انہوں نے اس پتھر میں بھی جونک لگا دی۔

شاہ جی بیٹھ گئے جبکہ دوسرے مہمان ذرا سنبھل گئے تھے کہ کہیں ایسی ویسی کوئی بات نہ ہو جائے جس کی وجہ سے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ کوثر جہاں بھی جب ہال میں داخل ہوئی تو اس کی نگاہ بھی پہلے شاہ جی پر ہی پڑی تھی۔ ایک دم سکتے کے عالم میں رہ گئی۔ لیکن پھر سنبھل کر اس نے شاہ جی کو سلام کیا اور اس کے بعد شمشیرہ بیگم ہی نے شاہ جی سے اجازت طلب کی۔

”حضور! اجازت ہے؟“

”جی......“

اب دوسرے چراغوں میں روشنی کہاں تھی۔ یہ سب تو اپنے تھے جو آتے جاتے رہتے تھے۔ شاہ جی کی آج آمد اہمیت رکھتی تھی اور شمشیرہ بیگم، غلام شاہ کو دل ہی دل میں گالیاں دے رہی تھیں۔ خود غلام شاہ بھی پریشان نظر آ رہا تھا کیونکہ بات اس کے علم میں آ چکی تھی مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قصہ کیا ہے۔

بہر حال کوثر جہاں خاص طور سے ان کی عزت کرتی تھی۔ اسے یاد تھا کہ شاہ جی نے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ آتے رہیں گے اور آج یہ اسی وعدے کی تکمیل تھی۔ بہرحال غزل شروع ہوئی اور کوثر جہاں نے اس طرح دل سے گایا کہ لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ گائیکی کا انداز تو تھا ہی قیامت کا لیکن اس وقت جو جذبات دل میں تھے وہ بھی زبان تک آ گئے تھے۔ اور ایسا ہو تو پھر محفل کیوں نہ جھوم جائے۔ خود شاہ جی کو بھی شاید پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ کوثر جہاں غزل کی گائیکی میں کمال رکھتی ہے۔ پھر وہ فرمائشیں بھی کرتے رہے تھے۔

یہ بات تو پہلے ہی طے کر لی تھی کہ شمشیرہ بیگم کی شکم سیری کے لئے نوٹوں کی غذا لے کر جائیں گے اور یہ غذا مسلسل دی جا رہی تھی جس سے شمشیرہ بیگم کی آنکھوں میں سرور اترتا جا رہا تھا۔ وہ دانت پیس پیس کر غلام شاہ کو دیکھ رہی تھیں اور محبت بھری نگاہوں سے حاجو کو۔ یقیناً یہ اسی کا اعجاز تھا اور مکھن شاہ کی برکت کہ آج اس پتھر پر بارش کی پہلی بوند پڑ گئی تھی۔

نوٹوں کی برسات ہوتی رہی اور کوثر جہاں ایک کے بعد ایک غزل سناتی رہی۔ انتخاب لاجواب تھا...... اور اس وقت تین افراد کی کیفیت سرور کی دولت سے مالا مال تھی۔ شمشیرہ بیگم جو بس صیاد کو صید بنتے دیکھ رہی تھیں۔ حاجو، جو حیرت اور مسرت میں ڈوبا ہوا اس حیران کن اتفاق کو دیکھ رہا تھا اور کوثر جہاں جو شاہ جی کی آمد پر مسرور تھی۔

آخر وقت تمام ہوا۔ مہمان اٹھنے لگے۔ شمشیرہ بیگم، شاہ جی کے سامنے بچھی جا رہی تھیں۔

”آپ بھی جا رہے ہیں شاہ جی!“ شمشیرہ بیگم نے کہا۔

”شمشیرہ بیگم! کوٹھا خالی ہو گیا ہے۔ ہم رک کر کیا کریں گے؟“ شاہ جی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”حضور! دوسروں کا اور آپ کا کیا مقابلہ؟“

”کیوں؟“

”آپ تو ایک انہونا خواب ہیں...... جس پر یقین نہ آئے۔“ شمشیرہ بیگم پرانی طوائف تھیں۔

”خوب...... شاعری بھی کر لیتی ہیں آپ۔“

”ہم کیا، ہماری شاعری کیا...... ہم پر سے تو عمر پوچھے بغیر گزر گئی۔ پتہ ہی نہ چلا۔ لیکن فکر کیا۔ یہ سب ہماری جوانیاں ہی تو ہیں۔“

”کوثر جہاں کو گائیکی کی خوب تربیت دی ہے آپ نے۔“

”حضور نے تو کبھی غور ہی نہ کیا۔“

”ہاں...... نجانے کیوں دور رہے۔“

”شکایت ہے شاہ جی۔“

”کیا شمشیرہ بیگم؟“

”اتنی قربت، اتنی دوری۔“

”چلو، شکایت دور کر دیں گے۔“

”وعدہ؟“

”کیوں نہیں؟“

''آپ کو علم ہے کہ وہ آپ کا دم بھرتی ہے۔''
''کون؟''
''کوثر جہاں۔''
''ارے کہاں شمشیرہ بیگم! آپ کا خیال ہے۔''
''حضور! ایک آنکھ ہی تو دی ہے اللہ نے۔''
''ایک آنکھ نہیں شمشیرہ بیگم! دو دی ہیں۔ مجھے تو دو نظر آ رہی ہیں۔ کیوں ناشکری کرتی ہیں آپ؟'' شاہ جی نے ہنس کر کہا۔
''دیکھنے والی نگاہ تو ایک ہی ہوتی ہے شاہ جی۔'' شمشیرہ بیگم بھلا ہار ماننے والی کہاں تھیں؟''
''اچھا...... کیا دیکھا؟''
''یہ دیکھا کہ مرجھائی ہوئی تھی۔ آپ آ گئے تو یوں لگا جیسے سوکھے پان ہرے ہو گئے۔ آواز میں رنگ دوڑ گئے۔''
''آپ نے تو تجسس پیدا کر دیا شمشیرہ بیگم!''
''مل کر دیکھ لیں۔''
''کہاں گئیں؟''
''اندر ہیں۔'' شمشیرہ بیگم نے کہا۔
''ٹھیک ہے...... تو پھر خلوت درکار ہو گی۔''
''کس کی مجال کہ دخل در معقولات کرے۔'' شمشیرہ بیگم نے کہا اور شاہ جی اندر کی جانب چل پڑے۔ ان کے جاتے ہی شمشیرہ بیگم خوشی سے کانپتی ہوئی حاجو کے پاس پہنچ گئیں۔
''ہائے حاجو! دیکھا؟''
''دوبارہ نہیں دیکھے گی؟'' حاجو نے منہ بنا کر کہا۔
''پھر وہی کتا منہ بنا لیا...... کیا کہہ رہے ہو؟''
''گستاخیاں کریں مکھن شاہ کی شان میں، ذلیل و خوار کریں ہمیں جس نے یہ کاوش کی۔'' حاجو طنزیہ انداز میں بولے۔
''اے بس کیا کہوں...... آگ لگی زبان قابو میں نہیں رہتی۔ معافی مانگ لوں گی اپنے

شاہ جی سے۔''
''زبان آگ لگی نہیں ہے شمشیرہ بیگم! آگ تو لگائی جاتی ہے۔'' حاجو نے غلام شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک کہتے ہو تم...... یہ غلام شاہ ہی نے مجھے پٹی پڑھائی تھی۔ شیطان کی طرح بہکاتا پھرتا ہے۔ قربان جاؤں اپنے مرشد مکھن شاہ کے، کیسا شیر کو پنجرے میں بند کیا ہے...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''
''سوچ تو تم اب بھی نہیں رہی ہو شمشیرہ بیگم! ابھی تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔'' غلام شاہ بولا۔
''جھاڑو پھرے تمہاری شکل پر غلام شاہ! جل کر کباب ہوئے جا رہے ہو۔ جلتے رہو، ہمارا کیا بگاڑ لو گے۔''
''پتنگ چڑھی ہوئی ہے حاجو کی...... اترے گی تو ایسے اترے گی کہ دیکھنے والے دیکھیں گے۔'' غلام شاہ نے کہا۔
''اب ہم کیا بولیں غلام شاہ! کہنے والے کہہ گئے، ہم کیا کہیں۔''
''کیا کہہ گئے؟'' غلام شاہ نے کہا۔
''وہی کہ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے''
شمشیرہ بیگم نے قہقہہ لگایا اور بولیں۔ ''ٹھیک کہتے ہو حاجو! بالکل ٹھیک کہتے ہو۔''
غلام شاہ جھلایا ہوا باہر نکل گیا تھا۔
ادھر رب نواز شاہ، کوثر جہاں کے پاس پہنچ گئے۔ کوثر جہاں نے شرمسار نگاہوں سے انہیں دیکھا۔
''کیسی ہو کوثر جہاں؟''
''دعاؤں کے سائے میں جی رہی ہوں۔''
''آ گئے ہم۔''
''جی شاہ جی! بہت بہت شکریہ۔''
''اور وہ تمہاری اماں بہت خوش ہیں۔''
''مجھے شرمندہ نہ کریں شاہ جی۔''

''بہت عجیب لگ رہا ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔ لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''لا دوا ہوں، دوا کرے کوئی۔ آپ ہمارے لئے مسیحا ثانی ہیں۔''

''بہر حال تم بالکل بے فکر رہو، اصل میں اگر کوئی نام ہمارے سامنے آ جاتا تو زیادہ آسانی ہو جاتی۔ بہر حال دیکھیں گے کہ کیا صورتحال ہوتی ہے۔ ویسے کوثر جہاں بیگم! کچھ باتیں ضرور کہیں گے۔''

''فرمایئے۔''

''تم بڑی عجیب سی ہو۔''

''کیوں شاہ جی؟''

''کوٹھوں کی تاریخ ایسی نہیں ہوتی۔ تماش بین تو آنے جانے والی چیز ہوتے ہیں...... سب کچھ ہوتا ہے بھول جانے کے لئے۔ تم نے اسے اتنا یاد رکھا۔''

کوثر جہاں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہماری بدنصیبی کا کوئی کیا کرے۔ اپنی مرضی سے تو پیدا نہیں ہوئے۔ قسمت کی مرضی کے تابع ہیں، جہاں بھی اتار دے۔ مگر شکوہ ہے کہ انسانوں میں جگہ بھی تو نہیں ملتی۔ مگر انسانوں جیسا بنا دیا جاتا ہے، دل بھی دے دیا جاتا ہے، دماغ بھی۔''

نہ، نہ...... رونے کی بات نہیں ہے۔ ویسے تم بالکل بے فکر رہو۔ ہم پوری پوری کوشش کریں گے۔ اچھا یہ نوٹوں کی گڈی رکھ لو، یہ تمہارے لئے نہیں تمہاری اماں کے لئے ہیں۔ ہمارے آنے جانے میں آسانی رہے گی۔''

''شاہ جی......''

''نہیں، تم پر احسان نہیں کر رہے...... یہ سب تو ہمارے لاڈلے بیٹے کا حق ہے، اسی کے لئے کر رہے ہیں یہ سب کچھ۔''

''کاش میرے پاس وہ دعائیں ہوتیں جو میں آپ کو دے سکتی۔''

''دعائیں کسی کے پاس نہیں ہیں کوثر جہاں بیگم!'' شاہ جی اچانک خاموش ہو گئے اور کوثر جہاں چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ پہلی بار...... پہلی بار اسے یوں لگا تھا جیسے شاہ جی کے لہجے

میں کوئی خاص بات ہے۔ عجیب سے الفاظ تھے یہ...... کیا مفہوم ہے ان کا۔

''اچھا چلتے ہیں......'' شاہ جی نے کہا اور باہر نکل گئے۔ کوثر جہاں دروازے کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

○●○

نادر شاہ لاہور میں ہی رہتے تھے۔ کاروباری آدمی تھے۔ کوٹ اڈو کے پاس بہت بڑا فارم ہاؤس تھا اور وہاں مختلف کام ہوا کرتے تھے۔ بہت عالی شان زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی پہنچ بھی خاصی تھی۔ لیکن درمیانہ زندگی گزارنے کے عادی تھے۔

بہر حال لاہور کے بڑے لوگوں کا نام جب لیا جاتا تھا تو نادر شاہ کا نام بھی ان میں شامل ہوتا تھا۔ بڑے بھائی سیاسی آدمی تھے لیکن ان کی سیاست انہیں کچھ آگے لے گئی۔ ایک بہت بڑے انگریز افسر نے جب اپنی مدت ملازمت ختم کی اور لندن واپس گیا تو زبردستی ان کے بڑے بھائی جواد حسین شاہ کو اپنے ساتھ لے گیا اور جواد حسین شاہ کو لندن اس قدر پسند آیا کہ بیوی بچوں کو بھی ادھر ہی منتقل کر لیا۔ مگر لاہور سے بھلا رابطے کہاں ٹوٹتے ہیں۔ جن کا رابطہ ایک بار لاہور سے ہو جائے وہ سب کچھ بھول سکتا ہے لاہور نہیں۔ اور پھر بھائی بھی بہت پیارا تھا چنانچہ ملک چھوڑنے کے باوجود نادر شاہ سے مسلسل رابطہ تھا۔ نادر شاہ کی نسبت چوہدری جواد حسین شاہ رنگین مزاج آدمی تھا۔ اور اس کے چھوٹے چھوٹے قصے اور کہانیاں آج بھی گھر میں یاد کی جاتی تھیں۔ اکثر لندن سے آنا جانا ہو جاتا تھا۔ ان دنوں بھی اس کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔ نادر شاہ، بھائی کی محبت سے سرشار تھا اور بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ساتھ ہی خوشی کی بات یہ تھی کہ داتا صاحب کے عرس کے دن بھی آ رہے تھے اور یہ دن لاہور والوں کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے تھے۔ نجانے کہاں کہاں سے لوگ آ جایا کرتے تھے اور ان مہمانوں کے لئے خصوصی انتظامات کر لئے جاتے تھے۔

بہر حال چوہدری جواد حسین آ گئے۔ بھائی سے اس طرح گلے مل کر چمٹے کہ جدا کرانا مشکل ہو گیا۔ چوہدری صاحب کی ایک بیٹی تھی جو تھی تو اپنی ماں کی طرح خوبصورت لیکن لندن کی فضاؤں میں پروان چڑھی تھی۔ وہ ابھی نوخیزی کی سرحدیں پار کر رہی تھی لیکن گرم یورپ کے گرم ماحول نے اس کی گرمیوں میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اب جوانی کی دلکشی نے

اس کے دروازے پر دستک دینا شروع کر دی تھی۔ دونوں بھائی جڑے بیٹھے باتوں میں مصروف تھے کہ چوہدری جواد حسین کی بیگم فاخرہ بیگم نے اپنی دیورانی سے ہنس کر کہا۔

"دیکھ رہی ہو، یہ دونوں بھائی تو اس طرح بیٹھے ہیں کہ عورتوں کو بھی مات کر دیا۔ ملنے جلنے کا تو نام ہی نہیں لے رہے۔ مسلسل باتیں کئے جا رہے ہیں۔ بھلا ان دونوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ باتیں صرف عورتیں ہی کرتی ہیں۔"

نادر شاہ کی بیگم ناصرہ ہنسنے لگیں اور بولیں۔ "چلئے بھابی جان! کیا فرق پڑتا ہے۔ دونوں بھائی بہت عرصے کے بعد ملے ہیں۔"

"ارے واہ...... اس عمر میں بھی ہمیں اپنی باتوں سے دور رکھیں گے؟"

"تو پھر چلئے، ان پر چھاپہ مارتے ہیں۔" ناصرہ بیگم نے کہا اور دونوں خواتین دونوں بھائیوں کے پاس پہنچ گئیں اور ان کی باتوں میں شامل ہو گئیں۔

چوہدری جواد حسین ہنس کر بولے۔ "یہ جیمس کارٹ تو یوں لگتا ہے جیسے میرا اور اس کا خون کا کوئی رشتہ ہو۔ وہ میرے لئے دنیا کی ہر آسائش مہیا کرتا ہے۔ پوچھ لو اپنی بھاوج سے، منہ سے کوئی بات نکل جائے تو جیسے یہ اس کے لئے ایمان بن جاتی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ اسی کی ڈور سے بندھا ہوا ہوں ورنہ لاہور سے باہر کی دنیا میں کس کا دل لگتا ہے۔ اپنا گھر اپنا ہی گھر ہوتا ہے...... مگر اب میرے پاس ایک معقول جواز ہے۔ سمجھا لوں گا جیمس کارٹ کو اور بہت جلد وہاں سے لاہور آنے کی کوشش کروں گا۔"

"کیا جواز مل گیا ہے؟" نادر شاہ نے پوچھا۔

"بتا دوں گا بھی۔"

"خیر، آپ واپس آ جائیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ ہماری زندگی میں بھی خوشیاں آ جائیں گی۔"

"ویسے ولایت میں تمہارے بھائی جان کو ایک بڑی تکلیف ہو گئی ہے ناصرہ بیگم!"

"کیا......؟" ناصرہ بیگم نے چونک کر فاخرہ کو دیکھا۔

"بس وہاں ہیرا منڈی نہیں ہے...... بلکہ وہاں ایسی کوئی منڈی ہے ہی نہیں۔ کیونکہ وہاں تو راستے تک محفوظ نہیں ہیں اس طرح کی خواتین سے...... اور تمہیں تو علم ہے کہ چوہدری صاحب موسیقی کے بہت رسیا ہیں اور رقص و موسیقی جب تک نہ ہو ان کا کھانا ہضم

نہیں ہوتا۔ لیکن لندن میں یہ دن کہاں؟ انگریزوں نے ان خواتین کو لندن منتقل نہیں کیا۔ وہاں اگر کبھی ناچ گانے کی محفل ہوتی بھی ہے تو کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔" فاخرہ بیگم نے اس طرح کہا کہ ناصرہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

"کتوں کے رونے کی آوازیں؟"

"تو اور کیا؟ کبھی انگریزی گانے نہیں سنے؟ ذرا سنو، یوں محسوس ہو گا جیسے بہت سے کتے مل کر رو رہے ہیں۔"

"توبہ توبہ...... کیسی بدذوق عورت ہے یہ۔" چوہدری جواد نے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ گفتگو جاری رہی۔ محبتوں کا پھیلاؤ لامحدود تھا۔ بڑی خوشیاں تھیں اور انہی خوشیوں میں ثانہ کا ذکر نکل آیا۔

"یہ ثانا ہمیں واپس پاکستان لے آئے گی؟"

"کیا وہاں اس کا جی نہیں لگتا؟"

"نہیں، خوش تو بہت ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں، اس کا لہجہ تک بگڑتا جا رہا ہے۔ بس یہی میں نہیں چاہتا۔" چوہدری جواد نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں بھائی جان؟"

"بھئی اپنی ثقافت، اپنا ماحول، اپنا رہن سہن ...... اسے تو کسی قیمت پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اور پھر ماشاء اللہ تیرھویں سال میں لگ گئی ہے۔ اٹھان دیکھو، مجھے تو یوں لگتا ہے کہ پندرھویں سال میں۔ اللہ رکھے خوب جوان ہو جائے گی۔ اب ظاہر ہے اپنے دیس کی جو بات ہے یورپ میں تو وہ سب کچھ نہیں ہے۔ حالانکہ بہت سے پاکستانی خاندان وہاں آباد ہیں، اچھے گھرانوں سے تعلق ہے لیکن سب کے سب وہاں کے رنگ میں رنگے جا چکے ہیں۔ اور پھر جیسا دیس ویسا بھیس والی بات ہوتی ہے۔ چنانچہ واپسی ضروری ہے۔"

ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اچانک ناصرہ بیگم کے منہ سے ایک آواز سی نکل گئی اور سب چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"خیریت...... کیا ہوا؟"

"نہیں...... کچھ یاد آ گیا تھا۔" ناصرہ بیگم نے کہا۔

"کیا؟" نادر شاہ نے بیوی کو گھورتے ہوئے کہا۔

”بس انسان تو انسان ہی ہے...... اور پھر یہ دماغ جو ہوتا ہے نا یہ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ کہاں کے ڈانڈے کہاں جا کر ملتے ہیں۔“

”بھئی کیوں سسپنس پیدا کر رہی ہو...... بات کیا ہے؟“

”یاد کیجئے، ایک دن کھانے کی میز پر بیٹھ کر آپ نے شانا کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک لڑکے کا نام لیا تھا۔“

”اوہ میرے خدا! دیکھو، اسے کہتے ہیں نصف بہتر بلکہ پچھتر فیصد بہتر۔ کیا موقع سے یاد دلایا ہے۔ وہ لڑکا بھلا کبھی ذہن سے نکلنے والا ہے۔“

”کون لڑکا ہے بھئی...... بھلا ہمیں بھی تو بتایئے اس کے بارے میں۔“

”بھائی یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کے منہ سے بات نکلی اور ہم نے اچک لی۔ شانا ہمارے ذہن سے دور کیسے رہ سکتی ہے؟ ہماری آنکھوں کا نور ہے۔ میرے ذہن میں بھی یہ بات آئی تھی کہ شانا کے لئے کوئی اچھا رشتہ نگاہوں میں رکھوں، سو آپ یوں سمجھئے کہ ایک دم سے اس وقت ذہن میں ٹھک سے ایک آواز آئی۔ اس سلسلے میں کچھ فیصلے کر کے ان پر غور کر رہی تھی۔“

”ہاں ہاں...... کیوں نہیں بھئی...... چچی ہو تم اس کی...... میں تو وطن سے دور بیٹھا ہوا ہوں اور یہاں کے ماحول سے ایک طرح سے کٹ گیا ہوں...... اب جو کچھ بھی آ ئی گئی ہے تم پر ہی پڑے گی۔ وہ لڑکا کون ہے؟“

”اکرام نام ہے...... بس بھائی جان کیا بتاؤں کیا شخصیت ہے، کیا اٹھان ہے، کیا پھبن ہے، کیا بانکپن ہے، کیا انداز ہے۔ دیکھنے دکھانے سے تعلق رکھتا ہے۔“

”بھئی واہ...... کیا تصویر کھینچی ہے...... مگر یہ ہے ون؟“

”کسی بہت بڑے جاگیردار کا بیٹا ہے...... یقیناً جاگیردار لاہور سے باہر ہوں گے کیونکہ لاہور میں ستر فیصد آبادی پنجاب کے دوسرے شہروں کی ہے۔ کوئی پڑھنے آیا ہے کوئی کاروبار کرنے، کوئی نوکری کرنے۔ لاہور نے سب کو اپنی آغوش میں چھپا رکھا ہے۔“

”ہوں...... کیا حیثیت ہے؟“

”عیش ہے...... ابھی عمر چھوٹی ہے لیکن ہمیں اتنا پسند ہے کہ آپ بھی دیکھیں گے تو عش عش کر اٹھیں گے۔“

”مگر اس کے والد صاحب وغیرہ سے ملاقات نہیں ہوئی کیا؟“

”میں نے کہا نا، یہاں نہیں رہتے۔ بس بچے ہی سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ بھی علی شاہ کے ساتھ سکول میں پڑھتا ہے۔ ہر لحاظ سے مکمل ہے، جتنا وقت ہمارے پاس ہے یقیناً اس کے ماں باپ بھی اتنے ہی وقت میں اس کی شادی کے بارے میں سوچیں گے۔ مگر جس طرح اپنی شانا کی اٹھان ہے، ماشاء اللہ اسی طرح وہ بھی طوفان ہے۔ تن و توش آفاقی ہے بلکہ انتہائی متناسب اور سڈول بدن کا مالک ہے۔ مگر بھائی جان! بے مقصد اتنی تعریف کر رہا ہوں۔ آپ سمجھ لیں کہ کس طرح اس نے مجھ پر اثر ڈالا ہے۔ ویسے والد کا نام رب نواز شاہ ہے، حیثیت کا اندازہ اس کی شخصیت دیکھ کر ہی ہو جاتا ہے۔“

”کیوں نہیں بھئی...... اتنا پسند ہے تمہیں تو یقیناً کچھ نہ کچھ ہوگا۔ اور واقعی اگر کوئی ایسا سلسلہ ہو جائے تو مجھے اس سے زیادہ خوشی بھلا کس بات کی ہوگی۔ تم کہتے ہو عمر بھی اتنی نہیں ہے، تعلیم حاصل کر رہا ہے، دیکھ لیں گے۔ اگر کوئی بنیاد ڈالنا چاہو تو ڈال دینا۔ اس بار کا آنا زیادہ فائدہ مند ثابت ہو جائے گا۔“

”آپ اطمینان رکھیں...... میں ایسا کرتا ہوں پہلے علی شاہ کے ساتھ اسے بلا لوں گا، آپ دیکھ لیجئے گا۔ پھر خاندان وغیرہ کے بارے میں تفصیلی چھان بین کر لی جائے گی اور اس کے بعد بات آگے بڑھا دیں گے۔“

”خود آگے بڑھا لو گے؟“ جواد حسین نے کہا۔

”نہیں اس قسم کے معاملات طریقے اور سلیقے سے ہوتے ہیں۔ کوئی اور کھیل کھیلیں گے۔ آپ اطمینان رکھیں۔“

”بھئی ہمیں اطمینان ہے۔“

دونوں بھائی ہنسنے لگے۔

اکرام واقعی نادر شاہ کے دل میں اتر چکا تھا۔

○●○

بقیہ واقعات کے لئے جلد دوئم کا مطالعہ کیجئے۔

دوئم
پازیب
ایم اے راحت

حاجو کی تقدیر کا ستارہ کچھ بلندی پر ہی پہنچ گیا تھا۔ غلام شاہ نے بڑی محنت سے شمشیرہ بیگم کے کان بھرے تھے لیکن سارے کا سارا کیا دھرا چوپٹ ہو گیا تھا۔ رب نواز شاہ اور کسی کے کوٹھے پر آ جائیں اور وہ بھی اس طرح کہ پہلے ہی ہلّے میں لاکھوں لٹا کر چلے جائیں۔ کوثر جہاں سے تنہائی میں ملیں۔

یہ ساری چیزیں صرف اسی سمت اشارہ کرتی تھیں کہ پیر مکھن شاہ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور انہی کی کرامت نے پتھر میں جونک لگا دی ہے۔ شمشیرہ بیگم نے خاص طور سے اس بات کی فرمائش کی تھی کہ شاہ جی جیسے دولت مند ان کی جانب متوجہ ہو جائیں اور ایسا ہو گیا تھا۔ شمشیرہ بیگم کے چہرے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کس قدر خوش ہیں۔ اس دن تو خیر کوئی بات نہ ہوئی، دوسرے دن غلام شاہ اتفاقی طور پر اس کمرے میں آ گیا جہاں حاجو اور شمشیرہ بیگم کھسر پھسر کر رہے تھے۔ غلام شاہ بھی ان لوگوں سے بہت قریب تھا، شمشیرہ بیگم کے دل میں انسانیت آئی، اسے بھی بلا لیا اور بولیں۔

''آؤ غلام شاہ! تمہاری کمی محسوس ہو رہی تھی۔ آؤ، بیٹھ جاؤ۔''

''ہماری اور کمی......؟ شمشیرہ بیگم! حاجو موجود ہے، ہماری کیا ضرورت ہے۔''

''تم تو بس جل جل کر ہی مرے جا رہے ہو، بچوں کو بھی مات کر دیا ہے۔ اس عمر میں رقابت۔ حاجو بھی ہمارے پرانے ساتھیوں میں سے ہے اور تم بھی۔ اب کس کو چڑھائیں اور کس کو اتاریں، یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔''

''رہنے دو شمشیرہ بیگم! کیا چڑھانے اتارنے کی بات کرتی ہو خوامخواہ۔ بس آگے نہ بولنا زیادہ بہتر ہے۔''

''بک بک کرنا بھی نہیں۔ دانتوں کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ جوتے کی ایڑھی سے ٹوٹ بھی سکتے ہیں۔''

ہاں، ہاں...... ٹھیک کہتی ہو۔ ہماری یہی اوقات ہے اور جو چوراچکے ہیں جنہوں نے چوری کو اپنا شعار بنالیا ہے وہی آرام سے جی رہے ہیں۔ ہم جیسے لوگ تو صرف خوار ہی رہتے ہیں۔"

"ستیاناس ہو تمہارا...... کبھی دل میں کوئی ہمدردی کی لہر اٹھتی بھی ہے تو تم اپنی بکواس سے بٹھادیتے ہو۔ الٹی سیدھی بھونکے جارہے ہو۔ تمہارے ساتھ تو اچھی زبان استعمال کرنی ہی نہیں چاہیئے۔"

"ہاں یہ ہوئی ناں بات...... اب آپ اصلیت پر آ گئیں۔ حاجو! ایک لمحے کے لئے ناک پر جا بیٹھے ہو...... لیکن بے فکر رہو، مکھی ہی کی طرح اڑا دیئے جاؤ گے۔ اطمینان رکھنا۔"

"اپنی سوچو غلام شاہ! اس کو رہنے دو...... اس کی تقدیر نے اس کے لئے جو جگہ متعین کی ہے، وہیں کا وہیں رہے گا۔ کیا سمجھے؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ جب کسی کا ستارہ عروج پر ہوتا ہے تو ایسی ہی زبان بولنے لگتا ہے وہ۔ لیکن حاجو ایک بات تم سن لینا، جب گرے تو ہڈیاں پسلیاں چور چور ہو جائیں گی۔"

"دھمکی...... پھر دھمکی...... دیکھو شمشیرہ بیگم! میں پولیس میں رپورٹ درج کرادوں گا کسی دن۔"

"تم بھی ضرورت سے زیادہ ہی بولنے لگے ہو حاجو! کون سی ہڈی پسلی توڑ دی غلام شاہ نے تمہاری؟ خوامخواہ تم دونوں جب بھی سامنے آتے ہو لڑنے جھگڑنے لگتے ہو۔ میری خوشیوں میں شامل ہونے کی بجائے تم اپنی رنجشوں میں پڑے رہتے ہو۔ میں کہتی ہوں میری بھی سنو گے؟"

"سنایئے...... سنایئے......" غلام شاہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اب بات چھپانے کی نہیں رہی ہے غلام شاہ! ہم لوگ پیر مکھن شاہ سے تعویز لائے تھے، یہی سوچا تھا کہ شاہ جی پھندے میں پھنس جائیں۔ سو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ہمارا سوچا پورا ہوا اور تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ میں قربان جاؤں مکھن شاہ کے، بگڑی بنا دی۔ ہائے کیسی شاندار کوٹھی دی ہے انہوں نے اکرام کو۔ جب بھی غور کرتی ہوں سینے پر

سانپ لوٹنے لگتے ہیں...... کتنی ہی بار یہ بات میرے دل میں آئی کہ شاہ جی کے دل میں ہے کچھ ضرور۔ اب کھل کر سامنے آئے ہیں۔" شمشیرہ بیگم نے کہا۔

"کیا مطلب؟" غلام شاہ چونک کر بولا۔

"بودم ہیں پورے غلام شاہ! بودم۔ وہ جو کہتے ہیں ناں دل کے راستے اولاد کی طرف سے ہو کر جاتے ہیں۔ یہ شاہ جی تو کافی گہرے آدمی ہیں۔ حالانکہ کہتے ہیں بھیا، طوائف کے کوٹھے پر اپنے دل کی بات کہہ دینے میں کوئی احمق ہی اعتراض کرسکتا ہے۔ لیکن ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں دنیا کی خبر نہیں ہوتی۔ اگر پہلے ہی کوثر جہاں سے کہہ دیتے کہ بی بی ہم تم سے محبت کرتے ہیں، تمہاری چاہت میں گرفتار ہو گئے ہیں تو کوثر جہاں کون سا انکار کر دیتی۔ مگر انہوں نے ہاتھ گھما کر ناک پکڑی ہے اور سب سے پہلے اکرام کو اپنی محبتیں دی ہیں۔ میں سب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ اب دیکھو رات کو کیا کیا نہیں دے گئے۔ اے غلام شاہ! میں تو کہتی ہوں پچھلی رات ہماری بڑی قیمتی رات گزری ہے۔"

"ہماری نہ کہو شمشیرہ بیگم! صرف اپنی کہو۔"

"ہاں...... تمہارے منہ سے تو رال بہتی ہی رہتی ہے۔ کھا رہے ہو، پہن رہے ہو، مشٹنڈے کے مشٹنڈے ہو رہے ہو۔ کیا مجھے تم لوگوں کی فضول خرچیوں کا کوئی پتہ نہیں ہے؟"

"تم نے بات کچھ بیچ میں چھوڑ دی، میں تو کچھ سننے کو بیٹھا ہوا ہوں۔"

"خاک جاری رکھوں...... دل تو جلا دیتے ہو تم۔ اچھی خاصی باتیں کر رہے تھے ہم لوگ، تم بیچ میں آ گئے۔ میں کہتی ہوں تم میرا جی جلانے کیوں آ جاتے ہو۔"

شمشیرہ بیگم اپنی جگہ سے اٹھیں تو غلام شاہ بھی جلدی سے واپسی کے لئے مڑ گیا۔ وہ بکتی جھکتی رہیں اور غلام شاہ سنی ان سنی کر کے باہر نکل گیا۔ حاجو نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں اپنا دل ہلکان کر رہی ہو...... غلام شاہ تمہارا وفادار کبھی نہیں ہو سکتا۔ ادھر کی اُدھر لگاتا رہے گا۔ کبھی میری برائی کرے گا کبھی کسی اور کی۔ کام کی بات کبھی نہیں سنے گا۔ اس کے مطلب کی بات نہیں ہو رہی تھی ناں...... اس لئے اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ دکھاتیں ہزار کا پتا، پھر دیکھتیں غلام شاہ کی لسانیاں۔"

"سب سمجھتی ہوں...... سب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔" شمشیرہ بیگم نے آنکھیں مٹکاتے

ہوئے کہا۔

○●○

راجہ شرافت علی فطرتاً بہت سرکش تھا۔ ویسے بھی بہت بڑا آدمی تھا۔ عیاش طبع اور تماش بین۔ عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری تھی مگر ایسی کبھی نہیں بیتی تھی۔ عزت دو کوڑی کی ہو گئی تھی۔

یہ بھی شکر تھا کہ جن لوگوں کے سامنے ایسا ہوا تھا، اس کے غلام تھے جنہیں دوستوں کا نام دے دیا گیا تھا۔ کسی اور کو پتہ نہیں چلا تھا ورنہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ انتقام کی آگ میں سلگتا ہوا اپنے گھر پہنچا تھا۔ گھر والوں نے سر گنجا دیکھا تو حیران ہو گئے۔ تفتیش احوال ہوئی تو کہہ دیا کہ گرمی چڑھ گئی تھی، حکیم صاحب نے مشورہ دیا کہ بال کٹوا لو ورنہ نقصان ہو جائے گا اس لئے سر گھٹوانا پڑا۔ بات بن گئی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر جوالہ مکھی پھٹ رہا تھا اور اس کا لاوا روکنا ممکن نہیں تھا اس وقت تک کہ جب تک کہ شکل بہتر نہ ہو گئی۔ اس دوران لاتعداد منصوبے دل میں آئے تھے اور ان پر غور کرتا رہا تھا۔

بہرطور بال آ گئے۔ شکل بہتر ہو گئی۔ اتنا وقت خاموشی سے گھر میں گزارا تھا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ گھر والے بھی حقیقت آشنا تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ راجہ صاحب گنجے سر کی وجہ سے گھر سے باہر نہیں بھاگے۔ ورنہ ان کا پاؤں نکتا کب ہے...... یہ آئے، وہ گئے۔ نجانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے تھے۔ زمینیں تھیں، جائیدادیں تھیں، کھیتی باڑیاں تھیں، کوئی مشکل تو تھی نہیں کہ گھر میں بیٹھ کر کاروبار کے بارے میں سوچتے۔ کارندے کام کرتے تھے، خود بھی کھاتے تھے مالک کو بھی دیتے تھے۔ لیکن جو خود کھاتے تھے اس کا پتہ نہیں چلنے دیتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ راجہ شرافت علی نے انہیں آزادی دے رکھی تھی۔ کتنا کھائیں گے آخر۔ جو وہ کر دیتے تھے اتنا ہوتا تھا کہ راجہ صاحب سے خرچ کرتے نہ بن پڑتا تھا۔ آخر کار پھر لاہور جانے کی تیاریاں کر لیں۔ لاہور میں دوستوں کے سوا اور کون ہوتا جس کے پاس جاتے۔ یہی یار وفادار تھے اور یہی راز دار۔ پھر ان کے دلوں سے یہ خیال بھی نکالنا تھا کہ راجہ شرافت اتنے بے حقیقت انسان نہیں ہیں کہ رب نواز شاہ سے مار کھا کر چلے گئے۔ سب سے پہلے نواب دین کے گھر پہنچے تھے اور نواب دین اس وقت گھر میں موجود تھا۔ راجہ شرافت علی کو دیکھ کر سہم گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھا

تو راجہ صاحب کہنے لگے۔

''کیا بات ہے نواب دین! حیران کیوں ہو گئے؟''

''نہیں صاحب! حیرانی کی کیا بات ہے۔ دوست ہوں آپ کا، یہ فخر حاصل ہے مجھے۔''

''صورت سے تو ایسا ہی لگا تھا۔''

''ہاں...... آپ کا حلیہ دیکھ کر۔''

''یاد نہ دلاؤ مجھے وہ لمحات۔ ویسے شکل تو تمہاری بھی بدل گئی۔''

''ہاں...... یہ بال تو آنی جانی چیز ہیں۔ آئیے بیٹھئے، اچانک ہی آپ آ گئے۔ اس دوران تو کوئی رابطہ ہی نہ رہا۔''

''خون کے گھونٹ پی پی کر جی رہا تھا جوشِ انتقام سے...... اور اب تیار ہو کر آیا ہوں۔''

''تت...... تت...... تیار ہو کر؟'' نواب دین کے منہ سے نکلا لیکن چہرہ اتر گیا تھا۔ کچھ بولا بے شک نہیں تھا۔ راجہ شرافت علی جب بھی آتا سال چھ مہینے اچھے گزر جاتے۔ اتنا کچھ ہاتھ آ جاتا تھا۔ آسامی نظر انداز تو نہیں کی جا سکتی تھی۔ ویسے بھی دوستی کا معاملہ تھا۔ دوستی نبھانے کے قائل تھے۔ چنانچہ خاموشی سے راجہ صاحب کی باتیں سنتے رہے۔ رہنے سونے کا بندوبست تو تھا ہی ان کے پاس۔ راجہ صاحب نے فرمائش کی۔

''اب ایسا کرو حیات خان وغیرہ کو بھی اطلاع دے دینا۔''

''ہاں...... بے شک۔ ویسے بھی عرس شریف آ رہا ہے اور اس میں شرکت تو کرنی ہی ہوتی ہے۔''

''ہاں، جو میرے دل میں ہے معلوم ہے نواب دین؟''

''اچھی طرح معلوم ہے...... میرا بھی دل یہی چاہتا ہے کہ رب نواز شاہ کو جوتے سے مسل کر رکھ دوں۔''

''بے فکر رہو...... یہی کرنے آیا ہوں اس بار۔ اور ظاہر ہے تم سب دوستوں کی مدد سے یہ سب کچھ کروں گا...... بات میری عزت کی نہیں، تم لوگوں کی عزت پر بھی بن آئی ہے۔ ویسے میرے جانے کے بعد تم لوگوں نے کیا سوچا تھا؟''

''بس راجہ صاحب! حیثیتوں کا فرق ہے۔ ہم اس قدر بے حیثیت لوگ ہیں کہ اپنے جذبوں کو بھی موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔ مالی وسائل تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔''

''یقین دلانے کی ضرورت نہیں۔ کیا میں جانتا نہیں ہوں کہ لاہور کے اخراجات کیا ہیں اور تمہاری آمدنی کس قدر محدود۔ لیکن اس سمت سے بے فکر رہا کرو۔ لو، یہ رکھ لو۔'' راجہ شرافت نے نوٹوں کا ایک بنڈل نواب دین کی طرف بڑھایا اور نواب دین نے اسے دونوں ہاتھوں سے لے کر ماتھے سے لگا لیا۔ بس اس کے بعد بھلا اور کیا کرنا تھا۔ چنانچہ باقی دوستوں کو اطلاع دینے چلا گیا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

''بھائی! دیکھو، بات ذرا کچھ اور ہے۔ شاہ جی کا معاملہ خاصا گڑبڑ ہے۔ اس لئے مجھے تو معاف ہی رکھو۔ اور سنو میرے بھی دوست ہو تم۔ راجہ صاحب سے میرے بارے میں کوئی بھی جھوٹ بول دینا۔''

بہرحال حیات خان تیار ہو گیا تھا۔ تیسرے آدمی کے پاس پہنچا اور پوچھا تو نواب دین نے دوستی نبھائی۔ اس کی بیوی بیمار تھی چند روز پہلے اسے لے کر بیوی کے میکے گیا ہے۔

''یہ تو برا ہوا۔''

''آ جائے گا واپس۔''

''چھوڑو حیات خان، نواب دین اور کلیم شاہ، تم لوگوں کو معلوم ہے کہ میں یہاں کس لئے آیا ہوں۔''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے راجہ صاحب؟''

''جیتے رہو...... تم جیسے لوگوں کے بھروسے پر ہی لاہور واپس آیا ہوں۔''

''اب ارادہ کیا ہے؟''

''بس لمبی پلاننگ ہے...... کسی اچھے علاقے میں رہنے کا بندوبست کرو۔ مگر اس سمت نہیں جہاں وہ شیطان رہتے ہیں...... ان سے ذرا فاصلہ رکھنا۔ خرچے کی کوئی پرواہ نہیں ہے، عزت کے لئے لاکھوں لٹا دوں گا...... یہ رب نواز آخر اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ کوئی جگہ درکار ہو گی ہمیں جہاں اپنے پاؤں ٹکا لیں اور اس کے بعد لاہور کے نامی گرامی بدمعاشوں کے بارے میں پتہ لگاؤ جو رب نواز شاہ کے مقابلے پر آ سکیں۔''

''یہ بھی ہو جائے گا شاہ جی! بلکہ میری تو رائے ہے کہ ہم ایسے آدمیوں کو ساتھ رکھیں جو نامی گرامی نہ ہوں۔ نامی گرامی لوگ تو سب ایک دوسرے کی نگاہوں میں ہوتے ہیں۔

ایسے بندے کی ضرورت ہے جو خاموشی سے کام کر گزرے اور اس کا نام بھی سامنے نہ آئے۔ ایسا بندہ زیادہ کارآمد ہو سکتا ہے۔''

''اس بار جو بہتر سمجھتے ہو وہ کرو۔ پیسوں کی فکر مت کنا۔ ہر کام پوری احتیاط کے ساتھ ہو۔''

''اچھا یہ بتایئے کرنا کیا ہے...... کیا رب نواز کو قتل کروانا ہے؟'' حیات خان نے پوچھا۔

''ارے نہیں، قتل کرنے میں کیا مزہ آئے گا...... ناک کاٹنی ہے اس کی۔ مونچھیں صاف کروانی ہیں، نتھنے توڑنے ہیں اور اس کے بعد اپنے قدموں میں ڈال لینا ہے۔ یہ کام ہو گا۔''

''بالکل ہو گا...... اب کسی کی مجال ہے کہ اس کام سے روکے۔'' نواب دین نے کہا۔

''لیکن بات سنو، ہوشیاری شرط ہے۔ یہ بتاؤ کہ لاہور کے کن کن بدمعاشوں کو اپنے ساتھ شامل کرو گے؟ میں یہ نہیں چاہتا کہ سب کچھ تم ہی کرو، تمہارے ہی ہاتھ سے ہو۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ اور کسی کو اپنے ساتھ شامل کر لو۔ کام وہ کرے اور نگرانی تم کرو۔ میں تمہیں خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔''

''مہربانی ہے آپ کی راجہ صاحب! ورنہ ہم تو ہر طرح سے تیار ہیں۔ ویسے رب نواز شاہ ہمیں پہچانتا ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ ہم اس کے سامنے ہی نہ آئیں تاکہ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو رب نواز کو یہ شبہ نہ ہو کہ اس کی اس حالت میں ہمارا ہاتھ ہے۔''

راجہ شرافت علی سوچ میں ڈوب گیا تھا، کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

''تو پھر کام شروع کر دو۔''

''کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے...... مکان کی تلاش شروع کر دی جاتی ہے۔ کئی جگہ جان پہچان ہے۔''

''ٹھیک ہے...... تم لوگ بھی یہ تھوڑی تھوڑی سی رقم لے لو۔ اس بار میں نے انتقام لینا ہے اور اس کے بعد اس کوثر جہاں کو دیکھوں گا۔ کتنی پارسا بن رہی ہے۔ تم دیکھنا کیا کرتا ہوں اس کا...... صرف اور صرف تلوے چٹواؤں گا اور کچھ نہیں کروں گا اس کا۔ اس کے علاوہ کوئی اوقات نہیں ہے اس کی۔ دیکھ لوں گا اس حرام کی جنی کو بھی۔ اگر وہ کوٹھا آباد رہ جائے تو میرا نام بھی راجہ شرافت علی نہیں ہے۔''

"ایسا ہی ہوگا راجہ صاحب...... سب آپ کے جانثار ہیں اور آپ کے لئے ہر کام کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔" نواب دین نے نوٹوں کی گرمی محسوس کرتے ہوئے کہا اور راجہ شرافت علی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

○●○

نادر شاہ نے اپنے بیٹے علی شاہ سے کہا۔ "سناؤ علی شاہ! تمہارے دوست اکرام کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے ابا جی! پڑھائی ہو رہی ہے۔ اکرام تعلیم میں بہت اچھا ہے، تمام لوگ اس کی تعریفیں کرتے ہیں۔ کئی بار اسے انعامی جملوں سے نوازا گیا ہے۔ انگریزی تو ایسی فرفر بولنے لگا ہے کہ استاد حیران رہ جاتے ہیں۔ اس کی تعلیم کی رپورٹیں بھی سب سے اچھی ہوتی ہیں۔"

"اور...... اور کوئی خاص بات؟"

"نہیں، اور تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"اور ادھر راجہ سخاوت کا کیا حال ہے؟ پھر تو کبھی کوئی گڑبڑ نہیں کی اس نے؟"

"نہیں...... اوقات میں ہے۔"

"ویسے اکرام بہت دن سے ہمارے گھر نہیں آیا ہے۔ بلاؤ اسے، اپنے گھر دعوت دے دو کسی وقت کی۔"

"ٹھیک ہے...... بات کروں گا۔ اگر کوئی بہت ضروری کام نہ ہوا تو کل لے آؤں گا اس کو۔"

"ہاں دیکھ لینا، مجھے بتا دینا۔"

چنانچہ علی شاہ نے اکرام سے بات کی اور بولا۔ "اکرام! ابا جان یاد کر رہے ہیں۔"

"چلوں گا کسی دن۔"

"کسی دن کیوں...... آج ہی میرے ساتھ چلو۔"

اکرام کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ شاہ جی نے کبھی اسے اس طرح کے کاموں سے منع نہیں کیا تھا بلکہ خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے طور پر اپنی زندگی گزارے، اپنے اندر اعتماد پیدا کرلے، کہیں آتا جاتا ہے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ چنانچہ وہ تیار ہو گیا

اور چھٹی کے بعد علی شاہ کے ساتھ اپنی کار میں بیٹھ کر نادر شاہ کی حویلی کی جانب چل پڑا۔ نادر شاہ نے بڑے بھائی کو بتا دیا تھا کہ ممکن ہوگا تو اکرام آج ہی آ جائے گا۔ بہر حال دونوں چھٹی کے وقت انتظار کرنے لگے اور جب ایک انتہائی خوبصورت کار حویلی میں داخل ہوئی تو چوہدری جواد نے نادر شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ اس کی اپنی کار ہے نادر شاہ؟"

"ہاں...... میں نے ذکر تو کیا تھا ناں کہ اسی میں آتا جاتا ہے۔"

"بی ایم ڈبلیو ایک قیمتی کار ہے۔"

"آپ اس کی کوٹھی دیکھیں گے تو وہ بھی بی ایم ڈبلیو ہی ہے۔"

"ویری گڈ......" چوہدری جواد حسین متاثر ہوتے ہوئے بولے۔

کار سے علی شاہ اور اکرام ایک ساتھ اترے تھے۔ جواد حسین کی نگاہیں اس کا جائزہ لینے لگیں۔ حُسن و جمال کا مُرقع، انتہائی سڈول جسم کا مالک، نوجوانی سے جوانی کی عمر میں داخل ہو رہا تھا لیکن چہرے پر جو خون ٹھاٹھیں مار رہا تھا، لگتا تھا جیسے صحت کا سمندر موجزن ہے۔ چال میں ایک شان، ایک وقار تھا جو قدرتی تھا۔ اتنی عمر کے لڑکوں کو اپنے آپ کو سنوارنے کا ہوش نہیں ہوتا۔ لیکن جنہیں قدرت سنوارتی ہے ان کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ چوہدری جواد حسین پر بہت اچھا اثر پڑا تھا۔

"بھئی واقعی، جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔"

فاخرہ بیگم بھی ساتھ ہی موجود تھیں اور پُر اشتیاق نگاہوں سے اکرام کو دیکھ رہی تھیں لیکن جب اکرام چند قدم اور آگے بڑھا تو اچانک ہی جواد حسین نے بیوی کے بازو پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"دیکھا فاخرہ!"

"ہاں...... لیکن جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں وہ آپ نہیں دیکھ رہے۔"

"وہی تو دیکھا ہے ابھی ابھی...... اور اسی لئے تمہیں متوجہ کیا ہے۔"

"کمال ہے...... کیسی مماثلت ہے...... اتنی زیادہ کہ لگ رہا ہے شمس کا بچپن ہو۔"

"میرے دل کی بات چھین لی تم نے...... حالانکہ میں نے بچپن میں شمس کو نہیں دیکھا لیکن دعوے سے کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ وہی جسامت، وہی چال ڈھال اور وہی چہرہ۔"

خدا کی پناہ کیا چہرے اس قدر بھی ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں؟''

وہ لوگ یہ باتیں کر رہے تھے کہ اکرام ان کے پاس پہنچ گیا۔ ادب سے ان کو سلام کیا۔ چوہدری جواد حسین اور فاخرہ بیگم کی تو نگاہیں ہی اس پر سے نہ ہٹ رہی تھیں اور نادر شاہ مسکراتے ہوئے بھائی اور بھاوج کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اکرام سے مصافحہ کیا، پھر اس کے بعد چوہدری جواد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''آپ کا نام اکرام ہے...... دیکھ لیجئے ہم کس قدر آپ کے شناسا ہیں۔''

''جی......'' اکرام نے نرم لہجے میں کہا۔ چہرے سے جو شان ٹپکتی تھی وہ ہر دیکھنے والے کو متاثر کرتی تھی۔ جواد حسین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''بھئی بڑی تعریفیں سنی تھیں آپ کی اکرام! ہم نے علی شاہ سے کہا بھئی ہمیں بھی تمہارے دوست سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ چنانچہ آپ کو زحمت دے دی۔''

''مگر علی شاہ نے مجھے آپ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''یہ نالائق ہے...... خیر چلو، تھوڑا سا سرپرائز بھی رہا۔ اچانک ہی تم سے ملاقات ہو گئی۔''

ڈرائنگ روم میں سب لوگ بیٹھ گئے۔ اکرام کے اندر بے پناہ اعتماد تھا۔ نئے لوگوں کے سامنے بہر حال احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے۔ نادر شاہ نے کہا۔

''اکرام! یہ بتاؤ تھکے ہوئے آئے ہو سکول سے۔ نہاؤ دھوؤ گے یا پھر چائے کا انتظام کیا جائے؟''

''نہیں، تھکنے کا کیا سوال ہے۔ تعلیم تو شگفتگی دیتی ہے...... ہمارا تو دل چاہتا ہے کہ پڑھتے ہی رہیں مگر چھٹی ہو جاتی ہیں۔''

''بھئی کمال کی بات ہے...... بڑی مسرت ہوئی تمہاری باتیں سن کر اکرام! اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے والد صاحب کا کاروبار کیا ہے؟''

اکرام کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے الجھن کے اثرات پیدا ہوئے تھے پھر اس نے جواد حسین کو دیکھا اور کہا۔ ''والد صاحب نے اپنی ذمہ داریاں خود سنبھال رکھی ہیں، مجھ سے کہا گیا ہے کہ جب تک تعلیم مکمل نہ کر لی جائے کاروبار کے بارے میں سوچا بھی نہ جائے۔ ان کا اپنا خیال ہے کہ پہلے ایک سمت توجہ دی جائے، پھر دوسری سمت رخ کیا جائے۔''

''بہت خوب...... گویا آپ کو یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ ان کا کاروبار کیا ہے؟''

''جی ہاں...... ان کا کہنا ہے کہ تعلیم مکمل ہو جائے گی تب مجھے بتایا جائے گا کہ میرا ذریعہ زندگی کیا ہوگا۔''

''اور آپ کو خود بھی کبھی معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی؟''

''جی نہیں...... جس چیز کے تجسس سے منع کر دیا گیا ہے اس کے بارے میں تجسس کرنا میرے نزدیک ان کے حکم سے انحراف ہے اور میں اپنے والد پر مکمل اعتماد کرتا ہوں اور ان سے انحراف نہیں کر سکتا۔''

''بہت خوب...... لاہور میں آپ کے دوسرے عزیز واقارب بھی ہیں؟''

''کس کے نہیں ہوتے۔''

''اچھا اب یہ بتاؤ، چائے پیو گے یا کوئی ٹھنڈا مشروب؟'' نادر شاہ نے درمیان میں دخل دیا۔

''میرا خیال ہے چائے ہی بہتر رہے گی۔''

''ٹھیک......''

پھر اچانک فاخرہ بیگم نے کہا۔ ''آپ کے اور کتنے بہن بھائی ہیں؟''

''صرف ایک بہن ہے۔''

''کتنی بڑی ہے؟''

''بہت چھوٹی ہے ابھی۔'' اکرام چبا چبا کر جملے بول رہا تھا۔ ایک عجیب سا احساس اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا بہت اچھے لوگ تھے یہ، بہت نفیس انسان تھے مگر اپنے بارے میں انہیں بتاتے ہوئے سخت شرمندہ تھا۔ جھوٹ بولنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر مصلحت جھوٹ بول رہی تھی۔ البتہ اتنی نفاست سے گفتگو کر رہا تھا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

''رب نواز شاہ ہے تمہارے والد کا نام؟'' چوہدری صاحب نے پوچھا۔

''جی ہاں......''

''اور والدہ کا نام؟'' فاخرہ بیگم نے سوال کیا۔

''کوثر جہاں۔'' اکرام نے فوراً جواب دیا۔

''اچھا اب یہ بتاؤ اکرام میاں! کہ اگر آپ کے ابو سے ملاقات کرنا چاہیں تو کب ہو

سکتی ہے؟''

''آتے جاتے رہتے ہیں وہ۔ اگر آپ ملنا پسند فرمائیں گے تو اطلاع دے دوں گا میں۔''

''ہاں ہاں، ضرور...... ملاقات تو کریں گے۔''

''اچھا بیٹا ایک بات تو بتایئے۔'' فاخرہ بیگم نے اچانک کہا۔

''جی......؟'' اکرام نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھنے لگا۔

''کسی شمس الدین کو جانتے ہیں آپ؟ آپ کے خاندان کے کوئی فرد یا پھر آس پاس کے کوئی رشتے دار شمس الدین، نظام الدین، ظہیر الدین وغیرہ؟''

''شمس الدین...... نہیں میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔''

''کیوں...... یہ شمس الدین کون ہیں بھئی؟'' نادر شاہ نے سوال کیا۔

''نہیں، ایسے ہی ایک صاحب یاد آ گئے تھے۔'' فاخرہ بیگم بولیں۔ نادر شاہ نے جواد حسین کو دیکھا، بڑے حیران حیران سے نظر آ رہے تھے لیکن نادر شاہ ان کی حیرانی کی وجہ نہیں سمجھ پائے۔ وہ یہی سوچ رہے تھے کہ اکرام کی شخصیت نے ہی چوہدری صاحب کو متاثر کیا ہے۔ اس کے بعد چوہدری جواد حسین اکرام سے اس کے دیگر مشاغل کے بارے میں پوچھتے رہے۔ انہیں دل و جان سے یہ لڑکا پسند آیا تھا۔ فاخرہ بیگم بھی اس کی گرویدہ ہو گئی تھیں۔

اکرام نے کچھ دیر کے بعد کہا۔ ''چونکہ گھر سے اجازت لئے بغیر علی شاہ کے کہنے پر آ گیا تھا۔ زیادہ دیر ہو جائے گی تو ملازمین پریشان ہو جائیں گے۔ ویسے بھی مجھے ہدایت ہے کہ میں وقت کی پابندی کا خیال رکھوں۔ لیکن والد صاحب نے علی شاہ کے لئے خاص طور سے اجازت دے دی ہے کہ میں جب چاہوں اس کے گھر آ جا سکتا ہوں...... تاہم زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکوں گا، اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔''

''تو بھئی ایسا کرو کہ کل گھر سے اجازت لے کر آنا اور دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھانا۔ اور اتفاق سے اگر والد صاحب سے رابطہ ہو جائے تو ان سے ملاقات ضرور کروانا ہماری۔ بیٹے وعدہ کرتے ہو؟''

''جی...... ضرور......'' اکرام نے جواب دیا اور اس کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ تمام ہی افراد

اکرام کو چھوڑنے باہر تک آئے تھے۔ اس نے ان سب کو سلام کیا اور کار میں جا بیٹھا۔ بہت زبردست اثر چھوڑا تھا اس نے سب لوگوں پر۔ کچھ دیر بعد جواد حسین نے کہا۔

''بخدا ایسی شخصیت بہت عرصے کے بعد دیکھی ہے۔ چھوٹی سی عمر کا لڑکا ہے لیکن اپنی زبان خود بولتا ہے۔ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ مستقبل میں اس کی شخصیت بہت سی عظمتوں کی حامل ہو گی۔ میں نے بھی زندگی تجربات میں ہی گزاری ہے۔''

''آپ سے ایسے ہی تو اس کا تعارف نہیں کرایا تھا بھائی جان۔''

''مگر یار! ایک بات، ایک انکشاف میں جو تم پر کروں گا اس بات سے تم بھی حیران رہ جاؤ گے...... ذرا اپنی بھابی سے پوچھو۔'' چوہدری جواد حسین نے اندر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''خیریت بھابی...... کیا بات ہے؟''

''کیا بتاؤں، اس قدر اچنبھے میں پڑ گئی ہوں کہ زبان سے الفاظ نہیں نکلتے۔''

''ایسی کیا بات ہو گئی؟'' نادر شاہ نے سوال کیا۔

''ہم نے ابھی ابھی اس سے کسی شمس الدین کے بارے میں پوچھا تھا۔''

''جی ہاں...... بات سمجھ میں نہیں آئی تھی میری۔''

''کیا تم یقین کرو گے نادر شاہ! کہ اس بچے کا ایک ہم شکل، اتنا ہم شکل کہ اگر اس لڑکے کو داڑھی مونچھیں لگا دی جائیں تو یہ شمس الدین بن جائے۔ میرا بہت گہرا دوست ہے۔ بہت گہرا اور بہت اچھا...... تفصیل بتاؤں گا تمہیں کسی وقت۔ لیکن یہ لڑکا اس قدر ہم شکل ہے اس کا کہ دیکھنے والی آنکھ کو یقین نہ آئے۔''

''دلچسپ بات ہے...... ویسے یہ بات تو طے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کی سات سات شکلیں بنائی ہیں۔''

''بے شک بنائی ہیں...... لیکن تھوڑی بہت تفریق بھی رکھی ہے۔ بس اتنا فرق ہے اس میں اور شمس الدین میں کہ یہ نوعمر ہے اور شمس الدین کی عمر اچھی خاصی ہو گئی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں یارک شائر سے لندن آیا تھا۔ بہت ہی اعلیٰ درجے کا انجینئر ہے وہ...... لیکن بے چارے کو دماغی دورے پڑتے ہیں۔ اتنا نفیس انسان کہ میں بتا نہیں سکتا۔''

''دماغی دورے کس قسم کے ہوتے ہیں؟'' نادر شاہ نے سوال کیا۔

"بس کچھ عجیب وغریب سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ پانچ دن میرے پاس رہا۔ کہیں اور جا رہا تھا۔ پورا بھراپُرا خاندان ہے، یہیں شیخوپورہ سے تعلق ہے اور یہاں کے زبردست لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عجیب وغریب داستان ہے اس کی۔ سناؤں گا کسی وقت۔"

"جس انداز میں آپ یہ بتا رہے ہیں کہ اکرام اس کا ہم شکل ہے تو یہ واقعی حیران کن بات ہے۔ لیکن ایسے اتفاقات زندگی سے الگ تو نہیں ہوتے۔"

"ہاں...... میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شخصیت کے لحاظ سے وہ بھی اس قدر شاندار نہیں تھا۔ اس لڑکے میں تو اب اس چھوٹی سی عمر میں ہی ایسی بات ہے جسے لفظوں میں بیان کرنے کی بجائے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔" فاخرہ بیگم نے کہا۔

"میں تو واقعی بڑی متاثر ہوئی ہوں اس سے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہماری کاوش بھرپور ہے؟ یعنی ہم نے جو سوچا اس کا ایک حصہ تو بالکل تکمیل تک پہنچ گیا ہے۔" فاخرہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا اور سب ہنسنے لگے۔ پھر چوہدری جواد حسین نے کہا۔

"بھئی سچی بات ہے، میں نے تو یہ صرف اس لئے کیا تھا کہ تم لوگوں کے علم میں رہے۔ اب بھئی مجھے کیا معلوم کہ شبانہ کے لئے اتنے سوچنے والے موجود ہیں۔ بہرحال ظاہر ہے تم لوگ اس کے اپنے ہو...... ویسے ابھی تو یہاں ہوں کافی دن تک۔ رب نواز شاہ صاحب سے ملاقات کا خاص طور سے بندوبست کیا جائے۔ ویسے کبھی ان سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے؟"

"نہیں، ابھی نہیں۔ لیکن اب تو کرنا ہی پڑے گی۔"

بہرحال کافی دیر تک وہ اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اتنا ہی متاثر کیا تھا اکرام نے ان لوگوں کو۔ حالانکہ زیادہ عرصہ پرانی بات نہیں تھی، ہیرا منڈی میں ایک طوائف زادے کی حیثیت سے اسے بہت سے لوگ جانتے تھے۔ اس کی اپنی شخصیت بری طرح کچلی ہوئی تھی۔ تقدیر ایسا کھیل کھیلتی ہے۔ ایک زخمی نے اپنے جیسے ایک اور زخمی کو دیکھا جس کے گھاؤ ابھی گہرے نہیں تھے اور اس نے اسے کیچڑ سے اٹھا لیا۔ وہ کیچڑ کا پھول تھا، چوٹ کھائے ہوئے اور رب نواز شاہ نے اس کی زندگی سے وہ داغ دھونے کی کوشش کی تھی جو اس کی اپنی شخصیت پر لگا ہوا تھا۔ اب یہ کوشش کس قدر کارگر تھی، یہ رب نواز شاہ

نہیں جانتا تھا۔ لیکن اپنے جیسی کوشش ضرور کر رہا تھا وہ۔

○●○

مختلف قسم کے واقعات مل کر ہی وقت کی تحریر بنتے ہیں۔ یہاں تذکرہ چونکہ صرف ہیرا منڈی کی زندگی کا ہے اس لئے بات یہیں سے شروع ہو کر یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ ادھر شمشیرہ بیگم کی زندگی اپنے مخصوص انداز میں گزر رہی تھی۔ ادھر رب نواز شاہ اور بہت سے متعلقہ لوگ۔ غلام شاہ بے چارے کا درد یہ تھا کہ وہ حاجو کو عیش کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بہت بڑی رقم ہاتھ آئی تھی لیکن غلطی سے نکل گئی تھی۔ اور اس کے بعد غلام شاہ نے کون سی جگہ تلاش نہیں کی تھی اور کیا کیا کچھ نہیں کیا تھا...... چنانچہ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ رقم خود اسی کے کمرے میں چھپی ہوئی ہو گی۔ حاجو نے بلاشبہ زندگی کا ایک بہت بڑا کام کیا تھا لیکن جو کچھ ہو رہا تھا وہ ناقابل یقین سا ہی تھا۔ شمشیرہ بیگم نے غلام شاہ کی صورت دیکھی تو رحم آ گیا۔

"ارے غلام شاہ! یہ تمہاری تھوتھنی بلی جیسی کیوں ہوتی جا رہی ہے...... آخر کیا مصیبت نازل ہوئی ہے تم پر؟"

"نہیں شمشیرہ بیگم! دعائیں ہیں تمہاری۔ بس ذرا سا دل دکھا ہوا ہے۔"

"آخر کیوں؟"

"دو کوڑی کا کر کے رکھا ہے تم نے...... نہ عزت، نہ توقیر۔ جو خاندانی میراثی ہیں، جن کا کوئی ماضی نہیں ہے ان کو تو سر پر بٹھا رکھا ہے اور ہم جو اپنا خاندان ترک کر کے، اپنے آپ کو بھلا کر تمہارے قدموں میں زندگی گزار رہے ہیں اس کی کوئی قدر ہی نہیں ہے۔"

"حاجو کی بات کر رہے ہو ناں تم؟"

"تو اور کس کی کریں...... تمہارا گھر لٹتا ہے شمشیرہ بیگم تو سینہ غلام شاہ کا ہی جلتا ہے۔ کھانے کمانے والے تو بہت سے ہیں جو طرح طرح سے بے وقوف بنا کر کھاتے ہیں۔ مگر سچی مانو تو یہ مکھن شاہ کا قصہ ہماری سمجھ میں آیا ہی نہیں...... یہاں کہیں بھی کسی مکھن شاہ کا وجود نہیں ہے۔ اگر کوئی تمہیں مکھن شاہ کے نام سے ملا تھا تو اب وہ لاہور میں نہیں ہے۔"

"اے غلام شاہ! دیکھو، احتیاط سے بات کرو۔ کچھ ہوا تو ہے۔ اب تم خود سوچو، کتنا عرصہ ہو گیا شاہ جی کو اس علاقے میں آئے ہوئے۔ کبھی ہمارے گھر کا چکر لگایا؟ اور وہ بھی

ایسے دولت سے لدے پھندے؟ اور غلام شاہ! تم ہی جانو، میری تو ایک ہی آرزو ہے، اس موذی کو موت مروڑ کر لے جائے۔ ایسے خوبصورت گھر میں بیٹھا ہوا ہے جس کے خواب میں نے دیکھے تھے۔ اسے وہ سب کچھ مل گیا غلام شاہ جو مجھے ملنا چاہئے تھا۔ خیر اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔ کوثر جہاں اگر شاہ جی کے منہ چڑھ گئی تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا تھا غلام شاہ! میں تو اس سب کو مکھن شاہ کی کرامت ہی سمجھتی ہوں۔ اب تم بتاؤ، حاجو کو ایسے کیسے نظروں سے گرا دوں...... اتنا بڑا کام کروایا ہے اس نے میرا۔"

"تو اطمینان رکھئے شمشیرہ بیگم! آپ کا کام تمام بھی وہی کرائے گا۔"

"دیکھو، پھر لعنت بھری باتیں کیں تم نے...... آ گئے نا اپنی اوقات پر۔" شمشیرہ بیگم دہل کر بولیں۔

"عقل سے کام لیتا ہوں، اونچ نیچ سوچتا ہوں، ہر اچھے برے پر غور کرتا ہوں۔ میں تو حیران ہوں کہ اب تک تجربہ نہیں ہوا آپ کو شمشیرہ بیگم! فرض کر لیں کہ اپنے شاہ جی کوثر جہاں سے عشق کرنے لگے اور فرض کر لیجئے انہوں نے ایک عالیشان کوٹھی خرید کر کوثر جہاں کو دے دی اور پھر خود بھی اس کوٹھی میں رہنے لگے تو آپ کو کیا ملا...... آپ کا کوٹھا تو ویران ہو گیا ناں۔"

"کیا بک رہے ہو غلام شاہ؟" شمشیرہ بیگم خوفزدہ ہو گئیں۔

"ماضی سے آپ کا رشتہ جوڑ رہا ہوں شمشیرہ بیگم...... یہ بتائیے دلدار گھوڑے کو گھوڑے پر سے کس نے اتارا تھا؟ بارات لے کر آیا تھا ناں وہ کوثر جہاں کو لے جانے کے لئے؟ یہ شاہ جی ہی تھے جس نے اسے مرغا بنا دیا۔"

"ہاں......"

"اور دوسرے بدمعاشوں کو کس نے مارا، شاہ جی نے ناں؟"

"تت...... تت...... تو...... کہنا کیا چاہتا ہے؟"

"فرض کرو اگر شاہ جی اپنی محبوبہ کو یہاں سے لے جانے کی کوشش کرتے ہیں تو کس سے فریاد کرو گی شمشیرہ بیگم؟ پولیس سے، جو شاہ جی کے گھر آ کر واپس لوٹ جاتی ہے یا کوئی بدمعاش تمہارے قبضے میں ہے جس سے تم شاہ جی کا راستہ رکوا دو گی؟ شمشیرہ بیگم! وہ تو جو

کچھ خرچ کریں گے، وصول کر لیں گے اور وصولیابی پتہ ہے کیا ہو گی؟ بیٹا تو ہے ہی ان کے پاس...... ماں اور بیٹی بھی ان کے پاس پہنچ جائیں گی اور تم رہ جاؤ گی تالیاں بجاتی ہوئی۔ غلام شاہ کا دماغ بہت دور تک سوچتا ہے اور بہت دور تک دیکھتا ہے۔"

شمشیرہ بیگم کا رنگ فق پڑ گیا تھا...... پھٹی پھٹی آنکھوں سے غلام شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر ان کے منہ سے نکلا۔ "خدا تمہارا بیڑا غرق کر دے...... تم تو ہو اسی قابل کہ تمہیں دن رات کوسا جائے۔ ہائے، ہیضے میں آ کر مرو...... کسی کی آئی تمہیں آ جائے۔ خوش نہ رہنے دینا۔"

"خوش رہو شمشیرہ بیگم! تمہاری خوشی ہمیں بہت عزیز ہے۔ ہم تو ہر بد دعا کے جواب میں دعا ہی دیتے رہیں گے۔"

"ہائے تو پھر کیا کروں میں؟" شمشیرہ بیگم سینے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"کچھ نہ کرو...... آرام سے بیٹھی تماشا دیکھتی رہو۔ ہمیں گالیاں اور کوسنے دیتی رہو اور انہیں سر پر چڑھاتی رہو جو تمہاری گردن پر چھری پھیر دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر غلام شاہ تو باہر نکل گئے۔ شمشیرہ بیگم آنکھیں اور منہ پھاڑے سوچ میں ڈوبی رہیں۔ بات تو بالکل ٹھیک کہی تھی غلام شاہ نے۔ اگر رب نواز شاہ نے اس قسم کا لین دین کیا تو اس کے بعد وہ خود کو کوثر جہاں کا حقدار بھی قرار دیں گے۔

"اے میرے مولا...... میں اِدھر کی رہی نہ اُدھر کی...... اب میں کیا کروں؟"

○●○

راجہ شرافت علی میں اور کوئی خوبی ہو یا نہ ہو لیکن دولت خرچ کرنے میں جی دار تھا۔ حواری بدنصیب تھے کہ موقع سے فائدہ اٹھانے کی بجائے خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ بہر حال اس کے دونوں ساتھی نواب دین اور حیات خان اور تیسرے کلیم شاہ ہر طرح سے ان کے ساتھ تھے اور خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ان سارے چکروں میں اچھی خاصی رقم کما لی تھی۔ ایک علاقے میں خوبصورت سا مکان لے کر اس میں سارا ساز و سامان بھروا لیا گیا تھا۔ راجہ شرافت کو اس بات کی بالکل پرواہ نہیں تھی کہ کتنی رقم خرچ ہو رہی ہے۔ بس جی کو لگی ہوئی تھی۔ وہ کچھ کر ڈالنا چاہتا تھا اور انہی کوششوں میں مصروف تھا۔ مکان کا بندوبست ہونے کے بعد لاہور کے ایسے بدمعاشوں کی تلاش شروع ہوئی جو دوسروں کے لئے کام

کرتے تھے۔ معلومات کرنے سے پتہ چل گیا کہ کون کون شاہ جی کے سامنے جوتے کھا کر آ چکا ہے۔ کچھ کے بارے میں تو یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہ جی سے ٹانگیں تڑوا کر لاہور ہی سے بھاگ گئے تھے۔ دلدار گھوڑے کا نام ونشان نہیں ملا تھا۔ گویا پہلوان اس طرح دُم دبا کر بیٹھ گیا تھا کہ اس کی شکل دوبارہ کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ ویسے اب رب نواز شاہ کا نام بھی لاہور کے بدمعاشوں کی زبان تک پہنچ چکا تھا اور اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔ بے شک شاہ جی بدمعاشی کا اڈہ نہیں چلا رہے تھے لیکن ہیرا منڈی سبھی کا راستہ تھا اور یہ دیکھا گیا تھا کہ ہیرا منڈی میں داخل ہونے والے بڑے بڑے بدمعاش احتیاط برتنے لگے تھے اور یہاں شاہ جی کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ بہرحال جب ایک جگہ ان لوگوں نے بات کی تو صاف انکار کر دیا گیا کہ لچے لفنگوں سے جھگڑا مول لینے کے لئے تیار نہیں ہیں ہم لوگ۔ البتہ لاہور ہی کے ایک گوشے میں لاگھا مداری مل گیا۔ نیا نیا ابھرا تھا اور فی الحال اپنے علاقے تک ہی محدود تھا۔ مخصوص علاقے کے ایک مکان میں رہتا تھا۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں تو نواب دین اور حیات خان اس کے پاس پہنچ گئے۔ لاگھا مداری کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ چہرے مہرے کا بھی اچھا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں نے البتہ اسے خوفناک بنا دیا تھا۔ بڑا بڑبولا تھا۔ ان دونوں کو اپنی دانست میں خونی نگاہوں سے دیکھا تو حیات خان نے کہا۔

''تمہارے پاس کام سے آئے ہیں استاد!''

''بولو، بولو...... دس پانچ قتل کرانے ہیں، کسی کو اٹھوانا ہے، ناک کٹوانی ہے کسی کی، سر منڈوانا ہے، کیا کام ہے، منہ سے پھوٹو؟''

''لاگھا جی! بہت بڑا کام ہے...... مال آپ کی پسند کا۔''

''بولو...... اور کام بتاؤ۔ مداری ایسی جادو کی چھڑی گھمائے گا کہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔ یہ بتاؤ آئے کہاں سے ہو؟''

''ایک بہت بڑے جاگیردار ہیں راجہ شرافت علی خان...... انہیں تم سے ایک بہت ضروری کام لینا ہے اور کام یہ ہے کہ ہیرا منڈی میں ایک رب نواز شاہ جی رہتے ہیں، بہت بڑے بدمعاش بنتے ہیں، صرف انہیں نیچا دکھانا ہے۔''

''بس...... ابے ہماری شان کے مطابق کوئی کام لاتے۔ الو کی لکڑی گھمانی ہوتی کسی پر

تو بتاتے۔ کون ہے یہ ہیرا منڈی کا بھڑوا...... ہمیں دکھا دینا، ٹھیک کر دیں گے۔ کوئی بڑی بات ہو تو بتاؤ۔''

''آپ نے کبھی ان کا نام سنا ہے، دیکھا ہے کبھی انہیں؟''

''دیکھ لیں گے، ابھی تک نہیں دیکھا ہے تو۔ آخر لاہور پر قبضہ جمانا ہے۔''

''یہ سمجھ لیں لاگھا جی کہ اگر آپ نے یہ کام کر دیا تو منہ مانگا انعام ملے گا۔''

''یہ راجہ صاحب کدھر ہیں؟''

''ان سے ملا دیں گے آپ کو۔''

''ٹھیک ہے...... سپاری لائے ہو؟''

''ملاقات کے فوراً بعد سپاری دے دی جائے گی آپ کو...... راجہ صاحب پیسوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ ویسے آپ کے ساتھ کتنے بندے ہیں؟''

''دس ہزار...... پورے دس ہزار۔'' لاگھا مداری نے کہا اور ان دونوں کی آنکھیں شدتِ حیرت سے پھیل گئیں۔

''دس ہزار؟''

''ہاں...... اپنے منہ سے نہ بول پڑو کہ دس ہزار ہیں کہ نہیں ہیں تو میرا نام نہیں۔ ابے آئیو، کہاں مر گیا دمڑی کے...... بلا کے لائیو ساروں کو۔'' لاگھا مداری نے کہا اور دس آدمی آ کر کھڑے ہو گئے۔ لاگھا مداری نے فخریہ انداز میں گردن اکڑا کر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پورے دس ہزار ہیں...... جب جی چاہے آزما لینا۔ جو زبان سے کہہ دیا وہ سمجھو پتھر کی لکیر۔ قسم لکڑی کی، جس کے سر پر گھوم جائیں، سر گھما کر رکھ دیں۔''

''یہ دس ہیں۔''

''ایسے مت بول...... ایسے مت بول۔ واپس جانا مشکل ہو جائے گا۔ میرا کوئی قصور نہیں ہوگا۔'' لاگھا مداری نے حیات خان کے لہجے کا کسی قدر برا مانتے ہوئے کہا۔

''نہیں، نہیں لاگھا جی...... ہمارا یہ مطلب نہیں ہے...... یہ سب آپ کے ساتھی ہیں؟''

''تو اور کیا...... نظر نہیں آ رہے؟''

''تو پھر ٹھیک ہے...... اب آپ یہ بتائیے کہ راجہ صاحب سے کب مل رہے ہیں؟''

''انہیں یہاں لے آؤ...... ہم کسی سے ملنے نہیں جاتے۔''

''نہیں لاگھا جی! اچھی دوستی کے لئے، اچھے تعلقات کے لئے تھوڑا سا اصولوں کو ترک بھی کرنا پڑتا ہے۔ آپ ان سے مل لیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔''

''دوستی کی بات ہے تو پھر ٹھیک ہے...... چلو چلتے ہیں۔''

حیات خان اور نواب دین، لاگھا مداری کو راجہ شرافت علی کے پاس لے کر پہنچ گئے۔ راجہ شرافت علی نے اس کا جائزہ لیا اور بولا۔

''رب نواز شاہ سے ٹکرا سکتے ہو؟''

''دیکھو بھا جی! توہین مت کرو ہماری...... کام بتا دو کام۔ اس کے بعد دیکھ لینا لاگھا مداری کو۔''

''ٹھیک ہے...... یہ سپاری لو اور کوئی ایسا منصوبہ بناؤ جس سے ہمارا کام ہو جائے۔''

راجہ شرافت علی نے رومال میں نوٹوں کے تین بنڈل مداری کی طرف بڑھا دیئے۔ لاگھا اتنا بڑا بدمعاش تھا یا نہیں لیکن رقم کے سلسلے میں اسے اندازہ تھا کہ کتنی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بولا۔

''کوئی منصوبہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے، چہرہ کرا دو، ایک بار دکھا دو کون سے ہیں یہ شاہ جی۔ ساری اکڑفوں نہ نکال دوں تو پھر مداری کی لکڑی بے کار۔''

''ایسا کرتے ہیں کہ ہم ہیرا منڈی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ اپنے آدمیوں کو آپ ہیرا منڈی میں چاروں طرف پھیلا دیں اور پھر شاہ جی نظر آ گئے تو ہم آپ کو ساری تفصیل بتا دیں گے۔''

''ایسے کرلو...... شاہ جی کے ساتھ کتنے بندے ہیں؟'' لاگھا مداری نے پوچھا۔

''صرف چار۔''

''دھت تیرے کی...... اور اس کے لئے تم ہمارے دس ہزار آدمی لے کر جا رہے ہو؟''

''دس ہزار......؟'' راجہ شرافت علی نے چونک کر پوچھا۔

''دس آدمی ہیں...... جنہیں لاگھا صاحب دس ہزار کہتے ہیں۔''

''اور ادھر رب نواز سمیت پانچ آدمی۔ ہمارے پاؤں میں یہ چپل دیکھ رہے ہو ناں، اگر اسی سے مار مار کر پانچوں کا بھیجہ نہ بہا دیں تو پھر مداری مت کہنا، کسی گھاس کھودے کی اولاد کہہ دینا۔ دس آدمیوں کو تکلیف مت دو...... ہم اکیلے ہی سب کچھ دیکھ لیں گے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں...... لیکن کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن میں ذرا سی مصلحت سے کام لینا پڑتا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ تعاون کر رہے ہیں ناں؟''

''ہاں بھئی...... سپاری لے لی ہے تو اب ایسی کیا بات ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔''

''منصوبہ کیا ہے راجہ صاحب؟''

''بس ذرا منصوبہ بدل لیا ہے...... ہیرا منڈی کے چکر لگائیں گے۔ شمشیرہ بیگم ہی کا تو کوٹھا نہیں ہے وہاں، اور بھی بہت سی ہیں۔ دیکھتے ہیں شاہ جی ہمارا راستہ روکتے ہیں یا نہیں۔''

''مجال ہے ان کی۔ کوٹھا کیا ان کے باپ کا ہے؟ کیسے روکیں گے راستہ؟ وہاں آنے جانے والوں کا راستہ روکا جاتا ہے کیا؟''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ ہیرا منڈی کا چکر نہیں لگاتے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو چاند۔ سالیاں خود لڑھکتی پھڑکتی چلی آتی ہیں ہمارے پاس...... ہمیں جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ خیر تمہاری وجہ سے چلیں گے۔ کب چل رہے ہو؟''

''آج کا کام کل پر کیوں چھوڑا جائے۔''

''ٹھیک ہے...... چھ بجے پہنچ جائیں گے تمہارے پاس۔''

''ٹھیک ہے......''

راجہ شرافت علی نے لاگھا مداری اور اس کے ساتھیوں کی خوب خاطر مدارت کی اور اس کے بعد لاگھا مداری چلا گیا۔ راجہ صاحب کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے۔

''نواب دین تعریف تو بہت کی ہے تم نے اس کی...... کیا یہ شخص کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے؟''

''جوان خون ہے راجہ صاحب...... میرا خیال ہے کچھ کر ہی دکھائے گا۔ مگر آپ کا پروگرام اچانک کیسے بدل گیا...... کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''میں بھی ایک لمبا داؤ کھیلنا چاہتا ہوں۔ پہلے دو چار بار ہیرا منڈی میں آنا جانا ہو

جائے، شاہ جی کو پتہ چل جائے کہ میں وہاں آنے جانے لگا ہوں۔ پہلے یہ دیکھوں گا کہ اب وہ خود ہمارے راستے میں آتے ہیں یا نہیں...... اگر ایسا ہوا تو کام کرنے میں آسانی ہو گی۔ انہیں ٹھکانے لگا دوں گا اور پھر دیکھوں گا اس کوثر جہاں کو جو بڑی پاک دامن بنتی ہے۔''

''ٹھیک ہے...... جیسی آپ کی مرضی۔'' نواب دین نے شاہ جی سے اتفاق کر لیا۔

بہرحال لاگھا داری زبان کا پکا تھا۔ ٹھیک چھ بجے پہنچ گیا۔ بڑا سجا بنا تھا۔ کہنے لگا۔

''قسم اُلو کی لکڑی کی...... پہلی بار کوٹھے والوں کی طرف جا رہے ہیں، کہیں پھنس نہ جائیں۔''

''کیا مطلب......؟'' راجہ شرافت علی نے چونک کر پوچھا۔

''اب ذرا دیکھ لو، جوان آدمی ہیں اور ذرا دل پھینک بھی ہیں...... ہمارے ساتھی تو ہمیں یہی کہتے ہیں، چلو خیر جو کچھ ہوگی، دیکھی جائے گی۔''

راجہ شرافت علی نے عجیب سی نگاہوں سے لاگھا داری کو دیکھا تھا۔ بہرحال تیار تو سب ہی ہو چکے تھے۔ لاگھا نے واسکٹ کی جیبوں میں چار چاقو لگائے ہوئے تھے اور ان چاقوؤں کی بڑی بڑی داستانیں ہانکنے لگا۔ راجہ شرافت علی کو کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ بڑبولا کہیں لٹیا ہی نہ ڈبو دے۔

بہرحال، ہیرا منڈی پہنچ گئے۔ شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر جانے کی جرأت تو نہ تھی، البتہ ایک دوسری گانے والی کا نام کانوں تک پہنچا، چنانچہ وہاں پہنچ گئے۔ گلبہار نے نئے آنے والے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور راجہ صاحب نے وہاں اچھی خاصی رقم خرچ کی۔ دولت لٹانے کا شوقین تھا اور ہیرا منڈی تو صحیح معنوں میں ایسے ہی لوگوں کا انتظار کرتی ہے۔ گلبہار نے سر آنکھوں پر بٹھایا اور ساری ادائیں ان پر لٹانے لگی۔ لیکن کوثر جہاں جیسی بات کہاں۔ راجہ شرافت نے اس بات کا پوری طرح اندازہ لگا لیا تھا کہ کوثر جہاں درحقیقت ہیرا منڈی کی رونق ہے۔

اور اس کے بعد وہ وہاں آنے جانے لگے۔ وقت یہ احساس دلا رہا تھا کہ ہیرا منڈی میں کوثر جہاں کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ نئے نئے کوٹھے دیکھے لیکن کہیں بھی کوثر جہاں جیسی بات نہ پائی۔ آتش شوق اور بھڑک اٹھی تھی۔ اس دوران لاگھا داری، شاہ جی کے بارے

میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ رقمیں ہاتھ آ رہی تھیں، بھلا اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ شاہ جی کے ڈیرے میں جا گھسے۔

آخر کار راجہ نے اس سے مشورہ کیا۔

''ہاں بھئی، ہیرا منڈی میں جا کر گانے تو بہت سے سن لئے، اب یہ بتاؤ کہ شاہ جی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''بس فوج لے کر جاتا ہوں اور پکڑ لاتا ہوں...... ان کا فیصلہ آپ خود کریں۔''

راجہ شرافت علی سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا۔ ''ایسا کر سکتے ہو؟''

''اور کیا جھک مارنے کے لئے وہاں پر آتے جاتے رہے ہیں؟''

''یہ تو سب سے اچھی بات ہے۔ ایسا ہی کرو۔ رب نواز شاہ کو اس کے چاروں آدمیوں سمیت اس کے ڈیرے سے پکڑ لاؤ۔ جو مانگو گے دوں گا۔''

''سوچ لو راجہ جی...... جو کہا ہے کرنا پڑے گا۔''

''راجہ شرافت علی نام ہے میرا...... کیا سمجھے؟''

''تو بس پھر ٹھیک ہے...... سمجھ لو، رب نواز تمہارے قدموں میں پہنچ گیا۔ اب تم انتظار کرو۔'' لاگھا داری چلا گیا اور راجہ شرافت علی سوچ میں ڈوب گیا۔ سامنے ہی حیات خان نظر آیا تو اس سے کہا۔

''ہاں بھئی، کیا کہتے ہو؟''

''لگ رہا ہے کام دکھا دے گا۔''

''تمہارے منہ میں گھی شکر۔'' راجہ شرافت علی نے کہا۔ نجانے کیا کیا منصوبے اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ پھر اس نے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ...... سلوک کیا، کیا جائے اس کے ساتھ؟''

''یہ تو سوچنے کی بات ہے...... اُس وقت معاملہ دوسرا تھا مگر اب میدان ہمارے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے سر گنجے کئے تھے ہمارے۔ ہم انہیں ختم بھی کر سکتے ہیں مگر جان سے مار دینے میں وہ مزہ نہیں ہوگا۔ مزہ تو تب ہے کہ مرتے رہیں بار بار۔ اور ایک ہی ترکیب ہے اس کی۔''

''وہ کیا......؟''

’’سر تو گنجے کرنے ہی ہیں ان کے۔ مگر ناکیں بھی کاٹیں گے۔‘‘

’’خدا کی قسم کیا بات دماغ میں آئی ہے۔ پانچ نکٹے جدھر سے گزریں گے لوگ دیکھیں گے۔ انہیں یہ تو معلوم نہیں ہوگا کہ ان کا راز کیا ہے مگر یہ نکٹے راجہ شرافت علی کا نام کبھی نہیں بھول سکیں گے۔‘‘

’’واہ راجہ صاحب واہ...... بات تو بڑی زبردست ہے۔‘‘ حواریوں نے مکھن لگایا۔

’’اب تو بے چینی سے انتظار ہے۔‘‘

راجہ شرافت علی خوش آئند خیالات میں کھو گیا۔

○●○

ان دنوں لاہور کے موسم نے لاہوریوں کو تحفہ دے رکھا تھا۔ بادلوں بھرا آسمان، وقفے وقفے سے پڑنے والی مدھم مدھم پھواریں، نہر کے کنارے سبزہ زاروں پر ابلنے والا حُسن...... شاہ جی بڑے خوش تھے ان دنوں۔ گھومنے پھرنے کا پروگرام بنا اور کھلی سڑکوں پر نکل پڑے۔ ساتھی ساتھ موجود تھے۔ اکرام کی کوٹھی کی جانب رخ تھا۔ بہرحال اس وقت بھی سب کے سب بڑی خوشگوار باتیں کر رہے تھے۔ گاڑی ایک سنسان سڑک سے گزر رہی تھی کہ عقب سے ایک اور بڑی ویگن آتی ہوئی نظر آئی۔ پھر ایک ایسا علاقہ سامنے آ گیا جو اپنی ویرانی کی وجہ سے مشہور تھا تو اچانک ہی پیچھے والی ویگن کی رفتار تیز ہو گئی اور شاہ جی چونک کر اس ویگن کو دیکھنے لگے۔ کھٹارہ سی ویگن تھی لیکن پرانے زمانے کی تھی اور مضبوط تھی۔ اچانک ہی ویگن نے راستہ روکا تو شاہ جی نے چونک کر کہا۔

’’کیا ہوا...... کیا بات ہے؟‘‘

گاڑی اس وقت شالے خان ڈرائیو کر رہا تھا، کہنے لگا۔ ’’پتہ نہیں کون کتیا کا جنا ہے...... وہ دیکھئے، آگے والی گاڑی ترچھی ہو کر رک گئی ہے جیسے ہمارا راستہ روک رہی ہو۔‘‘

شاہ جی نے گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دوسری ویگن سے کئی آدمی نیچے اتر آئے تھے ان میں سب سے آگے ایک نوجوان لڑکا تھا۔ جوانی کی عمر، چہرہ اگر مونچھوں کے بغیر ہوتا تو اچھا لگتا۔ آنکھوں میں سُرمہ، ہونٹوں پر پان کی دھڑی...... عجیب سی شکل تھی، لچا لفنگا ہی لگ رہا تھا۔ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ شاہ جی نے دلچسپی سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور بولے۔

’’گن کر آئے ہیں کمبخت مارے...... مگر چاہتے کیا ہیں ذرا دیکھو تو سہی۔‘‘

اس سے پہلے کہ کوئی نیچے اترتا، وہ خود ہی آگے بڑھا اور گردن خم کر کے بولا۔ ’’شاہ جی کی خدمت میں لاگھا مداری کا سلام۔ ذرا نیچے اتر آیئے، شاہ جی سے گلے ملنا ہے۔ کون ہے تم میں سے رب نواز شاہ؟‘‘

"مداری......لاگھا مداری......؟"

"ہاں جی......لاگھا مداری۔ ذرا لکڑی گھمائی ہے آپ کے سر پر۔"

شاہ جی نیچے اتر آئے، دونوں ہاتھ کمر پر رکھے۔ ہوشیار رہنا ضروری تھا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ ادھر لاگھا سینہ تانے ان لوگوں کو گھور رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"آپ لوگوں میں سے رب نواز شاہ کون ہے؟"

"کام کیا ہے مداری جی؟" دلبر خان نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"آپ ہیں شاہ جی۔"

"نہیں بھائی......میری یہ جرأت کہاں۔ وہ کھڑے ہوئے ہیں شاہ جی۔ کام کیا ہے؟"

"بس ذرا مہمان بنا کر لے چلنا ہے آپ لوگوں کو۔ آپ سے کچھ کام ہے۔"

"اچھا...... یہ اچھی مہمان داری ہے بھائی۔ ایک تو بغیر ڈگڈگی کے سامنے آگئے۔ ابے اگر مداری ہو تو بانسری اور ڈگڈگی ہاتھ میں لے کر سامنے آؤ۔ ویسے جانا کہاں ہے؟"

"آپ کہاں تکلیف کریں گے...... ہم لوگ خود آپ کو لے جاتے ہیں۔ بس تھوڑے سے ہاتھ پاؤں توڑ دیتے ہیں، پھر اطمینان سے کپڑا منہ میں ٹھونسیں گے، ہاتھ پاؤں پیچھے باندھیں گے اور لے جائیں گے۔ اب بے چاری دو دو گاڑیوں کو کہاں تکلیف دینی ہے۔ آپ لوگوں کو ہماری اس ویگن میں چلنا ہوگا۔"

شاہ جی کان کھجانے لگے۔ ایک نگاہ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر بولے۔ "مداری جی! اگر لے جانے کا ارادہ بدل دو تو کوئی حرج ہے؟ ہم تمہارے ساتھ جانے سے منع تو نہیں کر رہے۔"

"نہیں جی، یہی تو جادو کی لکڑی ہوتی ہے جو مداری کے ہاتھ میں ہے۔ آپ جس کے سامنے پہنچیں گے اس کی پسند کے مطابق پہنچیں گے۔ یہی ہمارا فن ہے۔"

"اچھا چلو پھر ٹھیک ہے۔ مگر ہاتھ پاؤں کس چیز سے توڑو گے؟"

"یہ تو ہم بتا دیں گے۔" لاگھا مداری نے کہا اور ان میں سے ایک آدمی نے ویگن کے نچلے حصے میں رکھے ہوئے لمبے لمبے ڈنڈے نکال لئے۔

"ابے لو، یہ تو ہر طرح سے تیار ہو کر آئے ہیں...... مگر بھائی یہ تو بتا دو، قصہ کیا ہے...... ہماری تم سے دشمنی کب ہوئی؟ پہلے کبھی تمہیں دیکھا بھی نہیں ہے، تعارف نہیں کراؤ گے؟"

"تعارف بھی ہو جائے گا اطمینان سے۔" لاگھا مداری نے نیفے میں سے چاقو نکال لیا اور اسے بڑی مہارت سے ہاتھوں میں گھمانے لگا۔ شاہ جی کی آنکھیں اس کے چاقو پر جمی ہوئی تھیں۔ باقی اس کے ساتھیوں نے ڈنڈے سنبھال لئے تھے۔ لاگھا مداری نے کہا۔

"جو یہ لوگ کریں انہیں خاموشی سے کرنے دینا۔ ورنہ یہ چاقو یہ نہیں دیکھے گا کہ سینہ کس کا ہے۔"

"چلو ایک چاقو کسی کے سینے میں چلا گیا اور بھیا باقی جو چار بچیں گے ان کا کیا کرو گے؟"

"انہیں بھی سنبھال لیں گے۔ بے فکر رہو۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" شاہ جی نے کہا۔ یہ اشارہ تھا۔ تمام لوگوں کی کمر سے ان کے مخصوص ہتھیار کھل گئے۔ ڈنڈوں کے مقابلے میں یہ تار اور گولے ہی مناسب تھے۔ ویسے کوئی تیاری تو کر کے نکلے نہیں تھے۔ دفعتہً ہی لاگھا مداری کے ایک آدمی نے ڈنڈے سے حملہ کیا اور اس کے باقی ساتھی بھی ان پر ٹوٹ پڑے۔ یہ ایک مخصوص انداز تھا جو عموماً لاٹھیاں چلانے والوں کا ہوتا ہے۔ لیکن ان کے ڈنڈے بڑی آسانی سے تاروں میں لپٹ گئے اور اس کے بعد پہلا گولا ان میں سے ایک کے پڑا اور اس کے حلق سے دلدوز چیخ نکل گئی۔ پنڈلی کی ہڈی نشانہ بنائی گئی تھی۔ اصل میں سڑک تھی، کسی وقت کوئی بھی آ سکتا تھا چنانچہ جو فیصلہ ہونا تھا، جلدی ہو جانا چاہئے تھا۔ شاہ جی کا بھی یہی اشارہ تھا۔ چنانچہ ایسے نپے تلے وار کئے جانے لگے کہ چیخوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔ ان لوگوں کی حسرتیں دل کی دل میں ہی رہ گئیں۔ لیکن اچانک ہی لاگھا مداری نے بڑی مہارت کے ساتھ اپنا چاقو شاہ جی پر اچھالا۔ یہ چاقو جس مہارت سے شاہ جی کی مٹھی میں پہنچا تھا، اس پر لاگھا مداری کا منہ خود حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بری طرح پٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور غور کر رہا تھا کہ وہ ایک ایک وار میں ہی ادھ مرے ہو گئے۔ یہ تو کچھ نہ ہوا۔ ساری شیخی دھری کی دھری رہ گئی۔ ادھر شاہ جی پر چاقو پھینک کر مارا تھا لیکن شاہ جی نے بھی اپنی خالی ہتھیلی ہوا میں سنسناتے ہوئے چاقو کے دستے پر ایسے بڑھائی تھی کہ لگتا تھا کہ لاگھا مداری نے خود اپنا چاقو اپنے ہاتھ سے ان کے ہاتھ میں دے دیا ہو۔ چاقو اب شاہ جی کی مٹھی میں تھا۔ انہوں نے ہنس کر کہا۔

''یار! عمر کتنی ہے تمہاری؟ اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ اگر یہ چاقو پلٹ کر تمہاری چھاتی میں بھی اتر جائے تو کتنی عمر میں مرنے والے قرار پاؤ گے، بولو......اب کیا کریں......کھیل تو بدل گیا ہے۔'' شاہ جی نے چاقو کو مختلف انداز میں گھماتے ہوئے کہا۔ لاگھا مداری بغلیں جھانکنے لگا۔ نور شاہ جذباتی ہو رہا تھا۔ شاہ جی کی گفتگو ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ نور شاہ نے اپنا ہتھیار لاگھا مداری کی کمر پر مارا اور وہ ہائے کر کے دوہرا ہو گیا۔ سیدھا ہوا تو شاہ جی نے آگے بڑھ کر اس کی گردن پکڑ لی۔

''ابے چڑیا کے انڈے، سالے! مونچھیں رکھ لینے سے آدمی مرد تھوڑا ہی بن جاتا ہے۔ کس برتے پر یہ لمبی لمبی مونچھیں رکھ لی تھیں تُو نے، مونچھوں کی توہین ہمیں پسند نہیں۔ کسی سے تُو نے ہمارے بارے میں پوچھا بھی نہیں۔ چل اب ہم تجھ سے پوچھ لیں گے۔ بھئی نور شاہ! اس سسرے نے سیر کا مزہ تو ختم کر ہی دیا۔ چلو لے کے چلو......اپنی ہی گاڑی میں ٹھونس لو حرامیوں کو۔''

''ٹھیک ہے شاہ جی! ان کی ویگن کا، کیا کیا جائے؟''

''دھکا دے کر سڑک سے نیچے اتار دو۔ خواہ مخواہ گزرنے والوں کا راستہ روکے گی۔''

ایسا ہی کیا گیا اور ویگن سڑک کے نشیب میں دھکیل دی گئی اور ان چاروں کو شاہ جی نے اپنی گاڑی میں ٹھونس لیا۔ ایک طرح سے انہیں کار میں دفن کر دیا گیا تھا۔ شاہ جی اور ان کے حواری ان لوگوں پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گئے۔ باقی لوگ بھی بیٹھ گئے اور گاڑی کا رخ تبدیل کر دیا گیا۔ گاڑی سبک روی سے ہیرا منڈی کی طرف جا رہی تھی۔ شاہ جی نے کہا۔

''ویسے تیری شکل نئی ہے، لاگھا مداری، نام بھی ابھی سنا ہے...... یہ مداری پن تُو نے کب سے شروع کر رکھا ہے؟''

لاگھا مداری کی بھلا آواز کہاں سے نکلتی۔ حلق میں تو کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ گول گول دیدے گھمانے لگا۔ ہمت پست ہو گئی تھی۔ جو مار پڑی تھی اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ کم از کم دو مہینے کے لئے بستر پر پڑ گیا۔ عجیب و غریب ہتھیار استعمال کئے گئے تھے۔ بہرحال وقت گزر رہا تھا۔ اچانک ہی شاہ جی کا ارادہ بدل گیا۔ کہنے لگے۔

''یار فضل خان! ڈیرے پر چلنے کی بجائے اپنے شہزادے کی طرف چلو۔''

''میں بھی یہی کہنے والا تھا شاہ جی!''

تھوڑی دیر بعد کار اس کوٹھی میں داخل ہو گئی جہاں اکرام رہتا تھا۔ چیختے کراہتے ''مہمانوں'' کو اندر پہنچایا گیا۔ پانچوں کے چہرے درد اور کرب سے بگڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اکرام نے حیرانی سے دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے بولا۔

''واہ...... یہ بوہے کہاں سے لے آئے شاہ جی؟''

''ارے بس چندا، ان حرامیوں نے گھومنے کا مزہ خراب کر دیا۔''

''کہاں گھومنے نکلے تھے؟''

''بس سوچا تھا تجھے سیر کرائیں گے۔ چل خیر چھوڑ، ذرا ان سے معلوم کر لیں کہ یہ لاگھا جی کہاں اپنا تماشہ دکھاتے ہیں؟''

کپڑا منہ سے نکال دیا گیا تھا۔ لاگھا بری طرح گھگھیا گیا۔

''معاف کر دیجئے شاہ جی، خدا کے واسطے معاف کر دیجئے۔ میں بدمعاش نہیں ہوں۔ بس ایسے ہی بنا رکھی تھی، آج آپ نے کرکری کر دی۔'' وہ بری طرح گھگھیانے لگا۔

''تو حرام کے جنے! اتنی بڑی بڑی مونچھیں کیوں رکھ لی تھیں؟ لگ رہا تھا جیسے سچ مچ مونچھ والے ہو......تم ان مونچھوں کو بدنام کرتے ہو۔ اب بتاؤ قصہ کیا تھا......کس نے پیچھے لگایا تھا ہمارے......اور ٹانگیں توڑ کر کہاں لے کر جا رہے تھے ہمیں؟''

''معاف کر دیجئے شاہ جی! معاف کر دیجئے......ہمیں چھوڑ دیں گے تو پلٹ کر منہ نہیں دکھائیں گے دوبارہ۔''

''دیکھ کتیا کے بچے! جو بات پوچھ رہا ہوں وہ منہ سے نکال دے۔ اب اتنا بھی بیوقوف مت سمجھ۔ اگر اب کی بار وہ نہ کیا جو ہم کہہ رہے ہیں تو پھر سمجھ لے کہ سب سے پہلے تیرے سارے دانت اُکھاڑ کر اسے پوپلا کر دیں گے۔''

''راجہ شرافت علی نام ہے۔ سپاری دی تھی اس نے آپ کو پکڑ کر لانے کے لئے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھے اتنا مشکل کام دے رہا ہے۔ شاہ جی، جو غلطی ہو گئی اسے معاف کر دیجئے۔ آئندہ ادھر کا رخ بھی نہیں کروں گا۔''

''کیا نام لیا تُو نے؟'' شاہ جی نے پوچھا۔

''راجہ شرافت علی۔ دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ ہیں۔ ایک کا نام نواب دین، دوسرے کا حیات خان، تیسرے کا کلیم خان۔''

”کہاں رہتے ہیں یہ؟“

”شاہ جی! موٹر وے سے تھوڑے فاصلے پر ایک آبادی ہے ادھر، آپ کو وہیں لے جانا تھا۔“

”اور تیرا علاقہ کون سا ہے؟“

”شاہ جی......مم......مم...... مجھے معاف کر دیجئے۔“

”اچھا، تو اس نے کیا کہا تھا تجھ سے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں توڑ کر، منہ میں کپڑا ٹھونس کر لے آؤ، یہی بات کی تھی ناں؟“

”جی شاہ جی! ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔“

”ابے تُو جو چاہتا ہے وہ تو سب بعد میں ہی ہوگا...... اب یہ سن کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔“

”جج......جج......جی شاہ جی...... خدا کے واسطے مجھے معاف کر دیں۔“

”اماں نور شاہ! یہ سالا تو معافی مانگنے کی مشین بن گیا ہے۔ کیا کہتے ہو، معاف کر دیں اسے؟“

”کر دیں گے شاہ جی! کر دیں گے۔ ایسی جلدی کیا ہے۔ پہلے اس سے یہ تو پوچھ لیں کہ وہ راجہ شرافت علی ہے کہاں؟“

”بتا تو چکا ہے جگہ۔“

”تو پھر اس سے ملیں گے نہیں شاہ جی؟“

”منہ کی بات چھین لی نور شاہ! ملیں گے اور یہ مداری جلد ہی ہمیں وہاں لے جائیں گے۔ کیا خیال ہے۔ ٹانگیں توڑ دو ہماری۔ چلنا تو ہوگا۔“

”مم......مم...... میری یہ مجال کہاں شاہ جی! آپ بس مجھے ایک بار معاف کر دیجئے۔“

”ابے سو بار معافی مانگ چکا ہے۔ ایک مرتبہ معاف کر دیں گے تو باقی ننانوے بار کا کیا ہوگا...... گنہگار کر رہا ہے ہمیں۔ چل معاف کر دیں گے تجھے۔ بس ایک کام کر۔“

”جج......جج......جی......“

”اسی گاڑی میں جس میں ہم یہاں تک آئے ہیں ہمیں باندھ کر لے چل۔ اکرام! تجھے بھی چلنا ہے ہمارے ساتھ۔“ شاہ جی نے اکرام کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں چلوں گا شاہ جی! ضرور چلوں گا۔ پروگرام تو بہت اچھا ہے۔“

”تو پھر تیار ہو جاؤ...... ہم چائے راجہ شرافت علی کے ہاں ہی پئیں گے۔ کیا خیال ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ لاگھا جی، تیار ہو جاؤ۔ ان چاروں کو تو یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ باندھ کر کسی کمرے میں بند کئے دیتے ہیں۔ یہ ہمارے پاس یرغمال رہیں گے۔ اور تُو ہمیں سیدھا سیدھا لے کر جائے گا راجہ شرافت علی کے گھر۔ کوئی گڑبڑ ہوگی تو انہیں ادھر مار دیں گے اور تجھے ادھر ختم کر دیں گے۔ کیا سمجھا؟“

”کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا شاہ جی...... وعدہ کرتا ہوں، ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔“

”الٹے ہاتھ کا تھپڑ دیں گے حرام کے کتے! ہمارے سامنے ماں جیسی مقدس چیز کا نام مت لینا...... چل، تیار ہو جا...... چلو بھئی، اس سے بات کرو، کیسے کیسے چلنا ہے۔“

چاروں ساتھی شاہ جی کا مطلب سمجھ چکے تھے چنانچہ وہ اسے سمجھاتے رہے۔ شاہ جی نے بھی پورا پورا ڈرامہ رچایا تھا۔ پاؤں بندھوا لئے، منہ میں کپڑا بھی ٹھنسوا لیا اور اس کے بعد لاگھا مداری انہیں لے کر چل پڑا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ راستے ہی سے اتر کر بھاگ جائے۔ ایک بڑی مصیبت کو ساتھ لئے جا رہا تھا۔ دل میں نجانے کیا کیا تصور تھے۔ لیکن شاہ جی نے اسے چلنے سے پہلے بتا دیا تھا کہ ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں، منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا ہے لیکن یہ ایک سیکنڈ میں کھل سکتا ہے، اس سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ چنانچہ کوئی بھی گڑبڑ کی یا بھاگنے کی کوشش کی تو بس یہ سمجھ لے کہ چاقو پھینک کر تُو ہمیں نہیں مار سکا، مگر ہمارے پھینکے ہوئے چاقو کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔

لاگھا مداری نے جو کچھ اب تک دیکھا تھا اس سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ اس نے سنبھل کر کہا۔

”نہیں شاہ جی...... میری مجال نہیں کہ جو وعدہ کیا ہے اس میں گڑبڑ کروں۔“

چنانچہ اس طرح شاہ جی چل پڑے۔ اکرام بھی ساتھ تھا اور بڑا دلچسپ ماحول لگ رہا تھا اسے۔ راستے بالکل ہی مختلف تھے۔ سنسان راستوں کو اختیار کیا گیا تھا۔ اور کچھ دیر کے بعد وہ مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔ بڑا سا شاندار مکان تھا، دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بہر حال یہ بات تو سمجھ میں آ گئی تھی کہ راجہ شرافت علی مالدار آدمی ہے۔ بہر حال لاگھا مداری نے

دروازہ بجایا تو نواب دین اور حیات خان باہر نکلے۔ لاگھا داری کو دیکھ کر ان کا چہرہ کھل اٹھا اور حیات خان نے جلدی سے پوچھا۔

"کیا رہا......؟"

"وہ......وہ موجود ہیں۔" لاگھا داری کی آواز مشکل ہی سے نکلی تھی۔

"سس......سس......سب چلے گئے۔"

"ابے تو تم کیوں ہکلا رہے ہو......انہیں اتارے گا کون؟"

"تم لوگ......تم لوگ خود ہی اتار لاؤ۔" لاگھا داری وہ الفاظ بول رہا تھا جو شاہ جی نے اس سے کہے تھے لیکن دونوں نے اس وقت لاگھا داری کی حالت پر غور نہیں کیا۔ کلیم شاہ بھی آ گیا۔ وہ سب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ بہرحال انہوں نے گاڑی میں ان سب کو پڑے ہوئے دیکھ لیا تھا چنانچہ وہ بڑی بے دردی سے ایک ایک کو گھسیٹ گھسیٹ کر نیچے اتارتے گئے۔ شاہ جی اور اکرام بھی ان میں شامل تھے۔ اندر راجہ شرافت علی موجود تھا۔ اس نے جوان لوگوں کو اس حال میں دیکھا تو اس کے چہرے پر مسرت کے آثار پھیل گئے۔ اکرام پر بھی نظر پڑی، آنکھوں ہی آنکھوں میں خون کروٹیں لینے لگا۔ وہ درگت یاد آ گئی جو بنائی گئی تھی۔ اب دیکھوں گا ان سب کو...... لاگھا داری کو آگے بڑھ کر سینے سے لگا لیا اور بولا۔

"بدن پسینے سے تر ہو رہا ہے تمہارا۔ محنت تو کرنی پڑی ہوگی۔ کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟"

لاگھا داری جو کمر پر ہاتھ رکھ کر چل رہا تھا، بے بسی سے شاہ جی کی طرف دیکھنے لگا۔ بہرحال وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے اور راجہ شرافت علی کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔

"جی رب نواز شاہ جی......اس سے پہلے تو آپ سے مکمل تعارف نہیں ہوا تھا لیکن آج خاصی تفصیلی بات رہے گی۔"

شاہ جی گردن ہلانے لگے جیسے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا ہونے کی وجہ سے کچھ بول نہ پا رہے ہوں۔ لاگھا داری ایک طرف بیٹھ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھنے لگا...... پھر راجہ شرافت علی کے اشارے پر ان سب کے منہ سے کپڑے نکال دیئے گئے۔ شاہ جی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولے۔

"ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے راجہ صاحب۔"

"ہاں، بھلا آپ ہمیں نہ پہچانیں گے۔ وہ دن تو یاد ہوگا جب ہماری اور آپ کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور آپ نے ہمیں اکیلا پا کر کچھ کھیل، کھیل ڈالے تھے۔"

"یاد ہے۔"

"تو پھر آج کے کھیل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ لاگھا! تمہارے باقی ساتھی کہاں گئے؟"

"بتا تو دیا ہے کہ کسی کام سے رک گئے ہیں۔ آنے والے ہوں گے۔" لاگھا کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس وقت کیا بولنا مناسب ہے۔ ایک لمحے میں وہ سارے کے سارے تیا پانچا کر کے رکھ دیں گے۔

"جی شاہ جی! آپ یہ بتایئے کہ ہیرا منڈی سے آپ کا کیا تعلق ہے؟"

"گھر ہے ہمارا......وہیں رہتے ہیں۔"

"سنا ہے زیادہ عرصہ نہیں ہوا آپ کو وہاں آئے ہوئے۔"

"یہ تو اپنی اپنی مرضی کی بات ہے راجہ صاحب! ہمیں تم سے ملاقات بھی کرنی تھی۔ یہ تو ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ تم اتنے کام کے آدمی ہو۔ کہاں چلے گئے تھے کھوپڑی گنجی کروا کر؟" شاہ جی کا لہجہ آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ راجہ شرافت علی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے ایک نگاہ شاہ جی پر ڈالی اور پھر کسی قدر پشیمان نگاہوں سے لاگھا داری کو دیکھا۔ یہ اندازہ تو نہیں تھا کہ شاہ جی اس عالم میں بھی یہ زبان استعمال کریں گے۔ آگے بڑھا، اپنا داہنا پاؤں ٹھوکر مارنے کے لئے شاہ جی کی طرف بڑھایا۔ شدید غصے کے عالم میں وہ شاہ جی کے سینے پر لات مارنا چاہتا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے شاہ جی کے ہاتھ آزاد ہوئے، شرافت علی کا پاؤں ان کے ہاتھ کی گرفت میں آیا اور شاہ جی نے اسے زور سے مروڑ دیا۔ راجہ شرافت علی چاروں خانے چت نیچے گرا تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر ماحول بدل گیا۔ باقی چاروں ساتھی بھی پھرتی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اچک کر ان تینوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ ان کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ شاہ جی ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے بعد انہوں نے راجہ شرافت علی کا گریبان پکڑ کر اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔

"ہاں...... تو تیرا نام راجہ شرافت علی ہے...... ٹھیک ہے۔ اور تُو نے اس لاگھا مداری کو ہمارے پاس تماشہ دکھانے کے لئے بھیجا تھا اور اس سے کہا تھا کہ ہمیں پکڑ کر لے آئے۔ ابے کتیا کے پلّے کوئی ڈھنگ کا آدمی نہیں ملا تھا تجھے لاہور میں...... بے چارہ یہ لونڈا ہی رہ گیا تھا جس نے مونچھیں رکھ کر یہ سمجھ لیا ہے کہ بدمعاش بن گیا...... ابے کتیا زادے! معلوم تو کر لیتا کہ شاہ جی کے بارے میں، کس کے اوپر بھیجا تھا تُو نے انہیں۔ ابے کہاں کا رہنے والا ہے، کوئی معلومات ہی نہیں ہے تیری۔"

راجہ شرافت علی کے بدن کا تو جیسے لہو ہی خشک ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ کیا ہوا، کیا لاگھا مداری نے دھوکا کیا؟ خونی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تُو نے...... تُو نے مکاری کی ہے میرے ساتھ۔"

"مکاری کے پلّے! مصیبت میں پڑوا دیا۔ چاروں کے چاروں وہاں الٹے پڑے ہوئے ہیں۔ ہماری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ نجانے کیسے چل پھر رہے ہیں۔ ابے بتانا چاہئے تھا تجھے کہ اتنے بڑے آدمی کے سامنے بھیج رہا ہے۔ آیا کہیں سے سالا راجہ کا پلاّ بن کر۔" لاگھا مداری نے عجیب سے لہجے میں کہا اور شاہ جی کے ساتھی بری طرح ہنس پڑے۔

"ہوں...... تو بھائی! اس مداری کی لکڑی تیرے کام نہیں آئی۔ ویسے راجہ شرافت علی! اس دن تو تیری کھوپڑی گنجی کی تھی، آج کیا کریں؟"

راجہ شرافت علی کے پورے بدن کا خون خشک ہو گیا تھا اور وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ یہ تو کہانی ہی کچھ اور ہو گئی۔ شاہ جی کے بارے میں جس قدر معلومات حاصل ہو چکی تھیں وہ ایسی نہیں تھیں کہ راجہ انہیں نظر انداز کر دیتا۔ بات اپنے بس کی نہیں رہی تو لاگھا کا سہارا لیا تھا جس کا پیشہ یہی تھا۔ لاگھا سے شدید نفرت کا احساس ہو رہا تھا۔ کمبخت غنڈہ بھی ملا تو ایسا کہ دیکھ کر شرم آئے۔ شاہ جی کے سامنے زخموں کی طرح کانپ رہا تھا اور شاہ جی کے ہونٹوں پر بھرپور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"ہاں...... ویسے تمہاری چندیا پر بال بڑی جلدی آ گئے۔ ابے الّو کے پٹھے! یہ تیری موت کیوں بار بار گھیر رہی ہے تجھے...... کیوں ہمارے سامنے آ جاتا ہے حرام زادے! ہمارے ہاتھوں کیوں مرنا چاہتا ہے؟"

راجہ شرافت علی کے پاس بولنے کو تو کچھ نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس پر سکتہ طاری ہو

گیا ہو۔ بس ٹکر ٹکر شاہ جی کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ شاہ جی کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو یہ حرامی کیسا معصوم بنا کھڑا ہے جیسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہی نہیں ہے۔ پچھلی بار تو چندیا صاف کی تھی، بال آ گئے ہیں۔ لیکن اب ناک کاٹ لو کتے کی۔ یہ ناک دوبارہ نہیں اُگے گی حرام زادے، اور ہمیشہ یاد رہے گا تجھے۔ چندیا پر بال آئے تو پچھلی مار بھول گیا اور لگ گیا پیچھے۔ لیکن ناک دوبارہ نہیں اُگے گی۔"

راجہ شرافت علی کے سارے جسم کا خون خشک ہو گیا تھا۔ اب اس پر تھرتھری طاری ہو گئی تھی۔ خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹا اور دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"معاف کر دیجئے شاہ جی! ایک بار اور معاف کر دیجئے۔ آئندہ آپ کے راستے میں نہیں آؤں گا۔ کان پکڑتا ہوں۔"

"کتیا کے جنے! میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں کہ تیری چندیا کیوں کھجا رہی ہے بار بار...... بس اس کا جواب دے دے مجھے۔"

"شاہ جی! بات اصل میں یہ ہے کہ کوثر جہاں نے بڑا ذلیل کیا ہے مجھے۔ آپ کی وجہ سے اس نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ مگر آئندہ کے لئے توبہ کرتا ہوں۔" راجہ شرافت علی گڑگڑانے لگا۔

"اور یہ کتے کون ہیں؟" شاہ جی نے باقی تینوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست ہیں۔"

"لاہور کے رہنے والے ہو؟" شاہ جی نے ان سے سوال کیا۔ ان کے منہ سے کوئی جواب نہیں نکل سکا تھا۔

"خیر یہ تو ہمیں پتہ ہے کہ تم بدمعاش نہیں ہو، چمچے بنے ہوئے ہو اس بے غیرت کے۔ چلو پھوٹو، جاؤ، سنا نہیں ہے...... ابھی دیگ میں ڈال کر بھون دیں گے۔ یہاں سے غرق ہو جاؤ۔" شاہ جی نے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ان تینوں کے حواس جواب دے گئے۔ نواب دین تو اس طرح بھاگا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ تب شاہ جی نے لاگھا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں، اب تُو بول، تیرا مداری پن دیکھا ہی نہیں ہم نے۔ بول، کیا کروں تیرے

ساتھ؟ چل اپنی زبان سے بتا دے۔"

"غلام ہوں جی آپ کا...... جو جی چاہے کریں۔"

"چل پھوٹ......" شاہ جی نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور لاگھا مداری بھی ایسے بھاگا جیسے موت اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ اب رہ گیا راجہ شرافت علی جو بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے پیروں میں جان نہیں رہی تھی۔ شاہ جی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ گھر خریدا ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر......؟"

"کرائے پر لیا ہے۔"

"ہوں...... کچھ کھلاؤ پلاؤ گے نہیں؟"

"میں...... میں...... میں ابھی لاتا ہوں۔"

"نہ...... نہ...... راجہ جی!...... نہ۔ ہم بڑے بے وقوف آدمی ہیں۔ بے دقوفی میں ایسی ایسی حرکتیں کر دیتے ہیں کہ بس...... کوئی نوکر نہیں ہے تمہارے ہاں...... تمہارا کیا پتہ، کیا ملا لاؤ اس میں۔"

"نہیں...... اب اس کی ہمت نہیں کر سکتا شاہ جی! آپ کی تقدیر اچھی ہے، میری خراب۔"

شاہ جی نے پانی پیا اور بولے۔ "ہاں، سوچا تو یہ تھا کہ تمہاری ناک کاٹ لیں۔ بہت دن کے لئے جھگڑا ختم ہو جائے۔ نکٹے کہلاؤ گے تو یاد رہے گا کہ کس نے کاٹی تھی۔ مگر کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ تمہاری زندگی ہے۔ ٹھیک ہے، جب اللہ نے دے دی ہے تو ہماری کیا بساط۔ بس ایک بات سن لو کہ آئندہ ادھر کا رخ مت کرنا۔ ورنہ بطخ کی طرح حلال کر دیں گے۔ قیں قیں کر کے رہ جاؤ گے۔"

"آئندہ کبھی آپ کا سامنا نہیں کروں گا۔"

"مگر ایک بات بتاؤ، کوثر جہاں بیگم کو کب سے جانتے ہو؟" شاہ جی نے سوال کیا۔

"بس شاہ جی، تماش بینی تو بہت عرصے سے کرتا ہوں۔ کوثر جہاں کو نیا نیا ہی دیکھا تھا۔"

"چلو ٹھیک ہے...... مگر ایک بات سمجھ لو، اب تمہاری شکل لاہور میں اور ہیرا منڈی میں

نظر نہیں آنی چاہئے۔ چلو بچو! بہت وقت ہو گیا ہے۔" شاہ جی نے کہا اور اس کے بعد وہاں سے باہر نکل آئے۔

○●○

داتا صاحب کا عرس مبارک تھا...... سارا پنجاب اُمڈ پڑا تھا۔ ہر طرف ہنگامے ہی ہنگامے ہوتے تھے۔ دودھ کی سبیلیں ہر شخص کے لئے کھلی ہوئی، لنگر خانے کہ ایک لمحے کے لئے خالی نہ رہیں۔ شاہ جی بھی پوری طرح اس میں حصہ لے رہے تھے۔ داتا صاحب کے مزار ہی پر ڈیرہ لگا دیا تھا۔ سو دیگیں روزانہ لٹائی جاتی تھیں اور چوبیس گھنٹے لنگر جاری رہتا تھا۔ شاہ جی مزار شریف پر ہی وقت گزار رہے تھے۔ لنگر ہوتے، قوالیوں میں نوٹوں کے انبار لٹائے جاتے۔ چاروں ساتھی بھی عرس میں پورا پورا حصہ لے رہے تھے۔ اس کے علاوہ شاہ جی بڑی حیثیت کے مالک بن چکے تھے۔ قوالیوں میں حال کھیلا جا رہا ہے، بھنگڑا ڈالا جا رہا ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس میں انہوں نے پرہیز کیا ہو۔ داتا صاحب کے مزار شریف پر خلقت اُمڈ پڑی تھی۔ اکرام بھلا ایسے موقع پر شاہ جی سے دور کیسے رہتا۔ عرس شریف کے لئے دوسرے تمام کام ملتوی کر دیئے گئے تھے۔ اکرام بھی اب خوب اچھی صحت کا مالک بن گیا تھا اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ جوان نظر آتا تھا۔ ایک عجیب شان، ایک عجیب تمکنت اس کے انداز میں پائی جاتی تھی۔ جو بھی ایک بار دیکھتا دوبارہ نگاہیں ڈالے بغیر نہ رہتا اور اس کی آنکھوں میں تحسین کے جذبات نظر آتے۔

بہر حال یہ ساری ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی کہ اسی دوران ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا۔ شاہ جی اس وقت مزار داتا صاحب پر اپنے ڈیرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور خلقت کو دیکھ رہے تھے جو داتا صاحب پر دیوانہ وار نثار ہونے کے لئے سندھ، سرحد، پنجاب اور بلوچستان کے گوشے گوشے سے آ گئی تھی۔ شاہ جی کے ڈیرے پر لنگر بدستور جاری تھا۔ ایک ایک کی ڈیوٹی ہوتی تھی لنگر پر۔ ضرورت مندوں کو بڑے خلوص اور احترام سے جو کچھ بھی حاضر ہوتا پیش کیا جاتا۔ یہ سلسلہ صبح سے شروع ہوتا تو رات گئے تک جاری رہتا اور اس وقت تک جب تک رات کے کھانے کا وقت ہو جاتا۔ اس وقت بھی شاہ جی کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے پُر خیال نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ دفعتہً ہی انہیں اپنے کان کے قریب ایک کڑک دار آواز سنائی دی۔

''نوازے......''

یہ آواز کچھ ایسا اثر رکھتی تھی کہ شاہ جی کے پورے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی۔ سہمی ہوئی نگاہوں سے پلٹ کر دیکھا، سیاہ رنگ کی شیروانی، خلوار اور کلاہ، ہاتھ میں چھڑی، دبلی پتلی جسامت کے ایک صاحب کھڑے تیکھی نگاہوں سے شاہ جی کو دیکھ رہے تھے۔ چہرے پر سفید داڑھی، بھنوئیں تک سفید۔ لیکن کمر بالکل سیدھی کی سیدھی اور آنکھیں بلا کی تیز۔ شاہ جی کے بدن کی لرزشوں میں اضافہ ہوگیا۔ شیروانی والے صاحب چند قدم آگے بڑھے اور انہوں نے پھر اسی انداز میں شاہ جی کو پکارا۔

''نوازے......!''

''استادمحترم...... السلام علیکم۔'' شاہ جی کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

''پہچان گئے ہو گے...... ہمیں شیر علی خان کہتے ہیں۔''

شاہ جی جلدی سے کھڑے ہو گئے اور پُر احترام لہجے میں بولے۔ ''استادمحترم کو نہیں پہچانوں گا؟''

''ہاں اوئے، جب شیطان دماغ پر سوار ہوتا ہے تو انسان بہت کچھ بھول جاتا ہے۔ اگر ہم تمہیں یاد ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان ابھی تک پوری طرح تمہاری کھوپڑی پر نہیں بیٹھا ہوا ہے۔''

''آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں استادمحترم؟''

''اوئے دیکھ، چھڑی ہے ہمارے ہاتھ میں اور کھوپڑی ویسی کی ویسی ہے۔ جو لفظ تم ہم پر استعمال کر رہے ہو ناں، ہم نے ہی تمہاری کھوپڑی تک پہنچائے ہیں۔ ہم پر یہی استعمال کر رہے ہو۔''

''استادمحترم! آپ تشریف رکھئے۔''

''اوئے دُکان کھول رکھی ہے تُو نے اِدھر۔'' ماسٹر شیر علی نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا اور پھر ان کی نگاہ نور شاہ پر پڑی جو لنگر کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

''ہوں...... تو یہ دھوبی کا کتا بھی یہیں پر موجود ہے۔ باقی تینوں بھی ہوں گے۔ کہاں ہیں وہ سارے کے سارے، وہ نہیں نظر آ رہے۔ ہمیں یقین تھا نوازے کہ تیری تباہی انہی چاروں کے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے، سو وہی ہوا۔''

''آپ تشریف تو رکھیں استادمحترم!''

''ہاں پتر! بہت سی باتیں کرنی ہیں تجھ سے...... پر ایک بات یاد رکھ، اگر بھاگنے کی کوشش کی تو چھڑی موجود ہے ہمارے ہاتھ میں۔''

''نن...... نہیں استادمحترم! آپ کے سامنے گستاخی کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔''

''اوئے تُو زبان بند نہیں رکھے گا اپنی؟ کہہ دیا ہے تجھ سے کہ ہمارے لفظ ہم پر ہی استعمال مت کر۔ یہ بتا کہاں تھا اور کیوں غائب ہوا تھا؟''

''استادمحترم! عرس شریف میں تشریف لائے ہیں ناں؟''

''ہاں...... اور دعاؤں کی ذمہ داری بھی دی گئی تھی ہمیں۔ کسی دکھے دل کی طرف سے کہا گیا تھا کہ ہم درگاہ داتا صاحب پر جا کر دعا کریں کہ کھویا ہوا بیٹا مل جائے۔ دعا تو ابھی کی بھی نہیں تھی لیکن جس دل سے دعا نکلی تھی، جن ہونٹوں نے یہ الفاظ ادا کئے تھے شاید ان کا براہِ راست اس پاک روح سے رابطہ قائم ہو چکا تھا جس کے سامنے دعا کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ سو ہماری دعا تو شروع بھی نہیں ہوئی اور تم مل گئے۔''

رب نواز شاہ نے گردن جھکا لی تھی۔ ماسٹر شیر علی انہیں بدستور گھورتے رہے، پھر بولے۔

''تو گھر کیا ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تُو نے؟''

''جی استادمحترم!''

''تیرے خیال میں تُو نے ٹھیک کیا؟''

''جی استادمحترم!''

''ابے کیا جی، جی لگا رکھی ہے...... یہیں پٹے گا کیا؟'' ماسٹر شیر علی ہتھے سے اکھڑ گئے۔ شاہ جی کی گردن جھکی کی جھکی رہ گئی تھی۔ ماسٹر شیر علی چند لمحے اسے گھورتے رہے پھر بولے۔

''میرے ساتھ ہی واپس چلنا ہے تجھے...... سمجھ رہا ہے نا میری بات؟''

''کچھ عرض کر سکتا ہوں؟''

''انکار کر رہا ہے، کیوں؟'' ماسٹر صاحب نے چھڑی ہلاتے ہوئے کہا، پھر ایک دم سنبھل گئے، پھر بولے۔ ''تُو نہیں سمجھتا، کتنی مشکل ہوئی ہے تجھے تلاش کرنے میں۔ سوچ بھی نہیں سکتا تُو۔ اب مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی ہے تو تیرا کیا خیال ہے کہ میں تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں گا......؟'' شاہ جی خاموشی سے گردن جھکائے کھڑے رہے تو ماسٹر شیر علی نے

پھر غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"جواب چاہئے مجھے...... جواب چاہئے۔"

"میری واپسی اب وہاں ممکن نہیں رہی ہے محترم استاد!"

"آخر کیوں؟"

"آپ سے کوئی بات چھپی ہوئی تو نہیں۔ وہ دلدوز واقعات میرے سامنے کیوں دہرا رہے ہیں؟"

"دیکھ پتر! مانتا ہوں کہ کچھ باتیں دل پر تیر کی طرح لگتی ہیں لیکن کہنے والے تو کہہ جاتے ہیں۔ یہ کمبخت زبان تو بتیسی کے بیچ میں پناہ لے لیتی ہے لیکن بندے کا آخر ٹھیک نہیں ہوتا۔ ایک بار میرے ساتھ چل کر دیکھ تو سہی، کس کس کو کیا کیا دکھ پہنچے ہیں۔ اور اب جو تُو مجھے نظر آ گیا ہے تو میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ کہاں رہتا ہے آج کل...... یہیں لاہور میں؟"

"جی ہاں۔"

"پتہ بتا اپنا۔"

"ہیرا منڈی میں رہتا ہوں۔"

"ہیرا منڈی؟"

"جی ہاں۔"

"ابے یہ کیا ہے...... کیا وہاں ہیرے بکتے ہیں؟" بے چارے ماسٹر شیر علی کو لاہور کی ہیرا منڈی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

"وہ استاد محترم! لاہور ہی کا ایک علاقہ ہے، شاہی مسجد کے پاس، شاہی قلعہ کے پاس۔ یہاں طوائفیں رہتی ہیں۔"

"او، ہو، ہو...... وہ جو کہتے ہیں ناں کہ مسجد کے زیر سایہ خرافات دیکھنا۔ اور یاد آ گیا بھئی، او یار مگر...... مگر......" ماسٹر شیر علی نے ایک بار پھر چونک کر شاہ جی کو دیکھا اور پھر بولے۔

"مگر یہ تو تُو نے بہت برا کیا نوازے! قصور کسی کا، سزا کسی کو...... اوئے، تیری کھوپڑی بالکل ہی آؤٹ ہو گئی ہے کیا...... کیسے وہاں وقت گزر رہا ہے۔ رہنے کے لئے وہی جگہ رہ

گئی تھی؟ میں کہتا ہوں غصے میں انسان کو کم از کم فیصلہ تو صحیح کرنا چاہئے۔"

"جی استاد محترم!" رب نواز نے گردن خم کر کے کہا۔

"تو اب کیا ارادہ ہے، یہ دکان کب بڑھے گی تیری؟"

"لنگر کر رہا ہوں، ظاہر ہے عرس کے خاتمے تک ہی یہ لنگر جاری رہے گا۔"

"ہوں...... اور اس کے بعد کیا ہو گا؟"

"جی استاد محترم۔"

"میں پوچھتا ہوں اس کے بعد کیا ارادہ ہے تیرا؟"

"کک...... کچھ نہیں استاد محترم۔"

"اوئے پھر وہی رٹ لگا رکھی ہے تُو نے، استاد محترم، استاد محترم۔ مشورہ تک کیا نہیں ہم سے۔ اتنا ہمیں بے حقیقت سمجھا...... اتنے خودسر ہو گئے، بغیر پوچھے غائب ہو گئے۔ چلو ٹھیک ہے، ہم پر مٹی ڈالو۔ یہ بتاؤ کہ ہیرا منڈی میں کہاں ہوتے ہو؟"

"وہاں کسی کو بھیج کر معلوم کر لیجئے، سبھی ہمارے ڈیرے کے بارے میں جانتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... عرس ختم ہونے تک کی مہلت دیتا ہوں...... دیکھ لوں گا تمہیں۔" ماسٹر شیر علی نے کہا پھر بولے۔ "چلتا ہوں...... اللہ بیلی۔"

رب نواز شاہ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ ماسٹر شیر علی چھڑی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ پیچھے سے چاروں ساتھی ایک دوسرے کے پاس چھپے ہوئے تھے۔ ادھر سے نگاہیں بچاتے ہوئے شاہ جی کے اکیلے پن کو دیکھ رہے تھے۔ نور شاہ کے ہاتھ بھی بہک رہے تھے۔ ایک بار بھی ادھر نگاہیں نہیں ڈالی تھیں لیکن دیکھ چکے تھے کہ کون آ گیا ہے۔ جب ماسٹر شیر علی دور نکل گئے تو چاروں کے چاروں رب نواز شاہ کے پاس آ گئے۔ رب نواز شاہ کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ نور شاہ نے کہا۔

"یہ استاد یہاں کیسے پہنچ گئے؟" شاہ جی اس طرح چونک پڑے جیسے دوستوں کی وہاں موجودگی کا علم ہی نہ ہو۔ پھر انہوں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے، عرس میں تشریف لائے ہوں گے۔ یہاں کتنا سامان رہ گیا ہے؟"

"ابھی تو کافی ہے۔" فضل خان بولا۔

"ہمیں یہیں سے فرار ہونا پڑے گا۔ ماسٹر شیر علی کو تم اچھی طرح جانتے ہو، بہت

خطرناک آدمی ہیں۔ ایسا کرو کسی کو اپنی جگہ مقرر کر کے پیسے دے دو، لنگر تو شام تک ختم ہو جائے گا مگر ہمارا یہاں رکنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔“

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاہ جی برق رفتاری سے انتظامات کرنے لگے اور پھر اکرام کو ساتھ لئے ہوئے پیدل چلتے ہوئے آگے بڑھ کر گاڑی تک پہنچ گئے جہاں گاڑی کھڑی رہا کرتی تھی۔ نور شاہ وغیرہ الگ انتظامات میں مصروف تھے۔ شاہ جی گاڑی میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ سب واپس آگئے تو شاہ جی نے کہا۔

”چلو، کوٹھی چلو۔“ شاہ جی کا مطلب اس کوٹھی کی طرف تھا جہاں اکرام رہتا تھا۔ راستے میں انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ اکرام خود ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ شاہ جی جیسے شیر کو پچاس شیر علی بھی مل کر خوفزدہ نہیں کر سکتے تھے۔ گھر پہنچنے کے بعد اکرام نے دبی آواز میں کہا۔

”یہ کون صاحب تھے شاہ جی جن سے آپ بھی ڈر رہے تھے؟“

شاہ جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”بیٹا! کلامِ پاک پڑھایا ہے انہوں نے ہمیں۔ بچپن میں پہلا تھپڑ انہی کے ہاتھوں سے کھایا ہے غلط پڑھنے پر۔ آج تک ہم ان سے ڈرتے ہیں۔ استاد ہیں ہمارے۔“

”آپ نے انہیں اپنا پتہ کیوں بتا دیا؟“ شالے خان نے کہا اور شاہ جی نے غصیلی نگاہوں سے شالے خان کو دیکھا، پھر بولے۔

”جب آمین ہوئی تھی ہماری اور انہوں نے بسم اللہ کہلوایا تھا ہم سے تو پہلی بات یہی کہی تھی کہ رب نواز شاہ سب سے پہلا کام تمہارا یہ ہے کہ جھوٹ مت بولنا سمجھے۔ اور ہم نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ تو تمہارا کیا خیال ہے ہم انہیں جھوٹا پتہ بتاتے؟“

”معافی چاہتا ہوں شاہ جی! معافی چاہتا ہوں۔“

”اب تم یوں کرو کہ سب لوگ نکل جاؤ۔ جتنی جلدی ہو سکے، وہاں سے تمام ضروری چیزیں اٹھا کر کوٹھی واپس آجاؤ۔ ہمیں پتہ ہے کہ استادِ محترم وہیں پر چھاپہ ماریں گے۔ نہ بھئی نہ، ہمیں اب ہیرا منڈی چھوڑنا ہوگی۔ وہ تو شکر ہے کہ قیام کے لئے کوٹھی موجود ہے ورنہ فوراً ہی کہیں نہ کہیں بندوبست کرنا پڑتا۔ چلو پھوٹ لو سارے کے سارے، خطرہ سر پر آ گیا ہے۔“ رب نواز نے کہا اور تمام دوست ان کے حکم کی تعمیل کے لئے کھڑے ہو گئے۔

○●○

سب سے زیادہ پریشان اکرام ہی تھا۔ شاہ جی کی موجودہ صورتحال کا کوئی جائزہ لینے کا موقع ملتا تو دانتوں میں انگلی دبا کر رہ جاتا۔ جس طرح وہ ہیرا منڈی سے بھاگ کر اکرام کی کوٹھی میں آچھپے تھے اور نکلنے کا نام نہیں لیتے تھے وہ ناقابلِ یقین سی بات تھی۔

ضروری چیزیں آگئی تھیں۔ ویسے بھی کسی قسم کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دونوں ہاتھوں سے خرچ کرتے تھے، بڑے سے بڑا کام کر ڈالتے تھے۔ لیکن ان دنوں وہ جس ذہنی بحران کا شکار نظر آتے تھے وہ ناقابلِ یقین تھا۔ وہ چاروں ساتھی جوان کے دم قدم کے ساتھ تھے، یوں لگتا تھا جیسے رب نواز کی ساری شخصیت سے واقف ہوں۔ انہیں شاہ جی کی اس حالت پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اکرام بڑا پریشان تھا اور اس نے کئی بار شاہ جی سے اس بارے میں پوچھ بھی ڈالا تھا۔ اس وقت بھی وہ انہی پریشانیوں کا شکار تھا...... اور شاہ جی کے پاس پہنچ گیا تھا جو اس کوٹھی کے سب سے عظیم الشان حصے میں بیٹھے پھولوں کی پتیاں نوچ رہے تھے۔ حقہ گرم تھا۔ خمیرے کی خوشبو فضا میں منتشر ہو رہی تھی لیکن شاہ جی نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے بیٹھے تھے۔

اکرام انہیں دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ چل کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ شاہ جی اسے دیکھ کر ایک دم سنبھل گئے۔ ہونٹوں پر پیار بھری مسکراہٹ آگئی، آنکھوں میں شفقت بھرا نور بکھر گیا، سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ کیا چھب ہے، کیا شان ہے...... کھڑا ہوا ایسا لگتا ہے جیسے پرستان کا کوئی شہزادہ ہو۔ کوئی بھی لباس پہن لے تو ایسا جچتا ہے کہ بس آنکھوں میں کھب کر رہ گیا ہے۔ اس وقت بھی وہ انتہائی حسین لگ رہا تھا۔ شاہ جی جیسے اپنی مشکل سے نکل آئے۔ مسکرائے اور بولے۔

”کیا بات ہے پتر؟“

اکرام خاموش شاہ جی کے پاس جا کر ان کے سامنے بیٹھ گیا، انہیں دیکھتا رہا اور وہ ہنس کر بولے۔

”یہ آنکھوں میں سنجیدگی بلکہ نیلی سنجیدگی نہیں مٹے گی۔ کیا دیکھ رہے ہو میری جان؟“

”شاہ جی! کتنی محبت دی ہے آپ نے مجھے...... کیا زندگی دے دی ہے۔ اب میں بے وقوف اور بچہ نہیں ہوں کہ ان باتوں کو نہ سمجھ سکوں۔ آپ نے گندگی کے کیڑے کو اٹھا کر مخمل

میں رکھ دیا ہے۔ اتنا مان دیا ہے...... کیا اب بھی کوئی ایسی چیزیں باقی رہ گئی ہیں جنہیں آپ مجھ سے دور رکھیں؟''

''ارے، ارے...... شہزادے! جوتے سمیت آنکھوں میں گھسے چلے جا رہے ہو۔ بیٹا! یہ تمہاری عمر کے بچوں کے کرنے کی باتیں نہیں۔'' شاہ جی نے کہا۔

''''نہیں شاہ جی! اگر آپ مجھے بچہ سمجھتے ہیں تو معافی چاہتا ہوں یہ کہتے ہوئے کہ یہ آپ کی بھول ہے۔''

''چلو بیٹا، جوان ہو گئے...... کیا اور کچھ چاہتے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''تو بول دو...... جدھر نظر اٹھا دو گے، کشتوں کے پشتے لگا دیں گے۔ کہو کیا بات ہے؟''

''آپ میرے سب کچھ ہیں شاہ جی! بدقسمتی یہ ہے کہ میں جس گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اس میں پاکیزگی کا خیال تو کم ہی ہے لیکن اب تو آپ کا دست شفقت مجھ پر ہے، آپ کا نام باپ کی جگہ لکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ احترام نہ کروں تو اور کیا کر سکتا ہوں۔''

''ابے شالے خان! ذرا لڈو لے آئیو دس کلو۔ یہ اپنا شہزادہ کیا بول رہا ہے۔ دیکھو تو سہی، لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی ادیب عالم ہو۔'' شاہ جی نے کہا۔

''یہاں کوئی نہیں ہے، سب لوگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ کوئی نہیں آئے گا اور نہ ہی اب مجھے آپ ان باتوں سے ٹال سکتے ہیں۔''

''بیٹھ تو جا میری جان...... بیٹھ تو جا...... ارے ہم کیا تجھ سے چھپائیں، ساری زندگی تو تیرے لئے وقف کر دی ہے ہم نے...... بول، کیا بات ہے؟''

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ ماسٹر شیر علی خان کون ہیں اور آپ جو دنیا میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہوتے ان سے کیوں ڈر رہے ہیں؟ آپ عرس چھوڑ کر بھاگے ہیں، داتا جی کے قدموں میں تو ہر روز ہی حاضری ہو سکتی ہے لیکن میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہیں جن کی وجہ سے آپ نے ہیرا منڈی چھوڑ دی؟''

شاہ جی سوچ میں ڈوب گئے اور دیر تک سنجیدہ رہے، پھر بولے۔ ''یہ ماسٹر جی نجانے کہاں سے آ مرے...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا، کیا جائے۔ چندا! استاد ہیں ہمارے۔ سپارے پڑھے ہیں ان سے۔ ماں باپ سے اتنا نہ ڈرے جتنا ان سے ڈرے۔ ذات کے

کھرے، دل کے ستھرے۔ ہاتھ چھٹ ہیں۔ دھڑ سے تھپڑ مار دیتے ہیں، آؤ دیکھیں گے نہ تاؤ۔ سوکھ کے چھوارہ ہو گئے مگر ہاتھ میں وہ جان ہے کہ آج بھی کسی کے پڑ جائے تو وہ جگہ سُن ہو جائے جہاں تھپڑ پڑا ہو...... اور پھر بانس کی چھلی ہوئی لکڑی، ارے توبہ توبہ...... بندر ناچ نچا دیتے ہیں۔ سچی شہزادے! کوئی بڑے سے بڑا لکڑی والا ہمارے سامنے آ جائے، جوتوں کی نوک پر نہ ماریں لیکن ماسٹر جی ہم سے بہت پیار کرتے تھے...... اور ہم نے بھی ہمیشہ ان کی عزت کی۔ بچپن کا خیال ذہن پر طاری ہے اور آج بھی بدن ان سے تھر تھر کانپتا ہے۔ اس دن سامنے آ گئے تو بس یوں لگا جیسے ابھی جھک کر چھپٹی اٹھائیں گے اور بندر ناچ نچا دیں گے۔'' شاہ جی ہنس پڑے، پھر بولے۔

''کیا سمجھے چندا...... اب تو سمجھ گیا ہو گا تُو۔''

''آپ کے بچپن کے استاد ہیں؟''

''ہاں، یوں سمجھ لے آمین انہوں نے ہی کی تھی ہماری۔ اور اس کے بعد ہماری تعلیم کا آغاز انہوں نے ہی کیا۔ اور ایک ایک لمحہ اس طرح گزارا ہمارے ساتھ کہ سچ جانو، ماں باپ نے اتنا وقت نہیں دیا ہو گا۔ بس ان کا سامنا کرنے سے جی ڈرتا ہے۔''

''وہ کیا کہہ رہے تھے اس دن؟''

''بس ایک وہی ہیں بیٹا جو ہمارا کان پکڑ کر جدھر جی چاہے موڑ سکتے ہیں۔ ورنہ اور کسی کتیا کے جنے سے ہمارا جوتا بھی نہیں ڈرتا۔''

اتنی دیر میں شالے، نور شاہ اور دوسرے لوگ پہنچ گئے۔

''آؤ، آؤ...... بیٹھو...... یہ شہزادہ آج ہم سے ہماری کہانی سننے کی کوشش کر رہا ہے مگر ابھی نہیں۔ ابھی کچھ وقت مانگیں گے تجھ سے۔ ہماری یہ کہانی ابھی ہم سے نہ پوچھ۔ لیکن ایک بات ہم تجھے بتائے دیتے ہیں کہ ہماری کہانی کا خاتمہ کرنے والا تو تُو ہی ہو گا۔ اب تیرے سوا ہماری زندگی میں رکھا کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، جو کچھ میں نے پوچھنا تھا، پوچھ لیا ہے۔ اس سے زیادہ پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔'' اکرام نے کہا اور شاہ جی ہنس پڑے، پھر بولے۔

''دیکھ رہے ہو نور شاہ! بات کرنے کا کیا انداز ہے میرے شہزادے کا...... آواز میں کیسا رعب پیدا ہو گیا ہے...... لگتا ہے جیسے رب نواز شاہ کا ہی بیٹا ہے۔''

"تو اس میں شک کیا ہے شاہ جی!"

"ہاں، اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن یہ اعلیٰ تعلیم کی تربیت بھی ہے۔" اور پھر یہ کہہ کر شاہ جی کسی سوچ میں ڈوب گئے، پھر بولے۔

"یار! بات کچھ الٹی سی لگ رہی ہے شالے خان! میرا خیال ہے ہمیں ماسٹر صاحب سے چھپ کر نہیں بیٹھنا چاہئے تھا...... ان سے صاف بات کر لینی چاہئے تھی۔"

"جی شاہ جی! آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔"

"اور کیوں چھپ کر بیٹھیں، کچھ لے کر بھاگے تھوڑا ہی ہیں کسی کا۔ ابے یار تم سب بھی بس بے تکے ہی ہو۔ پہلے یہ بات نہیں سمجھائی۔ اب شرم آ رہی ہے۔"

"معافی چاہتے ہیں شاہ جی!"

"شاہ جی کے بچے، چلو تیاری کرو۔ واپس چل رہے ہیں ہیرا منڈی۔ کیا سوچ رہے ہوں گے ہیرا منڈی والے کہ بھاگ گئے شاہ جی کسی سے ڈر کر۔ چلو اکرام! کوثر جہاں سے مل لینا۔ چلو گے ناں؟" شاہ جی نے اکرام سے کہا اور اکرام نے گردن ہلا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہ جی کی گاڑی لدی پھندی ہیرا منڈی جا رہی تھی۔ ہیرا منڈی والوں نے واقعی شاہ جی کی غیر موجودگی بری طرح محسوس کی تھی۔ لیکن بہرحال شاہ جی پر کوئی نقطہ چینی نہیں کر سکتا تھا...... البتہ شاہ جی نے نور شاہ سے کہا۔

"نور شاہ! ذرا دو چار دکانداروں سے معلومات حاصل کرو۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ماسٹر جی یہاں نہ آئے ہوں۔ آئے ہوں گے تو ہمارے بارے میں پوچھ گچھ بھی کی ہوگی۔ پتہ نہیں ان لوگوں نے انہیں کیا بتایا۔"

نور شاہ باہر چلا گیا۔ شاہ جی نے اکرام کو سامنے بٹھا کر شالے خان سے حقہ طلب کر لیا پھر مسکرا کر بولے۔ "کیا بات ہے اکرام! اُداس اُداس کیوں بیٹھے ہو بیٹا! ہنستے رہا کرو...... تمہاری ہنسی ہی تو ویرانوں میں چراغ جلا دیتی ہے۔ جاؤ ذرا نانوں کے یہاں ہو آؤ۔ دو چار پھلجھڑیاں چھوڑ آنا۔ کوثر جہاں سے بھی مل لینا...... بہن کو نہیں دیکھا ہو گا تم نے بہت دن سے، جاؤ ہو آؤ۔"

"جی شاہ جی، چلا جاتا ہوں۔" اکرام نے جواب دیا اور کچھ دیر بعد وہ چلا گیا۔

شاہ جی کے چہرے پر ایک عجیب سی اداسی تیرنے لگی تھی۔ سرخ سفید رنگ، زندگی سے

بھرپور آنکھیں کچھ لمحات کے لئے مدھم پڑ گئی تھیں۔ کسی ایسی سوچ نے دل میں بسیرا کر لیا تھا جس میں غم کی کوئی کیفیت بھی موجود ہوگی۔ کچھ دیر کے بعد نور شاہ واپس آ گیا اور شاہ جی حقے کے کش لے کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"استاد محترم کے آنے کی تو کوئی خبر نہیں ملی ہے لیکن پھول والا بتا رہا تھا کہ دو آدمی کئی بار معلومات لینے آ چکے ہیں۔ خفیہ پولیس والے لگتے تھے۔ پھول والا کافی چالاک آدمی ہے، اس نے تاڑ لیا۔"

"پولیس والے...... کب کی بات ہے؟"

"وہ کہہ رہا تھا کہ دو تین دن پہلے کی بات ہے، وہ ان لوگوں کو مسلسل پھیرے لگاتے دیکھ رہا ہے۔ آتے جاتے رہتے ہیں۔ تین دن پہلے ان میں سے ایک نے پوچھ ہی لیا کہ اس احاطے میں کون رہتا ہے۔ پھول والے نے آپ کا نام بتا دیا تو سنا ہے کہ کچھ اور معلومات حاصل کرنے کی فکر میں پڑ گئے۔ چار چھ باتیں پوچھ کر چلے گئے۔ آخری بار دو دن پہلے آئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا شاہ جی۔"

تھوڑی دیر تک شاہ جی خاموش رہے، پھر بولے۔ "تو ہم یہاں کب کسی ماں کے جنے سے موتا کاتتے ہیں۔ جو ہوگی دیکھی جائے گی۔ چھوڑو، کس دھندے میں پڑ گئے ہو بلا وجہ۔ ارے ہاں، ایک پتہ نکالو ذرا، بہت سے کام پیچھے رہ گئے ہیں...... میں تمہیں ایک پتہ لکھ کر دیتا ہوں۔" شاہ جی نے کہا اور ایک پتہ لکھ کر نور شاہ کو دیتے ہوئے کہا۔

"ہوں گے کوئی خفیہ پولیس والے...... دیکھیں گے کہ کوئی ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔"

بہرحال اس کے بعد شاہ جی نے شاید اس مسئلے کو نظر انداز ہی کر دیا تھا۔

○●○

اکرام بدستور تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس اعلیٰ درجے کے سکول میں اعلیٰ درجے کے لوگ ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس دن بھی وہ معمول کے مطابق سکول پہنچا تھا کہ سکول انتظامیہ کے افسر اعلیٰ کا اردلی اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔

"اکرام شاہ!"

"ہاں بولو، کیا بات ہے؟"

"آپ کو پرنسپل لیاقت علی نے طلب کیا ہے۔"

اکرام خاموشی سے اردلی کے ساتھ چل پڑا۔ نواب زادہ لیاقت علی ایک بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے اچنبھے کی نگاہ سے اکرام کو دیکھا اور بولا۔

''بیٹھو۔''

''شکریہ سر......'' اکرام ادب سے بیٹھ گیا۔

''تمہارا نام اکرام ہے؟''

''جی سر۔''

''بیٹے! تعلیم کا پہلا سبق ہے کہ جھوٹ نہ بولا جائے۔''

''جی۔''

''اور تم میرے سامنے جھوٹ مت بولنا۔''

''جی سر۔''

''تمہارے والد کا نام کیا ہے؟'' لیاقت علی شاہ نے پوچھا اور اکرام ایک لمحے کے لئے ہکا بکا رہ گیا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ رب نواز شاہ اس کے والد نہیں ہیں، وہ صرف سرپرست ہیں اور انہوں نے اس کا نام اس کی ولدیت میں لکھوا دیا ہے۔

افسرِ اعلیٰ کا پارہ چڑھنے لگا۔ اس نے کسی قدر ترش لہجے میں کہا۔

''تمہارے والد کا نام کیا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''رب نواز شاہ کون ہیں؟''

''میرے سرپرست ہیں۔''

''ماں کا نام کیا ہے؟''

''کوثر جہاں بیگم۔''

''کہاں رہتی ہیں؟''

''ہیرا منڈی میں۔''

''وہ طوائف ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''اور رب نواز شاہ اس کے گاہک تھے؟''

''کیا نام ہے آپ کا؟'' اچانک اکرام کا سوال ابھرا اور افسرِ اعلیٰ حیران رہ گیا۔ کیا عجیب لہجہ تھا، کیا عجیب انداز تھا...... اس نے سامنے کی نیم پلیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''نواب زادہ لیاقت علی شاہ۔''

''صرف اتنا پوچھئے جتنا آپ کے لئے ضروری ہو۔''

''جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں وہ میرے لئے ضروری ہے۔''

''میری ماں طوائف ہے، ہیرا منڈی میں رہتی ہے۔ شاہ جی میرے سرپرست ہیں، میرا خیال ہے بات اس پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے تم اگر کچھ کہو گے تو تمہارے جبڑے ثابت نہیں رہ سکیں گے۔''

نواب زادہ لیاقت علی شاہ ایک لمحے کے لئے ہکا بکا رہ گیا۔ یہ الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے، سمجھ میں آئے تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس بدتمیزی کی تمہیں جو سزا دی جا سکتی ہے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ لیکن میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے، میں صرف اپنا کام سرانجام دینا چاہتا ہوں۔ یہ سکول شریف زادوں کے لئے ہے۔ یہاں جو لڑکے پڑھتے ہیں ان کا حسب نسب بے داغ ہے۔ سکول انتظامیہ رب نواز شاہ پر چار سو بیسی کا مقدمہ دائر کرے گی اور اسے گرفتار کرا دے گی۔ اور سنو، تم اس آفس سے نکلنے کے بعد کلاس میں نہیں جاؤ گے، فوراً سکول کے گیٹ سے باہر نکل جاؤ اور دوبارہ تمہیں دروازے کے پاس دیکھا گیا تو گرفتار کر لیا جائے گا۔''

اکرام اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ کچھ لمحے نوابزادہ کی صورت دیکھتا رہا، پھر اس کے بعد خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے چہرے پر چٹانوں جیسی سختی اور آنکھوں میں سمندروں کا سا سکوت تھا۔ باہر نکل کر کار میں بیٹھا، ڈرائیور سے کہا۔

''ہیرا منڈی۔''

ڈرائیور نے ایک لمحے کے لئے منہ کھول کر اسے دیکھا لیکن اسے پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ اتنی جلدی چھٹی کیسے ہو گئی۔ بہر حال ہیرا منڈی پہنچ کر وہ شاہ جی کے سامنے پہنچ گیا۔ شاہ جی اسے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑے تھے۔ ایک شال لپیٹے ہوئے تھے۔ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پتہ چلا نزلہ ہو گیا ہے۔ کچھ لمحے خوشی کا اظہار کرتے رہے پھر اچانک ہی چونک کر اکرام کو دیکھنے لگے۔

"کیابات ہے چندا! چہرے کے نقش بتاتے ہیں کہ کچھ...... اور جلدی چھٹی بھی ہو گئی۔"

"جی شاہ جی، سکول کے پرنسپل نوابزادہ لیاقت علی شاہ نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا تھا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور یہ بھی کہا تھا کہ سچ بولنا انسانیت کی پہلی دلیل ہے۔ اس نے مجھ سے میرے ماں اور باپ کے بارے میں پوچھا، جنوں کے بارے میں پوچھا اور آپ کے بارے میں پوچھا اور پھر اس نے مجھے سکول سے نکال دیا۔"

"نکال دیا......؟" شاہ جی کا پورا بدن کانپ گیا۔

"ہاں...... اور کہنے لگا کہ یہ سکول شریف زادوں کے لئے ہے۔ یہاں جو لڑکے پڑھتے ہیں ان کا حسب نسب بے داغ ہے۔ سکول رب نواز شاہ پر چار سو بیسی کا مقدمہ دائر کرے گا۔"

رب نواز شاہ کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ بہت دیر تک ان کے چہرے پر عجیب سی سرخی چھائی رہی، پھر آہستہ آہستہ معتدل ہوتے چلے گئے۔ پھر انہوں نے اکرام کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تُو فکر مت کر چندا! ان حرام کے جنوں کی کیا مجال کہ تجھے سکول سے نکال دیں؟ آئے کہیں سے بے داغ حسب نسب والے۔ بتاؤں گا انہیں، بتاؤں گا...... حساب کر کے بتاؤں گا انہیں کہ کتنے اصل اور کتنے نقل پڑھ رہے ہیں ان کے پاس۔" شاہ جی اس طرح غرا رہے تھے کہ دوست ایک دم سے اندر آ گئے۔ ایک لمحے کے اندر اندر اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی انتہائی خراب صورتحال ہے۔ پھر شاہ جی نے ان چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے مشورے کی ضرورت آ گئی ہے۔ بات کچھ بگڑی ہوئی لگ رہی ہے۔"

"خیریت تو ہے شاہ جی؟"

"خیریت نہیں ہے۔ ہمارے چندا کو سکول سے نکال دیا ہے اس پرنسپل نے۔ حسب نسب پوچھا اور یہ کہہ کر نکال دیا کہ سکول میں صرف شریف زادے پڑھتے ہیں۔"

"یہ تو مناسب بات نہیں ہے۔" نور شاہ نے کہا۔ شاہ جی! اگر اکرام اس سکول میں نہیں پڑھے گا تو پھر اس سکول میں کوئی اور بھی نہیں پڑھے گا۔ سکول مٹی کا ڈھیر نہ کر دیں تو ہماری بھی زندگی پر لعنت۔"

شاہ جی ایک دم چونک کر نور شاہ کو دیکھنے لگے، پھر بولے۔

"مٹھائی ہوتی تو منہ میں رکھ دیتا تمہارے۔ جی خوش کر دیا ایمان سے۔ ہمارا بیٹا اس سکول میں نہیں پڑھے گا تو کوئی نہیں پڑھے گا۔ اُلو بھی نہیں بولیں گے۔ اس حرام کے پلے کی مجال ہی کیا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔"

"مگر شاہ جی ایک بات پر ذرا غور کر لیجئے آپ۔"

"ہاں بولو۔"

"یہ سب کچھ ہوا کیسے آخر؟ چلو مان لیا کہ سکول کے کچھ رسم و رواج ہیں لیکن وہاں تک یہ بات تفصیل سے پہنچائی کس نے؟ میں تو سیدھی سیدھی بات کہتا ہوں، مخبری ہوئی ہے۔ لیکن یہ ہوئی کیسے، کس سور کے پلے کو اپنی جان سے جانے کا خیال پیدا ہوا ہے؟"

"ایک اور بات شاہ جی! پھول والے نے بتایا تھا کہ دو بندے جاسوسی کرنے آئے تھے اور جاسوسی کر رہے تھے۔"

"ماننے والی بات ہے...... ماننے والی بات ہے۔ مگر کیا استاد محترم نے یہ کام کیا؟ اور اگر ایسا کیا انہوں نے تو ہمارے خلاف کرتے۔ ہمارے شہزادے کی طرف انگلی کیسے اٹھائی گئی؟ ہم استاد صاحب کی بڑی عزت کرتے ہیں، سچی بات یہ ہے کہ ہمیں دنیا کو دیکھنا سکھایا لیکن اگر انہوں نے یہ وار کیا ہے تو بڑا اوچھا وار ہے یہ، اور اوچھے وار کرنے والوں سے میرا جی نہیں لگتا۔ خیر یہ تو بعد کی بات ہے۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ وہ خود ادھر آئے بھی نہیں۔ بہر حال پتہ چلے گا بھیا...... پتہ ضرور چلنا چاہئے۔ اگر پتہ نہ لگا تو دھوکے میں نجانے کتنے مر جائیں گے۔ سارے کام چھوڑ دو، اب دیکھنا یہ ہے کہ سکول کا کیا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اس کالی بھیڑ کو بھی تلاش کرنا ہے جس نے ہماری ناک کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ دی ہے۔ نہیں بخشیں گے...... لیکن جس نے بھی یہ سب کچھ کیا ہے اس نے اپنی جان کی مصیبت مول لے لی ہے۔"

"آپ ہمیں حکم دیں شاہ جی۔"

"فہرست تیار کرو ان سب کی جن کا نام ہمارے دشمنوں میں شامل ہوتا ہے...... اور اب ذرا یہ سوچو کہ یہاں آنے کے بعد کس مردود کو ہم سے سب سے زیادہ دشمنی رہی ہے؟ بہت سے نام آتے ہیں ویسے تو خیر بخش حضوری، مراد بخش، راجہ شرافت علی...... اور بھی بہت

سے......اور اس کتیا کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کا نام شمشیرہ بیگم ہے...... رنڈی کی فطرت ہم جانتے ہیں۔ وہ دیکھ رہی ہے کہ آج کل کوثر جہاں سے بھی ہماری گاڑھی چھن رہی ہے۔ انگاروں پر لوٹ رہی ہوگی۔ حالانکہ پورا پورا منہ بھر رہے ہیں اس کا۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ بات صحیح سمجھ میں آئے تو سہی۔

''میں بتاؤں شاہ جی؟''

''ہاں بولو۔''

''یہ بات سیدھی سیدھی نوابزادہ صاحب ہی سے کیوں نہ معلوم کر لی جائے۔''

''ایں...... ابے بات تو سولہ آنے ٹھیک ہے۔ کیا فائدہ زیادہ سوچ سوچ کر۔ ہماری کھوپڑی بگڑ گئی تو خون خرابہ ہو جائے گا۔ چلو تیاریاں کرتے ہیں۔''

اور تھوڑی دیر کے بعد شاہ جی کی شاندار قیمتی کار سکول کی جانب جا رہی تھی۔

○●○

نور شاہ، دلبر خان، فضل خان اور شالے خان، شاہ جی کی کیفیت کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔ مزاج شناس اور ہر کیفیت سے آشنا تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آتش فشاں ابل رہا ہے۔ لاوا بہہ نکلا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔ نور شاہ ہی نے ہمت کر کے کہا۔

''بات بگاڑنے سے بنانا زیادہ بہتر رہے گا شاہ جی! جوش سے ہوش ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے۔ میں رائے دینے کی ہمت تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا کہہ دیا ہے۔''

شاہ جی نے سرخ آنکھوں سے نور شاہ کو دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔

کار سکول کے سامنے جا کر رک گئی۔ منصوبے کے مطابق شاہ جی صرف اکرام کو لے کر اندر داخل ہوئے اور کچھ دیر کے بعد پرنسپل صاحب تک رسائی حاصل ہو گئی۔

''آپ ہیں اس سکول کے پرنسپل؟''

پرنسپل نے اکرام کو دیکھ لیا تھا۔ اکرام پر نظر پڑتے ہی وہ سمجھ گیا اور اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔

''تشریف رکھیے۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور شاہ جی شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئے۔ ''جی فرمائیے......؟''

''میرا نام رب نواز شاہ ہے۔''

''ہوں...... تو آپ ہیں وہ۔''

''جی۔'' شاہ جی نے بارعب لہجے میں کہا۔

''رب نواز شاہ صاحب! بچے کے داخلے سے پہلے آپ کو ہمارا پراسپیکٹس ملا تھا؟''

''جی ہاں ملا تھا۔''

''آپ نے اسے پڑھا؟''

''بالکل پڑھا ہے۔''

”آپ کو ہمارے قوانین معلوم تھے۔ اس کے باوجود آپ نے ایک طوائف زادے کو ہمارے سکول میں داخل کروایا۔“

”طوائف زادے کو داخل کروایا ہے پرنسپل صاحب! طوائف کو تو نہیں داخل کرایا۔“ شاہ جی بولے۔

”آپ جانتے ہیں کہ یہاں ملک بھر کے وزیروں، سفیروں اور امراء کے بچے پڑھتے ہیں؟“

”جی جانتا ہوں۔“

”حسب نسب کا ہمارے ہاں خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ ایک طوائف زادہ بھی ہمارے سکول میں پڑھتا ہے تو ہمارے سکول کی کس قدر بدنامی ہوگی، آپ نے یہ نہیں سوچا؟“

”علم تو سب کے لئے ہے پرنسپل صاحب! کیا علم کی تقسیم کے لئے کچھ بندشیں ہیں؟“

”لاہور میں اور بھی بہت سے سکول ہیں۔“

”ٹھیک ہے...... یہ سکول بہت بڑا ہے۔ اس کے اخراجات بھی رئیسوں کے سے ہیں مگر ہم یہ اخراجات ادا کرتے ہیں۔“

”بڑے افسوس کی بات ہے رب نواز شاہ صاحب! آپ اپنی اس غلط حرکت پر شرمندہ ہونے کی بجائے مجھ سے بحث کر رہے ہیں۔ میں نے اس وقت یہ فیصلہ کیا تھا کہ آپ پر مقدمہ دائر کروں گا۔ بعد میں یہ فیصلہ بدل دیا تھا میں نے۔ مگر اب آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں آپ پر مقدمہ کر دوں۔“

”آپ ایسا نہ کریں پرنسپل صاحب! میں بڑی عاجزی سے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس بچے کو آپ خاموشی سے اسی سکول میں پڑھنے دیں۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ اٹھا کر دیکھ لیں، اس کا اخلاقی ریکارڈ دیکھ لیں۔ پرنسپل صاحب! طوائفوں کے ہاں پیدا ہونے والے بچے بھی انہی رئیسوں اور نوابوں کی اولاد ہوتے ہیں جو اپنا حسب نسب ان کوٹھوں پر چھوڑ آتے ہیں۔ وہ ان بچوں سے کہیں زیادہ بے غیرت ہوتے ہیں، یہ انہی کی اولادیں ہوتی ہیں۔ وہاں جو کوٹھے پر ناچتی ہیں اور جو کوٹھے کے دلال ہوتے ہیں، اپنی بیٹیوں کو دی ہوئی یہ پائل انہی کی دی ہوئی ہوتی ہے، سمجھ رہے ہیں نا آپ؟“

”یہ ایک الگ مسئلہ ہے...... آپ میرے سامنے تقریر نہ کریں۔“

”الگ نہیں، ایک اہم مسئلہ ہے۔ یہ ایک طوائف زادہ ہے، معاشرے میں اپنا مقام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آپ کا سکول اس کی مدد کرے گا۔ اس کے یہاں پڑھنے سے یہ سکول کوٹھا نہیں بن جائے گا۔“

”مجھے تعجب ہے رب نواز شاہ صاحب! آپ ایک جرم کر کے اپنے جرم کی وکالت کر رہے ہیں۔“

”روشنی دکھا رہا ہوں آپ کو پرنسپل صاحب! اس روشنی سے فائدہ اٹھائیے۔“

”سوری...... یہ نہیں ہو سکتا۔“

”نہ پرنسپل صاحب...... یہ سوری سے ختم ہونے والی بات نہیں ہے۔ آپ نے جو اکرام سے کہا تھا وہ آپ کو یاد ہے؟“

”کیا؟“

”آپ نے اس سے کہا تھا کہ وہ سچ بولے۔“

”ہاں...... یہ کہا تھا۔“

”اور اس نے سچ بولا۔“

”میں اس بات کی قدر کرتا ہوں۔“

”ایک سچ میں بھی بولنا چاہتا ہوں، یہ ایک شریف آدمی کی اولاد ہے، ایک صاحب نسب کی اولاد ہے اور آپ یقین کریں کہ میں آپ سے سچ بول رہا ہوں۔“

”مگر یہ ایک طوائف کا بیٹا ہے۔“

”آپ اسے بھول جائیے۔“

”آپ قانون کی توہین کر رہے ہیں...... میں آپ پر مقدمہ دائر کر دوں گا، آپ کو سزا ملنی چاہئے تا کہ لوگ آئندہ احتیاط کریں۔“

”میں رشتہ لینے آیا ہوں تمہاری بیٹی کا؟ تمہاری بیٹی کا رشتہ نہیں مانگا ہے میں نے؟ ہمارا ملک ہے اور تم ہمیں قانون سکھا رہے ہو۔“

”شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔“ پرنسپل غصے سے دھاڑا۔

”آہستہ بولو میری جان...... آہستہ بولو۔ ایک ایک کر کے شرافت کے سارے دائرے

توڑ دیئے تم نے۔ اب ایک اور بات بتا دو جگر کے ٹکڑے! یہ اکرام کی نشاندہی کس نے کی تھی؟"

"تم نے سنا نہیں، گیٹ آؤٹ......!"

"میں گیٹ آؤٹ ہوا تو تم دنیا سے آؤٹ ہو جاؤ گے۔ پرنسپل! کچھ بیچ کی باتیں ہونے دو۔ خود بھی جیو اور ہمیں بھی جینے دو۔"

"دھمکی دے رہے ہو مجھے...... دیکھ لوں گا میں۔"

"نہیں...... آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتے ہم۔ بتا دو، کس نے یہ انکشاف کیا تھا؟"

شاہ جی نے کہا اور چاقو نکال کر سامنے رکھ لیا۔ پرنسپل کا چہرہ فق ہو گیا۔

"حسب نسب کا یہ فرق ہوتا ہے۔"

"فرق پتہ چل ہی گیا ہے تو زبان کھول دو۔"

"میرے پاس اس کا فارم آیا ہے...... تمہارے بارے میں پوری تحقیقات کرائی گئی ہے۔"

"کوئی راستہ نکل سکتا ہے...... میرا مطلب ہے اکرام کے اس سکول میں پڑھنے کا؟"

"کوئی بھی نہیں۔"

"کہاں رہتے ہو؟" شاہ جی نے پوچھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"بال بچے تو ہوں گے...... مطلب بتاؤ۔"

"جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جاؤ...... ورنہ بعد میں پچھتاتے رہو گے...... تمہیں بچے یاد آتے رہا کریں گے۔"

پرنسپل نے غور سے شاہ جی کی صورت دیکھی۔ شخصیت تو ویسے ہی مرعوب کن تھی۔ اس نے کہا۔ "دیکھئے، قانون میں نے نہیں بنائے، میں انتظامیہ کا ایک فرد ہوں، میں نے صرف اس قانون کی پیروی کی ہے۔ آپ اس سکول کی انتظامیہ سے اجازت لے لیں تو مجھے اس بچے سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"اور تم اس سلسلے میں زبان نہیں کھولو گے۔"

"جی نہیں۔"

"ٹھیک ہے...... اس بات کا خیال رکھنا پرنسپل صاحب! ہم قسم کھاتے ہیں ایمان کی کہ تمہیں تمہارے بچوں سے محروم کر دیں گے۔ اور ایک بات اور بھی سن لو، ہمارا بچہ اس سکول میں نہ پڑھا تو کوئی بچہ اس سکول میں نہیں پڑھے گا۔ یہ بھی ایک مسلمان ہی کا قول ہے۔ اچھا، اب گیٹ آؤٹ ہو رہے ہیں۔ خیال رکھنا۔ آؤ اکرام!" شاہ جی نے کہا، چاقو واپس رکھا اور باہر نکل آئے۔ باہر تمام لوگ انتظار کر رہے تھے۔ اکرام بھی خاموش تھا۔ کچھ دیر کے بعد شاہ جی نے کہا۔

"نور شاہ! کوئی اور جگہ چاہئے...... اصل میں ہیرا منڈی سے دانہ پانی تو اٹھ ہی گیا ہے۔ ٹھکانہ چاہئے ہی ہو گا۔"

"شاہ جی! ہمیں بھی کچھ بتائیے۔"

"وہ سسرے گڑبڑ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مگر وہ سکول اسی صورت میں قائم رہے گا جب اکرام اس سکول میں پڑھے گا ورنہ یہ عمارت ملبہ بنے بغیر نہ رہے گی۔"

"وہ لوگ نہیں مانے؟"

"بچ گیا ہمارے ہاتھ سے...... ایک لفظ بھی ٹیڑھا بولتا تو گیا تھا۔ مگر ان کتیا کے جنوں سے ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ جگہ تو چاہئے دشمنوں سے ہوشیار رہنے کے لئے۔"

"ان حالات میں تو کوٹھی بھی مناسب نہیں ہو گی۔"

"ہاں...... اسے بھی عارضی طور پر چھوڑنا ہی ہو گا۔"

"فی الحال کہاں چلیں شاہ جی؟"

"ایک بات یاد آئی...... آہا...... خوب یاد آئی۔ وہ سسرا راجہ شرافت علی تو یاد ہے ناں۔ ہو سکتا ہے یہ بیج اس کا بویا ہوا ہو۔ خوب خیال آیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ بعد میں دیکھیں گے۔ ہم اس کوٹھی کی بات کر رہے تھے جس میں وہ ملا تھا، پتہ چلا تھا اس نے کرائے پر لی ہے۔"

"جی......"

"جگہ تو بڑی بڑھیا ہے، اکرام کی کوٹھی کے پاس ہی ہے۔ دونوں کو ملا کر کام چل جائے گا۔ چلو اتر جاؤ اور ذرا پتہ لگاؤ۔ جس بھاؤ ملے لے لو۔ اللہ کرے خالی ہو۔"

"تو کن دے آؤں شاہ جی؟"

"ہر قیمت پر۔"

"بس تو آپ مجھے اتار دیجئے۔ آپ تو ہیرامنڈی ہی جائیں گے۔"

"ہاں......" شاہ جی نے جواب دیا۔

○●○

ثمانہ یورپ کے ماحول کی پروردہ تھی لیکن فاخرہ بیگم نے اسے وہاں کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ رنگ روپ یورپ کا پایا تھا، اداؤں میں مشرقیت تھی۔ لیکن لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ حساس ہوتی ہیں، ماحول کی نگاہ پہچانتی ہیں۔ ماں باپ اور چچا چچی کی زبانی بار بار اکرام کا نام سن رہی تھی اور بھی بہت کچھ سنا تھا اس نے اور یہ سب کچھ سننے کے بعد ذرا نیند بھاری ہوگئی تھی۔ اس نے اکرام کو دیکھا تھا اور وہ اسے یہ سب کچھ سننے سے پہلے ہی اچھا لگا تھا۔ انگریزوں جیسا رنگ روپ، پاکستان کی ملاحت دونوں نے کام کر دکھایا تھا۔ اور پھر جب اس کے نام کے ساتھ اپنا نام سنا تو چودھواں سال بے اختیار ہوگیا۔ کمسنی کی یہ عمر سب سے بھیانک ہوتی ہے کہ تجربہ بالکل نہیں ہوتا۔ جذبات بے راہ ہونے لگتے ہیں۔ اکرام کے لئے دل مچلتا رہتا تھا۔ بدقسمتی یہ تھی کہ کوئی رازدار نہیں تھا۔ لے دے کر علی شاہ رہ جاتا تھا جو خود بے دم کا الو تھا۔ اس سے کیا بات کرتی، پریشان تھی۔

ادھر نادر شاہ اور ناصرہ بہن بھائی پر جان چھڑکنے والی۔ داتا صاحب کا عرس اس بار دہری خوشیاں لے کر آیا تھا۔ ان لوگوں کی آمد سے جو رونق ہوئی تھی وہ اپنی جگہ تھی، نذر نیاز، زیارتیں، چادریں، چڑھاوے، خوب دن گزر رہے تھے۔ پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ وقت کس طرح گزر گیا۔ آخر کار عرس ختم ہوا، حالات معمول پر آگئے۔ ان ہنگامہ خیزیوں سے علی شاہ کو بخار آگیا تھا۔ وہ سکول سے غیر حاضر تھا۔ نادر شاہ نے اس کا ذکر چھیڑ دیا۔

"بھئی وہ تمہارے دوست کا کیا حال ہے؟"

"ہاں...... میں بھی تو پوچھنے والا تھا۔" چوہدری صاحب نے کہا۔ "کئی دن سے اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ خاص طور سے وہ اس کی حیران کن ہم شکلی...... نہ کسی دن رب نواز شاہ صاحب سے ملاقات رکھی جائے؟"

"یہ تو ہمارے منصوبے میں ہے بھائی جان! دراصل داتا صاحب کا عرس عید کی طرح ہوتا ہے۔ ہر شخص مصروف۔"

"کیا سکول بھی بند رہتے ہیں؟"

"خاص دعا والے دن سکول بھی بند ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... اب رکھ لو کسی دن...... کیا کرنا ہے، یہ سوچو۔"

"علی شاہ ایک دو دن اور نہیں جا سکے گا۔ جونہی یہ سکول جائے گا، اسی دن اکرام کو ساتھ لے کر آئے گا۔ اکرام سے کہیں گے کہ شاہ جی سے ہماری ملاقات کرائے۔"

"یہ ٹھیک ہے......"

ثمانہ نے یہ باتیں سنیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ اور دل میں گدگدی ہونے لگی۔ علی شاہ، چچا زاد بھائی تھا لیکن نرا بھوندو کا بھوندو۔ حالانکہ عمر میں ثمانہ سے بڑا تھا لیکن اب بھی نوجوانی بیدار نہیں ہوئی تھی۔

بہرحال علی شاہ کا بخار اتر گیا۔ کمزوری تھی۔ اکرام کچھ ایسا یاد آیا کہ دوسرے دن ہی سکول جانے کے لئے تیار ہوگیا ماں نے روکا بھی لیکن رکا نہیں، سکول چل پڑا۔ کلاس لگی، مگر اکرام نہیں تھا۔ بے چین ہوکر دوستوں سے پوچھا۔ پڑھائی شروع ہوگئی تھی اس لئے اس وقت تو کسی نے کچھ نہیں بتایا مگر ہاف ٹائم میں راجہ سخاوت نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"وہ جو بیچتے تھے دواء دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔"

"میں اکرام کی بات کر رہا ہوں۔"

"انہی کے بارے میں بتا رہا ہوں...... سکول سے نکال دیئے گئے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" علی شاہ دھاڑا۔

"غصہ نہیں، غصہ نہیں...... غصہ ہمیں بھی آسکتا ہے اور اب ہمارا غصہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ کسی اور لڑکے سے پوچھ لو۔"

"سلیم! ادھر آؤ۔" علی شاہ نے ایک اور شناسا لڑکے سے کہا۔ سلیم قریب آیا تو اس نے کہا۔ "یہ راجہ سخاوت کیا بکواس کر رہا ہے؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے علی شاہ! پورے سکول میں افواہ اڑی ہوئی ہے۔ اکرام کو واقعی سکول سے نکال دیا گیا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"سنا ہے کسی ناچنے گانے والی کا بیٹا ہے...... اسی لئے اسے یہاں پڑھائی کی اجازت

نہیں دی جا سکتی۔"

"کیا بکواس ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔"

"مگر...... وہ تو...... مجھے اس کے گھر جانا ہوگا۔ ابھی جا رہا ہوں میں۔"

"ابھی......؟"

"ہاں...... خبر ہی ایسی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"چھٹی کے بعد چلے جانا۔ درمیان میں جاؤ گے تو سزا ملے گی۔"

"دیکھا جائے گا۔" علی شاہ نے کہا اور سکول سے باہر نکل آیا۔ اکرام کے گھر کا پتہ معلوم تھا اسے چنانچہ اس طرف چل پڑا۔ کوٹھی کے دروازے پر چوکیدار موجود تھا۔ چوکیدار کو ہدایت مل چکی تھی۔ علی شاہ نے اکرام کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"نہیں، ادھر موجود نہیں ہیں...... کچھ دن کے لئے کراچی گئے ہوئے ہیں۔"

"کب آئیں گے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"مجھے ایک بات بتایئے بابا صاحب!"

"بولو؟"

"کیا اکرام کو سکول سے نکال دیا گیا ہے؟"

"ہم تو نوکر ہیں صاحب جی! مالکوں کی باتیں ہمیں کیا معلوم۔" چوکیدار نے کہا اور علی شاہ مایوس ہو گیا۔ دل بہت کچھ پوچھنے کو چاہتا تھا لیکن اپنے دوست کی رسوائی گوارہ نہیں تھی۔ اپنی زبان سے وہ الفاظ ادا نہیں کر سکتا تھا جو سکول میں دوسرے لڑکوں نے کہے تھے۔

بڑا اداس اور بڑا ملول گھر لوٹا۔ ماں بے وقت گھر دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"بگڑ گئی نا طبیعت...... منع کیا تھا سکول جانے کو۔ جلدی کیسے آ گئے؟"

"ہاں...... طبیعت خراب ہو گئی ہے۔"

"میں نے منع کیا تھا نا، ایک دن کی چھٹی اور کرتے تو کیا تھا۔ دیکھو تو ماتھا کیسا سلگ رہا ہے۔"

بیماری کیا تھی، اکرام کے بارے میں سن کر بخار چڑھ آیا تھا۔ یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو

گیا اور کیسی کیسی کہانیاں سننے کو ملیں...... اکرام مجھے بتائے بغیر کراچی چلا گیا۔ کراچی میں اس کا کون ہے؟ علی شاہ نے ماں کو تو کچھ نہیں بتایا لیکن باپ سے کہا۔

"ابو! میں سکول گیا تھا، وہاں ایک عجیب بات سنی ہے میں نے۔ ابو، آپ اس کی تصدیق کریں۔ اکرام کو سکول سے نکال دیا گیا ہے...... اور اس کے بارے میں کچھ عجیب عجیب سی باتیں کہی گئی ہیں۔"

"کیا؟"

"یہ کہ وہ کسی ناچنے گانے والی کا بیٹا ہے اس لئے اسے سکول سے نکال دیا گیا ہے۔"

"کیا......؟" نادر شاہ اچھل پڑا۔

"ہاں ابو! میں سکول سے اس کے گھر گیا تھا۔"

"تو پھر؟" نادر شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کی کوٹھی کے چوکیدار نے بتایا کہ وہ کراچی چلا گیا ہے۔"

نادر شاہ سکتے میں رہ گیا تھا۔ دفعتہً دل میں خیال گزرا کہ بڑے بھائی سے ان کی بیٹی کے رشتے کی بات کی تھی اور بڑے قلابے ملائے تھے۔ اتنی بڑی بات بغیر کسی تحقیق کے کہہ دی تھی۔ چوہدری جواد حسین سنیں گے تو کیا کہیں گے کہ خوب رشتہ سوچا تھا۔ کہیں برا نہ مان جائیں۔ ویسے تو بات ٹالی جا سکتی ہے۔ پتہ چل گیا تو بے عزتی ہو جائے گی۔ چنانچہ علی شاہ سے کہا۔

"سنو، گھر میں کسی سے اس کا بھولے سے بھی تذکرہ نہ کرنا۔ بھول کر بھی نہیں۔ میں ذرا تصدیق کر لوں۔"

"ٹھیک ہے ابو...... میری بیماری کی درخواست بھی دے دیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ آج بھی آدھے دن سے کسی کو کچھ بتائے بغیر چلا آیا۔"

"ٹھیک ہے...... فکر مت کرو۔"

نادر شاہ کو بھی یہ سب بڑا عجیب لگا تھا۔ یہ خیال اس کے دل میں جڑ پکڑ گیا کہ چوہدری جواد حسین کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ اس بات کا برا منائیں گے کہ ایک طوائف زادے کو داماد چنا تھا۔ دوسرے ہی دن سکول پہنچ گئے۔ ذمہ دار لوگوں سے ملے اور اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ اکرام ہیرا منڈی کی ایک طوائف کا بیٹا ہے...... اس لئے اسے شرفاء کے

اس سکول سے نکال دیا گیا۔ رب نواز شاہ نے اپنی داشتہ کی اولاد کو اپنا نام لے کر اسے یہاں داخل کرایا تھا۔ نادر شاہ لاحول پڑھتا ہوا سکول سے واپس آ گیا تھا۔

○●○

وہی کوٹھی کرائے پر حاصل ہو گئی۔ نور شاہ صحیح جگہ پہنچ گیا تھا۔ لین دین کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بہرحال اس وقت شاہ جی لان میں بیٹھے سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ساتھی پاس ہی موجود تھے۔ دفعتہً ہی شاہ جی نے کہا۔

”اکرام کہاں ہے؟“

”اندر سو رہا ہے۔“

”اداس ہوگا۔“

”ہاں...... ہے تو۔“

”کتیا کے پلوں نے خوامخواہ کا جھگڑا ڈال دیا ہے۔ بچے کی پڑھائی بھی خراب ہو رہی ہے۔ چھوڑوں گا نہیں قسم ایمان کی...... ایسا وار کروں گا کہ پتہ چل جائے گا کہ کسی نے اپنی اصل دکھائی ہے۔ فضل خان! وہ کوٹھی کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا؟“

”بک گئی شاہ جی!“

”ہاں، یاد تو پڑ رہا ہے...... بنکوں سے کاغذ تو آ گئے تھے؟“

”جی۔“

”رقم لاہور منتقل ہو گئی؟“

”جی ہاں۔“

”کمبخت دماغ کچھ کمزور ہو گیا ہے...... کسی نے کوئی رکاوٹ تو نہیں ڈالی؟“

”کوئی اطلاع نہیں ملی۔“

”دوسری زمینیں بھی بیچنی ہیں۔ وکیل صاحب کو لکھ دو۔“

”ابھی کیا ضرورت ہے شاہ جی! لاکھوں روپے پڑے ہوئے ہیں، ابھی زمینیں رہنے دو۔“

”حالات کچھ نہ کچھ بگڑیں گے ضرور...... دل گواہی دے رہا ہے۔ حالات بگڑ گئے تو پھر زمینیں بیچنا مشکل ہو جائے گا۔ خیر بعد میں دیکھ لیں گے۔“

”شاہ جی! کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

”تو پھر پوچھ لو...... پریشانی کس بات کی ہے؟“

”بتا دیجئے۔“

”دیکھو شہزادے، گاڑی تو چل رہی ہے۔ ذرا خرابی ہو گئی ہے۔ پہلی پر تو ماسٹر شیر علی آ گئے۔ وہ بگڑے ہوئے آدمی ہیں، ہمیں تو اب تک ان کی خاموشی پر حیرانی ہے۔ اور اگر انہوں نے یہ چکر چلایا ہے تو بہت برا کیا ہے۔ اس دن کے بعد سے ہم ان کی عزت نہیں کر سکیں گے۔“

”اگر ان کا معاملہ نہ ہوا تو؟“

”تو پھر کھیل دوسرا ہوگا...... یا تو ہمارا شہزادہ اسی سکول میں پڑھے گا یا پھر سکول باقی ہی نہیں رہے گا۔ اب پوری بات سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ ہیرا منڈی اس لئے چھوڑ دی ہے کہ کوئی آسانی سے ہم تک نہ پہنچ جائے۔ کچھ سسروں کو تو اکرام کی کوٹھی کا بھی پتہ ہے اس لئے وہ بھی مشکوک ہو گئی ہے۔ خیر تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔ بس ایک مشکل آ پڑی ہے۔“

”کیا؟“

”کوثر جہاں سے وعدہ کیا تھا کہ اکرام کے باپ کا پتہ لگائیں گے۔ اس سلسلے میں ابھی تک کوئی قدم آگے بڑھا نہیں ہے۔ ہم زبان کے لئے ہی تو جیتے ہیں۔ برے ہیں ناں، گندا خون ہے ہماری رگوں میں۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں، ابھی تو آگے بڑھیں گے۔ آگے بڑھ کر ایک اور کردار پیش کریں گے۔“

”جی شاہ جی۔“

”اور وہ پرنسپل مقدمہ دائر کرنے کو کہہ رہا تھا، اس بات پر کہ ہم نے ایک طوائف کا بچہ اس کے سکول میں داخل کر دیا۔ ہم نے کہا بھی اس سے کہ اکرام نواب زادہ ہے مگر بات نہیں مانی اس نے۔ خیر آن پر بنی ہے، قربانی تو دینا ہی پڑے گی۔ ٹھیک ہے، ملاقات کریں گے اس ذات کے کھرے سے بھی۔“ شاہ جی پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگے۔

○●○

نادر شاہ شدید الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ اکرام کی شکل نگاہوں میں آتی تو دل دکھنے لگتا۔ کیا پیارا بچہ ہے، موسم بہار کا نوشگفتہ پھول۔ مگر کسی کی بے رحمی کا شکار۔ نادر شاہ کا اپنا کوئی قصور

نہیں تھا لیکن یہ احساس تھا انہیں کہ بھائی کیا سوچیں گے کہ ان کی اکلوتی بیٹی کے لئے کیا عمدہ رشتہ تلاش کیا۔

بہر حال خاموشی اختیار کر لی۔ اس کے علاوہ انہوں نے علی شاہ کو بھی چالاکی سے سکول جانے دیا۔ چوہدری جواد حسین شاہ کا ابھی واپسی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بہر حال ناصرہ بیگم نے شوہر کی پریشانی بھانپ لی اور بولیں۔

''کیا بات ہے...... آپ کچھ الجھے الجھے سے ہیں۔''

''ہاں، ایک بڑی عجیب سی مشکل آپڑی ہے۔''

''خیریت تو ہے...... کیا ہوا؟''

''کیا بتائیں، ہوسکتا ہے کوئی بات ہی نہ ہو۔ بس ایک احساس پریشان کر رہا ہے۔ وہ بچہ اکرام ہے ناں، اسے سکول سے نکال دیا گیا ہے اور جانتی ہو کیوں نکالا گیا ہے، اس لئے کہ وہ ہیرا منڈی کی ایک طوائف کے بطن سے پیدا ہوا ہے اور اس کی ماں آج تک ہیرا منڈی میں پیشہ کرتی ہے۔''

''کک...... کک...... کیا......؟'' ناصرہ بیگم کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''واقعی، یہ سچ ہے۔''

''مگر اس کا باپ کون ہے؟''

''پتہ نہیں، کیا کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال ایسے المیے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ قصور کس کا ہے، کوئی نہیں مانے گا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ رب نواز شاہ نے کسی زمانے میں اکرام کی ماں سے آشنائی رکھی ہوگی اور اس کی یادگار یہ لڑکا ہوگا۔ انہوں نے لڑکے کو اپنی تحویل میں لے کر پرورش کیا ہوگا۔ اب بات کھل گئی۔''

''ہائے یہ تو برا ہوا...... بچے کا کیا قصور ہے؟''

''میں اس لئے پریشان ہوں کہ بھائی جان کو پتہ چلے گا تو کیا سوچیں گے اس بارے میں۔ بڑے غمزدہ ہو جائیں گے وہ۔ بھابی تو بڑی چاہت سے اکرام کا نام لینے لگی ہیں۔''

''مگر اس میں ہمارا کیا قصور ہے...... ہمیں معلوم ہی کیا تھا۔''

''بس یہی سوچتا رہتا ہوں۔''

''میری رائے ہے کہ بھائی جان کو یہ بات بتا دیں۔''

''میں ان کا مزاج سمجھتا ہوں، اسی لئے تو ڈر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ واپسی کا ارادہ کریں اور تاریخ طے کر لیں۔ اس وقت تک انہیں ٹالتا رہوں گا اور یہ کہتا رہوں گا کہ رب نواز کے سلسلے میں تھوڑی تحقیقات ہو جائے تو پھر انہیں لکھوں گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ ابھی انہیں یہ بات بتانا نہیں چاہتے۔''

''کہا ناں، میں ان کا مزاج سمجھتا ہوں۔ چونکہ ثمانہ سے انہیں قلبی لگاؤ ہے اس لئے برا مان جائیں گے۔''

''خیر، ان کی دل شکنی تو واقعی نہیں ہونی چاہئے۔''

''اصل خطرہ علی شاہ سے ہے۔ کہیں وہ تذکرہ نہ کر دے۔''

''خاموشی ہی اختیار کئے رہنا بہتر ہے۔ میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گا۔''

''ہائے کتنا حسین بچہ ہے...... ہر طرح سے معیاری لگتا ہے۔ خدا انہیں غارت کرے ان عیاش طبع لوگوں کو۔ اپنی نفسانی خواہشوں کی تکمیل کے لئے بالا خانوں کا رخ کرتے ہیں، پھر وہاں ایسی درد بھری کہانیاں چھوڑ آتے ہیں۔ ذرا آپ غور تو کریں، یہ معصوم بچے جو فطرت کے عمل کے تحت عالم وجود میں آ جاتے ہیں، زندگی کے آخری لمحے تک اپنی مایوسیوں کے رونے روتے رہتے ہیں۔ نہ انہیں معاشرے میں کوئی مقام حاصل ہوتا ہے اور نہ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اب یہ رب نواز شاہ لاکھ سر پیٹتے رہیں، بھلا طوائف زادے کی چھاپ اس سے دور ہو سکتی ہے؟ ہائے یہ بچہ ساری زندگی بھر کے لئے محرومیوں کا شکار ہو گیا۔ پتہ نہیں اکرام کو اس سلسلے میں کچھ معلومات حاصل ہیں یا نہیں۔ بہر حال بڑی درد بھری بات بتائی ہے آپ نے۔''

ناصرہ بیگم بڑی دیر تک افسوس کا اظہار کرتی رہیں۔

پھر ایک دن چوہدری جواد حسین کو ایک فون موصول ہوا اور وہ فون سن کر بری طرح اچھل پڑے۔ انہوں نے بڑی بدحواسی سے بیوی کو آواز دی۔

''فاخرہ...... فاخرہ! ذرا سننا، ادھر آؤ...... اوہو، دیکھو یہ کیا ہو گیا۔''

فاخرہ بیگم ان کے پاس پہنچ گئیں۔ نادر شاہ بھی حیرانی سے ادھر دیکھنے لگے تھے۔

''کیا ہوا...... خیر تو ہے؟ اللہ خیر کرے۔''

''افسوس...... افسوس میرا یار انتقال کر گیا جس کی وجہ سے سب کو چھوڑ چھاڑ کر لندن

میں پڑا ہوا تھا۔ جب بھی کبھی یہاں آنے کا ارادہ کیا اس نے پاؤں آگے رکھ کر کہاں میاں! ذرا جا کر تو دکھادو۔ دوست تھا کہ بس بے مثال۔ دوستی کی آخری حد کو چھوتا ہوا۔ ہمارے گھر کو ہی اپنا گھر سمجھتا تھا...... میں تو کہتا ہوں کہ میری جدائی اسے کھا گئی۔ دھت تیرے کی، کیا برے وقت ساتھ چھوڑ گیا...... بس کیا کہیں کیا نہ کہیں......" بہت دیر تک چوہدری صاحب اپنے انگریز دوست کو روتے رہے۔ آخر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے۔

"واہ بھئی واہ، ہمارا یار تو چلا گیا لندن سے...... اب کیا کریں گے وہاں جا کر؟"

نادر شاہ کا منہ حیرت سے کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ بہرحال یہ بات پریشان کن تھی کہ چوہدری صاحب فوراً ہی یہاں رک گئے تھے۔ لندن چلے جاتے تو یہاں کی بات ہموار ہو سکتی تھی۔ لیکن اب کیا، کیا جا سکتا تھا...... ہاتھ پکڑ کر تو بھائی کو گھر سے نہیں نکال سکتے تھے۔ بڑی عجیب سی صورتحال پیش آ گئی تھی۔ واقعی ذرا پریشان کن تھی۔ پھر دو تین دن کے بعد یہ مشکل حل ہو گئی۔

"بھئی نادر شاہ! یہ تمہاری بھابی کہہ رہی ہیں کہ کچھ عرصے کے لئے شیخوپورہ ہو آئیں۔ وہاں کچھ شناسائیاں بھی ہیں۔ میں نے تمہیں شمس الدین کے بارے میں بتایا تھا، کہا بھی تھا شمس الدین نے کہ میں ان کے گھر ضرور جاؤں اور فاخرہ کے بھی کچھ عزیز ہیں وہاں پر۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان! اس طرح آپ کی ذہنی کیفیت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"تو کل تم ہماری روانگی کا بندوبست کر دو۔" چوہدری صاحب نے کہا اور نادر شاہ نے سکون کا گہرا سانس لیا۔

○●○

کراچی یونیورسٹی میں بہت سے ایسے واقعات ہو چکے تھے جب رب نواز شاہ نے بڑے بڑے اہم لوگوں سے جھگڑے مول لے لئے اور خود ہی ان جھگڑوں کو نمٹا بھی لیا تھا۔ ایک اچھا خاصا گروپ بن گیا تھا ان کا اور انہوں نے کچھ ایسے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا جو بڑے بڑے سرکاری عہدیدار تھے۔ ان کا کام کسی نہ کسی شکل میں ہو ہی جاتا تھا۔ محکمہ تعلیم کے ایک بہت بڑے افسر اعلیٰ سے ملاقات کا انہوں نے خود ہی بندوبست کیا تھا۔ کچھ حوالے دینے سے انہیں افسر اعلیٰ سے ملاقات کے لئے وقت مل گیا تھا اور مقررہ وقت پر وہ افسر اعلیٰ کے پاس پہنچ گئے۔ ایک بارعب شخصیت نے دوسری بارعب شخصیت کا

استقبال کیا۔ رب نواز شاہ اس وقت بڑی شان وشوکت کے ساتھ غلام حیدر شاہ صاحب کے پاس پہنچے تھے۔

"تشریف رکھئے...... غالباً رب نواز شاہ ہے آپ کا نام۔"

"جی ہاں...... اور میں آپ سے نواب زادہ لیاقت علی خان کے بارے میں کچھ بات کرنے آیا تھا۔"

"اوہو...... ہاں، ہاں...... ٹھیک ہے۔ غالباً آپ نے وہاں کسی لڑکے کو داخل کرایا تھا...... وہی بات ہے ناں؟"

"جی ہاں۔"

"اور وہ لڑکا ایک طوائف زادہ تھا۔"

"آپ کہہ لیجئے غلام حیدر شاہ صاحب! لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک شریف آدمی کا ہی بیٹا ہے۔"

"اور اس شریف آدمی کا نام رب نواز شاہ ہے؟"

"جی نہیں۔"

"لیکن وہاں اس کی ولدیت میں تو یہی نام لکھوایا گیا تھا۔"

"جی ہاں...... بعض جگہ کوئی مجبوری ہوتی ہے اور اسی مجبوری کی بنا پر میں نے اپنا نام اس کے باپ کی جگہ لکھوایا تھا۔"

غلام حیدر شاہ کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"وہ مجبوری کسی طوائف سے عشق بھی ہو سکتی ہے۔ بہرحال ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ تاہم شاہ صاحب! آپ نے یہ جرم کیا ہے۔ کیونکہ آپ کو علم ہے کہ جس سکول میں آپ نے اپنے منظور نظر طوائف زادے کو داخل کروایا وہاں بڑے بڑے جاگیرداروں، نواب زادوں اور رئیس زادوں کے بیٹے پڑھتے ہیں۔ بہت بڑے بڑے لوگ اپنے بیٹوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے یہاں بھیجتے ہیں۔ ایسی جگہ کسی طوائف زادے کا تعلیم حاصل کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ ہمارے کاغذات میں یہ بات درج کر دی گئی ہے کہ جب تک بچے کا حسب نسب پوری طرح دریافت نہ کر لیا جائے، داخلہ نہ دیا جائے۔ ایک جعلی نام سے آپ نے اس طوائف زادے کو اس سکول میں داخل کروا کر حکومت کے قوانین کے خلاف بغاوت کا

اعلان کیا ہے۔اس جرم کی آپ کو پوری سزا دی جاسکتی ہے شاہ جی۔“

”یہ بات ٹھوس لے شہزادے! اچھلنے کی کوشش مت کر...... یہ ملک ہمارا ہے، قانون ہمارا ہے۔تم لوگ اپنے قانون بنا کر کہاں سے بیٹھ گئے۔“

”خوب، خوب......آپ نے یہ بازاری لہجہ اختیار کر کے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ......“

”بس بس...... بولنے سے پہلے ذرا زبان کو سنبھال لینا۔ اگر تم شرافت سے بات کرتے تو ہم بھی شرافت سے بات کرتے۔مگر لگتے کسی چمار کی اولاد ہو۔ نچلے طبقے کے لوگ پڑھ پڑھ کر بڑی بڑی کرسیوں پر آبیٹھے ہیں۔تم اگر یہی زبان اختیار نہ کرو گے تو اور کیا کرو گے۔“ غلام حیدر شاہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔اس نے کہا۔

”تم جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو؟“

”ارے ہاں، جانتے ہیں...... کتنی بار کہو گے یہ بات۔“

”تمہارے ساتھ یہاں کیا سلوک ہوسکتا ہے۔“

”ارے چھوڑو، بات سنو۔اس وقت سلوک کرنے والا کوئی نہیں ہے یہاں۔صرف تم ہو ہمارے سامنے اور ہم ہیں تمہارے سامنے۔اور یہ بات تم جانتے ہو شاہ جی! کہ تم بھی شاہ، ہم بھی شاہ۔یہاں سے نکلنے سے پہلے ہم تمہیں ضرور ختم کر سکتے ہیں، یہ کام ہمارے لئے مشکل نہیں ہوگا۔بعد میں جب تم ہی اس دنیا میں نہ رہے تو تمہارا قانون تمہارے کس کام آئے گا۔“

غلام حیدر پھٹی پھٹی نگاہوں سے رب نواز شاہ کو دیکھنے لگا۔رب نواز شاہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔”ہماری پوری بات سن لو...... اس کے بعد بادشاہ بن لینا۔ہم تم سے کھلے دل سے کہہ رہے ہیں اور سچ کہہ رہے ہیں کہ وہ ایک شریف آدمی کا بیٹا ہے، صرف ایک طوائف زاد نہیں ہے۔بے شک وہ ایک طوائف کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے لیکن نسل تو باپ سے چلتی ہے۔تصدیق کرا دیں گے کسی مناسب وقت۔سنو غلام حیدر شاہ! اسے سکول میں پڑھنا چاہئے۔اگر وہ اس سکول میں نہ پڑھا تو کوئی کتے کا پلا اس سکول میں نہیں پڑھے گا سمجھے جب یہ سکول ہی نہ رہے گا تو یہاں پڑھے گا کون۔“

”تم دھمکیاں پر دھمکیاں دیئے جا رہے ہو......اس کا نتیجہ جانتے ہو؟“

”ہم تو جو کچھ جانتے ہیں سو جانتے ہیں۔اصل میں تمہیں جان لینا چاہئے۔چھوڑ دا

باتوں کو، اکرام کی نشاندہی کس نے کی تھی؟“

”جہاں تک میرے علم میں بات آئی ہے اس آدمی کا نام راجہ دلاور ہے جس کا بیٹا وہاں تعلیم حاصل کرتا ہے شاید راجہ سخاوت۔راجہ دلاور نے ہی اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ایک طوائف زادہ بھی اس سکول میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔“

رب نواز شاہ کا منہ ایک لمحے کے لئے حیرت سے کھلا پھر اسی انداز میں بولے۔

”ارے حرام کے جنے......تو یہ تھا تُو...... ہم نے تو سوچا بھی نہیں تھا...... ارے واہ آستین کے سانپ تو نے یہ حرکت کی۔بہر حال صاحب جی! آپ نے ہم سے جو بات بھی کی لیکن یہ ایک نشاندہی کر کے آپ نے ہم پر واقعی احسان کر دیا ہے۔زبان کے ہم بھی خراب ہیں۔آپ نے بات ایسی کی تو ہمارے منہ سے بھی سخت بات نکل گئی۔مگر صاحب! کسی ایک آدمی کے کہہ دینے سے آپ کسی ایک لڑکے کو طوائف زادہ قرار دے کر اس کا پورا مستقبل خراب نہ کریں۔سکول سے اس کی رپورٹ نکلوایئے، دیکھئے کتنے اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتا رہا ہے۔بس اسے اس لئے سکول سے نکالا جا رہا ہے کہ وہ ایک طوائف کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ارے صاحب! ان حرام زادے رئیسوں اور نوابوں کے ہاں جو اولادیں ہوتی ہیں ان کے بارے میں بھی ذرا غور کر کے تصدیق کریں۔نجانے کیسے کیسے نکلیں گے۔“

”چھوڑیں ان باتوں کو......ان میں کیا رکھا ہے۔آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟“

”بس یہ سوچ کر آئے تھے کہ شاید آپ کے پاس سے کوئی تسلی بخش جواب مل جائے اور ہم یہاں سے خوشی خوشی جائیں لیکن آپ نے خوش نہیں کیا ہمیں۔“

”خوش تو آپ نے کر دیا ہے ہمیں رب نواز شاہ! آپ کیا سمجھتے ہیں کہ کیا آپ کی باتیں نظر انداز کی جاسکتی ہیں؟“

”نظر انداز ہی کر دو شہزادے تو زیادہ اچھا ہے تمہارے لئے ورنہ ہم بگڑے ہوئے دماغ کے آدمی ہیں۔کیا سمجھے؟“

”ٹھیک ہے......میرے لائق اور کوئی خدمت؟“

”اب کیا خدمت کرو گے تم ہماری۔چلتے ہیں۔خدمت تو اب ہمیں تمہاری کرنی ہے۔“

شاہ جی نے کہا، اپنی جگہ سے اٹھے اور بڑی شان سے سینہ تانے باہر نکل آئے۔افسر اعلیٰ انہیں کینہ توز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔جو کچھ رب نواز شاہ نے اسے اس کے آفس میں بیٹھ

کر کہہ دیا تھا یہ کوئی معمولی باتیں نہیں تھیں۔ بہر حال جو شخص یہ الفاظ کہہ کر نکلا ہے وہ یقینی طور پر کوئی معمولی حیثیت کا مالک نہیں ہوگا۔ کسی بنیاد پر ہی اس نے یہ الفاظ ادا کئے ہوں گے۔ اور بہر حال وہ سمجھداری سے کام لینا چاہتا تھا۔

شاہ جی وہاں سے نکلے، گاڑی میں بیٹھے۔ آخری امید بھی ٹوٹ گئی تھی۔ سینے میں آگ ہی آگ بھری ہوئی تھی۔ راستے میں انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''نہیں...... اب سکول کو قائم نہیں رہنا چاہئے۔ مگر اس سے پہلے راجہ دلاور...... ارے تیرے کی...... ارے تیرے کی......''

○●○

رب نواز شاہ کا موڈ حیرت انگیز طور پر بہت اچھا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ شالے خان حقے پر چلم رکھ رہا تھا۔

''معاف کرنا، یہ کام تمہیں کرنا پڑ رہا ہے۔ مگر ابھی ہم یہاں نوکر وغیرہ نہیں رکھ سکتے۔''

''نہیں شاہ جی! ایسی باتیں کہہ کر ہمیں شرمندہ کیوں کر رہے ہیں۔''

''اچھا بیٹھو'' شاہ جی نے کہا اور انہوں نے اپنی کرسی سنبھال لی۔ دوسری کرسیوں پر باقی افراد بیٹھے ہوئے تھے جن میں اکرام بھی تھا۔

''کوئی مزے کی بات کی جائے اور مزے دار حقہ سامنے نہ ہو تو مزہ خراب ہو جاتا ہے۔ تم سب لوگوں کے چہروں پر بڑا تجسس پھیلا ہوا ہے، بات ہی ایسی مزے دار ہے کہ ہم نے سوچا ذرا مزے لے لے کر کہی جائے۔''

''اب کہہ بھی دیجئے شاہ جی! ہمارا خون ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔'' فضل خان نے کہا۔

''چھری تلے دم لیا کرو...... وہ حرام کا جنا جو بڑی بڑی باتیں کر رہا تھا، ہم اسے دیکھ سکتے ہیں۔ بات، مان لیتا ہماری تو بڑی اچھی بات تھی۔ لیکن خیر ہم بھی اوپر گالیاں سنا کر آئے ہیں۔ ہمارا حق چھین رہا ہے...... ارے ہم کیسے مان لیں تمہارے قانون کو؟ گھر کی بات ہے، قانون تو انسانوں کو انسان ہی کہتا ہے۔ خیر سیاست کی باتیں سیاستدان جانیں ہماری سیاست تو بہت تھوڑی سی ہے۔ اب دیکھو ناں ہمارا شہزادہ تعلیم حاصل کر کے مکمل ہو جاتا، ہم اس کے لئے اپنی پسند کی زندگی کا آغاز کر دیتے تو ہمارا کسی سے کوئی جھگڑا نہ ہوتا۔ کہنے لگے اس سکول میں نہیں پڑھے گا، ارے کیوں نہیں پڑھے گا؟ اس کے باپ کا نام رب

نواز شاہ ہے۔ ہماری اولاد اس سکول میں نہ پڑھے گی تو ان حرامیوں کی پڑھے گی جو اپنے آپ کو رئیس، نواب، راجہ، مہاراجہ، جاگیردار اور نجانے کیا کیا کہتے ہیں۔ اور انگریز کتوں کے دیئے گئے خطاب سے انگریزوں کو ماننے والے کتے اپنے آپ کو سربلند سمجھتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں سمجھتے رہیں، ہمیں اس سے کیا۔ مگر ہمارا شہزادہ اس سکول میں نہیں پڑھے گا تو اس سکول میں کوئی نہیں پڑھے گا۔ یہ سمجھ لیں، ہماری قسم تھی۔ اور جو منہ سے نکل گیا سو نکل گیا...... اب آگے کا کام کرنا ہے۔ وہ بڑے صاحب کہنے لگے، نہیں بھئی یہ لڑکا اس سکول میں نہیں پڑھے گا۔ تو ہم نے بھی ان سے کہہ دیا کہ سر! اگر یہ نہیں پڑھے گا اس سکول میں تو کوئی نہیں پڑھے گا۔ کہنے لگے تم قوانین سے بغاوت کر رہے ہو۔ ارے ہم نے اپنے گھر کے قوانین سے بغاوت کر ڈالی تو یہ قانون کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اچھا خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ ہاں ذرا نئی بات سنو! وہ حرام کا پلّہ یاد ہے تمہیں، راجہ دلاور کا بیٹا سخاوت؟''

''ہاں، ہاں......'' سب لوگ اچھل پڑے۔

''راجہ دلاور پہنچے تھے ایجوکیشن آفیسر کے پاس۔ اصل میں بیٹے کی جو جتائی ہوئی تھی، جوتے پڑ گئے تھے ناں سسرے کے منہ پر تو اس نے سوچا کہ یہ تو بری ہوئی۔ بڑی رقم خرچ کر دی تھی اس ہیجڑے کو مرد بنانے میں مگر رہا سسرا وہی کا وہی۔ اکرام کے ہاتھوں جوتے کھا گیا۔ دلاور کو بھلا یہ بات کہاں برداشت ہوتی۔ راجہ کہلاتے تھے حرام کے جنے بدلہ لینے کے لئے پہنچ گئے اپنے ابا کے پاس کہ اکرام کو سکول سے نکلوا دیا جائے۔ اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بڑی رقم خرچ کی ہوگی، ان سسروں کو ہم جانتے ہیں۔ جوتے کھا بیٹھے اور مروا دیا اپنے ساتھ ان دونوں افسروں کو بھی۔ مگر اب باتیں بنانے سے کچھ نہیں ہوگا، مستعد ہو جاؤ۔ آن کی بات ہے اور تم لوگ جانتے ہو کہ رب نواز شاہ کو بس آن پیاری ہے۔ باقی کیا رکھا ہے۔ کھایا، پیا، بہت عیش کر لی، زندگی گزار لی، اب کیا لینا دینا ہے۔ آن گئی تو جان گئی۔

''ٹھیک ہے شاہ جی! ہم دل و جان سے آپ کے ساتھ ہیں۔ ہمیں حکم دیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''دیکھو اس وقت اس بات کی بات نہیں ہے ذرا دور تک کمند ڈالنی پڑے گی اور لمبے کھیل کھیلنے پڑیں گے۔ اس لئے ہم سوچ رہے ہیں کہ ساری باتیں اس وقت کر لیں۔

دیکھو، بات اصل میں یہ ہے کہ اللہ نے سب کو دنیا میں اکیلا اکیلا بھیجا ہے۔ اپنی میا کے
پیٹ سے چیاؤں چیاؤں کرتے ہوئے برآمد ہوتے ہیں اور دنیا کو چھوڑ چھاڑ کر اکیلے چلے
جاتے ہیں۔ دوستی، رشتے ناتے ہوتے تو سب کے سب ہیں مگر ہمارا خیال ہے کہ ایک حد
تک نبھانے چاہئیں۔ بات حد سے بڑھ جائے تو مزے دار نہیں رہتی۔ ہم تو سرپھرے
ہیں، کوئی رگ زیادہ پھڑکتی ہے تو ایسے الٹے سیدھے کام کر ڈالتے ہیں۔ مگر دیکھو تم سب کو
خود پر اختیار ہے۔ اب جو کام شروع ہوگا اس میں بڑے خطرے ہیں۔ ہم کیا، ہماری بساط
کیا۔ ہم تو بس داؤ لگا رہے ہیں اور داؤ کے نتیجے میں داؤ لگیں گے ادھر سے، سارے کے
سارے خطرے میں گھر جاؤ گے۔ یا تو یہ کام ہمیں اکیلے ہی کر لینے دو اور تم لوگ اپنے اپنے
راستے ناپو۔ کسی کو زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے، جذباتی ہو رہے ہو تو یہ بات
سوچ لینا کہ اچھی نہیں گزرے گی۔ کب تک، یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔"

چاروں ساتھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہ جی کو دیکھنے لگے۔ کئی منٹ تک ان پر سکتہ
طاری رہا۔ اکرام بھی ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ جی نے جوان کی ایسی کیفیت پائی تو خود ہی
ہنس کر بولے۔

"سانپ کیوں سونگھ گیا تم لوگوں کو یار! بات کرو۔ دیکھو کھلے دل سے بات کرو بھئی۔
بڑی پکی یاری ہے ہماری تمہاری۔ ختم بھی کبھی نہیں ہوگی۔ اطمینان رکھو، ہم بھی صورتحال کی
نزاکت کو سمجھتے ہیں۔ ہم نے تو بہت کچھ دیکھ لیا ہے اس دنیا میں، تم نے ابھی کیا دیکھا ہے۔"

"شاہ جی! میں سب کی ترجمانی تو نہیں کر رہا، اپنی بات کر رہا ہوں۔ آپ کے ذہن
میں یہ بات آئی کیسے؟ یہ خیال آپ کے دماغ میں آیا کیسے شاہ جی؟ کیا ہم سے کوئی کوتاہی
ہوگئی؟ آپ نے ہمیں خود سے الگ رکھ کر کیوں سوچا؟" نور شاہ نے کہا۔

"دیکھو...... جذباتی نہ ہونا۔ اگر بات اتنی ٹیڑھی نہ ہوتی تو ہم ایسی بات ہی نہ کہتے۔
لیکن معاملہ حد سے زیادہ الجھا ہوا ہے۔ بہت بڑوں بڑوں سے جھگڑا شروع ہوگیا ہے۔
بات ذرا بگڑی ہی رہے گی۔ حالانکہ مزہ تو آئے گا۔ اب ہمارے پیچھے کون ہے جو ہمارے
لئے پریشان ہوگا...... اور کیوں ڈروں میں ان سسروں سے؟"

"ٹھیک ہے شاہ جی! آپ کے آگے پیچھے جو کوئی بھی ہے، کم از کم ہم سے تو یہ بات نہ
کہیں۔ لیکن خدا کے لئے اب اپنے آپ کو ہم سے الگ نہ سوچیں۔"

"تمہاری مرضی ہے۔ اب تمہارے ساتھی سوچتے ہیں۔" شاہ جی حقے کے کش لینے
لگے۔ خمیرے کی خوشبو فضاؤں میں منتشر ہو کر اظہار کر رہی تھی کہ حقہ پوری طرح تیار ہوگیا
ہے۔ شاہ جی کے حلق سے نکلنے والا سفید گاڑھا گاڑھا دھواں فضا میں خوشبو بکھیرتا ہوا منتشر
ہوتا رہا اور شاہ جی کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ اکرام بھی عجیب سی نگاہوں سے انہیں
دیکھ رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ شاہ جی کہیں اس سے بھی علیحدگی کی بات نہ کریں۔ لیکن ایسے
کسی تصور پر بھی وہ اپنی زندگی ختم کرنے کے لئے تیار تھا۔ بھلا اب شاہ جی کے علاوہ اس کی
زندگی میں کیا رہ گیا تھا۔ اور پھر یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شاہ جی اس کی وجہ سے
اپنی بھری پری زندگی چھوڑ رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شاہ جی ایسا کوئی کام کریں لیکن
اس کی اپنی فطرت میں بھی ایک انتقامی جذبہ پوشیدہ تھا اور سخاوت کے بارے میں یہ جان
کر کہ اس سے شکست کھا کر اس کے باپ نے باقاعدہ ان لوگوں سے دشمنی باندھ لی ہے،
اکرام کے دل میں بھی انتقام جاگ اٹھا تھا۔ شاہ جی تھوڑی دیر تک حقے کے کش لیتے رہے،
پھر انہوں نے کہا۔

"اب جب یہ بات ہمارے تمہارے درمیان طے ہوگئی ہے تو آگے بات کی جائے۔"

"جی شاہ جی! فرمائیے، اب آگے کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟"

"ہم نے کہہ دیا تھا اس افسر سے بلکہ دونوں افسروں سے کہ ہمارا بیٹا اس سکول میں نہیں
پڑھے گا تو کوئی اور بھی نہیں پڑھے گا۔ اب کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی ہے، لیکن
اس سکول کو قائم نہیں رہنا چاہئے۔ اس کے لئے ہمیں کوئی اچھا منصوبہ بنانا ہے۔ اصل میں
ان بھڑووں نے ہمارے بارے میں تحقیق نہیں کی تھی۔ اکرام وہاں پڑھتا رہتا اگر راجہ
دلاور وہاں فریاد لے کر نہ پہنچ جاتا۔ چنانچہ ہمارا پہلا مجرم تو راجہ دلاور ہی ہے۔ اسے سزا
دینی ہوگی اور اس کے بعد اس سکول کو ختم کرنا ہوگا اور اس کے بعد خاموشی سے یہاں سے
نکل جانا ہوگا۔ لاہور ہمارے رہنے کی جگہ نہیں رہی ہے۔ کیا سمجھے؟"

نور شاہ نے گردن گھما کر اکرام کی طرف دیکھا تو شاہ جی فوراً بول پڑے۔ "تم جس
طرح ہمارے شہزادے کو دیکھ رہے ہو نور شاہ، ہم تمہیں بتا دیں جو اس کے دل میں ہے وہ
ہماری زبان سے سن لو۔ وہ ہمارا ہے۔ وہ اب کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ ہم جہنم میں بھی جائیں
گے تو وہ ہمارے ساتھ ہی جائے گا۔ کیا سمجھے؟"

"جی شاہ جی......" اکرام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے بہت سکون ہوا تھا یہ الفاظ سن کر۔

"مگر شہزادے! کوئی جلدی نہیں ہے۔ جو کام ہم نے سوچا ہے وہ تو ہونا ہے لیکن اب اتنی برق رفتاری سے بھی کام نہیں کریں گے اور ادھر سے بھی کوئی کارروائی اتنی جلدی نہیں ہوگی کہ ہم پر مقدمہ دائر کر دیا جائے اور ہماری گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے جائیں۔ اور اگر جاری ہو بھی گئے تو سالے وارنٹ لے کر کون آئیں گے۔ سارے کے سارے ہمارے جوتے چاٹتے رہتے ہیں۔ بابا جی ہمارے منسٹر رہے ہیں۔ مگر ہم اتنی جلدی کیوں کریں۔ اب تُو یوں کر اکرام! تُو جا کر اپنی اماں اور بہنوں سے مل لے۔ ہم جو کہہ رہے ہیں ان سے یہی بات کرنا اور مل ملا کر یہیں واپس آ جانا۔ اس وقت تک ہم خاموش بیٹھیں گے۔ اصل میں شالے خان! لاہور چھوڑنے کے بعد ہمیں کوئی ایسی جگہ چاہیئے جہاں ہم سال چھ مہینے امن سے گزار سکیں اور ایسی جگہ ہم نے طے کر لی ہے۔"

"ٹھیک ہے شاہ جی...... بتائیں گے نہیں کون سی جگہ ہے وہ؟"

"تمہیں ہمارا شہریار یاد ہے؟"

"اوہو، وہ نواب شاہ والے شہریار؟"

"ہاں، وڈیرہ ہے، سمجھے...... بہت بڑا وڈیرا ہے۔ وڈیرہ تو خیر وہ ہے ہی لیکن یار اتنا بڑا ہے کہ ایسے یار کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔"

"آپ نے خوب سوچا شاہ جی۔"

"دماغ تو ہمارا بھی کام کرتا ہے۔ نجانے کب سے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ رب نواز کبھی ہمارے گھر کو بھی رونق بخشو۔ بڑا دل والا آدمی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ جب یہاں سے چلنے کا چکر چلے گا تو ہمیں نواب شاہ ہی جانا پڑے گا۔ سارا کام کر کے رکھیں گے۔ یوں سمجھ لو ہاتھ نہیں آنا کسی سسرے کے۔ آگے بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ وہاں اطمینان سے بیٹھیں گے آرام سے سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہیئے، اس کے بعد قدم آگے بڑھائیں گے۔ اگر ضرورت پڑی تو شالے خان! یہ سمجھ لو کہ اس شہر میں چھریاں چلا دیں گے۔ اپنے اکرام کی عزت ا آن کو ہاتھ نہ لگانے دیں گے۔ ہماری زندگی میں اس کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔"

"ہم چاروں آپ کے ساتھ ہیں شاہ جی۔" ان لوگوں نے بیک وقت کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے...... پہلے مرحلے کے طور پر اکرام اپنی ماں کے پاس جائے گا، ان سے ملے گا، انہیں تسلیاں دے گا۔ میں اسے سمجھا دوں گا کہ اسے کیا بات کرنی ہے کوثر جہاں بیگم سے۔ دراصل بات آگے بڑھ رہی تھی اگر یہ کتے کے جنے بیچ میں نہ آتے۔ خیر یہ کام اپنے وقت پر ہی ہونا ہے۔ ہم بھی دیکھ لیں گے کون سا فاصلہ ہے۔ اکرام! تُو ہمارے ساتھ آ، تجھ سے اکیلے میں کچھ باتیں کر لیں۔" شاہ جی نے کہا اور اکرام نے گردن ہلا دی۔ شاہ جی ادھر اُدھر دیکھ کر بولے۔

"ویسے کوئی فکر کی بات نہیں ہے...... یہ تو زندگی کے معاملات ہیں۔ کرنا یہ ہے کہ ہیرا منڈی کے احاطے میں تالا ڈال دو۔ جو اپنی جگہ ہے اسے چھوڑیں گے تو نہیں، بس قیمتی سامان اٹھا لو۔ پولیس نے ہاتھ ڈالا تو بھگتنا پڑے گا۔ جو کچھ بھی لے گئے، ایک ایک سے وصول کر لیں گے۔ اسی طرح اکرام کی کوٹھی سے بھی قیمتی سامان سمیٹ لینا...... چوکیدار کو بھی وہیں رہنے دیں گے۔ ہم تو کہتے ہیں یہ کوٹھی بھی ہمارے پاس ہی رہنی چاہیئے۔ سال ڈیڑھ سال کا کرایہ ادا کر دو کوٹھی کے مالک کو۔ پڑا رہنے دو اس جگہ کو بھی، کون جانے کب کون سی چیز کام آ جائے۔ یہ سارے انتظامات کر لو۔ باقی کام ہم اس کے بعد تمہیں بتا دیں گے۔ جو کچھ ہم نے کہا تم اس سلسلے میں منصوبہ بنا لو اور عمل کر ڈالو۔ آ جا اکرام!" شاہ جی نے کہا اور اکرام کو لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

○●○

زندگی ہر جگہ ایک سی ہی ہوتی ہے۔ جینے کا ایک ہی انداز ہوتا ہے۔ شمشیرہ بیگم ایک منصوبہ بنا کر کوثر جہاں کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ کوثر جہاں، تسنیم کا لباس تبدیل کر رہی تھی اور تسنیم مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ماں کا چہرہ دیکھ کر بار بار کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ کوثر جہاں نے شمشیرہ بیگم کو دیکھا اور مسکرا دی۔

"دیکھیئے تو اماں اس کی شرارتیں...... مجھے دیکھ کر ہنسے جا رہی ہے۔" کوثر جہاں نے کہا اور شمشیرہ بیگم تسنیم کے پاس جا بیٹھیں۔ ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"کیا بات ہے اماں...... کچھ فکرمند ہیں؟"

"ارے بیٹی! سوچتی ہوں کیا کہو گی تم دل میں۔ میں کیا کروں، نصیبوں کی ماری تین تین بیٹیوں کی ماں ہوں بلکہ اب تو چار بیٹیوں کی ہوں، یہ تسنیم بھی مجھ سے الگ تو نہیں

ہے۔ بس بچی ہے، تمہارے مستقبل کا خیال کھائے جاتا ہے۔''

''ارے اماں کیا ہوا...... اچھی خاصی زندگی تو گزار رہے ہیں ہم۔ کیا مجھے معلوم نہیں ہے کہ آپ نے بینکوں میں کتنا روپیہ جمع کرا رکھا ہے؟''

''بیٹی! وقت بہت بری چیز ہے۔ ساتھ دیتا ہے تو وہ پیسہ۔ بس جو کچھ اپنے پاس ہے وہی اپنا ہے، باقی کیا رکھا ہے۔''

''آپ کو پھر پیسے کا مرض لاحق ہو گیا۔''

''دیکھو کوثر جہاں! دل دکھانے والی باتیں نہ کرو۔ دل کا مرہم لینے آئی ہوں تمہارے پاس۔ زخم نہ دو۔''

''نہیں اماں! بیٹھ جائیے۔ اب کوئی ایسی بات نہیں کروں گی جس سے آپ کو دکھ ہو۔ کہئے کیا کہنا چاہتی ہیں؟ بتائیے۔''

''میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ یہ کون سی نحوست ہم پر سوار ہوئی ہے کہ جو ہماری بات نہیں بننے دیتی۔ اس کی کچھ وجوہات ہیں...... یا کسی نے کوئی گنڈا تعویز کر رکھا ہے؟ دیکھو نجانے کیسے کیسے لوگ آتے ہیں، کیسی سڑی سڑی شکلوں کی لونڈیاں نجانے تماش بینوں سے کیا کیا حاصل کر لیتی ہیں۔ ایک ہم ہیں جنہیں کچھ نہ ملا۔ خدا کی قسم سوچتی ہوں تو کلیجہ پانی پانی ہو کر رہ جاتا ہے...... ارے کیا میں قبر میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی؟ تمہارے لئے ہی چھوڑ جاؤں گی۔ مجھے ایک کوٹھی کی کیسی آرزو ہے، میری ہی تقدیر میں نہ رہی، باقی سب کو مل گئی۔ نجانے کون کون آیا۔ راوی کنارے کوٹھی تیار ہو گئی، ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ مراد بخش کیا کیا دینے کو تیار تھے، نہ ملا۔ ایک شاہ جی ہیں، سب کچھ کر سکتے ہیں ہمارے لئے، نام ہی نہیں لیتے۔ آخر کیا وجہ ہے؟''

''اماں! تم کوٹھی کا کرو گی کیا؟ ہماری تقدیر میں صرف کوٹھا ہے جو ہمارے پاس ہے۔''

''نہیں کوثر جہاں! انسان کی اپنی ایک الگ سی حیثیت ہوتی ہے۔ یہی جائیدادیں کام آتی ہیں ورنہ بڑھاپے میں کچھ نہیں ملتا۔ کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا نہیں ہوتا طوائفوں کے۔ اب ان دونوں نکمیوں کو دیکھو، غزالہ اور شبانہ کی بات کر رہی ہوں...... کچھ بھی نہیں کر کے دینے کی۔ یہ بات میں کہے دیتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے اماں...... ٹھیک ہے۔ آپ اطمینان رکھیں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے شاہ جی سے کچھ نہ کچھ لے ہی لوں گی۔ آپ بے فکر رہیں اور یہ ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دیں۔''

''بس بیٹی...... یہ بات آج تُو نے پہلی بار کہی ہے، اس سے پہلے تُو کبھی تُو نے میرے دل کو ایسی تسلی نہیں دی۔''

''اب تو دے رہی ہوں۔''

''اے بیٹی! میرے تو دلدر ہی دور ہو گئے ایک جملے میں۔ ایسا دل خوش کر دیا کہ......''

شمشیرہ بیگم کہتے کہتے رک گئیں چونکہ دروازے میں اکرام کھڑا نظر آیا تھا۔ جانتی تھیں کہ اکرام اس وقت ایک ایسا مہرہ ہے جس کے ذریعے بہت سے فاصلے طے کئے جا سکتے ہیں۔ دیکھا، دیکھ کر مسکرائیں، اٹھیں، ہاتھ آگے بڑھائے اور اکرام سے جا چمٹیں۔

''کمبخت مارے! تُو نے میرا کلیجہ نکال لیا۔ ارے دنیا تو یہ سوچتی ہوگی کہ ننوں تو صرف بیٹیوں سے محبت کرتی ہے۔ کیسا تُو میرے کلیجے میں اترا ہوا ہے کوئی جھانک کر تو دیکھے۔ لیکن تُو نے اپنے ہاتھوں سے سب کچھ بگاڑ کر رکھ دیا۔ تُو اتنے دنوں کہاں غائب رہتا ہے۔ اے کوثر جہاں! ماشاء اللہ، اللہ بری نظر سے بچائے، صحیح عمر دیکھو اور جوانی دیکھو۔ لگتا ہے پورا مرد کا مرد کھڑا ہوا ہے۔ کتنی جلدی بڑھا ہے، دیکھو میرے قد سے اونچا نکل گیا۔''

''اماں! نظر تو نہ لگاؤ۔ ہم نے اسے خونِ جگر پلا کر پالا ہے۔''

''لو، میری نظر لگے گی؟ ابھی کالا دھاگہ منگواتی ہوں، نظر اتارتی ہوں۔ اے میں تو جی بھر کر دیکھتی بھی نہیں ہوں حالانکہ کیسے کیسے جی مچلتا ہے۔ اکرام! کیسی پڑھائی ہو رہی ہے میرے بچے!''

''ٹھیک ہوں ننوں...... آپ کی دعائیں ہیں۔'' اکرام نے مضمحل لہجے میں کہا اور کوثر جہاں چونک پڑی۔ اکرام کا لہجہ ایسا ہوا اور وہ بھی شمشیرہ بیگم کے ساتھ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تشویش بھری نگاہوں سے اکرام کو دیکھا۔ شمشیرہ بیگم نے اوپری اوپری دل سے کچھ اور باتیں کہیں۔ اکرام کے آنے کے بعد ہر لمحہ کوئی خطرہ پیش آ سکتا تھا اس لئے خطرے کے پیش نظر باہر چلی گئیں کہ حاجو سے کالا دھاگا منگوائیں۔ اکرام اندر داخل ہو گیا تھا۔ کوثر جہاں نے تسنیم کو چھوڑ دیا، آگے بڑھی اور دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ اکرام، کوثر جہاں کے سینے سے جا لگا تھا۔ کوثر جہاں کو اپنا کلیجہ ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ شمشیرہ بیگم نے غلط تو نہیں کہا

تھا، ایک بھرپور مرد بازوؤں میں سمایا ہوا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا لمس ممتا کا پیار لئے ہوئے تھا۔ کوثر جہاں دیر تک اسے سینے سے چمٹائے رہی۔ اکرام کو بھی شاید کچھ ہو ہی گیا تھا کہ شمشیرہ بیگم تک کے ساتھ اتنی نرمی سے پیش آیا۔ انہیں دیکھ کر تو اس کے بدن میں پھلجھڑیاں پھوٹنے لگتی تھیں۔ کچھ نہ کچھ کہے بغیر باز نہیں آتا تھا اور تان شمشیرہ بیگم کے کوسنوں پر ہی ٹوٹتی۔ لیکن آج اس نے بڑا نرم لہجہ اختیار کیا تھا اور کوئی ایسی بات بھی نہیں کی تھی کہ شمشیرہ بیگم بھڑک اٹھتیں۔ کوثر جہاں نے اسے شانوں سے پکڑ کر پیچھے کیا اور دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں کھبا جا رہا تھا۔ حسین مردانہ نقوش، جانے پہچانے، اپنے اپنے۔

”کیسی گزر رہی ہے اکرام؟“

”زندگی کی ڈور تو سلجھتی اور الجھتی رہتی ہے...... اسی کو تو زندگی کہتے ہیں۔ اگر زندگی ایک سیدھی سڑک پر دوڑنے کا نام ہوتی تو اس دنیا میں بھی سبھی جینے سے اکتا جاتے۔“

”ہیں......“ کوثر جہاں کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ٹکر ٹکر اکرام کی صورت دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ”اللہ تیری عمر دراز کرے۔ کیسی بڑی بڑی باتیں کرنے لگا ہے...... لگتا ہی نہیں ہے کہ تُو وہی باولا سا لڑکا ہے جسے صحیح طریقے سے بات کرنا بھی نہیں آتی تھی۔ بہت لکھ پڑھ گیا ہے ناں۔“

”بس باجی! اپنی عمر کی بات نہیں کرتا۔ ابھی ابھی ننوں نے کہا تھا اور آپ کی نظروں سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ اب میں ان آنکھوں کو بڑا بڑا سا لگتا ہوں...... باجی میرا خیال ہے کہ عقل کے ساتھ ساتھ میرا جسم بھی بڑھ گیا ہے اور اگر میں اپنی زبان سے یہ کہوں کہ جس قدر میری جسامت بڑھی ہے، مجھے اللہ نے اتنی ہی عقل بھی دے دی ہے تو آپ شاید ہنس پڑیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے دنیا کا یہ سب سے عجیب تجربہ ہوا ہے۔ اب میں وہ اکرام نہیں ہوں باجی! جو کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ میں اپنی حقیقت اور اپنی حیثیت کو جانتا ہوں کہ میں جہاں پیدا ہوا ہوں وہاں عزت دار لوگ پیدا نہیں ہوتے چاہے وہ کتنے ہی عزت دار شخص کی اولاد ہوں، وہ طوائف زادے کہلاتے ہیں۔ ان کی اپنی ایک الگ ہی حیثیت رہتی ہے۔ وہ کچھ بھی بن جائیں۔ لیکن جب ان کے ماضی میں جھانکا جائے تو انہیں طوائف زادہ ہی کہا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میرا اپنا نظریہ اس سے مختلف ہے۔“

”کیا......؟“ کوثر جہاں کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”ایک زنجیر ہے جو نجانے کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ اس زنجیر میں پڑی ہوئی کڑیاں قیدی ہیں، زنجیر کی قیدی...... کوئی بھی کڑی اپنے حلقے سے نکل نہیں سکتی۔ کیونکہ دوسرے حلقے میں پڑی ہوتی ہے اور اس کا منہ بند ہوتا ہے۔ میں تمہیں قصوروار نہیں قرار دیتا کیونکہ تم اسی حلقے میں پڑی ہوئی ایک کڑی ہو۔ اپنا منہ نہیں کھول سکتیں، اپنے کمزور ہاتھوں سے اس زنجیر سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ اگر تم کسی شریف گھرانے میں پیدا ہوئی ہوتیں تو ایک مستند شریف زادی ہوتیں...... میں تمہارا بیٹا ہوتا تو ایک شریف زادہ کہلاتا۔ قصور نہ تمہارا ہے نہ میرا اور نہ ہی ننوں کا...... بس ہم ایک زنجیر کے قیدی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ زندگی ایک سلجھی اور الجھی ہوئی ڈور ہے۔ اگر وہ ایک سیدھی سپاٹ سڑک کی مانند ہو تو لوگ جینے سے اکتا جائیں اور جینا مشکل ہو جائے۔ ہم اس ٹیڑھی میڑھی اور ہموار سڑک پر دوڑ کر ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس سے ہمارے خون کی روانی تیز سے تیز تر ہوتی جائے گی۔ بد دل نہیں ہونا چاہئے۔ بد دلی ہی تو موت کہلاتی ہے۔ میں زندہ ہوں، زندگی کی الجھنوں سے نمٹنا چاہتا ہوں۔ تم میری ماں ہو، تسنیم میری بہن ہے۔ میرا کوئی سہارا ہے۔ بے شمار لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو ٹیڑھی میڑھی سڑکوں پر بے مقصد دوڑتے رہتے ہیں اور ان کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ میں تمہیں ایک باعزت زندگی دوں، اپنی بہن تسنیم کو ایک طوائف زادی نہ کہلانے دوں اور اس کے لئے باجی! ہمیں فرار چاہئے۔ سمجھ رہی ہو ناں...... ہمیں فرار ہونا ہے اپنے اس ماحول سے۔ اور اتنا فاصلہ طے کرنا ہے کہ اپنے شناسا ہمیں نظر نہ آئیں۔ دنیا کی بھیڑ میں کھو جائیں گے ہم لوگ تو لوگ ہمیں باعزت نگاہوں سے دیکھیں گے۔ مگر اس کے لئے بھی وقت چاہئے۔ میں تمہاری مجبوری اچھی طرح جانتا ہوں، دل سے اسے مانتا ہوں۔“

”خدا تجھے ہر بری نگاہ سے محفوظ رکھے اکرام! تیری باتیں تو افلاطون کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ لگ رہا ہے ارسطو بول رہا ہو۔ ارے توبہ توبہ، یہ کہاں سے سیکھ لیا سب کچھ...... کیا سکول میں اتنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اتنی بڑی بڑی باتیں سکھائی جاتی ہیں؟“

”بچہ نہیں ہوں باجی...... یہ الگ بات ہے کہ دنیا کی نگاہیں مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔ اس سینے میں بہت سے طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ مگر میں انہیں چھپائے رکھنا چاہتا ہوں۔ وقت بہت زیادہ نہیں ہے، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سننا اور اس پر عمل

کرنا...... میرے لئے، تسنیم کے لئے یہ بہت ضروری ہے باجی! ننوں لالچی خاتون ہیں، دولت کی ہوس انہیں ورثے میں ملی ہے، طوائف ان کے جیسی ہوتی ہے۔ وہ قصوروار نہیں بلکہ مریضہ ہے۔ تمہیں ایک کام کرنا ہے باجی! تم صرف اپنی آواز بیچنا اپنا بدن نہ بیچنا۔ میں تمہارا بیٹا ہوں، مجھے تم سے یہ الفاظ نہیں کہنے چاہئیں لیکن میں بھی یہ الفاظ کہنے پر مجبور ہوں۔ اگر تم اپنا جسم فروخت کرتی رہیں تو پھر تسنیم کو محفوظ نہ رکھ پاؤ گی اور باجی! مجھے بھی۔ میں بھی یہ برداشت نہیں کر پاؤں گا کہ مجبوریاں ختم ہو جانے کے بعد بھی میری ماں وہی کی وہی رہے۔ اس طرح میرا نظریۂ حیات بدل جائے گا۔ میرے لئے تمہیں یہ کرنا ہے۔ مجرے کرتی رہو لیکن اگر کبھی بدن تک بات پہنچ جائے تو خودکشی کر لینا۔ تسنیم کی گردن دبا دینا...... یہ سب کچھ نہ کرنا۔"

کوثر جہاں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کچھ لمحے ڈبڈبائی نگاہوں سے اکرام کو دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "ایک طوائف پر یقین کرے گا اکرام!"

"بالکل نہیں...... لیکن ایک ماں پر یقین کرلوں گا...... ایسا یقین جیسے میری آنکھیں یہ دیوار دیکھ رہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... میں ماں ہوں...... ماں کی حیثیت سے بول رہی ہوں۔ بندوں کو قتل کر دوں گی۔ کوٹھوں کو آگ لگا دوں گی۔ تسنیم کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دوں۔ اگر کبھی میری عزت پر حرف آنے لگا تو یہ سب کر گزروں گی...... اطمینان رکھ! اب ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔"

"ماں جو بھی ہو اس کائنات کی سب سے بڑی مخلوق ہوتی ہے۔ مجھے تم پر یقین ہے۔ سنو...... صورتحال میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ جس سکول میں، میں پڑھتا تھا وہ متعصبوں کا سکول ہے۔ بہت بڑا ہے اور سارے کے سارے نواب زادے اور رئیس زادے اس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وہاں کسی طوائف زادے کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے کچھ بدخواہوں نے یہ بات سکول کے منتظمین تک پہنچا دی کہ میں ایک طوائف زادہ ہوں اور اس طرح سے منتظمین نے مجھے سکول سے نکال دیا۔ شاہ صاحب پر مقدمہ قائم کرنے کے بارے میں میٹنگ ہو رہی ہے لیکن شاہ جی کو تم جانتی ہو، وہ اعلیٰ ترین افسروں سے ملے انہیں دھمکیاں دے آئے ہیں اور اب کوئی ایسا قدم اٹھانے والے ہیں جو خطرناک ہو گا۔

لیکن شاہ جی کو اس انتقام سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد ہم لوگ لاہور سے جا رہے ہیں۔ کہیں اور قیام کریں گے اور انتظار کریں گے کہ یہ معاملہ سرد ہو جائے۔ شاہ جی نے تمہارے لئے یہ پیغام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ بددل نہ ہونا۔ تمہاری زندگی کی ڈور سلجھ رہی ہے۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہو جاتا تو شاہ جی تم پر بہت بڑا انکشاف کرتے۔ جو ذمے داری تم نے ان کے سپرد کی ہے اس میں انہوں نے کافی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔ لیکن ابھی اس کامیابی کو پائیدار نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ثابت قدم رہ کر اگر انتظار کر سکو تو ضرور کرنا۔ اور اگر کوئی بہت ہی بڑی مشکل پیش آ جائے تو اپنے آپ کو پاکستان کی وسعتوں میں گم کر لینا، ہم تمہیں تلاش کر لیں گے۔ لیکن اگر ہو سکے تو یہیں رہنا۔ ہمارا جانا ضروری ہے کیونکہ اس کے بعد جو کچھ ہو گا وہ خطرناک ہو گا۔"

"کہاں جائے گا اکرام؟" کوثر جہاں نے روتے ہوئے کہا۔

"محفوظ ترین پناہ گاہوں میں۔ بس تمہارا اطمینان اور اس کے ساتھ ساتھ تمہاری دعائیں درکار ہوں گی۔ اچھا خدا حافظ۔"

کوثر جہاں نے بھینچ کر اکرام کی پیشانی چومی اور پھر آہستہ سے بولی۔

"خدا حافظ!"

○●○

رات کے کوئی بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ شاہ جی باہر نکل آئے۔ دو ساتھی اور اکرام اس وقت ساتھ تھے۔ صرف شالے خان غائب تھا۔ شاہ جی نے شالے خان کو جاسوسی پر لگا دیا تھا اور شالے خان اس وقت راجہ دلاور کی حویلی پر موجود تھا۔ شالے خان بڑا تیز طرار آدمی تھا۔ چالاکی سے حویلی پہنچا تھا اور حویلی کے چوکیدار سے یاری گانٹھ لی تھی۔ پوچھا تھا اور ایسے شاندار طریقے سے پوچھا تھا کہ چوکیدار متاثر ہو گیا تھا۔ شالے خان نے ایک پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ چوکیدار نے اس سے اس پتے سے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''محلہ تو یہی ہے لیکن کسی نے غلط پتہ دے دیا ہے۔''

شالے خان کچھ گھنٹوں کے بعد دوبارہ وہاں پہنچا تھا تو اس نے چوکیدار کو دکھ بھری آواز میں کہا تھا کہ وہ بہت دور سے آیا ہے اور کسی نے اس کے ساتھ دھوکا کر دیا ہے۔ اب واپس جانا پڑے گا۔ نہ اس کے پاس سونے کا ٹھکانہ اور نہ کسی سے شناسائی ہے، مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ چوکیدار نے ازراہِ ہمدردی اس سے کہا تھا کہ اگر رات گزارنا چاہے تو یہاں گزار لے، وہ جگہ دے دے گا۔ خاموشی سے رات گزارے اور صبح کو نکل جائے۔ مقصد بھی یہی تھا شالے خان کا۔ شاہ جی کو اندر آنے کا راستہ دینا چاہتا تھا اور اس کے لئے چوکیدار کو سنبھالنا ضروری تھا۔

بہرحال شالے خان حویلی پر موجود تھا۔ ڈرائیور کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے اور ڈرائیور جو اچھا خاصا وفادار تھا ہر کام کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ اصل میں شاہ جی کا رویہ ہی سب کے ساتھ ایسا ہوتا تھا کہ سب ہی ان سے خوش رہتے تھے اور کوئی ان کے حکم سے سرتابی نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ گاڑی راجہ دلاور علی کی حویلی سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی تھی اور سب سے پہلے نور شاہ گاڑی سے اتر کر تاریکی میں آگے بڑھا اور حویلی کے

دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے مدھم مدھم سُروں میں سیٹی بجائی تو شالے خان کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

''اماں نور شاہ! لگتا ہے کسی لال پری کو شیشے میں اتار رہے ہو۔ ہم کھڑے تو ہیں، ہمیں دیکھ نہیں رہے کیا؟''

''ارے تو کیا چوکیداری تمہیں مل گئی ہے؟'' نور شاہ نے بھی پُر مذاق لہجے میں کہا۔

''تو اور کیا کرتے...... بیچارہ چوکیدار گہری نیند اس جگہ سو رہا ہے جو اس نے سونے کے لئے ہمیں دی تھی۔ اب اس کی ڈیوٹی تو سنبھالنی ہی تھی۔''

''یہی دیکھنے آیا تھا...... شاہ جی کو جا کر اطلاع دیتا ہوں۔'' نور شاہ واپس پلٹا۔ شاہ جی کو صورتحال بتائی تو شاہ جی بھی باہر نکل آئے اور بولے۔

''صرف اکرام میرے ساتھ اندر جائے گا۔ باقی تمام لوگ باہر ہوشیار رہیں اور موقع کی نزاکت کا خیال رکھیں۔'' سب نے اقرار میں گردن ہلا دی تھی۔

شاہ جی نے اکرام کو ساتھ لیا اور بڑے اطمینان کے ساتھ راجہ دلاور کی حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔ دونوں محتاط انداز میں قدم بڑھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ حویلی بھی سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بس اندرونی حصوں سے مدھم روشنی ابھر رہی تھی۔ کسی کے کھانسنے تک کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ شاہ جی نے سرگوشی میں اکرام سے کہا۔

''ہمیں اس حرام زادے کا کمرہ تلاش کرنا پڑے گا۔ ہوسکتا ہے وہاں اس کی بیوی بھی سو رہی ہو۔ تمہیں خیال رکھنا ہے۔''

''فکر نہ کریں شاہ جی! بچ کر کہاں جائے گا۔'' اکرام نے کہا۔ شاہ جی نے ایک نظر اکرام کو دیکھا اور ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی مستی ابھر آئی۔ چیتے جیسا بدن رکھنے والا یہ نوجوان جو ابھی اپنی عمر میں بہت چھوٹا تھا، دیکھنے کے قابل تھا۔ شاہ جی کی نظریں جب بھی اس کی جانب اٹھتیں نجانے کیسے کیسے خیالوں میں گم ہو جاتے۔ اکرام کی ذات میں انہیں اپنا عکس نظر آتا تھا۔ ایسے ہی تھے وہ بھی اس عمر میں...... بالکل ایسے ہی تھے۔

بہرحال حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہونے کے بعد ایک غلام گردش سے ہوتے ہوئے کمروں کی اس قطار کے سامنے پہنچ گئے جس کے شیشوں سے مدھم مدھم روشنیاں چھن رہی تھیں۔ راجہ دلاور کی اس حویلی میں کون کون رہتا تھا، یہ تو انہیں معلوم نہیں تھا لیکن راجہ

دلاور کا کمرہ تلاش کرنے میں انہیں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ پہلے ہی شیشے سے اندر جھانکا تھا کہ وہ سوتا ہوا نظر آ گیا۔ مدھم روشنی میں انہوں نے اس کے ہیولے کو صاف پہچان لیا تھا اور شاہ جی کا یہ اندازہ بھی ٹھیک تھا کہ اس کی بیوی بھی اسی کمرے میں دوسرے بستر پر سو رہی تھی۔ شاہ جی نے اکرام کا چہرہ دیکھا اور پھر ایک انگلی سے کمرے کے دروازے کو اندر کی طرف دبایا تو کواڑ پیچھے سمٹنے لگے۔

شاہ جی نے ایک بار پھر مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔ تقدیر ساتھ دے رہی تھی۔ دروازہ اندر سے بند بھی مل سکتا تھا اور اسے کھلوانے کی کوشش خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ آسانی بھی انہیں خود بخود حاصل ہو گئی۔ چنانچہ دونوں دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ اندر پہنچتے ہی اکرام نے پھرتی سے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ راجہ دلاور کے مدھم مدھم خراٹے کمرے کی فضا میں ابھر رہے تھے۔ شاہ جی نے اکرام کے کان میں سرگوشی کی۔

"تمہیں اس کی بیوی کو سنبھالنا ہے۔ چھری نکال لو۔ منہ بند رکھنا، چیخنے نہ پائے۔ بعد میں تو سب کچھ ٹھیک ہو ہی جائے گا۔ اور اگر زیادہ گڑبڑ رہے تو منہ میں کپڑا ٹھونس دینا اور کنپٹی پر چوٹ لگا کر بے ہوش کر دینا۔ ہمیں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا کیونکہ ہمارا اس سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔"

اکرام نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔ شاہ جی نے بڑی محنت سے اکرام کی پرورش کی تھی اور اسے بہت کچھ سکھایا تھا لیکن وہ اس بات کے قائل بھی تھے کہ اکرام کے اندر انتہائی پھرتی، مستعدی اور ذہانت ہے۔ جو کام کرتا ہے وہ لگے بندھے اصولوں پر نہیں کرتا بلکہ اس میں اس کی شخصیت کا ایک اہم جزو شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ جی اس کی طرف سے بالکل مطمئن تھے۔ اکرام نے چھری نکال کر ایک پاؤں مسہری کی پٹی پر رکھا اور دوسرا زمین پر اور پھر وہ راجہ دلاور کی بیوی پر جھک گیا۔ جب تک عورت خود نہ جاگتی اسے جگانا ضروری نہیں تھا۔ ادھر شاہ جی اس جانب سے مطمئن ہونے کے بعد راجہ دلاور کے چہرے کی جانب متوجہ ہوئے۔ انہوں نے راجہ دلاور کی ایک مونچھ پکڑ لی اور پوری قوت سے اسے کھینچا۔ اس کے منہ سے آواز نکلی تو شاہ صاحب کا چوڑا پنجہ اس کے منہ پر جم گیا اور اس قوت سے کہ راجہ دلاور دونوں بازوؤں سے زور لگانے کے باوجود ان کے پنجے کو منہ سے نہ ہٹا سکا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں، روشنی بے شک مدھم تھی لیکن اتنی مدھم بھی نہیں کہ

راجہ دلاور، شاہ جی کی صورت نہ دیکھ پائے یا انہیں پہچان نہ سکے۔ نیند بھری آنکھوں سے پہلے تو اس نے شاہ جی کو دیکھا پھر پہچان لیا اور اس کے بعد اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ تب شاہ جی کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

"حرام کے پلّے، کتے کی اولاد! شامت آئی تھی تیری...... عقل کھو گئی تھی۔ حالانکہ تم اچھے خاصے خاندان کے ہو، چالاک بھی ہو مگر تم نے یہ نہیں سوچا کہ شیروں کے مقابلے پر جب بھی کبھی کوئی آیا ہے اسے کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اپنے باپ کے پاس چالاکی کرنے تو چل پڑے لیکن یہ نہیں سوچا کہ کس کے خلاف سازش کرنے جا رہے ہو بھنگی کی اولاد۔ منہ سے آواز نکالنے کی کوشش کی تو قسم ایمان کی یہ چمکدار چھری تمہاری گردن کی ہڈی کو اتنی صفائی سے کاٹ دے گی کہ تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا...... آواز بند رکھو۔" شاہ جی کے لہجے میں ایسی غراہٹ تھی کہ راجہ دلاور کا برا حال ہو گیا۔ اس کا قیمتی بستر تباہ ہو گیا تھا اور اب تو بدن بھی پوری طرح کانپ نہیں پا رہا تھا۔ دونوں ہاتھ سامنے کئے اور انہیں جوڑ لیا۔ شاہ جی نے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا اور چمکدار چھری اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ اس کی آنکھیں ٹیڑھی ہونے لگی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے بستر پر پھدک رہا تھا، منہ سے آواز نکالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آواز حلق سے باہر نہیں آ رہی تھی۔ شاہ جی سیدھے کھڑے ہو گئے۔ پھر انہوں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں...... وہ ایجوکیشن آفیسر تمہارا ناجائز باپ تھا جو اس کے پاس پہنچ گئے یہ بتانے کے لئے کہ اکرام طوائف زادہ ہے...... تم نے اپنی اولاد کو حلال کی کمائی کیوں نہ کھلائی سود خورو! سود کی رقم تمہارے بچوں کے جسموں میں خون بن کر دوڑتی ہے اور تم ان سے بہادری کی توقع رکھتے ہو۔ ابے گیدڑ کے پلّے! کبھی گیدڑوں کے ہاں شیر پیدا ہوئے ہیں؟ اتنی ہی سی بات تھی کمین کے جنے کہ تیرا بیٹا ہمارے شیر کے ہاتھوں پٹ گیا تھا۔ تجھے سامنے ہی نہیں آنا چاہئے تھا یہ سوچ کر کہ ہم نے تجھ پر رحم کھایا ہے۔ مذاق میں تو رحم نہیں کھایا تھا تجھ پر...... کوئی بات ہی ہو گی۔ ابے حرامی! یہ بھی نہ سوچا تُو نے کہ بعد میں تیرا کیا ہو گا۔"

"مم...... معافی...... شش...... شاہ...... مم...... معافی......"

"حرام کے بچے! جھوٹ نہ بول۔ سچ بتا، کیا کہا تھا اس سے جا کر؟"

"غ...... غلطی ہو گئی۔"

''اور دوسری غلطی تُو اس وقت فوراً ہی کر ڈالے گا جب ہم تجھے چھوڑ کر یہاں سے نکلیں گے۔ یہی کرے گا ناں؟''

''نہیں شاہ جی! مجھے معاف کر دیجئے......بس ایک بار معاف کر دیجئے۔''

''ہم ہیں شاہ سمجھے۔ کرتے پہلے ہیں سوچتے بعد میں ہیں۔ ٹھیک ہے مان لیا کہ ہم ذرا سے بیوقوف ہوتے ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ سانپ کو سامنے دیکھیں اور آنکھیں بند کر کے دوسری طرف مڑ جائیں۔ ابے تُو نے سوچا کیوں نہیں آخر؟ نکلوا دیا نا ہمارے بچے کو سکول سے......آخر نکلوا دیا...... تیرا کیا خیال ہے، وہاں تیرا لونڈا پڑھے گا؟ اس سکول میں اب کوئی پڑھ سکتا ہے۔ ارے تم لوگوں کو ہمارا تحفظ تھا، ایسی ہی سازشیں کرتے رہو گے تو ذلیل و خوار رہو گے ہمیشہ۔ باپ کے پاس چلے گئے، نتیجہ بھگتو...... بولو تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں؟ تمہارے اور تمہاری بیوی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں؟'' شاہ جی نے کہا اور پہلی بار راجہ دلاور کی نگاہیں اپنی بیوی کی جانب اٹھیں۔ ابھی تک کمرے میں کوئی آواز نہیں ابھری تھی اس لئے راجہ دلاور کی بیوی گہری نیند سو رہی تھی۔ لیکن اس پر اکرام کو چھری بردار مسلط دیکھ کر راجہ دلاور کی جان اور نکل گئی۔ گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہم سے غلطی ہو گئی ہے......اب واپس نہیں لا سکتے...... جو جرمانہ چاہو کر دو۔ یہاں سے جو مرضی آئے لے جاؤ......ہمیں معاف کر دو اور ہماری بیوی کو نقصان نہ پہنچاؤ۔''

''کتے کے بچے! تُو اس کے علاوہ اور سوچ بھی کیا سکتا ہے......اس پورے گھر کو خرید کر پھینک دیں تیرے بیوی بچوں سمیت۔ جی تو چاہ رہا ہے کہ ہاتھ پاؤں باندھیں تیرے، منہ میں ٹھونس دیں کپڑا اس کے بعد مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دیں۔ تیرے بیٹے کو بھی تیرے سامنے لا کر یہی سلوک کریں۔ مگر ہم ایسا نہیں کریں گے۔ دشمن اگر مر جائے تو دشمنی ختم ہو جاتی ہے۔ ارے مزا تو دشمن کو زندہ رکھنے میں ہے۔ زندہ رہے گا تو اور یاد رکھے گا۔ ہو سکتا ہے دال کی دیگچی میں ابال بھی آ جائے۔ جوش آئے کچھ۔ ہم سے بدلہ لینے کے لئے نکلے۔ مزہ تو اسی میں آتا ہے۔ ہم تیری ناک کاٹ رہے ہیں۔ ارے نکٹا پھرے گا۔ لوگ پوچھیں گے کہ نکٹا کیسے ہوا؟ تو بتائے گا تو سہی کچھ کسی کو، فریاد لے کر پہنچے گا کہ دیکھو اکرام کو سکول سے تو نکال دیا تم نے لیکن میری ناک نہ بچا سکے۔ یہی ہو گا نا......ٹھیک ہے، یہی کرتے ہیں۔'' شاہ جی نے ایک زوردار گھونسا راجہ دلاور کے پیٹ میں رسید کر دیا اور اس

کے منہ سے غوں کی آواز نکل گئی۔ لیکن شاہ جی کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پیٹ پر پہنچ جائیں۔ وہ بستر پر تھوڑا سا اٹھا۔ پیٹ کی تکلیف نے اس کا سانس بند کر دیا تھا۔ لیکن شاہ جی کا مقصد اسی سے پورا ہو گیا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی چمکدار چھری ایسے اپنی جگہ سے ہلی کہ اسے پتہ بھی نہ چل سکا کہ کب ناک کے نتھنوں کے نیچے سے چھری لگی اور نوک سے ہوتی ہوئی چھلکا علیحدہ کر گئی۔ راجہ دلاور کی آدھی ناک کٹ گئی تھی۔ خون کا فوارہ بلند ہوا اور اس کے حلق سے دہشت ناک چیخ نکل گئی۔ نتیجہ وہی ہوا جو توقع کے مطابق تھا۔ چیخ سن کر راجہ دلاور کی بیوی جاگی۔ اکرام نے اس کی گردن پر اپنا ہاتھ جما دیا۔

''آواز نکلی تو چھری سینے میں اتر جائے گی۔'' اس نے کہا۔ راجہ دلاور کی بیوی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے اور پھر گردن گھما کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ شوہر کا چہرہ خون میں تر دیکھ کر اس کی آنکھیں چڑھ گئیں اور بے ہوش ہو کر تکیے پر گر پڑی۔ اکرام نے اس کے بال پکڑ کر دو چار بار اسے جھنجھوڑا اور پھر شاہ جی کی طرف رخ کر کے بولا۔

''یہ کھیل تو خود بخود ختم ہو گیا شاہ جی!''

''بے ہوش ہو گئی؟''

''ہاں۔''

''اچھا ہی ہوا......اس کمینے کی وجہ سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔''

راجہ دلاور بستر پر تڑپ رہا تھا۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ شاہ جی نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور پھر قہقہہ لگا کر اکرام سے بولے۔

''لے دیکھ لے چندا، راجہ جی کو۔ بغیر ناک کے رہ گئے ہیں۔ اور ہاں راجہ جی! تمہاری ناک کا ٹکڑا ہم لے جا رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سسرے کو لے کر ہسپتال پہنچ جاؤ اور ڈاکٹر سے کہو اسے جوڑ دے۔ مزہ ہی کیا آئے گا...... ہم چلے۔'' شاہ جی نے جیب سے رومال نکال کر کٹی ہوئی ناک کا ٹکڑا رومال میں رکھ کر جیب میں رکھ لیا اور اس کے بعد ایک زوردار ٹھوکر اس کی کمر میں لگائی۔ راجہ دلاور پھر ڈکرایا۔ شاہ جی نے اکرام کو اشارہ کیا اور اس کے بعد دونوں باہر نکل آئے۔

پھر یہاں سے انہیں بھاگ کر ہی فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔ اس کو ہوش میں چھوڑ کر آئے تھے۔ ظاہر ہے شور مچائے گا۔ ملازم تو ہیں۔ بس تھوڑی سی محنت درکار تھی۔ کار موجود تھی۔

چنانچہ اس میں بیٹھ کر چل پڑے۔ کار فاصلے طے کرتی ہوئی پھر ایک جگہ پر اسرار طریقے سے رک گئی۔ شاہ جی نیچے اتر گئے۔ انہوں نے کہا۔

''چوکیدار نظر آ رہا ہے؟''

''نہیں شاہ جی۔''

''آس پاس تو سنسان ہی لگتے ہیں۔ ذرا پاس جا کر دیکھو اور کام کر لو۔ بلکہ اسے وہاں سے ہٹا کر دور لے آؤ۔ کہیں بھوتنی والے کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ جاؤ شالے خان اور نور شاہ! تم دونوں چلے جاؤ۔''

رات کی تاریکی میں شالے خان اور نور شاہ سکول کے پھاٹک کے پاس جا کر رکے، ایک جھری سے اندر جھانکا۔ گیٹ پر آفس بنا ہوا تھا اور اسی کے دروازے پر چوکیدار بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔

شالے خان نے آہستہ سے پھاٹک بجایا اور چوکیدار جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ذیلی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا اور بولا۔ ''کیہ گل اے بھائی؟''

''بھائی جان! اِک پتہ معلوم کرنا سی۔'' شالے خان نے کہا۔ چوکیدار باہر نکل آیا۔ لیکن جونہی وہ کھڑکی سے نکل کر سیدھا ہوا، نور شاہ نے اس کی ناک پر سر دے مارا اور چوکیدار کی چیخ نکل گئی۔ وہ گالیاں بکنے لگا تھا۔ لیکن دوسری ٹھوکر نے اسے بے ہوش کر دیا۔ شالے خان اور نور شاہ اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے وہاں لے آئے جہاں کار کھڑی تھی۔

''مطلع صاف ہے؟'' شاہ جی نے سوال کیا۔

''ہاں جی...... بالکل۔''

''چلو مال اتار لو۔''

مال مٹی کے تیل کے بڑے بڑے کنستر تھے۔ ایک بوتل میں پٹرول بھی بھرا ہوا تھا۔ تمام لوگ یہ کنستر کندھوں پر اٹھا کر ذیلی کھڑکی سے اندر داخل ہو گئے اور وہاں سکول کی عمارت کے قریب صدر دروازے کا تالا اینٹ مار کر توڑا گیا۔ اس کے بعد پوری عمارت کو مٹی کے تیل کا غسل دیا گیا۔ دروازے، کھڑکیاں، پردے، فرنیچر ہر چیز کو تیل سے شرابور کر دیا گیا۔ اس کام میں خوب دیر لگ گئی تھی۔ مٹی کے تیل کی بُو چاروں طرف سے اُڑ رہی تھی۔ آخر میں شاہ جی نے پٹرول کی بوتل صدر دروازے پر خالی کی پھر بولے۔

''بس چلو، باہر نکل لو۔''

سب گیٹ سے باہر پہنچ گئے۔ شاہ جی نے ماچس جلائی اور تیلی پھینک دی۔ پٹرول نے آگ پکڑ لی...... ہر شے اس طرح بھگوئی گئی تھی کہ خود ہی آگ پکڑ لے۔ شاہ جی کار میں آ بیٹھے۔ سکول شعلوں کا محل بن گیا تھا۔ شاہ جی کی غراہٹ ابھری۔

''اعلیٰ نسل کے کتے پڑھیں گے یہاں...... ارے ہمارا شہزادہ نہیں پڑھے گا تو کوئی نہیں بڑھے گا۔ چلو......'' انہوں نے ڈرائیور سے کہا اور ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔ شاہ جی نے جیبی گھڑی میں وقت دیکھا، گھڑی پونے دو بجا رہی تھی۔ شاہ جی نے ڈرائیور سے کہا۔

''اور کوئی بات تو نہیں رہ گئی۔ پولیس ضرور آئے گی تمہارے پاس۔ معصوم بن کر کہہ دینا کہ مالکوں کی بات نوکر کہاں جانتے ہیں۔ آرام سے گزارہ کرو اور کوٹھی کا خیال رکھنا۔''

''جی شاہ جی۔''

''ریل تین بجے آئے گی۔ ذرا رفتار تیز کر دو۔'' اور ڈرائیور نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ شاہ جی ریلوے اسٹیشن پہنچے، سامان کے صندوق اتارے گئے، قلی کئے گئے۔ ٹھیک تین بجے قلیوں نے سامان اندر رکھ دیا۔ ٹرین آ گئی تھی جو کراچی جا رہی تھی۔ شاہ جی نے لاہور چھوڑ دیا تھا۔

○●○

سفر بڑی خوش اسلوبی سے جاری تھا۔ ٹرین نے ابھی اپنے سفر کا ایک ڈیڑھ گھنٹہ طے کیا تھا۔ سب لوگ مطمئن نظر آ رہے تھے جیسے کسی بہت بڑے فریضے کی ادائیگی ہو گئی ہو۔ اکرام خوفزدہ بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ رات گزر رہی تھی۔ ہر طرف تاریکیوں کا بسیرا تھا۔ شاہ جی نے مسکراتی نگاہوں سے اکرام کو دیکھا اور بولے۔

''سو جا چندا! نیند کیوں خراب کر رہے ہو؟''

''نیند نہیں آ رہی شاہ جی!''

''ڈر لگ رہا ہے؟'' شاہ جی نے سوال کیا اور اکرام مسکرا دیا۔

''میں ڈرتا نہیں ہوں شاہ جی۔''

''لو، ہمیں بتا رہے ہو یہ بات شہزادے! ابے یہ تم سب لوگوں نے خاموشیاں کیوں اختیار کر رکھی ہیں؟ لگ رہا ہے جیسے کسی عزیز کی میت دفن کر کے آئے ہو۔ بولتے چالتے

رہو، کسی پریشانی کا شکار مت ہو۔ زندگی اسی کھیل کا نام ہے پیارے! کبھی ریل تو کبھی جیل۔" شاہ جی نے کہا اور ہنس پڑے۔ پھر خود ہی بولے۔ "لگتا ہے یہ محاورہ ایسے ہی کسی وقت کے لئے سیانوں نے ایجاد کیا ہوگا۔ کیا بات کہہ گئے۔ اللہ کے فضل سے جیل تو نہیں، ریل ضرور ہے۔ خیر وہ جنگل میں منگل بنے گا کہ تم کو بھی مزا آجائے گا۔ میں نے تمہارے سامنے ایک نام لیا تھا شہریار...... سائیں شہریار، نواب شاہ کے ایک ذیلی علاقے کے بہت بڑے وڈیرے ہیں۔ کیا شان ہے ان کی۔ بہت بڑی جاگیریں ہیں اور بڑا اچھا آدمی ہے وہ۔ تم سمجھ لو کہ فولاد کا بنا ہوا ہے۔"

شاہ جی اپنے دوست کے بارے میں تفصیلات بتاتے رہے۔ ریل کی رفتار بہت تیز تھی اور ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔ آنکھوں میں ایک کڑواہٹ سی پیدا ہوتی جارہی تھی۔ اکرام اپنی جگہ سے اٹھا اور برتھ پر جا کر لیٹ گیا۔ ہلکے ہلکے ہچکولے نجانے اسے کن وادیوں کی سیر کرا رہے تھے۔ شاہ جی بھی خاموش ہوگئے۔ باقی چاروں افراد بھی اونگھنے لگے۔

نجانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ اکرام کے ذہن میں ماں کا تصور تھا۔ تسنیم بھی یاد آرہی تھی۔ بے شک اس کی عمر اتنی نہیں تھی کہ دنیا کے نشیب و فراز سے گزر چکے ہوں لیکن قدرت نے اسے عمر سے کہیں زیادہ ذہانت بخش دی تھی اور وہ وقت کے شانوں پر سفر کرتا ہوا عمر کے اس لمحے سے گزر گیا تھا جو آہستہ آہستہ آتی ہے اور تجربے دے کر چلی جاتی ہے۔ تسنیم، کوثر جہاں کی بیٹی تھی۔ اس کی نام نہاد بہن۔ لیکن اکرام نے ماں ہی دیکھی تھی، باپ کا کوئی تصور کبھی اس کے ذہن میں نہیں اترا تھا حالانکہ یہ بات بھی اس کے کانوں میں سے بار بار گزری تھی کہ ایک ایسی شخصیت موجود ہے جس کے مل جانے سے اس کے باپ کا نام مل سکتا ہے۔ لیکن وہ شخصیت کبھی کوئی تصوراتی شکل تک اختیار نہیں کر سکی تھی۔ انہی سوچوں میں گم تھا...... پلکیں جڑ رہی تھیں کہ دفعتہً ایک ہولناک دھماکہ ہوا اور قیامت آگئی...... وہ برتھ سے پرواز کرتا ہوا نجانے کہاں سے کہاں جا گرا...... سر میں شدید ٹیسیں اٹھیں...... ڈوبتے ذہن نے بے شمار چیخیں اور کراہیں سنیں اور پھر اس کا ذہن بھی تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ریل کا خوفناک حادثہ ہوگیا تھا۔

ادھر تو یہ ہوا تھا اور اُدھر سکول کی عمارت کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ دور دور تک اس عظیم الشان الاؤ کو دیکھا جا سکتا تھا۔ عمارت کے در و دیوار تک نے آگ پکڑ لی

تھی۔ دیواریں چیخ رہی تھیں اور فضا میں دھماکے ہو رہے تھے۔ چاروں طرف شور مچ گیا تھا۔ لوگ قریب آتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ آگ کی لپیٹ میں نہ آجائیں۔ ایک عجیب کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ تپش تھی کہ میلوں دور جا رہی تھی۔ سکول کی انتظامیہ تک خبر پہنچ گئی۔ ذمے دار افراد گہری نیند سے جاگے، افسر اعلیٰ کو بھی پتہ چل گیا اور پھر فوراً ہی انہوں نے سکول کی جانب رخ کیا۔ آگ بجھانے والی گاڑیاں بھی پہنچ گئی تھیں لیکن یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ اب سکول کی عمارت تک پہنچنا ممکن نہیں رہا ہے۔ ہر چیز چیخ چیخ کر گر رہی تھی۔ سکول خاکستر ہو رہا تھا۔ خاص طور سے نواب زادہ کا اس سکول سے گہرا تعلق تھا، اس نے اس سکول کی تعمیر بڑی محنت سے کی تھی اور وہ اپنے طور پر اس سکول کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس چھوٹی سی عمارت میں اس کی حکومت تھی۔ اسے جلتے ہوئے دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ لیکن عمارت میں آگ کیسے لگی؟ دفعتہً ہی اس کے ذہن میں دھماکے ہوئے۔ کچھ الفاظ یاد آئے، کچھ کہانیاں ذہن میں آئیں...... کسی نے کہا تھا۔

"سوچ لو شاہ جی...... ہمارا شہزادہ اگر سکول میں نہیں پڑھے گا تو پھر کوئی بھی یہاں تعلیم نہیں حاصل کر سکے گا...... اچھی طرح سوچ لو......" یہ الفاظ بے بنیاد تھے۔ ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ لیکن اس وقت لیاقت علی شاہ کو وہی سب کچھ یاد آرہا تھا۔ سکول کے بارے میں اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب یہاں کھڑے ہو کر خون کے آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ واپس چل پڑا۔ گھر پہنچا اور یہاں سے اس نے متعلقہ افسران کو فون کیا، شاہ جی کے بارے میں تفتیش کرنے کے بعد اکرام نامی لڑکے کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی اور اکرام کے خلاف وہیں سے کارروائی ہوئی تھی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ واسطہ سر پھروں سے پڑ گیا تھا۔

"ہاں بولو...... کیا بات ہے؟"

"لیاقت علی شاہ بول رہا ہوں سر!"

"ہاں بولو...... کیا بات ہے؟"

"ہمارا سکول اب راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں ہے...... اسے آگ لگا دی گئی ہے اور وہ صرف راکھ بن کر رہ گیا ہے۔"

"کیا؟"

"میرا فرض تھا جناب کہ آپ کو اس بارے میں اطلاع دوں۔"

"لیکن یہ کیسے ہو گیا؟"

"ٹیلی فون پر تمام تفصیلات نہیں بتائی جا سکتیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے...... اب تم ایسا کرو صبح میرے ساتھ ناشتہ کرو۔"

"ٹھیک ہے۔"

بہرحال لیاقت علی شاہ ساری رات نہیں سویا۔ وہ ایک بار پھر سکول کی عمارت کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ آگ بجھانے والی گاڑیوں نے آگ پر قابو پا لیا تھا لیکن جلا ہوا سکول ایک خوفناک کھنڈر بن کر رہ گیا تھا۔ کوئی چیز سلامت نہیں رہی تھی۔ بنیادیں تک سلگ اٹھی تھیں۔ اب ان کا نام ونشان مٹتا جا رہا تھا۔

صبح کو فوراً مجلس مشاورت بیٹھ گئی۔ لیاقت علی شاہ نے کہا۔

"اس سکول کو میں نے اپنے خون سے سینچا تھا۔ اس وقت میرے دل سے خون ٹپک رہا ہے...... آپ جانتے ہیں یہ سب کیسے ہوا؟"

"میں کیسے جان سکتا ہوں؟"

"میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

"ہوں...... بولو۔"

"آپ کو یاد ہے کہ میں نے آپ سے اکرام نامی لڑکے کے بارے میں گفتگو کی تھی جو ایک طوائف زادہ تھا اور......"

"ہاں ہاں...... یاد ہے۔"

"رب نواز شاہ نامی ایک شخص میرے پاس آیا تھا۔"

"اوہو...... کیا اس نے تمہارے سامنے بھی یہی بات کہی تھی کہ اس کا بیٹا یا وہ طوائف زادہ اس سکول میں نہیں پڑھے گا تو پھر یہاں کوئی بھی تعلیم حاصل نہیں کر سکے گا؟"

"اور اس نے وہی کر دکھایا جو کہا تھا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے...... کیا رب نواز شاہ بچ جائے گا؟"

"یہ تو بعد کی باتیں ہیں سر! اس نے جو کہا تھا وہ تو کر دکھایا۔ اوہو، سر! ایک اور بات۔ اس سلسلے میں جو تفصیلات مجھ تک پہنچی تھیں وہ راجہ دلاور کے ذریعے پہنچی تھیں اور اس نے

مجھے اس بات پر اکسایا تھا کہ میں اس کے خلاف کام کروں۔ اچانک ہی یہ خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ جب رب نواز شاہ میرے پاس آیا تھا تو ایک اور آدمی میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میرا پرانا جاننے والا ہے۔ بہرحال راجہ دلاور کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں تو بہتر ہو گا۔ نجانے کیوں یہ خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔"

پھر اس سلسلے میں کوئی کارروائی ہونے ہی والی تھی کہ ایک ملازم نے اطلاع دی کہ راجہ دلاور آیا ہے۔ شیطان کا ذکر ہو رہا تھا کہ شیطان آ موجود ہوا۔ لیکن وہ جس حلیے میں آیا تھا اسے دیکھ کر وہ دونوں ہی چونک پڑے۔ دو آدمی اسے سہارا دے کر لا رہے تھے اور اس کے چہرے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ صرف اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں یا منہ کا تھوڑا سا حصہ۔

"ارے یہ کیا ہوا تمہارے چہرے پر؟" لیاقت شاہ نے پوچھا۔

"مروا دیا کتے کی موت...... ختم کر دی ہماری زندگی تو آپ نے۔"

"بیٹھو بیٹھو، کیا تم زخمی ہو...... کیا ہو گیا...... یہاں کیسے آ گئے؟ مجھے اطلاع بھجواتے۔"

"فریاد لے کر آئے ہیں جناب! ہسپتال سے سیدھے یہاں چلے آ رہے ہیں۔ ہمارا حلیہ دیکھ لیں، یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہمارے ساتھ یہ ظلم ہو گا۔ آپ کے علاوہ اور کون بتا سکتا تھا رب نواز شاہ کو کہ اکرام کے بارے میں اطلاع دینے والے ہم تھے۔ اس نے ہماری ناک کاٹ لی ہے، شکل بگاڑ دی ہے۔ مر جائیں گے ہم، بچیں گے نہیں۔ لیکن خون آپ کی گردن پر ہو گا۔ ہم ایک ایک سے کہہ کر مریں گے کہ دیکھو ہم نے وفاداری کا ثبوت دیا تھا، قانون کا احترام کرانا چاہا تھا کہ جس سکول میں شریف زادے پڑھتے ہیں وہاں ایک طوائف زادہ بھی پڑھ رہا ہے مگر ہمارا نام صاف لے دیا گیا اور ناک کٹوا دی ہماری۔ ارے پوری ناک کاٹ دی اس کتے نے...... ہم نے تو ایک نیکی کی تھی، اس کا یہ بدلا ملا ہے ہمیں۔" راجہ دلاور بولتے بولتے نڈھال ہو گیا۔ رات کو اس کے ساتھ جو واردات ہوئی تھی اس نے کئی گھنٹے تک تو اس کا حال بگاڑے رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے اٹھ کر ملازموں کو اطلاع دی۔ بیوی تو ایسی بے ہوش ہوئی تھی کہ صبح ہی کو ہوش میں آئی۔ اور اس کے بعد ملازم ہسپتال لے گئے۔ رات بھر ہسپتال میں پڑا رہا۔

بہرحال اب یہاں غصے میں دوڑا چلا آیا تھا۔

"ہمیں افسوس ہے مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ یہ لوگ جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ لیکن فکر مت

کرو، میں ایکشن لوں گا۔"

"ہاں لیجئے آپ ایکشن۔ ہم تو نکٹے ہو ہی گئے۔"

"واقعی وہ شخص بہت بڑا مجرم ہے۔ میں ابھی انتظامیہ سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔ اسے چھوڑا نہیں جائے گا۔ بہرحال دیکھتے ہیں، کہیں نہ کہیں تو پتہ چلے گا اس کا۔"

○●○

حاجو کی تو پرانی عادت تھی۔ جب بھی کوئی خبر لے کر آتا تھا اسی طرح اچھلتا کودتا اندر آتا تھا۔ اس وقت بھی اچانک غڑاپ سے اندر داخل ہوا تھا اور بڑی مشکل سے شمشیرہ بیگم نے اپنے آپ کو اس کی زد سے بچایا تھا۔

"تمہارا ستیاناس جائے...... اب تو تمہیں کوسنے دیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کچھ بگڑتا ہی نہیں ہے تمہارا۔"

"بات سن لو پوری، چلا جاؤں گا۔ ایسے ہی مجھ سے کچھ مت کہنا۔"

"کیا خبر لائے ہو، بتاؤ۔"

"ارے اب ہم سب کا سوئم ہو جائے گا، کیا سمجھیں۔ پولیس آ گئی ہے۔"

"کیا بک رہے ہو؟" شمشیرہ بیگم نے سنبھل کر کہا۔

"قسم اللہ کی، جھوٹ بولنے والے کا منہ کالا۔ رب نواز شاہ کے احاطے کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے، ہیرا منڈی کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ پولیس والے رب نواز شاہ کے احاطے میں کود گئے ہیں، بندوقوں سے مسلح ہیں اور ان کے تیور بڑے خراب ہیں۔"

"ہیں...... شاہ جی کے احاطے میں اترے ہوئے ہیں...... ارے سن لی کیا اللہ میاں نے ہماری؟" شمشیرہ بیگم ناگن کا روپ رکھتی تھیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ لیکن کچھ بھی تھا، رب نواز شاہ کی ازلی دشمن تھیں۔ لیکن یہ دوسری بات تھی کہ مصلحت کے تحت کینچلی بدلتی رہتی تھیں۔

"تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کیا حاجو! پکڑے گئے کیا شاہ جی؟"

"پکڑے جائیں گے اگر ڈیرے کے اندر ہوئے تو۔"

"ارے، ذرا معلوم تو کرو، جلدی، دیکھو کیا ہوا؟" شمشیرہ بیگم گیلری میں آ کھڑی ہوئیں۔ شاہ جی کا احاطہ سامنے کی سمت تھا۔ ساری کوٹھے والیاں اپنی گیلریوں میں کھڑی

ہوئی تھیں اور ادھر بازار میں ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ دکانیں دھڑا دھڑ بند ہو گئی تھیں۔ سب کے سب شاہ جی کے احاطے میں ہونے والی کارروائی دیکھ رہے تھے۔ پولیس والوں کی کئی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے افسر موجود تھے۔ دکان داروں سے شاہ جی کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔ حاجو بھی شمشیرہ بیگم کی بغل سے منہ نکالے جھانکنے لگا تھا۔ کہنے لگا۔

"ایک ایک کو پکڑ کر شاہ جی کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے شمشیرہ بیگم! کہیں ہماری بھی مصیبت نہ آ جائے۔"

"کیا کہہ سکتے ہیں ہم۔"

"منہ بند رکھو ورنہ منہ میں جوتا ٹھونس دوں گی۔ ہمارے بھلا شاہ جی سے کیا تعلقات تھے۔ ابھی تک بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ گولیاں چلنے کی آواز تو سنائی نہیں دی۔ میں تو کہتی ہوں ڈیرے کو بم سے اُڑا دیا جائے۔"

"آپ بھی عجیب ہیں شمشیرہ بیگم! اب جب کہ شاہ جی کچھ لینے دینے پر آمادہ ہیں تو آپ ان کی موت چاہ رہی ہیں۔"

"اے میں تو کہتی ہوں کہ یہ موا کل کا ختم ہوتا ہوا آج ختم ہو جائے۔" شاہ جی کے احاطے پر جو کارروائی ہو رہی تھی وہ وہیں تک محدود تھی۔ بہت بڑی فورسز بھیجی گئی تھیں شاہ جی کو گرفتار کرنے کے لئے مگر ڈیرا خالی پڑا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے رب نواز یہ احاطہ چھوڑ گیا ہو۔ ویسے بھی کئی دنوں سے اسے ہیرا منڈی میں دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ پولیس نے آس پاس کے لوگوں کے بیانات لینے شروع کر دیئے اور پھر اس کے بعد اکرام کے بارے میں پوچھا گیا تو شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کی نشاندہی ہو گئی اور شمشیرہ بیگم کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"سنبھالئے شمشیرہ بیگم! آ گئے۔"

شمشیرہ بیگم دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑ کر رہ گئی تھیں۔ پولیس والے ان کے کوٹھے کی طرف ہی آ رہے تھے۔ شمشیرہ بیگم کے زینے کے سامنے رک کر انہوں نے کوٹھے کے بارے میں بھی سوالات کئے اور اس کے بعد ان کے وزنی بوٹوں کی آواز اوپر آنے لگی۔ شمشیرہ بیگم غڑاپ سے غسل خانے میں جا گھسیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ حالت جس

قدر خراب ہو جاتی کم تھا۔ پولیس کا ایک سپاہی چند سپاہیوں کے ساتھ اوپر پہنچا۔ حاجو بھاگ کر کہاں جا سکتا تھا۔ چہرہ فق، بدن نڈھال، غلام شاہ کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ غلام شاہ کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا۔ پولیس والے نے ان دونوں کو دیکھا اور سوال کیا۔

"شمشیرہ بیگم کہاں ہیں؟"

"جی وہ یہیں ہیں...... بلاتا ہوں۔ مگر جناب عالی! قصہ کیا ہے؟" غلام شاہ نے سوال کیا۔

"وہ لڑکا اکرام کہاں ہے جو شمشیرہ بیگم کا بیٹا ہے؟"

"جی وہ یہاں نہیں رہتا۔ میں شمشیرہ بیگم کو بلاتا ہوں۔"

بہرحال بڑی مشکل سے شمشیرہ بیگم کو تلاش کیا گیا۔ پتہ چلا کہ غسل خانے میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ غلام شاہ نے دروازہ بجایا لیکن کوئی جواب نہ ملا تو وہ بولا۔

"باہر تو آنا پڑے گا شمشیرہ بیگم! کب تک اندر بیٹھی رہو گی؟"

"اے تمہارا بیڑہ غرق ہو، مر جاؤ، خدا کرے سارے کے سارے مر جاؤ۔ کسی کی آئی تمہیں آ جائے۔ کیا ہوا آخر، کیوں بلا رہے ہو مجھے؟"

"پولیس اکرام کی تلاش میں آئی ہے۔" غلام شاہ نے بتایا۔

"تو اس کی ماں کیا مر گئی؟ ارے اندر موجود ہے، اسے پکڑو۔"

اسی وقت انسپکٹر نے باہر سے کڑک کر کہا۔ "شمشیرہ بیگم دروازہ کھول کر باہر نکل آؤ ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔"

"اے نہ بھائی، نہ...... بری حالت میں ہوں۔ دروازے کو مت توڑنا، میں باہر آ رہی ہوں۔"

بہرحال شمشیرہ بیگم ہانپتی کانپتی باہر نکل آئیں۔ پولیس والوں کو دیکھ کر گرتے گرتے بچیں۔ بری طرح نڈھال ہو گئی تھیں۔ پولیس افسر نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

"اکرام تمہارا بیٹا ہے؟"

"اللہ نہ کرے...... وہ کھڑی ہے اس کی ماں، وہ سامنے کھڑی ہے۔"

شمشیرہ بیگم نے کوثر جہاں کی طرف اشارہ کیا جو تسنیم کو کاندھے سے لگائے مطمئن کھڑی ہوئی تھی۔ پولیس آفیسر نے اسے حیرت سے دیکھا پھر بولا۔

"اکرام تمہارا بیٹا ہے؟"

"ہاں جی، ہے۔"

"مگر تم تو بہت کم عمر ہو۔"

"اس میں میرا قصور ہے؟"

"تم جھوٹ تو نہیں بول رہیں؟"

"نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے پھر وہ تمہارا بیٹا ہے۔"

"جی ہاں"

"مگر وہ تو جوان لڑکا ہے۔"

"آپ یقین کریں، اس میں میرا قصور نہیں ہے۔"

"اے بھائی جی...... اللہ تمہاری ترقی کرے، خوش رہو، آباد رہو۔ یہ بتاؤ، ہم سے قصور کیا ہوا ہے؟" شمشیرہ بیگم نے کیسے نکالتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اکرام کی تلاش ہے۔"

"وہ حرام کا پلا یہاں رہتا کہاں ہے؟"

"تو پھر کہاں رہتا ہے؟"

"ارے وہ تم نے دیکھا نہیں رب نواز شاہ کا ڈیرہ؟"

"رب نواز سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"بھاڑ چولہے میں جائیں، ہمارے رشتے دار کیوں ہوتے؟" شمشیرہ بیگم بولیں۔

"تو پھر اکرام وہاں کیوں رہتا ہے؟"

"بس وہی مثال ہے کہ زبردست مارے اور رونے بھی نہ دے۔ ارے پوری ہیرا منڈی میں پوچھ لو، سب کا ناک میں دم کیا ہوا ہے، ہمیں تو فقیر کر کے رکھ دیا ہے شاہ جی نے۔ کہاں کہاں داد فریاد نہ کی لیکن غریبوں کی کون سنتا ہے...... مگر قصہ کیا ہے، یہ بھی تو بتا دو۔"

"بکواس بند کرو، یہ بتاؤ اکرام کہاں ہے؟"

"لو...... ساری رات کہانی سنائی، یہ نہ پتہ چلا کہ زلیخا مرد تھی یا عورت۔"

"چلو تلاشی لو۔" پولیس افسر نے کہا اور کانسٹیبل گھر کی تلاشی لینے لگے۔ اکرام نہیں ملا تھا۔

"تم سب کو تھانے چلنا ہوگا۔" انسپکٹر نے کہا اور شمشیرہ بیگم گرتے گرتے بچیں۔

"مگر کیوں...... آخر کیوں......؟"

"ہمیں اکرام کو برآمد کرانا ہے اور تمہاری مدد کے بغیر یہ نہیں ہوسکتا۔"

"میں بتاتی ہوں تمہیں وہ کہاں ملے گا۔ ہم کیوں تھانے جائیں۔ اب ایسے گرے پڑے نہیں ہیں، ہمارے ہاتھ بھی لمبے ہیں۔ اے حاجو! جا، ذرا بات کر بڑے شاہ جی سے۔ ان سے کہہ کہ پولیس ہمیں پریشان کر رہی ہے۔ ارے ہم پتہ دے رہے ہیں، وہیں ہوگا وہ کتیا کا جنا۔ اے غلام شاہ! ذرا اس کوٹھی کا پتہ تو بتاؤ، دیکھو ہم نے عزت بنائی ہے، وہ ہمارے گھر میں پیدا ضرور ہوا ہے لیکن بری صحبت میں رہ کر بگڑ گیا ہے۔ اچھا ہے جیل جائے تو ٹھیک ہو کر واپس آئے گا۔"

غلام شاہ نے کوٹھی کا پتہ بتایا۔ انسپکٹر نے کہا۔ "نہیں، وہاں بھی دیکھ لیا گیا ہے۔ رب نواز وہاں سے فرار ہوگیا ہے۔"

"میں صدقے چندا...... اب تو بتا دو ہوا کیا ہے؟"

"رب نواز اور اس کے ساتھیوں نے بہت بڑے سکول کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ ایک معزز شخص کی ناک کاٹ دی ہے۔ کیا نہیں کیا اس نے، بس بتا نہیں سکتے تمہیں۔ اور اکرام ان کے ساتھ تھا۔"

"لو، کوثر جہاں! مبارک ہو۔ بیٹا پورا بدمعاش بن گیا ہے۔ جرائم شروع کر دیئے ہیں اس نے۔ یہ تو ہونا تھا۔ اوہ خدا، تو سب کو اٹھا لے...... ساری عزت خاک میں ملا دی۔"

"بڑی بی! ہمارا وقت قیمتی ہے۔ دیر مت لگاؤ، چلو۔"

بڑی بات تھی۔ اس لئے پولیس کو اختیارات دیئے گئے تھے۔ اس لئے سب کو پولیس جیپ میں بیٹھنا پڑا۔ شمشیرہ بیگم نے راستے میں اور پھر تھانے میں وہ تماشے کئے کہ پولیس والے بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکے اور ان سے مذاق کرنے لگے۔

"ارے ایک بات تو بتا دو کہ اگر وہ کمبخت مارے نہ ملے تو ہمارا کیا ہوگا؟"

"اس کوٹھے کا مالک کون ہے جہاں اکرام رہتا تھا؟"

"میرا ہے وہ کوٹھا۔" شمشیرہ بیگم بولیں۔

"تو پھر آپ ہی کو پھانسی دی جائے گی۔" پولیس والے نے جواب دیا اور شمشیرہ بیگم کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا۔ چیخ چیخ کر رونے لگیں اور اکرام اور شاہ جی کو کوسنے لگیں۔ پولیس نے سب کے بیانات لئے اور یہ جاننا چاہا کہ شاہ جی یہاں سے بھاگے ہیں تو کہاں گئے ہوں گے۔ شمشیرہ بیگم نے دھواں دھار بیان دیا اور شاہ جی کی، ہیرا منڈی کی اور ان کے تمام جرائم کی تفصیل بتا دی۔ کوثر جہاں البتہ بالکل اطمینان سے تھی۔ اکرام نے اسے پوری بات بتا دی تھی اور اطمینان دلایا تھا کہ آسانی سے وہ لوگ پولیس کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔

بہرحال شمشیرہ بیگم کی کیفیت جو بھی ہو لیکن کوثر جہاں مطمئن تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ جب آئے گا تو بہاریں ساتھ لائے گا۔ بہرحال شمشیرہ بیگم کے بھی شناسا تھے۔ کئی افراد تھانے پہنچ گئے۔ صاحب حیثیت لوگ تھے، اپنی ضمانت پر ان سب کو تھانے سے رہائی دلائی۔ مگر اب بھی شمشیرہ بیگم کا واویلا دیکھنے کے قابل تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی کی شام قریب آگئی ہو۔

"ہائے یہ دن بھی دیکھنا تھا...... ارے ساری کوٹھے والیاں تھو تھو کریں گی۔ ایسا تو کبھی کسی کے ساتھ نہ ہوا ہوگا...... کوثر جہاں! اسی دن کے لئے کہتی تھی۔ مگر میری کون سنتا؟ دیکھ لیا نا نتیجہ...... ہائے دیکھ لیا نا......؟"

کوثر جہاں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اُڑا گئی تھی۔

○●○

چوہدری غیاث الدین کراچی سے آ رہے تھے۔ بہت اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ پشتنی جاگیردار، گجرات میں رہتے تھے۔ جاگیریں تو خیر تھیں ہی لیکن انہوں نے دو کارخانے بھی لگا رکھے تھے۔ ان کارخانوں میں لوہے کی مصنوعات بنائی جاتی تھیں اور بڑی شہرت کی حامل تھیں۔ گھر میں خوشیوں کا دور دورہ تھا۔ لیکن پھر ان خوشیوں میں تاریک اندھیرے داخل ہوگئے۔ عرشیہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی، بے حد چہیتی اور بڑی ہی اعلیٰ فطرت کی مالک، تعلیم یافتہ ہونے کے بلا، جود والدین کی بے حد اطاعت گزار اور تقدیر پر شاکر۔ ایسا نہ ہوتا تو نجانے کیا حشر کر دیتی۔ اکلوتی بیٹیوں کے طور طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن

اتنے بڑے سانحے کو صبر کے ساتھ پی گئی تھی۔ فیصلہ کرنے والے والدین ہوتے ہیں۔ یہی سوچتی تھی کہ میں کون ہوں والدین کے معاملات میں دخل اندازی کرنے والی۔

بدقسمتی یہ تھی کہ منگنی وغیرہ کی رسم ادا نہیں ہوئی تھی بلکہ باقاعدہ نکاح ہوا تھا رب نواز شاہ سے۔ چنانچہ جب تک رب نواز شاہ طلاق نہیں دے دیتے ظاہر ہے کچھ اور سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ رب نواز شاہ اس طرح غائب ہوئے تھے کہ نام و نشان تک کا پتہ نہیں چلا تھا۔ چوہدری غیاث الدین صاحب ظرف تھے۔ ملاقاتیں ہوتیں، تذکرے بے شک ہوتے لیکن کوئی شکوہ زبان تک نہ آتا۔ تقدیر پر شاکر تھے۔ اللہ نواز شاہ نے ایک دفعہ کہا بھی تھا۔

”غیاث الدین! گردن جھکی ہے تمہارے سامنے، جو کچھ بھی کرو گے سر نہیں اٹھاؤں گا۔ سو فیصدی قصور میرا ہے۔ لیکن غیاث الدین! یقین کر لو کہ بات چھپانے کے لئے گم نہیں کی تھی بلکہ اتنی پرانی ہوگئی تھی کہ ذہن میں اس کا تصور بھی نہیں رہا۔ بتاؤ کیا کروں؟“

”پہلا کام تو یہ کرو اللہ نواز شاہ کہ مجھے ذلیل مت کرو۔ شرمندہ مت کرو۔ پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ صورتحال میرے علم میں ہے۔ بس کچھ لوگ زبان کے پھوہڑ ہوتے ہیں۔ لندن سے آنے والے مہمان نے جس بدتمیزی کے ساتھ تذکرہ کر دیا تھا انہیں روا نہ تھا۔ اور پھر اگر وہ اسے دوست کا عیب سمجھتے تھے تو عیب چھپانے کی کوشش کرتے۔ انہوں نے تو الم نشرح ہی کر دیا۔“

”میں یہ کہہ رہا تھا غیاث الدین! کہ عرشیہ کو رب نواز کے نام پر کب تک بٹھائے رکھو گے؟“

”دیکھو خواہش تو میری بھی یہی ہے کہ عرشیہ کو اس کا گھر دے دوں۔ کون جانے حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ لیکن رب نواز! ایسا کر بھی تو نہیں سکتا۔ اور ویسے بھی قانونی طور پر کم از کم پانچ سال تو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آرزو تو یہی ہے کہ رب نواز شاہ کے دماغ سے برف پگھلے اور وہ واپس آ جائیں۔ خدا کرے ایسا ہو تو ہم سب کی زندگی بھی پار لگ جائے۔“

بہرحال صورتحال یہ تھی کہ غیاث الدین بذریعہ ریل کراچی سے لاہور آ رہے تھے۔ لاہور میں کچھ کام تھا۔ بعد میں گجرات جانا تھا۔ ریل کے فرسٹ کلاس ڈبے میں وہ اسی شان و شوکت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے جیسی زمینداروں کی ہوتی ہے۔ ٹرین کے سفر کو بھی

گھر کی شان و شوکت سے کم نہیں بنا رکھا تھا۔ اسٹیشن آتے رہے۔ غیاث الدین میں ایک خاص عادت تھی، وہ یہ کہ دوران سفر انہیں کبھی نیند نہیں آتی تھی۔ جہاز کے سفر سے الرجک تھے چنانچہ جہاز میں سفر نہیں کرتے تھے۔ اس وقت بھی جاگ رہے تھے۔ ٹرین خانیوال اسٹیشن پر رکی تھی جب ایک نوجوان لڑکا ان کے ڈبے میں چڑھ آیا۔ ویسے تو فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں اور بھی لوگ تھے لیکن سب کے سب شان و شوکت والے۔ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کس حیثیت کے مالک ہیں۔ لیکن آنے والا بلاشبہ شکل و صورت میں اور صحت میں شاندار تھا لیکن کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار معلوم ہوتا تھا۔ بال الجھے ہوئے اور مٹی میں اٹے ہوئے، چہرے پر کئی جگہ کھرنڈ جمے ہوئے، نیلے نیلے عجیب سے نشانات، آنکھوں میں وحشت۔ کچھ لوگوں کو اس کی آمد ناپسند ہوئی۔ ایک صاحب نے تو منہ ٹیڑھا کر کے کہہ ہی دیا۔

”اوئے کدھر گھسا چلا آ رہا ہے باولے اونٹ کی طرح...... یہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ ہے۔ ٹکٹ لیا ہے فرسٹ کلاس کا؟“

نوجوان لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر خاموشی سے فرش کے ایک حصے پر دوسری جانب کے دروازے کے قریب جا بیٹھا۔ کسی نے سرگوشی کی۔

”شکل صورت سے تو پاگل لگتا ہے۔“

”چہرے پر زخموں کے نشانات بھی ہیں۔“

”کہیں کوئی واردات کر کے نہ بھاگا ہو۔“

”لگتا تو کوئی جرائم پیشہ ہی ہے۔“

طرح طرح کی سرگوشیاں ہو رہی تھیں اور یہ طے کر لیا گیا تھا کہ جیسے ہی ٹکٹ کلکٹر آئے گا اس کے بارے میں شکایت کریں گے اور کہیں گے کہ ذرا اس معزز مہمان کو تو دیکھو۔

غیاث الدین بھی اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کی تجربہ کار نگاہیں نوجوان کا تجزیہ کر رہی تھیں۔ چہرہ مہرہ کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا لیکن انداز میں ایک ایسی شان نظر آئی انہیں کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے سردار علی سے کہا۔

”سردار علی! ذرا اس لڑکے کو دیکھو۔“

”دیکھ رہا ہوں غیاث صاحب! دوسرے لوگ تو کہہ رہے ہیں کہ یہ کوئی جرائم پیشہ ہے۔“

"یار چھوڑو دوسروں کی باتوں کو۔ اپنی آنکھ سے دیکھو۔ بلکہ مناسب سمجھو تو اسے بلا کر دوسری طرف لے آؤ۔"

"ابھی لاتا ہوں۔" سردار علی لڑکے کے پاس پہنچ گئے اور جھک کر بولے۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا سامنے دیکھتا رہا۔ سردار علی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ "ہم تمہی سے کہہ رہے ہیں...... کیا نام ہے تمہارا؟"

اس بار نوجوان نے بے بس نگاہوں سے سردار کو دیکھا مگر اب بھی کچھ نہ بولا۔ سردار علی نے کسی قدر جھنجلاہٹ کے انداز میں کہا۔ "ادھر دیکھو...... وہ بہت بڑے رئیس ہیں، تمہیں بلا رہے ہیں۔"

نوجوان نے روٹھے ہوئے انداز میں گردن دوسری طرف کر لی۔ سردار علی اسے دیکھتے رہے، پھر واپس پلٹے۔

"پاگل ہی معلوم ہوتا ہے جناب!"

"آہ...... کتنے افسوس کی بات ہے۔ بے چارہ کسی اچھے گھرانے کا لگتا ہے۔ ویسے بغیر ٹکٹ معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً ٹکٹ کلکٹر اس کے ساتھ برا سلوک کرے گا۔ نجانے کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ ایک کام کرو سردار علی! بچہ جو کوئی بھی ہے، اس کی مدد کرنی ہے۔"

اتفاق کی بات یہ ہے ٹکٹ کلکٹر بھی اسی وقت اندر آیا۔ لوگوں نے اطمینان کی سانس لی، اب اس کم بخت کو ٹرین کے ڈبے سے اٹھا کر باہر لے جایا جائے گا۔ لیکن نجانے کیوں غیاث الدین کے دل میں اس کے لئے ہمدردی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ٹکٹ کلکٹر نے بھی اسے تاڑ لیا اور اس کے قریب پہنچا اور پھر جھک کر بولا۔ "ٹکٹ دکھاؤ۔"

لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گردن اٹھا کر ٹکٹ کلکٹر کو دیکھا اور پھر گھٹنوں میں منہ دے لیا۔ ٹکٹ کلکٹر سمجھ گیا کہ بغیر ٹکٹ ہے۔ بال پکڑ کر سر اونچا کیا اور سخت لہجے میں بولا۔

"ٹکٹ ہے کہ نہیں تمہارے پاس؟"

غیاث الدین نے فوراً ہی سردار علی کو اشارہ کیا اور پھر خود بول پڑے۔

"ادھر آجائیے جناب! اس کا ٹکٹ ہمارے پاس ہے۔"

بہت سی گردنیں گھومیں، غیاث الدین کو دیکھا گیا اور پھر مدھم سرگوشیاں فضا میں بکھر

گئیں۔ ٹکٹ کلکٹر غیاث الدین کے پاس آگیا اور پھر بولا۔

"یہ آپ کے ساتھ ہے؟"

"یہی سمجھ لیجئے۔ ہمارے ساتھ بے شک نہیں ہے، لیکن اب ہمارے ساتھ ہے۔"

"اس کا ٹکٹ؟"

"ہاں، ہمارے ٹکٹ تو ملازم کے پاس ہیں، اس کے ٹکٹ کی جو رقم بنتی ہے وہ آپ ہم سے لے لیجئے۔"

ٹکٹ کلکٹر نے رقم وصول کر کے ٹکٹ بنا دیا اور دوسرے لوگوں کے ٹکٹ چیک کرنے لگا۔ لڑکا خاموش تھا۔ اس بار غیاث الدین خود اس کے پاس پہنچے اور اس نے آہستہ سے کہا۔

"بیٹے! فرش پر مت بیٹھو، جگہ ہے ہمارے پاس، آؤ اٹھو۔" انہوں نے نوجوان کا بازو نرمی سے پکڑا تو وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ غیاث الدین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس خوبصورت سے نوجوان کو قریب سے دیکھ کر انہیں اور بھی عجیب سا لگ رہا تھا۔ اسے بیٹھنے کے لئے جگہ دے دی گئی اور غیاث الدین اسے غور سے دیکھنے لگے۔ چہرے کے کھرنڈ اور زخموں کے نشانات اگر صاف ہو جائیں تو ایسی شکل وصورت نکلتی کہ دیکھنے والے دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔ مگر یہ ہے کون۔

"نام کیا ہے بیٹے تمہارا؟"

نوجوان کے خشک لب آہستہ سے ہلے اور پھر ان سے ایک آواز نکلی۔ "اکرام۔"

○●○

رب نواز کی آنکھ سرکاری ہسپتال کے ایک جنرل وارڈ میں کھلی تھی۔ بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ سر سے لے کر پاؤں تک زخمی تھے۔ حالات پر غور کیا تو واقعات یاد آنے لگے اور وہ بری طرح بے چین ہو گئے۔ قریب سے گزرتی ہوئی ایک نرس کو آواز دی تو نرس چونک کر رک گئی۔ جلدی سے قریب آ کر بولی۔

"آپ ہوش میں آگئے؟"

"ہوش میں نہ ہوتے تو تمہیں آواز کیسے دیتے؟ ہم اٹھ کر بیٹھ سکتے ہیں کیا؟"

"ارے نہیں...... آپ کے ہاتھ اور پاؤں پر تو پلاسٹر چڑھا ہوا ہے۔ ٹھہریئے میں آپ کو سہارا دے کر بٹھاتی ہوں اگر آپ الجھن محسوس کر رہے ہوں تو۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"آپ کو کچھ معلوم نہیں؟"

"سوالات زیادہ کر رہی ہو پیاری بہن! ہمیں صرف ہمارے سوالات کا جواب دو۔" شاہ جی نے بھاری لہجے میں کہا۔

"آپ ہسپتال میں ہیں...... ریل کا حادثہ ہوا تھا جس میں آپ زخمی ہو گئے۔"

"ہمارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ کیا وہ بھی اسی ہسپتال میں موجود ہیں؟ ان میں سے کوئی اللہ کو پیارا تو نہیں ہوا، ذرا پتہ کر کے بتاؤ گی؟"

نرس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ "یہاں تو بے شمار افراد زخمی لائے گئے ہیں۔ اب بھلا کسی کو کیا معلوم کہ آپ کے ساتھ کون کون تھا...... آپ ان کے نام بھی بتائیں گے تو ہمارے لئے بیکار ہے۔ کیونکہ زخمیوں میں سے صرف نو افراد ایسے ہیں جنہوں نے اپنے نام بتائے ہیں۔"

"چلو انہی کے نام بتا دو۔" شاہ جی بولے۔

"میں ابھی یہ معلوم کر کے آتی ہوں۔"

شاہ جی بری طرح بے چینی کا شکار تھے۔ ریل کا حادثہ ہوا تھا۔ اکرام بھی ساتھ تھا اور چاروں ساتھی بھی۔ خدا نہ کرے کسی کو نقصان پہنچا ہو۔ دل بری طرح بے چین ہو رہا تھا۔ زخمی پاؤں کو جنبش دی تو کوئی احساس نہیں ہوا۔ پلاسٹر چڑھا ہوا تھا، جنبش دے سکتے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی ایسا شدید زخم نہیں ہے جو انہیں معذور کر دے۔ دل ہی دل میں خدا سے دعا کی کہ باری تعالیٰ اگر زندگی دی ہے تو ایک مفلوج انسان کی حیثیت سے زندہ رہنے کی بجائے بہتر ہے کہ موت دے دے۔ اور اگر زندگی عطا فرمائی ہے تو صحت دے دے۔ باری تعالیٰ! مجھے میرے ساتھیوں سے جدا نہ کرنا ورنہ یہ زندگی ایک گہرے زخم کے سوا اور کچھ نہیں ہو گی۔

نرس وہ کاغذ اٹھا لائی جن پر ان زخمیوں کے نام درج تھے جو ہوش میں آ کر اپنا نام اور گھر بار کا پتہ درج کرا چکے تھے لیکن ان میں کوئی نام ان کے ساتھیوں کا نہیں تھا۔

"مجھے بتائیے، میں اور کیا کر سکتی ہوں؟"

شاہ جی نے اسے دیکھا پھر بولے۔ "ہم نے تمہیں بہن کہا ہے...... بہت بڑا درجہ ہو

ہے بہن کہنے کا۔ اس بات کو مانتی ہو؟"

"کیوں نہیں جناب۔"

"تو پھر تھوڑا سا سہارا دے دو ہمیں۔ ویسے تو ہم اس پاؤں کے سہارے دوڑ بھی سکتے ہیں۔ ہم پرواہ نہیں کرتے کسی بات کی۔ لیکن چاہتے ہیں کہ پاؤں ٹھیک ہو جائیں اور ہم مفلوج نہ رہیں اس لئے ہمیں وہاں تک سہارا دے دو جہاں جہاں زخمی موجود ہیں۔"

"سر! اس کی اجازت نہیں ہے۔ اگر میں نے ایسا کیا تو میری نوکری چلی جائے گی۔"

"ضد مت کرو...... ہم اس سسرے پاؤں کو نہیں مانتے۔ سارا پلاسٹر اکھاڑ کر پھینک دیں گے۔ ہم ہیں ذرا الٹے دماغ کے آدمی۔ اگر تم بہن کے نام پر بھی سہارا نہیں دے سکتیں تو ہماری نظروں سے دور ہو جاؤ۔"

نرس نے شاہ جی کا چہرہ دیکھا پھر بولی۔ "ٹھیک ہے...... اگر ڈاکٹر صاحب دیکھ لیں اور ناراض ہوں تو ساری ذمے داری آپ قبول کریں گے۔"

"بھائی کا وعدہ ہے...... ایسا ہی ہو گا۔"

نرس نے ان کے بازو کو سہارا دیا جو زخمی نہیں تھا اور جس پر پلاسٹر نہیں چڑھا ہوا تھا۔ شاہ جی نرس کے سہارے آگے بڑھنے لگے۔ پھر آہستہ سے مسکرا کر بولے۔

"اللہ کی مرضی ہے، مرد کی مونچھ کبھی کبھی اس طرح نیچی ہو جاتی ہے۔ لیکن شکر ہے آج ایک لڑکی کا سہارا لے کر چل رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی غرور کی بات منہ سے نکل گئی ہو۔"

بستروں کا طویل سلسلہ تھا اور شاہ جی ان پر پڑے ہوئے ایک ایک چہرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔ پھر اچانک ہی کسی کی آواز سنائی دی۔

"شاہ جی...... شاہ جی......"

شاہ جی نے بے چینی سے ادھر دیکھا، شالے خان تھا۔ شاہ جی نے رفتار تیز کی تو نرس نے کہا۔

"نہیں...... جس طرح چلتے رہے ہیں اسی طرح چلتے رہیں۔"

شالے خان بھی زیادہ زخمی نہیں تھا۔ مسہری سے نیچے اٹھ کھڑا ہوا۔ بس ایک دو جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ شاہ جی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کیا عورتوں کی طرح رو رہے ہو...... مردوں جیسی بات کرو۔ یہ بتاؤ باقی کا کیا ہوا؟"

”پتہ نہیں شاہ جی! ابھی تک کچھ پتہ نہیں۔“

”ہوں......ٹھیک سے چل پھر سکتے ہو؟“

”جی شاہ جی۔“

”تو پھر جاؤ، باقی کی خبر لگا کر آؤ۔“

”ٹھیک ہے شاہ جی! آپ اپنے بستر پر جایئے۔“

شاہ جی کی ہدایت کے مطابق شالے خان پورے ہسپتال میں تلاشی لیتا پھرا...... پھر واپس آ گیا اور بولا۔ ”تینوں موجود ہیں...... تھوڑی تھوڑی سی چوٹیں آئی ہیں، لیکن ٹھیک ٹھاک ہیں۔“

”اور اکرام؟“

”وہ ہسپتال میں نہیں ہے شاہ جی۔ ویسے میں ابھی آپ سے اجازت لے کر پورے ہسپتال کا چکر لگاتا ہوں۔“

”تو پھر جاؤ۔ کیوں ہمارے سینے میں چھریاں گھونپ رہے ہو۔ جاؤ پتہ لگاؤ، جلدی۔“

شالے خان چلا گیا۔ شاہ جی کی کیفیت بڑی خراب تھی۔ پھر باقی افراد بھی شاہ جی کے پاس پہنچ گئے۔ شالے خان انہیں شاہ جی کے بارے میں بتا کر آیا تھا۔ وہ سب کے سب شاہ جی سے ان کی خیریت دریافت کرنے لگے تو شاہ جی نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”نور شاہ، فضل خان! ہمیں صرف اکرام کا پتہ بتاؤ۔ اگر اللہ نے اسے زندگی عطا کی ہے تو اسے تلاش کرو۔ حادثے کے وقت تم دونوں کی حالت کیا تھی؟“

”بس شاہ جی! خوش قسمتی یہ تھی کہ ایک برتھ کے نیچے دب گئے تھے ہم لوگ۔ بس بدن کے چند حصوں پر چوٹیں آئی تھیں۔ بہرحال ڈبے میں سے سب کو نکال لیا گیا تھا۔ میں جب اوپر پہنچا تو میں نے اکرام کو تلاش کیا، وہ نظر نہیں آیا۔ رضا کاروں نے مجھے بھی پکڑ لیا اور پھر مجھے بھی اس ہسپتال میں پہنچا دیا۔“

”تم لوگوں نے اپنے نام بتا دیئے کیا؟“ شاہ جی نے سوال کیا۔

”نہیں شاہ جی! ایسی بے وقوفی کیسے کر سکتے تھے؟“

”یہ بڑا اچھا کیا...... اچھا اب ایسا کرو، میرا نام سنو۔ میرا نام سردار شاہ ہے۔ اپنے اپنے نام سوچ لو۔ اور پھر اس کے بعد اکرام کو تلاش کرو، میرا دل ڈوب رہا ہے۔“

”ہم جاتے ہیں۔“ نور شاہ اور دلبر خان نے کہا اور وہاں سے چلے گئے۔ شالے خان اور فضل خان شاہ جی کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ پھر شالے خان نے پوچھا۔

”آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہوں بھائی! ذرا ڈاکٹر سے پوچھ کر یہ بتاؤ کہ ہماری ٹوٹ پھوٹ کس طرح کی ہے؟“

بہرحال ان لوگوں نے اپنے اصلی نام نہیں لکھوائے تھے۔ ظاہر ہے مفرور تھے۔ ریل کے حادثے کے زخمیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جا رہا تھا۔ ان لوگوں نے بڑے سنبھل کر ہر کام کیا تھا۔ جس کے پاس جتنی رقم تھی نکال کر اپنے قبضے میں رکھ لی گئی تھی۔ بہرحال پیسہ بہت بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ پولیس سے بھاگے ہوئے تھے۔ ہسپتال میں بھی خطرہ پیش آ سکتا تھا۔ بہرحال رات گزر گئی، دوسری صبح آئی اور سارے کام ہونے لگے۔ شاہ جی نے کہا۔

”سنو...... اس ہسپتال سے آج رات نکل جانا ہے۔“

”لیکن شاہ جی! کہاں جائیں گے؟“

”یار! بس یہ فیصلہ کر لیں گے کہ کہاں جانا ہے۔ ہمارا اصل مقصد تو شہزادے کی تلاش ہے۔ بزرگوں کے مزاروں کے چکر لگائیں گے، دعائیں مانگیں گے اور کوشش کریں گے کہ ہمارا چاند ہمیں مل جائے۔“

شاہ جی کی آواز میں بھراہٹ تھی۔ جو زندگی میں پہلی بار سنی گئی تھی۔

○●○

جواد حسین، چوہدری نظام الدین کے گھر پہنچ گئے۔ فاخرہ بیگم اور شانہ ساتھ تھیں۔ چوہدری نظام الدین تو جواد حسین کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اور پھر اس طرح ان سے لپٹے کہ چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

”یار جواد! تُو اس طرح آ جائے گا، میرے خوابوں میں بھی نہ تھا۔ تُو نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟ کب آیا؟“ چوہدری نظام الدین نے جواد حسین کو جواب دینے کا موقع ہی نہیں دیا اور سوال پر سوال کرنے لگے۔ جواد حسین ہنسے، پھر بولے۔

”بھائی! بس ذرا یہ اور بتا دو کہ پہلے کون سے سوال کا جواب دوں؟“

"جواد! تیرے آنے سے دل کو اتنی ہی خوشی ہوئی ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ یوں بھی جب انسان کی عمر اتنی آگے بڑھ جاتی ہے، اگر اسے کوئی پرانا دوست مل جائے تو وہ اسے جوانی کا سرمایہ سمجھتا ہے۔ ہمارے درمیان بھی بڑا اچھا وقت گزرا ہے۔"

"ہاں...... یہ تو ہے۔"

پھر تمام تر خوشیوں کے درمیان مختلف باتیں ہوتی رہیں اور بڑے مزے کا وقت گزرنے لگا۔ شانہ اور فاخرہ بیگم بھی چوہدری نظام الدین کے اہل خاندان سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ بڑے تذکرے ہوتے رہتے تھے ان لوگوں کے۔ پہلے ملاقاتیں بھی ہو چکی تھیں۔ خوب ہنگامہ آرائی ہوتی رہی اور بڑے مزے کا وقت گزرنے لگا۔ چوہدری نظام الدین نے کہا۔

"اب یہ بتاؤ واپسی کب ہے انگلینڈ؟"

"طلاق دے دی ہے انگلینڈ کو۔" جواد حسین نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"چھوڑ دیا یار انگلینڈ...... انگلینڈ میں رہنے کی وجہ میرا ایک یار تھا۔ بس میں یہاں آیا تو وہ میری جدائی برداشت نہیں کر سکا اور دنیا چھوڑ گیا۔ انگریز تھا وہ۔"

"یار تھا یا پھر......"

"نہیں یار بس کیا بتاؤں، کیسا انسان تھا۔ ہر نسل اور ہر رنگ کے لوگوں میں بہت اچھے لوگ بھی چھپے ہوتے ہیں، ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔"

"ہاں...... یہ تو ہے۔ اچھا یہ بتاؤ نادر شاہ کیسے ہیں؟"

"نادر شاہ بھی ٹھیک ہے۔ اسی کے پاس تو آیا تھا۔ ایک ہی تو بھائی ہے میرا۔ پہلے میر یہاں رکنے کا ارادہ نہیں تھا، واپس جانے کا پورا پورا ارادہ تھا لیکن بس تم یقین کرو، اپ دوست کی موت کے بعد مجھے لندن جانے سے خوف محسوس ہونے لگا ہے۔ میں سوچتا ہو وہاں کس کے پاس جاؤں گا؟ ویسے تو ظاہر ہے زندگی ہی وہاں گزاری ہے۔ لیکن تم یقین لو، بس کیا کہوں؟" جواد حسین افسردگی سے خاموش ہو گیا۔

"بات اصل میں یہ ہے جواد! کہ تم خود اتنے اچھے انسان ہو کہ لوگ تم سے اتنی ہی محب کریں۔ ویسے واقعی یہاں قیام کے سلسلے میں سنجیدہ ہو؟"

"ہاں...... اب واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اور پھر ویسے بھی بچی ماشاء اللہ بڑی ہو رہی ہے۔ اس کے لئے ظاہر ہے انگلینڈ میں تو نہیں رک سکتا۔ وہاں اچھے لڑکوں کا فقدان ہے۔ اور پھر نادر شاہ نے کچھ کام کیا ہے یہاں۔ ارے ہاں، ایک بات بتاؤں تمہیں، بڑی انوکھی بات ہے۔"

"کیا؟"

"یار! نادر شاہ نے ایک لڑکے کی بات کی تھی مجھ سے۔ پڑھ رہا ہے ابھی، چھوٹی عمر کا ہے...... مگر شانہ کو بھی تم نے دیکھ لیا، اصل میں بچیاں بڑی لگنے لگتی ہیں۔ ذرا سی عمر ہو جائے تو۔ ابھی تو کوئی ارادہ بھی نہیں تھا لیکن نادر شاہ بھائی ہے اور ظاہر ہے بھائی کے بارے میں وہ نہ سوچے گا تو اور کون سوچے گا؟ آنکھوں میں ایک لڑکا چڑھ گیا تھا۔ وہاں کے بہت بڑے اور اچھے سکول میں پڑھتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ وہ لگ گیا پیچھے، کوئی رب نواز شاہ ہیں، بڑی شاندار کوٹھی ہے ان کی لاہور میں۔ بچہ وہیں رہتا ہے۔ وہ خود کہیں اور رہتے ہیں۔ رب نواز شاہ کا بیٹا ہے وہ اور پڑھ رہا ہے ابھی۔ لیکن اصل بات جو میں تم سے کہنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ وہ ہو بہو شمس الدین کی شکل ہے۔"

"شمس الدین کون؟"

"ویری گڈ...... ویری گڈ...... یار! ہم نے تو سنا تھا کہ وہ تمہارا بیٹا ہے۔"

"اپنے شمس کی بات کر رہے ہو؟"

"تو پھر کس کے شمس کی بات کر رہا ہوں؟"

"شمس الدین کی شکل ہے؟"

"ایسا کہ دیکھو تو حیران رہ جاؤ گے۔"

"تعجب کی بات ہے۔"

"اور یقین کرو ایسا حسین، ایسا پُر وقار اور ایسا نستعلیق کہ بس کہتے ہوئے بات نہیں بنتی۔"

"بیٹی کے حوالے سے دیکھا ہے نا، دل میں خود بخود محبت ابھر آتی ہے۔ بہر حال میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔"

"ارے نہیں بھئی...... ایسی بات نہیں ہے نظام الدین! ابھی تو ہم اس کے اہل خاندان سے ملے بھی نہیں ہیں۔ بس دوست کی موت نے کچھ ایسا دل برداشتہ کر دیا تھا کہ دماغ الجھ

کر رہ گیا تھا۔ ورنہ ملتے ضرور اس سے۔ میرا مطلب ہے اس کے والدین سے۔ خیر بعد میں سہی۔ تو حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ شمس الدین سے ملتا جلتا ہے بھئی۔ شمس الدین سے تو میری ملاقات انگلینڈ میں ہوتی رہتی ہے۔ ویسے ایک بات پتہ نہیں چلی نظام الدین!''

''وہ کیا......؟''

''شمس الدین پاکستان سے کیوں الرجک ہو گیا؟ یہاں آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ میں نے بھی آتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ یار چلو، ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تھوڑے دن تم بھی رہ لینا، ساتھ ہی واپس آ جائیں گے۔ ہنس کر خاموش ہو گیا۔ جب بھی کبھی میں اس سے پاکستان چلنے کے بارے میں کہتا ہوں یا پوچھتا ہوں کہ وہ پاکستان کیوں نہیں گیا تو عجیب سے انداز میں ہنس کر خاموش ہو جاتا ہے۔''

''ہاں، آتا ہی نہیں ہے۔ کافی عرصہ گزر گیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے، بتاتا بھی نہیں ہے۔ مگر تم نے میرے ذہن کو اُلجھا دیا ہے۔ خیر اللہ تعالیٰ نے ایک ایک انسان کے سات سات چہرے بنائے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کیا نام ہے اس لڑکے کا؟''

''اکرام۔''

''ہو سکتا ہے اکرام ایسی ہی اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہو۔''

''ہاں...... لیکن میں اور فاخرہ حیران رہ گئے تھے اس کی صورت دیکھ کر۔''

بہرحال باتیں ہوتی رہیں، پھر ظہیر الدین کا تذکرہ نکل آیا۔

''باقی لوگ تو نظر آئے مگر ظہیر الدین نظر نہیں آئے۔''

''اس کی حرکتوں کے بارے میں تو تم جانتے ہی ہو، بیمار ہے۔ لاہور کے ایک ہسپتال میں داخل ہے۔ بس برے کاموں کا برا نتیجہ۔ گُردوں کی تکلیف ہو گئی ہے۔ تمہیں پتہ ہے وہ کھانے پینے والا آدمی ہے اور اس کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔''

''ارے نہیں بھئی...... ہے تو اپنا ہی نا۔''

''نہیں یار! تھکا دیا ہے اس نے مجھے۔ بھائی تو ہے، دل بھی تڑپتا ہے اس کے لئے لیکن گنجائش نہیں چھوڑی۔'' نظام الدین کے ذہن میں نجانے کیا کیا خیالات آ گئے تھے۔ ادھر اتفاق کی بات ہے کہ فاخرہ بیگم بھی یہی تذکرہ نکال بیٹھی تھیں اور بیگم نظام الدین بھی بڑی افسردہ ہو گئی تھیں۔

''ظہیر الدین نے میرا بیٹا مجھ سے جدا کر دیا۔'' بیگم نظام الدین نے کہا۔

''ظہیر الدین نے؟''

''ہاں...... بس چھوڑو، گڑھے مُردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ؟''

فاخرہ بیگم خاموش ہو گئی تھیں۔ تیسرا کردار شانہ کا تھا۔ انگلینڈ میں پرورش پائی تھی لیکن والدین اچھے مزاج کے لوگ تھے اور بڑی اچھی تربیت کی تھی انہوں نے بیٹی کی۔ شانہ مغرب میں رہتے ہوئے خالص مشرقی تھی۔ شرم و حیا نے چہرے کی ملاحت میں ہزار گنا اضافہ کر دیا تھا۔ دل جوان تھا کیونکہ لندن میں پرورش پائی تھی لیکن جذبات قابو میں تھے۔ چھوٹی سی عمر تھی لیکن سمجھداری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ والدین کی زبانی اکرام کا تذکرہ سنا تھا اور اس انداز میں سنا تھا کہ دل میں گدگدیاں ہونے لگی تھیں۔ چنانچہ بہت غور کرنے لگی تھی ان باتوں پر۔ پھر یہاں ایک واقعہ ہوا۔ نظام الدین کی کوٹھی بے مثال تھی۔ اس میں ایک کمرہ عموماً بند رہتا تھا۔ اتفاق کی بات یہ کہ اس بند کمرے میں پہنچ گئی اور یہاں اس نے ایک عجیب و غریب چیز دیکھی۔ یہ ایک کافی بڑی تصویر تھی۔ اکرام کو نادر شاہ کے گھر میں دیکھ چکی تھی۔ اس کی تصویر یہاں دیکھ کر ششدر رہ گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس تصویر کو دیکھنے لگی۔ لیکن پھر احساس ہوا کہ تھوڑا سا فرق ہے۔ اکرام چھوٹی عمر کا تھا جبکہ یہ تصویر اتنی چھوٹی نہیں تھی بلکہ خاصی بڑی تھی۔ یہ کیا قصہ ہے؟ وہ حیران رہ گئی۔ دل میں اکرام کا خیال بے شک تھا لیکن بس بستر کی تنہائیوں میں وہ اس کے تصور کو آنکھوں میں لے آتی تھی اور عجیب سے احساس میں گم ہو جاتی تھی۔ تصویر کے سامنے گم صم کھڑی ہوئی تھی کہ دو لڑکیاں آ گئیں۔ یہ ندا اور فاضلہ تھیں۔ دونوں نظام الدین کے ایک بھائی کی بیٹیاں تھیں اور ابھی تھوڑے دن پہلے جب شانہ یہاں آئی تھی، ان کی دوستی ہوئی تھی۔ شانہ کو اس طرح کھڑے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''ارے یہ کیا دیکھ رہی ہو؟''

''یہ تصویر کتنی اچھی ہے۔''

''بہت اچھی...... ہمارے شمس بھائی جان کی ہے۔''

''شمس بھائی جان؟''

''ہاں...... بڑے ابو کے بیٹے شمس بھائی جان۔''

''شمس ہے ان کا نام...... مگر یہ تو وہاں رہتے ہیں، لندن میں۔''

''ہاں ہاں، جانتی ہو نا تم انہیں؟''

''اچھی طرح جانتی ہوں...... میں تو حیران ہو رہی تھی کہ...... کہ......'' شمانہ نے اپنے الفاظ پر قابو پالیا۔ کہنا چاہتی تھی کہ اس تصویر کا ایک چھوٹا حصہ یہاں موجود ہے۔ وہ بھی شمس سے ملی ہوئی تھی اور اکرام کو بھی اس نے دیکھا تھا۔ کچا ذہن تھا، اس وقت تو صحیح تجزیہ نہیں کرسکا تھا لیکن جب بڑوں سے یہ بات سنی کہ اکرام شمس کا بہت ہم شکل ہے تو خود بھی غور سے دیکھا اور اندازہ ہوا کہ کہنے والے ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔

بہرحال سمجھداری سے کام لیا اور ندا اور فاضلہ کو اس بارے میں کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ لیکن دل میں ایک کسک سی پیدا ہوگئی تھی۔ دوسری طرف والدین بھی اس بارے میں خاصی دلچسپی لے رہے تھے۔ چوہدری نظام الدین نے کہا۔

''بھئی تم نے عجیب بات بتائی ہے۔ بہرحال شوق تو پیدا ہو جاتا ہے۔ اور پھر جتنی تعریفیں تم کر رہے ہو وہ بھی ذرا سوچنے والی بات ہے۔ ایسا کرو نادر شاہ سے بات کرو۔ فون کر کے اس سے کہو کہ جس طرح بھی بن پڑے بچے کو ہمیں دکھائے۔ ادھر لے آئے۔ اگر ممکن ہو سکے تو۔ ویسے نادر شاہ کا رابطہ کیسے ہوا۔''

''نادر شاہ کا بیٹا علی شاہ بھی اسی سکول میں پڑھتا ہے...... بڑا معیاری سکول ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کے بچے ہی وہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔''

''کوشش کرو...... چلو رب نواز شاہ جی سے اگر ابھی ملاقات نہ بھی ہو تو اس بچے سے تو مل لیا جائے۔ یہ دیکھیں کہ ہمارے بیٹے کا ہم شکل کیسا ہے۔''

''میں نادر شاہ کو فون کر دوں گا...... اچھا ایک بات بتائیں، وہ ہمارے غیاث الدین شاہ صاحب کا کیا حال ہے...... کیسے ہیں؟''

''سنا تو ہوگا تم نے اس کے بارے میں...... بے چارہ بدنصیبی کا شکار ہو گیا۔''

''کون غیاث الدین؟ اسی گجراتی کی بات کر رہے ہو نا؟''

''ہاں ہاں، ظاہر ہے، ہمارا ایک ہی پینڈل تھا۔''

''ہاں...... بڑے اچھے دن گزرے تھے وہ بھی۔ مگر غیاث الدین کے ساتھ کیا ہوا؟''

''یار! بہت بڑی ٹریجڈی ہوگئی۔ اپنی بیٹی کی شادی کا کارڈ نہیں بھجوایا تھا اس نے تمہیں؟''

''نہیں...... میرے پاس نہیں پہنچا تھا۔''

''کوئی گڑبڑ ہوگئی ہوگی۔ ورنہ اس نے تو اپنے سارے پرانے دوستوں کو بلایا تھا۔''

''ٹریجڈی کیا ہوئی؟''

''بس نکاح ہو گیا تھا بیٹی کا ایک اچھے گھرانے میں۔ مگر وہاں گڑبڑ ہوگئی۔ اللہ نواز کے بارے میں تو تمہیں پتہ ہی ہوگا یا ہوسکتا ہے نہ جانتے ہو۔ یہ الفاظ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہر بڑا آدمی دوسرے بڑے آدمی کو جانتا ہے۔ ملک اللہ نواز شاہ تو وزیر بھی رہ چکے ہیں، بس انہی کے بیٹے سے غیاث الدین کی بیٹی کا نکاح ہوا تھا۔ رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی۔ جوانی کے کھیل بہرحال یہ زمیندار اور وڈیرے ٹائپ کے لوگ کھیلتے ہی رہتے ہیں اور کبھی کبھی اس کا بڑا خمیازہ بھگتتے ہیں۔ ملک اللہ نواز نے کبھی کسی زمانے میں مطلب عالم نوجوانی میں کسی طوائف سے شادی کر لی تھی اور اس طوائف سے ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ طوائف تو مرگئی، بیٹے کو ملک اللہ نواز نے پروان چڑھایا اور اسے کبھی یہ پتہ نہیں چلنے دیا کہ وہ کوئی طوائف زادہ ہے۔ اتفاق سے وہ بعد میں کسی اور اولاد کو نہ پیدا کر سکے اور وہی بیٹا ان کے ہاں پروان چڑھا۔ ظاہر ہے، بڑی آن بان شان والا تھا اکلوتا بیٹا۔ نکاح کے دوران ایک دوست کہیں باہر کے ملک سے آئے، انہوں نے پھوہڑپن سے اللہ نواز سے کہہ ڈالا کہ ان کا بیٹا تو طوائف زادہ ہے۔ لڑکے نے سن لیا اور اسے پہلی بار پتہ چلا کہ وہ کسی طوائف کی اولاد ہے۔ بس چڑھ گئی۔ گھربار چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ کہاں ہے۔ بے چاری بیٹی باپ کے گھر بیٹھی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے طلاق کے بغیر دوسری شادی بھی نہیں کی جاسکتی۔ اس لڑکے کو تلاش کرنے کی ہر کوشش بھی ناکام ہوگئی ہے۔''

''یار! واقعی، یہ تو بڑی دکھ بھری بات ہے، بڑی ہی غمگین۔ اب تو غیاث الدین کے ہاں جانا بڑا ہی ضروری ہو گیا ہے۔ کیا خیال ہے، چلو گے؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں...... تیاریاں کر لیتے ہیں، بعد میں واپس آنے کے بعد اس لڑکے کو بلا لیں گے یا پھر خود لاہور چلیں گے۔ دیکھ لیں گے بھئی، یہ کوئی چھوٹا موٹا معاملہ تو ہے نہیں۔'' نظام الدین نے جواب دیا۔

○●○

ادھر نادر شاہ سخت پریشان ہو گیا تھا۔ ساری تفصیلات پتہ چل گئی تھیں۔ یہ بات تو معلوم ہو ہی چکی تھی کہ اکرام ہیرا منڈی میں رہنے والی ایک طوائف کا بیٹا ہے اور رب نواز شاہ ظاہر ہے اس طوائف کے عاشق ہی ہوں گے۔ بھائی سے بڑی شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ابھی تو بات ٹل گئی ہے لیکن آگے جب جواد حسین پوچھیں گے کہ بھئی بات کس طرح آگے بڑھا رہے ہو تو کیا کہا جائے گا؟ ابھی یہ فیصلہ بھی نہیں کر پائے تھے کہ یہ حادثہ ہو گیا۔ علی شاہ نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بتایا کہ اکرام کو سکول سے نکال دیا گیا تھا۔ سکول کی عمارت کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا اور یہ کام رب نواز شاہ نے کیا ہے اور اب پولیس رب نواز شاہ کو تلاش کر رہی ہے۔ بیوی سے کہنے لگے۔

''بھئی کیا تو ہم نے بڑے خلوص کے ساتھ سب کچھ تھا۔ وہ بچہ جیسا تھا تمہیں اندازہ ہے اس کا۔ لیکن کمبخت اس خلوص کا اس طرح سے چرغہ بنے گا یہ بات ہمیں معلوم نہیں تھی۔ بھائی صاحب کے سامنے بڑی شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔''

''نہیں خیر، تفصیل تو ان کے علم میں بھی ہے۔ اتنی ہی شناسائی تو تھی کہ وہ علی شاہ کے سکول میں پڑھتا تھا۔ ویسے ایک بات کہوں، جو کچھ بھی ہوا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بچہ بڑا پیارا تھا۔''

''ہاں...... وہ تو تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھائی صاحب سے کیا کہیں گے؟''

''ایک بات کہوں میں تم سے، دنیا کی سب سے قیمتی چیز سچائی ہوتی ہے۔ ہم پوری پوری معذرت کے ساتھ بھائی صاحب کو سچائی بتائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ایسا ہوا ہے۔ ویسے بچے کے لئے دل ململاتا ہی رہے گا۔'' ناصرہ بیگم نے کہا۔

○●○

شاہ جی ہسپتال سے خاموشی سے فرار ہو گئے تھے۔ حالانکہ ساتھیوں کی خواہش تھی کہ کم

از کم اس وقت تک انتظار کر لیا جائے جب تک ہاتھوں اور پیروں کا پلاسٹر نہ کھل جائے لیکن شاہ جی کے تیور دیکھ کر زیادہ کچھ نہ بول سکے تھے۔ جانتے تھے کہ شاہ جی، اکرام کے لئے دیوانے ہو رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد جو کارروائی ہوئی وہ انتہائی خطرناک تھی۔ شاہ جی زخمی ہونے کے باوجود چلنے پھرنے سے باز نہیں آئے تھے۔ بیساکھی خرید لی تھی اور بیساکھی کے سہارے متحرک تھے۔ ان تمام ہسپتالوں میں اکرام کو تلاش کر لیا گیا جن کے بارے میں معلومات ہوئی تھیں۔ کون سی جگہ نہ تلاش کی تھی لیکن اکرام کا پتہ نہیں چلا تھا۔ شاہ جی کی ذہنی کیفیت بہت خراب نظر آتی تھی۔ کئی بار تو سخت جنون کا شکار ہو گئے تھے۔ اپنے ساتھیوں سے یہی سوال کرتے تھے۔

''اسے زمین کھا گئی یا آسمان...... کیا ہو گیا، کچھ پتہ تو چلے۔''

''ایک بات کہوں شاہ جی! اس بات کے امکانات ہیں کہ اکرام واپس لاہور چلا گیا ہو۔''

''ایں......؟'' شاہ جی چونک پڑے۔

''ہاں...... اس بات کے امکانات ہیں کہ ہم لوگوں کو نہ پا کر وہ لاہور چلا گیا ہو۔ صورتحال کا صحیح اندازہ تو اسے ہے ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے ادھر نکل گیا ہو۔''

''تو پھر سوچ کیا رہے ہو...... لاہور چلو۔''

سب خوفزدہ تھے کیونکہ لاہور ان کے لئے بہت خوفناک بن چکا تھا لیکن انہوں نے اکرام کے لئے کسی بھی چیز کی پرواہ نہ کی۔ لاہور پہنچے اور سیدھے اپنی کوٹھی کی طرف رخ کیا۔ کوٹھی کے باہر چوکیدار موجود تھا۔ شالے خان سب سے پہلے وہاں پہنچا تھا۔

''ہاں...... کیسے حال ہیں؟''

''آپ آ گئے؟''

''اندر کون کون ہے؟''

''کوئی نہیں ہے جی۔''

''پولیس آئی تھی یہاں؟''

''بہت بار آ چکی ہے صاحب! پوری کوٹھی کی تلاشی لے چکی ہے، طرح طرح کے سوالات کئے ہیں اس نے۔ ویسے اب کافی دن سے اس طرف نہیں آئی۔''

شالے خان نے شاہ جی کو یہ صورتحال بتائی۔ بہرحال شاہ جی بیساکھی کے سہارے چلتے ہوئے کوٹھی کے اندر پہنچے اور پھر انہوں نے کہا۔

''نور شاہ! یہ کام تم کرو گے۔ چوکیدار کو ایک بات بتا دو، کوئی آئے تو یہی کہا جائے کہ کوٹھی میں کوئی بھی نہیں رہتا۔''

''جی شاہ جی۔''

''اور نور شاہ! اب یہ طے کرو کہ آخر اکرام کو تلاش کیسے کیا جائے؟ ہمارا خیال تھا کہ شاید وہ بھی اسی کوٹھی میں آ کر چھپ گیا ہوگا۔ اب ایک اور خیال دل میں آیا ہے، ہوسکتا ہے وہ ہیرا منڈی چلا گیا ہو۔ حالانکہ شمشیرہ بیگم کی جنس ایسی نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت کرے گی۔ لیکن وہاں کوثر جہاں بھی موجود ہے۔''

''ٹھیک ہے شاہ جی! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ رات کافی ہوگئی ہے، آرام کریں۔ ویسے ہی آپ نے اپنے زخموں کا ستیاناس کر لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے...... میں آرام کر رہا ہوں۔ لیکن تم جاؤ۔ بس پتہ چل جائے، اکرام اپنی ماں کے پاس پہنچا یا نہیں؟''

''ٹھیک ہے...... آپ آرام کریں۔''

بعد میں نور شاہ نے کہا۔ ''میں ہیرا منڈی جاؤں گا...... حالانکہ وہ جگہ بے حد خطرناک ہے۔''

''تم اکیلے نہیں جاؤ گے نور شاہ! ہم تمہارا تعاقب کریں گے۔ اور اگر سنگین صورتحال ہوئی تو بے فکر رہنا، ہم جہنم کے دروازے کھول دیں گے۔ بے فکر رہو۔''

بہرحال وہ سب بڑی ہوشیاری کے ساتھ ہیرا منڈی پہنچے تھے۔ ڈیرے کے سامنے ایک پولیس والے کو ڈیوٹی پر پایا۔ پورا محلہ ان لوگوں کو جانتا تھا، حاجو نظر آ گیا اور نور شاہ نے حاجو کو پکڑ لیا۔ حاجو کا اپنا ہی ایک انداز تھا، اچھل پڑا۔ نور شاہ اسے گھسیٹتا ہوا ایک درخت کے نیچے لے آیا۔ حاجو کا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ حیران نظر آ رہا تھا۔ پھر نور شاہ کو پہچان کر اس نے کہا۔

''ارے آپ...... خیریت......؟''

''ہاں، سب ٹھیک ٹھاک ہے...... اکرام کے بارے میں بتاؤ، وہ ٹھیک ہے؟'' نور شاہ

نے چالاکی سے کہا اور حاجو اچھل پڑا۔

''ک...... کیا مطلب...... وہ آپ کے ساتھ نہیں ہے؟''

نور شاہ کو اندازہ ہو گیا کہ اکرام یہاں نہیں پہنچا لیکن بات بنانا ضروری تھا، کہنے لگا۔

''وہ اپنی ماں سے ملنے آیا تھا؟''

''بالکل نہیں۔''

''ہوسکتا ہے چھپ کر آیا ہو۔''

''نہیں جی...... ہمیں معلوم ہے وہ نہیں آیا۔ سب پریشان ہیں۔ ویسے شمشیرہ بیگم تو اکرام کو کوستی ہی رہتی ہیں۔''

''اور شاہ جی کو؟'' نور شاہ نے پوچھا۔

''اب تم سے کیا کہیں، ناراض ہو جاؤ گے۔''

''میں جانتا ہوں وہ انہیں بھی کوستی رہتی ہوں گی۔ مگر اکرام تو یہ کہہ کر آیا تھا کہ اپنی ماں سے ملنے جا رہا ہے۔''

''وہ بالکل نہیں آیا یہاں۔''

''تو پھر کہاں چلا گیا وہ؟''

''کیا مطلب...... کیا وہ غائب ہے؟''

''نہیں، کہہ کر آیا تھا کہ ماں سے ملنے جا رہا ہوں...... پہنچ گیا ہوگا گھر واپس۔''

''ہوسکتا ہے۔ لیکن میرے علم میں نہیں ہے۔''

''یار ایک کام کرو حاجو! شمشیرہ بیگم سے پوچھ کر آؤ کہ کیا اکرام ان سے ملنے آیا تھا؟''

''ٹھیک ہے...... ابھی پوچھ آتے ہیں۔''

''نہیں، چلو میں بھی چلتا ہوں۔'' نور شاہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ بہرحال یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اکرام ادھر بھی نہیں آیا۔ اس کے بعد صرف ایک ہی بات سوچی جا سکتی تھی وہ یہ کہ ریل کے حادثے میں اکرام کا کام ہو گیا اور اسے لاوارث لاش کی حیثیت سے مرنے والوں کے ساتھ دفن کر دیا گیا ہے۔ شاہ جی کے لئے یہ خبر بڑی روح فرسا ہوگی۔ لیکن کیا، کیا جائے؟

بہرحال پوری پوری نگرانی کی جا رہی تھی۔ نور شاہ، حاجو کے ساتھ شمشیرہ بیگم کے کوٹھے

پر پہنچ گیا۔ شمشیرہ بیگم سے تو ملاقات نہیں ہوئی تھی، کوثر جہاں کے پاس پہنچا اور کوثر جہاں، نور شاہ کو دیکھ کر اچھل پڑی۔

''کیسی ہیں کوثر جہاں بیگم؟''

''آیئے، اندر آ جایئے...... خیریت تو ہے؟''

''ہاں بالکل خیریت ہے...... بس تمہارے پاس آیا تھا۔''

''اکرام کیسا ہے؟ شاہ جی کیسے ہیں؟''

''دونوں ٹھیک ہے...... اکرام ضد کر رہا تھا کہ اماں سے ملنے جاؤں گا۔ آیا تو نہیں آپ کے پاس؟''

''نہیں، جب سے آپ لوگ یہاں سے گئے ہیں اس نے صورت تک نہیں دکھائی۔''

''شاہ جی نے منع کر دیا تھا کہ ابھی نہ جاؤ، پولیس چکر میں لگی ہو گی، کچھ وقت گزر جائے تو دیکھ لیں گے۔ لیکن وہ ضد کرنے لگا۔ اکیلا ہی چلا آیا۔ خیر کوئی بات نہیں، عقل آ گئی، پہنچ گیا ہو گا واپس۔''

''خیریت تو ہے...... آپ لوگ کہاں غائب ہیں شاہ جی؟ یہاں تو پولیس نے ناک میں دم کر دیا ہے...... ہر دوسرے چوتھے دن دندناتی ہوئی آ جاتی ہے۔ ہمیں تھانے میں بلا لیا جاتا ہے، تلاشیاں لی جاتی ہیں۔ خیر اس کی تو کوئی بات نہیں، آپ صرف یہ بتایئے کہ سب خیریت سے تو ہیں ناں؟''

''بالکل خیریت سے ہیں۔'' نور شاہ نے کوثر جہاں کو ہوا تک نہ لگنے دی کہ اس طرح کا کوئی حادثہ ہوا ہے۔ ظاہر ہے، ماں تھی۔ بہر حال کچھ دیر کے بعد وہ وہاں سے باہر نکل آیا۔

تینوں حواری ادھر سے اُدھر گھوم رہے تھے۔

''کچھ پتہ چلا؟'' شالے خان نے سوال کیا۔

''نہیں...... اس طرف نہیں آیا۔ ویسے ایک بات کہوں، میرا خیال ہے اب وہ زندہ نہیں ہے۔''

''یار اپنے منہ سے یہ الفاظ مت نکالنا۔''

بہر حال تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس کوٹھی پہنچ گئے۔ شاہ جی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے چہرے دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ کیا صورتحال رہی۔ ٹھنڈی سانس لے کر

بولے۔ ''یہی ایک آخری سہارا تھا...... ہم نے سوچا تھا کہ ہو سکتا ہے یہاں پہنچا ہو۔ بہر حال اس دوران ہم سوچ رہے تھے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ ملتان میں ہمارے ایک دوست ہیں الیاس علی خاں، کراچی یونیورسٹی میں ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ میرا خیال ہے ان کے پاس چلا جائے۔ بہر حال تیاریاں کرو، یہ جگہ ہر حالت میں خطرناک ہے۔ بس اس حد تک اسے استعمال کیا جا سکتا تھا کہ اکرام کی یہاں آمد کے بارے میں پتہ چلا لیا جائے۔''

شاہ جی نے کہا اور یہاں سے روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

○●○

غیاث الدین کا گھرانہ ایک شریف گھرانہ تھا...... خود بھی عزت آبرو والے تھے اور دوسروں کی عزت بھی کرنا جانتے تھے۔ اکرام نے اپنا نام بالکل صحیح بتا دیا تھا اور پھر اس کے بعد غیاث الدین اسے گھر لے آئے تھے۔ یہاں اس کی بہترین پذیرائی ہوئی تھی۔ جب غیاث الدین نے اکرام سے اس کا نام پوچھا تھا تو نام کا تصور تک اس کے ذہن میں نہیں ابھرا تھا، بس اس کے ہونٹ ہلے تھے اور اپنا نام اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ لیکن یہ بھی نہیں سوچا تھا اس نے کہ یہ نام اس کا اپنا ہے بھی یا نہیں۔ البتہ دماغ نے اتنا ساتھ ضرور دے دیا کہ اس نے اپنا اصل نام بتا دیا تھا۔ یہاں موجود تمام انسان اجنبی تھے۔ خود غیاث الدین بھی اس کے لئے شناسا صورت نہیں رکھتے تھے لیکن ان کا محبت بھرا رویہ دیکھ کر اکرام کو یہ احساس ضرور ہوا تھا کہ وہ ایک اچھے انسان ہیں۔ اس کے ذہن میں ایسی کوئی بے ترتیبی نہیں ہوئی تھی جو اسے بالکل دیوانگی کی حد میں داخل کر دیتی۔ بس اپنا ماضی بھول گیا تھا اور پچھلے ماحول سے اس طرح ناواقفیت ہو گئی تھی جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ ہوتا ہے۔ لیکن زبان الفاظ کی تراش جانتی تھی اور ذہن ان کی سوچ کو سمجھتا تھا۔ یہی خوبی اس میں موجود تھی۔ یہاں رہ کر وہ جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اس کا تعلق اس کے ذہن سے قائم ہو گیا تھا۔ اس کا یہاں بہت زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ خاص طور سے عرشیہ تو اسے چھوٹے بھائی کی مانند چاہتی تھی۔ سب سے زیادہ خوش وہی تھی اور اس نے مشورہ دیا تھا کہ اس کے زخموں کا علاج کرایا جائے۔ علاج شروع ہو گیا...... پورے جسم پر جگہ جگہ جہاں زخموں کے نشانات تھے ان پر ایک انتہائی بدنما رنگ کی مٹیالی دوا لگائی گئی۔ یہ علاج حکیم صاحب سے کرایا گیا تھا اور حکیم شبیر حسین کا دعویٰ تھا کہ اس کی اصل شکل اس طرح نمایاں ہو گی کہ

دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔ شبیر حسین قدیمی حکیم تھے اور غیاث الدین کا پورا خاندان اس دور میں بھی ڈاکٹروں کی بجائے حکیم شبیر حسین کا علاج کرایا کرتا تھا۔ بہرحال شبیر حسین نے اس کا علاج شروع کر دیا۔

اس دن شام کا وقت تھا۔ غیاث الدین یونہی چہل قدمی کرتے ہوئے باہر نکلے تھے۔ اکرام کا کمرہ برابر میں تھا اور دروازہ کھلا ہوا تھا اور اکرام ایک کرسی پر گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو اکرام نے گردن اٹھائی اور پھر احترام کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ غیاث الدین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''بیٹھو بیٹا! بیٹھو......'' اور خود بھی کرسی گھسیٹ کر اس کے برابر میں بیٹھ گئے۔ اکرام کا اس طرح ادب سے کھڑے ہو جانا اس بات کی دلالت کرتا تھا کہ اسے احترام کرنا آتا ہے۔ غیاث الدین اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

''یہاں رہتے ہوئے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی بیٹے؟''

''جی نہیں۔''

''یاد نہیں آتا کہ اس سے پہلے کہاں رہتے تھے، تمہارا ماضی کیا ہے، ماں باپ کون ہیں، کون سے شہر سے تعلق ہے؟''

''نہیں، مجھے یاد نہیں آتا۔''

''کوئی فکر ہے یہاں پر؟''

''نہیں۔''

''یہ تو نہیں سوچتے کہ کسی اجنبی جگہ آ گئے ہو؟''

''نہیں۔''

''کمرے میں دل گھبراتا ہے؟''

اکرام نے ایک نگاہ پورے کمرے پر ڈالی اور پھر بولا۔ ''نہیں۔''

''کبھی کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے؟''

''نہیں...... ہاں، کبھی کبھی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ میں کون ہوں؟''

غیاث الدین کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے، وہ بولے۔

''خوب...... خوب...... لیکن بیٹے! فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے لاشعور میں جو کچھ بھی موجود ہے ایک نہ ایک دن تمہارے شعور تک پہنچ جائے گا۔ یہ عارضی کیفیت ہے، تمہیں سب کچھ یاد آ جائے گا۔ میں تمہارے ذہن پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا...... پہلے تمہارے زخموں کا علاج ہو جائے پھر جو کچھ بھی ہو سکا کروں گا تمہارے لئے۔ اتنا ضرور کہتا ہوں تم سے کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ گھر تمہارا اپنا ہے، جہاں دل چاہے گھومو پھرو۔ چلو آؤ چہل قدمی کرتے ہیں۔''

اکرام نے خاموشی سے کرسی چھوڑ دی اور غیاث الدین کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اندازہ یہ ہوتا تھا کہ یہ بہت جلدی اپنی ذہنی قوتیں حاصل کر لے گا۔

بہرحال یہ ساری کیفیتیں اکرام پر بیت رہی تھیں اور وہ بہت اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ غیاث الدین افسردہ تھے اور بڑی عجیب و غریب کیفیت کا شکار رہتے تھے۔ خاص طور سے بیٹی کی وجہ سے۔ عرشیہ بہت ہی پُروقار لڑکی تھی، کوئی گھٹیا عمل اس سے نہیں سرزد ہوتا تھا، بڑے صبر و سکون کے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔ لیکن ماں باپ کی بات دوسری ہوتی ہے۔ پھر غیاث الدین کے ہاں اچانک ہی خوشیاں آ گئیں۔ یہ خوشیاں جواد حسین، ان کی بیگم فاخرہ اور ان کی بیٹی ثمانہ کی شکل میں تھیں۔ قدیمی دوست تھے، بس اس طرح جیسے بڑے بڑے لوگوں کے ہوا کرتے ہیں۔ غیاث الدین نے بڑی محبت سے جواد حسین شاہ کو گلے لگایا تھا اور گھر میں خوشیاں دوڑ گئی تھیں۔ عرشیہ اور ثمانہ کی عمر میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن بہرحال ثمانہ بھی جوان ہونے لگی تھی۔ عرشیہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ادھر غیاث الدین، جواد حسین اور ان کی بیگمات کے درمیان انہیں گفتگو کا مزہ آ رہا تھا۔ غیاث الدین کی کوٹھی بڑی شاندار تھی اور اس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

بہرحال دوسرا دن تھا، ثمانہ نے اس کوٹھی کو بہت پسند کیا تھا۔ خاص طور سے اس کے خوبصورت لان کو۔ اور یہاں اس نے عرشیہ کے ساتھ خوب چہل قدمی کی تھی۔ اس دن بھی صبح ہی صبح وہ سب لوگوں کے اٹھنے سے پہلے باہر نکل آئی اور اس نے باغ کے اس حصے کا رخ کیا جو اسے بے حد پسند آیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پھولوں کی خوشبو کو سونگھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کی نظریں ایک طرف اٹھ گئیں۔ وہاں اکرام موجود تھا۔ ثمانہ ایک دم ٹھٹھک کر رہ گئی۔ یہ چہرہ اس کے خوابوں میں بسا ہوا تھا...... لیکن ان خوابوں میں جن کے

بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ یہ چہرہ اکثر تصور میں آتا رہتا تھا اور وہ اپنے آپ سے بھی خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ لیکن اس وقت نہ جانے کیا سحر طاری ہوا اس پر کہ اس نے قدم آگے بڑھا دیئے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ قدم آگے بڑھانے کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ اور کچھ لمحوں کے بعد وہ اکرام کے سامنے پہنچ گئی۔ اکرام نے قدموں کی چاپ پر اسے پلٹ کر دیکھا اور شانہ خوفزدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اکرام کے چہرے پر دوائیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ اسے پہچان تو گئی تھی لیکن نجانے کیوں نروس ہو گئی تھی۔ اس کے اندر ایک عجیب سی کیفیت بیدار ہو گئی تھی اور نجانے کون سے جذبے سے اس کے منہ سے نکل گیا۔

''اکرام.....!''

وہ اور قریب سے اکرام کو دیکھنے لگی۔ اکرام کچھ نہیں بولا تھا۔ قریب سے اس نے اکرام کے چہرے کو دیکھا، اس پر دوا لگی ہوئی تھی لیکن بھلا پیوند کاری سے کہیں حُسن چھپتا ہے؟ اس کی آنکھیں تھیں کہ قیامت..... حسین نیلاہٹیں ان آنکھوں کے نیچے جیسے موتی کی طرح چمک رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے پتلیوں کی جگہ نیلم جڑ دیا گیا ہو..... شانہ کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اس کشش میں اس طرح کھو گئی کہ بات کرنا ہی بھول گئی۔ اکرام نے ایک لمحے کے لئے اسے دیکھا اور پھر گردن گھما کر حوض میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آگے بڑھی اور بولی۔

''سنو!''

اکرام نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''نہیں نہیں..... بیٹھ جاؤ۔ میں نے تم سے کھڑے ہونے کے لئے تو نہیں کہا۔''

اکرام بیٹھ گیا۔

''تمہارا نام اکرام ہی ہے ناں؟''

''ہاں۔''

''تم لاہور میں رہتے تھے؟''

''لاہور میں.....؟''

''ہاں، ہاں..... علی شاہ کے ساتھ سکول میں پڑھتے تھے ناں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''کیا.....؟ یہ تمہارے چہرے پر زخم کیسے ہیں؟''

''بس..... میں نہیں جانتا۔''

''اکرام..... میں شانہ ہوں۔''

''جی.....''

''میں تم سے پھر ملوں گی۔ اس وقت مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''جی۔'' اکرام نے کہا اور شانہ وہاں سے واپس پلٹی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر گئی تھی کہ عرشیہ نظر آ گئی اور وہ ایک دم سہم سی گئی۔ عرشیہ اس کے قریب پہنچی اور بولی۔

''کیا بات ہے..... ارے ارے، تمہیں تو پسینہ آ رہا ہے جبکہ موسم ٹھنڈا ہے۔''

''باجی، وہ..... وہ..... وہ.....''

''کیا ہوا.....؟''

''وہ ادھر اکرام.....''

''ہاں ہاں..... اکرام نے کچھ کہا تمہیں؟''

''نہیں باجی! وہ اکرام ہے؟''

''ہاں، ہے تو سہی۔ کیوں، کیا بات ہے..... کیا تم اسے جانتی ہو پہلے سے؟''

''ہاں باجی۔''

''کیا.....؟'' عرشیہ ایک دم اچھل پڑی۔ اکرام کے بارے میں یہ بات کتنی ہی مرتبہ ہو چکی تھی کہ اس کے بارے میں پتہ کیسے چلایا جائے اور اس وقت شانہ اسے جاننے کا دعویٰ کر رہی تھی۔ یہ بات عرشیہ کے لئے بڑی سنسنی خیز تھی۔ وہ شانہ کو گھورتی ہوئی بولی۔

''شانہ تم..... تم اسے کیسے جانتی ہو؟''

''میرے چچا ہیں نا..... نادر شاہ..... لاہور میں رہتے ہیں۔''

''ہاں میں جانتی ہوں..... مل بھی چکی ہوں ان سے ایک دو بار۔''

''علی شاہ ہے ان کے بیٹے کا نام۔''

''یہ بھی جانتی ہوں۔''

''یہ اکرام، علی شاہ کے ساتھ اس کے سکول میں پڑھتا تھا۔ علی شاہ کے دوست کی حیثیت سے ہمارے گھر بھی آیا تھا۔''

''اچھا......اور......؟''

''بس...... اس سے زیادہ نہیں جانتی اس کے بارے میں۔ اسے یہاں دیکھ کر میں حیران ہوگئی تھی۔''

''ویری گڈ...... اگر تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے تو تم یہ سمجھ لو کہ تم نے ایک ایسا انکشاف کیا ہے کہ جسے سن کر سب دنگ رہ جائیں گے۔ خاص طور سے ابو بہت خوش ہوں گے۔ آؤ ذرا اکرام کے پاس چلیں۔''

''نہیں باجی...... مم...... مم...... میں......''

''لیکن تم اسے دیکھ کر اتنی نروس کیوں ہوگئی ہو؟''

''نہیں باجی...... بس۔''

''اچھا آؤ، ابو کو بتائیں۔''

غیاث الدین اس وقت چوہدری جواد کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ فاخرہ بیگم اور غیاث الدین کی اہلیہ شاہجہاں خاتون بھی وہیں پر موجود تھیں۔ سب لوگ باتوں میں مصروف تھے۔ کوئی ایسا تذکرہ نکلا ہوا تھا جو سب کے لئے باعث دلچسپی تھا۔ دونوں لڑکیاں وہاں پہنچ گئیں۔ شانہ کے بدن پر اب بھی ہلکی ہلکی کپکپی طاری تھی۔ بس کسی طرح یہ بات اس کے کان تک پہنچ گئی تھی کہ اکرام کے بارے میں سوچا جا رہا ہے کہ اسے شانہ کی زندگی میں شامل کر دیا جائے۔ یہی بات اس کے بدن کی کپکپی بن گئی تھی۔ خود بھی اکرام کو دیکھ کر اس پر دل آ گیا تھا اور اس کے ہلکے ہلکے خواب آنے لگے تھے۔ یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا اور اکرام کے چہرے پر ہلکے ہلکے زخموں کے نشان دیکھ کر بھی اسے بے حد دکھ ہوا تھا...... بزرگوں نے بچیوں کی آمد کو خاص طور پر محسوس کیا۔

''کیا بات ہے بیٹا...... خیریت تو ہے؟'' غیاث الدین صاحب نے لڑکیوں کے چہرے پر کوئی خاص بات محسوس کر لی تھی۔

''جی ابو! بڑی خاص بات ہے۔ خیریت تو ہے بالکل۔ لیکن ایک انوکھا انکشاف ہوا ہے۔''

''انکشاف؟''

''جی ابو...... واقعی اگر آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔''

''تو پھر حیران کرو نا ہمیں...... دیر کیوں لگا رہی ہو؟'' غیاث الدین نے کہا۔

''ابو! شانہ، اکرام کو پہچانتی ہے۔''

''کیا......؟'' غیاث الدین اچھل پڑے۔ جواد حسین کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ فاخرہ بیگم بھی سوالیہ نگاہوں سے لڑکیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ غیاث الدین نے شدید حیرت سے کہا۔

''شانہ بیٹے...... اکرام...... اکرام......''

''میں بتاتی ہوں ابو! یہ پتہ نہیں کیوں نروس ہوگئی ہے۔ ابو! اس کا کہنا ہے کہ اکرام لاہور میں رہتا ہے اور علی شاہ کے ساتھ سکول میں پڑھتا ہے۔ اس نے اسے پہچان لیا ہے۔''

غیاث الدین تو خیر اس پر حیران نہیں ہوئے تھے جتنی حیرانی جواد حسین اور فاخرہ بیگم کو ہوئی تھی۔

''کیا...... اکرام...... اکرام یہاں آیا ہے؟''

''کیا...... کیا...... آپ لوگ...... میرا مطلب ہے آپ لوگ۔''

''ہاں بھئی...... اگر اکرام یہاں ہے تو کہاں ہے وہ؟ اور یہاں کیسے آیا...... کیا آپ لوگوں کے کچھ تعلقات ہیں اس کے خاندان سے؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔ آپ لوگ بھی اسے دیکھئے، اگر واقعی بقول آپ کے یہ وہی اکرام ہے جسے آپ جانتے ہیں تو آپ کو پتہ نہیں ہے کہ آپ نے کتنا بڑا انکشاف کیا ہے۔''

''مطلب؟''

''بتاتا ہوں، پہلے آئیے...... ٹھہرو، میں اسے یہیں بلا لیتا ہوں۔''

''بلائیے، بلائیے۔'' جواد حسین نے کہا اور غیاث الدین صاحب نے یہ ڈیوٹی عرشیہ ہی کی لگا دی۔

''جاؤ عرشیہ! بلا کر لاؤ اکرام کو۔''

''آؤ شانہ! چلتے ہیں۔''

''نن...... نن...... نہیں باجی!'' شانہ نے تھرتھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ کیوں ڈر رہی ہے اس سے...... میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ اگر یہ وہی اکرام ہے تو میں تجھے بتاؤں شانہ! یہ بڑا نرم مزاج اور باسلیقہ بچہ ہے۔ بچہ ہی کہوں گی میں اسے۔ اپنی عمر سے بہت چھوٹی باتیں کرتا ہے۔''

''اس کی عمر زیادہ نہیں ہے، بس اللہ نے اسے جو جسمانیت دی ہے وہ بڑی ہے۔''

''تم تو یوں لگتا ہے جواد حسین! جیسے اسے......''

''ارے بھئی ہاں، میں بتاتا ہوں تمہیں۔ شانہ بیٹا! جاؤ آرام کرو۔'' جواد حسین نے بیٹی سے کہا اور شانہ کو یہ موقع بہت غنیمت لگا۔ وہ ہانپتی کانپتی وہاں سے باہر نکل گئی تھی۔

''خیریت......؟''

''بھئی یہ بچہ بڑے اچھے خاندان کا ہے اگر یہ وہی ہے تو۔''

''کمال ہے، اس کے خاندان کو بھی جانتے ہو تم...... لندن میں رہتا ہے کیا اس کا خاندان؟''

''نہیں بھئی، بڑے انوکھے انکشافات ہیں اس بارے میں...... یوں سمجھو کہ اکرام کی شخصیت بڑی پراسرار ہوگئی ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ یہاں کیسے آیا۔ تم مجھے بتاؤ۔''

''میں بتاتا ہوں، کسی حادثے کا شکار ہوا ہوگا بے چارہ...... چہرے پر بہت سی چوٹیں آئی ہیں۔ حُسن بے مثال ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے تھوڑا سا ذہن متاثر ہوا ہے، یادداشت کھو بیٹھا ہے، اپنے آپ کو یاد نہیں رکھتا۔''

''ارے......'' چوہدری جواد حسین کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ فاخرہ بیگم کے اندر بھی بڑی عجیب سی کیفیت ابھر رہی تھی۔ پھر عرشیہ اکرام کو لے کر آ گئی۔ جواد حسین اور فاخرہ بیگم نے بھی ایک نگاہ میں اسے پہچان لیا تھا۔

''ارے اکرام بیٹے...... تم...... تم...... اوہ میرے خدا، یہ کیا ہو گیا...... یہ زخم کیسے لگ گئے تمہیں اکرام! یہاں کب آئے، تمہارے ابو کہاں ہیں؟''

اکرام گھبرائی گھبرائی نگاہوں سے سب کو دیکھنے لگا۔ منہ سے کچھ نہیں بولا تھا۔

''آؤ بیٹا! بیٹھو، بیٹھو۔ ارے دیکھو کیسی چوٹیں لگی ہیں بے چارے کے۔ یہ لگا کیا ہے چہرے پر؟''

''دوائیں ہیں...... انشاء اللہ چند دنوں کے اندر اس کا اصل چہرہ درست ہو جائے گا۔ حکیم شبیر حسین علاج کر رہے ہیں، کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں وہ۔ پورے اعتماد کے ساتھ اس کا علاج کر رہے ہیں۔''

''مگر ہوا کیا...... قصہ کیا ہے اکرام! کچھ بتاؤ تو سہی۔''

''مجھے...... مجھے نہیں معلوم۔''

''اچھا لاہور سے کب آئے؟''

''لاہور سے......؟'' اکرام نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے اس سے یہ سوالات مت کرو۔ انشاء اللہ یہ اپنے بارے میں خود ہمیں تفصیل بتائے گا۔ مگر تم کیا جانتے ہو؟''

''میں بہت کچھ جانتا ہوں...... مجھے تعجب ہے اس کی تلاش کیوں شروع نہیں کی گئی؟ میرا تو خیال ہے ملک بھر کے اخبارات میں اس کی تصویریں چھپ جانی چاہئیں تھیں۔ بہت بڑے آدمی کا بیٹا ہے یہ۔ بڑی عالیشان کوٹھی میں شہزادوں کی طرح رہتا ہے۔''

''اچھا......؟'' غیاث الدین حیرت سے منہ کھولے یہ تمام باتیں سن رہے تھے۔

''ہاں...... بیٹھو اکرام بیٹے! کوئی بات نہیں تھی۔ انہیں پہچانتے ہو؟'' غیاث الدین نے چوہدری جواد حسین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اکرام غور سے چوہدری جواد حسین کا چہرہ دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''ہاں...... پہچانتا ہوں۔'' فاخرہ بیگم اور جواد حسین خوش ہو گئے۔

غیاث الدین نے کہا۔ ''اچھا بتاؤ یہ کون ہیں؟''

اکرام پھر ان کا چہرہ دیکھنے لگا، دیر تک دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''پتہ نہیں۔''

''اوہ...... اوہ......'' جواد حسین کا چہرہ مرجھا گیا۔ غیاث الدین نے کہا۔

''شکریہ بیٹے! ہم نے آپ کو تکلیف دی۔ جائیے اپنے مشغلے میں مصروف ہو جائیے۔'' ملازم نے چائے لا کر رکھ دی تھی۔ چائے پی جانے لگی۔ عرشیہ بھی بیٹھ گئی تھی۔

''بھئی یہ ایک عجیب سا سلسلہ ہے۔''

''ایک بات بتائیے چچا ابو، یہ شانہ اکرام کو دیکھ کر خوفزدہ سی ہو گئی تھی۔ بڑی عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی اس کی۔''

''ہاں بیٹا! بچیاں بڑی ہونے لگتی ہیں نا تو ان کے احساسات بھی بڑے عجیب ہو جاتے ہیں۔ خیر غلطی تو نہیں ہے ہماری۔ شانہ کو ابھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا لیکن میں تمہیں بتاؤں بڑا عجیب مسئلہ ہو گیا۔ اصل میں نادر شاہ کا بیٹا علی شاہ ایک اعلیٰ درجے کے سکول میں پڑھتا ہے، اسی سکول میں اکرام بھی پڑھتا ہے۔ نادر شاہ نے اکرام کو دیکھا تو

فریفتہ ہوگیا اور اس کا خیال شانہ کی جانب گیا کہ کیوں نہ شانہ کے لئے اکرام کا انتخاب کرلیا جائے۔ یہ بات ابھی ہم لوگوں کے درمیان تھی۔ ابھی ہم لوگ پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ اکرام کے والد سے ملا جائے کہ وہ لندن والا واقعہ ہوگیا۔ میں ذہنی طور پر اتنا متاثر ہوا اس سے کہ لاہور میں نہ رکا اور وہاں سے چل پڑا۔ نظام الدین کے ہاں پہنچا۔ اصل میں اکرام کی ذات سے اتنے عجیب وغریب واقعات منسلک ہوگئے ہیں کہ وہ تو مجھے کوئی مافوق الفطرت ہستی معلوم ہونے لگا ہے۔ نادر شاہ نے اپنے دل کی بات مجھے بتائی اور اکرام کو علی شاہ کے ذریعے بلایا۔ مجھے بھی یہ بچہ بہت پسند آیا تھا۔ بہرحال اس حادثے کے بعد ہم یہ پروگرام ملتوی کر کے چوہدری نظام الدین کی طرف چل پڑے۔ نظام الدین کو تو تم جانتے ہونا؟''

''ہاں، ہاں...... کیوں نہیں؟''

''جب میں نے اکرام کو پہلی بار دیکھا تو میرے ذہن کو ایک عجیب شاک سا لگا تھا۔ کیونکہ اکرام، نظام الدین کے بیٹے شمس الدین کا ہم شکل ہے۔ شمس الدین وہیں لندن میں رہتے ہیں، ان کا بھی عجیب واقعہ ہے، تیرہ چودہ سال ہوگئے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ لندن گئے تو واپس نہیں آئے، وہیں کی سکونت اختیار کرلی ہے۔ کتنی ہی بار چوہدری نظام الدین نے انہیں لندن سے واپس لانے کی کوشش کی لیکن شمس الدین وہاں سے نہیں آتے۔ پتہ نہیں کیا قصہ ہے...... حیران کن بات یہ ہے کہ اکرام، شمس الدین کا اتنا ہم شکل ہے کہ بس یوں سمجھ لو کہ دیکھو تو خدا کی قدرت کے قائل ہو جاؤ۔ عمر کا فرق ہے ورنہ دونوں ہوبہو ایک دوسرے کا نقش۔ یہی بات ہمارے لئے حیران کن تھی کہ مزید حیران کن واقعات پیش آگئے۔ خیر تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ نادر شاہ نے مجھ سے اس کا تذکرہ کیا اور میں نے کہا بھئی ذرا دکھاؤ تو سہی اس بچے کو۔ واقعی اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی شان و شوکت کا مالک کہ دیکھنے والی نظر دیکھے تو ہٹانا ناممکن ہو جائے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ تمہارے یہاں کیسے آیا...... یہ کیا واقعہ ہے۔ ہے تو وہی، نام بھی وہی ہے۔ میں ابھی نادر شاہ کو فون کرتا ہوں۔''

''واقعی بات بڑی حیران کن ہے۔ ایسے واقعات تو قصے کہانیوں میں ہوا کرتے ہیں۔ یہ تو ایک حقیقی واقعہ ہے جس پر جتنا بھی تعجب کیا جائے کم ہے۔ ویسے خاندان کیا ہے اس

کا...... کون لوگ ہیں یہ؟'' غیاث الدین نے سوال کیا۔

''ملاقات تو نہیں ہوئی لیکن کوئی رب نواز شاہ ہیں جو کاروبار کے سلسلے میں لاہور سے باہر رہتے ہیں، لاہور میں نہیں۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟'' لیکن یہ نام سن کر غیاث الدین کے سینے پر ایک گھونسہ سا پڑا...... عرشیہ بھی دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر باہر نکل گئی تھی۔ رب نواز شاہ کا نام ہی ایسا تھا جو اس خاندان کا بہت بڑا المیہ تھا۔ جواد حسین شاہ نے تو یہ بات محسوس نہیں کی لیکن غیاث الدین صاحب دیر تک گنگ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''یہ رب نواز شاہ صاحب کہاں کے رہنے والے ہیں؟''

''اتنی تفصیلی معلومات نہیں حاصل ہوئیں۔ ارادہ تھا ملنے کا لیکن بس......''

''ہوں......'' غیاث الدین صاحب کا ذہن ایک لمحے کے لئے متاثر ہوا تھا۔ ظاہر ہے رب نواز شاہ کوئی ایک ہی نام تو نہیں ہوسکتا، ایک ہی شخصیت نہیں ہوسکتی۔ وہ تو بس ایک نام تھا جو دل کا زخم بنا ہوا تھا۔ اتنی بڑی عمر کا بچہ رب نواز شاہ کا تھا۔ بہرحال اپنے آپ کو سنبھال لیا، کہنے لگے۔

''بڑی عجیب سی بات بتائی ہے...... تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ یہ مجھے بس راستے میں مل گیا تھا۔ میں اسے ساتھ لے آیا اور اس کے بعد سے میرے پاس ہے۔ مگر شخصیت بڑی اعلیٰ ہے...... میں یہی سوچ رہا تھا کہ کسی بہت ہی پروقار خاندان کا بچہ ہے۔ اگر واقعی یہ وہ ہے تو معلومات حاصل کرنا پڑے گی، کون ہے؟ کیا ہے؟ کیا کیا حالات ہیں اس کے۔''

''ہاں، تم ایسا کرو فوراً نادر شاہ کو فون کرو اور ان سے کہو کہ ذرا معلومات حاصل کریں۔ علی شاہ کے ذریعے پتہ تو چل ہی سکتا ہے۔ پوری تفصیل نادر شاہ کو بتا دو۔''

''میں فون کرتا ہوں۔'' چوہدری جواد حسین نے کہا۔

بہرحال ایک انوکھی ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔ ادھر شانہ اپنی کیفیتوں کو نہیں چھپا سکتی تھی۔ معصوم فطرت تھی۔ خوفزدہ ہونے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ عرشیہ کے ذہن پر بھی رب نواز شاہ کا نام سن کر ایک دھکا سا لگا تھا۔ آخر وہ اس کا شوہر تھا، دونوں کا نکاح ہو چکا تھا۔

○●○

رائے پور بے شک چھوٹی سی جگہ تھی لیکن اس کی تاریخ رائے خاندان سے منسوب تھی اور رائے خاندان کے کئی نواب رائے پور کی تقدیر کے مالک بنے رہے تھے۔ رائے راشد

علی خاں اور اس کے بعد یونس علی خاں اور اب رائے الیاس علی خاں، یہ رائے پور کی تقدیر کے مالک چلے آرہے تھے۔ برا کوئی بھی نہیں تھا۔ رائے پور کے رہنے والوں کے لئے یہ لوگ فرشتہ صفت تھے۔ رائے الیاس علی خاں کچھ کاہل اور سست رفتار تھے مگر اس کاہلی میں بھی شان تھی۔ کوئی اپنی ضرورت لے کر پہنچ گیا تو مجال ہے کہ اس کا کام نہ ہو۔ رائے پور کے اطراف میں زمینیں، باغات تھے۔ یاروں کے یار تھے۔ سب کے سب رائے صاحب کے لئے کچھ کرنے پر تیار، لیکن اس قدر بے اعتنائی کہ مجال ہے کسی سے کوئی کام کہا ہو۔

کراچی یونیورسٹی میں رب نواز شاہ کے ساتھ طویل ترین عرصے کا ساتھ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ اس وقت وہ شطرنج کھیل رہے تھے کہ ملازموں نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔

''کون ہے...... کیا نام ہے؟'' رائے صاحب نے ناگواری سے پوچھا۔

''رب نواز شاہ نام بتاتے ہیں اپنا...... لاہور سے آئے ہیں۔''

''رب نواز شاہ؟ ارے کہیں اپنے نوازے نہ ہوں......'' یہ کہہ کر وہ شطرنج کی بساط الٹ کر بھاگے اور اس جگہ پہنچ گئے جگہ ملازمین رب نواز شاہ اور اس کے ساتھیوں کو بٹھا کر گئے تھے۔ چہرہ تو کھلا ہوا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ بازو اور ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ بغل میں بیساکھی تھی۔ لیکن راؤ الیاس نے یہ سب کچھ نہ دیکھا اور دوڑ کر قریب پہنچ گئے۔

''ارے میرا یار...... میرا یار......'' انہوں نے دونوں ہاتھ پھیلائے تو شالے خان نے دست بستہ کہا۔

''شاہ جی زخمی ہیں۔''

''ایں...... زخمی ہیں...... کیسے...... کیا ہوا؟ کسی سے جھگڑا ہو گیا کیا؟...... کس نے لگائے یہ زخم؟ مار ڈالوں گا...... قسم ایمان کی چھوڑوں گا نہیں...... کون ہے، کہاں ہے؟''

''ابے تُو آج تک ویسے کا ویسا ہی ہے۔ میں کھڑا ہوا ہوں اور تُو دیکھ رہا ہے کہ ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے، کشتی لڑنے کے لئے سامنے آگیا اور اب اِدھر اُدھر کی ہانک رہا ہے...... بیٹھنے کے لئے کہہ، میں زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔''

رائے نے آگے بڑھ کر بیساکھی کی جگہ سنبھال لی۔ شاہ جی کا ہاتھ اپنے کاندھے پر رکھا اور بڑی دلسوزی سے بولا۔ ''میرے یار کو کس نے یہ زخم پہنچائے ہیں؟ یہ سارے زخم میرے

سینے پر ہیں...... ابے کیا دیکھ رہے ہو تم لوگ، پہیوں والی کرسی لے کر آؤ، میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تُو نے یار رب نواز شاہ! سب سے پہلے مجھے ان زخموں کے بارے میں بتا دے، بعد میں دوسری باتیں ہوں گی۔''

''او یار! تُو مجھے بیٹھنے کے لئے تو کہہ۔''

''اوہ...... کہنے کی ضرورت ہے کیا؟ آ جا۔'' رائے نے کہا اور وہیل چیئر کا انتظار کئے بغیر رب نواز کو سہارا دے کر آگے بڑھ گیا۔ سارے دوست ان دو دوستوں کی دوستی دیکھ رہے تھے۔ رائے کی شخصیت ہی بدل گئی تھی۔ مصاحبین پیچھے پیچھے دوڑے چلے آئے تھے۔ ان میں سے کچھ رب نواز شاہ کے شناسا اور کچھ ناواقف۔

بہر حال رائے الیاس، شاہ جی کو ایک آرام دہ کمرے میں لے گئے۔ نرم و گداز بستر پر بٹھا کر خود بھی دلسوزی سے ان کے پاس بیٹھ گئے اور پھر کہنے لگے۔

''کیسے ہو دوست...... یار! کیسی حالت میں میرے پاس آئے ہو، پاؤں پھیلا لو۔ پاؤں پھیل سکتا ہے یا نہیں؟''

''سب کچھ ہو سکتا ہے۔''

رائے الیاس نے مصاحبوں کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''جاؤ...... جتنے لوگ بھی ملنے آئے ہیں سب کو واپس کر دو۔ آج ہمارا یار ہمارے ساتھ ہے۔ اور ان چاروں دوستوں کی رہائش کا بندوبست بہترین کرو، انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔''

تمام لوگ باہر نکل گئے اور رائے نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

''زخموں میں زیادہ درد تو نہیں ہو رہا؟''

''نہیں، پرانے زخم ہیں...... اب تو ٹھیک بھی ہو گئے ہوں گے۔ بس بھاگ دوڑ میں وقت گزرا ورنہ شاید پلاسٹر اتر چکا ہوتا۔''

''یہ بتا چوٹ کیسے لگی؟'' رائے الیاس نے پوچھا۔

''ریل کا حادثہ ہو گیا تھا۔''

''اوہ...... اچھا، اس کا مطلب ہے کسی سے بدلہ لینے کی گنجائش نہیں ہے۔'' رائے الیاس کے انداز سے مایوسی جھلکنے لگی۔

''تُو ویسے کا ویسا ہی ہے، کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تجھ میں۔''

"اچھا یہ بتاؤ کیا کھاؤ گے، کیا پیو گے؟ پھر بعد میں باقی باتیں ہوں گی۔"

"پینے کے لئے کچھ منگوالو۔"

"ابھی منگواتا ہوں......" رائے نے دروازے پر لگی بیل بجائی، ملازم آیا تو اس نے مشروب طلب کرلیا۔ رب نواز دلچسپی سے دوست کو دیکھ رہا تھا، پھراس نے کہا۔

"ہاں...... کیا ہورہا ہے آج کل...... عیاشی چل رہی ہے؟"

"تفصیل سے بتائیں گے یار! زندگی میں یہ سب کچھ نہ ہوتو زندگی گزارنے سے فائدہ؟ سیدھے سیدھے قبر کھودو اور قبرستان جا کر لمبے لمبے لیٹ جاؤ۔ کیا فائدہ جینے سے۔ زندگی تو انہی مہ جبینوں کے درمیان ہے۔ تُو اپنی سنا، بیوی بچوں کا کیا حال ہے؟ ویسے مجھے بڑی شکایت ہے تجھ سے۔ دوستوں سے پتہ چلا کہ شادی کرڈالی ہے۔ میرا انتظار کرلیتا۔ ابا نے کام سے بھیج دیا تھا ملک سے باہر ورنہ بھلا میں اور تیری شادی میں شریک نہ ہوتا۔ چلو ٹھیک ہے، بھابی بچوں کا کیا حال ہے؟"

"چھوڑ یار! ہم جیسے لوگ بھلا شادی کرتے ہیں؟"

"کیا مطلب...... شادی ہوئی تھی تیری۔"

"پتہ نہیں یار! اس موضوع کو جانے دے۔"

"چل ٹھیک ہے، اچھا اب یہ بتاؤ کہ کہاں سے آرہے ہو۔ ریل کا یہ حادثہ کب اور کہاں پر ہوا؟"

"بہر حال میں تجھے تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ بات بہت زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہے مگر پھر بھی تیرے کانوں میں ڈال دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اصل میں پولیس کے چکروں میں پڑ گیا ہوں میں۔ پولیس جگہ جگہ مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔ کیونکہ لاہور میں، میں نے کچھ وارداتیں کی ہیں۔ ایک بدمعاش کی ناک کاٹی ہے، ساتھ ہی ایک سکول کو بھی آگ لگا کر بھاگا ہوں۔"

"یہ تو تُو نے بڑے ثواب کا کام کیا ہے...... اور جہاں تک بات رہی پولیس کی تو پیارے! رائے پور تیرا گاؤں ہے، معمولی سی جگہ ہے یہ مگر مجال ہے کسی حرام کے جنے کی کہ ادھر کا رخ بھی کرے۔ تیرے ساتھی بھی پولیس کو مطلوب ہیں؟"

"ہاں...... یہ سمجھ لے کہ چھ آدمیوں کا گروپ ہے اور بھی ایک مسئلہ ہے۔"

"بول بول...... مجھے بتا، تُو نے صحیح جگہ کا رخ اختیار کیا ہے۔ اور کیا مسئلہ ہے؟"

"ہم چھ افراد تھے۔ لاہور سے آرہے تھے کہ ریل کا حادثہ ہوگیا۔"

"اچھا...... پھر تم اس میں زخمی ہوئے تھے۔"

"ہاں۔"

"آگے کہو...... آگے کہو۔"

"ایک اور لڑکا بھی تھا میرے ساتھ۔ ایک نوجوان لڑکا، جس کا نام اکرام ہے۔ یوں سمجھ لو وہ بچہ میری زندگی ہے، میری جان ہے۔"

"تیرا بیٹا ہے؟"

"ابے کھوپڑی میں بُھس بھرا ہوا ہے کیا؟ میں بتا چکا ہوں جوان لڑکا ہے، جوان لڑکا۔ میرا ہوسکتا ہے کیا؟"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... آگے بولو۔" رائے الیاس نے کہا۔

"بس یوں سمجھ لے رائے کہ اسی کی وجہ سے یہ سارا کھیل شروع ہوا ہے۔ اس حادثے کے بعد سے وہ غائب ہوگیا ہے۔ میں زیادہ تیزی سے اس لئے تلاش نہیں کرسکا کہ وہ بھی پولیس کو مطلوب ہے۔ میں اپنے طور پر اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں، اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتاؤں گا۔"

"بے فکر رہ...... تیرے ذہن میں جو کچھ آئے، جو کچھ تُو اپنے آپ کرنا چاہے وہ بس مجھے بتادے۔ میں کروں گا وہ سب میرے یار! تجھ پر زندگی نچھاور ہے۔"

"میں جانتا ہوں...... ایک کام اور بھی کرنا ہے۔"

"وہ بھی بول دے۔"

"کچھ رقم چاہئے ہوگی مجھے۔"

"ارے یہ کوئی کہنے کی بات ہے؟"

"نہیں...... تجھ سے نہیں چاہئے بلکہ کچھ آدمی ایک جگہ بھیجنے ہیں، رقم آرام سے وہاں سے آجائے گی۔"

"یہ کام دو نمبر کا ہے...... خیر ہوجائے گا۔"

"ایسے نہیں ہوگا جیسے تُو کرتا ہے۔"

"تُو بالکل فکر نہ کر۔"

"تو پھر اکرام کی تلاش کے لئے کیا ارادہ ہے؟"

"پورے ملک میں آدمی دوڑا دوں گا۔ جہاں تُو کہے گا وہاں ناکہ بندی کرا دوں گا۔ کیا سمجھے؟"

"بس...... لاہور سے آنے والے راستوں پر تمام ہسپتالوں کی تلاش کرنی ہے اور اس کے بعد دوسرے شہروں کی۔ کہیں نہ کہیں سے اسے برآمد کرنا ہے۔"

"ایک اور بات بتا۔"

"پوچھ۔"

"وہ زندہ تو ہے نا...... معاف کرنا یہ سوال ضروری ہے۔"

"ہاں...... وہ زندہ ہے۔ اگر وہ مر گیا تو میری تاریخ مر جائے گی۔ میرا سارا وجود خاکستر ہو جائے گا۔ مگر میں مر چکا ہوتا تو وہ بھی مر چکا ہوتا۔ اگر میں زندہ ہوں تو وہ بھی زندہ ہے۔ یہ میرا ایمان ہے۔"

رائے الیاس نے گہری نگاہوں سے رب نواز شاہ کو دیکھا اور پھر بولا۔

"بہت بڑی شخصیت ہوگی وہ جس نے میرے شیر کو اپنے پنجرے میں بند کر لیا ہے۔ لیکن بے فکر رہو، وہی سب کچھ ہوگا جو تم چاہو گے۔ اب اپنے آپ کو تمام فکروں سے آزاد کر دو...... کیا سمجھے؟"

"ٹھیک ہے...... اسی لئے تو یہاں آ گیا ہوں۔"

"پلاسٹر کب اترے گا؟"

"ڈاکٹر نے ایک مہینے کے لئے کہا تھا۔ ایک دو دن اوپر نیچے ہی ہوں گے، اس کے بعد دکھالیں گے۔"

"فکر مت کرو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اچھا اب ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ۔"

"کچھ نہیں...... میرے بہت ہی قریبی ساتھی ہیں، ہر طرح کا اعتماد کیا جا سکتا ہے ان پر۔" رب نواز شاہ نے کہا اور رائے الیاس گردن ہلانے لگا۔

○●○

ایک عجیب سی بے کلی، ایک عجیب سی بے چینی ماحول میں پیدا ہو گئی تھی۔ چوہدری جواد حسین نے نادر شاہ کو فون کیا اور رابطہ قائم ہو گیا تو چوہدری جواد حسین نے کہا۔

"نادر شاہ! کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں بھائی جان...... خیریت، کہاں سے بات کر رہے ہیں اور کب تک باہر رہنے کا ارادہ ہے؟"

"بھئی غم غلط کر رہا ہوں اپنے دوست کی موت کا۔ اور پھر بہت عرصے کے بعد بھاگ دوڑ ختم ہوئی ہے ورنہ جب بھی تمہارے پاس آتا تھا ایک خیال ذہن پر طاری رہتا تھا کہ واپس گھر جانا ہے اور اس واپس جانے کے چکر میں کسی سے ڈھنگ سے ملاقات ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اب ذرا تسلی ہوئی ہے تو سب لوگوں کے پاس وقت گزارنے کا ارادہ ہے۔ پہلے نظام الدین کے گھر گیا تھا اور وہاں بڑا اچھا وقت گزارا۔ اس کے بعد غیاث الدین کے پاس آیا ہوں گجرات۔ بڑا اچھا لگ رہا ہے، بہت خوش و خرم وقت گزر رہا ہے۔"

"شکر ہے...... آپ کی طرف سے ذرا طبیعت الجھی رہتی ہے۔ خیر آپ خیریت سے ہیں، میرے لئے بڑی تسلی والی بات ہے۔"

"ایک کام تمہارے سپرد کر رہا ہوں نادر شاہ! ذرا ہوشیاری کے ساتھ کرنا ہے۔ تم نے اکرام کا تذکرہ کیا تھا مجھ سے نادر شاہ! ابھی کوئی تفصیل نہیں بتاؤں گا جب تک کہ تم مجھے تفصیل مہیا نہیں کرو گے۔"

"میں سمجھا نہیں بھائی جان؟" نادر شاہ کا دل دھک سے ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں اکرام کے بارے میں کیا بات ذہن میں آئی تھی جواد بھائی کے۔ کہیں تذکرہ تو نہیں کیا کسی سے۔ بیٹی کا رشتہ کہیں کر رہے ہیں؟ وہ بے چارے تو ابھی تک حقیقتوں سے ناواقف ہیں۔ اگر انہوں نے دوسروں کے کانوں تک بات پہنچا دی اور اس کے بعد کوئی بات بڑھی تو سکی ہو گی۔ بہر حال ابھی اس بارے میں خاص طور سے غور نہیں کیا تھا۔ اب یہ سن کر نادر شاہ محتاط ہو گئے تھے۔ جواد حسین نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم فوری طور پر اکرام کے بارے میں تفصیلات معلوم کر کے مجھے اطلاع دو۔"

"تت...... تت...... تفصیلات......؟ بھائی جان! میں سمجھا نہیں؟" جواد حسین نے کہا۔

"نادر شاہ! تمہیں بتائے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اکرام یہاں غیاث الدین کے گھر موجود ہے۔"

"کیا......؟" نادر شاہ اچھل پڑا۔

"ہاں...... لیکن میں چاہتا ہوں کہ بات تمہاری ذات تک محدود رہے، کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے، اکرام کے بارے میں مجھے تفصیل درکار ہے۔ وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر یادداشت کھو بیٹھا ہے، اس کے چہرے پر اور جسم پر بے شمار زخم ہیں۔ ویسے تو اس کا علاج ہو رہا ہے اور ٹھیک حالت میں ہے لیکن اپنے نام کے علاوہ اسے کچھ یاد نہیں ہے، ذرا تفصیل سے بتاؤ۔ اور رب نواز شاہ کے بارے میں تفصیلات معلوم کرو، انہیں اکرام کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں کچھ معلوم بھی ہے یا نہیں؟ یہ تفصیل جلد سے جلد مجھے فراہم کرو۔"

"جی بھائی جان! میں خود یہ معلومات حاصل کر کے آپ کے پاس گجرات پہنچ رہا ہوں۔"

"اس سے اچھی تو کوئی اور بات نہیں ہوگی۔ ناصرہ کو بھی لیتے آؤ۔ غیاث الدین بہت خوش ہوں گے۔"

"جی بہت اچھا۔"

"خدا حافظ۔"

نادر شاہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ بڑی انوکھی تفصیل سامنے آئی تھی۔ معلومات کافی حد تک تو حاصل ہو گئی تھیں اس سے زیادہ معلومات اور کیا ہو سکتی تھیں؟ ساری تفصیل اخبارات میں بھی چھپی تھی اور ذاتی طور پر بھی اس لئے معلوم ہو گئی تھی کہ علی شاہ بھی اسی سکول میں پڑھتا تھا۔ پھر بھی مزید معلومات حاصل کیں۔ البتہ یہ بات ذہن میں رکھی کہ تمام معاملات خفیہ رہیں۔ کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ مزید تفصیلات معلوم کرنے کے بعد وہ ناصرہ بیگم کو لے کر گجرات کی طرف روانہ ہو گئے۔ لاہور سے گجرات تک کا سفر کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ غیاث الدین کی حویلی پر پہنچ گئے اور اس کے بعد انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ غیاث الدین کی اہلیہ عرشیہ، فاخرہ بیگم اور تمام لوگ بہت خوش ہوئے تھے۔ نادر شاہ نے بے صبری سے کہا۔

"اکرام کہاں ہے...... کیا وہ واقعی یہاں موجود ہے؟"

"ہاں...... ذرا تم بھی ایک نگاہ ڈال لو اس پر، مجھے غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟" جواد حسین نے کہا۔ عرشیہ، فاخرہ بیگم، غیاث الدین تمام لوگ اس کمرے میں پہنچ گئے جو اکرام کے لئے مخصوص تھا۔ اکرام اس وقت بھی کمرے میں خاموش بیٹھا خلاء میں گھور رہا تھا۔ نادر شاہ نے اکرام کو دیکھا اور اپنے بیٹے کو آواز دی۔

"علی شاہ! ذرا دیکھو۔"

علی شاہ خود بھی عجیب و غریب کیفیت کا شکار نظر آ رہا تھا۔ اکرام کو دیکھ کر سہما سہما سا آگے بڑھا اور اکرام کے پاس پہنچ گیا۔

"اکرام!" علی شاہ نے اسے آواز دی اور اکرام بری طرح چونک پڑا۔ علی شاہ کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آئی اور وہ آگے بڑھا اور اس کے بعد ایک دم ٹھٹک سا گیا اور علی شاہ کو دیکھنے لگا۔

"ابو! یہ اکرام ہی ہے۔" علی شاہ نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"اکرام بیٹے! اپنے دوست کو پہچان گئے...... علی شاہ ہے یہ۔"

اکرام ایک بار پھر گم صم سا ہو گیا۔

"اکرام! کیا ہو گیا...... کہاں غائب ہو گئے تھے تم؟ یہ سب کیسے ہو گیا؟"

اکرام کھوئی کھوئی نگاہوں سے علی شاہ کو دیکھنے لگا اور پھر بولا۔ "پتہ نہیں علی شاہ! میں نہیں جانتا۔"

سب کے سب دھک سے رہ گئے۔ علی شاہ کا نام اکرام کے سامنے کسی نے نہیں لیا تھا لیکن اکرام نے جس اپنائیت سے علی شاہ کو پکارا تھا وہ بڑی امید افزا بات تھی۔

"وہی ہے...... سو فیصدی وہی ہے۔" نادر شاہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اس کے ذہن پر زیادہ زور نہیں ڈالنا چاہئے...... کچھ عرصے کی بات ہے، یادداشت پر جو بھی اثر پڑا ہے وہ یقیناً کسی حادثے یا چوٹ کی وجہ سے پڑا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

علی شاہ کو اکرام کے پاس چھوڑ دیا گیا اور وہ سب لوگ واپس آ گئے۔ نادر شاہ کے چہرے پر شدید تشویش کے آثار تھے۔ بیوی سے مشورہ کیا تھا اور ناصرہ نے یہی کہا تھا کہ بلاوجہ چور بنے رہنے سے کیا فائدہ، تفصیل بتا دی جائے۔ بھائی جان اتنے غلط آدمی نہیں

ہیں کہ اس بھول کا برا مان جائیں۔ سب لوگ ایک کمرے میں آ بیٹھے۔

''ہاں بھئی، کیا معلوم کیا تم نے...... اس بات کی تصدیق تو تم بھی کر چکے ہو کہ یہ اکرام ہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اکرام وہاں نہیں ہے، میرا مطلب ہے لاہور میں۔''

''بھائی جان! بڑی تفصیلات سے معلومات حاصل کی ہیں میں نے۔ خاص طور سے اس تصور کے تحت جو میں نے آپ سے بیان کیا تھا۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں...... یہ اکرام ہی ہے نا۔''

''سو فیصدی اکرام ہی ہے۔ اب اس میں کسی بات کا شک وشبہ نہیں ہے۔''

''مگر یہ ہوا کیا...... اور رب نواز شاہ؟''

''میں آپ کو تفصیل بتا رہا ہوں...... اصل میں اکرام رب نواز شاہ کا بیٹا نہیں ہے۔''

''کیا......؟'' جواد حسین اچھل پڑے۔ ایک بار پھر ان کا ذہن نظام الدین کی طرف گیا تھا۔ شمس الدین اور اس بچے کا ہم شکل ہونا کیا معنی رکھتا تھا...... بہر حال خاموش ہو گئے، پھر بولے۔

''نادر شاہ! پہیلیاں مت بجھواؤ...... تفصیل بتاؤ، کیا ہوا تھا؟''

''رب نواز شاہ کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں کہ وہ کون ہیں یا کون تھے...... لاہور کے بازارِ حُسن میں اچانک ہی نمودار ہو گئے تھے اور وہیں ہیرا منڈی میں ایک جگہ خرید لی تھی۔ اپنے چار دوستوں کے ساتھ ہیرا منڈی میں نہایت ہی خوشگوار وقت گزارتے رہے۔ اکرام، ہیرا منڈی کی ایک طوائف کوثر جہاں کا بیٹا ہے۔ کوثر جہاں کے اس بیٹے کو رب نواز شاہ نے پال لیا تھا اور اسے اپنی اولاد کی جگہ دی تھی۔ بہت محبت کرتے تھے وہ اس سے۔ بہت ہی دولت مند آدمی تھے۔ اکرام کے لئے باقاعدہ ایک کوٹھی خریدی گئی تھی اور وہاں اسے شاہانہ شان وشوکت کے ساتھ قیام پذیر کیا گیا۔ انہوں نے اسے ہیرا منڈی سے اٹھا لیا تھا اور ایک باعزت مقام دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اکرام کے سلسلے میں انتہائی جذباتی تھے۔ چنانچہ راجہ دلاور کے بیٹے راجہ سخاوت کو اکرام کے سامنے ہزیمت اٹھانی پڑی تو راجہ دلاور نے کوششیں کر کے یہ بات اس سکول کی انتظامیہ تک پہنچا دی کہ اکرام ایک طوائف زادہ ہے۔ انتظامیہ نے اکرام کو سکول سے نکالنے کا نوٹس دے دیا۔ رب نواز شاہ نے ان کی خوشامد کی اور ان سے کہا کہ وہ ایسا نہ کریں، اس بچے کے اعلیٰ مستقبل کا سوال

ہے۔ لیکن انتظامیہ نہ مانی۔ تب رب نواز شاہ نے کہا کہ اگر اکرام اس سکول میں نہیں پڑھے گا تو کوئی نہیں پڑھے گا۔ انہوں نے راجہ دلاور کی ناک کاٹ لی اور سکول کو جلا کر خاکستر کر دیا اور اس کے بعد وہاں سے فرار ہو گئے۔ یہ ہے اس بدنصیب کی داستان۔ حادثہ کیسے ہوا، باقی سارے معاملات کیا تھے، یہ اللہ جانتا ہے مگر بھائی جان! آپ مجھے قصوروار قرار نہ دیں۔ بخدا ایک اعلیٰ ترین شخصیت دیکھی تھی جس کا اعتراف آپ نے بھی کیا ہے۔ بس یہ خیال دل میں آ گیا کہ......''

جواد حسین شاہ سکتے کے عالم میں آ گئے تھے۔ اس بات نے دل پر بڑا برا اثر کیا تھا کہ اکرام طوائف زادہ نکلا۔ ظاہر ہے کہ بیٹی کے باپ کی نگاہ سے اکرام کو دیکھا تھا اور اتنا ہی پسند آیا تھا وہ انہیں کہ وہ اکرام کے خوابوں میں کھو گئے تھے۔ شانہ تو خیر معصوم سی لڑکی تھی، اس کے دل کے اندر کیا کیا کچھ تھا شاید کسی کو کبھی معلوم نہ ہو پاتا لیکن خود چوہدری جواد حسین شاہ کو جو دھچکا لگا تھا وہ غور کرنے کے قابل تھا۔ بڑے عجیب وغریب حالات پیدا ہو گئے تھے۔

یہ مختصر سی تفصیل سن کر غیاث الدین بھی دم بخود رہ گئے تھے۔ حالات کا انہیں بھی علم ہو چکا تھا۔ بیٹی کا نکاح رب نواز شاہ سے ہوا تھا اور وہیں یہ انکشاف ہوا تھا کہ رب نواز شاہ طوائف زادے ہیں۔ شریف لوگ بہر حال بیٹیوں کے معاملے میں تقدیر پر بھروسہ کرتے ہیں۔ بے شک رب نواز شاہ کے بارے میں یہ انکشاف بہت سنسنی خیز تھا لیکن بہر حال وہ ایک شریف آدمی کی اولاد تھے۔ اللہ نواز شاہ بے داغ شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اس طوائف سے نکاح کیا تھا۔ اب حالات کچھ بھی ہوں، اس کی کوئی تفصیل کسی کے سامنے نہیں تھی۔ مگر یہ بات ہر وہ شخص جانتا تھا جسے اس بات کا علم تھا کہ رب نواز، اللہ نواز کے بیٹے ہیں اور اللہ نواز نے ان کی ماں سے نکاح کیا تھا۔ باقی ذرا سوچنے والی بات ہے۔ ہر شخص اپنا نظریۂ فکر رکھتا ہے۔ طوائف بھی بہر حال انسان ہے۔ اب سوچنے والوں کی سوچ ہے کہ وہ کس انداز میں سوچیں۔ چنانچہ غیاث الدین دل وجان سے اس بات پر تیار تھے کہ بہر حال بیٹی کی تقدیر کا جو بھی فیصلہ ہوا، وہ اسے اللہ کی رضا کے ساتھ قبول کریں گے۔ لیکن رب نواز نے دل پر چوٹ کھائی تھی اور گھر سے نکل گئے تھے۔ پھر ان کا کوئی پتہ نہیں مل سکا تھا۔ لیکن اب ایک بار پھر رب نواز کا نام جن تفصیلات کے ساتھ کانوں تک پہنچا تھا انہوں

نے غیاث الدین صاحب کو دیوانہ کر دیا تھا۔

نجانے کیوں دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ وہی رب نواز ہے جوان کی بیٹی کے سر کا تاج ہے۔ سب اپنے اپنے طور پر سوچ رہے تھے۔ غیاث الدین بھی اسی کیفیت کا شکار تھے۔ وہ تو خوش قسمتی سے عرشیہ اس وقت موجود نہیں تھی ورنہ اس پر بھی برے اثرات مرتب ہوئے۔

نادر شاہ، جواد حسین سے کہہ رہے تھے۔

''اب بتایئے بھائی جان! کیا کرنا چاہئے؟ ساری باتیں اپنی جگہ ہیں، ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ یہ حادثہ کس طرح سے ہوا؟ اور ایک بات اور ہے جو میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے۔''

''کیا بھائی جان؟''

''میں نے تم سے کہا تھا نا، لندن میں نظام الدین کے بیٹے شمس الدین سے میرے بہت ہی گہرے تعلقات ہیں۔ شمس الدین اعلیٰ پائے کے ڈاکٹروں میں شمار کیا جاتا ہے وہاں کے۔ اور اس کی کیفیت بھی کچھ عجیب سی ہے۔ وہ وطن واپس نہیں آتا۔ طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے پیچھے کیا کہانی ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے لیکن اس لڑکے کو دیکھ کر نجانے کیوں اب میرے ذہن میں عجیب وغریب خیالات آنے لگے ہیں۔ آخر اس مماثلت کا راز کیا ہے؟''

''عجیب گورکھ دھندہ ہو گیا ہے...... بتایئے کیا کریں؟''

''رب نواز شاہ مفرور ہیں؟''

''ہاں۔''

''کوئی پتہ نہیں ہے ان کا؟''

''نہیں۔''

''ٹھیک ہے...... فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کیا، کیا جائے؟ ایک مشغلہ ہاتھ آ گیا ہے۔ کیوں بھئی غیاث الدین! کیا کہتے ہو اس بارے میں؟''

''ہاں...... ہاں......'' غیاث الدین نے بدحواسی کے عالم میں کہا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''کچھ نہیں...... کچھ نہیں...... بس......''

جواد حسین گہری نگاہوں سے غیاث الدین کا جائزہ لینے لگے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''غیاث الدین! کوئی بات ضرور ہے۔ دوست ہوں تمہارا۔ مجھ سے چھپاؤ گے؟''

غیاث الدین نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولے۔ ''میں ایک عجیب وغریب وحشت کا شکار ہو گیا ہوں جواد حسین! یہ بات تو تمہیں معلوم ہے کہ عرشیہ کی شادی ہو رہی تھی۔''

''ہاں ہاں...... باقی بھی کچھ اور تفصیلات معلوم ہوئی تھیں مجھے، وہ یہ کہ عرشیہ کا شوہر ارے کچھ نام...... نام......''

''ہاں...... اس کا نام رب نواز شاہ تھا۔''

''میرے خدا...... میرے خدا...... کوئی ناچاقی ہو گئی تھی، کوئی بدمزگی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے عرشیہ بیٹی کی رخصتی نہیں ہوئی۔ دیکھو کیسا دماغ خراب ہے، عرشیہ بیٹی کو دیکھ کر بھی مجھے ماضی کی باتیں یاد نہیں آئیں۔ کارڈ بھیجا تھا تم نے۔ اصل میں لندن اور اس کے بعد نادر شاہ...... نہیں نادر شاہ! تم سے نہیں کسی اور سے مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عرشیہ کی رخصتی نہیں ہو سکی۔ کوئی بدمزگی ہو گئی ہے...... کیسا دماغ سے نکل گیا تھا کہ میں نے تم سے پوچھا بھی نہیں۔ عرشیہ کو دیکھ کر بھی مجھے یہ بات یاد نہیں آئی۔ فاخرہ بیگم! تم بھی میری طرح احمق ہی ہو، تم نے بھی نہیں پوچھا۔ لیکن غیاث الدین! مجھے کچھ بتاؤ تو سہی، یہ کچھ عجیب و غریب الجھاوے پھیل گئے ہیں، ہم ان کی ایک ترتیب کرتے ہیں جس میں پہلا نام رب نواز شاہ کا آتا ہے۔ رب نواز شاہ جس کے بارے میں یہ پتہ چلا ہے کہ وہ طوائفوں کے ڈیرے میں...... اُف...... اُف...... اس کا بھی کوئی پس منظر معلوم ہوتا ہے۔''

''میں اس کا پس منظر جانتا ہوں۔'' غیاث الدین نے کہا۔

''ہاں...... نادر شاہ نے بتایا تھا...... اب میں ان گزرے ہوئے واقعات پر گھوڑے دوڑا رہا ہوں۔ نادر شاہ نے بتایا کہ رب نواز شاہ کسی طوائف کی اولاد تھے۔ ایسی ہی بات ہے نا؟''

''ہاں...... اللہ نواز نے اس طوائف سے شادی کی تھی اور اسی کے بطن سے رب نواز شاہ پیدا ہوئے تھے۔ طوائف کا انتقال ہو گیا۔ اللہ نواز کی دوسری شادی ہو گئی یا شاید پہلے سے تھی۔ ان کی بیگم کے ہاں کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی اور ذکیہ بیگم نے رب نواز کو اپنی اولاد ہی کی طرح پالا۔ رب نواز کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ وہ کسی طوائف کے بطن سے پیدا ہوئے

تھے۔ شادی والے دن مہمان آئے اور کسی مہمان نے اللہ نواز سے یہ سوال کر دیا کہ انہوں نے جس طوائف سے شادی کی تھی اس کا بیٹا کہاں ہے۔ کیونکہ اس بیٹے کی پیدائش کی اطلاع ان مہمان کو تھی۔ تب رب نواز پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ طوائف کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ باپ سے احتجاج کرتے ہوئے وہ گھر سے نکل گئے اور اس کے بعد لا پتہ ہو گئے۔ ذرا غور کرو اس بات پر، ایک شخص جو ایک جذباتی حادثے کا شکار ہوا یہ انکشاف ہونے کے بعد کہ وہ رئیس ابن رئیس ہونے کے باوجود ایک طوائف زادہ ہے، کیا گزری ہو گی اس پر؟ اور پھر اسی جذباتی حادثے کا شکار ہو کر طوائفوں کے اس محلے میں رہائش اختیار کر لی۔ شاید اس احساس کے ساتھ کہ وہاں وہ ماحول ہے جو اس کی ماں کا ماضی ہے، یہ ایک جذباتی بات ہی ہو سکتی تھی۔ اس نے وہ جگہ آباد کر لی اور پھر اسے وہاں اکرام نظر آیا جو اس کا اپنا عکس تھا۔

اکرام کی شخصیت اتنی مسحور کن تھی کہ رب نواز شاہ اس کے لئے جذباتی ہو گیا، یہ سوچ کر کہ اکرام بھی اسی راستے کا مسافر ہے جس راستے پر رب نواز شاہ چلا تھا۔ میرے خدا...... میرے خدا! اس نے اکرام کو اپنی اولاد بنا لیا اور اس کے اعلیٰ مستقبل کے لئے کوشش کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایسی ہی ایک جذباتی کیفیت کا شکار ہو کر اس نے سکول کو آگ لگا دی۔ سارے الجھے دھاگے سلجھتے جا رہے ہیں...... اب ہم آ جاتے ہیں اکرام پر۔ اکرام ہیرا منڈی کی ایک طوائف کا بیٹا ہے اور...... نہیں بھائی! بڑی لمبی داستان ہے، بڑا لمبا چکر ہے۔ اب ذرا ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ طوائفوں کے اس محلے سے شمس الدین کا کیا تعلق رہا؟ خدا کی قسم، یہ تو بڑی پراسرار اور پیچیدہ کہانی بن گئی۔ نادر شاہ! کیا کہتے ہو؟''

''بھائی جان! آپ مجھ سے سوال کر رہے ہیں۔ میں تو خود اس کہانی میں اس قدر کھو گیا ہوں کہ آپ کو بتا نہیں سکتا۔''

''بھئی ڈرامہ کرنا پڑے گا...... بڑا لمبا ڈرامہ کرنا پڑے گا۔ یہ پتہ کرانا پڑے گا کہ اکرام آخر شمس الدین کا ہم شکل کیوں ہے۔ بات ذرا بری سی ہے لیکن معلوم تو کرنا پڑے گا۔''

''میرے خیال میں معلومات کرتے ہیں۔ اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ ہم لوگ اس معاملے میں براہِ راست الجھے ہوئے ہیں۔''

''مل جل کر سوچنا ہو گا۔ اکرام کی حفاظت کا مزید بندوبست کر لیا جائے۔ وہ یہاں

ہے، اس کی خبر کسی کو کانوں کان نہیں ہونی چاہئے۔ حکیم شبیر حسین کا کہنا ہے کہ کچھ دن بعد وہ خود بخود معتدل ہو جائے گا۔ خدا کرے یہ سب کچھ ہو جائے۔''

''تو پھر اب اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل مرتب کیا جائے؟''

''ہاں...... بالکل...... میرا خیال ہے ہمیں اللہ نواز کو بھی اس معاملے میں شامل کرنا ہو گا۔ نظام الدین سے بھی رابطہ کرنا پڑے گا۔''

اچانک ہی جواد حسین شاہ ہنس پڑا اور سب اسے دیکھنے لگے۔

''کیوں جواد حسین! ہنسی کیوں آئی؟''

''یار ایک بڑا دلچسپ مشغلہ مل گیا ہے...... یہ تو بڑی چوکھی والی بات ہو گئی۔ دیکھنا پڑے گا اور سوچنا پڑے گا کہ کیا کر سکتے ہیں ہم...... واہ، مزا آ گیا...... واقعی مزا آ گیا۔''

○●○

زندگی چیز ہی ایسی ہے...... ہر شخص اسے گزارنے کے لئے نہ جانے کیا کیا جتن کرتا ہے۔ حیات خاں کی الگ دنیا تھی۔ کام دھندہ کچھ بھی نہیں کرتے تھے، نوابوں رئیسوں کی حاشیہ برداری کرنے میں ساری زندگی گزار دی تھی۔ اب بھلا عمر کا ایسا کون سا دور رہ گیا تھا جو کوئی ڈھنگ کا کام کرتے۔ بس اسی بات کی تلاش میں رہتے تھے کہ کوئی چنگل میں پھنسے تو کام بن جائے۔ پرانے کرم فرماؤں کے پاس بھی چکر لگاتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی یہ خود بھی چکر میں آ جاتے تھے۔ بہرحال ہیرامنڈی کی کہانی سے دور بھی نہیں رہتے تھے۔ یہاں بھی ان کا اچھا خاصا دھندہ چل جاتا تھا۔ یہ بات ان کے علم میں تھی کہ رب نواز شاہ ہیرامنڈی سے غائب ہو گئے ہیں۔ پھر ایک بار شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر جا پہنچے۔ شمشیرہ بیگم تو ویسے ہی بڑی تیز اور کائیاں تھیں، حیات خاں کے تعلقات کو جانتی تھیں، پولیس ان دنوں اکرام کے سلسلے میں انہیں کافی پریشان کر رہی تھی۔ شمشیرہ بیگم نے حیات خاں سے کہا۔

''ارے حیات خاں! تمہارے تو بڑے بڑے افسروں سے تعلقات ہیں۔ ہماری اس پولیس سے جان چھڑا دو۔''

''کوئی مشکل کام نہیں ہے شمشیرہ بیگم! اعلیٰ افسروں سے بات چیت کرتے ہوئے لین دین بھی کرنا پڑتا ہے۔ تھوڑا سا خرچہ ہو جائے گا۔''

''ہو جائے...... سکون تو ملے۔''

''تو پھر لاؤ، رقم نکالو۔ وعدہ کرتا ہوں کہ جان چھوٹ جائے گی۔''

''بتاؤ، کتنے دوں؟''

''فی الحال تو پندرہ ہزار روپے دے دو۔ لیکن پچیس تک کی بات ہو گی۔ باقی کام ہو جانے کے بعد۔''

''اے میرے مولا۔''

''سوچ لو...... جو کام کرانے جا رہی ہو، وہ بھی تو معمولی نہیں ہے۔''

''دیکھو حیات خان! ہماری تمہاری تو پرانی شناسائی ہے۔ ہمارا کام کرا دو۔''

''کہہ تو دیا نا۔ اگر اعتبار نہیں تھا تو پھر حیات خان سے کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ارے ہم تو بڑے بڑوں کا کام کرتے ہیں اور وہ ہم پر اعتبار کرتے ہیں۔''

''نہیں نہیں...... اعتبار کی بات نہیں ہے۔ مگر پوری پوری کوشش کرنا۔''

''ایسی ویسی...... یوں سمجھ لو کہ آج سے اس کام پر لگ گئے۔''

پندرہ ہزار روپے حیات خان کی جیب میں آ گئے۔ بڑی سخت ضرورت تھی، اللہ کی دین، بیوی بہت دنوں سے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ میکے لے چلو مگر ان دنوں ہاتھ تنگ تھا، ہر جگہ سے کوشش کر ڈالی تھی مگر نا کام رہے تھے۔ اس وقت یہ ایک ایسا کام ہوا تھا کہ بس جی جان خوش ہو کر رہ گئے تھے۔ جہنم میں جائیں شمشیرہ بیگم اور جہنم میں جائیں رب نواز شاہ۔ گھر پہنچے، میکے جانے کے لئے تیار ہونے کے لئے کہا تو وہاں بھی جیسے عید آ گئی۔ ساری تیاریں مکمل کیں، ریل میں بیٹھے اور چل پڑے۔ جب رانی پور پہنچے تو بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ کیونکہ پیسے جیب میں موجود تھے۔ خوب خاطر مدارات ہونے لگیں۔ ان کے قیام کے دو تین دن بعد کی بات ہے کہ حیات خان کے سسر منہ لٹکائے ہوئے آئے۔ باہر کچھ ہنگامہ ہوا تو اچھے خاصے شور شرابے کی آوازیں بھی ہوئی تھیں۔ حیات خان یہ تو سمجھ نہیں پائے تھے کہ کوئی لڑائی، دنگا ہو رہا ہے البتہ سسر جی اندر پہنچے تب انہیں صورت حال پتہ چلی۔

''بس بیٹا! تقدیر کی خرابی ہے۔ کیا بتائیں، تھوڑے دن پہلے کی بات ہے، تمہارے سالے نے کچھ زمین خریدی تھی۔ سوچا تھا کہ اس پر کچھ بنوا لیں گے مگر لاپرواہی میں پڑی رہ گئی۔ اب اس بدمعاش نے اس پر ڈیرہ ڈال لیا ہے۔ پولیس سے بھی کہا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ الٹا وہ ہمارے پاس آ گیا اور دھمکیاں دینے لگا۔''

''آپ نے پولیس والوں کو کچھ رقم کھلائی تھی؟''

''بس بیٹا! سو دو سو کی پوچھ تاچھ کیا ہوتی ہے۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے...... اچھا خیر، میں کوشش کرتا ہوں۔'' حیات خان نے بس ایسے ہی رعب ڈالنے کے لئے کہہ دیا تھا اور پھر نجانے دماغ میں کیا سمائی کہ وہ اس پلاٹ کی طرف چل پڑے۔ لیکن وہاں انہیں شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بدمعاش دلدار گھوڑا

تھا جسے رب نواز شاہ نے لاہور سے مار کر بھگا دیا تھا۔ حیات خان کے دماغ میں فوراً ایک منصوبہ آ گیا۔ دلدار گھوڑا سے اس طرح بات کی کہ وہ پلاٹ چھوڑنے پر راضی ہو گیا۔ انہوں نے دلدار گھوڑے کو ہیرا منڈی سے شاہ جی کے بھاگ جانے سے لے کر اب تک کی تمام باتیں بتا دیں اور بولے۔

’’ہیرا منڈی اس وقت کسی بھی سرپرست سے خالی ہے اور ابھی تک وہاں کسی نے قبضہ نہیں جمایا اس لئے کہ ابھی کسی کو پتہ نہیں چلا۔ لیکن یہ بات تو مجھے معلوم ہے کہ شاہ جی تو اب گئے، واپس نہیں آتے۔ پولیس ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔‘‘

دلدار گھوڑے کو اس سے اچھا موقع پھر کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ شاہ جی اس وقت ایک مجرم کی حیثیت سے چھپے چھپے پھر رہے تھے۔ اس وقت جو بھی ہیرا منڈی میں جا کر بیٹھ جائے گا سمجھ لو اس کا سکہ چلتا رہے گا۔ دلدار گھوڑے کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگی تھیں۔ اس نے کھڑے ہو کر حیات خان کا بازو پکڑ کر کہا۔

’’حیات خان! کوئی چار سو بیسی تو نہیں کر رہے؟‘‘

’’اچھا...... اب یہ دن آ گئے ہیں دلدار کہ ہماری کسی بات پر تم ہم سے ہی سوال کر رہے ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم تم سے جھوٹ بولیں؟‘‘

’’ہو تو نہیں سکتا مگر خبر اتنی بڑی ہے کہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔‘‘

’’کلیجہ مت پھاڑو، بلکہ لاہور جانے کی تیاری کرو۔‘‘

’’اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو حیات خان! لاہور واپس آؤ گے ناں۔‘‘

’’بھائی! میرا گھر ہے وہاں، کیسے واپس نہ آؤں گا؟‘‘

’’موتیوں سے منہ بھر دوں گا تمہارا...... مہینے کا بھتہ مقرر کر دوں گا۔ ہیرا منڈی کی بدمعاشی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میرے ہاتھ لگ گئی تو بس سمجھ لو کہ وارے نیارے ہو جائیں گے۔‘‘

’’جتنی دیر کرو گے اتنا ہی نقصان اٹھاؤ گے۔ جلدی کرو، یہاں سے نکل لو۔‘‘

’’ارے میں تو ابھی آدمیوں کو اسٹیشن بھیجتا ہوں اور جو پہلی ٹکٹیں ملتی ہیں ریل کی وہ منگوائے لیتا ہوں اور آج ہی لاہور روانہ ہو جاتا ہوں۔‘‘

حیات خان معمولی آدمی تو نہیں تھا، بنیے کا بیٹا جہاں گرتا ہے کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے۔

واپس گھر پہنچا، اپنے سسرال والوں کو اچھی طرح جانتا تھا، کنجوس لوگ تھے، پیسہ دبا کر رکھتے تھے، بہت معمولی زندگی گزارتے تھے اور یہ بات حیات خان اچھی طرح جانتا تھا کہ پیسہ ان کی جیب میں موجود ہے۔ سوکھا سا منہ بنا کر سسر کے سامنے جا بیٹھے۔

’’کیا ہوا بیٹا؟‘‘ سسر جی نے سوال کیا۔

’’بس ابا جی...... آپ ہی کے کام سے گیا تھا مگر سسرا بہت خراب ہے۔ ویسے پلاٹ کی قیمت کتنی ہو گی؟‘‘

’’چار پانچ لاکھ سے کم نہیں ہو گی۔ بہت بڑی جگہ ہے۔ تم نے دیکھی نہیں ہو گی، وہ بہت اچھی جگہ ہے۔‘‘

’’دیکھ کر آیا ہوں...... اور بھی کچھ کر کے آیا ہوں۔ وہ زمین پانچ چھ لاکھ کی ہے اور اگر پچاس ہزار اوپر سے دینے پڑے تو پانچ لاکھ پچاس کی ہو جائے گی۔ مگر یہ پچاس ہزار آپ کو مجھے دینے ہوں گے اور میں ہی آپ کا یہ پلاٹ خالی کرا سکتا ہوں مگر پہلے رقم میرے ہاتھ میں رکھیں تو بات ہو گی۔‘‘

سسر جی سوچ میں پڑ گئے۔ اور پھر بیٹے سے مشورہ کر کے پیسے حیات خان کے حوالے کر دیئے۔ حیات خان تھوڑی دیر کے لئے گھر سے باہر گیا اور واپس آ کے سب کو ساتھ لیا اور زمین ان کے حوالے کر دی۔ سب حیات خان کو مبارکبادیں دے رہے تھے کہ داماد نے آ کر اتنا بڑا کام کر دکھایا جس میں جانیں جانے کا خطرہ بھی تھا۔ رقم کا معاملہ تو خیر تھا ہی۔ بہرحال آج کل تقدیر سونے کی طرح چمک رہی تھی۔ سسر جی نے پوچھا۔

’’آخر ایسا کون سا جادو چلا دیا تم نے کہ وہ بدمعاش پلاٹ چھوڑ بھاگا؟‘‘

’’بہت سے جادو ہیں ہمارے پاس سسر جی! لاہور کے بڑے بڑے افسروں سے یاری ہے۔ ہم نے کہہ دیا ہے اس سسرے سے کہ تھوڑے بہت پیسے لے اور لاہور بھاگ جا ورنہ کیا فائدہ کہ لاہور سے یہاں کی پولیس کو حکم ملے۔ زمین بھی جائے اور جیل الگ جانا پڑے۔ یہی بات سمجھائی تھی سو سمجھ میں آ گئی۔‘‘ حیات خان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

○●○

شاہ جی کا پلستر اتر گیا۔ مضبوط ہڈیوں نے اپنی جگہ حاصل کر لی اور ایکسرے کی رپورٹ

کے مطابق وہ بالکل ٹھیک ہوگئیں۔ ادھر رائے الیاس علی نے ان کی دلجوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کے علاوہ بے شمار افراد ہر طرف پھیل گئے اور اکرام کو تلاش کیا جانے لگا۔ نجانے کیوں شاہ جی پر مایوسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

''بے کار لگتا ہے اب یہ سب کچھ...... ایسا لگتا ہے جیسے ہمارا چندا ہمیں داغِ مفارقت دے گیا۔ آخر اب کہاں تلاش کریں؟ جیتا ہے تو اب خود ہی آئے گا۔ ہمارا اب اسے تلاش کرنا بے کار ہے۔''

یہ بات ان کے ساتھی بھی محسوس کر چکے تھے لیکن شاہ جی کے سامنے یہ الفاظ نہیں کہہ سکتے تھے۔ شاہ جی کے چہرے کی لکیریں اس بات کی غماز تھیں کہ اکرام کا گھاؤ دل میں گہرا ہے اور اسے بہت یاد کرتے ہیں۔ ایک دن جب سب لوگ جمع تھے تو شاہ جی نے ان کے ساتھ بیٹھ کر کہا۔

''دیکھو، دنیا جو چاہتی ہے وہ تو ہونے سے رہا۔ کم از کم اکرام کی یاد میں کچھ ایسے کام تو ہو جائیں جن سے اپنا ہی جی خوش ہو جائے۔''

''مثلاً شاہ جی؟'' نور شاہ نے پوچھا اور شاہ جی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ بہت دیر وہ ایک طرف گردن جھکائے سوچتے رہے پھر بولے۔

''ہم جہاں بھی ہوں گے ہمیں کوثر جہاں کی خبر تو رکھنا ہی پڑے گی۔''

''اب تو زیادہ سے زیادہ ذمہ داری آپڑی ہے۔ ہم نے اکرام سے وعدہ کیا تھا اگر کبھی ملا تو بولے گا کہ واہ شاہ جی! جھوٹا وعدہ کیا تھا میری ماں اور بہن کو عزت دینے کا۔''

''تو پھر کیا حکم ہے شاہ جی؟''

''ایک الجھن میں ہیں...... اصل میں ہم راستے سے بھٹک گئے۔ کیا کرتے اور کیا نہ کرتے۔ اس بندے کا پتہ کرانا ہے جو اکرام کا باپ ہے۔ بس اسی کے لئے ذرا پریشان تھے۔ کوئی ایسا اشارہ ابھی تک نہیں ملا جو مضبوط ہو۔ ویسے کچھ کرنا پڑے گا۔ اکرام نہیں ملا تو کم از کم اس کا باپ ہی مل جائے۔ اگر باپ کا پتہ چل گیا تو حرامی کو پکڑ کر لے آئیں گے اور کہیں گے کہ بیٹا چل شادی کر لے اب اس سے۔ بہت ہو گیا۔''

''ہاں ٹھیک ہے...... لیکن شاہ جی! ایک کام اور کرنا ہو گا، وہ یہ کہ کوثر جہاں کو شمشیرہ بیگم کے کوٹھے سے ہٹا دینا ہو گا۔ کہیں وہ بددل ہو کر جی نہ چھوڑ بیٹھے۔''

''شمشیرہ بیگم اسے چھوڑے گی آسانی سے؟'' شالے خان بولا اور شاہ جی کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔

''اس کتیا کی کیا مجال کہ وہ کوثر جہاں کو روک سکے۔ ہمارے اکرام کی ماں ہے وہ۔ اور اکرام کی ماں بے چاری اکرام کے باپ کا انتظار کر رہی ہے۔ عورت بھی کیا شے ہوتی ہے یار! مرد اسے کچھ بھی کہہ لے، کمین کا پلاّ قصوروار وہی ہوتا ہے۔ کوٹھے پر بٹھا دیتا ہے اسے اور طوائف کہہ کر نفرت کرتا ہے۔ حالانکہ وہاں بھی مصیبت اس کے لئے وہی بنتا ہے۔ خیر چھوڑو! تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ کوثر جہاں کو وہاں سے ہٹا لیا جائے۔''

''کہاں رکھیں گے شاہ جی؟''

''کوئی جگہ خرید لیتے ہیں...... کسی بھی شہر میں۔''

''لاہور والی کوٹھی بیچ دیں شاہ جی؟''

''نہیں...... خطرے کی بات ہو گی۔ پیسوں کے لئے پریشان ہو گیا؟''

''ضرورت تو پڑے گی شاہ جی!''

''وہ کتیا کا پلاّ کیا بقرہ عید پر ہلال کرنے کے لئے رکھ چھوڑا ہے؟''

''کون......؟''

''وہی حمید خان۔ ہم کاغذ لکھ کر دے دیں گے، اس سے کہنا کہ پیسوں کا بندوبست کر دے۔ بہرحال اب یہاں سے جی اکھڑ گیا ہے۔ تیاریاں کرو۔''

''شاہ جی! جائیں گے کہاں؟''

''فی الحال کہیں بھی جا کر ٹک جائیں گے۔''

بہرحال شاہ جی نے تیاریاں شروع کر دیں اور اس کے بعد رائے الیاس سے اجازت لینا دنیا کا سب سے مشکل کام تھا لیکن بہرحال شاہ جی نے کسی نہ کسی طرح رائے الیاس کو تیار کر ہی لیا اور آخر کار وہ وہاں سے چل پڑے۔

○●○

دلدار گھوڑا لاہور آ گیا۔ چالاک آدمی تھا۔ حیات خان کی یہ مجال تو نہیں تھی کہ دلدار کو دھوکا دے، پھر بھی پوری طرح اظہار نہیں کیا تھا۔ ہیرا منڈی کی بدمعاشی معمولی چیز نہیں تھی، لاہور پہنچ گیا تھا لیکن اس نے ابھی ہیرا منڈی کا رخ نہیں کیا تھا۔ یہاں اس کی بھی

شناسائیاں تھیں۔ ایک دوسرے سے معلومات حاصل کر کے علاقے کے تھانے دار کے پاس جا پہنچا۔ تھانے دار بھی اس کا پرانا شناسا تھا۔ دلدار نے اس سے کہا۔

"کہو، کیا حال ہیں؟"

"حال تم اپنا بتاؤ۔"

"دلدار جی! کہاں کا اڈہ سنبھال رکھا ہے آج کل...... نام سننے کو نہیں ملا۔"

"کتنے دن سے یہاں ہو؟"

"ابھی تو تبادلہ ہوا ہے...... اب یہاں کا تھانہ مل گیا ہے، لیکن ساون سوکھا گزر رہا ہے۔ کچھ دھندے پانی کی بات کرو۔"

دلدار گھوڑے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بولا۔ "بس جناب! دلدار گھوڑا کے دوست ہمیشہ ہی اسے یاد کرتے رہتے ہیں کیونکہ دلدار ہمیشہ بانٹ کر کھانے کا عادی ہے اور دوستوں کے لئے دھندے تلاش کرتا ہی پھرتا ہے۔ چلو ٹھیک ہے، تم بھی کیا یاد کرو گے۔ دس ہزار روپے مہینہ ٹھیک ہوں گے؟ ہیرا منڈی کا دھندا سنبھالے ہوئے ہیں۔"

"صرف دس ہزار...... اور وہ بھی ہیرا منڈی کے دھندے سے؟"

"بس زیادہ منہ مت پھیلاؤ، زیادہ کمائیں گے تو تمہارے لئے ہی کمائیں گے۔ تمہیں تعاون کرنا پڑے گا۔ ہیرا منڈی پر اپنا قبضہ کر رہے ہیں۔ اگر کوئی ٹانگ اڑائے تو ساتھ دینا پڑے گا۔"

"رقم بڑھاؤ...... دس ہزار تو بہت کم ہیں اس دور میں۔"

"چلو ڈبل کر لو۔"

اور یہ معاملات طے ہو گئے۔ چنانچہ دلدار ہیرا منڈی چل پڑا اور وہاں پہنچ کر اس نے سب کو اپنے رعب میں لے لیا۔ سرِ بازار رب نواز کے ڈیرے پر پہنچ کر اسے زور زور سے پکارا، للکارا اور دعوت دی کہ اب آ جائے، دیکھتے ہیں کتنا بڑا بدمعاش ہے وہ۔ مگر لوگوں نے اسے بتایا کہ وہ یہاں نہیں ہے اور بازار چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

"تقدیر کا اچھا تھا...... ورنہ اس بار میں نے وہ بندوبست کیا تھا اس کے لئے کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔" اور اس کے بعد دلدار گھوڑے نے تمام کوٹھے والیوں سے کہا۔

"سنو...... اب یہاں سے رب نواز کا راج ختم ہو گیا ہے۔ ہیرا منڈی کا مالک اب میں

ہوں...... یہ اڈہ میرا ہے...... تم سب کو میرا حکم ماننا پڑے گا۔ کسی نے گردن اٹھائی تو منکا توڑ دوں گا۔ باہر کے بدمعاشوں سے تمہاری حفاظت کی جائے گی۔ پانچ پانچ سو روپے دینے پڑیں گے تمہیں مہینے کے۔ سب لوگ جمع کر کے ڈیرے پر پہنچا دیا کرو۔ مہینے کی تیس تاریخ کو ساری کوٹھے والیوں کو یہ رقم اکٹھا کر کے دینا ہوگی۔ سب لوگ کان کھول کر سن لو، کسی کو کوئی مشکل پیش آئے، ہمارے پاس آؤ اور ہمیں بتاؤ۔ اگر کسی کی میّا نے اسے زیادہ دودھ پلایا ہو تو دودھ اُلٹنے بھی ہمارے پاس ہی آ جانا۔ بس یہی کہنا تھا ہمیں۔ ایک مہینے کی رقم پیشگی پہنچا دو، تین دن کا وقت دیا جاتا ہے۔ تیسرا دن آخری ہوگا۔ جس کے پاس سے رقم نہ پہنچی وہ اپنی مصیبت کا خود ذمہ دار ہوگا۔ تم لوگوں نے سن لیا؟"

لوگوں نے خاموشی سے گردن جھکا دی اور اپنے اپنے دروازے کی طرف چل دیئے۔

دلدار گھوڑے کو رب نواز کے احاطے میں دیکھ کر سب ہی کو دکھ ہوا تھا۔ سب نے ساری کی ساری داستان سنی جن میں حاجو بھی شامل تھا۔ وہ پھدک کر گھر بھاگا۔ غلام شاہ اب وہ سب کچھ کر رہا تھا جو تھوڑے دن پہلے حاجو کرتا تھا۔

"کیا بات ہے حاجو...... خیر تو ہے؟"

"خیر نہیں ہے۔"

"منہ سڑے تمہارا۔ برباد ہو جاؤ۔ پھلبہری بھی نہیں نکلی منہ پر کہ دیکھنے والوں کا لعنت بھیجنے کو دل چاہے۔"

"بات تو سن لو...... ہوشیار ہو جاؤ، اب عیش و عشرت کے دن بیت گئے۔ اب رب نواز کے احاطے میں دلدار گھوڑا آ گیا ہے۔"

"گگ...... گھوڑا...... اے میرے مالک...... مگر شاہ جی نے تو اس کی بڑی پٹائی کی تھی۔ اب کیسے آن مرا کمبخت...... ہائے ہائے...... پتہ چل گیا ہوگا موئے کو کہ شاہ جی نے ڈیرہ چھوڑ دیا ہے۔ آ گیا قبضہ جمانے کو۔"

"کیا کہہ رہا تھا حاجو؟"

"ہیرا منڈی والیوں کو خوشخبریاں سنا رہا تھا۔ دکانداروں کو بھی پیسے دینے پڑیں گے اور تم لوگوں کو بھی پانچ پانچ سو روپے ہر مہینے دینا پڑیں گے۔ باقی اس کی مرضی ہے جس سے جو دل چاہے جب مرضی وصول کر لے۔ اب نیا قانون نافذ ہوگا ہیرا منڈی میں۔ شاہ جی

چلے گئے، اب دلدار گھوڑے کا راج ہے۔''

''خدا کی مار کمبخت پر...... کہاں سے آن مرا...... آخر یہ لوگ کب تک ہماری گردن دبائے پھریں گے...... کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ کوئی قدم اٹھائے۔ دلدار گھوڑا تو بڑا ہی کمینہ ہے۔ ہمارے مہمانوں کو بھی پریشان کرے گا۔''

''وہ تو کرے گا شمشیرہ بیگم!'' حاجو نے کہا۔

''تم چپ ہو جاؤ حاجو...... زبان کترنی کی طرح چلے جا رہی ہے۔ حسرت ہی رہی کہ کبھی کوئی خوشخبری بھی لے کر آؤ۔''

بہرحال شمشیرہ بیگم ہر چیز سے پریشان ہو جانے کی عادی تھیں چنانچہ اس بات پر بھی خوب پریشان ہو گئیں۔

○●○

ماسٹر حمید اللہ، ملک اللہ نواز کے پاس پہنچ گئے۔ ملک اللہ نواز بہت ہی دکھی وقت گزار رہے تھے۔ ذکیہ بیگم کی کیفیت بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔ کوئی تصور تک نہیں تھا رب نواز کے بارے میں کہ وہ ذکیہ بیگم کی اپنی اولاد نہیں ہے۔ اگر خود صاحب اولاد ہوتیں تو ممکن ہے اتنا ظرف قائم نہ کر پاتیں۔ لیکن خدا نے انہیں اولاد سے نہیں نوازا تھا اس لئے تمام تر محبتیں رب نواز کے لئے وقف ہو گئی تھیں۔ وہ تو ایک طرح سے بیمار ہی پڑ گئی تھیں۔ بس عبادتیں ہو رہی تھیں اور دعائیں ہوتیں۔ ایک ہی دعا لبوں پر رہتی، معبودِ دو جہاں! رب نواز کی حفاظت کرنا، اس کے دل میں رحم ڈالنا کہ ہم بھی اس کے ماں باپ ہی ہیں، ایک چھوٹی سی بات پر گھر چھوڑ گیا۔ ظالموں میں داخل ہو گیا ہے وہ۔ اس کا گناہ معاف کر دینا۔ ملک اللہ نواز یہ خاموش دعا کتنی ہی بار سن چکے تھے۔ جانتے تھے کہ ذکیہ بیگم نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ رب نواز ان کی اولاد نہیں ہے۔

بہرحال ہر جتن تو کر لیا تھا، کہیں سے کچھ خبر ہی نہیں ملی تھی۔ ایسے وقت میں حمید اللہ صاحب پہنچے۔

''آیئے ماسٹر صاحب! مزاج بخیر ہیں؟''

''خاک بخیر ہیں...... تین مہینے سے بیمار پڑا تھا۔ لاہور کے ایک ہسپتال میں علاج ہو رہا تھا۔ خبر لی تم لوگوں میں سے کسی نے؟''

''ارے ارے...... ماسٹر صاحب! یہ تو بڑے دکھ کی بات ہے...... واقعی ہماری کوتاہی ہے۔''

''بس، بس...... یہ لفاظیاں اور زیادہ غصہ دلاتی ہیں ہمیں۔ ٹھیک ہے بھائی، ٹھیک ہے، ہم کب کہتے ہیں کہ ہم تمہارے کوئی عزیز یا رشتے دار ہیں۔ ہم کب کہتے ہیں کہ ہم اس قابل ہیں کہ تم جیسے بڑے لوگ ہم پر توجہ دیں۔ خیر کوئی بات نہیں، ہم کبھی نہ آتے تمہارے پاس۔ ایک اطلاع دینے آئے تھے۔ اگر بیمار نہ ہوتے تو اسی وقت اطلاع دیتے تمہیں آ کر۔ پر وہیں بیمار ہو گئے تھے۔''

''جی...... جی...... آپ کا غصہ بجا ہے...... واقعی ہمارا قصور ہے جس کے لئے ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں۔''

''اطلاع کی پوچھو، اطلاع کی...... معاف وعاف نہیں کروں گا میں تم لوگوں کو بتائے دے رہا ہوں۔'' ماسٹر حمید اللہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور ملک اللہ نواز مسکرانے لگے پھر بولے۔

''آپ جانتے ہیں ماسٹر صاحب! اب تو مسکرانے کو بھی دل نہیں چاہتا۔''

''چاہے گا، چاہے گا...... ایسی کوئی بات نہیں، انسان کی زندگی میں الٹ پھیر آتے ہی رہتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اللہ پر شاکر رہو تو سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ہاں، وہ میں داتا صاحب کے عرس پر گیا تھا لاہور۔ وہاں پر ڈیرہ لگایا ہوا تھا تمہارے صاحب زادے نے لنگر تقسیم کر رہے تھے بڑی آب و تاب کے ساتھ عرسِ مبارک میں۔''

''کک...... کک...... کس نے......؟''

''ارے اسی رب نواز کی بات کر رہا ہوں۔''

''جی......؟'' ملک اللہ نواز اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

''ہاں...... کہا نا۔ مگر سرکش ہے، باغی ہے، بدتمیز ہے، احمق ہے، بے وقوف ہے۔''

''وہاں لاہور میں نظر آیا تھا...... وہ اب کہاں ہے؟''

''بتا رہا ہوں یار! پوری بات تو سن لو، ایک تو تم لوگ اتنے بے صبرے ہوتے ہو۔ ارے بھائی میری بات پوری ہو گئی کیا کہ تم نے بیچ میں اپنی کہانیاں شروع کر دیں؟''

''نہیں ماسٹر صاحب! بتایئے...... بتایئے......!''

"بیٹھ جاؤ۔ کیا ہونقوں کی طرح کھڑے ہو گئے ہو؟" حمید اللہ صاحب نے کہا اور ملک اللہ نواز بیٹھ گئے۔ حمید اللہ صاحب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ شاید واحد شخصیت تھی جو ایک وزیر کو اس طرح کہہ سکتی تھی۔ حالانکہ دورِ وزارت ختم ہو گیا تھا لیکن بہت کچھ تھا اب بھی۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ماسٹر حمید اللہؒ کی لاکھ خوشامدیں کیں کہ اس دورِ وزارت میں وہ بھی کچھ لے لیں لیکن ڈنڈا اٹھا لیا تھا اس بات پر۔

"ہو گے وزیر اپنے گھر کے...... زمین پر ہے نا تمہاری وزارت۔ آسمان پر ہو تو میں جانوں۔ دینے آئے ہیں مجھے۔" حمید اللہ صاحب کا ایک ہی انداز ہوتا۔ بہرحال یہ عجیب و غریب انکشاف کیا تھا ماسٹر حمید اللہ نے۔

"تو پھر آپ نے پکڑا اسے؟"

"دھوکا دے گیا...... چکر دے گیا بدمعاش...... میرے سامنے تو بھیگی بلی بن گیا تھا۔ بڑی ڈانٹ ڈپٹ کی میں نے...... پوچھا کہ کہاں رہتا ہے؟ معلومات بھی حاصل کیں۔ بس دماغ کی خرابی ہے، پاگل پن ہے۔"

"کک...... کک...... کہاں رہتا ہے...... کچھ پتہ چلا؟"

"رہتا ہے نہیں، رہتا تھا...... اسی دن بھاگ گیا گھر بار چھوڑ کر، عرس میں لنگر ونگر ختم کر کے جب ہم نے کہا کہ اس نے ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ بس دھوکا کھا گئے۔ ورنہ اسی وقت گردن پکڑ لیتے تو ایسا نہ ہوتا۔"

"کہاں رہتا ہے...... کہاں رہتا تھا؟"

"لاہور میں طوائف خانہ ہے، ہیرا منڈی کے نام سے مشہور ہے۔ نام سنا ہے کبھی؟"

"ہاں......" ملک اللہ نواز کا دل خون ہونے لگا۔

"وہیں رہتا ہے ایک احاطہ لے کر...... شاہ جی کے نام سے مشہور تھا، بڑی دھونس جما رکھی تھی محلے بھر پر۔ وہ چاروں کمینے دوست بھی ساتھ ہی تھے۔ بس ہم جانتے ہیں ہماری وجہ سے چلا گیا۔ ہم وہاں پہنچے، چکر لگائے، کہیں نہیں ملا۔ ہم جانتے تھے کہ ہماری وجہ سے غائب ہے۔ اور پھر اس کے بعد اچانک ہی ہم پر بیماری کا حملہ ہو گیا۔ بچے گھر لائے لیکن مجبوراً واپس لاہور لے جانا پڑا اور پھر وہاں ہسپتال میں تین مہینے رہے ہیں۔ پرسوں ہی تو وہاں سے چھٹی ہوئی ہے۔ کل گھر پہنچے تھے، کل ہمت نہیں پڑ سکی کیونکہ رات ہو چکی تھی۔ سو

آج تمہارے پاس آ گئے۔"

ملک اللہ نواز کی گردن جھک گئی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں لیکن آنسو بہنے نہ دیئے۔

"پتہ نہیں اب وہاں رہتا ہے یا نہیں۔"

"اماں پتہ کراؤ...... مرد ہو، چوڑیاں پہنی ہوئی ہیں ہاتھوں میں؟"

"نہیں ماسٹر صاحب! میں فوراً تیاریاں کرتا ہوں۔"

"اچھا پھر خدا حافظ۔ ہم اطلاع دینے آئے تھے، اب جا رہے ہیں۔"

"بیٹھئے تو سہی۔"

"ہاں بیٹھئے، کچھ کھائیے پیجئے۔"

"یار کیوں تم لوگ فضول باتوں میں وقت گزارتے ہو...... کیا مجھے پتہ نہیں ہے کہ اس وقت تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ جاؤ پہلے اپنے کام کرو، کوئی خوشخبری سناؤ مجھے۔ اس سے بڑی خوشخبری میرے لئے اور کوئی نہیں ہوگی کہ وہ تمہیں مل گیا۔ بعد میں تو پہنچ ہی گیا ہوگا اپنے گھر۔ سوچا ہوگا کہ بلا ٹل گئی۔"

"ماسٹر صاحب! خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ میں فوراً ہی تیاریاں کرتا ہوں۔ جیسے ہی کوئی اطلاع ملی آپ تک بھی پہنچاؤں گا۔"

"اللہ تمہیں کامیاب کرے۔" ماسٹر حمید اللہ نے کہا اور باہر چلے گئے۔ لیکن اللہ نواز شاہ کے دل کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھے رہے۔ ذکیہ بیگم کو یہ سب کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ جو حالت ان کی ہو جاتی وہ سنبھالے نہ سنبھلتیں۔ پتہ نہیں آگے کے حالات کیا ہوں...... یہ شبہ تو ہوگا کہ ماسٹر حمید اللہ جا کر بتا دیں گے سب کچھ اور پھر حملہ ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے مستقل ہی ہیرا منڈی چھوڑ دی ہو۔ بیوقوف کہیں کا، یہاں بھی اس نے غلط ہی فیصلہ کیا۔ تھوڑا وقت تو دیتا سمجھانے کے لئے۔

بہرحال انہی چکروں میں تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ اب آغاز کہاں سے کرنا چاہئے کہ باہر سے ایک اور اطلاع ملی۔

"غیاث الدین صاحب بہت سے مہمانوں کے ساتھ آئے ہیں۔ ابھی ابھی پہنچے ہیں۔"

اللہ نواز شاہ ہی اطلاع سن کر ٹھٹک گئے تھے۔ دل میں پریشانی کا احساس جاگا تھا لیکن

فوراً یہ پریشانی تقویت میں بدل گئی۔ انہوں نے دل میں سوچا کہ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ غیاث الدین کے دل میں بھی اتنی ہی لگی ہوئی تھی جتنی خود ان کے دل کو۔ صاحب ظرف، صاحب دل آدمی تھے، یہ جانتے تھے کہ بیٹی کے باپ پر اس وقت کیا بیت سکتی ہے جب نکاح ہونے کے بعد دولہا غائب ہو جائے۔ تیار ہوئے، باہر نکلے اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ غیاث الدین کے ساتھ اور بھی بہت سے افراد تھے۔ دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا، گلے لگ گئے۔ غیاث الدین ایک ایک کا تعارف کرانے لگا۔ ملک اللہ نواز سب سے بڑی خوش اسلوبی سے ملے۔ بیگم کو بھی بلا لیا کیونکہ مہمانوں میں خواتین بھی تھیں۔ فاخرہ بیگم، ناصرہ اور غیاث الدین کی بیگم، ذکیہ بیگم سے ملیں۔ بڑی محبتوں کا اظہار کیا اور پھر اس کے بعد مزید گفتگو شروع ہوئی۔ ملازموں سے ان لوگوں کے کمروں کی تیاری کے لئے کہا گیا۔ غیاث الدین نے کہا۔

"ہاں بھئی، ذرا کچھ وقت قیام کرنا پڑے گا...... بڑے اہم مشورے کرنے ہیں۔"

"کہتے کیوں ہو دوست! یہ بات کوئی کہنے کی ہے۔ اگر تمہارا ارادہ نہ بھی ہوتا تب بھی تمہیں جانے کون دیتا۔ آپ سب لوگوں کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے غریب خانے کو رونق بخشی۔"

"اب مطلب پر آ جانا چاہتا ہوں۔ ساری باتیں بعد میں ہو جائیں گی۔ جو بات تم سے کرنا چاہتا ہوں وہ ضروری ہے۔"

"کوئی دل دکھا دینے والی بات نہ کر دینا غیاث الدین!" ملک اللہ نواز نے آزردہ لہجے میں کہا۔

"یار! اب کیا کہوں تم سے، میں تو اس بات پر بھی تیار ہوں کہ عرشیہ کو تمہارے ہی گھر بھیج دوں۔ تمہاری بہو ہے، تمہاری امانت ہے، یہیں زندگی کاٹ دے گی۔ خداوند عالم رب نواز کو زندگی عطا کرے۔ تمام خوشیاں نصیب کرے۔ آئے گا...... ضرور آئے گا۔ اگر بیس سال کے بعد بھی آئے تو عرشیہ اس کا یہیں انتظار کرے گی۔ اصل میں جواد حسین! میرے دوست اللہ نواز کا خیال ہے کہ میں حالات سے اکتا گیا ہوں اور کسی وقت مطالبہ کر سکتا ہوں کہ میری بیٹی کو آزادی دلا دی جائے۔ انہوں نے یہ الفاظ کبھی منہ سے ادا نہیں کئے لیکن میں بھی دنیا کے ساتھ ہوں۔ دنیا دیکھی ہے میں نے۔ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ ارے

میرے بھائی! بیٹی ہے میری۔ کیوں مجھے ذلیل کرتے ہو۔ میں نے تو کبھی کچھ نہیں کہا تم سے۔ گردن پر چھری پھیر دو اس کی۔ تمہاری امانت کو پال رہا ہوں، جب دل چاہے بلا لینا اپنے پاس۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو...... بلاوجہ جذباتی کر دیتے ہو۔ کچھ اطلاعات ملی ہیں اور کچھ ایسے مسائل آ گئے ہیں جنہیں بتانا ضروری ہے۔" غیاث الدین نے کہا اور اس کے بعد الف سے یے تک ساری تفصیل ملک اللہ نواز کو بتا دی۔ ملک اللہ نواز سینے پر دونوں ہاتھ رکھے یہ داستان سن رہے تھے۔ بہت جذباتی ہو گئے تھے وہ۔ بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا، چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔

"ہلا کر رکھ دوں گا لاہور کو...... کیا سمجھا ہے ان لوگوں نے...... ٹھیک کیا اس نے، سکول جلا دیا۔ لوگوں نے بلاوجہ احمقانہ تصورات قائم کر رکھے ہیں، اس لئے نہیں کہہ رہا یہ بات کہ میں خود ان حالات میں ملوث ہوں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ایک طوائف عورت ہی تو ہوتی ہے، اسے کیوں غیر انسانی حیثیت دے دی گئی ہے؟ کیا قیامت آ جاتی اگر وہ لڑکا اس سکول میں تعلیم حاصل کر لیتا؟ کیا ہو گیا ہے، چھ سکول بنوا کر کھڑے کر دوں گا ایسے۔ بات کرتا ہوں اعلیٰ حکام سے، کیا سمجھا ہے انہوں نے میرے رب نواز کو...... ارے واہ بھئی واہ، ہم نے جتنی شرافت سے زندگی گزاری، کون گزارتا ہے اس طرح؟ اور اب یہ جرأت آ گئی لوگوں میں کہ انہوں نے...... دیکھتا ہوں کہ کون سی پولیس پیچھے پڑی ہے...... کون پکڑتا ہے اسے؟...... دیکھتا ہوں سب کو۔" ملک اللہ نواز جلال میں آ گئے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"پھر وہ بچہ تمہارے پاس ہے؟"

"ہاں......"

"ٹھیک ہے...... میں پہلے ایک مرحلے سے نمٹ لوں، اس کے بعد ملک بھر کے اخبارات میں اکرام کی تصویریں چھپوا کر اسے آواز دوں گا، اس سے کہوں گا کہ بیٹے باپ کو اور جتنی سزا چاہو دے لو، تمہاری امانت ہمارے پاس موجود ہے۔ تم لوگ سمجھ رہے ہو گے، میں بھی سمجھ رہا ہوں اس کے جذبات کیا ہیں۔ وہ صرف اس احساس کا شکار ہے کہ ایک اور طوائف زادے کو مشکل سے نکال دے۔"

"اب ایک اور انکشاف ہے آپ کے لئے...... نظام الدین صاحب کو جانتے ہیں آپ؟ چوہدری نظام الدین؟"

''نام ذہن میں نہیں آرہا۔''

چوہدری نظام الدین کے بارے میں ملک اللہ نواز کو تفصیل بتائی گئی اور پھر غیاث الدین نے کہا۔

''بہت سے محاذوں پر کام کرنا ہے۔''

''میں تم سے ایک بات کہوں غیاث الدین! پہلے تو ہم سب مل کر رب نواز کی گلو خلاصی کراتے ہیں۔ میں کل ہی اسلام آباد روانہ ہو جاتا ہوں اور سارے کام شروع کرا دیتا ہوں۔''

''ہم میں سے کوئی......''

''نہیں، نہیں...... بالکل نہیں۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ مجھے معاف کرنا، اب تمہاری خاطر مدارت نہیں کرسکوں گا اس لئے کہ پہلے......''

''ہم سب اپنی خاطر مدارت خود ہی کریں گے آپ کی طرف سے۔ آپ اپنے کام کا آغاز کیجئے اور خدا کے لئے اپنے آپ کو بھی سنبھالے رکھئے، بالکل جذباتی نہ ہوں۔''

''نہیں ہوں گا...... بالکل بے فکر رہو'' ملک اللہ نواز نے کہا اور اس کے بعد نجانے کب تک یہ مجلس مشاورت جاری رہی۔

○●○

کوثر جہاں اب خوف کی منزل میں داخل ہوگئی تھی۔ کہیں سے کوئی اطلاع نہیں آرہی تھی، کیا ہوا، کیا ہوگیا...... اللہ نہ کرے یہ لوگ گرفتار تو نہیں ہوگئے؟ خبریں کہاں سے ملیں؟ کون ہے خبریں لانے والا؟ پھر ہیرا منڈی کا ماحول دلدار گھوڑے کی آمد سے خراب سے خراب تر ہوتا جارہا تھا۔ بہت سے شرفاء نے ہیرامنڈی کا رخ کرنا بند کردیا تھا۔ کوٹھوں پر چہ میگوئیاں ہورہی تھیں لیکن اس کا حل کسی کے پاس نہیں تھا۔ بس یہی باتیں ہوتی رہتی تھیں کہ دلدار گھوڑے نے یہ کیا، دلدار گھوڑے نے وہ کیا۔ شمشیرہ بیگم کے منہ سے تو ایک بار بھی اکرام کے لئے کوئی لفظ نہیں نکلا تھا۔ کوثر جہاں بڑی دلبرداشتہ تھی۔ بارہا اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ سب لوگ ایک بند مٹھی ہیں اور وہ تسنیم کے ساتھ اس گھر میں تنہا ہے۔ غزالہ اور شبانہ شمشیرہ بیگم کے اشاروں پر چلتی تھیں اور شمشیرہ بیگم کی آنکھوں میں کوثر جہاں کے لئے کبھی وہ تاثرات نہیں ابھرتے تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ کوثر جہاں نے ان کی کئی آسامیاں

نکال دی تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ رب نواز کو کوس کوس کر کہتی تھیں کہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔ کوثر جہاں کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ اب وہ عمر کی ڈھلان کی جانب آرہی ہے۔ کئی بار اشاروں کنایوں میں اس سے کہہ چکی تھیں کہ اب تسنیم کی تربیت شروع کردی جائے۔ اس ننھی سی عمر میں اگر تھرکنا شروع کردے گی تو بڑی ہوکر ماہر رقاصہ بن جائے گی۔ گلوکاری کے بارے میں بھی انہوں نے یہی کہا تھا کہ ڈھائی سال کی عمر میں کوثر جہاں کو ریاض شروع کرا دیا گیا تھا اور استاد مٹھن خان نے اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ یہ ساری باتیں کوثر جہاں کے دل کو خون کے آنسو رُلاتی تھیں۔ اکرام کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا اور اس کے پس منظر میں جو چہرہ ابھرتا تھا، وہ تو بس ایک آہ بن کر رہ گیا تھا۔ اب تو اسے یہ بھی امید نہیں تھی کہ وہ چہرہ کبھی نگاہوں کے سامنے دوبارہ آئے گا۔ ساری دعائیں بے اثر رہی تھیں۔

شمشیرہ بیگم نے ایک مجرے کی سائی لے لی تھی۔ صابر شیخ نامی کوئی صاحب تھے لاہور کے دولت مندوں میں۔ ان کے ہاں کسی تقریب میں ناچنا تھا۔ شاہ جی تو چلے ہی گئے تھے، اکرام بھی نہیں تھا حالانکہ اکرام کی خواہش تھی کہ کوٹھے پر آنے والے آنا چاہیں تو آجائیں لیکن کوثر جہاں کہیں مجرا کرنے نہ جائے۔ البتہ کوثر جہاں حالات سے خوب دکھی ہوئی تھی کہ اس نے شمشیرہ بیگم سے کوئی نیا جھگڑا لینا مناسب نہیں سمجھا اور مجرے کی بات سن کر خاموش ہوگئی۔ شمشیرہ بیگم کو بھی یہ احساس تھا کہ اب کوثر جہاں کی کمر سے دیوار ہٹ گئی ہے اب بھلا کیا اکڑ دکھائے گی۔ حالانکہ ماں تھی لیکن دولت کسی کی ماں نہیں ہوتی۔ کوثر جہاں کے مسلسل انکار نے شمشیرہ بیگم کے دل میں جو کدورتیں پیدا کردی تھیں اب وہ عملی شکل میں ظاہر ہو رہی تھیں۔ ایک ذرا سا احتجاج کیا تھا کوثر جہاں نے۔ کہنے لگی۔

''اماں! اگر مناسب سمجھیں تو شبانہ اور غزالہ کو لے جائیں۔ میرا جانا کیا ضروری ہے؟''

''تم یہاں گھر میں کیا کروگی؟''

''تسنیم اکیلی رہ جائے گی۔''

''عادت پڑنی چاہئے اسے اکیلا رہنے کی۔ دیکھو برا مت ماننا، تمہاری حرکتوں نے مجھے جو نقصانات پہنچائے ہیں میں انہی کا خسارہ پورا نہیں کرسکی۔ اب اگر تم نے کوئی ٹیڑھی میڑھی بات کی تو قسم اللہ کی صرف ایک کام کروں گی۔ وہ کوتوال جی تو چلے گئے، اب جو کوتوال جی

آئے ہیں ناں وہ صرف پیسوں کے شوقین ہیں۔ دلدار گھوڑے کو کچھ دے دلا دوں گی اور کہہ دوں گی کہ تمہیں ٹھیک کر دے۔ ہر بات میں ناک منہ چڑھانا، یہاں نہیں جاؤں گی وہاں نہیں جاؤں گی، یہ نہیں کروں گی وہ نہیں کروں گی۔''

کوثر جہاں نے خوفزدہ نگاہوں سے شمشیرہ بیگم کی طرف دیکھا اور بولی۔

''اماں! تم دوسروں کے ہاتھوں مجھے نقصان پہنچواؤ گی؟''

''تمہارے ہاتھوں جو ہم سب کو نقصان پہنچے ہیں وہ کون بھرے گا؟ کون کون نہ آیا یہاں...... کیا کیا تقدیر کے دروازے نہ کھلے لیکن تم خود ان دروازوں کو لات مار مار کر بند کرتی رہیں۔ جوتی اٹھاؤں گی اور سر پر اتنی لگاؤں گی کہ گن نہیں سکو گی کوثر جہاں بیگم! اب میرے اوپر کوئی دھونس نہیں رہی ہے۔ جانا پڑے گا تمہیں۔''

''اماں! جانے کو تو خیر میں کہہ چکی ہوں کہ جاؤں گی۔ لیکن نہ جانا چاہوں تو تم مجھے لے جا نہیں سکو گی۔''

''رن پڑوائے گی گھر میں...... اور کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ اب صورتحال میرے لئے بھی ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔''

کوثر جہاں خاموش ہو گئی۔ منہ کھولنا عذاب ہو گیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت پہلی بار دل میں اتری تھی کہ اگر شمشیرہ بیگم کی بات نہ مانی تو دلدار گھوڑا آ سکتا ہے۔ وہ اس پر جوتی بھی اٹھا سکتی ہیں۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ بیٹا جیسا بھی تھا، دیوار تھا۔ شاہ جی کی بات تو بعد کی ہے۔ کوثر جہاں کو وہ دن یاد آنے لگے جب کئی بار اکرام نے کوثر جہاں کی طرف آنکھ اٹھانے والوں پر چاقو کھول لیا تھا۔ لیکن اب...... کہاں ہو اکرام! کہاں ہو؟ کہاں ہو میرے بچے...... بڑی دلبرداشتہ ہوں تمہارے لئے...... کہاں ہو اکرام! بہت اداس ہوں میں...... بہت اداس ہوں تمہارے لئے اکرام! کہاں ہو میرے بچے؟

مجرے میں جانا پڑا۔ صابر شیخ تھے تو رئیس آدمی لیکن کسی گھٹیا درجے کے گھرانے کے معلوم ہوتے تھے۔ گھر کی محفل بھی ایسی ہی تھی۔ گو عظیم الشان انتظام کیا گیا تھا اور بھی طوائفیں تھیں لیکن کوثر جہاں نے معمول کے مطابق اپنا رنگ جمایا تو صابر شیخ اس پر لٹو ہو گئے۔ مجرے کا اختتام ہوا۔ لین دین ہوا۔ صابر شیخ کا ایک ہرکارہ شمشیرہ بیگم کے پاس پہنچ گیا۔

''یہ جو سامنے کھڑی ہیں ان سے آپ کا کوئی تعلق ہے؟''

''ہاں...... اس کا نام کوثر جہاں ہے۔ میری بیٹی ہے۔''

''شیخ صاحب کا کہنا ہے کہ آپ انہیں ہمارے گھر چھوڑ جائیے۔''

''ایں......؟'' شمشیرہ بیگم چونک پڑیں۔

''ہاں...... وہ شیخ صاحب کو بہت پسند آئی ہیں۔ آپ بے فکر رہیں، جو مانگیں گی ملے گا۔ شیخ صاحب منچلے آدمی ہیں، بہت کم کسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں مگر ہوتے ہیں تو ہر قیمت پر اسے حاصل کر لیتے ہیں۔''

''بات کرواؤ ہماری شیخ صاحب سے۔'' شمشیرہ بیگم نے کہا۔

''مجھ سے ہی بات کر لیں تو زیادہ بہتر ہے۔''

''بات اصل میں یہ ہے کہ ہم آئے ہیں مجرے کے لئے۔ بچی بھی تیار نہیں ہوگی اس وقت۔ اور پھر شیخ صاحب سے کہیں کہ غریب خانہ حاضر ہے۔ ہیرا منڈی میں آئیں، شیخ صاحب کا ہم استقبال کریں گے۔ کوثر جہاں تو ان کی غلام ہے۔ لیکن ہر بات کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ہماری طرف سے دست بدستہ عرض کر دیں گے کہ آج ایسا نہ کریں، کل تشریف لے آئیں۔ ہم چشم براہ رہیں گے۔''

شیخ صاحب نے آنے کا وعدہ کر لیا اور شمشیرہ بیگم خوشی خوشی چل پڑیں۔ راستے میں بول پڑی تھیں۔

''کوثر جہاں! تقدیر کا دروازہ ایک بار پھر کھلا ہے...... اب یہ تم پر ہے کہ اسے بھی لات مار دو۔'' کوثر جہاں نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ اس وقت تو کچھ نہ بولی۔ جانتی تھی کہ شمشیرہ بیگم زبان دراز ہیں، یہیں پر شروع ہو گئیں تو تانگے والوں کے سامنے بے عزتی ہو گی۔ لیکن دل میں کرید پیدا ہو گئی تھی۔

صبح ہی صبح شمشیرہ بیگم نے وہی کیا جس کا کوثر جہاں کو خدشہ تھا۔ خود ہی کوثر جہاں کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ ننھی سی تسنیم چیزیں اٹھا اٹھا کر ادھر سے اُدھر رکھ رہی تھی۔ اس طرح بڑھی تھی وہ کہ یقین ہی نہیں آتا تھا۔ اس کی طرف تو کسی نے توجہ ہی نہیں دی تھی، دوسرے ہی مسائل اتنے تھے کہ غور ہی نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن وہ اپنی عمر کی منازل آہستہ آہستہ طے کر رہی تھی اور اچھی خاصی نظر آنے لگی تھی۔ شمشیرہ بیگم نے اسے دیکھا اور مسکرائیں اور اٹھا کر

سینے سے لگا لیا۔ کوثر جہاں جانتی تھی کہ شمشیرہ بیگم کس قدر فتنہ ساز ہیں۔ دنیا داری تو انہیں ہی آتی ہے۔ اس وقت تسنیم سے جو محبت کا اظہار کیا جا رہا تھا اس کی وجہ صابر شیخ صاحب تھے جنہوں نے اسے طلب کیا تھا۔ شمشیرہ بیگم نے آہستہ سے کہا۔

''کوثر جہاں! رات کو تم سے تانگے میں کچھ کہا تھا میں نے۔ ہم جس مجرے میں گئے تھے، صابر شیخ ہیں اس گھر کے مالک۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ کیسا اعلیٰ آدمی ہے۔ اللہ کے فضل سے عمر کی اس منزل میں آنے کے باوجود اب بھی ہزاروں پر بھاری ہو تم۔ کچھ کر لو بیٹی! تمہارے سامنے اکرام کا معاملہ ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے لئے دولت درکار ہوتی ہے۔ ایک کمبخت ایسا پھانس لو جو کچھ دے مرے۔ میری بات مان لو کوثر جہاں! ساری زندگی اپنی من مانی کرتی رہی ہو۔''

''اماں! خدا تمہیں عقل دے، تمہاری ہوس ختم کر دے۔ سب کچھ تو ہے ہمارے پاس۔ اندھی ہوں میں، جانتی نہیں ہوں؟ چھ کوٹھیاں خرید کر پھینک سکتی ہو تم اگر چاہو تو۔ کیا کرو گی ایک اور کوٹھی کا؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا...... ہم کیا بن باس لے رہے ہیں؟ کچھ کر کے نہیں دکھاؤ گی؟ ابھی عمر کتنی گزری ہے، ایسے ہی پال لو گی بیٹی کو؟ میری جگہ لے لو گی۔ میں ابھی مرنے کی نہیں کوثر جہاں بیگم! میں اپنے ہی مقام پر رہوں گی۔ تمہارے نخرے اب حد سے زیادہ بڑھ چکے ہیں۔''

''وہ تو ساری باتیں ٹھیک ہیں اماں! پر آپ کو ایک بات کا پتہ ہے کہ اکرام نہیں چاہتا کہ میں مجرا کروں۔ میں نے آپ کی ساری باتیں مان لیں، کوئی جھگڑا نہیں کیا۔ لیکن اب اماں! ایک فیصلہ میں کر چکی ہوں۔ ناچتی رہوں گی جب تک آپ مجھے نچائیں گی۔ لیکن بس ناچوں گی، کسی کو میرے قریب مت لانا اماں! ورنہ کچھ نہ کچھ کر بیٹھوں گی۔ یہ بات میں آپ کو بتائے دے رہی ہوں۔''

''دماغ تو تمہارا خراب ہو ہی گیا ہے...... میں کہتی ہوں ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے، دل میں آرزو نہیں آتی؟ امنگ نہیں اٹھتی؟''

''جہنم میں جائیں آرزوئیں اور جہنم میں جائیں امنگیں...... اماں! بس میں نے آپ سے کہہ دیا ہے، یہ سب کچھ میرے لئے ممکن نہیں ہے۔''

''لعنت ہے تم پر...... ہمیشہ دماغ خراب کر کے رکھ دیتی ہو۔ دیکھوں گی کیسے ممکن نہیں ہے۔ ارے واہ...... نجانے کیا کچھ سمجھ رکھا ہے مجھے۔ کسی قابل ہی نہیں چھوڑا، جیسے میرا فیصلہ تو کوئی فیصلہ ہی نہیں ہے۔ دیکھو کوثر جہاں بیگم! اپنے ہوش و حواس درست کر لو۔ ابھی رات دور پڑی ہوئی ہے، فیصلہ کر لو۔ رات کو آئیں گے شیخ صاحب۔ مجھے جواب دینا ہے انہیں۔ بتاؤ کیا جواب دوں؟''

''میرا ایک ہی جواب ہے اماں! آج سن لیجئے، کل سن لیجئے۔'' کوثر جہاں نے کہا۔

شمشیرہ بیگم غصے سے پھنکارتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ باہر پہنچیں تو استاد نتھو خان بیٹھے ہوئے تھے۔ نتھو خان کو خاص طور سے بلایا گیا تھا۔ تسنیم اپنے پاؤں چلنے لگی تھی تو سوار ہو گئی تھی اس کی تربیت ذہن پر اور نجانے کیا کیا منصوبے بنانے لگی تھیں...... وہ بھی دھن کی پکی تھیں، اپنی دھن میں سوچتی رہتی تھیں۔ استاد نتھو خان بہت اچھے رقاص تھے چنانچہ ابھی سے تسنیم کو ان کی شاگردی میں دینا چاہتی تھیں۔ استاد نتھو سے بڑے پیار سے ملیں اور بولیں۔

''کہئے استاد! کیسے ہیں؟''

''شمشیرہ بیگم! جیسے بھی ہیں، تمہارے ہیں...... تم سے کبھی گردن ہٹائی ہم نے؟''

''ہاں، بڑی یادیں وابستہ ہیں۔ اچھا ٹھہرو، میں اس بچی کو بلاتی ہوں جس کے لئے میں نے تمہیں تکلیف دی ہے۔''

''کچھ دیر باتیں تو کر لو جانِ من! ہم تو تمہارے پرانے شناسا ہیں۔''

''بچے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے ہیں...... ویسے بھی اب بری بات ہے نتھو خان! سنو، کوئی ہے...... حاجو! اے حاجو...... کہاں مر گئے...... اچھلتے پھر رہے ہو اِدھر سے اُدھر۔ اِدھر آؤ۔''

حاجو اندر آیا تو شمشیرہ بیگم نے اسے حکم دیا کہ تسنیم کو لے آیا جائے۔ حاجو اندر پہنچا تو کوثر جہاں سر جھکائے ہوئے انہی باتوں کے بارے میں سوچ رہی تھیں جو شمشیرہ بیگم اس سے کر کے گئی تھیں۔ حاجو نے کہا۔

''تسنیم کو بلایا ہے شمشیرہ بیگم نے۔''

کوثر جہاں نے گردن اٹھا کر حاجو کی طرف دیکھا اور بولی۔

''کیوں؟''

''وہ نتھو خان آئے ہیں...... استاد نتھو خان۔''

"کیا......؟" کوثر جہاں اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

"ہاں جی...... استاد نتھو خان۔"

"تو پھر تسنیم کا کیا کریں گے وہ؟"

"بلایا ہے شمشیرہ بیگم نے تسنیم کو۔ ان کا ہی تو شاگرد بنانا چاہتی ہیں۔" حاجو نے کہا۔

"کیا......؟" کوثر جہاں کے دل و دماغ میں طوفان برپا ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے در و دیوار ہل رہے ہوں۔ اس نے چشم تصور سے دیکھا کہ تسنیم کے پیروں میں گھنگھرو بندھے ہوئے ہیں، وہ رقصاں ہے۔ ہوس پرست نگاہیں اس کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ کوثر جہاں کے منہ سے بے اختیار انداز میں نکلا۔

"نہیں...... نہیں...... نہیں......"

"کیا مطلب...... منع کر دوں کیا؟" حاجو نے کہا۔

"جاؤ اور منع کر دو حاجو! کہہ دو کہ تسنیم پردہ کرتی ہے۔ وہ غیروں کے سامنے نہیں آئے گی۔"

حاجو منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنس پڑا تو کوثر جہاں نے قریب رکھا ہوا گلدان اٹھا لیا۔ وہ تو حاجو اس قسم کے حملوں کا عادی تھا اور اپنے آپ کو بچانا جانتا تھا ورنہ گلدان نے کھوپڑی ہی پھاڑ دی تھی۔ گھبرا کر بھاگا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ کوثر جہاں پر جنون طاری ہوگیا تھا۔

بہر حال حاجو سیدھا اندر پہنچا۔ شمشیرہ بیگم بھی یہی سمجھیں کہ کوثر جہاں پیچھے پیچھے آرہی ہے۔ نتھو خان بھی انتظار کر رہے تھے۔ حاجو نے کہا۔

"وہ نہیں آرہیں...... کہا ہے تسنیم پردہ کرتی ہے۔"

شمشیرہ بیگم نے چونک کر حاجو کو دیکھا اور بولیں۔ "کیا بک رہے ہو...... کہاں ہے تسنیم...... کہاں ہے کوثر جہاں؟"

"باوا آدم ہی نرالا ہے اس گھر کا تو...... ہم رہ گئے ہیں پتلی گردن والے۔ جسے دیکھو ہم پر رعب جما لیتا ہے۔ بچ گئے، ورنہ کھوپڑی پھٹ گئی تھی۔ ہم تو کہتے ہیں آخر ہم ہیں کیا۔ سازندے ہیں اس گھر کے۔ کسی اور گھر میں جائیں گے، وہاں بھی عزت سے کھائیں گے شمشیرہ بیگم! کوئی عزت نہیں کرتا۔"

شمشیرہ بیگم نے بدحواسی سے نتھو خان کو دیکھا اور بولیں۔ "اے حاجو! کچھ ہوا کیا...... ہوا کیا...... کچھ منہ سے تو پھوٹو۔"

"گلدان کھینچ مارا ہمارے منہ پر...... کہنے لگیں دفع ہو جا یہاں سے، تسنیم بیگم پردہ کرتی ہیں۔ کسی کے سامنے نہیں جائیں گی۔" حاجو نے کہا اور شمشیرہ بیگم حیران نگاہوں سے حاجو کی طرف دیکھنے لگیں۔ نتھو خان نے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی...... کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"اصل میں کوثر جہاں کا دماغ خراب ہوگیا ہے استاد۔ شرافت کا بھوت ایسا سوار ہوا ہے۔ خیر اچھے اچھوں کے بھوت اتار چکی ہوں میں...... شمشیرہ بیگم ہے میرا نام۔ ایسا کرو استاد نتھو خان! تم ایک دو دن آرام کر لو۔ اس دوران میں یہ کام کر لوں۔ پرسوں آجانا۔ تنخواہ تو تمہاری آج سے ہی شروع ہوگئی۔"

"عجیب بات ہے شمشیرہ بیگم! کوثر جہاں تو اچھی لڑکی ہے...... اسے کیا ہوگیا ہے؟"

"چلو اب جاؤ...... میں ذرا کوثر جہاں سے بات کر لوں۔"

استاد نتھو خان کو روانہ کرنے کے بعد شمشیرہ بیگم وہاں سے اٹھیں اور غصے سے پھنکارتی ہوئی کوثر جہاں کے کمرے میں داخل ہوگئیں۔ کوثر جہاں تسنیم کو سینے سے لگائے ہوئے بیٹھی تھی۔ شمشیرہ بیگم نے خونی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آخر تُو چاہتی کیا ہے کوثر جہاں...... کیا کرنا ہے مجھے...... اس گھر میں آگ لگا دوں، راکھ بنا دوں۔ بول، تجھے مار دوں یا خود مر جاؤں...... بتا کون سا کام کروں؟"

"جو جی چاہے کر لو اماں...... بس بہت ہوگیا تماشا۔ پہلے بھی تمہارے کانوں میں یہ بات ڈال چکی ہوں کہ میں تسنیم کو کسی طرح بھی رقاصہ نہیں بنانا چاہتی۔ کیونکہ میرا اکرام یہ نہیں چاہتا۔ وہ اسے پڑھا لکھا کر کسی اچھے گھرانے میں عزت سے رخصت کرنا چاہتا ہے۔ اماں! مجھے اس کی یہ خواہش پوری کرنی ہے۔ تسنیم کو میں ناچ گانا نہیں سکھاؤں گی۔ اکرام ذرا سا اور بڑا ہو جائے تو میں یہ کوٹھا چھوڑ دوں گی تمہارا سمجھی۔ تمہارا کیا ہے، شبانہ اور غزالہ تمہارے ساتھ موجود ہیں۔ اگر ایک میں نہیں ہوں گی تو کیا ہو جائے گا۔ ویسے بھی خدا کا دیا بہت کچھ ہے تمہارے پاس۔"

"ستیاناس ہو جائے تیرا...... ارے تیرا ستیاناس ہو جائے کوثر جہاں! ایسا جی کو جلایا تو

نے کمبخت کہ بس الفاظ میں بیان نہیں کرسکتی۔ ارے ناشکری! تیرا کیا اچار ڈالنا تھا مجھے...... تجھے پال پوس کر کیوں جوان کیا، تیری گردن پیدا ہوتے ہی کیوں نہ دبا دی میں نے...... کیسے رنگین خواب دیکھ رہی ہے پاگل کی بچی...... اس سے پہلے کبھی کسی طوائف کی یہ خواہش پوری ہوئی ہے؟ نسلیں چلتی ہیں ہماری نسلیں۔ اگر چھ نسلیں پہلے کوئی طوائف ہو تو اس کی چھٹی نسل کو بھی طوائف ہی سمجھا جاتا ہے۔ اتنا لکھایا پڑھایا، سمجھایا لیکن آج وہی باتیں کر رہی ہے جو پاگل لڑکیاں کرتی ہیں اور اس کے بعد اندھے کنوئیں میں پناہ لیتی ہیں۔ ارے تُو کیا، تیری اوقات کیا...... مرمٹا وہ سانپ جو تیرے پیٹ سے پیدا ہوا تھا...... جہنم میں چلا گیا...... خدا غارت کرے اس رب نواز شاہ کو جس نے یہ آگ لگائی ہمارے گھر میں۔ اسی دن سے بگڑی ہے تُو کوثر جہاں! جس دن شاہ جی اس محلے میں آیا تھا، کون سا برا دن تھا، وہ دن غارت نہ ہو گیا...... کیا کیا خیال دل میں نہ رکھے میں نے، تُو نے مجھ سے کبھی تعاون نہ کیا۔ جب بھی موقع ملا تُو نے میرے سینے پر ڈنک مارا۔ اب اس زندگی میں نہیں واپس آنے والا وہ، سمجھی...... میں کہے دیتی ہوں۔''

''تم کہے دیتی ہو، ولی اللہ ہو نا تم۔ میرا اکرام زندہ ہے۔ تم ایک طوائف ہو جس کی چھاتی کبھی اولاد کے لئے نہیں دھڑکتی۔ اماں! تم فطری طور پر ایک طوائف ہو، تمہارے اندر ایک ماں تو کیا ایک عورت بھی نہیں جاگ سکتی۔ جو عورت ایک ماں کے سامنے اس کی اولاد کو کوسے وہ عورت ہو ہی نہیں سکتی۔ پتہ نہیں کس مٹی سے تمہارا خمیر بنا ہے...... اور کیا کہوں تم سے۔ اگر خوف نہ ہوتا، غیرت مند نہ ہوتی تو جو کچھ کہتی تم سے سنا نہ جاتا۔''

''اور کیا سنائے گی ذلیل...... اور کیا سنائے گی۔ میں کہتی ہوں، میں نے ہی تجھے پال پوس کر جوان کیا ہے، تیرے حُسن کو پروان چڑھایا ہے اور اب میں ہی اسے مٹی میں نہ ملا دوں تو میرا نام بھی شمشیرہ بیگم نہیں ہے۔ اپنے اتنے ہاتھ بھی نہیں بندھے ہوئے ہیں، چہرے پر تیزاب ڈلوا دوں گی، چوٹی کٹوا دوں گی، بھنوئیں منڈوا دوں گی اور منہ کالا کر کے چھوڑ دوں گی ہیرا منڈی کی گلیوں میں...... دولت خرچ کی ہے میں نے تجھ پر...... رقمیں خرچ کی ہیں، تُو کیا سمجھتی ہے، اگر آج چاہوں تو دلدار گھوڑے کو بلوا کر کہہ دوں کہ اسے ٹھیک کر دے۔ کچھ رقم ہاتھ پر رکھوں گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حد سے آگے بڑھ گئی ہے تُو...... سُن، میں نے نتھو خان کو بلایا ہے کہ بچی کی تربیت ابھی سے شروع ہو جائے اور تُو

نے یہ کہانیاں سنائی ہیں مجھے۔ تسنیم میرے کوٹھے پر میری ملکیت ہے...... یہاں جو کچھ ہے میری ملکیت ہے۔ کوئی اس پر اپنا حق نہیں جما سکتا۔ تیرا کھونٹا اکھڑ چکا ہے، کیا سمجھی۔ وہ رب نواز تیرا کھونٹا تھا نا، اسی سے بندھی ہوئی تھی تُو۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ان لوگوں کے واپس آنے کا...... اپنی موت مر گئے سب کے سب حرام کے پلّے۔ چل، میں جو کچھ کہہ رہی ہوں اس پر عمل کر...... ہٹا دے اسے اپنے پاس سے۔ کل سے نتھو خان آئے گا اور اس کی تربیت ہو گی۔ نہیں تو تُو...... بس دلدار گھوڑے کو بلا کر اس کے حوالے کر دوں گی۔ اگر اصل طوائف ہوں تو جو کچھ کہہ رہی ہوں وہی کر کے چھوڑوں گی۔ سوچ لینا کوثر جہاں! آج سے تیرے اور میرے درمیان ماں بیٹی کا رشتہ تو ختم ہو گیا، کیا سمجھی۔''

کوثر جہاں بے اختیار مسکرا دی اور بولی۔ ''طوائفوں میں رشتے کہاں ہوتے ہیں اماں! چلو ٹھیک ہے، آپ کا جو جی چاہے کریں۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ تسنیم کو طوائف بناؤں۔ لیکن اگر آپ کہتی ہیں تو ٹھیک ہے۔ واقعی میں کہاں آپ کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔''

شمشیرہ بیگم بولیں۔ ''مامتا تو تُو نے ہی میرے سینے سے سلا دی ہے کوثر جہاں! اب وہ ماما نہیں جاگ سکتی۔ کتنے دھوکے کھاؤں تجھ سے...... ساری زندگی دھوکے ہی دیتی رہی ہے۔ ٹیڑھی انگلیاں تُو نے ہی کرائی ہیں مجھ سے۔ اگر شرافت سے مان لیتی تو عزت آبرو سے بات ہوتی۔ لیکن بس خبردار، اب وہ کرنا ہے تجھے جو میں کہوں۔ کسی کے دھوکے میں مت رہنا، رب نواز شاہ کے اور نہ اکرام کے۔ میرے منہ سے برا کہلوایا تُو نے، میں نے خود برا نہیں کہا۔''

''اس کی زندگی کی دعائیں تم ہی کرو گی اماں! تم۔'' کوثر جہاں نے انتہائی نرم اور دھیمے لہجے میں کہا لیکن شمشیرہ بیگم ہزار تجربے کار ہونے کے باوجود کوثر جہاں کی پسپائی کو نہیں سمجھ رہی تھیں...... اس کے منہ سے جو آواز نکل رہی تھی اس میں چھپی ہوئی طوفانی بجلیوں کو نہیں دیکھ رہی تھیں، یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اچھے اچھے محسوس نہیں کر سکتے تھے اس آواز کو جو اس بڑبڑاہٹ میں ابھر رہی تھی۔ شمشیرہ بیگم چلی گئیں۔ وہ بھی اس وقت آپے سے باہر ہی ہو گئی تھیں۔ اگر کوثر جہاں اس سے زیادہ بولتی تو شاید مار پیٹ شروع ہو جاتی۔ لیکن کوثر جہاں کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''اماں! اکرام زندہ ہے...... زندہ رہے گا۔ لاکھ کوسو تم اسے...... وہ میرے دل میں کنول کی طرح کھلا ہوا ہے اماں! دہرا دہرا رشتہ ہے اس سے میرا...... ماں ہوں میں اس کی اور وہ اس کا بیٹا ہے جسے...... جسے میں اس کائنات میں نجانے کیا سمجھتی ہوں۔ اماں! بس اب کھیل ختم ہو گیا۔ آج سارا کھیل ختم ہو گیا۔ ٹھیک ہے، بے وفا، دنیا کے بے وفا لوگو! اپنی ہوس کی آگ مٹانے کے لئے کسی کی دنیا کو برباد کرنے آ جاتے ہو۔ یہ نہیں سوچتے کہ انسان کہیں بھی پیدا ہو، انسان ہی ہوتا ہے۔ گوشت پوست کا وہ لوتھڑا جو سینے میں دل بن کر دھڑکتا ہے، وہ تم لوگوں جیسا ہی ہوتا ہے...... ٹھیک ہے دنیا والو، ٹھیک ہے...... جو کچھ تم نے میرے مقدر میں لکھ دیا ہے وہ میں نے قبول کیا۔'' اس نے محبت بھری نگاہوں سے تسنیم کو دیکھا اور بولی۔

''تسنیم! تیار ہونا بیٹی؟''

''اماں کیا......؟''

''تم تیار ہو؟''

''ہاں تیار ہوں۔'' تسنیم کے منہ سے نکلا اور اسے سن کر کوثر جہاں کا سینہ ہاتھ بھر کا ہو گیا۔

''اکیلی نہیں ہوں میں بیٹی! بیٹے اور بیٹی کی ماں ہوں۔ تم طوائف بے شک پیدا ہوئیں اماں، تم دیکھ لینا تم طوائف ہی رہو گی اور مر جاؤ گی۔ لیکن میری زندگی میں سنہری دن لکھے ہوئے ہیں اماں! یہ سنہری دن میری زندگی میں ضرور آئیں گے۔''

کوثر جہاں نے کچھ سوچ لیا تھا۔ وہ تیاریاں کرنے لگی۔ بس چند چیزیں رکھ لی تھیں جنہیں آسانی سے سنبھالا جا سکے۔ شمشیرہ بیگم کے سامنے لہجہ بدلنے کی کوشش تو صرف ایک عیاری تھی۔ ایسی عیاری جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ اپنی مختصر سی تیاریوں کے بعد وہ مطمئن ہو گئی۔

پھر سورج ڈھلا، شام ابھری اور روشنیاں جل گئیں۔ ہیرا منڈی میں زندگی کا آغاز ہو گیا۔ موت کی بستی زندگی میں تبدیل ہو گئی۔ طبلے کھڑکنے لگے، سارنگیوں کے تار ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونے لگے...... ستار، ہارمونیم سب اپنی جگہ سج گئے۔ کوثر جہاں نے اپنا لباس پہنا اور جب تماش بین جمع ہو گئے تو ان کے درمیان پہنچ گئی۔ چہرے پر کوئی ایسا

تاثر نہیں تھا جس سے کسی کو شبہ ہو سکے۔ شمشیرہ بیگم نے اسے دیکھا، چہرے پر اسی طرح مدھم سی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی جو دیکھنے والوں کو اس طرح نیم جان کر دے جو برسوں نہ بھول پائیں۔ ایسی نرمی، ایسی محبت جیسے تمام تماش بینوں سے گہری دوستی ہو۔ برسوں سے شناسا تھے یہ لوگ، انہی کے درمیان پلی بڑھی اور جوان ہوئی تھی۔ آج ان سب سے رشتے ٹوٹ رہے تھے اور صرف ایک رشتہ قائم ہو رہا تھا...... صرف ایک رشتہ......!

اس نے ایسی تڑپا دینے والی غزلیں سنائیں کہ تماش بین دیوانے ہو گئے۔ سارے پرانے شناسا پاگل ہو گئے تھے...... جو کچھ پاس تھا دے ڈالا۔'' شمشیرہ بیگم حیران حیران سی اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ کوثر جہاں نے انہیں بتا دیا کہ وہ کیا ہے۔ شمشیرہ بیگم تو بس نوٹوں کی رسیا تھیں۔ ایک قدیم تماش بین نے کہا۔

''بخدا آج تو قیامت برپا کر دی ہے شمشیرہ بیگم! کوثر جہاں نے...... اسے ہو کیا گیا ہے...... اس سے پہلے تو یہ محفل ایسے کبھی نہ سجی تھی۔''

شمشیرہ بیگم داد اور تحسین وصول کرتی رہیں۔ آج تاثر بہت اچھا رہا تھا تماش بینوں پر۔ وہ نجانے کیا کیا کہتے ہوئے رخصت ہوئے تھے۔ ان کو جو کچھ ہوا تھا، وہ ایک بالکل الگ ہی حیثیت کا حامل تھا لیکن شمشیرہ بیگم کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ کوثر جہاں جب چاہے رنگ محفل بدل دے۔ کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کوثر جہاں خاموشی سے اپنے کمرے میں گئی، لباس وغیرہ تبدیل کیا اور معمول ہی کے مطابق تسنیم کے قریب لیٹ گئی۔ اس نے روشنی بجھا دی تھی۔ شمشیرہ بیگم کئی بار اس کے کمرے کے دروازے پر آئیں۔ دل چاہتا تھا کہ اس سے کچھ کہیں۔ دن میں جو تلخ کلامی ہوئی تھی، اس کی معذرت کریں۔ لیکن وہ شاید سو گئی تھی۔ آخر میں یہ سوچ کر چلی گئی تھیں کہ کل صبح پچھلے دن کا کچھ نہ کچھ ازالہ کر دیں گی۔ یہ بھی شکر کی بات ہے کہ صابر شیخ کا آدمی نہیں آیا تھا۔

جب رات آدھی کے قریب پہنچ گئی تو کوثر جہاں خاموشی سے اٹھی۔ وہ تھیلا ہاتھ میں لیا، تسنیم کو جگایا اور دبے قدموں دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ تمام کمروں میں مدہوشی کی نیند طاری تھی۔ آہستہ آہستہ زینے کے دروازے پر پہنچی، اندر کی زنجیر ہٹائی۔ سیڑھیاں اتری اور پھر آخری دروازے سے گلی میں نکل آئی۔ گلی کے کنارے کنارے چلتی رہی۔ اور جب ہیرا منڈی سے باہر نکلی تو سکون کی گہری سانس لی۔ ایک عزم

سینے میں زندہ تھا، ایک احساس دل میں پروان چڑھ رہا تھا۔ تانگہ تو کوئی مل نہیں سکتا تھا۔

بہرحال تسنیم ساتھ دے رہی تھی۔ بچتی بچاتی آگے بڑھتی رہی۔ یہ احساس بھی دل میں تھا کہ رات کو پولیس کا گشت ہوتا ہے۔ کہیں پکڑی گئی تو مصیبت کا شکار ہو جائے گی۔ راستے معلوم تھے، لاہور ہی میں زندگی گزاری تھی۔ یہیں سے زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ چنانچہ چلتی رہی۔ اسٹیشن جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ دعائیں مانگتی رہی کہ کوئی تانگہ مل جائے راستے میں لیکن دعائیں ہر وقت قبول نہیں ہوتیں۔ چلتی رہی، چلتی رہی...... ایک دھن تھی، ایک لگن تھی۔ راستوں کا تعین نہیں کیا تھا...... کم از کم اس سلسلے میں سڑکیں تعاون کرنے والی ثابت ہوئیں۔ پھر جب اسٹیشن نظر آیا تو اس کا دم اکھڑ رہا تھا۔ سانس تھی کہ دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ ریلوے اسٹیشن کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں بیٹھنے کی جگہ تھی۔ کون سی ریل کہاں جاتی ہے ابھی تک اس کا تصور ذہن میں نہیں ابھرا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔ دم لے لے تو دیکھے۔ سامان کے تھیلے کو تکیہ بنا کر ایک طرف رکھا اور تسنیم کو لٹا دیا۔ خود نڈھال سی ایک سمت بیٹھ گئی۔ معصوم تسنیم ایک لمحے میں سو گئی تھی۔ آدھی رات کے اس حصے میں بھی ریلوے اسٹیشن پر اچھی خاصی رونق تھی لیکن سب لوگ سوئے سوئے سے محسوس ہو رہے تھے۔ بس وہ جاگ رہے تھے جنہیں کہیں سفر کرنا تھا۔ کوثر جہاں کو پرواہ نہیں تھی کہ کون سی ریل کہاں جاتی ہے۔ بس جو جہاں مل جائے، لاہور چھوڑنا تھا۔ لاہور اب اس کے لئے دشمنوں کا شہر بن کر رہ گیا تھا۔ شمشیرہ بیگم سے بڑی دشمن اس کی اس کائنات میں اور کوئی نہیں تھی۔ سوچ اور سمجھ کے سارے راستے بند ہو گئے تھے۔

بہت دیر آرام کرنے کے بعد وہ ریلوے ٹکٹ گھر پہنچی اور وہاں سے ریل کے بارے میں معلومات حاصل کی۔

''کہاں جانا ہے بہن؟'' اندر بیٹھے ہوئے ایک داڑھی والے شخص نے پوچھا۔

''وہ...... وہ...... کون سی ٹرین آنے والی ہے؟'' اس نے سوال کیا اور جواب ملا تو اس پر غور ہی نہیں کیا، بس ٹکٹ کی رقم آگے بڑھا دی تھی۔ ٹکٹ بن گیا اور وہ واپس اپنی جگہ آ بیٹھی۔ پھر بہت زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ریلوے پلیٹ فارم پر ہنگامہ خیزی ہونے لگی۔ کوئی ریل آ رہی تھی۔ کوثر جہاں کو تو صرف اس وقت لاہور چھوڑنا تھا، کہیں بھی نکل جائے،

کوئی فکر نہیں تھی۔ چنانچہ جب ریل پلیٹ فارم پر لگی اور لوگ اترنے لگے تو اس نے ایک زنانہ ڈبہ تاک لیا اور کچھ لمحات کے بعد وہ اس زنانہ ڈبے میں منتقل ہو گئی۔ بہت سی عورتیں وہاں موجود تھیں۔ بچے سو رہے تھے۔ عورتیں بھی عموماً سو رہی تھیں۔ کوثر جہاں کو بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ سب سے پہلے اس نے تسنیم کو ایک جگہ بٹھایا اور پھر خود سکڑ کر بیٹھ گئی۔ پھر ریل نے سیٹی بجا دی اور پھر آہستہ آہستہ پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔

کوثر جہاں کی آنکھیں رات کی تاریکیوں میں چمکتی ہوئی مدھم روشنیوں پر جمی ہوئی تھیں جو اسے نجانے کیا کیا کہانیاں سنا رہی تھیں۔ شاید آنے والے وقت کی کہانیاں یا اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی۔ رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ نیند کا بھلا آنکھوں سے کیا گزر ہو۔ البتہ تھوڑی دیر کے بعد تسنیم گہری نیند سو گئی تھی۔ شکر ہے جگہ مل گئی تھی ورنہ بڑی مشکل پیش آتی۔ کمپارٹمنٹ میں موجود تقریباً تمام ہی خواتین سو رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے کبھی کبھی چونک کر رو پڑتے اور کچھ لمحات کے لئے زندگی بیدار ہو جاتی لیکن پھر وہی ماحول، وہی خاموشی، وہی سناٹا...... کھڑکی سے باہر رات بھاگ رہی تھی اور کوثر جہاں کے ذہن میں گہری سوچیں گردش کر رہی تھیں۔ گھر چھوڑ دیا تھا اور اس کے بعد کے حالات کے خوفناک تصور نے ذہن پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

زندگی بہت محدود رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ گھر سے باہر نکلی تو کسی مجرے کے سلسلے میں رئیسوں اور نوابوں کی ڈیوڑھیوں تک۔ لیکن اس وقت بہت سے لوگ ساتھ ہوا کرتے تھے۔ تنہا تو کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ یہ زندگی کا پہلا سفر تھا جس کا اختتام نجانے کہاں ہوگا۔ دل میں خوف کی لہریں پیدا ہونے لگیں۔ اس وسیع و عریض دنیا میں کہیں بھی کوئی شناسائی نہیں ہے اور اس بات کو بھولا نہیں جا سکتا کہ عورت چاہے اس کا تعلق کسی بھی جگہ سے ہو، تنہا ہو تو غیر محفوظ ہے۔ میرے ساتھ تو میرا بیٹا بھی نہیں ہے...... کاش تسنیم بھی بیٹا ہی ہوتی۔

اسے ان تمام پریشان کن خیالات کے باوجود ہنسی آ گئی۔ طوائفوں کے کوٹھوں پر بیٹیوں کی آرزو کی جاتی ہے۔ میں پہلی طوائف ہوں جو بیٹے کی تمنا کر رہی ہے۔ آنکھوں میں اکرام کا چہرہ آ گیا اور کوثر جہاں اس کے میٹھے تصور میں کھو گئی۔ لیکن پھر فوراً اسے تصورات کے جال سے نکلنا پڑا۔

ہائے...... کہاں جاؤں گی میں...... کس طرح اپنے آپ کو اس دنیا میں ضم کر سکوں گی۔

بڑی مشکلات پیش آئیں گی۔ لیکن اب اس دنیا کی مشکلوں میں قدم رکھ ہی دیا ہے تو ہمت سے کام لینا ہوگا...... صرف ہمت ہی سے نہیں بلکہ چالاکی سے۔

انہی سوچوں میں رات بیت گئی۔ صبح کے اجالے پھیلنے لگے۔ ہیرا منڈی کے اس کوٹھے سے کبھی صبح اتنی حسین نظر نہیں آئی تھی۔ یہ آزاد ماحول تھا، کنواری صبح تھی جو پہلی بار اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزری۔ ڈبے میں زندگی جاگنا شروع ہوگئی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک تیز طرار سی خاتون نے منہ پھاڑ کر جمائی لی پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کچھ ٹٹولنے لگیں۔ نیچے چھوٹا سا پاندان رکھا ہوا تھا۔ غلیظ منہ میں پان کی گلوری بنا کر ٹھونس لی۔ کوثر جہاں نے ایک دم رخ تبدیل کرلیا تھا۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، ایک کوثر جہاں ہی جاگ رہی تھی۔ نگاہیں ملتے ہی مسکرادیں۔

''پان کھاؤ گی؟'' انہوں نے سوال کیا اور کوثر جہاں نے ہونٹوں پر اخلاقی مسکراہٹ پیدا کر کے منع کردیا۔

''بس بی بی...... میری تو یہی کیفیت ہے کہ جب تک منہ میں پان نہ رکھ لوں، آنکھیں ہی نہیں کھلتیں۔ یہ میری بچپن کی عادت ہے۔''

''جی۔'' کوثر جہاں نے نرم لہجے میں کہا۔

''کہاں جارہی ہو؟'' خاتون نے فرصت سے کاروبار شروع کردیا۔

''وہ جی بس ذرا اپنے...... اپنے ماموں کے ہاں جارہی ہوں۔'' کوثر جہاں بھلا کسی شہر کا نام کیا لیتی۔ خاتون بھی شاید اس جواب سے مطمئن ہوگئی تھیں یا انہوں نے صرف سوال برائے سوال کیا تھا، جواب کی ضرورت مند نہیں تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر بولیں۔

''ہاں، میں حیدرآباد جارہی ہوں۔ وہاں میرا بیٹا اور بہو رہتے ہیں۔ اصل میں بات وہی ہے کہ رشتے دار رشتے دار ہی ہوتے ہیں۔ تین بیٹے ہیں میرے اللہ کے فضل سے۔ ''کمبخت مارے فرنٹ ہوگئے ہیں مجھ سے اور اس کی وجہ جانتی ہو کیا ہے؟''

''نہیں۔'' کوثر جہاں نے کہا۔

''بس کمبخت ماروں کو غیر گھرانوں میں بیاہ دیا تھا۔ غیر لڑکیاں آگئیں، بس پھر ناک چوٹی کے چکر میں پڑگئیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ جب اپنا ہی کھوٹا کمزور ہو تو دوسروں کی شکایت کیا کی جائے۔ بیٹے بھی انہی کے چکروں میں پھنسے ہوئے ہیں، میں بھی

اب لوٹ کر نہیں آؤں گی کبھی لاہور۔ بڑے بیٹے کے پاس رہوں گی۔ حیدرآباد میں جو میری بڑی بہو ہے وہ میرے سگے ماموں کے سالے کی لڑکی ہے۔ وہ میرا بڑا خیال کرتی ہے۔ تھوک آئی میں تو سب کے منہ پر...... اب عیش کروں گی حیدرآباد جاکر۔''

''جی، جی...... بعض اوقات ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''تم کہاں جارہی ہو...... بتایا نہیں تم نے؟'' خاتون پھر اس جانب متوجہ ہوگئیں۔ کوثر جہاں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ کہیں جارہی ہے لیکن خاتون نے یہ خیال اچانک ہی اس کے ذہن میں بیدار کردیا تھا۔ کم از کم راستے کے ایک شہر کا نام تو علم میں آیا۔ کہنے لگی۔

''بس میرے بھی کچھ رشتے دار رہتے ہیں حیدرآباد میں۔''

''حیدرآباد میں؟''

''ہاں......''

''کون سے محلے میں؟''

''محلے کا نام تو مجھے یاد نہیں۔''

''تو پھر کیسے جاؤ گی ان کے ہاں؟''

''خط لکھ دیا تھا...... بس کوئی نہ کوئی لینے آجائے گا۔''

''اچھا اچھا...... پھر تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اچھا خاصا بڑا شہر ہے ہمارا حیدرآباد۔''

''وہاں سرائے اور ہوٹل وغیرہ بھی ہوں گے؟''

''سرائے......؟'' خاتون نے ناک پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے کہا۔

''ہاں...... میرا مطلب ہے جیسے کوئی مسافر وغیرہ جائے تو اس کے ٹھہرنے کی جگہ۔''

''تمہیں کیا ضرورت ہے اس کی؟'' خاتون نے مشکوک نگاہوں سے کوثر جہاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میرا مطلب ہے کہ کوئی سرائے وغیرہ تھی جس کے برابر میں رہتے تھے میرے رشتے دار۔''

''اچھا اچھا...... بابو کی سرائے ہوگی۔ ہر جگہ ہوتی ہے۔ مگر تم عجیب ہو، کسی جگہ کا نام تک یاد نہیں تمہیں۔''

"بس جی کیا بتاؤں...... نام یاد کرنے میں بھی ذرا دقت ہوتی ہے۔"

"میاں کیا کرتا ہے تمہارا؟" خاتون نے سوال کیا اور کوثر جہاں ایک بار پھر بھونچکی ہو گئی۔ جان چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھیں وہ...... ساری معلومات حاصل کر لینا چاہتی تھیں۔ لیکن اب تو سنبھالنا ہی تھا۔ نجانے کتنی باتیں سننے کو ملیں گی، نجانے کیسی کیسی باتوں کے جواب دینے پڑیں گے۔

"نوکری کرتے ہیں بس لاہور میں۔"

"کتنے بچے ہیں؟"

"دو۔" کوثر جہاں کو اب اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ خدا کا شکر تھا کہ دوسری خواتین بھی آہستہ آہستہ جاگنے لگیں۔ ان میں سے ایک ان کی کوئی شناسا بھی موجود تھیں۔ انہوں نے خاتون سے پانی کا سوال کر ڈالا اور وہ پاندان تلاش کرنے لگیں۔ کوثر جہاں نے سوتی ہوئی تسنیم کے بالوں کو سنوارا جو پیشانی پر آ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کا رنگ جاگ اٹھا تھا۔

اب کوثر جہاں کے ذہن میں صرف حیدر آباد تھا۔

اسٹیشن آتے رہے اور پھر حیدر آباد بھی آ ہی گیا۔ خاتون نے اپنا سامان سنبھالنا شروع کیا تو کوثر جہاں بھی ہوشیار ہو گئی۔ اگلا اسٹیشن حیدر آباد کا ہی تھا۔ کوثر جہاں بھی اسی اسٹیشن پر اتر گئی۔ ریلوے پلیٹ فارم پر بڑی رونق تھی۔ شہر بھی خوب بڑا معلوم ہوتا تھا۔ اترنے والے مسافر جلدی جلدی اترنے اور چڑھنے لگے۔ خاتون بھی مسافروں کی بھیڑ میں گم ہو گئیں۔ ویسے بھی اب انہیں اس کا خیال بھی نہیں رہا تھا۔ سرِ راہ ملاقات بھی کوئی ملاقات ہوتی ہے۔

کوثر جہاں، تسنیم کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور ریلوے پلیٹ فارم سے باہر نکل آئی۔ انسانوں کا ایک سمندر موجزن تھا...... لاتعداد مکانات، دکانوں کی قطاریں لیکن ان میں کوئی ایسا ٹھکانہ نہیں تھا جو اس کا اپنا ہو۔ سرائے وغیرہ میں مرد تو جا کر ٹھہر سکتے ہیں لیکن ایک جوان عورت، ایک ننھی سی بچی اگر سرائے میں رہنے کا تصور کرے تو خود سرائے والوں کو عجیب سا محسوس ہو۔ کیا کروں...... کون سا ٹھکانہ بناؤں اپنے لئے؟ یہ تو سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ زندگی میں کبھی کسی ہوٹل کا رخ نہیں کیا تھا۔ بھلا طوائفوں کو

ہوٹلوں سے کیا دلچسپی۔ ہاں اگر کوئی تماش بین ساتھ گھمانے لے جائے تو اس سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے۔ لیکن اتفاق کی بات یہ ہے کہ کوثر جہاں کو کبھی ایسے مرحلے سے نہیں گزرنا پڑا تھا۔ گھر سے تو بہرحال نکلنا تھا، بہتر تھا کہ کوئی شناسائی ہوتی۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا میں بس وہ ایک تنہا ذات ہے جس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے...... چلتی رہی، کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اگر دھوپ ہوتی تو حیدر آباد کی گرمی تو مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ البتہ پھر بھی فضا میں حبس سا طاری تھا۔ چلتے چلتے بہت دور نکل آئی۔ تسنیم تھک گئی تھی، کہنے لگی۔

"باجی! بس اب مجھ سے نہیں چلا جا رہا۔"

"بس تھوڑا سا اور تسنیم...... تھوڑا سا اور۔"

"مگر ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

اس سوال کا کوثر جہاں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک سیاہ سی عمارت نظر آئی۔ طرزِ تعمیر مندروں جیسا تھا۔ اس کا رخ اس جانب ہو گیا۔ ذرا ویران سی جگہ تھی۔ مندر کا عقبی حصہ تھا، بہت سے درخت تھے۔ اِدھر اُدھر انسان نظر نہیں آ رہے تھے۔ تسنیم کے چہرے ہی سے تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور مندر کے عقب میں ایک پیپل کے بڑے درخت کی چھاؤں میں پہنچ گئی۔ تسنیم سے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"بیٹھ جاؤ...... دیکھو کیسی اچھی ہوا چل رہی ہے۔"

"کہاں چل رہی ہے باجی...... ہوا تو بند ہے۔" تسنیم کو اب اتنی سمجھ تو آ ہی گئی تھی۔ کوثر جہاں مسکرا دی۔ بچی کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگر اس کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھ لئے جاتے تو خود تسنیم بھی ڈر جاتی۔ اس احساس سے اس نے خود کو شگفتہ ہی رکھا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ پیپل کے سوکھے پتے آس پاس پڑے ہوئے تھے۔ تسنیم اپنی جگہ بیٹھی بیٹھی ان پتوں کو چننے لگی اور کوثر جہاں کی وحشت زدہ نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ دل سے دعائیں نکل رہی تھیں، الٰہی کچھ ہو جائے...... کوئی ایسا سہارا مل جائے جو عارضی ہی سہی لیکن تھوڑا سا وقت گزارنے کا ٹھکانہ تو ہو جائے۔ کیا کروں...... کس سے کہوں...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بادل تھے کہ جھکے چلے آ رہے تھے۔ اندھیری چھا رہی تھی۔ اس بات کا

امکان بھی تھا کہ بارش شروع ہو جائے۔ اور جب پیپل کے پتوں سے چھن کر بارش کی پہلی بوند زمین پر پڑی تو کوثر جہاں کا دل کانپ اٹھا۔ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ اب کیا، کیا جائے۔ بارش باقاعدہ شروع ہو گئی۔ موٹی موٹی بوندیں زمین پر ٹپ ٹپ کر کے پڑنے لگیں اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ کچی کھلی جگہ تھی اور مٹی کی خوشبو ہواؤں میں شامل ہو کر نجانے کیا رنگ دکھانے لگی۔ لیکن کوثر جہاں کی سوچوں کا الگ ہی رنگ تھا۔ پھر ایک درمیانی عمر کا آدمی چھتری ہاتھ میں لئے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف آیا، رکا، کوثر جہاں اور بچی کو دیکھا اور پھر جلدی سے ان کے پاس پہنچ گیا۔

''ارے بٹیا! تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ بچی بھیگے گی تو بخار آ جائے گا اسے...... یہاں کیوں بیٹھی ہوئی ہے...... کوئی اور ٹھکانہ نہیں ہے تیرا کیا؟''

''بابا جی! راستہ بھول کر ادھر آ گئی ہوں۔ بارش رکے گی تو چلی جاؤں گی۔''

''میرے ساتھ آ جا...... بھگوان کے گھر میں بہت جگہ ہے۔ آج پوجا پاٹھ کے لئے تو کوئی آنے سے رہا۔ آ جا۔''

کوثر جہاں اٹھ گئی۔ دو قدم آگے بڑھ کر اس شخص نے کہا۔ ''میرا نام پنڈت ہر داس ہے...... سائے میں یہاں بیٹھ جا...... تیرا دھرم کیا ہے، ہندو ہے یا مسلمان؟''

''مسلمان ہوں۔'' کوثر جہاں نے بتایا۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا...... ہم مسلمانوں کے دیس میں رہ رہے ہیں۔ پرنتو انسان تو انسان ہی ہے۔ سب دھرم ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔''

وہ اندر چلے گئے۔ کوثر جہاں کا دل کانپ رہا تھا۔ ادھر اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا اور بارش تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ پنڈت جی پھر آ گئے۔

''پرنتو حیدر آباد میں کون سے محلے کی ہے؟''

''میں مسافر ہوں پنڈت جی! پہلی بار حیدر آباد آئی ہوں۔''

''کسی کے گھر تو آئی ہو گی۔''

''وہی تو یاد نہیں رہا۔''

''یاد نہیں رہا؟''

''ہاں۔''

''عجیب بات ہے...... جوان عورت، بچی ساتھ۔ جہاں آئی ہے وہاں کے بارے میں نہیں جانتی۔ بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔ خیر تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں ابھی آتا ہوں۔''

پنڈت جی دوبارہ اندر چلے گئے۔ کوثر جہاں کا دل کانپ رہا تھا۔ نجانے کیوں اسے یہ پنڈت کچھ اچھا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت اس کا لہجہ خراب نہیں تھا جب وہ اسے پیپل کے درخت کے پاس سے اٹھا کر لایا تھا۔ لیکن اب عورت کی چھٹی حس نے اسے بتایا کہ وہ صرف ایک مرد کی پیشکش تھی۔ اس نے تسنیم کو دیکھا جو پریشان بیٹھی تھی، بارش تیز ہو گئی تھی اور یہ جگہ اس سے بچنے کے لئے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ اچانک پنڈت جی دوبارہ نمودار ہو گئے۔

''جگہ بنا کر آیا ہوں تیرے لئے...... یہاں بھیگ جائے گی۔''

''نہیں پنڈت جی! ٹھیک ہوں یہاں۔''

''میری بات کیا تیرے کانوں میں نہیں پڑ رہی؟ یہ جگہ دیوی استھان ہے۔ مسلمانوں کو یہاں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''تو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔''

''کہاں؟''

''کہیں بھی۔''

''تیرا دماغ خراب ہوا ہے کیا...... چل اٹھ۔'' پنڈت نے جھک کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے اٹھانے کے لئے زور لگانے لگے۔

''چھوڑو مجھے...... چھوڑو...... یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

''ایسے نہیں چھوڑوں گا...... ایک مسلمان ہو کر مندر میں گھس آئی اور پھر نخرے دکھا رہی ہے۔ اٹھ۔'' پنڈت نے زور لگایا۔ کوثر جہاں جوان تھی، بازو چھڑانے کے لئے پوری طاقت سے جھٹکا دیا تو پنڈت جی منہ کے بل نیچے آ گئے۔ سر سنگلاخ زمین سے ٹکرایا تو خون کا فوارہ بہہ نکلا...... منہ سے ہائے رام نکلا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر سیدھے ہو گئے۔ تسنیم رونے لگی تھی۔ کوثر جہاں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ وہ سوچے سمجھے بغیر ایک راستے پر چل نکلی۔ دل خشک پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ بارش بری طرح بھگونے لگی

اور آن کی آن میں لباس شرابور ہو گیا۔ تسنیم اس کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ مندر سے اتنی دور نکل آئی کہ اس کی عمارت نگاہوں سے معدوم ہو گئی۔ وہ اپنی دھن میں چلی جا رہی تھی۔

''باجی......'' تسنیم کی گھٹی گھٹی آواز ابھری۔ ''رک جاؤ...... اب نہیں چلا جا رہا مجھ سے۔'' وہ رونے لگی۔

''تھوڑی دیر اور چلو تسنیم!''

''باجی! مجھے گود میں لے لو۔'' تسنیم کا بدن ڈھیلا پڑنے لگا...... کوثر جہاں رک گئی۔ پھر جھکی اور اس نے تسنیم کو گود میں اٹھا لیا۔ خود بھی تھکن سے چور تھی۔ اس کے منہ سے دلدوز آواز نکلی۔

''اللہ......!''

''اللہ اکبر...... اللہ اکبر......'' جواب ملا۔ کہیں قریب ہی سے اذان کی آواز ابھر رہی تھی۔

○●○

شمشیرہ بیگم کو کوثر جہاں کی گمشدگی کا علم ہو گیا۔ وہ ہنگامہ ہوا، وہ واویلا مچا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ شمشیرہ بیگم نے کیا کیا دہائیاں نہ دے ڈالیں۔ ہر طرح سے کوششیں کر لیں، پولیس میں رپٹ درج کرائی گئی، شمشیرہ بیگم بستر سے جا لگیں۔ کوثر جہاں کو یاد کر کے روتی پیٹتی رہیں...... اس کیفیت میں لمحات گزرنے لگے۔ خود حاجو اور غلام شاہ بھی شمشیرہ بیگم کے اشاروں پر کوثر جہاں کی تلاش میں کہاں کہاں نہیں گئے تھے مگر کچھ نہ ہوا۔ سب شمشیرہ بیگم کی دلسوزی میں لگے ہوئے تھے۔

اچانک ہی حاجو کے دل میں ایک خیال آیا۔ غلام شاہ سے ہمیشہ سے چلتی تھی۔ بڑی بات یہ تھی کہ غلام شاہ ایک طاقتور آدمی تھا اور حاجو دھان پان۔ ہمیشہ ہی حاجو کو غلام شاہ سے نیچا دیکھنا پڑتا تھا۔ دل میں زبردست خواہش تھی کہ جیسے بھی بن پڑے، غلام شاہ پر وار کیا جائے۔ اس وقت جو خیال دل میں آیا تھا وہ بڑا کام کا تھا۔ چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد کوثر جہاں کے کمرے میں گھس گیا۔ ہر چیز کھنگال ڈالی اور پھر تقدیر نے کچھ ساتھ دیا، چھوٹے صندوق میں دو جڑاؤ کنگن مل گئے۔ حاجو نے انہیں انٹی میں اڑس لیا اور باہر نکل آیا۔ شمشیرہ بیگم کو کچھ صبر و قرار آیا تو مال و اسباب کی فکر ہوئی، تلاشی لی، پتہ چل گیا کہ کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا ہے۔ جڑاؤ کنگن ان کے دماغ میں نہیں آئے تھے۔ دیئے ہوں گے کسی قدردان نے، پڑے رہ گئے کوثر جہاں کے پاس۔

پانچواں دن ہو چکا تھا اور کہیں سے کوثر جہاں کی سن گن نہیں ملی تھی۔ تسنیم کو بھی ساتھ لے گئی تھی۔ شمشیرہ بیگم بے شک طوائف تھیں لیکن کہیں نہ کہیں دل کے کسی گوشے میں ماں موجود تھی۔ چھٹے دن کوثر جہاں کی یاد آئی تو دل میں بیٹی کا تصور تھا۔ آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ کہنے لگیں۔

''ارے پاگل! گھر چھوڑ گئی...... ضد کرتی رہتی، بات منوا لیتی مجھ سے اپنی۔ میں بھلا

تجھے کیسے مجبور کر لیتی۔ جان سے تو نہ مار دیتی۔ ہائے کیا کروں، جس جگہ پیدا ہوئی اسی جگہ تو عمر گزاری ہے میں نے...... وہیں سے سوچا ہے اور وہیں ختم کر لیا ہے۔ کوئی نئی بات اب میرے دل میں کیسے آتی۔ کوثر جہاں! ماں ہو، ماں کے دل کو سمجھ لینا بیٹی! واپس آ جانا، تجھے میری ممتا کا واسطہ۔ تیری گود میں بھی اولاد ہے۔ جس طرح تُو اس اولاد کو پال رہی ہے میں نے بھی تجھے اسی طرح پالا ہے۔ غلطیاں مجھ سے ضرور ہوئی ہوں گی مگر ان غلطیوں کی اتنی بڑی سزا تو اچھی نہیں ہوتی بیٹا! اپنا پتہ ٹھکانہ تو دے دے۔ تیری ضد کے آگے تجھے کون مجبور کر سکتا تھا؟ ہائے غلطی تو مجھ سے ہی ہوئی......'' ایسی جذباتی ہوئیں کہ شبانہ اور غزالہ کو بلایا، کلیجے سے لگایا، خوب روئیں۔ دونوں بہنیں بھی بہن کی گمشدگی سے غمزدہ تھیں۔

''شبانہ، غزالہ! کوٹھے پر ناچنے کو جی نہیں چاہتا کیا؟ بتا دو میری بچیو! جھوٹ مت بولنا مجھ سے۔''

''اماں! کیسی باتیں کر رہی ہو...... یہاں نہ ناچیں گے تو کہاں جائیں گے؟''

''یہی میں نے کوثر جہاں کو سمجھایا تھا۔ یہی تو کہا تھا میں نے کہ روشنیوں کی طرف نہ بھاگ۔ وہ روشنیاں دور سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ہم لوگ معاشرے کے وہ بدنما داغ ہیں جنہیں کوئی بھی اپنے دامن پر قبول نہیں کرتا۔ ہماری پذیرائی تو سبھی کرتے ہیں لیکن ہمیں اپنی خوابگاہوں میں سجانا، اپنے خاندان میں عزت دینا پسند نہیں کرتے۔ وہ ہمارے گھروں کی ڈیوڑھیوں کو عبور کر کے ہمارے گھروں میں تو آ سکتے ہیں، ہمیں عزت سے اپنے گھروں کے کمروں میں نہیں لے جا سکتے۔ تُو دیکھ لے شبانہ بیٹی، غزالہ! کتنوں نے دعویٰ وفا کیا، کتنے دعوے وفا کر سکے۔ بات وہیں تک آ جاتی ہے۔ پتہ نہیں وہ بیوقوف کہاں چلی گئی۔ لڑکیو! آج میں تم سے جو بات کہہ رہی ہوں خدا کے لئے اسے جھوٹ نہ سمجھنا، کہیں دل لگا بیٹھی ہو، کہیں جانے کا ارادہ ہے تو آج مجھے بتا دو۔ ہو سکتا ہے آنے والا کل مجھے وہی پرانی شمشیرہ بیگم بنا دے۔ کہیں جاؤ تو مجھے بتا کر جاؤ۔ بولو، چھوڑ دو گی مجھے؟ کب چھوڑ دو گی مجھے؟''

''نہیں اماں...... کیسی بات کرتی ہو...... باجی تو پاگل ہے۔ اور سنو اماں! ہم طوائفوں کی تو ایک ہی تاریخ ہوتی ہے، کہیں بھی نکل جائیں، بعد میں اپنے گھر واپس آ جاتے ہیں۔ انسان کو دولت کے علاوہ عزت کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے اماں! ہمیں دولت تو حاصل

ہے اور تمام عمر حاصل رہتی ہے۔ لیکن عزت ہماری تقدیر میں نہیں ہوتی۔ باجی کو جب یہ احساس ہو گا کہ اسے عزت دینے والا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے تو وہ یہیں واپس آ جائے گی۔ تم دیکھ لینا اماں۔''

شمشیرہ بیگم آنسو بہاتی رہیں۔ ماں کی ممتا بہت دیر تک ذہن پر حاوی رہی۔ ہر طرح کی کوششیں کر ڈالی تھیں۔ کوٹھے کی رونق لٹ گئی تھی۔ کاروبار بند کر کے رکھ دیا تھا۔ اب بھلا اس حادثے کے بعد بھی شمشیرہ بیگم کہاں تک پتھر بنی رہتیں۔ دل میں بیٹی کا خیال تو آتا ہی تھا۔ کوثر جہاں سے محبت بھی محسوس ہوتی تھی البتہ اکرام کا خیال آتا تو دانت پر دانت جم جاتے اور کڑکڑانے کی آوازیں بلند ہونے لگتیں۔ بیج بویا تو اسی کا تھا۔ اکرام کے لئے ان کے دل کا کوئی گوشہ نرم نہیں ہوتا تھا۔ بس فطرت تھی ان کی۔ حاجو اور غلام شاہ بھی منحوسوں جیسی شکلیں بنائے کمرے میں بیٹھے رہتے تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ حاجو کی آنکھوں میں قہر و غضب کی بجلیاں کوندتی رہتی تھیں اور غلام شاہ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ۔

اس دن شمشیرہ بیگم مغموم انداز میں سروتہ ہاتھ میں پکڑے چھالیہ کتر رہی تھیں کہ کہیں سے حاجو نمودار ہو گیا۔ شمشیرہ بیگم ان دنوں بڑی نرم تھیں۔ بیٹی کی گمشدگی نے دل میں خوف پیدا کر دیا تھا۔ حاجو کو گالیاں بھی نہیں پڑ رہی تھیں۔ اس وقت بھی انہوں نے نرم نگاہوں سے حاجو کو دیکھا اور حاجو آ کر دوزانو بیٹھ گیا۔

''شمشیرہ بیگم! اپنے آپ کو سنبھالو گی کہ نہیں؟ یوں لگتا ہے جیسے کوثر جہاں ہی سب کچھ تھیں۔ آخر شبانہ اور غزالہ بھی تو ہیں۔ ان لوگوں سے محفلوں کو سجاؤ، طوائف کا کوٹھا چار دن غیر آباد رہے تو پھر سے آباد کرنے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ تماش بین آتے ہیں اور مایوس چلے جاتے ہیں۔ منع کرتے کرتے بھی زبان دکھ گئی ہے۔ اب تو محفلیں جاری کرو۔ کب تک رنج کرو گی؟ آستین کے سانپ نے ڈس ہی لیا ہے، اب اس کا کچھ علاج بھی کرو۔''

شمشیرہ بیگم کے ہاتھ میں گردش کرتا ہوا سروتہ رک گیا۔ غصیلی نگاہوں سے حاجو کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''تم نے میری بیٹی کو آستین کا سانپ کہا ہے...... تمہاری اتنی ہمت کیسے ہوئی حاجو؟''

''پھر غلط سمجھیں شمشیرہ بیگم! آستین کا سانپ میں نے کوثر جہاں کو نہیں کہا۔''

"پھر؟"

"نام لوں گا تو پھر زبان پکڑو گی۔ میں ٹھہرا کمزور آدمی۔ کیا کروں، اللہ نے ڈیڑھ پسلی دے کر دنیا میں اتارا ہے، جان ہوتی غلام شاہ جیسی تو سینہ تان کر بات کرتا۔ زبان کھولتے ہوئے بھی خوف آتا ہے۔ مرواؤ گی مجھے، بنے گا کچھ نہیں...... بھروسہ تو تمہیں غلام شاہ پر ہی ہے۔"

"اے منہ سے تو پھوٹو...... خدا تمہیں غارت کرے۔ کتنا سوچتی ہوں کہ منہ سے کوئی بری بات نہ کروں لیکن جس طرح تم باتیں کرتے ہو، تلوؤں میں لگتی ہے، بالوں میں بجھتی ہے۔ کیا بکنا چاہتے ہو...... غلام شاہ کا نام بیچ میں کیسے آ گیا؟"

"جانتا ہوں شمشیرہ بیگم! ہمیشہ سے جانتا ہوں، میری کوئی اوقات نہیں ہے۔ میری ساری باتیں غلط ہوتی ہیں تمہاری نظر میں۔ مگر کیا کروں، زبان تو نہیں رکتی، دل تو نہیں مانتا۔ اتنا ہی تمہارا نمک خوار ہوں جتنے دوسرے ہیں۔ یہ سازش ہے شمشیرہ بیگم! پکی سازش ہے۔ کوثر جہاں خود نہیں گئی، اسے نکالا گیا ہے...... بھگایا گیا ہے اسے یہاں سے۔"

"کک...... کک...... کیا بک رہے ہو؟ کس نے نکالا ہے؟ کس نے بھگایا ہے؟" شمشیرہ بیگم چیک کر بولیں۔

"غلام شاہ سے زیادہ یہاں اور کون ہو سکتا ہے؟ وہی ایک بہادر آدمی ہے جو تال ٹھونک کر ایسے کارنامے سرانجام دیتا ہے۔"

"جھاڑو پھرے تمہارے منہ پر حاجو! جھاڑو پھرے...... جب بھی کہتے ہو ایسی ہی کہتے ہو۔ ارے غلام شاہ اتنا بھی برا نہیں ہے کہ میرے ہی خلاف سازش کر ڈالے۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے شمشیرہ بیگم! وہی کہا نا جو میں نے سوچا تھا۔ بھلا الگ کہاں کہو گی تم۔ وہی بات ہے نا، طاقتور ہی کی سنی جاتی ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ ہم کیا، ہماری اوقات کیا۔ ہمیشہ وفاداری کا مظاہرہ کر کے ذلیل ہوتے ہیں۔"

"کہنا کیا چاہتے ہو آخر؟"

"شمشیرہ بیگم! غلام شاہ کی کچھ ایسی ہی مشکوک حرکتیں دیکھی ہیں میں نے کہ میرے دل میں خیال آتا ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوئی ہو۔ پچھلے دنوں غلام شاہ سے بڑی کھسر پھسر چل رہی تھی کوثر جہاں کی۔"

"کیسی کھسر پھسر؟"

"کیا کہوں، غلام شاہ کا سامنا کون کر سکتا ہے، تم یا میں۔ ہاں اگر بات بدل سکتے ہیں تو ہمارے استادِ محترم پیر مکھن شاہ۔"

"مکھن شاہ...... وہ تو نجانے کہاں مر گئے۔"

"ارے ارے شمشیرہ بیگم! بزرگوں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کی جاتیں، احترام سے نام لیا جاتا ہے ان کا۔"

شمشیرہ بیگم پُر خیال انداز میں حاجو کو دیکھنے لگیں پھر بولیں۔ "اچھا ایک بات بتاؤ، مکھن شاہ سے ملاقات ہو سکتی ہے تمہاری؟"

"تمہارے لئے تو پتھروں سے دودھ کی نہر نکال کر لا سکتے ہیں۔ انہیں تلاش کرنا کون سا مشکل کام ہے۔"

"تو ایک کام کرو حاجو! مکھن شاہ کو تلاش کرو۔ اگر انہوں نے کوئی عمل کر دیا تو کوثر جہاں واپس بھی آ سکتی ہے۔"

"کیا سمجھتی ہیں آپ، بزرگوں کے ہاتھوں میں تو سب کچھ ہوتا ہے۔ آپ کو اصل بات تو پتہ ہی نہیں ہے، بڑے بڑے کام کر ڈالتے ہیں یہ بزرگ۔ ایک بات بتائیے، آپ کو جوتا الٹنے کا عمل معلوم ہے؟"

"نہیں...... وہ کیا ہوتا ہے؟" شمشیرہ بیگم نے کہا۔

"جوتیاں پڑھ کر دیتے ہیں، کوئی جادو ٹونا ہو تو بس جوتیاں الٹی رکھ دی جاتی ہیں اور جس کی جوتیاں ہوتی ہیں وہ الٹے قدموں واپس آ جاتا ہے۔ توا اور کڑاہی الٹ دی جاتی ہے اور کام ہو جاتا ہے۔ ایک اور بات بتاؤں تمہیں شمشیرہ بیگم! اچھا ابھی نہیں بتاؤں گا، بعد میں بتاؤں گا۔ اگر تم اجازت دو تو مکھن شاہ کو تلاش کروں؟ بھئی میں کہتا ہوں کہ ٹھیک ہے کہ غلام شاہ نے یہ سب کچھ نہیں کیا لیکن کوثر جہاں کہیں اور بھی گئی ہوں گی تو واپس آ جائیں گی۔ کیا تم نے ایسی باتیں نہیں سنیں کہ کھوئے ہوئے بچے مل جاتے ہیں، بھاگے ہوئے شوہر واپس آ جاتے ہیں۔ خود طوائفوں کے خلاف کیا کیا عمل نہیں کراتیں یہ گھروں کی بیویاں۔ شمشیرہ بیگم! مان ہی لو میری۔ مکھن شاہ کو تلاش کر لیتا ہوں میں۔"

"کر لو حاجو! کر لو۔"

"مگر رقم خرچ ہوگی۔ بہت ہوگئی الٹی سیدھی۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ پیر کالے۔ اپنے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی اور مارے مارے پھرتے ہیں۔ پیسے ڈھیلے کرو، تب نکلیں گے ان کی تلاش میں۔ ارے ہاں، یہ تو سودا ہے۔"

شمشیرہ بیگم نے غصیلی نگاہوں سے حاجو کو دیکھ کر نجانے کیا کیا کوسنے دے ڈالے اسے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ تصور بھی ذہن میں تھا کہ مکھن شاہ کچھ نہ کچھ کر ہی سکتے ہیں۔ حاجو نے بھی کہا لیکن اس بات کی دل سے قائل ہوئی تھیں کہ مکھن شاہ کے عمل سے رب نواز نے تو چکر لگانے شروع کر دیئے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں ہوا کا رخ بدل گیا۔

بہرحال حاجو نے دو ہزار روپے گھسیٹ لئے تھے اور پھر پھدک پھدک کر سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی بھلی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ فی الحال تو دو ہزار روپے کی رقم جیب میں آ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دل و دماغ کو تقویت بھی ملی تھی کہ غلام شاہ کے خلاف منصوبے بنائے جا سکیں۔

○●○

"اللہ اکبر...... اللہ اکبر" کی صدا بڑی پاک تھی۔ نگاہیں اٹھائیں تو مسجد نظر آئی۔ تھکے تھکے قدم مسجد کی طرف اٹھ گئے۔ خانہ خدا سے آواز ابھری تھی۔ دل سے اللہ کو پکارا تھا اور جواب ملا تھا۔ یقیناً اس بارش میں خانہ خدا میں پناہ مل جائے گی۔ عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا تھا اور مؤذن اذان دے رہے تھے۔ مسجد کے دروازے کے بائیں جانب تھوڑا سا چھجا اُبھرا ہوا تھا، اس سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں لیکن اتنی جگہ ضرور تھی کہ دیوار سے چپک کر کھڑی ہو جائے۔ بارش کی وجہ سے نمازی مسجد کی طرف نہیں آئے تھے اور مسجد کا دروازہ بدستور ویران نظر آ رہا تھا۔ بارش سے پناہ مل گئی تھی لیکن فضا میں خاصی ٹھنڈک تھی جو بھیگے ہوئے کپڑوں کی وجہ سے بدن کو زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ کوثر جہاں کو اپنی فکر تو نہیں تھی، بس تسنیم کو سینے میں سموئے ہوئے تھی کہ کہیں اسے سردی نہ لگ جائے۔ مؤذن صاحب نے خود ہی نماز پڑھی، پھر باہر کا جائزہ لینے یا پھر مسجد کا دروازہ بند کرنے تین سیڑھیاں اتر کر بارش کے رنگ دیکھے، پھر بائیں جانب نظر اٹھ گئی جہاں کوئی موجود تھا۔ چونکے، دو قدم آگے بڑھے۔ کوثر جہاں کو دیکھا اور حیران رہ گئے۔ آہستہ سے بولے۔

"عزیزہ! یہاں کیوں کھڑی ہوئی ہیں...... کہاں جا رہی تھیں؟ بارش تو بڑی دیر سے ہو

رہی ہے۔ اپنے گھر چلی جایئے، وہی بہترین پناہ گاہ ہوگی۔ اس بارش کا کوئی ٹھکانہ نہیں، جمعرات کی جھڑی ہے۔ آپ کو پتہ ہوگا جو بارش جمعرات کو شروع ہو، ہفتے جاری رہتی ہے اور پھر یہاں تو ویسے بھی بارشوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ کیا گھر کا فاصلہ یہاں سے زیادہ ہے؟"

"نہیں مولوی صاحب! مسافر ہوں، لاہور سے آئی ہوں۔ یہاں غلطی سے حیدر آباد میں اتر گئی۔ کوئی شناسا نہیں ہے، کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ بس یونہی پناہ کے لئے آ کھڑی ہوئی ہوں۔"

"ارے ارے، اوہو...... یہ تو بہت پریشان کن بات ہے۔ آپ کے ساتھ کوئی ہے؟"

"نہیں۔"

"بے شک پریشانی کی بات ہے...... لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ آپ کو اس پریشانی میں اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ آیئے آیئے، مسجد میں آ جایئے۔ اوہو، بچہ بھی ہے آپ کے ساتھ۔"

"میری بیٹی ہے۔"

"توبہ توبہ، کیا طوفانی بارش ہے...... آیئے آیئے، آپ اندر آ جایئے۔ آپ کی کہانی تو بڑی دردناک ہے۔" مولوی صاحب مسجد سے ملحق حجرے میں لے گئے۔ یہ ان کی اپنی رہائش گاہ تھی۔ ایک جانب پلنگ پڑا ہوا تھا، لکڑی کی بینچیں رکھی ہوئی تھیں، سامنے کے حصے میں توا، چمٹا، چولہا وغیرہ نظر آ رہا تھا۔ حجرے کا ایک ہی دروازہ تھا جو مولوی صاحب کی کل کائنات تھی۔ خود ان کی عمر کوئی چالیس بیالیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اندر آ کر انہوں نے کوثر جہاں کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور ایک دم کھو سے گئے، پھر بولے۔

"افسوس، نجانے کتنی دیر سے آپ باہر کھڑی ہوئی ہیں اور ہمیں علم ہی نہ ہو سکا۔ مگر قصوروار ہم نہیں ہیں، کوئی الہام تو نہیں ہوا تھا ہمیں۔ آپ خود ہی اندر آ جاتیں۔"

"نہیں مولوی صاحب! ظاہر ہے، آپ کو کیا معلوم۔ کیا مجھے یہاں ایک رات پناہ مل سکتی ہے؟"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ عزیزہ! آپ براہِ کرم آرام سے تشریف رکھئے، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ آپ مہمان ہیں ہماری۔ میرا نام حیات احمد ہے اور میں یہیں رہتا ہوں۔ آپ بیٹھ جایئے، اوفوہ، لباس سے پانی ٹپک رہا ہے۔ گویا سردی کا موسم نہیں ہے لیکن ہوا

لگ کر بخار بھی آ سکتا ہے۔ آپ بیٹھئے تو سہی، اور یہ حجاب چھوڑ دیجئے، ہم غیر نہیں ہیں۔ ویسے آپ مسلمان خاتون ہیں؟''

''جی۔''

''کیا نام ہے آپ کا؟''

''کوثر جہاں۔''

''سبحان اللہ...... اس میں کوئی شک نہیں، یہ بیٹی ہے آپ کی؟''

''جی ہاں......'' کوثر جہاں نے جواب دیا۔ مولوی صاحب کافی چرب زبان معلوم ہوتے تھے۔

''اس کا کیا نام ہے؟''

''تسنیم۔''

''واہ، کوثر تسنیم...... واہ، واہ...... صاحب ذوق ہے وہ جس نے آپ کی بیٹی کا نام تسنیم رکھا۔ بہرحال ہم آپ کے لئے کچھ کرتے ہیں۔ اچھا یہ بتایئے کھانا کھایا ہے یا نہیں؟''

''جی...... جی...... جی ہاں۔''

''کمال کرتی ہیں...... یعنی یہ کیا، آپ مسافر ہیں، اس شدید بارش میں غلطی سے حیدر آباد کے اسٹیشن پر اتر گئی ہیں اور پھر یہاں تک پہنچ پائی ہیں اور کہتی ہیں کہ کھانا کھا لیا...... ایسا تکلف شرع میں جائز نہیں ہے۔ کھانا موجود ہے، سالن گرم کرنا پڑے گا آپ کو۔ مگر نہیں، ٹھہریئے، ہم ابھی حاضر ہوئے۔'' مولوی صاحب باہر نکل گئے۔ کوثر جہاں کے دل میں ایک چبھن پیدا ہو گئی۔ مولوی صاحب کا لہجہ، ان کی آواز، ان کی آنکھوں کا انداز مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ ویسے بھی شکل منک قسم کے آدمی تھے۔ باہر گئے اور ایک چادر لے آئے۔ بڑی سی چادر تھی۔ کہنے لگے۔

''تکلف نہ فرمایئے گا، لباس اتار کر چادر اوڑھ لیجئے اور لباس ہمیں دے دیجئے۔ نچوڑ کر باہر برآمدے میں پھیلا دیں گے۔ صبح تک خشک ہو جائے گا۔ آپ کے جسم پر یہ چپکا ہوا لباس کچھ موزوں نہیں لگ رہا۔''

کوثر جہاں دھک سے ہو گئی، پھر بولی۔ ''نہیں مولوی صاحب! بے حد شکریہ، میں ٹھیک ہوں۔ البتہ اگر آپ اجازت دیں تو یہ چادر بچی کو اوڑھا دوں۔''

مولوی صاحب کو جیسے مایوسی ہوئی تھی۔ کہنے لگے۔ ''ہم نے تو آپ کو پیشکش کر دی، جیسے مناسب سمجھیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو بچی کے لئے اور کوئی چھوٹی چادر لے آئیں؟''

''نہیں، بے حد شکریہ۔ میرا لباس میرے بدن پر ہی خشک ہو جائے گا۔''

مولوی صاحب آہستہ سے مسکرائے، پھر بولے۔ ''ہاں، اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ ماشاء اللہ جوانی کی عمر ہے، اس عمر میں تو جسم ویسے ہی تپتے ہیں۔ یہ لباس واقعی تھوڑی دیر میں خشک ہو جائے گا۔'' یہ جملے بھی بڑے عجیب اور مشکوک تھے۔ مسجد کے ایک خدا پرست انسان کو بھلا اتنی گہرائیوں میں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسا ہونا بھی نہیں چاہئے تھا۔ کوثر جہاں کے ذہن میں سناٹے آ رہے تھے۔ یہاں بھی پناہ نہ ملی تو کیا ہو گا؟ مولوی صاحب چولہا، ہانڈی کے پاس پہنچ گئے، کھانا گرم کرنے لگے۔ کوثر جہاں اس خیال سے خاموش رہی کہ کم از کم تسنیم کا پیٹ ہی بھر جائے۔ بہت عمدہ قسم کا مرغی کا سالن پکا ہوا تھا۔ نرم بوٹیاں۔ یہ ضیافت کوثر جہاں نے قبول کر لی۔ تسنیم کو کھانا کھلایا، چند لقمے خود بھی اس خیال سے زہر مار کر لئے کہ جسم میں جان ہو گی تو حالات کا مقابلہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ خانہ خدا میں خوراک میسر آئی تھی، بھوکا رہنا ویسے بھی ناشکری تھی۔ مولوی صاحب کے الفاظ اور لہجہ تسلی بخش ہوتا تو اس وقت بڑا سکون محسوس ہوتا۔ مگر عورت تھی اور وہ بھی ایسی عورت جو ہمیشہ مردوں کی نگاہوں کا سودا کرتی آئی تھی۔ مولوی صاحب کے تیور کچھ بہتر نظر نہیں آ رہے تھے۔ خانہ خدا کا کیا قصور، زمین پر بسنے والے ہی اگر برے انداز میں سوچنے لگیں۔ حالانکہ مولوی صاحب نے ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو باعث تردّد ہوتی۔ بس اپنا ایک احساس تھا جو دل میں ہول پیدا کر رہا تھا۔ ہاتھ روکا تو مولوی صاحب آگے بڑھ آئے۔

''ارے یہ کیا...... پیٹ بھر کر کھانا نہ کھانا ناشکری ہے۔ آپ نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔''

''نہیں مولوی صاحب! بے حد نوازش ہے آپ کی، آپ نے مجھے یہ سہارا دیا۔''

''ہاں عزیزہ! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے، کوئی نا آشنا بھی سب سے بڑا آشنا بن جاتا ہے۔ خیر اب آپ آرام کیجئے۔ بچی کا لباس تو اتار دیجئے گا۔ چادر لپیٹ دیجئے گا، بھیگا ہوا لباس کہیں نقصان نہ پہنچا دے۔''

''اللہ محافظ ہے۔ آپ کی عنایت کی ہوئی چادر اوڑھائے دیتی ہوں۔'' کوثر جہاں نے نیاز مندی سے کہا۔

"جایئے، پلنگ پر لیٹ جایئے جا کر...... جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ سے بہت سی باتیں کی جائیں لیکن نجانے کب سے تھکی ہوئی ہیں، آرام کر لیجئے۔ ہم بھی دری بچھا کر سو جاتے ہیں۔" مولوی صاحب نے کونے میں رکھی ہوئی دری کھولی اور پلنگ سے دو گز کے فاصلے پر بچھالی۔ ایک بار پھر کوثر جہاں خوفزدہ ہوگئی۔ اصولاً تو مولوی صاحب کو مسجد کے اندرونی حصے میں جا کر سو جانا چاہئے تھا لیکن یہاں بھی انہوں نے شک کی گنجائش رکھ چھوڑی تھی۔

بہر طور یہ بات ان سے کہی نہیں جا سکتی تھی۔ وہ پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔ تسنیم کو گود میں بھر لیا۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ یہ رات سکون سے گزر جائے۔ بھلا سونے کا کیا تصور ذہن میں آ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے کہا۔

"سو گئیں عزیزہ؟"

"جی نہیں۔"

"ارے، ارے...... ہمارا یہ مقصد نہیں تھا۔ آرام کیجئے گا۔ ہم یہ پوچھ رہے تھے کہ بچی کے والد کہاں ہیں...... کیا خدانخواستہ......"

"خدانخواستہ۔" کوثر جہاں کے منہ سے آواز نکلی۔

مولوی صاحب اپنی ترنگ میں کہنے لگے۔ "اگر وہ موجود ہیں تو آپ کے ساتھ کیوں نہیں ہیں؟"

"بس نہیں ہیں۔"

"حیدر آباد میں غلط کیسے اتر گئیں آپ؟"

"راستے نہیں جانتی تھی۔"

"گویا تنہا سفر کر رہی تھیں؟"

"جی ہاں۔"

"گویا شوہر سے کوئی ناراضگی ہوگئی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"اوہو، تو پھر ساس بہو کا کوئی جھگڑا؟"

"نہیں مولوی صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"خیر، آپ جانیں آپ کا کام۔ لیکن عزیزہ! ہم یقین نہیں کر پائے۔ چلئے آپ کو تنگ

نہ کریں گے۔ اچھا شب بخیر۔" مولوی صاحب کروٹ بدل کر لیٹ گئے لیکن کوثر جہاں کو بھلا سکون کہاں۔ خدا خدا کر کے رات گزری۔ بارش کی آوازیں ابھرتی رہی تھیں۔ چھت پر سخت آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ مولوی صاحب شاید سو ہی گئے تھے البتہ صبح کو وہ جلدی اٹھ گئے اور اپنے معاملات میں مصروف ہو گئے۔ دن کے آٹھ بجے پھر واپس آئے۔ حلوہ پوریاں، ترکاری کے ساتھ۔ دونوں ہاتھوں میں دبائے ہوئے لائے تھے۔ یہ اشیاء کوثر جہاں کے سامنے رکھ دیں۔ کوثر جہاں نے ایک بار ان کا چہرہ دیکھا، دل مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا اس چہرے کو دیکھ کر۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو دل کو متردد کئے ہوئے تھی۔ کہنے لگی۔

"آپ کا بہت شکریہ مولوی صاحب...... اب میں چلتی ہوں۔"

"ہم نے کہا نا کہ بس جمعرات کی جھڑی ایسی ہی لگتی ہے کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔ ذرا بارش کے رنگ تو دیکھئے کہ ہم پریشان ہیں کہ آپ کہاں جائیں گی اس بارش میں؟ ویسے آپ کو جانا کہاں تھا؟"

"بس اپنے ایک عزیز کے پاس جا رہی تھی۔"

"کہاں؟"

"مولوی صاحب! خدا کے لئے بس۔ مجھ سے بہت سارے سوالات مت کیجئے، بس میں چلی جاتی ہوں یہاں سے۔"

"نہیں عزیزہ، ذرا باہر قدم رکھ کر تو دیکھ لو۔ جا سکتی ہو تو چلی جاؤ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ تمہیں تو شاید نقصان نہ پہنچے لیکن بچی بے شک نمونیے کا شکار ہو کر مر جائے گی۔ اب تو ہوائیں بھی ٹھنڈی ہوگئی ہیں۔"

کوثر جہاں نے سہمے ہوئے انداز میں تسنیم کو سینے میں بھینچ لیا۔

دوپہر ہوئی، پھر رات آ گئی۔ بارش نے جل تھل کر کے رکھے ہوئے تھے۔ حیدر آباد کی بارشوں کے بارے میں کبھی نہیں سنا تھا کہ اس انداز میں ہوتی ہیں۔ سندھ کے اس علاقے کے بارے میں تو یہ پتہ چلا تھا کہ بارش ہوتی ہی نہیں ہے۔ ہاں، یہ بھی سنا تھا کہ ہوتی ہے تو پھر ایسی ہی ہوتی ہے کہ جل تھل کر دیتی ہے۔ غرض اچھی خاصی مشکل کا شکار ہوگئی تھی۔ سڑکوں پر پانی اس طرح بھرا ہوا تھا کہ جیسے ندی نالے بھر جاتے ہیں۔

مولوی صاحب نے رات کے کھانے کا زبردست انتظام کیا۔ یہ کھانا باہر سے آتا تھا اور

بعض اوقات ضرورت سے زیادہ ہو جاتا تھا۔ البتہ ربڑی کا وہ آب خورہ مولوی صاحب خرید کر ہی لائے ہوں گے۔ اسے کوثر جہاں کے سامنے رکھتے ہوئے بولے۔

''حیدر آباد کی ربڑی بہت مشہور ہے۔ آپ کے لئے خصوصی طور پر لائے ہیں۔''

کوثر جہاں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مولوی صاحب نے کوئی بہت ہی تیز خوشبو والا عطر لگایا ہوا ہے۔ آنکھوں میں سرمے کے ڈورے کھنچے ہوئے تھے۔ یہ اہتمام بہت خوفزدہ کر دینے والا تھا۔ مولوی صاحب کہنے لگے۔

''عزیزہ! آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں اگر اجازت ہو تو۔''

کوثر جہاں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے مولوی صاحب کو دیکھا، کہنے لگی۔ ''جی فرمایئے؟''

''دیکھئے، زمانہ ساز اور زمانہ شناس ہم بھی ہیں، وقت کو سمجھتے ہیں، زمانے کو سمجھتے ہیں۔ اصل میں ہمارا خیال ہے کہ یا تو آپ شوہر سے طلاق وغیرہ لے کر آئی ہیں یا پھر اس کے ہاں سے فرار ہوئی ہیں۔ ہم اس کے قائل ہیں کہ اگر ذہنوں میں ہم آہنگی نہ رہے تو دوریاں اختیار کر لینی چاہئیں۔ ہماری بھی شادی ہوئی تھی ایک وقت میں لیکن اہلیہ محترمہ ہمیں برداشت نہ کر پائیں۔ وہ ذرا رنگین مزاج کی مالک تھیں اور ہم ٹھہرے سیدھے سادھے مسجد کے مولوی پیش امام۔ حالانکہ اللہ کے فضل سے کھانے کے لئے روٹی اور پہننے کے لئے لباس موجود تھا لیکن محترمہ ہمارے ساتھ قیام نہ فرما سکیں اور طلاق لے کر چلی گئیں۔ اس وقت سے ہم تنہا زندگی گزار رہے ہیں۔ دیکھئے اگر کوئی ایسی بات ہے تو ہمارا ہاتھ آپ کے لئے حاضر ہے۔ جو کچھ بھی بن پڑے گا کریں گے۔ اب یہ کہ ہماری عمر بھی اتنی نہیں ہے، اس بچی کو مضبوط سہارے کی ضرورت ہے، اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیں گے۔''

کوثر جہاں بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ مولوی صاحب؟ آپ تو اللہ والے ہیں، میں شادی شدہ ہوں...... شوہر ہیں میرے۔''

''تو پھر حجرہ چھوڑ دیجئے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس سے زیادہ آپ کی پذیرائی نہیں کر سکیں گے۔ یا تو پھر ایسی گفتگو کیجئے جس سے دلداری کا احساس ہو۔''

کوثر جہاں غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ باہر بارش مسلسل ہو رہی تھی لیکن جو احساس دل میں جاگا تھا اس کے تحت اب یہاں رکنا بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔ غصے سے دروازہ کھول کر باہر نکلی تو مولوی صاحب نے عقب سے کہا۔

''یہ چادر عنایت فرماتی جایئے...... احسان ہوگا آپ کا۔''

کوثر جہاں نے تسنیم کے جسم سے لپٹی ہوئی چادر اتار کر پھینک دی اور پھر حجرے کے دروازے سے باہر نکلی اور پھر مسجد کے دروازے سے بھی باہر نکل گئی۔ سڑکوں پر بہتے ہوئے پانی میں قدم بڑھانا مشکل تھا۔ تسنیم اس کے بدن سے چمٹ گئی تھی۔ کوثر جہاں کسی نہ کسی طرح آگے بڑھ رہی تھی مگر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کسی جگہ کوئی گڑھا بھی ہو سکتا تھا...... بہتر ہے زندگی کی شام ہو جائے...... اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

پھر ایک جگہ مدھم سی روشنی نظر آئی۔ کسی چھوٹے سے جھونپڑا نما گھر کے سامنے ایک بلب جل رہا تھا۔ یہاں بھی سایہ نظر آ رہا تھا۔ اتنا فاصلہ طے کر چکی تھی اور وہ بھی پانی میں پورے پاؤں رکھ کر پاؤں شل ہوتے جا رہے تھے۔ سایہ دیکھ کر اس جانب بڑھی۔ اس وقت اسے ہر سایہ درکار تھا۔ وہ بلب کے نیچے بنے ہوئے چھجے کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ چھوٹا سا ایک کمرہ نما جھونپڑا تھا۔ کچی مٹی کی دیواریں، سامنے چھجے پر بلب جل رہا تھا۔ اندر نجانے کون تھا۔ دروازہ اچانک ہی کھلا اور ایک لمبا تڑنگا آدمی باہر نکل آیا۔ بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ موٹے موٹے ہونٹوں پر پان کی دھڑی، جسم پر غیر شریفانہ لباس۔ سب سے بڑی چیز منہ سے اٹھتی ہوئی بدبو کے بھبکے تھے جو دل کو سہار رہے تھے۔ یہ بدبو کوثر جہاں سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا...... شراب کی بُو بھلا وہ نہ جان پاتی تو اور کون جانتا۔ بڑی بڑی چمکدار آنکھوں سے اس نے کوثر جہاں کو دیکھا اور بولا۔

''کون ہے ری...... کیسے آ کھڑی ہوئی یہاں؟''

''بس...... بس...... با...... بارش......''

''تو باہر کیوں کھڑی ہے؟ اندر آ جا۔''

''نہیں بس...... آپ...... آپ...... میں...... بس میں چلی جاؤں گی۔ جونہی بارش رکی، میں چلی جاؤں گی۔''

''بارش رکے گی...... پتہ ہے تجھے بارش رکے گی؟''

''رک جائے گی۔ نہیں رکے گی تو ایسے ہی چلی جاؤں گی۔''

''اری تو موت کیوں آ رہی ہے...... کھا تو نہیں جاؤں گا تجھے۔ بھیڑیا ہوں کیا...... چل، اندر چل۔''

''نن......نن......نہیں جاؤں گی۔'' کوثر جہاں سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

''چل پاگل کی بچی...... بچی بھی ہے تیرے ساتھ...... چل، اندر چل۔'' اس نے آگے بڑھ کر کوثر جہاں کا بازو پکڑ لیا۔ ہاتھ کی گرفت تھی کہ خدا کی پناہ، تھوڑے جھٹکے سے وہ کوثر جہاں کو گھسیٹ کر جھونپڑی کے اندر لے آیا۔ کوثر جہاں کے منہ سے مدھم مدھم کراہیں نکل رہی تھیں۔ یہ آوازیں نہ تو رونے کی تھیں نہ چیخنے کی، عجیب سی بے بس کراہیں تھیں۔ تسنیم بدستور سہمی ہوئی اس کے کاندھے سے چمٹی ہوئی تھی۔

''پانی میں شرابور ہو رہی ہے...... کپڑے بھی بھیگے ہوئے ہیں...... اور مصیبت کیا آ رہی تھی تجھے اس بارش میں نکلنے کی؟ کئی دن سے تو بارش ہو رہی ہے۔''

''مسافر ہوں...... حیدر آباد سٹیشن پر غلطی سے اتر گئی تھی۔ کہیں اور جا رہی تھی، کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ بس یہیں پر چلی آئی۔''

''ہوں، ہوں...... اچھا اچھا...... دیکھ، وہ کپڑے پڑے ہوئے ہیں، چارپائی وہ موجود ہے۔ اپنے بھی کپڑے بدل لے۔ میرے پاس زنانہ کپڑے نہیں ہیں، بچی کے بھی کپڑے نچوڑ کر پھیلا دے، صبح کو پہن لینا۔ بالکل فکر مت کر...... بالکل فکر مت کر سمجھی۔ تُو اپنے بھائی کے گھر میں ہے۔ دروازہ اندر سے بند کر لے، میں باہر پہرہ دوں گا۔ کسی کی مجال نہیں کہ تیری طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے۔ حیدر ہے میرا نام...... حیدر پہلوان...... اور حیدر پہلوان زبان سے جو کچھ کہتا ہے وہی کرتا ہے۔ بھائی سمجھ لے مجھے، تیرا ماں جایا نہیں ہوں مگر انسان ہوں۔'' وہ باہر نکل گیا اور کوثر جہاں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی۔ چمکدار بڑی بڑی آنکھوں والا، بڑی بڑی مونچھوں والا یہ غنڈہ جس کے منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے، کیا پنڈت اور مولوی سے بہتر انسان نہیں ہے؟ اس نے سب سے پہلے دروازہ بند کیا اور اندر دیکھنے لگی۔ یقیناً وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اندر اور کوئی دروازہ نہیں تھا۔ وہ غنڈہ درحقیقت دل اور زبان کا سچا تھا۔

○●○

حاجو نے ایک بار پھر تالا مار لیا تھا۔ دو ہزار روپے جیب میں آئے تھے۔ مکھن شاہ تو خیر کیا ملتا، وہ تو لاہور ہی چھوڑ بھاگا تھا یا اگر ہو گا بھی تو کسی ایسے گوشے میں جہاں سے وہ حاجو کو نظر نہ آ سکے۔ اچھی خاصی کمائی کرا دی تھی حاجو نے۔ بہرحال کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا حاجو

نے۔ غلام شاہ کو ہمیشہ ہی نیچا دکھا دیا کرتا تھا حاجو اپنی عقل اور ذہانت سے۔ غلام شاہ ایک مضبوط بدن کا مالک تھا تو حاجو ایک مضبوط دماغ کا۔

بہرحال جو رقم حاصل کی تھی، ہلال تو کرنی ہی تھی۔ چنانچہ اپنی جیسی تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔ ادھر کوثر کے کنگن گلے میں اٹکے ہوئے تھے۔ حاجو جانتا تھا کہ غلام شاہ ایک بچھو ہے۔ اگر سن گن مل گئی تو آفت آ جائے گی اور پھر چوری کے الزام سے نہ بچ سکے گا۔ بہتر ہے کہ کچھ کر ڈالا جائے۔ ایک کام کا آدمی تھا، بہت سنا تھا اس کے بارے میں۔ چنانچہ اس کے پاس پہنچ گیا۔

''آؤ میاں جی! کہو کیا بات ہے؟'' بابو خان نے پوچھا۔

''سنا ہے خرید و فروخت کرتے ہو۔''

''ہاں ہاں، کرتے ہیں...... سناؤ، کیا لائے ہو؟''

''ذرا ان کنگنوں کی قیمت تو بتاؤ۔'' حاجو نے کنگن سامنے کر دیئے۔ چور بازار کے دکاندار نے خوب ٹھونک بجا کر دیکھا، پھر بولا۔

''پندرہ سو روپے مل جائیں گے۔''

''پاگل ہوئے ہو کیا؟ وزن تو دیکھو۔''

''ہے تو چوری کا میاں جی! ہم چیز کا وزن نہیں، بیچنے والے کی شکل دیکھتے ہیں۔ ویسے کھوٹ کافی ہے۔ نگینوں کی قیمت الگ۔ پندرہ سو سے زیادہ نہیں دے سکتے۔''

''ٹھیک ہے...... کہیں اور دکھا دیں گے۔'' حاجو نے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔

''دکھاؤ گے تو ضرور مگر نام پتہ پوچھے بغیر کوئی نہیں خریدے گا۔ رسید دے دو گے تو ہزار روپے اوپر سے مل جائیں گے۔ یہ تو ہم ہی ہیں کہ سب کی مشکل میں کام آ جائیں۔ چلو ٹھیک ہے، ایسا کرو ڈھائی ہزار لے لو۔ یہ بھی صرف تمہارے لئے ہیں۔''

''لعنت ہے تم پر...... چلو نکالو پیسے۔''

ڈھائی ہزار یہ اور دو ہزار وہ لے کر چل پڑا۔ بہرحال اسے تو عیش ہی عیش تھے اور غلام شاہ اپنی سی ہر کوشش کر کے ہار چکا تھا۔ حاجو نے کھانے پینے کا فیصلہ کیا۔ ایک اچھے سے ہوٹل میں گیا، پسند کے کھانے منگوائے اور پھر نجانے تقدیر کو کیا منظور تھا کہ اچانک ہی غلام شاہ کو سامنے پایا۔ چھپنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ دم نکل گیا تھا۔ ہمارا کھایا پیا حرام ہو گیا۔

وہی ہوا، غلام شاہ نے اسے دیکھا، ایک لمحے کے لئے حیران ہوا اور پھر اس کے پاس پہنچ گیا۔

''ہوں......تو یہ عیش ہو رہے ہیں حاجو! واہ واہ، پھر کوئی خزانہ مار لیا کیا؟ پچھلے دنوں کی بات تو تمہارے اور میرے دونوں کے علم میں ہے۔ خوب چکر چلایا مکھن شاہ کا۔''

''دیکھو مجھ سے فضول باتیں مت کیا کرو۔''

''اچھا پھر ایک بات بتا دو، یہ خزانہ آ کہاں سے گیا؟''

''تمہارا نہیں چرایا ہے۔'' حاجو نے کہا۔

''پھر کس کا چرایا ہے؟''

''تمہارا کاروبار نہیں کرتے۔''

''ہمارا کاروبار کیا ہے؟''

''جیب کترے ہو پورے جیب کترے۔'' حاجو نے کہا اور غلام شاہ ہنس پڑا۔

''چلو چھوڑو، کیا کھا رہے ہو؟''

''کیوں، بھیک مانگنے نکلے ہو کیا؟''

''نہیں، اللہ کا فضل ہے۔ لیکن استاد ماننے کو دل چاہتا ہے تمہیں۔'' غلام شاہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''لعنت ہے تم پر۔''

''کچھ دل کی باتیں کر لیں۔ پتہ ہے ہمیں کہ تم نے پھر حلال کر دیا ہے شمشیرہ بیگم کو۔''

''تمہاری طرح حرام خوری تو نہیں کی۔''

''مل بانٹ کر کھانا چاہئے۔''

''محنت نہیں ہوتی تم سے۔ بھیک ہی مانگتے رہتے ہو ہاتھی جیسا بدن رکھ کر۔''

''موذی کا مال مارا ہے، ہمارا بھی حصہ لگاؤ۔''

''اس کا مطلب ہے تم شمشیرہ بیگم کو موذی کہہ رہے ہو۔ بتانا پڑے گا انہیں۔''

''کیا کہو گے ان سے؟'' غلام شاہ نے ہنس کر کہا۔

''یہی کہ تم نے انہیں موذی کہا ہے۔''

''مال بھی تو کہا ہے...... مال کے بارے میں انہیں کیا بتاؤ گے؟''

''کیڑے پڑیں گے تمہارے غلام شاہ! کیڑے پڑیں گے۔''

''دیکھا جائے گا...... چلو کتنے مارے ہیں شمشیرہ بیگم سے؟ اتنا تو بتا دو۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' حاجو اچھل پڑا۔

''سنا ہے دو ہزار مانگے ہیں۔ ہزار نکال دو سیدھ سیدھے، آسانی سے ہضم نہیں کر پاؤ گے۔''

حاجو کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ غصے سے کھول گیا، پھر بولا۔ ''کس نے بتائی یہ بات تمہیں؟''

''ارے چھوڑو، چلو رقم ڈھیلی کرو۔''

''ٹھیک ہے...... دے دوں گا۔''

''دے دوں گا نہیں، دے دو۔''

''سوچ لو غلام شاہ! سوچ لو اچھی طرح۔''

''سوچ لیا ہے اچھی طرح حاجو میاں! سانپ ہیں ہم بھی۔ ایسا ڈسیں گے کہ پانی نہیں مانگو گے۔''

''اگر یہ بات ہے غلام شاہ تو تم بھی ایک بات سن لو، ہم بھی نیولے ہیں سمجھے۔ تمہارا پھن کاٹ کر نہ پھینک دیا تو نام نہیں ہمارا حاجو۔''

''اماں جاؤ، مچھر کی طرح کان پر بھنبھناتے رہتے ہو۔ کیا بگاڑ لو گے ہمارا؟''

''بس دیکھ لیں گے۔'' حاجو نے کہا۔ کاؤنٹر پر پیسے دیئے اور باہر نکل آیا۔ غلام شاہ نے خون کھولا دیا تھا۔ غصے سے کانپ رہا تھا۔ کیا، کیا جائے؟ پیدل بہت دور نکل آیا۔ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب کچھ کر کے ہی دم لے گا۔ پھر ایک ڈاک خانے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ کچھ خیال آیا، ڈاک خانے کے سامنے عرضی نویس بیٹھے ہوئے تھے۔ حاجو کچھ سوچ کر عرضی نویس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کیا لکھوانا ہے؟''

''کام ہے آپ سے ایک۔''

''فرمائیے......''

''یہ بتائیے غلام شاہ کو جانتے ہیں آپ؟''

''کون غلام شاہ؟''

''شمشیرہ بیگم کہ کوٹھے پر طبلہ ٹھونکتے ہیں ہیرا منڈی میں۔''

''لاحول ولاقوۃ، کسی طبلچی سے ہمارا کیا واسطہ؟'' عرضی نویس نے کہا۔

''اکثر دیکھا ہے انہیں آپ کے پاس۔'' حاجو نے پتھر پھینکا۔

''عرضی وغیرہ لکھوانے آتے ہوں گے۔ اب ہمیں آنے والے گاہکوں کے بارے میں کیا معلوم؟''

''منی آرڈر بھی لکھتے ہیں آپ؟''

''ہاں، کیوں نہیں؟''

''چلئے ٹھیک ہے، ایک چٹھی لکھ دیجئے۔'' حاجو نے کہا۔

''کس کے نام؟''

''میرے خالو فیصل آباد رہتے ہیں۔ تحریر میں بتائے دیتا ہوں۔'' حاجو نے کہا اور پھر چٹھی لکھوانے لگا۔ بہرحال غلام شاہ کو ایک بدترین شکست دینا تھی۔ حاجو کے دل میں ایک نئی لگن بیدار ہوگئی تھی۔ رات بھر منصوبوں کے جال بنتا رہا، صبح کو چل پڑا۔ سڑک گردی کررہا تھا کہ اردو بازار کے پاس ایک فال نکالنے والے کے سامنے جا بیٹھا۔ بوڑھا سا آدمی تھا وہ۔ گاہک سمجھ کر متوجہ ہوا اور بولا۔

''فال نکلوانی ہے؟''

''کیا نام ہے تمہارا؟'' حاجو نے پوچھا۔

''حکیم اللہ...... کیا کرنا ہے نام کا؟''

''کتنے میں فال نکالتے ہو؟''

''جو جی میں آئے دے دینا۔''

''پیسے بتاؤ۔''

''روپیہ، دو روپے، پانچ روپے، دس روپے۔''

''کتنے گاہک آجاتے ہیں دن میں؟''

''کیا تم بھی فال نکالنے والے ہو بھائی؟ بیٹھنا چاہتے ہو یہاں؟''

''نہیں...... بس تمہاری کچھ کمائی کرانی ہے۔''

''کیسے؟''

''ایک جگہ چل کر بس فال نکالنا ہوگی۔''

''پچیس روپے لیتے ہیں...... اس سے ایک روپیہ کم نہیں لیں گے۔''

''یہ سو روپے رکھو اور مزید سو روپے کام ہونے کے بعد۔'' حاجو نے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر فال نکالنے والے کو دیا اور فال نکالنے والے کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے بے یقینی کے انداز میں حاجو کو دیکھا، پھر حسرت سے بولا۔

''مذاق کررہے ہو بھائی؟''

''ہمارے کام کا وعدہ کرو اور نوٹ جیب میں رکھ لو۔''

''بڑی مہربانی۔ جو کہو گے کریں گے۔''

''نوٹ جیب میں رکھ لو۔ اگر کام ہماری پسند کے مطابق ہوگیا تو سو نہیں، دو سو اور دیں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں اور بھی کچھ دے ڈالیں۔''

''جان حاضر ہے...... جان حاضر ہے سرکار! آپ حکم کریں۔''

''تو پھر غور سے سنو، جو کچھ ہم بتا رہے ہیں ویسے ہی کرنا ہے۔'' حاجو نے کہا اور حکیم اللہ کو اپنے منصوبے کی تفصیل بتانے لگا۔ حکیم اللہ بے چارے کو سو روپے کا نوٹ کیا ملا تھا وہ تو حاجو کا غلامِ بے دام بن گیا تھا۔

○●○

سارے بزرگ اپنے مشن پر نکلے ہوئے تھے۔ غیاث الدین، نادر شاہ، جواد حسین تقریباً تمام ہی افراد۔ کچھ اور لوگوں کو بھی اس مشن میں شامل کرنا تھا جیسے نظام الدین اور ملک اللہ نواز۔ ایک ایسا گورکھ دھندا پھیل گیا تھا جس میں ہر مسئلے کو سلجھانا تھا۔ ادھر اللہ نواز، ماسٹر شیر علی خان کی زبانی لاہور میں رب نواز کے موجود ہونے کی خبر پانے کے بعد منصوبہ بندی میں مصروف ہوگئے تھے۔ غیاث الدین کو بھی اس کام میں شامل کرنا چاہتے تھے لیکن بہت سی سوچیں اور بھی دامن گیر تھیں۔

بہرحال وہ لوگ ادھر اپنے کاموں میں مصروف تھے اور ادھر اکرام کے بارے میں خاص طور سے لوگوں کو ہدایات کر گئے تھے کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ حکیم صاحب بدستور علاج کررہے تھے۔ پیش گوئی کردی تھی کہ بس بہت جلدی اکرام کے چہرے کے یہ تمام

داغ مٹ جائیں گے اور اس کی اصلی شکل نمایاں ہو جائے گی۔ اکرام کی کیفیت بھی پہلے سے کافی بہتر تھی۔ عرشیہ تو خیر اسے چھوٹے بھائی کی طرح چاہنے ہی لگی تھی لیکن شانہ کو بھی اکرام کے قریب جانے کا موقع مل گیا تھا۔ لندن کی پروردہ یہ لڑکی اپنی فطرت میں بے مثال تھی اور اس پر لندن کی کوئی چھاپ نہیں پڑی تھی۔ وہ اپنے طور پر اکرام کے لئے اپنے دل میں ایک بہت بڑا مقام محسوس کرنے لگی تھی بلکہ اپنے معصوم سے ذہن سے اس نے سوچا تھا کہ لگن اگر سچی ہو تو محبوب اور مطلوب اس طرح سامنے آ جاتا ہے کہ یقین نہ آئے۔ جب بھی موقع ملتا خود بھی اکرام کی خدمت کرنے لگتی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اکرام بھی اس پر غور کرتا ہے۔ اسی دوران ایک اور چھوٹا سا واقعہ پیش آ گیا۔ یہ جمال بیگ تھا جو غیاث الدین کا دور کا رشتے دار تھا۔ آوارہ منش اور لچا لفنگا قسم کا آدمی۔ گھر والوں نے ایک طرح سے اس سے قطع تعلق ہی کر لیا تھا۔ بس ایسے ہی اِدھر اُدھر چکر لگاتا رہتا تھا۔ گجرات پہنچا اور ان لوگوں کے لئے عذابِ جان بن گیا۔

فاخرہ بیگم نے حیرت سے غیاث الدین کی بیگم سے کہا۔ ''باجی! معاف کیجئے گا، اس شخص سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟''

''بس غیاث الدین کے بہت دور کے رشتے داروں میں سے ہے۔ کراچی میں رہتے ہیں یہ لوگ۔ غیاث تو ان سے کبھی ملتے نہیں، یہ عجیب سا شخص ہے، آ جاتا ہے کبھی کبھی اور گھر میں فضول باتوں کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ غیاث بڑے با مروت آدمی ہیں، چنانچہ اسے دو چار دن برداشت کرتے ہیں۔ کچھ لے دے کر چلا جاتا ہے۔''

''بچیوں کو ذرا احتیاط سے رکھئے گا۔ ان کے اردگرد چکراتا رہتا ہے۔''

جمال بیگ واقعی ایک لچا آدمی تھا۔ عرشیہ تک پہنچا اور مسکرا کر بولا۔

''کہئے پیا جی کا کچھ پتہ چلا؟ ویسے عرشیہ بیگم! اس کو کہتے ہیں اپنوں سے گریز کا نتیجہ۔''

''آپ کیا بکواس کر رہے ہیں جمال بھائی؟''

''نہیں..... بکواس تو بالکل نہیں کر رہے..... ارے یہ کون ہیں، کیا گھر میں آپ نے بلیاں پال لی ہیں؟'' جمال بیگ نے دور سے آتی شانہ کو دیکھ کر کہا۔

''سنئے، اس وقت گھر میں ابو نہیں ہیں، آپ بعد میں آئیے۔''

''ہم ابو سے نہیں آپ سے ملنے آتے ہیں محترمہ! کہ کبھی تو ہماری بھی دال گلے گی۔''

''لعنت ہے آپ پر..... آپ انتہائی بے اوقات آدمی ہیں۔''

''ہماری اوقات تو آپ ہی بنائیں گی۔ ارے کمال ہے بھئی، بڑے نئے نئے لوگوں کا اضافہ ہو چکا ہے۔ یہ بے دُم کا بندر کون ہے؟'' اس بار اس نے اکرام کو دیکھ کر کہا۔

''میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔''

''روٹھنے پر کوئی گانا سنائیں آپ کو..... ارے، ارے..... تم ادھر کہاں آ مرے بھائی؟''

''اکرام! یہ ایک بے غیرت آدمی ہیں، تم ان کی بات کا برا نہیں مانو گے۔''

''ہوں..... اکرام ہے ان کا نام۔ مگر تم اس کے سامنے مجھے بے غیرت کہہ رہی ہو۔''

''کاش اس سے زیادہ کچھ کہہ سکتی۔''

''اس کا نتیجہ جانتی ہو؟''

''تم یہاں سے دفعان نہیں ہو سکتے جمال بیگ؟''

''بات دراصل یہ ہے عرشیہ بیگم کہ میرا دماغ دوسری قسم کا ہے۔ اپنے جھگڑے میں خود نٹانے کا عادی ہوں..... ماں باپ کی بات بھی نہیں مانتا۔ کراچی میں میرا طوطی بولتا ہے۔ ڑے بڑوں کا دماغ ٹھیک کر دیا ہے میں نے۔ اپنی بے عزتی کرنے والے کے دانت توڑ یتا ہوں۔ اس بدتمیزی کی معافی مانگو مجھ سے، ورنہ یہاں سے سلامت نہیں جاؤ گی۔''

''کیا کر لیں گے آپ میرا؟'' عرشیہ بولی۔

''سزا دوں گا تمہیں اس بدتمیزی کی۔'' جمال بیگ غرایا۔

''جائیے جائیے، دیکھ لیں گے..... سزا دینے والے۔'' عرشیہ نے کہا اور جمال بیگ خونخوار انداز میں آگے بڑھا۔ اکرام بھی آگے بڑھ آیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''آپ براہِ کرم واپس چلے جائیے۔''

''ابے تُو پیچھے ہٹ اُلو کے پٹھے۔'' جمال بیگ نے اکرام کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے ری قوت سے دھکا دیا۔ چٹان تو نہ ہلی البتہ جمال بیگ خود ہی پیچھے گرتے گرتے بچا۔ اس بےعزتی سے اور دیوانہ ہو گیا۔ شاید چاقو رکھنے کا عادی تھا۔ جھٹ سے چاقو نکال لیا اور بولا۔

''بیٹا! آنکھیں نکال کر باہر کر دوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اکرام پر چھلانگ لگائی لیکن ھ میں چاقو تھا اور سامنا اکرام کا تھا۔ اکرام، جس پر رب نواز ناز کرتے تھے اور جسے ے بڑے استادوں نے استاد قرار دے دیا تھا۔ بھلا بے چارے جمال بیگ کی کیا

حیثیت تھی؟ اکرام نے بڑے فنکارانہ انداز میں لاپرواہی کے ساتھ جسم کو تھوڑی سی جنبش دی اور جمال بیگ اس کے برابر سے نکل گیا۔ چاقو سیدھا کئے ہوئے تھا۔ اکرام نے کلائی پر ہاتھ ڈالا۔ اکرام کے ہاتھ کا شکنجہ اور جمال بیگ جیسے جھینگا۔ چاقو رکھنا ایک الگ بات ہے اور چاقو کا فن دوسری چیز۔ اور پھر مقابلے کا فنکار اگر اکرام جیسا آدمی ہو تو بات کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ اکرام نے کلائی واپس موڑی اور جمال بیگ قلابازیاں کھا گیا۔ چیخ کے ساتھ چاقو ہاتھ سے نکل گیا تھا اور نوک کے بل زمین پر گر گیا تھا۔ اکرام نے چاقو کے پھل پر ایڑھی کا دباؤ ڈالا اور چاقو زمین میں اندر دھنستا چلا گیا۔ یہ ایک انوکھا فن تھا اور اتنا متاثر کن کہ جمال بیگ کے ہوش وحواس رخصت ہو گئے۔ غصہ ہوا ہو گیا۔ اندازہ ہو گیا کہ اگر اس فنکار کو غصہ آ گیا تو اس کا جو حشر ہو سکتا ہے، اس کا جمال بیگ کو ایک لمحے میں احساس ہو گیا تھا۔ قلابازی کھانے سے چوٹ بھی لگی تھی لیکن چوٹ کو نظر انداز کر کے جان بچانا ضروری تھا۔ کیونکہ پہلے وار کا مرتکب ہوا تھا اور کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اور پھر بولا۔

"ارے ارے...... بڑے بھائی! آپ تو سچ مچ ناراض ہو گئے۔ مم...... میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

اکرام نے پاؤں کے انگوٹھے سے حفاظت کے ساتھ چاقو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ چاقو زمین سے نکال لو تم تو تمہیں فاتح مان لیا جائے گا۔"

"نہیں بھئی...... یہ مذاق ہی مذاق میں بات بگڑ گئی۔ اصل میں تمہیں علم نہیں ہے بڑے بھائی جان! بچپن کا ساتھ ہے ہمارا عرشیہ بیگم سے۔ ہمارا اور ان کا مذاق تو چلتا ہی رہتا ہے۔ جب بھی یہاں آتا ہوں تو ان سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا ہوں۔ ہمیشہ سے عادت ہے میری۔ لیکن اس بار ان کا مزاج نجانے کیوں بگڑا ہوا ہے، ناراض ہی ہو گئیں۔ ٹھیک ہے، اگر یہ بات ہے تو آئندہ خیال رکھیں گے۔" جمال بیگ بزدل تھا اور یہاں سے فرار کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔

عرشیہ کی ہنسی نکل گئی۔ اس نے فخریہ انداز میں اکرام کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو تم نے زبردست کھیل دکھایا اکرام۔ جمال بیگ صاحب تو چپل بیگ بن گئے۔ حالانکہ میں نے زندگی میں انہیں کبھی منہ نہیں لگایا۔ بھلا ان کا اور میرا کیا مذاق...... بہر حال تم کمال کے انسان ہو۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے...... بس میں...... میرا مطلب ہے کہ آپ لوگ...... آپ......"

"چلو چھوڑو......"

تھوڑی دیر کے بعد اکرام چلا گیا۔ شمانہ شرمائی شرمائی سی کھڑی تھی۔ عرشیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "قیامت کا ہے یہ بچہ تو...... اور یہ جمال بھائی، سچی بات تو یہ ہے کہ پینترا بدل لیا، جان بچالی۔ ورنہ یقینی طور پر اکرام کے ہاتھوں پٹ جاتے۔ مگر میں ایک بات بتاؤں، یہ بچھو ہیں، ڈنک مارنے سے باز نہیں آئیں گے۔ بہر حال مزہ آ گیا، چلو دیکھیں اندر جا کر کیا گل کھلا رہے ہیں۔"

دونوں تیز رفتاری سے کوٹھی کے اندرونی حصے میں آ گئیں لیکن پتہ چلا کہ جمال بیگ بالکل چپ ہیں کسی مصلحت کے تحت۔ کسی سے بھی اس بے عزتی کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ چاقو تک وہیں زمین میں گڑھا چھوڑ آئے تھے۔ البتہ دوسرے دن ٹھیک دوپہر کے وقت جب تمام لوگ اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے، جمال بیگ چپکے چپکے اس جگہ پر پہنچ گئے جہاں چاقو زمین میں پیوست تھا۔ خطرہ تو یہ تھا کہ کہیں اکرام نے چاقو زمین سے نکال نہ لیا ہو۔ لیکن چاقو زمین میں اسی طرح گڑھا ہوا تھا۔ نجانے کس کس طرح زمین کھودی اور چاقو بمشکل تمام نکالا اور پھر بولے۔

"یہ انسان ہے یا...... یا......"

بہر حال اکرام کا وقت یہاں گزر رہا تھا۔ چنانچہ حکیم صاحب نے غیاث صاحب کی بیگم سے اجازت لے کر اکرام کے چہرے سے وہ تمام پٹیاں ہٹا دیں اور ان کے حلق سے ایک آواز نکل گئی۔

"سبحان اللہ...... سبحان اللہ......"

اکرام کا چہرہ تمام داغ دھبوں سے پاک ہو گیا اور اپنی اصلی شکل میں آ گیا۔ دودھ اور میدے کی آمیزش سے گندھا ہوا سفید، شفاف، بے داغ چہرہ، آنکھوں کی نیلاہٹیں اس چہرے پر ایسی جگمگائیں جیسے سچے موتی کی بڑی سی سیپ پر دو فیروزے جڑ دیئے گئے ہوں۔ ایسا حُسن تھا ان آنکھوں میں کہ دیکھنے والا مسحور ہو کر رہ جائے۔ پچھلے دنوں جو دھندلاہٹیں اور گندگی آ گئی تھی، اب وہ چھٹ چکی تھی۔ سبک نقوش، نیلی جھیل کی گہرائی رکھنے والی

آنکھیں، ہونٹوں کی گلابیاں دیکھنے والوں کو مسحور کرنے والی۔ حکیم صاحب خود دیوانے ہو گئے تھے۔ آگے بڑھے اور اکرام کے ہاتھ پکڑے اور بولے۔

"اللہ کی دین ہے بیٹے! شاید کبھی غرور کی کوئی بات تمہارے ہونٹوں سے نکل گئی ہو۔ بہرحال ہمیشہ تکبر سے توبہ کرنا اور اس سے گریز کرنا۔ مشکل کے دن ختم۔ اللہ تعالیٰ نے حُسن و جمال میں اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔"

پھر وہ بے خودی کے عالم میں باہر نکل آئے اور سب کو اس سلسلے میں اطلاع دینے لگے۔ کہنے لگے۔ "بیگم صاحبہ! انعام تو آپ مجھے بے شک عطا کریں گی ہی لیکن اس میں میری جانب سے چار گنا اضافہ کر دیجئے گا۔ آپ کو علم ہے کہ کبھی منہ سے کچھ نہیں مانگا لیکن جو کچھ آپ کو دکھانے والا ہوں وہ ناقابل انعام ہے۔"

"کیا بات ہے حکیم صاحب؟"

"آیئے ذرا۔" حکیم صاحب نے بیگم صاحبہ کو ساتھ لیا، فاخرہ بیگم بھی ساتھ ہی تھیں۔ دونوں نے اکرام کو دیکھا اور سکوت کے عالم میں رہ گئیں۔ اکرام مسکرا رہا تھا۔ پھر بہت سی بے معنی آوازیں نکل گئیں۔ فاخرہ بیگم نے آگے بڑھ کر اکرام کی پیشانی کو بوسہ دیا اور بولیں۔

"کبھی کبھی دل، دماغ سے بہتر فیصلے کر لیتا ہے، آج اس کا قائل ہونا پڑا ہے مجھے۔ دماغ میں تو میں نے نجانے کیا کیا وسوسے پیدا کئے تھے لیکن دل نے ان تمام کو ٹھکرا کر تمہاری محبت قبول کی تھی بیٹے! جس گھر کا بھی چشم و چراغ ہو خدا اسے سلامت رکھے اور تمہیں بھی۔ میرا کیا ہے۔"

بہرحال اکرام کو دیکھ کر سب کی حالت ایسی ہی ہو گئی تھی۔

○●○

شمشیرہ بیگم پر عجیب لمحات بیت رہے تھے۔ انسان پگھل رہا تھا، ساری زندگی جس انداز میں سوچتی رہیں اب اس کے بارے میں سوچ رہی تھیں کہ وہ ٹھیک تھا یا غلط؟ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ کوثر جہاں تو اب حسرت بن گئی تھی۔ بری طرح یاد آ رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا بہرحال ماں تھیں۔ کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا، طبیعت بوجھل بوجھل سی رہتی تھی۔ شبانہ اور غزالہ بہن کی گمشدگی سے بوکھلا گئی تھیں۔ اس وقت بھی شمشیرہ بیگم اداس بیٹھی ہوئی تھیں کہ دونوں ان کے پاس پہنچ گئیں۔

"کیا بات ہے اماں! کیسی طبیعت ہے آپ کی...... کیا ہوتا جا رہا ہے آپ کو...... رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑتا جا رہا ہے۔"

شمشیرہ بیگم نے بھیگی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولیں۔

"تم لوگوں کو بہن یاد نہیں آتی؟"

"کیوں نہیں اماں!" غزالہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"یہ کوثر جہاں ایسی طوطا چشم نکلے گی ہمیں یہ نہیں معلوم تھا۔ ارے میں تو سوچ رہی تھی غصے میں کہیں چلی گئی ہے، گھوم پھر کر آ جائے گی ادھر۔"

"اماں! تمہاری طبیعت کافی خراب لگ رہی ہے مجھے۔"

"نہیں غزالہ! غلطی مجھ سے ہی ہوئی ہے۔"

"کیسی غلطی اماں؟"

"پتہ نہیں...... ماں کے دل میں نہیں جھانکا تھا میں نے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے بھی سختیاں کی تھیں اس کے ساتھ۔ مگر اولاد تو اولاد ہی ہوتی ہے۔ بیٹا ہو یا بیٹی، پاؤں تو ماں کے پیٹ میں ہی پھیلاتے ہیں دونوں۔ تکلیف تو برابر کی ہوتی ہے۔ کوثر جہاں کو میں نے اکرام کا غم دیا تھا، جان کو لگ گئی تھی بے چارے بچے کی۔ پتہ نہیں کیوں۔ بہرحال بدلہ لے لیا کوثر جہاں نے مجھ سے۔ اکرام! خدا تجھے خوش رکھے...... کوثر جہاں! غلطی ہو گئی تھی مجھ سے، مگر اب میں کیا کروں؟ کیسے تجھے بتاؤں؟ اب غلطی کا احساس ہو گیا ہے...... معاف کر دے مجھے...... آئندہ خیال رکھوں گی۔ شبانہ! ایک بات بتا مجھے بیٹی!"

"ہاں اماں بولو؟"

"ہم تو ان چیزوں سے واقف نہیں ہیں لیکن جو لوگ بیٹیاں بیاہ دیتے ہیں، پرائی ہو جاتی ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوسروں کی ملکیت بن جاتی ہیں، جی لیتے ہیں وہ ان کے بغیر؟"

"فرق ہے اماں! وہاں ایک طریقہ کار ہوتا ہے جس سے ہم واقف نہیں ہیں۔"

اسی وقت ملازمہ اندر آئی اور بولی۔ "شمشیرہ بیگم! ایک اللہ والے آئے ہیں۔ یہ لمبی داڑھی، گیروے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، ہاتھ میں ہزارہ، آنکھوں میں جلال۔ کہتے ہیں گھر کے مالک سے ملیں گے۔"

"ہیں، کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں...... کچھ بتایا؟" شمشیرہ بیگم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"اوپر آ گئے ہیں...... عجیب سی آواز ہے۔ بس ایک ہی بات کہے جا رہے ہیں کہ گھر کے مالکوں سے ملا دو۔"

"بلاؤ...... بلاؤ...... کون ہے؟" شمشیرہ بیگم نے کہا اور نوکرانی باہر نکل گئی۔ پھر وہ ایک بزرگ کو لے کر اندر آ گئی۔ بزرگ عجیب سی شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے چند قدم اندر رکھے، پھر ساکت ہو گیا۔ بھاری لہجے میں بولا۔

"حکم ہوا ہے تمہیں حقیقت سے آگاہ کریں اور بتائیں کیا کرنا ہے۔ دشمن وار کر گیا ہے، دوست سرگرداں ہے۔ ماں کے دل کی پکار دلوں کو جھنجھوڑ رہی ہے اور جب کسی کو دل سے یاد کیا جاتا ہے تو اہل دل بے سکون ہو جاتے ہیں۔ ممتا کی تڑپ نے دلوں کو غمزدہ کیا تو ہمیں طلب کیا گیا اور کہا کہ اسے تمہاری ضرورت ہے۔ اور پہلے بھی شاید تمہارے کام آ چکا ہے وہ پیر مکھن شاہ۔"

شمشیرہ بیگم اچھل پڑیں اور احترام سے بولیں۔ "حضور! اندر تو تشریف لائیے، ہمارے دلوں کو رونق بخشئے۔ ہماری یہ تقدیر کہاں کہ ایسے اللہ والے ہمارے دروازے پر آئیں۔"

"ہاں...... حکم ملا ہے...... ہم تو حکم کے غلام ہیں۔"

نو وارد ایک جگہ بیٹھ گیا، آنکھیں بند کر لیں اور تسبیح پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ شمشیرہ بیگم دو زانو بیٹھ گئیں۔ آنکھوں سے عقیدت جھانک رہی تھی۔ شبانہ اور غزالہ کو بھی ساتھ بٹھا لیا۔ خاموشی طاری رہی تو کچھ دیر کے بعد بزرگ نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"مشکل بیان کرو...... دل زخمی ہو گیا ہے...... جگر گوشہ نگاہوں سے دور ہو تو زخم تڑپاتا رہتا ہے۔ لیکن آستین میں سانپ کیوں پالتی ہو...... آستین کے سانپ کی ڈسی ہوئی ہو۔ وہ گئی نہیں ہے، اسے بھگا دیا گیا ہے۔"

شمشیرہ بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ ہکا بکا ہو گئی تھیں۔ ایسا انکشاف کیا کہ دیوانی ہو گئیں۔ آگے بڑھیں اور بزرگ کے پاؤں پکڑ لئے۔

"صدقے جاؤں، واری جاؤں...... میری مشکل حل کر دو پیر بابا! میری مشل حل کر دو...... ہائے کیا کہہ دیا، کلیجہ نکال دیا...... کون ہے آستین کا سانپ...... کس نے بھگایا میری بچی کو؟"

"بین مت کرو...... یہ گناہ ہے...... وہ زندہ ہے، خیریت سے ہے۔ آئے گی واپس...... لیکن کچھ وقت ضرور لگے گا۔ سانپ کا سر کچل دو ورنہ نقصان پہنچاتا رہے گا۔"

"اے پیر بابا! کچھ تو بتا دو...... تمہیں اللہ کا واسطہ۔" شمشیرہ بیگم گڑگڑائیں۔

"جو گیا ہے وہ واپس آئے گا...... کلیاں کھل جائیں گی، پھول مسکرائیں گے...... لیکن آنسوؤں کا نذرانہ لے کر مرشد کو اطلاع دے دوں گا۔ مکھن شاہ جو حکم دیں گے وہ کروں گا۔ مجھے بھیجا گیا ہے کہ تمہیں خوشی کی خبر سنا دوں۔ باقی میرا مرشد جانے یا پیر مکھن شاہ، یا پیر، میرا مرشد۔"

"مجھے ان کے پاس لے چلئے، آپ کو اللہ کا واسطہ...... ان کے قدموں میں گر جاؤں گی، تلوؤں سے آنکھیں رگڑوں گی۔ مان لیں گے وہ میری۔"

"ابھی نہیں...... تمہارا ان کے پاس جانا ضروری نہیں ہے۔ وہ حالات سے باخبر ہیں، جو بہتر سوچیں گے وہ کریں گے۔ انتظار کرلو۔"

"مگر آستین کا سانپ کون ہے؟"

"لمبا چوڑا جسم، لمبا قد، تمہارے اپنوں میں سے ہے...... نوکیلی مونچھیں، لالچ کا مرض...... بس دولت کی ہوس نے ایمان خراب کر دیا۔"

"لمبا چوڑا، لمبا قد، نوکیلی مونچھیں...... اے غزالہ اور شبانہ! کچھ سمجھیں؟" شمشیرہ بیگم سرسراتی ہوئی آواز میں بولیں۔ اتنی دیر میں پیر صاحب کھڑے ہو گئے تھے۔

"ارے ارے...... بیٹھئے...... کچھ شربت پانی۔"

"فقیر لالچ سے مبرا ہیں...... حق اللہ......" پیر بابا آگے بڑھ گئے اور شمشیرہ بیگم اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھتی رہ گئیں۔ پھر وہ شبانہ اور غزالہ کی طرف رخ کر کے بولیں۔

"تم کچھ سمجھیں؟"

"حلیہ تو غلام شاہ کا بتایا ہے۔"

"ارے وہی موذی ہے...... مگر ایسے ڈسے گا...... اے غلام شاہ! تیرا بیڑا غرق ہو، موت مڑ کر لے جائے تجھے...... یہ تُو نے کیا، کیا...... کیوں کیا ایسا؟"

"اماں! نام تو نہیں لیا کسی کا...... ہو سکتا ہے کوئی اور ہو" شبانہ نے کہا اور شمشیرہ بیگم

گردن ہلانے لگیں۔ سوچوں کے دائرے پھیلتے چلے گئے۔ غلام شاہ نے آخر ایسا کیوں کیا؟

حاجو درحقیقت اس بار غلام شاہ پر بھاری پڑ گیا تھا۔ بڑا کامیاب پانسہ پھینکا تھا۔ غلام شاہ ہمیشہ اسے ذلیل وخوار کیا کرتا تھا، ہر جگہ اس کا راستہ کاٹتا تھا۔ بہرحال یہ شخص وہی نجومی تھا جسے معاوضہ دے کر حاجو نے اس کام پر آمادہ کیا تھا اور اس بار واقعی ایسا کاری وار کر دیا تھا کہ غلام شاہ کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ادھر حاجو نے نجومی کو شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر سکھا پڑھا کر بھیجا تھا اور ادھر اس عرضی نویس سے ایک خط لکھوایا تھا جس کی تحریر یوں تھی۔

”غلام شاہ!

میں خیریت سے ہوں۔ تمہاری عنایت سے وہ یہاں پہنچ گئی ہے اور خوش ہے۔ بچی بھی اطمینان سے ہے۔ مگر وہ کہتی ہے کہ کسی طرح لڑکے کے باپ کو تلاش کیا جائے۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے کہ یہ کام ضرور کروں گا...... اب میں ایسا کروں گا کہ اسے مختلف شہروں میں لے کر پھروں گا اور آخر کار اس سے کہہ دوں گا کہ وہ شخص نہیں ملا۔ اب اس کے بعد اس کا واپس ملنا تو بے کار ہی ہے۔ اس کے علاوہ باقی ساری باتوں کی فکر مت کرنا۔ ہمارے درمیان اس کام کے پندرہ ہزار طے ہوئے تھے۔ بالکل فکر مت کرنا، میں پوری رقم کی ادائیگی کے لئے ذمے دار ہوں۔ احتیاطاً اپنا نام نہیں لکھ رہا، لیکن تم یہ جانتے ہو کہ میں کوثر جہاں کا عاشق ہوں۔“

خط کیا تھا، بارود کا ڈھیر تھا۔ غلام شاہ کی موت کا پروانہ تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ غلام شاہ نے کسی سے کوثر جہاں کا سودا کیا ہے۔ بہرحال ادھر پیر صاحب گئے، اُدھر ڈاکیے نے دروازے سے آواز لگائی۔ خط ملازمہ نے وصول کیا۔ غلام شاہ کا نام تو پڑھ نہیں سکی تھی، لا کر شمشیرہ بیگم کو دے دیا۔ یہاں وہی سوچیں چل رہی تھیں۔

”کس کا خط ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

”دیکھو شبانہ! کہیں میری کوثر جہاں نے نہ بھیجا ہو۔“

”اماں! غلام شاہ کے نام ہے۔“

”چولہے میں جھونکو، بھاڑ میں جائے...... یہ غلام شاہ ہے کہاں؟“

”گیا ہوا ہے۔“

”شبانہ! ذرا یہ خط مجھے دینا۔“ غزالہ نے کہا اور شمشیرہ بیگم چونک کر غزالہ کو دیکھنے لگیں، پھر بولیں۔

”کہاں سے آیا ہے...... ذرا کھول کر تو دیکھو۔ ہوسکتا ہے کوئی کام کی بات لکھی ہو۔“

”کھول لوں اماں؟“

”ہاں ہاں، کھولو۔“ شمشیرہ بیگم نے کہا اور غزالہ نے لفافہ چاک کر لیا، خط نکالا اور اسے پڑھنے لگی۔ جوں جوں وہ خط پڑھتی جا رہی تھی، اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ شمشیرہ بیگم غور سے اس کی صورت دیکھے جا رہی تھیں۔ آخر انہوں نے ہول کر کہا۔

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”اماں! غضب ہو گیا۔“

”اری ہوا کیا...... کچھ منہ سے تو پھوٹ۔“

”خط سنو ذرا۔“ غزالہ نے کہا اور زور زور سے خط پڑھنے لگی۔ شمشیرہ بیگم کے چہرے کا رنگ ایک ایک لفظ پر بدلتا جا رہا تھا۔ خط ختم ہوا تو شمشیرہ بیگم سینہ کوبی کرنے لگیں۔

”آخر بھید کھل گیا تیرا موذی غلام شاہ...... ہائے تیرا ستیاناس، رقم لے کر تُو نے میری بچی بیچ دی...... ہاں ہاں، بیچ دی تُو نے رقم لے کر میری بچی...... ہائے کہاں پہنچا دیا اسے ...... ارے دیکھو تو سہی، وہ کتیا زادہ ہے کہاں؟“ شمشیرہ بیگم شروع ہوئیں تو ایسی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ بھگدڑ مچ گئی، غلام شاہ اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا، نکلا ہوا تھا۔ جونہی اطلاع ملی، شمشیرہ بیگم کی پالیسیاں کام کرنے لگیں۔ ایک ایک کو ہدایت کر دی کہ گھر میں گھسے تو چہرے سے اظہار نہ ہونے دیا جائے۔ پتہ نہ چلے کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ ایک دم چھاپہ مارا جائے گا، بند کر لیا جائے گا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد غلام شاہ کے خلاف پوری پوری مورچہ بندی کر لی گئی۔ حاجو کے دل میں ٹھنڈک اُتر رہی تھی۔ غلام شاہ کے خلاف جو مورچہ تیار کیا گیا وہ کمال کا تھا اور حاجو بہت خوش تھا۔

بہرحال شامت آ گئی تھی بے چارے غلام شاہ کی۔ پھر وہ شامت کا مارا واپس آیا۔ وہم وگمان مین بھی نہیں تھا کہ کسی مشکل میں پھنسنے والا ہے۔ ملازموں کے چہرے بھی غور سے

نہیں دیکھے۔ اندر گھسا تو دھڑ سے سارے دروازے بند ہو گئے۔ چونک کر پلٹا، دروازے کے قریب پہنچا، باہر کی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ دروازہ دھڑ دھڑانے لگا اور چیخنے لگا۔

"ارے کون بے وقوف ہے...... کس نے دروازہ بند کیا؟"

"ہم بے وقوف ہیں غلام شاہ!" شمشیرہ بیگم کی آواز سنائی دی اور غلام شاہ چونک کر پلٹا۔ پیچھے شبانہ اور غزالہ وغیرہ آ گئی تھیں۔ حاجو نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ غلام شاہ کی درگت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ غلام شاہ ہکا بکا ہو کر شمشیرہ بیگم کو دیکھنے لگا۔ شمشیرہ بیگم لال بھبھوکا ہو رہی تھیں۔

"جی تو چاہتا ہے موذی کہ تیری آنکھوں میں انگلیاں ڈال دوں...... کچا چبا جاؤں تیرے ٹینٹوے کو...... بڑا ہی نمک حرام نکلا تُو تو۔"

"اے شمشیرہ بیگم! ہوش کی دوا کرو...... کسی نے بھنگ پلا دی ہے کیا؟ کس سے بات کر رہی ہو تم؟ غلام شاہ ہے میرا نام۔"

"ارے نام مٹ جائے تیرا موذی! تُو نے برباد کر دیا ہمیں...... بتا میری بچی کہاں ہے؟ کہاں بیچا ہے تُو نے اُسے؟ میں پوچھتی ہوں غلام شاہ! کیوں میرے کلیجے میں چھری گھونپی تُو نے؟ پیسے کی ضرورت تھی تو ڈاکہ مار لیتا۔ ایسے سینے میں تو خنجر نہ گھونپتا۔"

"دیکھو شمشیرہ بیگم! میں ہوں ذرا دوسری قسم کا آدمی۔ ساری باتیں اپنی جگہ، تمہاری وفاداری، تمہاری محبت میں ساری زندگی یہاں گزار دی۔ لیکن تمہیں پتہ ہے گالیاں سننے کا عادی نہیں ہوں۔ بک کیا رہی ہو...... منہ سے تو پھوٹو۔"

"اسے کہتے ہیں بی بی، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ کتنے میں بیچی تُو نے میری بیٹی؟ بول!"

"کس کی بات کر رہی ہو...... دماغ خراب ہے کیا؟"

"ہائے...... کیسا معصوم بن رہا ہے...... تیرا بیڑا غرق ہو...... سینے میں چھری مار دی۔ کس دل سے تیری عزت کروں؟"

"دیکھو شمشیرہ بیگم! عزت کی بات میرے سامنے مت کرو۔ عزت دار کسی کی عزت کرتے ہیں۔ جس کی اپنی کوئی عزت نہ ہو وہ کسی کی کیا عزت کرے گا۔ میں ایک بار پھر تم سے کھل کر کہہ رہا ہوں کہ جو بھیجے میں ہے اسے سیدھی طرح باہر نکال لو اور الٹی سیدھی باتیں مت کرو۔ ورنہ میرا دماغ پھر گیا تو قسم اللہ کی خون خچر کر دوں گا۔ گالیاں سننے کا عادی نہیں

ہوں۔"

"مردنی دکھا رہا ہے...... مرد عورتوں کو بیچا نہیں کرتے غلام شاہ!"

"میں نے کون سا تمہاری ماں کو بیچ دیا شمشیرہ بیگم؟" غلام شاہ بولا۔

"کوثر جہاں کو نہیں بیچا تُو نے؟"

"کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"زبان چلا رہا ہے مجھ سے...... عورت سمجھ کر سینہ تانا ہوا ہے۔ قانون کا سہارا حاصل کروں گی میں۔ پرچہ کٹواؤں گی میں تیرے نام کا غلام شاہ! شمشیرہ بیگم ہے میرا نام، چھوڑوں گی نہیں۔ اسے کہتے ہیں گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ میں کہتی ہوں کیا موت پڑی تھی تجھے کہ میری بچی کو ہی بیچ دیا؟"

"میں نے کہیں نہیں بیچا تیری بچی کو شمشیرہ بیگم! کس گدھے نے تجھ سے کہا ہے؟"

"اچھا...... پہلے سے بنائی ہوئی منصوبہ بندیاں ایسی ہی ہوتی ہیں سمجھے...... ایسی ہی ہوتی ہیں۔ خط مل گیا ہے تیرے باپ کا۔"

"کک...... کیسا خط؟"

"دکھاؤ ذرا اسے خط۔"

غزالہ نے وہ خط غلام شاہ کے سامنے کر دیا۔ غلام شاہ نے خط پڑھا اور ہکا بکا رہ گیا۔

"یہ...... یہ کہاں سے آیا؟"

"پولیس بتائے گی تمہیں میرے بھیا! پولیس بتائے گی۔" شمشیرہ بیگم نے خط غلام شاہ کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

"خط مجھے دے دو شمشیرہ بیگم! یہ میرے خلاف کوئی سازش ہے۔"

"اب اس کا پتہ تو پولیس ہی چلائے گی کہ کس نے کس کے خلاف سازش کی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تمہیں اس بات کا یقین ہو گیا ہے؟ اوہو...... اوہو...... میں سمجھ گیا...... حاجو! ادھر آؤ۔"

"کک...... کیوں...... ہم کیوں آئیں...... کوئی نوکر ہیں تمہارے؟" حاجو دو قدم آگے بڑھا اور شمشیرہ بیگم کے پیچھے ہو گیا۔ "شمشیرہ بیگم! ہم دبلے پتلے ضرور ہیں لیکن اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ روکیے ان غلام شاہ کو، ہم نے کیا، کیا ہے آخر؟"

"یہ سب تیری کارستانی ہے حاجو! نمٹ لوں گا تجھ سے۔"

"کیسی کارستانی...... لو...... شمشیرہ بیگم! تم سیدھی سیدھی پولیس کو اطلاع کیوں نہیں کرتیں؟ یہ خط پولیس کو دکھاؤ اور غلام شاہ کو ہتھکڑی لگوا دو۔ یہ ایسے نہیں مانے گا۔"

غلام شاہ طیش کے عالم میں حاجو پر جھپٹا اور حاجو نے اندر چھلانگ لگا دی۔ غلام شاہ دروازے پر پہنچا تو پیچھے موجود ملازم نے دروازہ بند کر دیا۔ یہ منصوبہ بندی بھی پہلے سے کی گئی تھی۔ ادھر شمشیرہ بیگم چیخم دھاڑ مچانے لگیں۔ شبانہ اور غزالہ گوشوں میں سمٹ گئیں۔ اچھی خاصی دھماچوکڑی ہو گئی تھی۔ شمشیرہ بیگم نے کہا۔

"نہیں جان بچا سکتے غلام شاہ! نہیں جان بچا سکتے۔"

"شمشیرہ بیگم! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو، کیا بیوقوفی مچا رکھی ہے تم نے...... میں اور بھلا کوثر جہاں کو بیچوں گا؟ ذرا یہ خط ایک بار پھر دکھانا مجھے۔"

"نہیں دکھانے کی...... اگر میری طرف آگے بڑھے تو سر پھوڑ لوں گی دیوار سے۔ خودکشی کرلوں گی اور پھر خون کا الزام بھی لگوا دوں گی تم پر۔"

"دیکھو شمشیرہ بیگم! میں کچھ دیکھنا چاہتا ہوں...... کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"ایسے جھانسوں میں نہیں آؤں گی...... کہاں تک بھاگو گے...... ارے جاؤ، دروازہ کھلوا دو، غلام شاہ کو چھوڑ دو۔ دیکھوں گی کہاں تک جاتا ہے۔ جب تک کوثر جہاں کا پتہ نہیں بتائے گا، جب تک کوثر جہاں واپس گھر میں نہیں آ جائے گی غلام شاہ! میں تیری جان نہیں چھوڑوں گی۔" ملازموں نے دروازہ کھول دیا۔ غلام شاہ کی عقل تو چکرائی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ آہستہ قدموں سے باہر نکلا اور پھر حاجو کو تلاش کرنے لگا لیکن حاجو کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

○●○

سہمی سہمی رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی اور پھر صبح کو کسی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ کوثر جہاں کا دل ایک بار پھر سہم گیا۔ اسے مولوی صاحب یاد آ گئے تھے۔ تعجب کی بات ہے، خدا کے گھر میں ایسے لوگ داخل ہو جاتے ہیں۔ وہ عبادت گاہ جس کے نام ہی سے تقدس کا احساس ہوتا ہے، ایسے ناپاک قدموں کی متحمل کیسے ہو سکتی ہے۔ بہرحال ایک آوارہ شخص نے کم از کم اپنا قول نبھایا تھا۔ رات کے ہر لمحے وہ اس بات کی منتظر رہی تھی کہ ایک دروازہ کسی سمت سے کھلے گا اور ایک عفریت اندر داخل ہو جائے گا...... ایک وحشی، جس کے منہ سے شراب کی بُو اور آنکھوں سے دیوانگی ٹپک رہی ہو گی۔ لیکن صبح تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ تسنیم کو تو اس نے سلا دیا تھا اور وہ ابھی تک آرام کی نیند سو رہی تھی۔ لیکن خود اس نے خوف سے پلکیں تک نہیں جھپکائی تھیں۔ اپنے آپ کو سمجھایا بھی تھا کہ کوثر جہاں! کون سی عزت کی زندگی گزاری ہے تُو نے؟ اب آرام کی نیند سو جا۔ جب تقدیر میں یہی سب کچھ لکھا ہے تو تقدیر سے کیسے جنگ کر سکتی ہے تُو؟ اگر وہ اندر آ گیا اور اس کی وحشت نے جنون کی شکل اختیار کر لی تو کیا ہوا...... ایسے جنونیوں سے تو اکثر تیرا واسطہ پڑتا رہا ہے...... تُو کون سی عصمت مآب کنواری دوشیزہ ہے جسے اپنے مستقبل کے برباد ہونے کا خدشہ ہو۔ لمحے اگر وہی داستان دہرانے پر تلے ہوئے ہیں تو کیوں بلاوجہ ان سے جنگ کر رہی ہے؟ سکون کی نیند اپنا لے۔ آنے والا وقت اپنے فیصلے خود کرے گا۔ لیکن نجانے کیوں ایسے لمحات میں جب یہ سوچ ذہن پر مسلط ہوتی تھی اسے اکرام کا چہرہ یاد آ جاتا تھا۔ اس نے آرزو کی تھی اپنی ماں کے لئے کہ وہ برائیوں کی طرف قدم نہ اٹھائے۔ اور کوثر جہاں نے اس کے بعد سے اس کی آرزوؤں کی تکمیل کی تھی اور اب اس کا حقیقت میں ان راستوں پر قدم بڑھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

بہرحال وہ اٹھی۔ کبھی سچے دل سے عبادت نہیں کی تھی۔ لیکن آج دل چاہا اور دوزانو بیٹھ

گئی۔ ایک اجنبی تصور ذہن میں تھا، ایک ایسا خیال جی میں آیا تھا جو بے حد مختلف تھا۔ جی چاہا کہ نماز پڑھے لیکن اسے نماز نہیں آتی تھی۔ جہاں اس کی پرورش ہوئی تھی، جہاں وہ پروان چڑھی تھی وہاں دعائیں تو ہر طرح کی مانگ لی جاتی ہیں لیکن عبادت کا وہ طریقہ کار نہیں ہوتا جو عبادت گزار کا ہوتا ہے۔ تاہم آج بڑی سچائی سے وہ آنکھیں بند کر کے دوزانو بیٹھی رہی اور بہت دیر اس طرح گزرتی گئی۔ یہاں تک کہ روشنی پوری طرح پھوٹ پڑی۔ دھوپ تو ابھی تک نہیں نکلی تھی یا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن اجالے سے اندازہ ہوتا تھا کہ خوب صبح ہوگئی ہے۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا...... اب کیا ہوگا؟ وہ بری طرح پریشان ہوگئی۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ دوسرے کا گھر تھا، وہ یہاں پناہ گزین تھی۔ دروازہ نہ کھولنا کیا معنی رکھتا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ حیدر پہلوان کھڑا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی۔ اس وقت بہتر حالت میں نظر آ رہا تھا۔ وہ خونخواری اور دہشت ناکی چہرے پر نہیں تھی۔ لمبے چوڑے بدن کا مالک، بے ڈھنگے لباس میں ملبوس، بکھرے ہوئے بال، وحشت زدہ چہرہ جسے دیکھ کر آنکھیں جھک جاتی تھیں۔ آہستہ آہستہ دو قدم آگے بڑھا اور پھر بولا۔

''مجھے اندر آ جانے دے بہن! کہہ چکا ہوں تجھے، کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گا جو برا ہو۔ بہن کا مطلب جانتا ہوں...... یہ ناشتہ لایا ہوں۔ بچی سو رہی ہے کیا؟''

''ہاں۔''

''حیدر پہلوان ہے میرا نام۔ پتہ نہیں رات کو تجھے بتایا تھا یا نہیں...... نشے میں تھا رات کو...... ناشتہ کر لے۔ اور سن، ارے کپڑے نہیں بدلے؟''

''نہیں...... اس کا لباس اتار دیا تھا میں نے۔ نچوڑ کر سکھا دیا۔ میرا لباس بھی سوکھ چکا ہے۔''

''بیوقوف ہے تُو...... بیوقوف ہے۔ سُن ایک بات کہوں، جب تک میرے پاس ہے جو کہوں کر لیا کر ورنہ میرا ایک تھپڑ منکا توڑ دیتا ہے۔'' کوثر جہاں سہم کر دو قدم پیچھے ہٹی تو وہ بولا۔

''تیری بات نہیں کر رہا...... کپڑے سکھا لیتی تو اچھا تھا۔ جان سے جوان ہے تو جھیل گئی

ورنہ ٹھنڈی ہوا سے بیمار ہو جاتی۔ ڈر رہی ہے کیا؟ تیرے ذہن میں بھائی کیا کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟ ناشتہ کر لے، اور سن ناشتے کے بعد میں تیرے پاس واپس آ جاؤں گا، تجھ سے باتیں کروں گا۔ اس کے بعد جو تیرا جی چاہے وہ کرنا مگر مری مت جا...... میں تیرے چہرے پر دیکھ رہا ہوں کہ تُو مجھ سے ڈر رہی ہے۔ ڈر مت، ہر شے کی ایک حیثیت ہوتی ہے۔ جب میں نے تجھے بہن کہہ دیا تو پھر تیرے لئے ڈر کیا معنی رکھتا ہے...... اور اگر پھر بھی تُو ڈرتی رہے تو مجھے افسوس ہوگا۔ میں سمجھوں گا کہ تُو نے میری زبان پر اعتبار نہیں کیا۔ ناشتہ کر لے، بچی کو بھی اٹھا لے۔ چائے والا چائے لے کر آئے گا تیرے لئے، میں نے اسے کہہ دیا ہے۔ اچھا باہر موجود ہوں۔ یہ چھوٹا سا گھر ہے، اسے دیکھ لے۔ دروازے کے باہر میں عموماً موجود ہوتا ہوں۔ جب ضرورت ہو تو دروازہ بجا دینا، کیا سمجھی؟ اور اگر زیادہ مری جا رہی ہے تو اسے اندر سے بند کر دے۔ میرا کوئی کام نہیں ہے خاص، بارش بند ہوگئی ہے، باہر سے ٹھیک ہے۔'' وہ بے تکے انداز میں بولا اور باہر نکل گیا۔

کوثر سامنے پڑے ڈونگے کو دیکھنے لگی تھی جس میں حلوہ پوری اور ترکاری رکھی ہوئی تھی۔ گرم گرم ترکاری سے خوشبو اٹھ رہی تھی اور تلی ہوئی پوریوں کی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ کوثر جہاں کو اچانک ہی شدید بھوک کا احساس ہوا، وہ ان جملوں پر غور کرنے لگی۔ پوری رات اس بات کا یقین دلاتی تھی کہ کم از کم جو کچھ اس نے رات کو کہا وہ بھی ٹھیک تھا اور جو کچھ وہ اب کہہ کر گیا ہے وہ بھی سچ ہے۔ اس پر اعتبار کر لینا چاہئے۔ تسنیم کو بھوک لگ رہی تھی۔ پوریوں کی خوشبو ناک تک پہنچی تو آنکھ مسلتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

''باجی! بھوک لگی ہے۔'' اس نے کہا۔

''آؤ تسنیم! تمہارا منہ دُھلا دوں۔ ناشتہ تیار ہے۔'' وہ بولی اور تسنیم کا چہرہ دُھلا کر اسے سامنے بٹھا لیا۔ نجانے کیوں دل سے ایک اعتماد سا ابھر رہا تھا۔ اس اعتماد نے اس کے دل سے جھجک ختم کر دی اور وہ ناشتہ کرنے لگی جس میں تسنیم بھی اس کے ساتھ تھی اور مزے سے ناشتہ کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''باجی! یہ گھر کس کا ہے؟''

''ایں......؟'' کوثر جہاں سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''یہ گھر کس کا ہے؟''

''یہ...... یہ ماموں کا گھر ہے بیٹے!'' کوثر جہاں کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''ماموں کیا ہوتا ہے؟'' بچی نے سوال کیا۔ یہاں بھی کوثر جہاں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ رشتے کے بارے میں اس نے صرف سن رکھا تھا، اسے خود رشتوں کی حقیقت معلوم نہیں تھی۔

''ناشتہ کرو تسنیم!''

ناشتے سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ چائے والا باہر سے اندر داخل ہوا، ہاتھ میں چائے کے برتن تھے۔ اس کے پیچھے ہی حیدر بھی آ گیا تھا۔ اس نے غصیلی آواز میں کہا۔

''ابے او کتے کی نسل! کیا کہا تھا میں نے تجھ سے...... آواز دے کر اندر جانا گدھے کے پلّے، منہ اٹھا کر اندر گھسا چلا آیا۔''

چائے والے نے حیدر کی بات کا کوئی برا نہیں مانا تھا، مسکرا کر پہلے اسے پھر کوثر جہاں کو دیکھا۔ ''بھابی ہے پہلوان؟'' اس نے سوال کیا۔

''برتن رکھ......'' حیدر نے کہا اور چائے والے نے برتن رکھ دیئے۔

''ہاں، اب بول۔''

''حیدر پہلوان! بھابی لائے ہو؟''

''کتے کے اُونٹ! بغیر سوچے سمجھے بولنے کے لئے کس نے کہا تجھ سے...... دفعہ ہو ادھر سے۔'' حیدر نے چائے والے کی گردن پکڑی، اسے دروازے تک گھسیٹ لایا۔ پھر واپس پلٹ کر بولا۔

''ادھر چائے یا کوئی چیز لے کر آئے تو پہلے آواز دے لینا، سمجھے؟''

''تو مجھے کیا معلوم تھا؟'' چائے والا بھی ڈھیٹ معلوم ہوتا تھا۔ حیدر نے ایک تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا اور وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ کوثر جہاں کے اندر اب ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، آہستہ سے بولی۔

''حیدر بھائی! آپ بھی ناشتہ کر لیجئے۔''

''تُو نے کرلیا؟ بچا ہے تو مجھے دے دے ورنہ اور آ جائے گا۔''

''بہت بچا ہوا ہے۔''

''لا پھر، اٹھا کر باہر لے جاتا ہوں۔''

''نہیں، آپ یہیں ناشتہ کر لیجئے۔''

''تیرا منہ پھر سوج جائے گا۔ مرنے لگے گی ڈر کے مارے۔ میری شکل دیکھ کر تو تجھے بخار آ جاتا ہے۔ لا، ناشتہ باہر لے جاتا ہوں۔''

''نہیں...... آپ یہیں ناشتہ کر لیجئے۔'' کوثر جہاں نے کہا۔

''دھت تیرے کی۔'' اس نے کہا اور ہنستا ہوا بیٹھ گیا۔ پھر ایک ایک پوری کو ایک ایک نوالہ بنا کر حلق میں ٹھونسنے لگا۔

''نام کیا ہے تیرا...... نام بتائے گی؟''

''مم...... میرا نام...... میرا نام کوثر...... کوثر......''

''یہ لڑکی ہے تیری؟''

''ہاں۔''

''اس کا کیا نام ہے؟''

''تسنیم۔''

''کہاں سے آئی ہے؟''

''لاہور سے۔'' چاہنے کے باوجود کوثر جہاں کے منہ سے جھوٹ نہیں نکل رہا تھا۔

''کیا کہہ رہی تھی رات کو، میں ٹھیک سے ہوش میں نہیں تھا، کیا کہہ رہی تھی؟''

''بس یہاں غلطی سے اسٹیشن پر اتر گئی۔ کوئی ٹھکانہ نہیں ہے میرا، کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''کہاں جا رہی تھی؟''

''کہیں نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ ناشتہ کرتے کرتے رک گیا۔

''میں کسی پناہ گاہ کی تلاش میں نکلی تھی، کوئی منزل نہیں تھی میری، بھائی! میری کوئی منزل نہیں تھی۔ جہاں تقدیر لے جانا چاہتی، وہاں جا رہی تھی۔''

''میاں سے لڑ کر آئی ہے؟''

''نہیں۔''

''ساس سے جھگڑا ہو گیا ہوگا۔ ارے ہاں، یہ تو بتا، یہ لڑکی تیری ہے؟''

''ہاں۔'' کوثر جہاں نے آہستہ سے کہا۔

"ضرور پھر میاں نے چھوڑ دیا ہے یا تُو خود لڑ کر آئی ہے۔ ماں باپ نہیں ہیں کیا تیرے؟"

"کوئی نہیں ہے میرا۔"

"کچھ ہو تو بتا، میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ کون ہے تیرا میاں اور کیوں جھگڑا کیا ہے اس نے تجھ سے؟"

"نہیں، آپ یقین کریں بھائی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا شوہر لاپتہ ہو گیا ہے۔ اپنی یہ نشانی چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے...... میں بے سہارا ہوں، بے بس ہوں۔ بس خدا کے آسرے پر نکل کھڑی ہوئی ہوں اور اس بات کی آرزومند ہوں کہ اللہ مجھے کہیں پناہ دے دے۔"

"اس سے پہلے تُو کہیں رہ رہی ہو گی۔"

"بھٹکتی پھر رہی ہوں اِدھر اُدھر...... تقدیر کی ماری ہوں۔"

"ایک بات بتائے گی؟"

"جی۔"

"میں نے تجھے بہن کہا ہے۔ کیا یہ دیکھ رہی ہے کہ میں بدمعاش ہوں، غنڈہ ہوں۔ بھائی کیوں نہیں کہا تُو نے مجھے؟ کیا بھائی کا رشتہ بہت برا ہے؟ ارے آدمی کتنا ہی برا ہو، بھائی کی حیثیت سے تو اچھا ہی ہوتا ہے۔ کیا تُو نے مجھے بھائی کہنے کے قابل نہیں سمجھا؟"

کوثر جہاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دل بھرا ہوا تھا، بے بسی آخری حدوں کو چھو رہی تھی اور اب کوئی ایسا سہارا نہیں تھا جس کا دامن پکڑتی۔ دل پھوڑا بن رہا تھا۔ پک کر بہنے کے لئے تیار۔ جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حیدر پہلوان خاموشی سے کھانے میں مصروف تھا۔ باقی بچی ہوئی ساری چیزیں چٹ کر گیا۔ اس لئے اس نے کوثر جہاں کے آنسو نہیں دیکھے تھے۔ آہستہ سے بولا۔

"تمہاری مرضی ہے۔ میں کیا کہوں تجھ سے۔ میری بھی سن لے، میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن، سارے رشتے مذاق ہیں میرے لئے...... بس اکیلا جی رہا ہوں میں اس دنیا میں۔ میرے جیسے بھی بہت سے ہیں، کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ارے یہ رو کیوں رہی ہے تُو؟...... ارے چھوڑ، نہیں کہنا چاہتی مجھے بھائی مت کہہ۔ کتنی دیر

کا ساتھ ہے تیرا میرا۔ تُو اپنے رستے جا لگے گی میں اپنے رستے چلا جاؤں گا۔ کوئی اور بات ہو تو مجھے بتا، دل چاہتا ہے کہ تیری مدد کروں۔"

"بھائی کہا ہے میں نے تمہیں، تم نے سنا نہیں ہو گا۔ میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

"اچھا، کہا ہے تُو نے مجھے بھائی؟ بھئی سنا نہیں میں نے، معافی چاہتا ہوں۔ اچھا تُو بتا دے، میں تو سچے دل سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اپنی ساری کہانی سنا دے۔ اللہ نے چاہا تو مدد کروں گا تیری۔ جیسے بھی بن پڑا، مدد کروں گا۔ اب دیکھ نا، کوئی تو کسی نہ کسی کا سہارا بنتا ہی ہے۔ اگر سارے ہی منہ موڑ کر کھڑے ہو جائیں تو انسان تو مر جائے۔"

"حیدر بھائی! میرا نام کوثر جہاں ہے...... پورا نام کوثر جہاں ہے میرا۔"

"اور یہ لڑکی؟"

"یہ تسنیم ہے۔"

"میاں سے لڑی ہے؟"

"نہیں، میں طوائف زادی ہوں۔ لاہور کی ہیرا منڈی میں ایک کوٹھے پر ناچتی تھی۔ یہ میری بیٹی ہے۔ مجھے یہ زندگی ہمیشہ سے ہی ناپسند تھی۔ حیدر بھائی! میں اس زندگی کو چھوڑ کر بھاگنا چاہتی تھی، میرا ایک بیٹا بھی ہے جو کافی بڑا ہو گیا ہے لیکن لاپتہ ہے، اس کا کوئی پتہ نہیں۔ حیدر بھیا! میری ماں مجھے اس کوٹھے پر محدود رکھنا چاہتی تھی جب کہ میں نے اپنے بیٹے سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس برائی کی زندگی کو چھوڑ دوں گی۔ اس نے مجھ سے یہ بھی وعدہ لیا تھا کہ میں اس کی بہن کو کوٹھے پر پروان نہیں چڑھاؤں گی۔ بھائی! میں نے جس حد تک بھی ممکن ہوا اس وعدے پر عمل کیا۔ لیکن میری لالچی ماں مجھے کسی کے ہاتھوں بیچنے پر آمادہ ہوئی تو میں وہاں سے بھاگ نکلی۔ بے بس اور بے سہارا۔ اب تم سمجھ گئے کہ میں نے تمہیں بھائی کہہ کر کیوں نہیں پکارا۔ کیوں کھلے دل سے تمہیں بھائی نہیں کہہ پا رہی میں...... ہم لوگ جس ماحول کے پروردہ ہوتے ہیں وہاں کسی شخص کو بھائی کہہ دینا اس کے لئے گالی ہوتی ہے۔ تم نے مجھ پر احسان کیا تھا کہ مجھے پناہ دی تھی اس بارش میں۔ میں تمہیں گالی کیسے دیتی۔"

"دھت تیرے کی...... گدھے کی بچی ہے بالکل۔ ارے انسان تو ہے نا، برائی کو برائی تو سمجھتی ہے۔ جو آدمی برائی کو برائی سمجھ لے وہ برا نہیں ہوتا۔ ہاں جو برائی کو اچھائی سمجھ کر

کرے، وہ برا ہوتا ہے۔ مولوی صاحب جمعہ کی نماز میں مسجد میں یہی کہتے ہیں کہ میں بھی برا آدمی نہیں ہوں، غنڈہ گردی کرتا ہوں لیکن اسے برا سمجھتا ہوں۔ برائی کو برائی سمجھ کر کر رہا ہوں اس لئے برا آدمی نہیں ہوں۔ چھوڑ پاگل، اچھا کیا وہ زندگی چھوڑ دی۔ مگر اب تو تیرا قرض اور بھی بڑھ گیا ہے میرے اوپر۔ بھلا کہاں بھٹکتی پھرے گی تُو؟ دنیا تو بہت بری ہے۔ کوئی بھی تجھے عزت کی نظر سے نہیں دیکھے گا۔ تُو عزت کی تلاش میں نکلی ہے نا، چل ٹھیک ہے، حیدر بھیا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے۔ دولت تو نہیں ملے گی تجھے مگر عزت کی زندگی ضرور دیں گے اللہ کے فضل سے۔“

کوثر جہاں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”گدھے کی بچی! رو رو کر ہمارا دل دکھا رہی ہے۔ فکر مت کر، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنا تو کوئی تھا بھی نہیں یہاں پر۔ ورنہ کیا نہیں کمایا اور کیا نہیں گنوایا۔ تُو بالکل بے فکر رہ، اب یہ ہماری بھانجی ہے اور تُو ہماری بہن۔ پرواہ مت کر بالکل۔ جب اللہ نے بہن اور بھانجی دی ہے تو تھوڑی سی عزت بھی پکڑ لیں گے کہیں سے۔ چل اب آرام سے بیٹھ جا۔ اس گھر میں کھانے پکانے کی کوئی جگہ نہیں ہے مگر کیا فکر ہے۔ پر ایک بات ہے، ہمارے ساتھ وفاداری کرنا، تیرا کیا نام ہے......“

”کوثر جہاں۔“ کوثر جہاں نے روتے ہوئے کہا۔

”وفاداری کرنا ہمارے ساتھ۔ بے وفائی مت کرنا۔ ہم نے ایسا تجربہ کبھی نہیں کیا زندگی میں۔ مگر اب کرنے کو جی چاہتا ہے۔ بیٹھ آرام سے۔ دوپہر کا کھانا تیرے لئے وہ چائے والا لے آئے گا۔ رمضان ہے اس کا نام۔ آدمی برا نہیں ہے، بس ذرا مسخرہ ہے۔ منہ مت لگانا اسے۔ تجھ سے کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ حیدر پہلوان کی بہن ہوں۔ گاؤں سے آئی ہوں، کسی بھی گاؤں کا نام لے دینا۔ کوئی ہمارے بارے میں یہ نہیں جانتا کہ ہم پہلے کہاں رہتے تھے۔ اپنے بارے میں بھی تجھے بتا دیں گے کبھی۔ اور بے فکری سے یہاں وقت گزارنا، کسی کی مجال نہیں ہے جو تیری طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے۔ اچھا، ناشتہ ہو گیا، اور بھی بہت سی باتیں ہو گئیں۔ جب بھی موقع ملا آئیں گے۔ چلتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کچھ دھندا پانی کرنے۔ تم بے فکر رہنا، حیدر پہلوان کی بہن ہے اب تُو۔ تیری طرف کوئی ٹیڑھی نظر اٹھا ہی نہیں سکتا۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ کوثر جہاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کے دل میں مسرت کی لہریں اٹھیں۔ حیدر کے الفاظ نے اسے ڈھارس دی تھی۔ واقعی ان الفاظ میں سچائی تھی۔ رب نواز شاہ بھی اسی انداز کے انسان تھے اور اس انداز کے لوگ برے نہیں ہوتے۔ اس نے تسنیم کو اٹھایا اور اس کی پیشانی چوم لی۔

○●○

اللہ نواز شاہ، ماسٹر شیر علی کے ساتھ لاہور پہنچ گئے۔ معمولی شخصیت نہیں تھے۔ خود بھی وزیر رہ چکے تھے۔ پنجاب میں اتنی زمینیں تھیں ان کی کہ لوگ مثال دیا کرتے تھے اور یہ زمینیں دورِ وزارت کی پیداوار نہیں تھیں بلکہ آباؤ اجداد نے چھوڑی تھیں۔ بڑی خوش اسلوبی سے اللہ نواز شاہ ان زمینوں کے معاملات چلا رہے تھے۔ دولت اس قدر تھی کہ خود انہیں اس کی تفصیل معلوم کرنا مشکل ہو جاتی تھی۔ اس طرح سے تعلقات بھی تھے۔ بڑے خفیہ طریقے سے لاہور پہنچے تھے اور لاہور میں اپنی ایک عالیشان رہائش گاہ میں قیام کیا تھا جہاں صرف ملازمین کا راج ہی رہتا تھا۔ یہ رہائش گاہ بھی بڑی خفیہ تھی اور کسی کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا، یہاں تک کہ ان کے اہل خاندان کو بھی۔ پھر یہاں سے انہوں نے وزیر اعلیٰ سے رابطہ قائم کیا اور وزیر اعلیٰ نے اللہ نواز شاہ کا نام سن کر فوراً ہی ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

”میں کب حاضری دوں سر!“

”شاہ صاحب! یہ سوال کر کے آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“

”نہیں جناب، آپ کی مصروفیات کا مجھے اندازہ ہے۔“

”آپ جیسے عزیز دوستوں کے لئے ہر وقت فرصت ہے۔“

”تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔“

”رات کا کھانا میرے ساتھ کھا لیجئے۔ سارے اپائنٹمنٹ کینسل کئے دیتا ہوں۔“

”اگر ضروری نہ ہو تو۔“

”آپ آ جائیے...... کس وقت آ رہے ہیں؟“

”نو بجے۔“

نو بجے اللہ نواز شاہ وزیراعلیٰ کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے جہاں ان کا پُر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ وزیراعلیٰ نے انہیں اپنے کمرہ خاص میں جگہ دی تھی۔

''سیدھی سیدھی سی بات کہنا چاہتا ہوں، آپ کے پاس ایک اہم ضرورت سے آیا ہوں۔''

''شاہ صاحب! یہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ انتہائی شریف آدمی ہیں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب کچھ دے رکھا ہے چنانچہ میرے دونوں پہلو مطمئن ہیں۔ فرمائیے کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی؟''

''آپ کو یہ تو یاد ہے کہ آپ میرے بیٹے کی شادی میں تشریف لائے تھے۔''

''ہاں، بعد میں کچھ لوگوں کے ذریعے باتیں ضرور سنی تھیں۔ آپ کے صاحبزادے نے کسی بات پر گھر چھوڑ دیا تھا۔ باقی تفصیل میرے علم میں نہیں آسکی۔''

''ہاں، بس ناراض ہو گیا تھا کسی بات پر مجھ سے...... اور کچھ ایسے معاملات تھے کہ پھر بہت عرصے تک میں اس کا پتہ نہیں چلا سکا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں ہیرا منڈی میں اس نے اپنے لئے ایک جگہ حاصل کر لی ہے۔''

''ارے...... ہیرا منڈی میں کیوں؟''

''اس لئے کہ اس کی ماں طوائف تھی اور میں نے اس طوائف سے شادی کی تھی جس کے بطن سے وہ پیدا ہوا۔ لیکن وہ بے چاری اللہ کو پیاری ہوگئی اور اپنی یہ نشانی چھوڑ گئی میرے پاس جسے میری موجودہ بیوی نے اولاد کی مانند پرورش کیا۔ پھر ایک احمق آدمی نے عین اس وقت جب اس کا نکاح ہو چکا تھا، یہ سوال کر ڈالا کہ وہ طوائف زادہ کہاں ہے؟ بس نادان دوست ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جب اُسے معلوم ہوا، وہ جذباتی اور حساس نوجوان تھا۔ اس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ نہیں رہے گا۔ مجھے یہ بات نہیں معلوم تھی کہ وہ ہیرا منڈی میں آکر آباد ہو گیا ہے۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا میں نے۔ بہر حال وہ وہاں رہتا ہے۔ پھر کسی بات پر کچھ لوگوں سے اس کی تُسل ہوگئی اور اس نے یہاں ایک بڑا سکول جلا ڈالا۔ کسی بچے کو وہاں تعلیم دلانا چاہتا تھا، جو طوائف زادہ تھا۔ آپ کو یہ تو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ وہ ایک جذباتی کیفیت میں گھر کو چھوڑ کر نکلا تھا۔ اس سکول میں اس بچے کو جگہ نہیں دی گئی تو طیش میں آگیا۔''

''ہاں، یہ واقعہ بھی میرے علم میں ہے۔ اوہو، رب نواز...... یہی نام ہے نا آپ کے بیٹے کا؟''

''ہاں...... اور آپ کے پاس میں اس لئے آیا ہوں کہ یہ کیس رب نواز پر سے ختم کر دیا جائے۔''

''اوہ...... اچھا۔''

''جتنا بڑا وہ سکول تھا، اس جیسے چھ سکول بنوانے کی پیشکش کرتا ہوں۔ پوری سنجیدگی کے ساتھ اسے اسی طرح تعمیر کر دیا جائے گا۔ رب نواز پر سے کیس ختم کر دیا جائے۔''

شاہ صاحب! آپ نے حکم دیا، ہم نے تعمیل کی۔ آپ کون سا ہم سے بار بار کچھ کہیں گے۔ اتنا سا کام اگر ہم نے نہ کیا تو ہم خود اپنی نگاہوں میں گر جائیں گے۔ آپ اگر اتنا سا کام کر دیں کہ اس سکول کو اسی طرح تعمیر کرا دیں تو ہم خفیہ طور پر بات چیت کئے لیتے ہیں۔''

''آپ کر لیجئے۔ میں نے آپ کو پیشکش کی ہے تو جگہ کا تعین آپ کریں۔ زمین بھی خرید لوں گا اور اس جیسے چھ سکول تعمیر کرا دوں گا۔''

''ہرگز نہیں جناب۔ اس سکول کی تعمیر کے لئے بھی ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ معاملہ فوراً ختم ہو جائے اور کوئی ردّ و قدح نہ کر سکے۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں نا ہم؟''

''جی بالکل ٹھیک۔''

''سمجھ لیجئے بات ہوگئی۔ باقی معاملات آپ ہمارے ذمے چھوڑ دیجئے گا۔''

''آپ کا بے حد شکر گزار ہوں میں...... ایک بڑی مشکل حل کر دی ہے آپ نے۔ تو اب کیا میں اس بات پر یقین رکھوں پورا پورا؟''

''ملک صاحب! سر آنکھوں پر...... یہ کام ہو جائے گا۔''

رات کا کھانا کھایا گیا اور اس کے بعد ملک اللہ نواز وہاں سے نکل آئے۔ ماسٹر شیر علی اس شاندار کوٹھی میں انتظار کر رہے تھے۔ ملک اللہ نواز نے انہیں تفصیل بتائی اور انہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... اللہ کا فضل ہے یہ کام ہو گیا۔''

''اب آپ یہ بتائیے ماسٹر صاحب کہ اسے کہاں تلاش کیا جائے؟''

''یہاں قیام کر کے کچھ لوگوں کا انتظام کرنا ہوگا اور پھر اسے ہیرا منڈی ہی میں دیکھا جا

سکتا ہے، وہیں ملے گا۔ ویسے بھی لاہور اب اتنا بڑا نہیں ہے کہ ہم اپنے جگر گوشے کو تلاش نہ کر سکیں۔"

"خدا کرے وہ مل جائے۔" اللہ نواز شاہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

○●○

پہلے بڑے کام کا آغاز ہوا۔ نظام الدین صاحب کو اکرام کے سامنے لایا گیا۔ یہ وہ لمحات تھے جب اکرام کے چہرے سے ہر قسم کی پٹیاں ہٹ چکی تھیں اور وہ یہاں موجود لوگوں کا موضوع بنا ہوا تھا۔ عرشیہ تو اس کے لئے پاگل ہو گئی تھی، بڑی بہن کا کردار ادا کر رہی تھی۔ ہر طرح سے اس کا خیال رکھنا، بڑی محبت سے اس کے ساتھ پیش آنا۔ اکرام بھی اس کے ساتھ بہت مانوس ہو گیا تھا۔ ادھر شانہ تھی جس کی آنکھوں میں چاند ستارے اتر آئے تھے۔ دل و جان سے اکرام کی دیوانی ہو گئی تھی۔ حالانکہ بہت ہی معتدل لڑکی تھی، بڑی محتاط۔ پتہ نہیں لندن کی فضاؤں نے اسے متاثر کیوں نہیں کیا تھا۔ کھل کر اکرام کے سامنے تک نہیں آ پائی تھی۔ بری طرح خوفزدہ ہو جاتی تھی خود اپنے آپ سے۔ بہرحال یہ سب لوگ واپس گجرات پہنچ گئے تھے اور پھر نظام الدین نے اکرام کو دیکھا اور دل پکڑ کر رہ گئے۔ بیٹے کا ایسا ہم شکل ہونا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ لوگ بتاتے تو تھے کہ اکرام یہ ہے، اکرام وہ ہے۔ لیکن اکرام یہ ہے، اتنا انہوں نے نہیں سوچا تھا۔ اکرام کو دیکھتے رہے، پھر آگے بڑھے اور اس کی پیشانی چوم لی۔

"بیٹے! کیا نام ہے آپ کا؟"

"اکرام۔"

"آپ کے والد صاحب کا کیا نام ہے؟"

اکرام نے خالی خالی نگاہوں سے نظام الدین کو دیکھا اور پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

"والدہ کا نام بھی یاد نہیں ہے آپ کو؟"

اکرام نے نفی میں گردن ہلا دی۔ نظام الدین تو جیسے اس کے سامنے سے ہٹنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ غیاث الدین وغیرہ نے اکرام کو واپس بھیج دیا۔

"ہاں نظام! کیا کہتے ہیں؟"

"دیکھیں، ویسے تو اللہ تعالیٰ کا ہر کام معجزاتی ہے، ہم بے اوقات حقیر کیڑے اس کی قدرت پر کیا تبصرہ آرائی کر سکتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ میرا ضمیر بھی یہی کہہ رہا ہے کہ اکرام کی صورتِ حال کچھ گمبھیر ہے۔"

"کیا ہو سکتی ہے آپ کے خیال میں؟"

"ایک انکشاف کر رہا ہوں میں آپ لوگوں پر۔ شمس الدین مستقل لندن جا کر کیوں آباد ہو گئے...... وہ یہاں کیوں نہیں آتے، اس کی ایک وجہ ہے۔"

"کیا......؟"

"لندن سے آئے تھے۔ جوانی کا عالم تھا، ظہیر الدین ہمیشہ کے اوباش فطرت، لاہور کی ہیرا منڈی میں لے گئے اور اس بات کا علم مجھے ہو گیا۔ ظہیر الدین کو تو خیر میں نے گھر سے ہی نکال دیا تھا لیکن شمس الدین کی بھی وہ خبر لی کہ بھولے نہ بھول پائیں۔ لندن چلے گئے اور اس کے بعد واپس نہیں آئے۔ شرمندگی بھی ہو گی اور شاید یہ احساس بھی کہ کہیں کوئی طوائف ذہن کے پردے کو نہ چھو لے۔ وہاں گئے تھے۔ خدا جانے اس کے بعد کیا ہوا، یہ ایک الگ امر ہے۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں یہی وسوسے آ رہے ہیں کہ یہ لڑکا شمس الدین ہی کی اولاد ہے، لیکن اس طوائف کے بطن سے۔ میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی کہ یہ جملے اور یہ انکشاف کس قدر شرم ناک ہے...... لیکن حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لینے سے حقیقتیں چھپ نہیں جاتیں۔ آپ لوگ میرے دوست ہیں، میں نے بڑی صاف دلی سے آپ کو ساری حقیقتیں بتا دی ہیں۔ اب مجھے مشورہ دیجئے، مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"ظہیر الدین سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"ہاں، کئے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ لاہور ہی کے ایک ہسپتال میں داخل ہیں۔ برائیوں کا خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ برسوں سے بیمار ہیں۔ کچھ دن کے لئے صحت ہوتی ہے اور اس کے بعد پھر بستر پر دراز ہو جاتے ہیں۔"

"آپ سے رابطہ ہے؟"

"ہاں ظاہر ہے، بھائی ہیں۔ چھوڑ تو نہیں سکتا۔ جو کچھ بھی مالی مدد ہوتی ہے، کر رہا ہوں۔ بس یہی کیا جا سکتا ہے زیادہ سے زیادہ۔"

"تعاون کریں گے؟"

"کس سلسلے میں؟"

"ان واقعات کے سلسلے میں جو پیش آئے۔"

"ہاں، کیوں نہیں کریں گے۔"

"تو چلئے، لاہور چلتے ہیں۔ اکرام کو بھی ساتھ لے چلنا ہوگا۔ کسی بہترین ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔ ضرورت پڑی تو کسی دماغی ہسپتال میں بھی داخل کروا دیں گے۔ یہ تو کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اکرام کے ساتھ رہنے کی ذمہ داری غیاث الدین نے تسلیم کر لی تھی۔ لاہور میں انتظامات کئے گئے اور اس کے بعد یہ لوگ روانہ ہو گئے۔ راستے میں رب نواز زیر بحث آ گیا۔

"سارے معاملات اپنی جگہ، رب نواز کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہونا چاہئے۔" غیاث الدین ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے تھے۔

بہرحال لاہور پہنچ کر سب سے پہلا کام تو یہ کیا گیا کہ اکرام کو ایک ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ عرشیہ ساتھ آئی تھی۔ شانہ اور فاخرہ بیگم بھی تھیں۔ باقی تمام لوگ بھی تھے۔ چنانچہ اکرام کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ نادر شاہ اور اس کا بیٹا علی شاہ ہر طرح سے اکرام کی دیکھ بھال کے لئے اپنے آپ کو پیش کر چکے تھے۔ علی شاہ خاص طور سے اکرام کے پاس رہتا تھا اور اب اس کے بعد ظہیر الدین کا معاملہ تھا۔ چنانچہ ظہیر الدین تک رسائی حاصل کی گئی۔ بھائی کو دیکھ کر ظہیر الدین اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ بہت ہی دبلا پتلا بدن، نحیف و نزار۔

"ظہیر الدین! ایک کام سے تمہارے پاس آیا ہوں۔"

ظہیر الدین کے ہونٹوں پر پھیکی سی ہنسی دوڑ گئی۔ "بھائی جان! کام سے آپ میرے پاس آئے ہیں، تعجب کی بات ہے۔ کیا ہڈیوں کا یہ ڈھانچہ، ایک بدکار انسان آپ کے کسی کام آ سکتا ہے؟"

"ایسی باتیں مت کرو...... جو گزری سو گزر گئی۔ بس ہو جاتا ہے۔ اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو ظہیر الدین! مجھے ایک بات بتاؤ، بہت عرصے پہلے جب شمس الدین یہاں آئے تھے اور تم انہیں ہیرا منڈی لے گئے تھے تو تمہیں معلوم ہے کہ شمس الدین کسی سے منسلک ہوئے تھے؟ دیکھو، خوب اچھی طرح غور کر کے بتانا۔ بہت ضروری ہے، ایک اہم مسئلہ درپیش ہو گیا ہے۔"

"بتاتا ہوں بھائی جان...... شمشیرہ بیگم کا کوٹھا تھا وہ اور ان کی بیٹی کوثر جہاں، شمس الدین سے متاثر ہوئی تھی اور شمس الدین اور اس نے، دونوں نے رات ساتھ گزاری تھی۔"

"شمشیرہ بیگم...... کوثر جہاں؟"

"جی ہاں...... مگر بات کیا ہے؟"

"بس بھئی، کیا کہیں، بہت کچھ چھن گیا ہمارا۔ خیر......" ظہیر الدین نے شرمندگی سے گردن جھکا دی تھی۔ یہ انکشاف بقیہ افراد کے سامنے کیا گیا تو جواد حسین نے کہا کہ اب تو اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ اکرام، شمس الدین کی اولاد ہے۔"

"بھائی ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان شرمندہ ہوتے ہوتے آخر میں ڈھیٹ ہو جاتا ہے۔ میری بھی یہی کیفیت ہے۔ میں اس بات کو نظر انداز کر کے اب آپ لوگوں سے مزید مشورہ چاہتا ہوں۔"

"دیکھو بات اصل میں یہ ہے کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ شمس الدین معصوم تھے اور طوائف بہرحال طوائف ہوتی ہے، اس کا بھی اپنا وہی ایک کام ہوتا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اکرام کے ہوش مند ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس دوران نادر شاہ! کیا تم ہیرا منڈی سے کوثر جہاں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہو؟"

"جی بھائی جان! کیوں نہیں۔" نادر شاہ نے بڑے بھائی کو جواب دیا۔

"تو پھر ہم یہ کارروائی کرتے ہیں۔ ایک طرف، ہمیں رب نواز کی تلاش ہے اور ان کے بارے میں ساری تفصیلات کا پتہ چلنا چاہئے۔ کوشش یہ کریں گے کہ ان کی بھی گلوخلاصی کسی طرح ہو سکے۔ قتل و غارت گری تو کی نہیں ہے، بس جذباتی ہو کر ایک سکول جلا دیا ہے اور اسے نکلا کر دیا ہے۔ خیر وہ تو بے اوقات آدمی ہے، اس کو تو میں سنبھال لوں گا۔ لیکن باقی سارے معاملے بھی بڑی سنجیدگی سے طے کرنے ہیں اور یہ دیکھنا ہے کہ ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ یہ انکشاف ہو گیا ہے کہ اکرام، شمس الدین ہی کی اولاد ہے۔ باقی سارے معاملات دیکھنا ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" سب لوگ اس بات پر متفق ہو گئے۔

○●○

حیدر پہلوان کون تھا، کیا تھا؟ کوثر جہاں کو اس کا کچھ پتہ نہیں تھا لیکن جو اندازہ اس کو

ہوا تھا وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ قدرت اس پر مہربان ہوئی ہے اور ایک ایسے اچھے انسان سے ملاقات ہوگئی جو اسے عارضی سہارا تو دے ہی سکتا ہے۔ حالانکہ وہ خود شرمندہ تھی، کوئی بھی تو رشتہ نہیں تھا اس سے۔ ہر طرح سے کوثر جہاں کا ساتھ دے رہا تھا۔ اسے بہت سا کپڑا لا کر دیا تھا۔ کوثر جہاں سے اس نے پوچھا تھا کہ کیا اسے سینا پرونا آتا ہے تو اس نے بے بسی کا اظہار کر دیا تھا۔

تب حیدر پہلوان نے کسی اور عورت سے ان دونوں کے کپڑے سلوائے۔ کھانے پینے کی بہت سی اشیاء اس نے یہاں لا کر جمع کر دی تھیں اور کہا تھا۔

''بس بہن، ہمارے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور گھر میں کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں تھا کیونکہ ہم تو جہاں بھی بیٹھے، کتے کی طرح منہ مار لیا۔ لیکن اب تُو ہمارے پاس آ گئی ہے تو اب تو کھانے پینے کا انتظام گھر پر ہی کریں گے۔ تجھے تکلیف تو ہوگی مگر ہم بھی گھر کا مزہ لیں گے۔''

کوثر جہاں نے گردن جھکا دی تھی۔ تقریباً گیارہ بارہ دن ہو گئے تھے یہاں آئے ہوئے۔ حیدر پہلوان کی نیت کا صاف اظہار ہو گیا تھا۔ وہ صاف ستھرا انسان تھا۔ کیا کرتا ہے، کیا ذریعہ معاش ہے، اس کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ صبح کو گھر سے جاتا اور شام کو گھر واپس آ جاتا لیکن اس نے اپنا ٹھکانہ گھر سے باہر ہی رکھا ہوا تھا۔ کئی بار کوثر جہاں کا دل چاہا کہ اس سے اس موضوع پر بات کرے مگر اس کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ البتہ اسے افسوس ضرور ہوتا تھا کہ اس کی وجہ سے حیدر پہلوان بے گھر ہو گیا ہے۔ گھر کے باہر سوتا تھا، ہمیشہ آواز دے کر اندر آتا تھا۔ یہ عادت یہ بات ظاہر کرتی تھی کہ وہ جیسی بھی زندگی گزار رہا تھا، وہ الگ بات ہے مگر نیک ماں باپ کی اولاد، نیک ماں باپ کا خون ہے۔ دل ہی دل میں وہ اور بھی بہت کچھ سوچتی تھی۔ ہیرا منڈی سے نکل کر یہاں آ گئی تھی اور اس نے حیدر پہلوان کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود حیدر نے اسے بہن کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ایسے کسی ٹھکانے کا اس نے تصور تک نہیں کیا تھا۔ وہ تو اس دہشت کا شکار تھی کہ آئندہ نجانے کیا ہوگا۔ پہلے جو دو تجربے ہوئے تھے وہ بھی بڑے خوفناک تھے۔ وہ تھے تو دونوں دین دار لیکن دونوں ہی کی نیتوں میں فتور۔ اگر یہ بھی نہ ملتا تو کیا ہوتا۔ بات تو کچھ بھی نہ تھی، ایک جہنم سے نکلتی تو

دوسرے میں پھنس جاتی۔

چنانچہ عارضی سہی لیکن سہارے کے لئے حیدر پہلوان سے اچھا انسان اور کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے خوش دلی سے حیدر کی ہر پیشکش قبول کر لی اور مزید دو تین دن گزر گئے۔

پھر ایک شام حیدر نے اندر آنے کی اجازت طلب کی اور اس کے اجازت دینے پر اندر آ گیا۔ تسنیم اب حیدر سے بہت زیادہ مانوس ہو گئی تھی اور وہ بھی اس کے لئے چیزیں لاتا رہتا تھا۔ تسنیم اسے اپنے کسی سگے کی مانند چاہنے لگی تھی۔ اس ماحول میں تسنیم نے ایک بار بھی کسی افتاد کا نظارہ نہیں کیا تھا حالانکہ روشنی اور چمک دمک سے یہاں پہنچی تھی مگر شاید یہ سادہ زندگی اسے پسند آئی تھی۔ اس وقت تسنیم دوڑ کر حیدر کی گود میں چلی گئی۔ حیدر کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ تسنیم کو گود میں اٹھا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا، چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن جب کچھ نہیں کہہ سکا تو کوثر جہاں نے خود ہی کہا۔

''حیدر بھیا! کوئی بات ہے؟''

''ہاں کوثر جہاں! تجھ سے کام ہے ہمیں۔''

''تو کہئے نا، سوچ کیوں رہے ہیں؟''

''ایک بات پوچھیں تجھ سے؟''

''سو باتیں پوچھیں۔''

''یہ بتا کہ ہمارے پاس رہے گی یا چلی جائے گی یہاں سے؟''

کوثر جہاں ایک دم چونک پڑی۔ حیدر کو دیکھ کر ایک دم بولی۔ ''بھیا! کیا بات ہے، کوئی مشکل پیش آ گئی ہے؟''

''بہت بڑی مشکل۔''

''تو بتائیں مجھے، میں کیا کروں...... مجھے کیا کرنا چاہئے؟''

''ہمارے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا ہے ہمیں۔ کہیں جانا ہے تجھے یہاں سے؟ یا اس بچی کو اسی طرح سے پروان چڑھانا ہے؟''

''دل میں تو یہی ہے حیدر بھیا کہ کسی سنسان گوشے کو اپنا لوں، اپنی بیٹی کی شہزادیوں کی طرح پرورش کروں۔ میں اسے کوٹھے سے اٹھا کر یہاں لے آئی ہوں، اپنے بیٹے کے بارے میں تمہیں بتا ہی چکی ہوں حیدر بھیا! رب نواز شاہ نامی ایک نیک دل انسان کے

ساتھ تھا وہ۔ پورا قصہ سنا دیا ہے میں نے تمہیں۔ نجانے کہاں کہاں بھٹکتے پھر رہے ہیں یہ لوگ۔ اب اگر لاہور واپس جاؤں گی تو نہ جانے کیا کیا مشکلیں پیش آئیں گی۔ جانا بھی نہیں چاہتی۔ رب نواز سے وعدہ کیا تھا میں نے، اب میں ناچنے والی نہیں رہوں گی۔ وہ تو ایک مشکل تھی، ایک مصیبت تھی جسے گزارنا چاہتی تھی۔ پتہ نہیں میرا اکرام کہاں ہوگا...... ہوسکتا ہے اللہ مجھے اس سے کبھی ملوا دے۔ اور اگر یہ میری تقدیر میں نہیں تو حیدر بھیا! اتنا ضرور چاہتی ہوں کہ گمنام رہ کر کہیں وقت گزار دوں۔ میں خود بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھوں گی۔ کچھ نہ کچھ کروں گی میں۔ اس کے علاوہ بھیا! اگر مجھے آپ جیسے نیک دل انسان کا سہارا مل جائے تو یوں سمجھ لیجئے کہ میری تقدیر کا اس سے زیادہ روشن پہلو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ ورنہ ہم جیسی عورتوں کو اچھے سہارے کہاں ملتے ہیں۔ یہ چند روز جو آپ نے ہمارے ساتھ گزارے ہیں، آپ یقین کریں یہ میری زندگی کے سب سے قیمتی دن ہیں۔ عورت کہنے والے تو شاید بہت لوگ ملے ہیں لیکن بہن کہنے والا کوئی نہ ملتا۔ اس سے بڑی گالی کسی کے لئے اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ بھیا! یہ گالی تم نے اپنا لی ہے، تم سے بڑا آدمی میرے لئے اس کائنات میں اور کون ہوسکتا ہے...... لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ اگر تمہیں اور کوئی مشکل پیش نہ آئے مجھے اپنے پاس رکھنے سے تو بھیا پریشان نہ ہونا، کہیں نہ کہیں چلی ہی جاؤں گی۔ تقدیر کے فیصلے ہر حال میں اٹل ہوتے ہیں۔“

حیدر اس گفتگو کے جواب میں مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ”تیری باتوں میں اتنی سچائی ہے کوثر! کہ خدا کی قسم تیری باتوں پر اعتبار آگیا ہے۔ اپنے دل میں تیرے لئے اعتماد پیدا ہوگیا ہے۔ دیکھ ہم تجھے اپنی زندگی بھر کی داستان پھر سنا دیں گے۔ بس یوں سمجھ لے کہ جس طرح کسی گندی نالی میں جس قدر کیچڑ ہوسکتی ہے اس کیچڑ سے جس قدر تعفن اٹھ سکتا ہے، ہمیں وہی کیچڑ ہی سمجھ لے، ہم گندی نالی کے بدبودار کیڑے ہیں۔ کبھی عزت کا کوئی خیال ہمارے دل میں نہیں آیا۔ مگر تُو نے یہاں آکر ہمیں ایک بھائی کا مقام دے دیا ہے۔ اصل میں ہم یہ سوچ رہے تھے کہ تھوڑے دن کے لئے شریف بننے سے کیا فائدہ...... جب تک تُو یہاں ہے تو شرافت سے کام چلالیں گے، اس کے بعد جب تُو چلی جائے تو وہی دن ہوں وہی راتیں۔ یہ بچی بھی ہمیں بہت پیاری لگتی ہے۔ ماموں کہا ہے ہمیں اس نے...... ماموں تو مٹی کا بھی قیمتی ہوتا ہے۔ ماموں کے تصور کے ساتھ محبتوں کے در کھل

جاتے ہیں۔ ہمیں بھانجی اور بہن کا رشتہ ملا ہے تو ہم بھی بھٹک گئے ہیں۔ اگر تُو ہمارا یہ رشتہ مستقل کر دے تو ہم آدمی بننے کی کوشش کریں گے۔ ماموں جیسے کپڑے پہنیں گے، ماموں جیسی عادتیں کرلیں گے۔ بہن کے بھائی بن جائیں گے۔ لیکن وعدہ کرنا ہے تجھے کہ تُو ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔“

کوثر جہاں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”اگر یہ سہارا مجھے مل رہا ہے تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ حیدر بھیا! میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری مرضی کے بغیر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔ ہاں میری زندگی میں چند معاملات ہیں، ان کے بارے میں تمہیں بتا دوں گی۔ لیکن ان میں جو کچھ بھی ہوگا، تمہاری مرضی کے مطابق ہی ہوگا۔ اگر تم مجھے یہ سہارا دے دو تو یہ سمجھ لو کہ آسمانوں سے بڑا سہارا تمہیں ملے گا۔“

”تو سن، اب ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے۔ آج ہی سے سامان باندھ لیں گے اور کل تڑکے تڑکے یہاں سے چل پڑیں گے۔“

”کہاں؟“

”بس چلیں گے کسی ایسی جگہ جو شریفوں کا محلہ ہو۔ جہاں لوگ ہمیں حیدر بدمعاش کی حیثیت سے جانتے بھی نہیں ہیں۔ تُو رہے گی اس گھر میں۔ اور ہم بس تیرے بھیا کی حیثیت سے کبھی کبھی آتے رہیں گے تیرے پاس۔ لوگوں کو یہ بتانا کہ تیرا شوہر کہیں چلا گیا ہے...... یا تجھے چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا ہے اور تیرے بھائی نے تجھے یہ گھر لے کر دیا ہے۔ اس طرح تُو زندگی گزارنا، ہم دنیا کی ہر چیز تجھے وہاں مہیا کر دیں گے۔ اصل میں ہم حیدر پہلوان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور یہاں تیری موجودگی کو کوئی اچھی نظر سے نہیں دیکھے گا جب کہ ہم تجھے ایک عزت کا مقام دینا چاہتے ہیں۔“

کوثر جہاں مسلسل روتی رہی۔ اس نے کہا۔

”یہ بھی میری تقدیر کا ایک روشن پہلو ہے بھائی! تمہاری ہدایت پر عمل کروں گی۔ تمہاری عزت آبرو کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گی۔ جیسا تم پسند کرو۔“

بہرحال حیدر پہلوان، کوثر جہاں کو دوسرے دن نئے گھر میں لے گیا۔ ساز و سامان تھوڑا سا باندھ کر لے آیا تھا۔ دن بھر مصروف رہا۔ یہ ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن کا مکان تھا

جس پر ایک چھت بھی تھی اور ایک چھوٹے سے خاندان کے رہنے کے لئے کافی گنجائش تھی۔ حیدر شام تک مصروف رہا۔ آس پاس کے لوگ بھی صاف ستھرے نظر آ رہے تھے۔ بہرطور یہاں آ کر کوثر جہاں کی زندگی کا نیا آغاز ہو گیا۔ اس رات حیدر پہلوان اس گھر کے صحن میں ہی سویا۔ کوثر سے اس نے یہی کہا تھا کہ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند رکھا کرے۔ یہ تمام ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔ کوثر گھر کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ تسنیم تو گویا موم کی گڑیا تھی، جس طرف موڑ دو، اس طرف مڑ جائے۔ یہاں آ کر بھی خوش تھی۔ پڑوس کی گلی میں چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ وہ انہیں محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ حیدر پہلوان نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنا نام یہاں کچھ اور ہی بتائے اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دے کہ اس کا تعلق کسی طور لاہور کی ہیرا منڈی سے رہا ہے۔ کوثر جہاں نے یہ بات گرہ میں باندھ لی تھی۔

○●○

یہ چاروں دوست بھی کمال کے دوست تھے۔ نہ ملازم، نہ خادم۔ دوستوں ہی میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن ایسے جانثار کے ماں جائے بھی ایسے نہ ہوتے ہوں گے۔ شاہ جی کے بارے میں ان چاروں کو اس بات کا علم تھا کہ شاہ جی کس طرح بدل ہو گئے ہیں۔ پہلے جیسی طبیعت ہی نہ رہی تھی۔ اکرام نے نجانے ان پر کیا جادو کر دیا تھا، کہیں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ حالانکہ جہاں جاتے ایسی پذیرائی ہوتی اور ایسی ایسی پیشکشیں کی جاتیں کہ کوئی اور ہوتا تو وقت گزاری کے لئے فوراً تیار ہو جاتا۔ لیکن شاہ جی کہیں نہ رکے تھے۔ اس وقت بھی اداس اور ملول بیٹھے ہوئے تھے۔ لاہور میں تھے۔ دوستوں سے کہا۔

''دیکھو بھئی، اونٹ پہاڑ تلے آ گیا ہے۔ بڑے تیس مار خان سمجھتے تھے ہم اپنے آپ کو، ساری تیس مار خانی نکل گئی۔ اکرام کی وجہ سے کچھ ایسے مفلوج ہوئے ہیں کہ اب دل لگتا نہیں ہے کسی کام میں۔ ایک فیصلہ کیا ہے دوستو! اور یہ بات بھی طے ہے کہ اپنے جال میں تمہیں نہیں پھنسائیں گے۔ سوچا یہ ہے کہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ کیا فائدہ اس طرح مارے مارے پھرنے سے۔ کچھ کرتے، دیکھتے، مقابلہ کرتے، سارے مسئلوں سے۔ مگر اب صورتحال بالکل بدل گئی ہے۔ تم لوگ ایسا کرو، منتشر ہو جاؤ اور اپنے تحفظ کا بندوبست کر لو۔ بڑا اچھا وقت گزارا ہم لوگوں نے اور بہت عرصے کا ساتھ رہا۔ بس اب

اپنے اپنے راستے الگ الگ کئے لیتے ہیں۔''

چاروں دوست شاہ جی کو دیکھ رہے تھے۔ نور شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''واہ، شاہ جی واہ...... ہم تو آپ کو فولاد کا انسان سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں۔ فولاد میں گڑھے تو نہیں پڑتے شاہ جی! یہ آپ زبردستی اس فولاد میں گڑھا کیوں ڈال رہے ہیں؟ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کیوں کرنا چاہتے ہیں؟''

''ابے یار! اب تم وہی جذباتی باتیں کرو گے۔''

''شاہ جی! یہ جذباتی باتیں نہیں ہیں، یہ تو سچائیاں ہیں جو اپنا ایک مقام رکھتی ہیں۔ آپ کے خیال میں آپ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں اور ہم بھاگ جائیں؟''

''کرنا ہے تمہیں یہ بیٹا...... کرنا ہے۔''

''نہیں کرنا شاہ جی! ہمیں مجبور مت کریں کہ ہم آپ کی کوئی حکم عدولی کریں۔ پانچوں چلتے ہیں، پولیس کے حوالے کرتے ہیں اپنے آپ کو۔ سزا ہو گی، ساتھ ساتھ جیل میں چلیں گے۔ کبھی جیل سے دل گھبرایا تو جیل توڑ کر بھاگ لیں گے۔ واہ شاہ جی واہ، اتنا کچا سمجھا ہے آپ نے ہمیں...... دیکھیں کبھی آپ سے انحراف نہیں کیا۔ اس طرح ذلیل نہ کریں۔''

''کمال کے لوگ ہو تم...... بھائی میں...... میں......''

''نہیں شاہ جی! بھلا اس کا کیا سوال ہے کہ ہم آپ کو اکیلا جانے دیں یا پھر جاتے ہی نہیں ہیں پولیس اسٹیشن۔''

''نہیں، جانا ہے۔ بس دل کہہ رہا ہے۔''

پانچوں پولیس ہیڈ کوارٹر میں پیش ہوئے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ ایس پی شوکت گوریجہ سے ملے اور شوکت گوریجہ وہی تھے جو ایک بار ان سے ہیرا منڈی میں مل چکے تھے اور ان کی اصل حیثیت کو جانتے تھے۔ شوکت گوریجہ کو بھی ساری صورتحال معلوم تھی۔ کہنے لگے۔

''رب نواز شاہ! اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے آئے ہیں؟''

''ہاں ایس پی صاحب! سوچا ہے کہ کچھ دن آپ کی بھی روٹیاں توڑ لیں۔ پھانسی کی سزا تو دیں گے نہیں آپ ہمیں۔''

''ایک بات مان لیں گے آپ میری؟''

"اچھا، اب آپ کی باتیں بھی ماننا پڑیں گی۔ کیا وقت آ گیا ہے۔ شالے خان، فضل خان! دیکھو، ایس پی صاحب بھی بات منوا رہے ہیں۔"

"کچھ بھی کہہ لیں شاہ جی! جو دل میں ہے وہ تو ضرور کہیں گے۔"

"کہہ دو بھائی، کہہ دو...... تم بھی کہہ دو۔"

"شاہ جی! اپنے گھر چلے جائیں، اپنے ماں باپ سے مل لیں۔ کوئی ایسا جرم نہیں کیا ہے اللہ نواز شاہ نے۔ شادی کی تھی، آپ کی والدہ سے باقاعدہ نکاح کیا تھا اور سارے خاندان کو یہ بات معلوم ہے۔ آپ ان کی جائز اولاد ہیں۔"

"او میاں ایس پی! میری بات سن، اپنے کام سے کام رکھ۔"

"برا کیا ہے آپ نے...... ہو سکتا ہے آپ کے اندر بہت سی اچھائیاں ہوں لیکن یہ ظلم آپ اپنے والدین پر کر رہے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس ظلم کا حساب آپ سے ضرور لے گا۔"

"او یار! تُو نے مولوی کا پیشہ اختیار کر لیا ہے کیا...... او بھائی! ہمیں گرفتار کر۔ پولیس ہماری تلاش میں ہے۔"

"جی نہیں، پولیس کو آپ کی تلاش نہیں ہے۔ آپ کے والد صاحب نے یہ کیس ختم کرا دیا ہے۔ انہیں علم ہو گیا تھا کہ ایسا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ لاہور آئے، سارے احکامات وزیراعلیٰ کی جانب سے پولیس کو دیئے گئے ہیں۔ اس کیس کا اب نام و نشان نہیں ہے۔"

"کیا......؟" شاہ جی کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"کاش شاہ جی! آپ مجھے اس کا موقع دیتے کہ میں آپ کے ساتھ آپ کے گھر چلتا۔"

"مذاق کر رہے ہو ایس پی صاحب؟"

"نہیں شاہ جی! جایئے، جس سے آپ کا دل چاہے مل لیجئے۔ ہاں یہ آرزو ضرور رہے گی میرے دل میں کہ اگر آپ گھر جائیں تو میں آپ کو لے کر جاؤں۔ اس وقت بھی میں نے بالکل خاموشی اختیار کئے رکھی تھی اور کسی کو ہوا تک نہیں لگنے دی تھی کہ میں آپ سے مل چکا ہوں۔ لیکن اب مجھے یہ موقع دے دیجئے۔"

پھر اس کے بعد رب نواز شاہ کئی پولیس کے اعلیٰ افسران سے ملا اور اسے یہی اطلاع ملی

کہ کیس ختم کر دیا گیا ہے اور اب پولیس کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے شاہ جی نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ خوشی ملنی تھی تو کاش اس کے ساتھ ساتھ یہ خوشی بھی ملتی کہ اکرام دستیاب ہو گیا ہے۔"

دو دن تک بالکل خاموشی طاری رہی اور اس کے بعد شاہ جی نے کہا۔

"بھئی دل چاہ رہا ہے کہ اب ہیرامنڈی کا رخ کیا جائے۔ اس جگہ کے علاوہ کہیں دل لگے گا نہیں۔ پتہ نہیں کیوں وہاں کی عادت پڑ گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے شاہ جی...... چلتے ہیں۔" چاروں ساتھیوں نے جواب دیا۔

○●○

ہیرامنڈی والوں پہ عذاب نازل ہوا تھا۔ دلدار گھوڑے نے ان کا جینا حرام کر دیا تھا۔ دکاندار فکرمند تھے۔ کاروبار ہمیشہ کی طرح سے تھا لیکن منافع ختم ہو گیا تھا۔ اصل سے زیادہ دلدار گھوڑا لے جاتا تھا۔ یہی کیفیت کوٹھے والیوں کی تھی۔ اتنا دینا پڑتا تھا دلدار گھوڑے کو کہ ناک میں دم ہو گیا تھا۔ نہ دو تو مصیبت سوار۔ ایسی بے عزتی کرتا تھا کہ لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی نہ کوئی لڑکی ہر رات خدمت کے لئے طلب کر لی جاتی تھی۔ اس وقت بھی نسیم بیگم کے کوٹھے کی طرف دھاڑ گئی۔

"خدا خیر کرے۔" پھول والے نے کہا۔

"یہ دھاڑ کہاں جا رہی ہے؟"

"نسیم بیگم پر حملہ ہوا ہے۔"

"کیوں؟"

"رات کو ستارہ کو بلایا تھا ڈیرے پر۔ ستارہ نے کہا جان دے دے گی مگر دلدار گھوڑے کے پاس نہیں جائے گی۔ نسیم بیگم نے بھی بیٹی کو لاکھ آمادہ کیا لیکن وہ نہیں مانی۔"

"اوہو...... تو اب کیا ہو گا؟"

"توبہ توبہ، کیا تقدس قائم کیا تھا یہاں شاہ جی نے۔ بڑے بے وفا نکلے وہ تو۔ ایسے گئے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔"

"ہاں یار...... صحیح معنوں میں مرد تھا۔"

"ضرور کسی نواب کے خاندان سے تھا۔ چہرے سے پتہ چلتا تھا۔ اچھی نسل کی یہی تو

نشانی ہوتی ہے۔"

"ڈیرے سے کبھی ایسا ظلم نہیں ہوا، کسی سے ایک پیسے کا سودا لیا جاتا تو اس کو پیسے دیئے جاتے۔ اور یہ دلدار گھوڑا......"

"یہ لچا لفنگا، حرامی کا جنا...... بس سڑک چھاپ بدمعاش۔"

"مگر شاہ جی آخر گئے کہاں؟"

"ابے لو...... اب اتنا بھی بے خبر رہنا اچھی بات نہیں ہے۔ سارے محلے کو معلوم ہے اور تمہیں نہیں ہے خبر؟"

"مگر ہوا کیا تھا؟"

"لو، بڑے بڑوں کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ اپنا اکرام پڑھتا تھا ناں بہت بڑے سکول میں...... ان بڑے لوگوں نے کہا کہ یہ طوائف کا لونڈا ہے، رئیسوں کے سکول میں نہیں پڑھے گا۔ شاہ جی نے کہا کہ اگر اکرام نہیں پڑھے گا تو سکول بھی نہیں رہے گا۔ مرد کے بچے نے سکول پھونک ڈالا۔ جو کہا تھا، وہ کر دکھایا۔ اب بعد میں کچھ بھی ہو۔"

"اوہ...... یہ ہوتا ہے مردوں کا قول۔"

"لے ہو گیا شروع۔" مٹھائی والے نے کہا اور سب ادھر دیکھنے لگے۔ نسیم جہاں کی چوٹی پکڑ کر اسے نیچے لے آیا گیا تھا۔ پیچھے اس کی بیٹی جو نوجوان تھی، بھی آئی تھی۔ اس وقت ڈیرے سے دلدار گھوڑا بھی کرتے پاجامے میں ملبوس اکڑتا ہوا باہر نکلا۔

"لے آؤ گھسیٹ کر چھنال کو چوک میں...... اری او ستی ساوتری! آ جا چوک میں۔" دلدار گھوڑے نے دھاڑ کر کہا۔

"معاف کر دو دلدار...... معاف کر دو ہمیں، معاف کر دو۔" نسیم بیگم نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہم نے بلایا تھا اس شہزادی کو...... کیوں نہیں آئی؟"

"نادان ہے دلدار جی! آج آ جائے گی۔"

"ہمارا حکم نہیں مانا گیا۔"

"آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔"

"بکواس مت کر کتیا! اب یہ سڑک پر ناچے گی۔ اس کا غرور سب کے سامنے ٹوٹے گا۔"

"معاف کر دے دلدار گھوڑے! ایسا مت کر...... اللہ تیرا بھلا کرے۔ وہ کہتی ہے کہ خودکشی کر لے گی اگر تُو نے اسے مجبور کیا۔ وہ بھی گرم خون ہے، مر جائے گی میری بیٹی دلدار! مر جائے گی۔ مر جائیں گے ہم اجڑ جائیں گے ہم...... معاف کر دے اسے۔" نسیم بیگم نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"ہمارے حکم کی تعمیل نہ ہو اور جو نہ کرے اس کا مر جانا ہی اچھا ہے۔ نچاؤ اس حرام کی بلی کو......" دلدار گھوڑے نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔

"مدد کرو ہماری...... ارے ہیرا منڈی والو ہماری مدد کرو...... سب کے خون سفید ہو گئے کیا...... ارے کوئی ہے جو ہماری مدد کرے...... کوئی ہے؟"

اور کبھی کبھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جسے فلمی انداز کہا جاتا ہے لیکن فلمیں بھی تو حقیقی کہانیوں پر ہی بنتی ہیں۔ اسی وقت ایک کار ہیرا منڈی میں داخل ہوئی اور بہت سے لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر اس کار سے جو اترا اس نے سب کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ ایک آواز نکلی۔

"ارے...... رب نواز شاہ۔"

دلدار گھوڑے کے سر پر جیسے بم کا دھماکہ ہوا تھا...... اس کے سورماؤں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں ہوئی تھی۔ شاہ جی بڑی شان سے نیچے اترے تھے۔ نسیم بیگم نے نعرہ لگایا۔

"مدد...... شاہ جی مدد...... دہائی ہے شاہ جی...... ہمیں بچاؤ...... دہائی ہے۔"

"ارے یہ کیا مجمع لگا رکھا ہے تُو نے حرامی؟ مداری کی اولاد، بغیر ڈگڈگی بجائے بندر کی ناچ ناچ رہا ہے؟"

دلدار گھوڑے کا خون تو خشک ہو گیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں درد ہونے لگا تھا۔ نجانے یہ مصیبت کہاں سے آ گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ بھاگ جانے کو جی چاہ رہا تھا مگر یہ بے عزتی بھی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ آگے بڑھا اور آواز کو بمشکل سنبھال کر کہا۔

"تم پھر آ گئے رب نواز...... تمہیں معلوم ہے کہ تم حکومت کے مجرم ہو۔"

"کتیا کے پلّے! حکومت تیرے باپ کی ہے کیا؟ ابے اپنی اوقات کو بھول کر بات مت کر۔ پہلے یہ بتا کہ تُو ہیرا منڈی میں دوبارہ گھسا کیسے؟"

"دیکھئے شاہ جی! عزت داروں کی طرح بیٹھ کر بات کریں۔ میں دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لئے تیار ہوں...... ہم مل جل کر بھی رہ سکتے ہیں۔"

"ابے بھنگی کے بچے! ابے اپنے باپ کا اصل نام یاد ہے تجھے؟ ابے تجھ سے دوستی کریں گے؟ ہم تو کتا بھی اصلی نسل کا پالتے ہیں، تجھ جیسے بدنسل سے دوستی کرلیں؟ یہ کہہ کیا رہا ہے تُو؟ کیا کر رہا تھا یہ نسیم بیگم؟"

"ہماری بیٹی کو سڑک پر نچا رہا تھا...... ہمیں بے عزت کر رہا تھا، اس لئے کہ ہماری بیٹی اس کی بیگار پر نہیں گئی تھی۔"

"ہوں...... تو یہ بات ہے۔"

"لوٹ لیا ہے اس نے ہم سب کو...... لوٹ لیا ہے۔ آپ کے ڈیرے پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا ہے۔"

"تمہاری بیٹی کو سڑک پر نچا رہا تھا؟ ابے کتے کے بچے...... تیری ٹانگ ٹھیک ہوگئی کیا جو ہم نے توڑی تھی؟ چلو، اب یہ کنجر کا جنا ایک ٹانگ پر خود ناچے گا اور پھر کبھی نہیں ناچے گا...... کیونکہ اس ناچ کے بعد اس کی دوسری ٹانگ بھی نہیں رہے گی۔"

"دیکھئے شاہ جی! قانون کی جنگ لڑیئے، پولیس آپ کی تلاش میں ہے۔ میں کہے دے رہا ہوں، بے موت مارے جاؤ گے۔ پھانسی لگے گی تمہیں۔"

"سب کچھ بعد میں ہوگا پیارے...... پہلے ناچ دکھا ان سب کو۔ ہاں بھئی شالے خان، فضل خان، نور خان! نچاؤ اس بھڑوے کو۔"

چاروں حواریوں نے ہتھیار کھول لئے اور اس کے بعد پہلا ڈنڈا دلدار گھوڑے کی ٹانگ پر پڑا اور وہ ایک ٹانگ پر اچھلنے لگا۔ اس کے ساتھی بھاگ جانے کی فکر میں تھے۔ دلدار گھوڑے نے چاقو کھول لیا...... شاید یہ پھینک کر مارنا چاہتا تھا لیکن اس وقت نور شاہ نے اپنا مخصوص ہتھیار پھینکا اور چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کے بعد چاروں حواری دلدار گھوڑے کے آدمیوں پر ٹوٹ پڑے۔ دلدار گھوڑے کے آدمی بھی ہاتھ پاؤں کھولنے لگے مگر شاہ جی کی پارٹی کو بہت دنوں بعد موقع ملا تھا۔ وہ پھرکنیاں گھمائیں کہ دیکھنے والوں کے منہ سے بے ساختہ واہ، واہ نکل گئی۔ پوری ہیرا منڈی ایک جگہ جمع ہوگئی تھی۔ شمشیرہ بیگم بھی گیلری میں کھڑی کانپ رہی تھیں۔ ان کے منہ سے نکل رہا تھا۔

"جل تُو جلال تُو...... آئی بلا کو ٹال تُو......"

"کسے بلا کہہ رہی ہو شمشیرہ بیگم؟" حاجو نے پوچھا۔

"تیری آنکھیں ہیں یا بٹن...... دیکھ نہیں رہا، وہ موا واپس آگیا ہے۔"

"انہیں بلا کہہ رہی ہو؟"

"اور کیا کہوں...... پولیس پیچھے لگی ہوئی تھی، پھر یہ کہاں سے آگیا؟"

"پولیس نے پہلے اس کا کیا بگاڑ لیا تھا شمشیرہ بیگم؟ تمہیں ان کے آنے کی خوشی نہیں ہوئی؟" حاجو نے کہا۔

"آگ پڑے تم پر حاجو میری جان نکل رہی ہے اور تم خوشی کی بات کر رہے ہو۔"

غلام شاہ نے حاجو کو پیچھے کھینچ کر کھڑا کرلیا۔

ادھر دلدار گھوڑے کا فیصلہ ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھی زمین پر پڑے ہوئے تھے اور وہ خود بھی زمین پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ وہ سب سہمی ہوئی نگاہوں سے شاہ جی کو دیکھ رہے تھے۔

"ایک ٹانگ بچ گئی تھی مگر صبر نہ کیا حرامی، کھو بیٹھے نا دوسری۔"

"شاہ جی! ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے تھے...... ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"نہ...... نہ...... سسرال آئے ہو کتیا کے پلو...... باپ کی جاگیر پر آ بیٹھے تھے؟ میرے ڈیرے میں رہنے لگے تھے تم۔"

"شاہ جی...... وہ......"

"بولو، میرے ڈیرے میں گھسنے کی تمہیں اجازت کیسے ملی؟" شاہ جی نے ڈپٹ کر کہا۔

"شاہ جی...... شاہ جی بس......"

"کس نے اجازت دی تھی تمہیں...... پہلے یہ بتاؤ۔"

"کسی نے نہیں۔"

"تو کیا حملہ کیا تھا فوجوں کے ساتھ...... ارے یہ سب کیا کہہ رہے ہیں، کیوں ستاتے تھے انہیں تم؟"

"غلطی ہوگئی شاہ جی۔"

"اس کے بعد غلطی نہیں کرو گے۔" شاہ جی نے آگے بڑھ کر دلدار گھوڑے کے پاؤں پر پاؤں رکھ دیا۔ دلدار گھوڑا اذیت سے چیخ پڑا تھا۔

"تمہیں اللہ کا واسطہ شاہ جی...... تمہیں اللہ کا واسطہ...... معاف کر دو...... ارے معاف کر دو۔"

"واہ رے سور، واہ...... تجھ جیسے کو غنڈہ کہتے ہیں...... ابے ایسے ہوتے ہیں غنڈے؟ چلو اس لڑکی سے معافی مانگو۔ بہن کہو اسے، چلو۔" شاہ جی نے نسیم بیگم کی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور دلدار گھوڑے کے پاؤں پر سے پاؤں ہٹا دیا۔ وہ پلٹا اور اس نے لڑکی کے پاؤں پکڑ لئے۔

"معاف کر دے مجھے بہن...... مجھے معاف کر دے۔"

آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے قہقہے لگائے تھے۔

"اور نسیم بیگم سے بھی معافی مانگو۔ ماں کہو انہیں۔" شاہ جی نے کہا اور دلدار گھوڑے نے نسیم بیگم کے پاؤں پکڑ لئے۔ اس کے بعد ساری ہیرا منڈی سے معافی مانگی۔ لوگ خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔

"اب چل ہمارا حساب کر...... چل، گھر چل...... دیکھیں کیا کرتا رہا ہے وہاں۔ ارے اٹھو حرام خورو اور اپنے پیروں سے چلو...... ورنہ ان سے کہوں گا کہ لاتیں پکڑ کر گھسیٹ کر لے چلیں۔"

لنگڑے لولوں کی برات چل پڑی۔ سب پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ مگر ڈیرے کے اندر جانے کی ہمت کسی کی نہ ہوئی۔ شاہ جی اندر چلے گئے تو پھول والے نے کہا۔

"بھائی، وہ جو کہتے ہیں نا کہ چوبیس گھنٹے میں ایک وقت قبولیت کا ضرور ہوتا ہے، اس وقت جو مولا سے مانگو مل جاتا ہے۔ کیا رحمت کے فرشتے کی طرح آئے ہیں شاہ جی۔"

"مگر خطرہ ہے بھائی! پولیس لگی آئے گی۔ وہ لوگ چھوڑیں گے تھوڑا ہی شاہ جی کو۔"

"کیا معلوم...... شاہ جی بھی کچھ سوچ کر ہی واپس آئے ہوں گے۔"

"اللہ رحم کرے ان پر بھی اور ہم پر بھی۔"

ادھر شاہ جی اپنے ساز و سامان کا جائزہ لے رہے تھے۔

"ابے تو لاہور چھوڑ کر بھاگ گیا تھا...... واپس کیسے آ گیا؟"

"بس شاہ جی شامت ہی آئی تھی میری۔"

"کیسے آئی تھی، کہاں سے آئی تھی؟" شاہ جی نے پوچھا اور دلدار گھوڑے نے انہیں

حیات خاں کی پوری کہانی سنا دی۔

"اچھا، اچھا...... ایک بات بتا، یہ بتا کہ کسی نے شمشیرہ بیگم کی لونڈیا کو تو نہیں پار کر دیا ہے...... بتا سکتا ہے کہاں گئی وہ؟"

"نہیں، قسم لے لو، نہیں معلوم۔"

"سن پیارے...... ہم مرد کے بچے ہیں، زبان پر جان دینے والے۔ تجھے بھی معاف کر دیں گے اور رقم بھی الگ دیں گے۔ بس اتنا بتا دے کہ کوثر جہاں کہاں گئی؟"

"خدا کی قسم شاہ جی! مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا پتہ ہے کہ شمشیرہ بیگم نے سودا کیا تھا اس کا کسی سے اور وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔"

"ہوں...... شمشیرہ بیگم...... چلو، وہی بتائے گی۔ چلو بیٹا! اب ٹھنڈے ٹھنڈے پھوٹ لو، دوبارہ تم یا تمہارا کوئی ساتھی ادھر کی طرف رخ کر کے کھڑا ہوا تو خدا کی قسم آنکھیں نکال کر ہتھیلی پر پھینک دیں گے اس کی۔" شاہ جی نے کہا اور اس کے بعد دلدار گھوڑے کا ہیرا منڈی سے بھاگنا بھی دیکھنے کے قابل تھا۔

○●○

ہیرا منڈی میں جشن کا سماں تھا۔ شاہ جی کے آتے ہی کایا پلٹ گئی تھی۔ اس سے پہلے دلدار گھوڑے نے تھوڑے ہی عرصے میں ہیرا منڈی میں رہنے والوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ کیا کوٹھے والیاں، کیا دکاندار، ہر طرف خوف کا شکار۔ لچے لفنگوں کی بھرمار، سڑکوں پر ہنگامے۔ شاہ جی جب تک ہیرا منڈی میں تھے، کیا مجال کوئی ادب و آداب کے خلاف کچھ کر جائے۔ اصول متعین کر دیئے گئے تھے۔ نئے نئے وارد ہونے والے بھی یہ ماحول دیکھ کر سنبھل جاتے اور اگر کسی پر مستی طاری ہوتی تھی تو پٹائی بھی ضرور ہوتی تھی۔ ہر ایک سینہ تان کر بات کر لیتا تھا کہ میاں ہوش و حواس درست رکھو ورنہ یہاں تمہارے لئے معقول انتظام ہے۔ لیکن دلدار گھوڑے کو ان باتوں کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ تو بس اپنے آپ میں مست رہتا تھا۔ ہیرا منڈی والوں سے بھتہ وصول ہو جائے، دکانداروں سے بغیر پیسوں کی چیزیں، باہر کا مال الگ لاتا تھا۔ لیکن یہ سارے کام یکلخت ختم ہو گئے۔ دکانداروں نے سکھ کا سانس لیا۔ کوٹھے والیوں نے سکون کی نیند سونا شروع کر دیا۔ جسے دیکھو شاہ جی کے گن گاتا نظر آتا تھا۔ دکانداروں نے فیصلہ کیا کہ شاہ جی کی آمد کی خوشی میں ایک جشن منایا جائے

اور اس کے لئے خفیہ طور پر کام شروع ہو گیا۔ پھر دکانوں پر رنگین رنگین جھنڈیاں لگائی جانے لگیں۔ دکانداروں کی انجمن نے فیصلہ کیا کہ شاہ جی سے بات کرنے کے بعد گلی میں شامیانہ لگایا جائے گا، کھانے پکوائے جائیں گے، شاہ جی کو دعوت دی جائے گی اور نذریں بھی اتاری جائیں گی۔ اس سلسلے میں دکاندار تنہا نہیں تھے۔ خفیہ طور پر کوٹھے والیوں نے بھی اس کام میں حصہ لیا تھا۔ نسیم بیگم اور اس کی بیٹی نے دل کھول کر رقم دی تھی۔

''ہاں، ہاں...... ہم خود شاہ جی کی آمد سے بہت خوش ہیں۔ وہ مری کا لیا دلدار گھوڑا تل گیا یہاں سے...... کمبخت نے دھندے تک ختم کر ڈالے تھے۔ شرفاء ہیرا منڈی میں داخل ہونے سے گریز کرنے لگے تھے۔ دوسری بہت سی طوائفوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ چندہ جمع کرنے والوں کا ایک وفد شمشیرہ بیگم کے ہاں بھی پہنچا تھا۔ شمشیرہ بیگم نے کہا۔

''کیا بات ہے...... کیسے آنا ہوا؟''

''چندہ جمع کر رہے ہیں شمشیرہ بیگم؟''

''اے ہے، کوئی لاوارث مر گیا کیا؟''

''جب بولو گی ایسی بے تکی ہی بولو گی۔ پتہ نہیں ہے تمہیں شاہ جی آ گئے ہیں۔''

''وہ تو پتہ ہے، لیکن تم چندہ کاہے کے لئے لے رہے ہو؟''

''شاہ جی کی دعوت کریں گے۔ جشن منایا جا رہا ہے ہیرا منڈی میں۔''

شمشیرہ بیگم بہرحال اتنی بیوقوف بھی نہیں تھیں کہ جھگڑا مول لیتیں ہیرا منڈی میں۔ دل پر تو ہول سوار تھا، راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی کہ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ لیکن اظہار نہیں کیا۔ خود بھی چندے کے لئے رقم دی لیکن ان کے جانے کے بعد اپنے آپ کو کوسنا پیٹنا شروع کر دیا۔

''کمبخت مارے دفعان ہو گئے تھے ہیرا منڈی سے، پھر سے آن مرے۔ اے غلام شاہ! کچھ تو پتہ چلا ہو گا تمہیں، پولیس تلاش کر رہی تھی۔ سکول جلا دیا تھا سب نے مل جل کر۔ کسی کو مارا بھی تھا۔ خبریں ملی تھیں مجھے۔ پھر یہ اس بے نتھے بیل کو آزادی کیسے مل گئی؟ ہیرا منڈی پاک ہو گئی تھی، یہ ناپاکی پھر اندر آ گئی۔ ان کم بختوں کو دیکھو، جشن منا رہے ہیں۔''

غلام شاہ اپنی ہی کیفیت میں تھا، نجانے کیا سوچ رہا تھا، کہنے لگا۔

''شمشیرہ بیگم! شیر پنجرے سے آزاد ہو گیا ہے۔ دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔''

''خدا اس شیر کو مٹی میں ملائے۔ ارے ان کے ساتھ اکرام نظر آ رہا۔''

''اپنی تو ہمت ہی نہیں پڑ رہی ادھر جانے کی۔ ڈھلائی ہو رہی ہے احاطے کی۔ نیا سامان آ رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ بچھے جا رہے ہیں ان کے قدموں میں۔ دیکھو یہ نئی سرکس کیا رنگ دکھائے۔''

بہرحال شمشیرہ بیگم کے دل کو لگی ہوئی تھی۔ ہیرا منڈی میں غالباً وہ اکیلی خاتون تھیں جو رب نواز شاہ کی آمد سے خوش نہیں تھیں۔ ورنہ باقی سب تو اپنی اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ادھر ڈیرے کی درستگی ہو رہی تھی۔ دلدار گھوڑا جیسے ناپاک آدمی نے پورے ڈیرے کو گندا کر کے رکھ دیا تھا، ہر طرف شراب کی بوتلیں بکھری پڑی ہوئی تھیں۔ اچھی طرح دھلائی کر دی گئی، لوبان کی دھونی دی گئی۔ اگر بتیاں سلگائی گئیں۔ نذر نیاز کرانی تھی مگر اس کے لئے بڑا وقت درکار تھا۔ نئے سرے سے پاؤں جما کر کام شروع کرنا تھا۔ البتہ شاہ جی کے سارے ساتھی یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ شاہ جی کے اندر وہ تروتازگی نہیں ہے جو ان کی فطرت کا ایک حصہ تھی اور اس کی وجہ وہ اچھی طرح جانتے تھے یعنی اکرام کی غیر موجودگی۔ اس کی گمشدگی پر شاہ جی ہمیشہ ہی یہ بات کہا کرتے تھے کہ کم از کم اس کی موت کی اطلاع ہی مل جاتی تو اپنے دل پر صبر کا ایک پتھر ہی رکھ لیتے۔ مگر لاش تک کا پتہ نہ چل سکا۔ پتہ نہیں کائنات کی وسعتوں میں کہاں گم ہو گیا۔

پھر ہیرا منڈی کے دکانداروں کا ایک وفد شاہ جی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دستک دی گئی، شاہ جی نے ان سب کی طرف دیکھا تو انہوں نے دست بستہ عرض کیا کہ شاہ جی سے ملنا چاہتے ہیں...... شاہ جی نے سب کو اندر بلا لیا، پھر وہ کہنے لگے۔

''شاہ جی! آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ آپ کی آمد پر ہم نے جشن منانا شروع کر دیا ہے۔ جتنی ہماری بساط تھی اس کے مطابق دکانیں اور گلی سجائی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ سے وقت لے کر آپ کی دعوت کی جائے اور اپنی خوشیوں کا اظہار کیا جائے۔''

''ارے نہیں، یہ کیا شروع کر دیا تم نے۔''

''بس یہ اظہارِ عقیدت ہے شاہ جی! آپ ہماری یہ دعوت قبول کر لیں۔''

''بات اصل میں یہ ہے کہ ہم تو آ گئے ہیں یہاں پر مگر ہمارا جی خوش نہیں ہے۔ اس موقع پر یہ سب اچھا نہیں ہو گا۔ تم لوگوں نے یہ جو سب کچھ کیا ہے اس سے بڑی ڈھارس

ہوئی ہے دل کو۔ کم از کم تم لوگ تو ہم سے محبت کرتے ہو۔ مگر اس سب کے لئے ہمیں معاف کر دو۔ ہم تمہاری خدمت کے لئے موجود ہیں۔ کسی کی کوئی مشکل ہو تو بتا دو۔“

”مگر شاہ جی! ہم چاہتے تھے......“

”نہ......ایسا مت کرو......اصل میں ہم بتائیں، ہمارا بیٹا ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہمارا اکرام ہم سے روٹھ کر کہیں چلا گیا ہے......اس کے لئے دعا کرو۔ اگر وہ مل گیا ہمیں تو جشن تو ہم ہیرا منڈی میں منائیں گے۔ تمہارے جذبات ہمیں پتہ چل گئے......اس سے آگے کچھ مت کرو، تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ ہماری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

سب نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔ شاہ جی نے جس عاجزی سے یہ الفاظ کہے تھے، وہ مان گئے اور اس کے بعد واپس چلے گئے۔ شاہ جی پھیکے سے انداز میں مسکراتے رہے، پھر انہوں نے کہا۔

”بھئی سیدھے سچے دل کے لوگ ہوتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں ان کا دل توڑنا اچھا نہیں لگا مگر ہمارا اکرام ہوتا تو سب کچھ مان لیتے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہ جی۔“

”باقی تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے......مگر اب یہ حرافہ کی جنی جیسی کی تیسی ہے، اس سے ذرا سی معلومات حاصل کرنی ہے۔“

”شمشیرہ بیگم؟“

”ہاں......صحیح بات تو وہی بتائے گی کہ کوثر جہاں کہاں گئی۔“

”جی شاہ جی۔“

”یہاں کا کام تو پورا ہو گیا ہے؟“

”جی شاہ جی۔“

”تو پھر بلاؤ اسے کسی وقت......ذرا اس سے دو چار باتیں کریں۔“

”ٹھیک ہے......جب آپ حکم کریں۔“

”ابھی ایک آدھ دن اور رک جاؤ، ہم بتا دیں گے کب بلانا ہے اسے۔“ شاہ جی نے کسی خیال کے تحت کہا اور خاموش ہو کر خلاؤں میں گھورنے لگے۔

○●○

شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کی رونق تو کوثر جہاں کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ شبانہ اور غزالہ تو ہمیشہ کی نکمی تھیں۔ محنت وہ بھی کرتی تھیں مگر کوثر جہاں جیسی بات کہاں۔ آواز کے شوقین، گائیکی کے رسیا اور خاص طور سے وہ جو گائیکی کو سمجھتے تھے اب ادھر کا رخ نہیں کرتے تھے۔ رقص اور نغمہ تو ہر کوٹھے پر مل جاتا تھا لیکن فن کہیں کہیں ہوتا ہے اور شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کا فن رخصت ہو گیا تھا۔ مال و دولت کی کمی نہیں تھی۔ پوری زندگی کمایا تھا اور ساری زندگی بچایا تھا لیکن کوٹھے والیوں کی فطرت میں دولت کی ہوس رچی ہوئی ہوتی ہے۔ جب تک مال نہ برسے، جی نہیں لگتا۔ شمشیرہ بیگم کو پتہ نہیں کوثر جہاں کا اتنا دکھ تھا یا نہیں یا اس بات کا کہ اب پہلے سے دن اور رات نہیں رہے تھے۔ اب دولت کی وہ فراوانی بھی نہیں ہوتی تھی۔ یہ دکھ کون سے کم تھے کہ رب نواز شاہ پھر ہیرا منڈی میں واپس آ گئے۔ دن رات کا دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اب کچھ ہوا کہ اب کچھ ہوا۔ ان کے اپنے دل میں چور تھا۔ نہ جانے کیا کیا جتن انہوں نے شاہ جی کو یہاں سے بھگانے کے لئے کئے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ شاہ جی ہر کوشش پر آڑے آ گئے تھے، حالانکہ دلدار گھوڑے جیسا کمینہ آدمی جو ہر ایک کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا، ہیرا منڈی کے لئے تباہی کا باعث بن گیا تھا۔ لیکن شمشیرہ بیگم کو اس بات کی فکر نہیں تھی۔ وہ دلدار گھوڑے کی آمد سے خوش تھیں کہ کم از کم شاہ جی کا پتا تو کٹا۔ لیکن مصیبت پھر نازل ہو گئی تھی۔ بہر حال یہ بڑی پریشانی کی بات تھی۔

ادھر غلام شاہ کے بارے میں بھی حاجو یہ خیال شمشیرہ بیگم کے دل میں ڈال چکا تھا کہ کوثر جہاں کو اس نے بھگایا ہے۔ بہر حال شاہ جی کے آنے سے مزید سنسنی پیدا ہو گئی۔ شمشیرہ بیگم اتنی احمق نہیں تھیں کہ غلط بات سوچتیں۔ جو خدشہ تھا آخر کار سامنے آ گیا۔ شمالے خان شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر پہنچا تھا۔ دن کا وقت تھا، دوپہر کے بعد شمشیرہ بیگم آرام کرنے کے لئے لیٹ جاتی تھیں۔ اس وقت بھی اپنی خواب گاہ میں لیٹی چھت کو گھور رہی

تھیں، یہ تجزیہ کر رہی تھیں کہ کوثر جہاں کے جانے کے بعد ان کے دل کے کون کون سے گوشے خالی ہو گئے ہیں کہ اچانک ہی حاجو نازل ہوا...... خواب گاہ میں اندھیرا تھا، دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ حاجو اپنے مخصوص انداز میں دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اندھیرے کی وجہ سے کمرے کی چیزیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔ توازن نہ سنبھال پایا اور دوڑتے ہوئے شمشیرہ بیگم کی مسہری تک پہنچا اور اس سے ٹکرا کر سیدھا شمشیرہ بیگم کے اوپر گر پڑا...... شمشیرہ بیگم تو پہلے ہی اس بھونچال سے خوفزدہ ہو گئی تھیں، بری طرح چیخیں۔

''ارے تجھے خدا سمجھے...... ارے تجھ پر خدا کی مار...... ارے رک......'' مگر حاجو میاں کی بریکیں ہمیشہ فیل رہتی تھیں۔

''ارے حاجو! کیا خدا کے گھر تیری کوئی پوچھ گچھ نہیں ہے؟ تُو اس دنیا سے نہیں جائے گا؟''

''وہ تو بعد کی بات ہے شمشیرہ بیگم! میں جاؤں گا یا نہیں جاؤں گا۔ لیکن آپ ضرور جا رہی ہیں۔''

''ہاں، ہاں...... جا رہی ہوں حاجو...... ابھی جا رہی ہوں۔''

''جی، تو شمالے خان باہر کھڑے ہوئے ہیں، آپ کو بلا رہے ہیں۔''

''ہیں......؟'' شمشیرہ بیگم کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ خوفزدہ لہجے میں بولیں۔ ''تیرا بیڑا غرق حاجو...... کیا بدفال منہ سے نکال رہا ہے۔ کہاں ہے شمالے خان؟''

''بڑے کمرے میں انتظار کر رہے ہیں آپ کا، فوراً آ جائیے۔ ورنہ آپ جانتی ہیں۔''

''ارے جھوٹ تو نہیں بول رہے؟''

''نہیں شمشیرہ بیگم! اس وقت جھوٹ نہیں بول رہا۔''

شمشیرہ بیگم ہانپتی کانپتی باہر آئیں اور فوراً ہی انہوں نے اپنا چولہ بدل لیا۔ ''ارے شمالے خان! میں تو تمہیں پہچانتی بھی نہیں ہوں، نام کسی کا بھی نہیں پتہ۔ کتنا سوچ رہی تھی میں کہ کسی وقت مبارکباد دینے پہنچوں احاطے پر مگر کمبخت فرصت ملے تو آدمی اپنے دل کا کام کرے۔ ارے تم لوگ تو ہیرا منڈی سے کیا گئے جھاڑو پھر گئی یہاں پر۔ لچے لفنگے کمینے آ کر آباد ہو گئے۔ اب جو آپ کی واپسی کی خبر سنی تو سچ جانو گھی کے چراغ جلائے ہیں میں نے کہ چلو اس دلدار گھوڑے جیسے شیطان سے تو جان چھوٹی۔ بڑا یاد کرتے تھے ہم لوگ

آپ کو۔ ہم کیا، پورا ہی محلہ یاد کرتا تھا۔ کچھ ایسی ہی محبت ہو گئی ہے آپ لوگوں سے۔

شمالے خان بھی دلچسپ نگاہوں سے شمشیرہ بیگم کو دیکھ رہا تھا، بولا۔ ''شمشیرہ بیگم! ہمیں آپ لوگوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں لیکن...... خیر، اچھا شاہ جی نے بلایا ہے آپ کو۔ آج شام کو چار بجے احاطے پر پہنچ جائیے۔''

شمشیرہ بیگم کو چکر آ گیا۔ کہنے لگیں۔ ''مجھے تو خود بھی مبارک باد دینے آنا تھا، یہ میری بدقسمتی ہے کہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی شاہ جی کا بلاوا آ گیا...... اے بھیا کیوں بلا لیا ہے ہمیں؟''

''اے بڑھیا! زبان سنبھال کر بات کر۔ شرم نہیں آتی کسی کو بھائی کہتے ہوئے؟ تم جیسیوں کو بھی بہن بنایا جا سکتا ہے کیا؟ آئندہ اگر کوئی اس قسم کی بات کی تو زبان کی خیر نہیں ہو گی۔''

''وہ...... وہ دیکھو اصل میں بھیا! میرا مطلب ہے کہ...... کہ، ہاں شمالے خان، ہاں ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گی۔ میں چار بجے پہنچ جاؤں گی۔'' شمشیرہ بیگم بدحواس ہو گئی تھیں۔

''چار بجے آ جانا...... کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم لوگوں کو آنا پڑے۔''

''نہیں نہیں...... میں آ جاؤں گی۔''

شمالے خان جھٹکے سے مڑا اور باہر نکل گیا۔ شمشیرہ بیگم دھڑ سے وہیں پر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بہت دیر تک وہ اپنے احساسات میں گھری رہیں۔ شاہ جی کا طلب کرنا بے مقصد نہیں تھا اور شمالے خان کے تیور بتاتے تھے کہ کوئی بڑی ہی بات ہے۔ جانا تو تھا ہی۔ بہرحال تیز خاتون تھیں، مٹھائی کا ڈبہ منگوایا، ہار منگوائے اور اس کے بعد تیاریاں کرنے لگیں۔ ٹھیک چار بجے وہ بالکل تن تنہا شاہ جی کے احاطے کی جانب چل پڑیں۔ چار بجے کا وقت دیا گیا تھا۔ شاہ جی ان کے استقبال کے لئے تیار تھے۔ شمشیرہ بیگم ہانپتی کانپتی شاہ جی کے احاطے میں پہنچ گئیں۔ حاجو اور غلام شاہ کو ہزاروں کوسنے دے رہی تھیں۔ ایسے غائب ہوئے تھے کہ نام ونشان تک نہیں ملتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس سازش میں برابر کے شریک ہوں۔ دیکھ لوں گی...... ایک ایک کو دیکھ لوں گی۔ راستے بھر جل تُو جلال تُو پڑھتی ہوئی آئی تھیں...... دروازے پر دستک دی تو فضل خان نے دروازہ کھول دیا۔

"آیئے......"

باہر ہی سامنے والے برآمدے میں شاہ جی اپنے مخصوص انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مونڈھے پر کمر ٹکائی ہوئی تھی، حقہ سامنے رکھا تھا۔ تمباکو کی خوشبو فضا میں اُڑ رہی تھی۔ عجیب سی نگاہوں سے شمشیرہ بیگم کو دیکھا اور شمشیرہ بیگم ہانپتی کانپتی آگے بڑھیں۔ چہرے پر خوشی کا تاثر پیدا کیا مگر اس تاثر میں سچائی نظر نہیں آتی تھی۔ مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں تھا، اسے کھول لیا اور شاہ جی کی طرف بڑھاتی ہوئی بولیں۔

"خوشی کے پھول لائی ہوں شاہ جی...... انہیں قبول فرمایئے۔"

شمالے خان، نور شاہ وغیرہ ہنس پڑے تھے۔ شاہ جی نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کھوپڑی آؤٹ ہوگئی ہے کیا...... مٹھائی کا ڈبہ ہمارے گلے میں ڈالو گی؟"

"ایں...... نہیں...... لو واقعی سٹھیا گئی ہوں...... اصل میں ساٹھ برس سے اوپر نکل گئی ہوں شاہ جی! یہ پھول لائی ہوں آپ کے لئے۔"

"رہنے دو...... ہم پھول نہیں پہنتے۔"

"شاہ جی......"

"شمشیرہ بیگم! بہت زیادہ وقت نہ ہمارے پاس ہے اور نہ ہم تمہیں اس کے لئے مجبور کریں گے۔ صرف دو لفظوں میں بتاؤ، کوثر جہاں کہاں ہے؟"

شمشیرہ بیگم لرز گئیں۔ چند لمحات سوچتی رہیں، آنکھوں میں آنسو آ گئے، بدن کانپنے لگا، ہونٹ لرزنے لگے، پھر آہستہ سے بولیں۔

"ہمیں کیا معلوم...... ہم تو خود برباد ہو گئے...... کوٹھا اجڑ گیا۔ جب سے وہ گئی ہے سچ مچ بیمار رہنے لگی ہوں۔ دیکھ لیجئے کیا چہرہ دیکھ کر گئے تھے اور کیا ہو گیا ہے...... خدا کوثر جہاں کی حفاظت کرے، روٹھ کر چلی گئی۔ اس کے چلے جانے سے بے چین ہوں، پریشان ہوں۔ ہمیشہ کہتی تو تھی اماں جب سے اکرام گیا ہے جی ہی نہیں لگتا، کچھ خبر بھی نہیں ملی اس کی۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ بیٹا شاہ جی کی حفاظت میں ہے، جہاں بھی ہو گا حفاظت سے ہو گا۔ انتظار کرتی رہی اور جب اکتا گئی تو ہم میں سے کسی کو کچھ بتائے بغیر چپکے سے ایک رات باہر نکل گئی۔ میں نے کنوئیں میں بانس ڈلوا دیئے، کہاں کہاں تلاش نہ کیا شاہ جی میں نے...... لیکن ایسا لگتا ہے کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ آپ کو نہیں معلوم، میں بھی

آخر ماں ہوں، کچھ بھی ہے جنا تو میں نے ہے اسے اپنے پیٹ سے۔ محبت تو ہوتی ہی ہے۔ چنانچہ میرا ابھی کھانا پینا حرام ہے۔ نہ نیند آتی ہے راتوں کو اور نہ دن میں چین ملتا ہے۔ پتہ نہیں میری بچی کہاں گئی...... ہائے میرے مولا۔" شمشیرہ بیگم نے رونا شروع کر دیا۔ شاہ جی ڈپٹ کر بولے۔

"اے بڑھیا! ہوش و حواس سنبھال۔ اتنے جوتے لگواؤں گا تیرے سر پر کہ بھیجہ ناک کے راستے باہر آ جائے گا۔ یہاں یہ اداکاری کرنے کے لئے نہیں بلایا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہاں گئی ہے وہ؟"

شمشیرہ بیگم کے آنسوؤں میں جیسے بریک لگ گیا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولیں۔ "ہم پر یقین کریں شاہ جی! ہم تو خود ہی مظلوم ہیں۔ خدا گواہ ہے، اللہ کو مان کر کہتے ہیں، داتا صاحب کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئی۔ بس خاموشی سے باہر نکل گئی۔ آپ جو چاہیں قسم لے لیں مجھ سے اور جیسے چاہیں تصدیق کر لیں۔ مجرم ثابت ہو جاؤں تو جوتے کیا گولی مار دیں مجھے، ہنٹر مار مار کر جان نکال لیں میری۔ خدا کی قسم مجھے بالکل نہیں معلوم کہ وہ کہاں چلی گئی۔ مجھے بتا کر نہیں گئی۔ بس تسنیم کو کندھے سے لگایا اور چپ چاپ باہر نکل گئی۔ تھوڑا بہت ساز و سامان بھی لے گئی۔ مگر یہ سب کچھ تو اسی کا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے...... کوئی پتہ نہیں چل سکا۔"

"جانے کی وجہ کیا تھی؟"

"وہی شاہ جی جو آپ کو بتا چکی ہوں۔"

"ایک بات سن لے شمشیرہ بیگم! اگر کوئی اور بات معلوم ہوئی تو کھال کھنچوا لوں گا تیرے بدن سے۔"

"آپ کی غلام ہوں شاہ جی! جو دل چاہے کریں اگر آپ کو کچھ پتہ چل جائے۔ ہائے میں تو خود صبر کر لوں گی۔ باقی سب کچھ اجڑ جائے، مجھے اس کی پرواہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے...... دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ایک بات یاد رکھنا، اس کے بارے میں اگر کوئی بھی اطلاع ملے فوراً مجھے خبر دو گی۔"

"لیجئے، اب تو آپ آ ہی گئے ہیں۔ بے سایہ تھی میں تو آپ کے بغیر۔ خدا کرے اس کا کہیں پتہ چل جائے مجھے یا آپ کو۔ میں تو خود یہی چاہتی ہوں کہ وہ کوٹھے پر واپس آ

جائے۔"

"جاؤ، اسے باہر تک چھوڑ آؤ" شاہ جی نے کہا اور شمشیرہ بیگم جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ پھولوں کے ہار اور مٹھائی کے ڈبے کی طرف دیکھا اور پھر شاہ جی کی طرف سوالیہ نظروں سے تو شاہ جی نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔

"تمہارا شکریہ شمشیرہ بیگم! یہ لے جاؤ، ہم انہیں قبول نہیں کر سکتے۔"

شمشیرہ بیگم کی کچھ اور کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ دونوں چیزیں اٹھائیں اور باہر نکل گئیں۔

شاہ جی خاموشی سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔ جب وہ باہر چلی گئیں تو شاہ جی نے کہا۔

"اس بڑھیا کے ساتھ دو آدمی اور رہتے ہیں، ان دونوں کو بلا کر لاؤ۔" ان کے حکم پر فضل خان باہر نکل گیا۔ غلام شاہ اور حاجو کو تلاش کیا۔ دونوں مل گئے اور تھوڑی دیر کے بعد دونوں شاہ جی کے بھیجے ہوئے آدمیوں کا شکار ہو گئے۔

"بلایا ہے تمہیں شاہ جی نے۔"

غلام شاہ نے سہمی ہوئی نگاہوں سے شاہ جی کے آدمیوں کو دیکھا اور حاجو نے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا۔

"اب تو جو کچھ ہونا ہے وہ ہو ہی جائے گا۔"

چنانچہ وہ خاموشی سے شاہ جی کے احاطے کی جانب چل پڑے۔

○●○

کوثر جہاں سب کچھ چھوڑ آئی تھی۔ دل میں دراڑ ہی دراڑ تھے۔ وہ سوچتی رہتی تھی کہ آخر وہ ذہنی طور پر طوائف کیوں نہ ہوئی؟ شبانہ اور غزالہ تو کوٹھے پر بہت خوش ہیں، شمشیرہ بیگم کی لاڈلی ہیں۔ ہر طرح کی آسانیاں انہیں حاصل ہیں۔ میں نے ہی محبت کا روگ دل کو لگا لیا۔ وہ ظالم مجھے دیوانہ بنا کر چھوڑ گیا اور یہ دیوانگی اکرام نے مکمل کر دی۔ تسنیم کو لئے لئے گھوم رہی ہوں، دیکھو تقدیر کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ لیکن اونٹ کی تو کوئی کل ہی سیدھی نہیں ہوتی۔

چنانچہ نیا کھیل شروع ہوا۔ حیدر پہلوان واقعی اس کے لئے فرشتہ ثابت ہوا تھا۔ پندرہ دن میں ایک بار لدا پھندا آتا، ضرورت کا ہر سامان گھر لاتا، اس کے سر پر ہاتھ رکھتا، تسنیم کی پیشانی چومتا اور چلا جاتا۔ اس وقت بھی اسے پندرہ سولہ دن ہو گئے تھے اور کوثر جہاں کے

اندازے کے مطابق اسے اب آنا ہی تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی اور کوثر جہاں نے دروازہ کھول دیا۔

دروازے کے باہر ایک عالیشان کار کھڑی ہوئی تھی اور دروازے پر ایک شاندار شخصیت کا مالک شخص۔ دیکھنے سے ہی بہت بڑا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کوثر جہاں ایک دم سہم گئی۔

"بیٹے! کوثر جہاں آپ ہی کا نام ہے؟" اس شخص نے ابتدا ہی ایسے لفظ سے کی جو تسلی دلاتا تھا۔ کسی کو بیٹی کہنا بڑی بات ہوتی ہے۔ کوثر جہاں نے کہا۔

"جی...... میرا ہی نام ہے۔"

"بیٹی! میں اندر آنا چاہتا ہوں۔"

"جی مگر...... آپ کون؟"

"خیر بخش حضوری ہے میرا نام...... نواب شاہ سے آیا ہوں۔"

"مجھ سے کیا کام ہے جناب؟"

"دروازے میں کھڑے ہو کر بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میں تم سے صرف چند منٹ لوں گا، زیادہ نہیں۔"

"آیئے۔" کوثر جہاں نے بادل نخواستہ کہا اور وہ شخص صحن میں داخل ہو گیا۔ پھر بولا۔

"بس یہیں تک ٹھیک ہے۔ بیٹا! ایک بری خبر لایا ہوں آپ کے لئے، مگر کیا کروں مجبوری ہے، بتانا تو ہے آپ کو۔"

"بب...... بب...... بری خبر؟"

"حیدر پہلوان میرا بڑا ہی وفادار تھا، پچھلے دنوں الیکشن ہوئے، اس الیکشن میں وہ میرے لئے کام کر رہا تھا۔ میرے مخالفوں نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے بیٹا! مرتے وقت مجھے تمہارے بارے میں بتا گیا تھا اور کہا تھا اس نے کہ اس کی ایک بہن یہاں رہتی ہے۔ پتہ معلوم کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ حیدر پہلوان نے جو کچھ میرے لئے کیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس کی بہن کی زندگی بھر کفالت کروں۔ بیٹا ایک بچی ہے تمہاری۔ تسنیم نام ہے اس کا۔ حیدر پہلوان نے مرتے وقت یہی بتایا تھا اور تمہارا نام کوثر جہاں ہے...... میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ یہاں رہنا مخدوش ہے۔ اور اب تمہارا کوئی سہارا بھی نہیں ہے یہ بات حیدر نے مجھے بتا دی تھی۔"

کوثر جہاں پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ کتنا اچھا انسان ......آہ، کتنا اچھا انسان دنیا سے چلا گیا۔ ایک بار پھر وہ ہمدردیوں سے محروم ہو گئی۔ فیصلہ کرنا تھا۔ جو تفصیلات خیر بخش نے بتائی تھیں، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ کوثر جہاں کو تھوڑا بہت چہروں کا اندازہ تھا۔ یہ شخص ایک نیک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے روتے ہوئے ان کے ساتھ جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

''بیٹا! میری حویلی میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تمہیں ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔ بچی کو بھی سکول میں داخل کرا دیا جائے گا۔ تم ساری زندگی وہاں آرام سے گزار سکتی ہو۔ حیدر پہلوان کے نام پانچ لاکھ روپے رکھے ہیں میں نے، وہ تمہارے نام منتقل ہو جائیں گے۔ بچی کے مستقبل کے لئے محفوظ رکھنا، باقی سب اللہ کی مرضی ہے۔ اس کے کپڑے لے لو اور اپنے دو چار جوڑی کپڑے لے لو۔ سب انتظام ہو جائے گا۔ سب کچھ یہیں چھوڑ دو، کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔ میں اپنے ہرکارے کو کہہ دوں گا بعد میں، اس مکان کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اس کا تیا پانچا کر دے گا۔ مگر تمہارا یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔''

کوثر جہاں ایک بار پھر اجڑ گئی تھی۔ نواب شاہ میں عظیم الشان حویلی میں اسے مہمان خانے میں رہنے کی جگہ مل گئی۔ اس حویلی میں بے شمار کوارٹر ملازمین کے لئے تھے، تھوڑی سی جگہ مہمانوں کے لئے بھی تھی۔ ایک الگ دو کمروں اور صحن والا گھر اسے دے دیا گیا۔ خیر بخش حضوری، نواب شاہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے اور حیدر پہلوان کو انہوں نے بہت عرصے سے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا...... الیکشن کی مہم میں حیدر پہلوان کام آ گیا۔ مرتے ہوئے وہ کوثر جہاں کے بارے میں تفصیل بتا گیا تھا۔ خیر بخش حضوری الیکشن جیت گئے لیکن حیدر پہلوان کو نہیں بھولے اور انہوں نے اس کی خواہش کے مطابق کوثر جہاں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

بہر حال یہ اچھے لوگوں کی نشانی ہوتی ہے اور وہ واقعی ایک اچھے انسان تھے۔ بہر حال یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن ایک دن ایک صاحب نے کوثر جہاں کو دیکھ لیا، یہ ریاض الدین تھے۔ خیر بخش حضوری کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ کوثر جہاں وہی طوائف ہے جس کے چکر میں ان کا بیٹا مراد بخش حضوری پڑ گیا تھا اور جس کے لئے انہوں نے بڑے پاپڑ بیلے تھے۔

بعد میں انہیں یہ بات بھی پتہ چل گئی تھی کہ خود کوثر جہاں نے مراد بخش کو وہاں سے ہٹا دیا تھا اور مراد بخش بمشکل تمام اپنے آپ کو کوثر جہاں سے دور کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔

ریاض الدین نے کوثر جہاں کو دیکھا اور اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر اس کے بعد وہ سیدھا خیر بخش حضوری کے پاس گیا تھا۔

''کہو ریاض الدین! خیر ہے؟''

''خیریت نہیں ہے جناب...... خیریت نہیں ہے سائیں، ایک بہت بڑا دھوکا ہو گیا۔''

''کیا ہوا بھئی؟ ہمیشہ ایسی ہی خبریں سنایا کرتے ہو۔''

''سائیں! آپ جس لڑکی کو یہاں لائے ہو جانتے ہو وہ کون ہے؟''

''کیا مطلب...... تمہیں پتہ ہے کون ہے وہ؟''

''سائیں! پہلے نہیں پتہ تھا، لیکن اب پتہ چل گیا۔''

''کون ہے؟...... کیا پتہ چل گیا؟''

''سائیں! ہیرا منڈی کی طوائف ہے وہ...... وہی لڑکی جس کے چکر میں سائیں مراد بخش پڑ گئے تھے۔ سائیں! کیا لے آئے آپ اپنے گھر میں...... آگ بجھی نہیں۔ بس یوں کہئے کہ آگ کی چنگاریاں دبا دی گئی تھیں۔''

''ریاض الدین! کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''سچ کہہ رہے ہیں...... وہ تو خدا کا شکر ہے کہ سائیں مراد بخش اس وقت یورپ کے دورے پر گئے ہوئے ہیں سائیں...... ان کے آنے سے پہلے کچھ کر لیجئے ورنہ آپ مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

''یار! تم نے تو میرے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے۔ مگر حیدر پہلوان نے تو اسے اپنی بہن بتایا تھا۔ ہم کیا کہیں...... لڑکی تو بہت اچھی ہے، میرا خیال ہے میں اسی سے بات کرتا ہوں۔''

خیر بخش حضوری کوثر جہاں کے پاس پہنچ گئے۔ کوثر جہاں پُر ادب انداز میں کھڑی ہو گئی تھی۔ خیر بخش حضوری نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ بے پناہ خوبصورت تھی، ایک عجیب سی کشش، ایک عجیب سا انداز تھا اس کا۔ بڑا تعجب ہوا انہیں کہ طوائفوں کے چہروں پر بھی اس قدر نرمی، اتنا وقار ہو سکتا ہے...... ایک لمحے کے لئے تو وہ الجھ سے گئے لیکن بہر حال اصلیت کا سامنا تو کرنا تھا، کہنے لگے۔ ''بیٹھ جاؤ بیٹی! میں تمہیں پورے خلوص اور پوری

محبت کے ساتھ بیٹی کہہ رہا ہوں۔ بیٹھ جاؤ۔"

تسنیم سو رہی تھی۔ کوثر جہاں، خیر بخش کے اشارے پر بیٹھ گئی۔

"بیٹی! ہر رشتے کی ایک حیثیت ہوتی ہے۔ مرحوم حیدر پہلوان میرے لئے کام کرتے ہوئے موت کا شکار ہو گیا۔ میں اس کی یاد کو کبھی دل سے نہیں مٹا سکتا۔ اس نے تمہارا نام لیا تھا میرے سامنے۔ میرا فرض تھا کہ میں مرحوم کی آرزو پوری کروں۔ لیکن بیٹی! دل پر ایک الگ ہی اثر ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں نے ایک بہت ہی اچھا کام کیا ہے۔ بیٹا دیکھو، تمہارے بارے میں مجھے کچھ تفصیلات معلوم ہوئی ہیں۔ خدا کرے غلط ہوں۔ اور یہ بھی سن لو کہ تم جو کچھ کہو گی، میں اسے ہی سچ مانوں گا چاہے دنیا ہزاروں ثبوت میرے سامنے میرے سامنے لا کر کھڑے کر دے۔ بیٹا! تمہارے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے کہ......"

"جی ہاں...... میں ایک طوائف زادی ہوں۔ لاہور کی ہیرا منڈی میں پیدا ہوئی، وہیں پلی بڑھی، وہیں زندگی گزاری۔ یہ سچ ہے۔"

خیر بخش حضوری کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"وہاں سے نکلیں کیسے؟ حیدر پہلوان تک کیسے پہنچیں؟"

"کہانی تو بہت لمبی ہے، مختصر سناتی ہوں۔ ہر جگہ کا اپنا ایک ماحول ہوتا ہے۔ تھوڑی بہت تعلیم بھی حاصل کی ہے میں نے۔ میری ماں شمشیرہ بیگم روایتی قسم کی طوائف ہیں۔ دولت، دولت اور دولت یہی ان کی زندگی کا مقصد ہے...... ہم تین بہنیں ہیں۔ دو بہنیں تو اس ماحول میں پوری طرح مگن ہیں، انہیں کوئی فکر نہیں ہے۔ مزے سے کھاتی پیتی اور رہتی ہیں۔ جناب عالی! میری زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ یہ انقلاب ایک شریف زادے کی دین تھی جو بیٹے کی شکل میں مجھے ملی۔ مگر میں اس شریف زادے کو نہ بھول سکی کیونکہ ذہنی طور پر میں صرف عورت تھی، طوائف نہیں۔ جناب عالی! ہم لوگوں کے ساتھ بڑے بڑے المیے ہوتے ہیں کبھی کبھی۔ ہم ذہنی طور پر وہ نہیں ہوتے جو بنا دیئے جاتے ہیں۔ شاید میں بھی ذہنی طور پر وہ نہیں تھی جو بنا دی گئی ہوں۔ آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ ایک طوائف زادی کسی شریف گھر میں رہے گی تو اس شریف گھر میں بھی تعفن پیدا ہو گا۔ مجھے اندازہ ہے جناب عالی! میں آگے کی کہانی سناتی ہوں آپ کو۔

میرا بیٹا بڑا ہو گیا...... چودہ پندرہ سال کا تھا۔ اس نے مجھ سے ایک ہی مطالبہ کیا، وہ یہ کہ میں کوٹھا چھوڑ دوں۔ ہیرا منڈی چھوڑ دوں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ جیسے ہی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا مگر اس نے مجھ سے یہ بھی وعدہ لیا کہ میں اس وقت تک اپنے آپ کو غلاظت میں ملوث نہ کروں۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔ مگر وہ میری ماں مجھ سے تعاون نہ کر سکی۔ وہ میرے سودے کرتی رہی۔ جہاں تک ہو سکا میں انہیں ٹالتی رہی۔ لیکن مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی ماں کا مقابلہ نہیں کر سکوں گی تو میں نے اپنی بیٹی کو کندھے سے لگایا اور گھر چھوڑ دیا۔ بھٹکتی رہی، کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ حیدر آباد اسٹیشن پر اتر گئی۔ وہاں مجھے بڑے تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا۔ مندر کا پجاری اور مسجد کا مولوی وہ نہ نکلے جو انہیں ہونا چاہئے تھا۔ حیدر پہلوان جو ایک غنڈے کی شکل میں سامنے آیا تھا، اس نے مجھے بہن کہہ کر بہن کا رشتہ نبھا دیا۔ جناب عالی! وہ میرا بھائی بن گیا۔ اس نے اپنی وہ جھونپڑی چھوڑ دی اور مجھے اس گھر میں لے گیا۔ لیکن تقدیر بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ اگر تقدیر ایسی نہ ہوتی تو جناب عالی! ہم کسی اچھے گھرانے میں نہ پیدا ہو گئے ہوتے؟ میرا باپ ریلوے کا قلی ہوتا، ہم لوگ غربت میں زندگی بسر کرتے، میں کوئلہ چن کر زندگی گزارتی، طوائف نہ ہوتی۔ لیکن تقدیر کو آپ کیا کہیں گے۔ بس اس طرح آپ تک پہنچ گئی ہوں۔ لیکن آپ یقین کریں، میں خود اس جنت کو داغدار کرنا نہیں چاہتی۔ آپ بے شک مجھے یہاں لے آئے ہیں لیکن مجھے اطمینان نہیں ہے۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ بس اتنا انتظام کر دیجئے کہ میں یہاں سے کہیں اور چلی جاؤں۔ دیکھتے ہیں زندگی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ آپ ذرا بھی پریشان نہ ہوں، ایک دن بھی میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔"

خیر بخش حضوری سکتے کے سے عالم میں بیٹھے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ دیر تک سوچ میں ڈوبے رہے، پھر ایک دم مسکرا پڑے۔ "ایک بات بتاؤ، کل تک تم مجھے انکل کہتی رہی تھیں، یہ آج میں صرف جناب عالی کیسے رہ گیا؟"

"اس وقت تک آپ مجھے نہیں جانتے تھے انکل۔ ہم بدنصیب لوگ کسی سے رشتہ قائم کرتے ہیں تو دھتکار دیئے جاتے ہیں۔ ہمارا صرف ایک ہی رشتہ ہوتا ہے۔ عورت، طوائف۔"

"بیٹی! میں اب بھی تمہیں پورے خلوص سے بیٹی کہہ رہا ہوں۔ تم صرف عورت ہو، طوائف تو صرف ایک ذہن کو کہتے ہیں، ایک علاقے کو کہتے ہیں۔ جہاں عورت صرف عورت ہوتی ہے وہاں صرف عورت ہے۔ میں تمہاری ایک ایک بات پر یقین کرتا ہوں۔ تم پاک صاف اور ہر لحاظ سے میرے لئے قابل احترام ہو۔ بہرحال، تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تمہارے لئے ایک بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم لاہور میں رہنا پسند کرو گی؟"

"میں نے عرض کیا نا کہ میں وہاں سے نکلی ہوں تو صرف اس لئے کہ شمشیرہ بیگم کا کوٹھا چھوڑ دوں۔ اگر اس وقت لاہور میں ہی میرے لئے کوئی جگہ ہوتی تو ظاہر ہے کہ اتنا لمبا چکر نہ کاٹتی۔"

"میری ایک بہت عالیشان کوٹھی ہے لاہور میں...... تم چاہو تو اسے میں تمہارے نام کر دوں گا۔ عزت واحترام سے وہاں پر رہو گی۔"

"آہ کاش آپ مجھے ایک چھوٹا سا گھر دے دیتے...... میں یہ الفاظ اس لئے کہہ رہی ہوں کہ آپ نے بار بار میرے بھائی کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر اس کی خدمات کچھ ایسی ہیں جن کا آپ کو کوئی صلہ ملا ہے تو آپ میرے لئے ایک چھوٹا سا گھر مہیا کر دیں۔ میں کسی چھوٹے گھر میں زندگی گزار لوں گی۔"

"خیر، خیر...... یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے، میں انتظام کئے دیتا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"نہیں جناب!" کوثر جہاں نے جواب دیا۔

○●○

اللہ نواز شاہ کو تفصیلی رپورٹیں حاصل ہو رہی تھیں۔ بیٹے کے سر سے پولیس کا عذاب تو ہٹا چکے تھے، اب یہ سوچ رہے تھے کہ کیا کرنا چاہئے۔

"پتہ نہیں کہاں ہے...... اگر میں اسے پا بھی لوں گا تو وہ مجھے حاصل نہیں ہو سکتا۔ جانتا ہوں اس کے مزاج کو بھی میں...... کیا کروں کیا نہ کروں۔ ماسٹر شیر علی ساتھ تھے۔ خود بھی وہ حتمی طور پر کوئی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ رب نواز ان کا احترام بے حد کرتا تھا۔ اس احترام میں اس نے یہ کیا تھا کہ دربار سے بھاگ گیا تھا اور اس کے بعد ہیرا منڈی چھوڑ دی تھی۔ لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ رب نواز شاہ ان کی بات مان ہی لے گا۔

چنانچہ وہ بھی کوئی دعویٰ نہیں کر رہے تھے اس بارے میں۔ بہرحال اللہ نواز شاہ کی کیفیت کا انہیں بخوبی اندازہ تھا۔ یہ مردِ آہن ان دنوں جس قدر نڈھال رہتا تھا، ماسٹر شیر علی کو اس کا اندازہ تھا۔ اکثر تنہائیوں میں اللہ نواز کو روتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ وہ ان کے دکھ کو جانتے تھے۔ اس وقت بھی اللہ نواز نے کہا۔

"جمعرات ہے آج ماسٹر صاحب! کیا خیال ہے مزارِ مبارک پر چلیں؟ پڑھیں گے وہاں بیٹھ کر، کچھ سکون ملے گا۔"

"میرے منہ کی بات چھین لی ہے آپ نے ملک صاحب۔"

"آیئے چلتے ہیں۔"

چنانچہ اللہ نواز شاہ ماسٹر شیر علی کے ساتھ دربار پر چل پڑے۔ قدرت وہی معجزے دکھانا چاہتی تھی جو بچھڑوں کو ملا دیتی ہے۔ ایسے واقعات اگر سکرین پر پیش کئے جاتے ہیں تو لوگ انہیں روایتی سمجھتے ہیں لیکن ان کی سچائیوں سے کوئی انکار کر کے دیکھے۔ یہ اللہ والے تو ہوتے ہی انسانیت کی بھلائی کے لئے ہیں۔ انسانیت کی بھلائی کے لئے اللہ کے ہرکارے۔ اور اس وقت بھی کچھ دعائیں پوری ہونے جا رہی تھیں۔ چنانچہ اللہ نواز شاہ، ہجویریؒ دربار پہنچ گئے اور وہاں درود و فاتحہ میں مصروف ہو گئے۔ ماسٹر شیر علی بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ ہر طرف ہجوم نظر آ رہا تھا۔ عقیدت منداپنے جذبوں کے اظہار کے لئے ہر جتن کر رہے تھے۔ بہت سے لوگ نذر تقسیم کر رہے تھے۔ ہر شخص یہاں فقیر تھا۔ نہ کوئی ملک، نہ چوہدری، نہ وزیر نہ سفیر۔ دربارِ ہجویریؒ تھا...... جس سے بڑا شہنشاہ یہاں کوئی دوسرا نہیں تھا۔

○●○

رب نواز شاہ خوبصورت آدمی تھے۔ شان و شوکت تو ویسے بھی دیکھنے کے قابل تھی اور سچی بات یہ ہے کہ ہیرا منڈی میں جو دل والیاں تھیں ان میں سے کچھ نے کتنی ہی بار ان کی آرزو کی تھی لیکن جانتی تھیں کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ رعب اور دبدبہ ہی ایسا بیٹھا ہوا تھا کہ دل کی بات دل ہی میں چھپا کر رہ گئی تھیں۔ ویسے بھی شاہ جی کا رویہ ان سب کے ساتھ مشفقانہ ہوتا تھا۔ ایسا آدمی اس طرح کے جال میں نہیں پھنستا۔ نہ ہی کوئی ایسی رپورٹ نگاہوں کے سامنے تھی۔ بہرحال اب ذرا چہرے میں پھیکا پن پیدا ہو گیا تھا اور خاص طور سے ان کے حواری اس پھیکے پن کو محسوس کرتے تھے۔ نور شاہ، دلبر خان، فضل

خان اور شالے خان ایسا لگتا تھا جیسے رب نواز شاہ کے بدن کے مختلف حصے ہوں۔ ان کی ایک ایک کیفیت سے واقف۔ شالے خان نے پوچھ ہی ڈالا۔

''شاہ جی...... آپ کا جو رویہ ہمارے ساتھ ہے ہم جانتے ہیں کہ اس میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اللہ کے فضل سے آپ ہمیں عزت بھی دیتے ہیں اور محبت بھی۔ شاہ جی آپ بہت پریشان ہیں آج کل۔ سنبھالیں اپنے آپ کو۔ دیکھئے اللہ پر تو ہم سب شاکر ہیں ہی۔ اگر وہ زندہ ہے تو ضرور مل جائے گا۔ ورنہ اللہ کے حکم اور اس کی مرضی کے مطابق صبر کرنا ہوگا۔''

''جانتا ہوں شالے خان! کچھ اور بھی الجھنیں ہیں۔ اللہ نواز شاہ صاحب کو ساری حقیقتیں معلوم ہوگئی ہیں۔ انہوں نے فوراً ہی ایکشن لیا اور ہمارے اوپر سے سارے کیس وغیرہ ختم کرا دیئے۔ بات تو بے عزتی کی تھی لیکن ہم نے جو کچھ کیا تھا وہ بھی زبان کی بات تھی۔ جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ ویسے ایک بات جس کا احساس ہوتا ہے، اللہ نواز شاہ نے جو کچھ کیا، وہ ہمارے ساتھ زیادتی بے شک تھی۔ ہمیں ان حقیقتوں سے ناواقف رکھا اور دنیا ہمارے بارے میں جان گئی۔ لیکن بہرحال باپ ہیں ہمارے۔ کبھی کبھی دل دکھتا ہے ان کے لئے۔ بہت سے خیالات جمع ہوگئے۔''

''چلئے شاہ جی! کہیں گھوم آئیں۔''

''کہاں چلیں؟''

''لاہور بہت دلکش اور وسیع جگہ ہے اور پھر ولیوں اور بزرگوں کا شہر۔ آئیے، داتا دربار چلتے ہیں۔''

چنانچہ رب نواز شاہ تیار ہوگئے اور پھر داتا صاحب کی نگری پہنچ گئے۔ خلقت کا ہجوم دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ یہ ایک زندہ معجزہ تھا، کسی کو کہیں سے رزق حاصل نہ ہو، داتا صاحب کے قدموں میں پہنچ جائے اور پیٹ بھرے۔ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ اس وقت بھی خوب رش تھا۔ شاہ جی ایک عجیب سی کیفیت کا شکار تھے۔ فاتحہ خوانی کی، اس کے بعد مدھم مدھم آواز میں کہنے لگے۔

''داتا صاحب! وہ میری اولاد نہیں ہے لیکن بس نجانے کیوں دل میں اس کے لئے اولاد کا پیار جاگ اٹھا ہے۔ اس کی جدائی برداشت نہیں کر پا رہا۔ پتہ نہیں کب اور کہاں

کمزور پڑ جاؤں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ جب میں کمزور پڑا تو پھر اس کے بعد زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ خود اپنے آپ مر جاؤں گا۔ مجھے اس طرح نہ مرنے دیجئے، آپ کی عنایت ہوگی۔''

ادھر تو وہ یہ دعا مانگ رہے تھے اور کچھ فاصلے پر اللہ نواز شاہ کھڑے ہوئے رب نواز شاہ کو دیکھ رہے تھے۔ پورا بدن پسینے سے تر ہوگیا تھا۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ ماسٹر شیر علی نے بھی انہیں دیکھ لیا اور اللہ نواز کے بازوؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''سنبھالئے خود کو...... آئیے دیکھتے ہیں۔'' ماسٹر شیر علی آگے بڑھے تو اللہ نواز نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آپ اس کے استاد ہیں، مجھے معلوم ہے، یہاں اس سے بات نہ کریں۔''

رب نواز شاہ نے فاتحہ خوانی کی، دعائیں مانگیں اور اس کے بعد افسردہ سے واپس چل پڑے لیکن انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ آخر کار ڈیرے پر پہنچ گئے۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی ڈیرے پر پہنچے ہوئے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور افضل خان نے دروازہ کھولا۔ ایک لمحے کے اندر اندر اللہ نواز کو پہچان کر وہ ساکت ہوگیا۔ ماسٹر شیر علی خان نے کہا۔

''پہچانتے ہو انہیں؟...... اگر پہچانتے ہو تو اُلّو کی طرح منہ اٹھائے ہوئے کیوں کھڑے ہو؟ ہٹو، راستہ دو۔''

یہ آواز اتفاق سے رب نواز شاہ نے سن لی تھی۔ شالے خان ان کے پاس موجود تھا۔ ایک دم سے بولے۔ ''ماسٹر شیر علی کی آواز ہے۔''

لیکن اس دوران ماسٹر شیر علی، افضل خان کو راستے سے ہٹا کر اللہ نواز کے ساتھ اندر آ گئے تھے۔ ماسٹر شیر علی کے ساتھ باپ کو بھی دیکھا اور احترام کے انداز میں کھڑے ہوگئے۔ گردن جھکا لی۔ اللہ نواز شاہ ان کے قریب پہنچ گئے۔ پھر انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''گلے لگانے کی اجازت ہے بیٹے؟'' اس آواز میں بڑا درد، بڑا سوز تھا۔ شاہ جی نے آگے بڑھ کر قدموں میں سر جھکا دیا تو اللہ نواز شاہ نے انہیں سینے سے بھینچ لیا اور بولے۔

''نہیں، ایک گنہگار کو یہ مقام مت دو...... حقیقت تو یہی ہے کہ گناہ کیا ہی نہیں تھا، اپنی

قبر میں جانا ہے۔ اللہ کو منہ دکھانا ہے۔ بڑے اہتمام اور احترام کے ساتھ اس نیک بخت سے نکاح کیا، دل مائل ہو گیا تھا اس کی جانب۔ بڑے ہنگامے ہوئے۔ طوائفیں بھلا اپنی اولادوں کو کہاں چھوڑتی ہیں۔ نجانے کیسے کیسے جتن کرنے کے بعد نکاح کیا۔ بیٹے! کوئی گناہ نہیں کیا ہے ہم نے۔ بزرگوں نے تسلیم کر لیا۔ تم اولاد ہو کر تسلیم نہ کرو تو دوسری بات ہے۔"

شاہ جی کچھ نہیں بولے تھے۔ اللہ نواز نے کہا۔ "یہاں کیوں آ گئے؟"

پہلی بار شاہ جی نے نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور بولے۔ "اصل میں ابا جان! ہمارا احساس پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ ساری زندگی اس طرح سر اٹھا کر جیئے کہ دیکھنے والے کبھی بھرپور نگاہ سے نہ دیکھ سکے۔ اس وقت ہمیں احساس ہوا کہ آخر کار ہر غرور کی ایک سزا مقرر ہوتی ہے۔ ایک طوائف زادے کی حیثیت سے اپنے بارے میں سن کر ہم برداشت نہیں کر سکے۔ ہم اسے آپ کا قصور قرار نہیں دیتے۔ آپ یقین کریں، آپ سے ناراض نہیں ہیں ہم۔ بس اپنی تقدیر سے شاکی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ نے ہماری گلو خلاصی کرائی ہے سکول کی قیمت ادا کر کے۔ یہ قیمت ہم بھی ادا کر سکتے تھے لیکن آپ کا مقام نہیں لا سکتے تھے ابا حضور! ہم آپ کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں۔ آپ کو واقعی ہماری وجہ سے بہت تکلیف ہوئی ہے، ہم شرمسار ہیں۔ لیکن ہمیں اپنی تقدیر سے لڑنے دیجیے۔ جو کچھ آپ نے کیا وہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ آپ نے ہمیں پال پوس کر پروان بھی تو چڑھایا ہے۔ کوئی دوسرا ایسا بھی نہیں کر سکتا۔ پر دیکھیے اس کے بعد ہم سے کچھ نہ کہیے۔ ایک نکما اور آوارہ آدمی سمجھ کر ہمیں معاف کر دیجیے گا۔"

"گھر نہیں چلو گے؟"

"نہیں ابا جان! ہم نے جو مقام اپنانا تھا، وہ حاصل کر لیا ہے۔ خاک وہیں تک پہنچ چکی ہے جہاں کا خمیر ہے۔ ہم خواہش مند ہیں اس بات کے کہ آپ ہمیں مجبور نہ کریں۔"

"ابے بہت زیادہ منطقی مت بن۔" ماسٹر شیر علی نے کہا اور رب نواز شاہ ہنسنے لگے۔

"یہ لہجہ بھی ہمارے لئے بہت قیمتی ہے۔ مگر ابا جان جانتے ہیں کہ جو فیصلہ ہم کر لیتے ہیں وہ بدلنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

اللہ نواز شاہ تھوڑی دیر تک بیٹے کو دیکھتے رہے پھر بولے۔ "تو میں جاؤں؟"

"خدا کی قسم اگر آپ اپنے ماضی کو دہرانا چاہیں تو یہاں ہمارے پاس بیٹھیے، ہم آپ کی خاطر مدارات کریں گے۔ آپ یوں سمجھ لیجیے کہ آپ ایک بار پھر کسی کوٹھے پر آئے ہیں۔"

رب نواز کے دل میں نجانے کیا آئی تھی کہ انہوں نے یہ الفاظ کہے۔

"اچھا خدا حافظ۔" اللہ نواز نے کہا اور ماسٹر شیر علی کو اشارہ کر کے بولے۔ "آؤ ماسٹر شیر علی! میرا بیٹا ہے وہ۔ فخر کرتا ہوں میں اس پر کہ وہ اتنا ہی ٹھوس کردار کا انسان ہے۔"

○●○

شمشیرہ بیگم لاکھ طوائف سہی مگر ان کے جسم کی بناوٹ بھی عام انسانوں کی طرح ہی تھی۔ سینے میں دل دھڑکتا تھا اور دل میں جذبات بھی تھے لیکن کبھی کبھی شمشیرہ بیگم کے چہرے سے ماں بھی جھلکنے لگتی تھی۔ کوثر جہاں ان کی اولاد تھی اور بڑی حیثیت رکھتی تھی ان کے لئے چنانچہ تنہائیوں میں اکثر یاد آ جاتی تھی اور شمشیرہ بیگم کی آنکھیں آنسو بہانے لگتیں۔ اس وقت ان کے دل کی دھڑکنیں ممتا کا روپ اختیار کر لیتی تھیں۔ چپکے چپکے روتی تھیں اور کوثر جہاں کو یاد کرنے لگتی تھیں۔ کبھی اپنے ماحول کا خیال بھی آ جاتا مگر کیا کرتیں، جس ماحول کی پلی ہوئی تھیں اسے بدلنا تو ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ کیسے شریف زادی بنا کر شریفوں کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جاتا۔ یہ ایک ناممکن عمل تھا، بہت سے واقعات نگاہوں کے سامنے تھے۔ شریف زادے یہاں بھٹک کر آ جاتے اور پھر شدید محبتوں کا اظہار کر کے طوائفوں کو اپنے گھر لے جاتے۔ لیکن بعد میں وہ طوائفیں کسی ٹی بی ہسپتال میں خون تھوکتی نظر آتی تھیں۔ اہل خانہ انہیں قبول نہیں کرتے تھے۔ یہ صدیوں کی داستانیں تھیں جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ کوثر جہاں کو بھی بھلا ایک شریف زادی کیسے بنایا جا سکتا تھا؟ جو تقدیر لے کر پیدا ہوئی تھی، اس میں ترمیم کہاں ممکن تھی؟ اور پھر صحیح معنوں میں وہ شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کی صحیح رونق تھی۔ بہت یاد کرنے لگی تھیں ان دنوں۔ پرانے شناسا آ جاتے تھے۔ پھر اس دن مرزا حیات بیگ نے تو بالکل ہی دل بجھا دیا تھا۔ مرزا حیات بیگ اور شیخ رحمت علی دونوں ہی آئے تھے۔ غزالہ اور شبانہ سرتوڑ کوشش میں مصروف تھیں۔ گانا بھی سیکھا تھا، زیادہ محنت کی تھی۔ رقص تو وہ جانتی ہی تھیں رنگ جمانے کی کوشش کرتیں۔ نئے لوگوں پر تو رنگ جم جاتا لیکن پرانے لوگ جو صرف کوثر جہاں کی آواز سننے آیا کرتے تھے جب یہاں آتے تو منہ بنائے ہوئے ہی واپس جاتے۔ مرزا حیات بیگ بہت دن کے بعد آئے تھے اور غالباً

انہیں معلوم نہیں تھا کہ کوثر جہاں اب یہاں نہیں ہوتی۔ شمشیرہ بیگم نے معمول کے مطابق خوبصورت جملوں سے ان کا استقبال کیا اور حیات بیگ نے شمشیرہ بیگم کو پھولوں کا گلدستہ پیش کیا، پھر بولے۔

''سچ بات یہ ہے شمشیرہ بیگم! کہ پچھلے دنوں بڑے مصروف رہے لیکن آپ لوگ یاد آتے رہے۔ اور اب جیسے ہی فرصت ملی رسیاں تڑوا کر بھاگے اپنی کوثر جہاں کی آواز سے لطف اندوز ہونے کے لئے۔''

شیخ صاحب قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے، انہیں کوثر جہاں کی گمشدگی کا علم تھا، جلدی سے بولے۔ ''چڑیا اُڑ گئی بیگ صاحب! جس شاخ پر آشیانہ تھا، وہ شاخ ہی ٹوٹ گئی۔''

''کیا مطلب؟''

''کوثر جہاں اب یہاں نہیں ہوتیں۔''

''ارے کیوں؟ وہ تو شمشیرہ بیگم کی بیٹی تھی۔ کہاں چلی گئی؟ کوئی اور کوٹھا آباد کر لیا اس نے؟''

''نہیں..... گھر چھوڑ کر بھاگ گئی اپنی بچی کو لے کر۔''

''ہیں.....؟'' حیات بیگ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ شمشیرہ بیگم کا چہرہ ست گیا تھا۔ پچھلے دنوں ویسے بھی کوثر جہاں کو بہت یاد کرتی رہی تھیں۔ حیات بیگ کے الفاظ سے بہت غمزدہ ہو گئیں۔ حیات بیگ نے شمشیرہ بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''شمشیرہ بیگم! یہ کیا ہوا اور کیسے ہوا؟''

''بس کیا کریں حیات صاحب! تقدیر کالی ہو گئی۔ چلی گئی اپنے مقدر بنانے کے لئے بے وقوف۔ مگر جانتی نہیں ہے کہ طوائفوں کا مقدر تو ایک ہی ہوتا ہے۔ آئے گی کسی دن خون تھوکتی ہوئی اسی گھر میں۔ دکھ تو یہ ہے کہ معصوم بچی کو بھی ساتھ لے گئی۔ نجانے کہاں بھٹک رہی ہو گی کمبخت۔''

''یہ تو واقعی بری سنائی تم نے۔ پھر اب کوٹھے کا کاروبار کیسا چل رہا ہے؟''

''بس اللہ کا کرم ہے مرزا صاحب، بچیوں نے سنبھالا ہوا ہے۔''

''بھئی کچھ سمجھ میں نہیں آئی بات۔''

خیر شبانہ اور غزالہ نے اپنا کام شروع کر دیا۔ شبانہ نے تان پُرا سنبھالا، غزالہ رقص

کرنے لگی۔ حیات بیگ اور شیخ صاحب بیٹھے ان دونوں کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد حیات بیگ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ کچھ حقیری سی رقم ہے، آپ کے لئے لائے تھے۔ چلتے ہیں اب۔''

''بچیوں کا گانا کچھ پسند نہیں آیا؟''

''دیکھو شمشیرہ بیگم! اب یہ بھی سوال کوئی کرنے کا ہے؟ کہاں کوثر جہاں اور کہاں یہ بچیاں۔ خیر کوئی بات نہیں۔''

شمشیرہ بیگم بری طرح بد دل ہو گئی تھیں۔ بہت افسردہ تھی۔ مجرا ختم ہو گیا اور اپنے کمرے میں آ بیٹھیں۔ روشنیاں بجھ گئیں۔ رات کو نجانے کب تک جاگتی رہیں۔ اس رات مامتا بہت تڑپی تھی، بہت یاد کیا تھا انہوں نے کوثر جہاں کو اور نجانے کیا کیا سوچتی رہی تھیں۔ دوسری صبح بخار ہو گیا۔ سر میں شدید درد تھا۔ بہت دیر تک باہر نہ نکلیں تو لوگوں کو تشویش ہوئی۔ حاجو اور غلام شاہ دونوں ہی کمرے میں پہنچ گئے۔ ان دنوں دونوں میں گاڑھی چھن رہی تھی۔ شمشیرہ بیگم کی کمائی کا ایک بڑا حصہ ان کے قبضے میں آیا تھا۔ عیش کر رہے تھے۔ ویسے بھی سستا دور تھا، جو کچھ بھی تھا اس نے انہیں رئیس بنا رکھا تھا۔ شمشیرہ بیگم بھی کچھ نہ کچھ انہیں دیتی رہتی تھیں۔ غلام شاہ نے کہا۔

''کیا بات ہے شمشیرہ بیگم! یہ بخار کیسے آ گیا؟''

شمشیرہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھیں۔ حاجو نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''شمشیرہ بیگم! تم جانتی ہو کہ ہم تمہارے غلام ہیں لیکن تم نے ہمیں......''

''چھوڑ حاجو! اب ان باتوں میں کیا رکھا ہوا ہے۔ کلیجہ نکل گیا ہمارا۔ کیا کہیں کیا نہ کہیں، سمجھ میں نہیں آتا۔ کوثر جہاں چلی گئی۔ گاتی نہ گاتی یہ اس کی مرضی تھی۔ مجرا کرتی نہ کرتی مگر سامنے تو ہوتی نگاہوں کے۔ کہیں کسی ظالم کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ تم نے حیات بیگ اور شیخ صاحب کی باتیں سنی تھیں؟ سچ بات یہ ہے کہ یہ لڑکیاں تو صدا کی نکمیاں ہیں، کبھی کچھ کر کے نہ دیا۔ بھلا ان میں سے کون کوثر جہاں کی جگہ سنبھال سکتی ہے۔''

''ہاں یہ تو ٹھیک ہے...... لیکن اس طرح اپنے آپ کو بیمار ڈال لو گی تو کیا ہو گا۔''

''نہیں، بس نجانے کیوں کبھی کبھی بری طرح یاد آ جاتی ہے۔''

''اپنے آپ کو سنبھالو...... اب کیا فائدہ اس چکر میں پڑنے کا۔''

"ہائے کوئی نہیں ہے اس دنیا میں جو میری کوثر جہاں اور تسنیم کو تلاش کر کے لے آئے۔"

"اللہ بہتر ہی کرے گا...... کیا، کیا جائے۔"

"ویسے تمہارا کیا خیال ہے غلام شاہ، ان لڑکیوں میں سے کسی کو ڈھنگ نہیں آ سکتا۔"

"سمجھاؤ انہیں، زیادہ محنت کریں۔ آخر وہ بھی تو تمہاری ہی بیٹیاں ہیں۔"

"کیا سمجھاؤں ان گھوڑیوں کو۔ اچھلنے کودنے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ کبھی کبھی تو غزالہ اس طرح رقص کرتی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ کسی درخت کا بکل لے کر اس کی اچھی طرح پٹائی کر دوں۔ شبانہ اچھا خاصا گا رہی ہوتی ہے مگر کبھی کبھی پھٹا ہوا بانس بن جاتی ہے۔"

دونوں لڑکیاں اتفاق سے اندر کمرے میں داخل ہوئیں، ماں کی باتیں سنیں اور دونوں کا پارہ چڑھ گیا۔ ماں کی بیماری کا تو خیر پتہ نہیں تھا۔ شبانہ نے منہ بنا کر کہا۔

"ہماری برائیاں ہو رہی ہیں اماں؟"

"برائیوں کی بچی، میں کہتی ہوں کہ تمہیں کبھی مجرے کا سلیقہ آئے گا یا نہیں؟ گھوڑے کی طرح چھلانگیں لگاتی ہو، پھٹے بانس کی طرح گاتی ہو۔ میں کہتی ہوں اس کوٹھے کا ستیاناس مارنے پر کیوں تُل گئی ہو تم...... تماش بینوں کی تعداد ویسے ہی کتنی کم ہو گئی ہے اور پھر بے پرواہی نے اور حالات خراب کر دیئے ہیں۔"

"اتنی محنت تو کر رہے ہیں اماں...... اور کیا مر جائیں تمہارے لئے؟"

"ہاں، یہی تو محنت ہوتی ہے۔ میں کہتی ہوں کہ تم خود ہی اپنے آپ پر غور کیوں نہیں کرتیں۔"

"غور ہی تو کرتے ہیں۔ غور کر کے ہی کہہ رہے ہیں کہ ہم کتنی ہی محنت کر لیں، تمہارا منہ کبھی بھرا ہے...... اور کیا کر سکتے ہیں ہم؟"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... اب مجھ سے لڑنے بیٹھ جاؤ۔ میں کہتی ہوں تم لوگ محنت کیوں نہیں کرتیں؟"

"بس اس سے زیادہ محنت نہیں ہوتی ہم سے...... کہاں تک سنبھالے رکھیں ہم ان معاملات کو۔ جو کچھ ہم سے ہوتا ہے وہ ہم کر رہے ہیں۔"

"اور وہ کوثر جہاں جو اتنا اچھا گاتی تھی وہ؟"

"اس پر محنت بھی تو کی تھی آپ نے۔ خرچہ بھی تو کیا تھا۔"

"اور تم پر محنت نہیں کرتی، خرچہ نہیں کرتی؟"

"کیا خرچہ کرتی ہیں؟ ہر وقت تو سانپ بن کر بنی بیٹھی رہتی ہیں اپنے پیسوں پر۔ نہ کسی ڈھنگ کے استاد کو رکھا آج تک نہ کبھی ہم لوگوں پر پیسہ خرچ کیا۔ بس گھر میں ہی گھٹ گھٹ کر مر جاؤ۔"

"تو کہاں آسمان پر پرواز کرو گی تم؟"

"سب لوگ ہی کرتے ہیں، ہمارا ہی کیا۔ آپ ہی ہیں جو ہمیں گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتیں۔"

"ہاں بھاگ جانا تم بھی گھر سے...... باہر نکلنا اور تاک لینا کسی اور کو اور بسا دینا اس کا گھر۔"

"چھوڑیئے اماں! آپ کہاں بسنے دیں گی اس کا گھر؟ اسے بھگا دیا مار مار کر۔ کما ہی رہی تھی آپ کے لئے، کچھ نہ کچھ تو کر ہی رہی تھی۔ جان کر پیچھے ہی پڑی رہتی تھیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ تم نے کبھی ماں بن کر سوچا ہی نہیں۔ آخر اکرام بھی تو انہی کا بیٹا تھا، آپ کا نواسہ تھا، انسان تھا۔ جو کچھ بھی تھا، اس کوٹھے پر پیدا ہوا۔ آپ اس کی جان کے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ آخر وہ بھی ماں ہے، اس کے دل میں بھی ممتا آئی ہو گی، اپنی بچی کو لے کر نکل گئی۔"

"ارے ارے...... مجھ سے منہ مارے جا رہی ہو؟"

"بس اماں...... ہم اس سے زیادہ محنت نہیں کریں گے۔ اور سنئے، ہمیں گھومنے پھرنے کا وقت بھی چاہئے۔"

"لڑکیو! تمہارا دماغ واقعی بہت خراب ہو گیا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے...... ہمیں بھی زہر دے دیجئے۔ وہ تو گھر سے نکل گئی، ہمیں یہیں ہلاک کر دیجئے۔" شبانہ نے کہا۔ غزالہ بھی اس کے پیچھے پاؤں پٹختے ہوئے چلی گئی تھی۔ شمشیرہ بیگم اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں، سارا بخار وخار بھول گئی تھیں۔ غلام شاہ سے کہنے لگیں۔

"دیکھ رہے ہو غلام شاہ؟"

"ہاں شمشیرہ بیگم...... لڑکیاں سرکش ہوتی جا رہی ہیں۔"

"نہیں ہونے دوں گی انہیں سرکش غلام شاہ! اپنی بھی جان دے دوں گی اور ان کی بھی لے لوں گی۔ میں کہتی ہوں کہ اس کوٹھے پر اب رہ کیا گیا ہے؟ اب تو لوگ یہی کہتے ہیں

کہ بی شمشیرہ بیگم! اپنا سامان اٹھاؤ اور آگے بڑھ جاؤ۔ اب یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔"

یہی تمام باتیں ہوتی رہیں۔ اس رات غزالہ اور شبانہ کا منہ بنا ہوا تھا حالانکہ آج اتفاق سے تماش بین زیادہ آ گئے تھے۔ پرانوں میں سے تو شاید کوئی بھی نہیں تھا لیکن نئے لوگ آئے تھے۔ خصوصاً خوبصورت لباس میں ملبوس وہ خوبصورت شکل وصورت والا نوجوان جو چہرے سے زیادہ پڑھا لکھا تو نظر نہیں آتا تھا لیکن شوقین تھا۔ گلے میں سونے کی زنجیر پہنے ہوئے، ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی۔ جیبیں بھی پھولی ہوئی لگ رہی تھیں۔ بوسکی کا کرتہ، خوب عطر لگائے ہوئے ذرا جھجکتا ہوا آیا تھا۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کوٹھوں سے اجنبی ہے لیکن ایسے تماش بین روز آتے رہتے تھے، کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شمشیرہ بیگم نے ایک نگاہ میں اس کا جائزہ لیا، یوں لگا جیسے ٹھیک ٹھاک ہو۔ شبانہ نے نغمہ شروع کیا، غزالہ نے رقص۔ اور نجانے کیوں دونوں نے ذرا صحیح انداز میں محفل جمائی۔ شبانہ بھی بہت اچھا گا رہی تھی اور غزالہ تو بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ ویسے بھی شوخ وشنگ لڑکی تھی۔ چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ کوثر جہاں کے چلے جانے کے بعد بے شک اس میں کمی آ گئی تھی۔ آخر بہنیں تھیں۔ لیکن شاید ماں کی دن کی باتوں کا اثر تھا کہ دونوں نے آج بہت محنت کی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ نوجوان کھلنے لگا۔ دوسرے لوگ بھی داد دے رہے تھے، نوٹ بھی برسا رہے تھے لیکن نوجوان کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات نظر آئے۔ اس نے نوٹوں کی کئی گڈیاں غزالہ پر وار دی تھیں۔ غزالہ ہی کی جانب متوجہ نظر آتا تھا۔ بہت دیر اسی طرح گزر گئی۔ رقص جاری رہا۔ بارہ بج گئے، بہت سے لوگ آئے اور چلے گئے لیکن وہ نوجوان اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہی رہا تھا۔

آخر جب رقص ختم ہوا تو اس نے گلے سے سونے کی زنجیر اتاری، ہاتھوں سے ہیرے کی انگوٹھی اور جیب سے نوٹوں کی گڈیاں اور اس کے بعد اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر یہ تمام چیزیں غزالہ کے قدموں میں ڈھیر کر دیں۔ شمشیرہ بیگم کو آج بہت دنوں کے بعد دلاسہ حاصل ہوا تھا۔ کوئی آسامی آئی تھی۔ بہت خوش ہو کر بولیں۔

"ارے میاں! یہ ساری چیزیں تو ثانوی حیثیت رکھتی ہیں، تم نے فن کی قدر کی، ہم نے تمہاری قدر کی۔ کون ہو؟ بیٹھو، چلے جانا۔ مجرا تو ختم ہو گیا۔ مگر معزز مہمان اگر کچھ دیر رک

جائیں تو کچھ حرج نہیں ہوتا۔"

ایک ساتھی نے بتایا۔ "علی شان ہے ان کا نام...... علی شان کھوکھر۔ بہت بڑا کاروبار ہے لاہور میں، بہت سے کارخانے ہیں لاہور کے آس پاس۔ شمشیرہ بیگم! ہم نے آپ کا نام سنا تھا، جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ بہت اچھی محفل ہوتی ہے آپ کے ہاں۔"

"بس قدر دانوں کے دم سے سب کچھ ہوتا ہے۔ آپ کو ہماری محفل پسند آئی، آپ کا شکریہ۔ غزالہ دیکھو ذرا، کچھ منگواؤ شان میاں کے لئے۔ جلدی کرو۔" شمشیرہ بیگم کی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ نوجوان کی نگاہیں غزالہ ہی کی طرف نگراں ہیں۔ کہنے لگیں۔ "کیا نام بتایا میاں آپ نے؟"

"علی شان۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ لگتے بھی رئیس زادے ہی ہیں۔ اب یہ بتائیں کہ آج آ کر پھر کبھی دوبارہ منہ دکھائیں گے یا نہیں؟ یا پھر ہمیں یونہی تڑپتا ہوا چھوڑ جائیں گے؟"

"نہیں نہیں...... کل پھر آؤں گا...... اگر آپ کی اجازت ہو۔"

"لو، اجازت کی بات کر رہے ہو، یہاں ایک نظر میں تم نے ایسا جادو جگا دیا ہے کہ لگتا ہے برسوں کے جانے پہچانے ہو۔ انتظار کریں گے تمہارا۔ مگر جلدی آنا، مجرا شروع ہونے سے پہلے۔ غیروں کی طرح مت آنا۔"

"جی بہت بہتر...... حاضر ہوں گے۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ لوگ رخصت ہو گئے۔ شمشیرہ بیگم ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگیں۔ پھر انہوں نے غزالہ کو قریب بلایا اور بولیں۔

"دیکھو غزالہ! یہی ہماری زندگی ہوتی ہے اور اسی میں ہماری زندگی ہے۔ کوئی آنکھ کا اندھا، گانٹھ کا پورا لگتا ہے۔ کچھ کر لو۔ وہ تو کچھ نہ کر سکی۔ اس کے پاس تو ایسے ایسے موقعے آئے کہ آج نجانے کیا حالت ہوتی ہماری۔ تمہی کچھ کر لو۔"

"کیا کروں اماں! بتائیں؟"

"کل جلدی آ جائے تو اس سے کہنا کہ رات کو دیر تک رکے۔ بس دل لگانے کے لئے جو طریقے تمہیں سکھائے گئے ہیں انہی پر عمل کرنا۔"

''ٹھیک ہے اماں! جیسا آپ کہہ رہی ہیں ویسا ہی کروں گی۔'' غزالہ نے کہا۔ شمشیرہ بیگم کو آج خاصی تسلی ہوئی اور طبیعت کافی بہتر ہوگئی۔

○●○

ہسپتال میں اکرام کی حالت کافی بہتر ہوتی جارہی تھی۔ پورے ہسپتال کے ڈاکٹروں اور نرسوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا تھا۔ حُسن و جمال کی ایسی تصویر بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ خدا نے مردوں کو اتنا حسین کم ہی بنایا ہے۔ جو بھی دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ پھر مزاج کا بہت اچھا، ہر ایک سے نرمی اور محبت سے پیش آنے والا۔ غیاث الدین نے ڈیوٹیاں لگا رکھی تھیں۔ نادر شاہ تو بس زیادہ تر وقت ہسپتال ہی میں گزارتا تھا۔ ادھر چوہدری جواد حسین بھی اس کے دیوانے تھے۔ غیاث الدین ہفتے میں ایک آدھ چکر لگا لیتے تھے۔ جب بھی وہ یہاں آتے عرشیہ ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ خود بھی اکرام کو بے پناہ چاہنے لگی تھی۔ جہاں تک مسئلہ شانہ کا تھا تو حیران کن طریقے سے یہ لڑکی مشرقی تھی، جبکہ یورپ ہی میں پیدا ہوئی اور پرورش پائی۔ لیکن ایک مثال تھی وہ مشرق کے لئے۔ دل میں بہت کچھ چھپائے ہوئے لیکن اپنے آپ پر مکمل اختیار۔ اور پھر جو مشکل پیش آئی تھی وہ بھی دور ہوگئی تھی۔ البتہ چوہدری جواد حسین کبھی کبھی یہ کہتے تھے۔

''بھئی نادر شاہ! یہ بات تو طے ہے کہ لوگ بڑے طعنے دیں گے اور ہمیشہ انگلیاں اٹھائی جاتی رہیں گی۔ لیکن میں زیادہ پرواہ نہیں کرتا ان باتوں کی۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر یہاں مجھے زیادہ دقت ہوئی تو میں واپس یورپ چلا جاؤں گا لیکن اس بچے کو چھوڑوں گا نہیں میں۔''

''بھائی جان! اللہ بہتر کرے گا۔ ہم بہر حال تقدیروں سے سمجھوتا کرتے ہیں۔ دیکھئے، ویسے تو یہ اچھی بات نہیں ہے جو میں کہہ رہا ہوں لیکن آپ مجھے ایک بات بتائیے کہ دنیا میں آنے والا ایک ننھا سا وجود یہ جانتا ہے کہ کب اور کن حالات میں تخلیق ہوئی۔ سارے کام اللہ تعالیٰ کے ہیں، وہ بہتر سمجھتا ہے۔''

بہر حال سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اکرام کی حالت پہلے سے بہتر ہوتی جارہی تھی۔ اس بار بھی غیاث الدین آئے تو نظام الدین سے لاہور ہی میں ملاقات ہوئی۔ وہ اور ان کے اہلِ خاندان بھی اکرام کے دیوانے تھے۔ دوسرے تیسرے دن آنا ان کا معمول بن گیا تھا۔ اور چین ہی نہیں آتا تھا انہیں اکرام کے بغیر۔ بیوی سے کہتے تھے۔

''تم بھی سوچتی ہوں گی کہ اس عمر میں دیوانہ ہوگیا ہوں...... لیکن کیا کروں، شمس الدین اپنی نشانی یہاں چھوڑ گیا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا، کچھ بھی ہو جائے میں اس بچے کو چھوڑوں گا نہیں۔ دنیا نے اسے جو کچھ بھی بنایا ہے لیکن اللہ نے اسے کیا بنایا ہے یہ تم نے بھی دیکھ لیا۔''

''ہاں، اب ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔''

اس بار بھی جب سب لگ مل کر بیٹھے تو یہی سوچا جانے لگا کہ اب کیا ہو۔

''شمس الدین کے پاکستان نہ آنے کی وجہ کا پتہ چل گیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے جواد حسین صاحب! آپ تو وہاں لندن میں اس سے ملتے رہے ہیں۔''

''آپ یقین کریں، جس قدر بیٹا باظرف ہے، اسی طرح باپ بھی کمال کی شخصیت ہے۔ ہم لوگ اکثر شمس الدین کا حوالہ دیتے رہتے تھے اپنے گھروں میں اور کہتے تھے کہ دیکھو یہ ہے سچا پاکستانی۔ اکرام جتنا حسین ہے، شمس الدین آج بھی اتنا ہی حسین ہے اور تم یورپ میں ان چھپکلیوں کے بارے میں تو جانتے ہی ہو، پروانوں کی طرح نثار ہوتی ہیں اس پر۔ لیکن کیا مجال ہے کہ اس کی نگاہوں میں کبھی کسی کے لئے کوئی کھوٹ آئی ہو۔ مذاق بھی اڑاتی ہیں اس کا، دشمنی بھی کرتی ہیں۔ لیکن وہ بھی مردِ آہن ہے۔ آج تک کسی جال میں پھنسا نہیں۔ لیکن اب یہ پتہ چل رہا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ ظہیر الدین اسے لے گئے تھے شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر اور وہاں وہ بھٹک گیا تھا۔ لیکن حقیقت حال جانتا تھا۔ بعد میں احساس ہوا کہ وہ نہیں ہوسکتا جو دل کی طلب ہے۔ یعنی کوثر جہاں کا حصول۔ اب اصولی طور پر ہمیں جو کام کرنے چاہئیں وہ یہ ہیں کہ جس طرح بھی بن پڑے شمس الدین کو یہاں بلائیں۔ کوثر جہاں کو بھی کسی نہ کسی طرح کوٹھے سے حاصل کرلیا جائے اور بس پھر ان دونوں کا نکاح کرا دیا جائے۔ باقی معاملات اللہ پر چھوڑ دیئے جائیں۔ بات چونکہ ایک اچھے مقصد کی ہے چنانچہ اس سلسلے میں کام کرلینا زیادہ مناسب ہوگا۔''

اور آخر کار یہ سارے معاملات طے ہوگئے۔ طریقہ کار بھی منتخب کرلیا گیا۔

○●○

غزالہ شوخ، الہڑ، دنیا سے ناواقف، دل کی چوٹ سے ناآشنا۔ بس اتنا ہی کام تھا کہ ماں کے اشاروں پر ناچتی رہے۔ شبانہ بھی بالکل ایسی ہی تھی۔ کوثر ان دونوں کی بڑی بہن

تھی لیکن ان دونوں کی فطرت الگ تھی۔ جبکہ کوثر جہاں سنجیدہ، بردبار اور ہر طرح سے ان پر فوقیت رکھنے والی۔ بہنیں تو تھیں کوثر جہاں کی، گمشدگی کو شدت سے محسوس کرتی تھیں، غم کا شکار ہوئی تھیں مگر اس طرح بھی نہیں کہ ان کی فطرت بدل جائے بلکہ بعد میں تو ذمہ داریاں بھی زیادہ آ پڑی تھیں۔ اور دونوں اکثر باتیں کرتی ہوئی کہتی تھیں۔

''کوثر جہاں کے جانے سے ان کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ اب اماں کی ساری توجہ ان کی طرف ہے۔ شبانہ کہتی۔

''ویسے تو سب باتیں ٹھیک ہیں...... مگر اماں نے بھی آنکھیں سر پر رکھ لی تھیں۔ اب تم خود سوچو، اکرام کوثر جہاں ہی کا تو بیٹا تھا۔ اماں جس طرح اپنی اولاد سے چاؤ چونچلے کرتی ہیں کیا کوثر جہاں کے دل میں اکرام کے لئے کوئی مامتا نہیں ہوگی؟ مگر اماں نے کبھی مان کر نہ دیا۔ ہمیشہ اس کی کاٹ کرتی رہی۔ اگر اماں کوثر کو اس طرح منع نہ کرتیں تو وہ کبھی گھر چھوڑ کر نہ جاتیں۔ اب چلی گئی ہیں تو واپس نہیں آئیں گی۔''

''مگر ہماری بھی جو درگت بن رہی ہے اسے بھی تو کوئی دیکھنے والا ہو۔ اب جیسی آواز ہے ویسا ہی تو گا سکتے ہیں۔ جیسا ناچنا آتا ہے ویسا ہی تو ناچ سکتے ہیں۔ کمبخت تماش بینوں کی آنکھیں ہی اندھی ہوگئی ہیں تو کوئی کیا کرے۔ انہیں تو کوثر جہاں میں ہی سرخاب کے پر نظر آتے تھے۔ ارے وہ پر ہم کہاں سے لا کر لگا لیں؟ اماں کو دیکھو، ہر وقت جان کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ نیرکھ کے بھاؤ سیکھو، آواز میں جادو پیدا کرو۔ ارے جادو بھی کوئی پیدا کرنے کی چیز ہے؟''

''جو پیدا کرنے کی چیز ہے وہ اماں پیدا نہیں کرنے دیتیں۔'' شبانہ نے ہنس کر کہا اور غزالہ بھی ہنس پڑی۔

''تو بڑی بے حیا ہے...... نتھ اتر جائے گی کسی دن۔ سارے ارمان پورے ہو جائیں گے۔ لیکن دعا کرنا کوئی بانکا چھبیلا ہو۔ مل گیا کوئی بڈھا ٹھڈا تو دل کی یہ آرزو بھی مٹی میں مل جائے گی۔''

''جھاڑو پھرے ان کم بختوں پہ...... ان میں شریف کون ہوتا ہے...... سارے کے سارے ہوس کے مارے چلے آتے ہیں دولت کے بل پر۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے غزالہ کہ ہم لوگوں کی تقدیریں بہت خراب ہوتی ہیں۔ گرہستوں کو دیکھو، ماں باپ بڑی

چاہتوں سے رشتے طلب کرتے ہیں، ساری رسمیں ادا کی جاتی ہیں، آہوں اور آنسوؤں کے بیچ رخصت کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کوئی ارمان بھرا بانکا سجیلا دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے قریب آتا ہے اور زندگی بھر کے رشتے پکے ہو جاتے ہیں، ہر طرح کا تحفظ ملتا ہے اس زندگی میں۔ ایک ہم ہیں کہ بس جو زیادہ بولی لگا دے۔''

''ایک بات تو میں بھی کہوں گی کہ اگر وہ بانکا سجیلا من بھایا نہ ہو تو ساری زندگی زخموں سے چور ہو جاتی ہے۔ کم از کم ہمارے پاس آنے والے ہماری ذات پر مسلط تو نہیں ہوتے۔''

''پھر زندگی میں بس ایک ہی دن آتا ہے جس کے لئے جانے کتنی کتنی قربانیاں دی جاتی ہیں۔ اگر زندگی کا یہ پہلا دن ہی اپنی پسند کا نہ ہو تو فائدہ ہی کیا۔ لٹ تو گئے نا، ناپسندیدگی کے ہاتھوں۔''

''اماں نے سن لیا تو چمٹے سے کھال کھنچوا کر دروازے میں لٹکوا دیں گی۔ ایسی باتیں مت کرو۔''

دونوں ہنس کر خاموش ہوگئیں۔ پھر ایک ایسا بھی نظر آیا جس نے غزالہ کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ نوخیز تھی، نوعمر تھی۔ لیکن یہاں آنکھوں کی پہچان ابتدائی تعلیم کے طور پر دی جاتی ہے۔ غزالہ نے بھی محسوس کر لیا کہ یہ پیار ان تماش بینوں میں سے نہیں ہے جو آتے ہیں، دیکھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں یا اگر زیادہ سے زیادہ دولت لٹانے پر آمادہ ہوتے تو خرید لیا۔ جب تک دل چاہا ساتھ رکھا، چھوڑا اور بھول گئے۔ ان آنکھوں اور ان آنکھوں میں فرق ہوتا ہے۔ پھر شمشیرہ بیگم نے غزالہ سے بات کی اور غزالہ کو پتہ چل گیا کہ جو سوچا تھا وہ سچ ہے۔ یہ رات ذرا بدلی بدلی سی تھی۔ دل میں پہلی بار ایک نوخیز چہرے نے گھر کیا تھا اور شمشیرہ بیگم نے اس سے پینگیں بڑھانے کی اجازت دے دی تھی۔ خوبصورت تو ہے، سادہ سادہ سا، نوجوان، رنگ و روپ کا بھی اچھا ہے۔ چلو کیا فرق پڑتا ہے...... تھوڑا سا کھیل کھیلا جائے۔ غزالہ کی سوچ اس سے زیادہ نہیں تھی۔ ادھر علی شان تھا کہ پوری رات تڑپتا رہا تھا۔ پہلی بار دل پر چوٹ پڑی تھی۔ لاہور کے رئیس خاندانوں میں سے تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ خاندان ذرا دوسری قسم کا تھا۔ والدین کسی چک کے رہنے والے تھے، وہیں کچھ زمینیں وغیرہ تھیں، چھوٹا موٹا سا خاندان تھا لیکن دولت بہت زیادہ تھی۔ لاہور آ

گئے تھے اور یہاں بہت سے کارخانے لگا لئے تھے۔ بہر حال ترقی ہوئی۔ اللہ نے بس ایک ہی بیٹا دیا تھا، وہ بھی آنکھ کا تارا، ساری آرزوؤں اور امنگوں کا مرکز۔ بہت عرصے تک تو علی شان کے باپ کے ہاں اولاد ہی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ نجانے کتنی منتیں مانی تھیں، بزرگوں کے مزاروں پر چادریں چڑھائی تھیں، اس کے بعد کہیں جا کے علی شان کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ جس طرح اس کی پرورش ہوئی وہ بھی ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ پھولوں میں پلا بڑھا، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا، ہر خواہش پر دریا دلی کا مظاہرہ۔ اسی عالم میں جوان ہوا، دوستوں کی صحبت ملی۔ دوست اگر اچھے ہوں تو زندگی اچھی ہو جاتی ہے اور اگر یہی دوست برے ہوں تو ایسی جگہ پہنچا دیتے ہیں کہ وہاں سے ابھرنا نصیب نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ خاندانی معاملات تو ایسے تھے جن کی وجہ سے گڑبڑ تھی۔ یہ محترمہ ستارہ بیگم تھیں جن کے نام کے ساتھ علی شان کے والد علی زمان کھوکھر کے رنگین مزاجی کے واقعات وابستہ تھے۔

بہر حال علی شان پر یہ رات سخت بھاری پڑی۔ دوسری صبح اس کے اثرات نمایاں پائے گئے۔ ماں باپ نے کام دھندا چھوڑ دیا، بیٹے کا چہرہ اترا ہوا تھا، کیسے دیکھ سکتے تھے۔ پوچھا گیا تو کہہ سن کر ٹال دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد علی شان گھر سے باہر نکل گیا اور ان دلداروں کے پاس جا پہنچا جو دلداری کر سکتے تھے۔ فقیر محمد اور شیر علی نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دوست کم، مصاحب زیادہ تھے جو انہی کی رقم پر پلتے تھے، انہی کی جوتیاں سیدھی کیا کرتے تھے۔ رات کو ہی انہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ محفل میں علی شان پر کیا گزری ہے۔ کمائی کا ایک اور ذریعہ پیدا ہو گیا تھا۔ علی شان کو دیکھ کر دونوں بچھ گئے۔

"صبح ہی صبح...... خیریت تو ہے؟"

"یار ساری رات نیند نہیں آئی۔"

"کیوں، خیریت؟"

"آگ لگا کر پوچھتے ہو کہ جلن کیوں ہو رہی ہے...... دھواں کیوں اٹھ رہا ہے؟"

"آگ لگے تمہارے دشمنوں کو...... کیا ہوا، بتاؤ تو سہی۔"

"وہ لڑکی جو گلابی لباس میں رقص کر رہی تھی وہ میرے دل کو بھا گئی ہے فقیر محمد! یوں لگتا ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں اس کے لئے۔ رات بھر جاگتی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا ہوں۔"

"ارے تو یہ کون سی پریشانی کی بات ہے یار! آج پھر ملیں گے۔ ویسے بھی بائی جی نے

دعوت دی تھی آپ کو آنے کی۔ ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ ترچھی نظر کا شکار ہو گئے۔ مگر خوش نصیب ہو کہ محبوب کا حصول مشکل نہیں ہوگا۔"

"مگر میں اس سے شادی کروں گا فقیر محمد، اس بات کو لکھ لو۔ میں نے بھی رات بھر سوچا ہے۔"

"یہ سب بعد کی باتیں ہیں، تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ ہم تمہارے لئے جان کی بازی لگانے کے لئے آمادہ ہیں تو پھر تمہیں کس بات کی فکر؟"

"آج چلو گے ناں؟"

"لو، نہ چلنے کی کیا بات ہے۔"

"کوئی اچھا سا تحفہ خریدنا ہے مجھے۔"

"تو خرید لو...... بلکہ یہ کام ہمارے سپرد کر دو۔"

"میں اپنی پسند کی کوئی چیز لوں گا۔ صرافہ بازار چلنا ہے۔"

"چلتے ہیں۔"

صراف کی دکان سے ایک حسین گلوبند خریدا گیا۔ چشم تصور میں علی شان نے گلوبند کو غزالہ کی گردن میں دیکھا اور خوش ہو گیا۔ دوستوں کے پاس اس گلوبند کو امانت رکھوایا گیا۔ گھر پہنچا تو طبیعت کچھ بہتر تھی۔ البتہ ماں باپ بے چارے پریشان تھے۔ بیٹے کو دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔ آج علی شان کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ شام کو گھر سے نکلے، ماں باپ سے بہانہ کیا کہ دوستوں کے ساتھ کسی دوست کی شادی میں جا رہا ہے، ہو سکتا ہے واپسی میں دیر ہو جائے۔ قوالیوں کا پروگرام بھی ہے۔ ماں باپ خاموش ہو گئے۔ اولاد کی خوشی ہر حالت میں عزیز تھی۔

بہر حال چونکہ شمشیرہ بیگم نے کہا تھا کہ جلدی آئیں، چنانچہ شام ڈھلے جب گلیوں کی صفائی مکمل ہوئی تھی، پھول والے پھولوں پر پانی چھڑک رہے تھے، پان والے پانوں کی گلوریاں بنا بنا کر شوکیسوں میں سجا رہے تھے، دودھ والا دودھ کے نیچے الاؤ روشن کر کے کڑاہی میں کفگیر چلا رہا تھا، سازندوں نے سازوں کے مٹھے نہیں سنبھالے تھے کہ یہ لوگ شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر پہنچ گئے۔ حاجو نے اوپر جا کر خبر دی کہ کل والا شکار آیا ہے۔ شمشیرہ بیگم تو انتظار کر ہی رہی تھیں۔ جلدی سے غزالہ کو ٹہوکا دیا اور غزالہ سجنے بننے اندر چلی گئی۔

شمشیرہ بیگم بڑے کمرے کی صفائی کرنے چلی گئی تھیں۔ خوشبوئیں جلادی گئی تھیں۔ لوبان کی دھونی دے دی گئی تھی۔ فضا میں ایک خوشگوار کیفیت طاری تھی، باہر نکل گئیں اور ان تینوں کا استقبال کیا، ہنس کر بولیں۔

''شریفوں کے وعدے اس طرح کے ہی ہوا کرتے ہیں۔ ہم بھی انتظار میں ہی تھے۔ سچ بات ہے کہ آپ نے اپنی اعلیٰ نسلی کا ثبوت دیا ہے۔ آیئے تشریف لایئے۔ اصل میں سورج چھپے کوٹھوں کے دروازے ہر ایک کے لئے کھل جاتے ہیں، کون کسے روکے، کون کسے ٹوکے۔ اپنوں سے ملنے کو جی چاہے تو تڑپتے رہو، سوچو گے تو سہی کہ ایک دن کی ملاقات میں اپنے کیسے ہو گئے۔ لیکن خدا لگتی کہتی ہوں بعض چہرے ہی ایسے ہوتے ہیں جیسے صدیوں کے شناسا ہوں اور تمہارا چہرہ بھی ایسا ہی ہے علی شان، یوں لگا جیسے دُور کا کوئی بچھڑا ہوا آ گیا ہو۔ اسی لئے تو دل چاہا کہ جلدی بلاؤں۔ میں تو میں، غزالہ کو دیکھو، کہنے لگی کہ اماں یہ کون ہیں؟ پتہ نہیں کہاں دیکھا ہے انہیں...... ویسے ایک بات بتایئے، کبھی پہلے آئے ہیں ہمارے کوٹھے پر؟''

شمشیرہ بیگم کی چکنی چپڑی باتوں نے علی شان کا صبر وسکون چھین لیا۔ نوخیزیت تھی، جوانی کا عالم تھا، باتیں ہی کافی تھیں، گردن جھکا کر بولا۔ ''نہیں...... پہلے تو کبھی نہیں آنا ہوا۔ لیکن اب یوں لگتا ہے جیسے یہاں آئے بغیر جی نہیں مانے گا۔''

''تو تمہیں روکے گا کون...... ہزار بار آؤ۔ ارے لاؤ بھئی، کچھ لاؤ۔ یہ تماش بین تھوڑی ہیں، اپنے ہیں ہمارے۔''

سب کچھ پہلے سے تیار تھا۔ شمشیرہ بیگم نے اندر منہ کر کے کہا۔

''اب شرمائے جاؤ گی یا پاس بھی آؤ گی؟ اچھا میں سمجھ گئی۔ لیکن اب وقت نہیں ہے، تماش بین آنے والے ہوں گے۔ رات کو روک لینا، دیر سے چلے جائیں گے۔ جی بھر کے باتیں کر لینا۔''

شمشیرہ بیگم خود کہے جا رہی تھیں۔ پھر علی شان کی طرف رخ کر کے بولیں۔

''آپ کے ان دونوں دوستوں کی وجہ سے شرما رہی ہے وہ شاید۔ ورنہ دن بھر چھوٹی بہن سے پوچھتی رہی ہے کہ پتہ نہیں وہ آئیں گے یا نہیں پر میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ ذرا ایسا کریں جب رقص وموسیقی کی محفل ختم ہو جائے تو تھوڑی دیر کے لئے اس کے

پاس بھی رک جایئے، ویسے بھی کسی کا دل رکھنا ثواب ہے۔''

شمشیرہ بیگم کسی پرانی مکڑی کی مانند معصوم علی شان کے گرد جالا بُن رہی تھی اور معصوم علی شان اس میں جکڑتا جا رہا تھا۔

○●○

کوثر جہاں کی تقدیر کھوٹی نہیں تھی شاید۔ گھر سے باہر نکلی تھی، اس ہولناک دنیا میں جہاں کسی اکیلی عورت کو اس طرح کے خوفناک تجربے ہوتے ہیں کہ پھر مزید تجربوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ وہ باہر نکل آئی تھی۔ معصوم تسنیم اس کے ساتھ تھی لیکن شکر تھا کہ زیادہ مصیبتیں نہیں جھیلنی پڑی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے دو واقعات ہوئے تھے اور بس۔ اس کے بعد حیدر پہلوان مل گیا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ یہیں سے تقدیر پلٹ گئی تھی۔ حیدر پہلوان تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اچھے لوگ بہت جلد خدا کے ہاں چلے جاتے ہیں۔ وہ برا ہونے کے باوجود اچھا تھا۔ کوثر جہاں کے لئے وہ ایک اور سہارا پیدا کر گیا تھا۔ اور یہ سہارا خاصا پائیدار تھا۔ نواب شاہ میں ہی رہتی لیکن جو انکشاف خیر بخش حضوری کو ہوا تھا اس سے وہ خوفزدہ ہو گئی تھی اس نے اسے فوراً لاہور پہنچا دیا تھا۔ یہاں اس کے عیش و آرام کے تمام انتظامات کر دیئے گئے تھے۔ عالیشان رہائش گاہ، موٹر کار، دنیا کی ہر آرائش، نوکر چاکر، ڈرائیور ہر وقت تیار۔ خیر بخش نے کہا تھا کہ تھوڑے سے دن اور گزر جانے دیئے جائیں، اس کے بعد وہ خود تسنیم کو کسی اچھے سکول میں داخل کروائیں گے۔ انہوں نے کوثر جہاں سے کہا تھا۔

''بیٹی! بے فکر ہو کر یہاں پر رہنا...... تمہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ میں نے ہدایت کر دی ہے اپنے آدمیوں کو۔ ہر لمحہ تمہارے محافظ رہیں گے۔ اخراجات کی بالکل فکر مت کرنا، جہاں چاہو گھومنے نکل جانا۔ بس میری رائے ہے کہ برقعہ استعمال کر لیا کرو تا کہ کوئی تمہیں پہچان نہ سکے۔'' اور کوثر جہاں کو یہ مشورہ سب سے بہتر محسوس ہوا تھا۔ اس طرح لاہور میں رہنے میں کوئی دقت پیش نہیں آ سکتی تھی۔ تسنیم کا بھی حلیہ بدل دیا گیا تھا چنانچہ اسے بھی پہچان لئے جانے کے خدشات نہیں تھے۔

بہرحال خاصے دن ہو گئے یہاں رہتے ہوئے۔ گھر سے باہر نہیں نکلی تھی حالانکہ ڈرائیور رفیق نے کہا تھا کہ بیگم صاحبہ جب دل چاہے گھومنے نکل جایا کریں۔ تسنیم کو البتہ رفیق کتنی

ہی بار گھما کر لایا تھا۔ تسنیم یہاں آ کر تو بہت ہی زیادہ خوش تھی۔ ایک آزاد زندگی ملی تھی اسے اور اس ماحول سے چھٹکارہ جو شمشیرہ بیگم کے گھر کا ماحول تھا۔ پھر اس دن نجانے کیوں طبیعت کچھ زیادہ ہی گھبرا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ تو کیا جائے۔ یاد آیا کہ جمعرات کا دن ہے، دربارِ داتا صاحب یاد آیا۔ رفیق سے کہا۔

''رفیق! داتا دربار چلنا ہے۔''

''جیسا حکم بیگم صاحبہ...... چلئے گا۔''

شام کو سات بجے کے قریب رفیق، داتا دربار لے گیا۔ جمعرات کے دن ذرا رش کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے، بہرحال داتا دربار کی تعمیر میں کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ خواتین کے لئے الگ جگہ منتخب کر دی گئی ہے۔ اس طرح نذر و نیاز میں آسانی ہو جاتی ہے۔ تسنیم کو باہر ہی چھوڑ گئی تھی اور پورے اہتمام کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ دربارِ داتا پر جب بھی پہنچتی، ایک ہی آواز دل سے نکلتی۔ اس وقت بھی ایک عجیب سی کیفیت دل میں بیدار ہو گئی۔ مدھم مدھم آواز میں بولی۔

''بس ایک بار ملا دو داتا صاحب! بس ایک بار ملا دو۔ آنکھیں ترس گئی ہیں...... ایک بار، بس ایک بار وہ چہرہ دکھا دو جسے دیکھنے کی آرزو قبر میں جائے گی۔''

ہولے ہولے یہ الفاظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ وہ یہ الفاظ اپنے ہی دل میں سن رہی تھی۔ اور خواتین بھی موجود تھیں۔ تبھی اس کی نگاہیں اپنے برابر میں موجود اس نوجوان اور انتہائی حسین لڑکی کی طرف اٹھیں اور کوثر جہاں اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ کیا حُسن تھا، کیا چھب تھی، کیا کشش تھی، کیا معصومیت تھی، کیسا پیارا سا چہرہ تھا۔ پھر کوثر جہاں نے اس کے ہونٹوں سے مدھم سرگوشی سنی۔

''ٹھیک کر دو داتا! اسے ٹھیک کر دو...... ٹھیک کر دو اسے...... وہ میری زندگی ہے۔ ہمارے راستے ایک کر دو۔ اسے صحت مند کر دو، تم ولی ہو، میرے دل میں وہ جتنی گہرائیوں تک اتر گیا ہے اب ان گہرائیوں سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں اسے اپنے دل سے نہیں نکال سکتی۔ مجھے اس سے ملا دو...... مجھے اس سے ملا دو۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔'' یہ آواز بڑی رقت کے عالم میں اس کے منہ سے نکل رہی تھی اور کوثر جہاں حیران رہ گئی تھی۔ یہ دلکش چہرہ، یہ حسین وجود بھی کسی کا گھائل ہے۔ جب وہ دعائیں مانگ

چکی تو اس نے پیار سے اس لڑکی کو دیکھا، نوخیزیت کی عمر تھی، بہت ہی نوعمر، بہت ہی پیاری۔ کوثر جہاں اس کے پاس پہنچ گئی۔ لڑکی نے بھی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا، دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''کون ہیں آپ؟''

''بیٹی! میرا نام کوثر جہاں ہے...... تمہارا نام کیا ہے؟''

''شانہ......'' لڑکی نے جواب دیا۔

○●○

بیٹے کی بات تھی، ہمت کیسے ہار دیتے۔ ماسٹر شیر علی سے کہا۔

''ماسٹر صاحب! معذرت چاہتا ہوں، اگر آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ مجھے تو یہاں خاصا وقت رکنا ہوگا۔ میں تو اس احمق کو ایسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ کوئی تدبیر کرنا پڑے گی۔''

''اگر آپ حکم دیتے ہیں تو میں چلا جاتا ہوں...... ورنہ نہ تو مجھے جانے کی ضرورت ہے اور نہ کوئی ایسا کام پڑا ہوا ہے جو باعث پریشانی ہو۔''

''نہیں نہیں...... بخدا صرف آپ کی وجہ سے کہی ہے میں نے یہ بات۔ آپ آرام سے رکئے، آپ سے ڈھارس رہے گی۔ آپ سے بڑا رازدار میرا اور کون ہو سکتا ہے۔''

''کرنا کیا ہے...... اب یہ بتاؤ۔''

''ایک آدمی کی تلاش میں نکلوں گا...... ستار جگنی ہے اس کا نام۔ ویسے تو ذات کا قصائی ہے لیکن میرا قدیم جاننے والا ہے۔ مختلف فطرت کا مالک ہے، مالی طور پر کبھی غیر مطمئن نہیں رہا اور پھر بیوی کے انتقال کے بعد اس نے اپنی تمام دولت بیٹوں میں تقسیم کر دی۔ اچھا خاصا گھر تھا، بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے اور ستار جگنی کو ایک الگ تھلگ جگہ دے دی گئی تھی۔ گھر والوں کا رویہ بہت اچھا نہیں تھا تو بہت برا بھی نہیں تھا اور اس کی وجہ ستار جگنی کی فطرت تھی۔ ہمیشہ کا رنگین مزاج ہے۔ بیوی کی موجودگی میں بھی زیادہ تر وقت طوائفوں کے کوٹھوں پر گزارتا رہا ہے۔ بچوں کے دل میں یہ رنجش موجود تھی اور اسے وہ ستار جگنی کے بڑھاپے تک دل سے نہ نکال سکے۔ بس ایک کھچاؤ ہے باپ بیٹے کے درمیان۔ اور بیویاں تو بہرحال شوہروں کی نگاہوں کے ساتھ چلتی ہیں۔ لیکن ستار جگنی بس گزارہ کر رہا ہے۔ اب عمر کی یہ منزل ہے کہ تعاون کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ بہرحال اگر وہ ہاتھ لگ جاتا ہے تو بہت سے کام بن جائیں گے۔''

ستار جگنی مل گیا اور اللہ نواز کو دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔

''ارے وزیراعظم! یاد رہا تمہیں یہ قصائی۔''

''تم کوئی بھولنے کی چیز ہو ستار! میں نے تمہیں ہمیشہ یاد رکھا۔''

''کبھی اظہار نہیں کیا دلارے۔ ایسا نہ ہوا کہ کبھی بلا ہی لیتے۔''

''بس یار۔''

''اچھا چھوڑو، لاہور کیسے آنا ہوا؟''

''بس سمجھ لو تمہارے ہی پاس آئے تھے، کچھ کام بھی تھے۔''

''ایک بات کہے دے رہا ہوں...... جانے نہیں دوں گا ابھی۔ جب تک جی نہ بھر جائے۔ میرے پاس رہو یا مجھے اپنے پاس بلا لو۔ بھاگنے کی مت سوچنا۔''

''نہیں، نہیں...... ابھی لاہور میں ہوں۔''

بہرحال بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر اللہ نواز شاہ نے کہا۔

''تمہارے گالوں میں سرخی تو ابھی جوں کی توں ہے۔''

''چھوڑو یار! بس جوانی یاد آتی ہے تو کلیجہ پھڑکنے لگتا ہے۔ کیا کیا کہانیاں ہیں ہماری بھی زندگی کی۔''

بہرحال کافی دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ اللہ نواز اسے اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے۔ انہوں نے ان دنوں ستار جگنی کے مشاغل کے بارے میں معلومات حاصل کی اور اس کے بعد دونوں سو گئے۔ صبح کو البتہ اللہ نواز صاحب نے لات مار کر ہی ستار جگنی کو جگایا تھا۔

''ارے کچھ دیر ہو گئی...... چلو ناشتے کی کیا ہے؟''

''ناشتہ تیار ہے۔''

''چلو پھر ناشتہ کرتے ہیں۔''

ناشتے کے بعد اللہ نواز نے کہا۔ ''تم نے میرا ایک بہت ہی اہم اور ضروری کام کرنا ہے ستار جگنی! اور اس کے لئے تمہیں ایک بار پھر پرانے ستار جگنی کو زندہ کرنا ہوگا۔''

''کر لیں گے...... بولو، کام کیا ہے؟''

''ہیرا منڈی جانا ہوگا...... طوائفوں میں نام پیدا کرنا ہوگا۔ سچ مانو تو میری نظر میں اس سلسلے میں تم سے بہتر کوئی آدمی نہیں ہے۔''

ستار جگنی کا منہ حیرت سے کھل گیا اور پھر اس نے کہا۔ ''کیا کہہ رہے ہو...... قسم ایمان

کی، لاٹھیوں سے کوٹ ڈالیں گے اگر ہیرا منڈی کا رخ بھی کیا ہم نے۔ اب بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یار! بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ قسم ایمان کی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر تم یہ کام نہ کر سکو تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''مگر بتاؤ تو سہی، چکر کیا ہے؟''

''اصل میں وہاں معاملہ کسی طوائف کا نہیں بلکہ کسی اور شخص کا ہے۔''

''شخص کا؟''

''ہاں......''

''بات تو بتاؤ پوری۔ بیچ کا کوئی رستہ نکال لیں گے۔ یہ مت جاننا کہ جان چرا رہے ہیں۔ گردن بھی کٹ جائے گی تو پرواہ نہیں ہے۔ مگر تھوڑی سی تفصیل تو بتا دو۔''

''ہیرا منڈی میں مجھے کسی طوائف کے کوٹھے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ تم وہاں کے ماحول سے واقفیت رکھتے ہو، وہاں کے ادب و آداب جانتے ہو اس لئے میں نے تمہیں منتخب کیا ہے۔''

اچانک ہی ستار جگنی ہنس پڑا، پھر بولا۔ ''چلو ٹھیک ہے، ویسے مزہ ہی آ جائے اگر تم بھی ہمیں ہیرا منڈی میں نظر آ جاؤ۔''

''میں سنجیدہ ہوں جگنی۔''

''اچھا چلو چھوڑو، بات بتاؤ کیا ہے؟''

''ایک آدمی ہے وہاں، رب نواز شاہ کے نام سے مشہور ہے۔ بس اس کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنی ہیں۔ وہیں ایک احاطے میں رہتا ہے، مشہور آدمی ہے، لوگ اسے جانتے ہیں۔ اس کے بارے میں ذرا تفصیل معلوم کرنی ہے۔ اگر کسی طرح اس تک رسائی ہو جائے تو یوں سمجھ لو میرا کام ہو جائے گا۔''

''مطلب یہ کہ وہ کسی طوائف کے کوٹھے پر نہیں رہتا۔''

''نہیں...... بلکہ الگ جگہ لے رکھی ہے اسی محلے میں۔''

''کام کیا ہے اس سے تمہیں؟''

''یہ ابھی نہیں بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے...... اس کے بعد کیا کرنا ہوگا؟''

''بس اس سے دوستی کرنا ہوگی جس طرح بھی بن پڑے۔ اس کے قریب آنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے...... کر لیں گے...... ضرور کر لیں گے۔''

''میں جانتا ہوں، اس سلسلے میں اخراجات بھی ہوں گے۔ میں اس شرط پر تمہیں کام کرنے کی اجازت دوں گا کہ تم تمام اخراجات مجھ سے لو گے۔''

''ٹھیک ہے...... اگر تم نہ بھی کہتے تو ہم مان لیتے۔ چلو، کیا کیا جائے، مجبوری ہے۔ جائیداد بیٹوں میں تقسیم کر دی یہ سوچ کر کہ اگر آنکھ بند ہو گئی تو بچے لڑتے رہیں گے۔ اپنے لئے کچھ نہ رکھا۔ یہ الگ تھلگ جگہ جو تم نے دیکھی بس پرانے حساب میں دے دی۔ کھاؤ پیو، جیتے رہو۔ اس سے آگے ٹائیں ٹائیں فش۔''

''تم بالکل فکر مت کرو۔''

''چلو ٹھیک ہے پھر۔ چلے جائیں گے۔''

''ہاں، تمہیں یہ کام کرنا ہے۔''

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ستار جگنی پرانا کھلاڑی تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ پاکستان بھر کے شہروں کی طوائفیں اسے جانتی تھیں۔ لاکھوں لٹائے تھے ان کے درمیان، ہر طرح کی عیاشیاں کی تھیں۔ عمر بہرحال سب کچھ چھین لیتی ہے۔ بہرحال مست مولا قسم کا آدمی تھا، زندگی پر کبھی بوجھ نہیں محسوس کیا، ہر حالت میں خوش رہتا تھا، جو کچھ اس نے کہا تھا وہ بھی سچ تھا۔ آخر کار تیار ہوا اور اس کے بعد وہاں سے چل پڑا اور ہیرا منڈی میں داخل ہو گیا۔ عمر کا ایک ایک واقعہ یاد آنے لگا۔ یہاں بھی بہت سی شناسائیاں تھیں۔ رب نواز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے پہلے کسی شناسا سے ملنا ضروری تھا اور ایک شناسا مل گیا۔ یہ انعام الدین ماشیا تھا۔ بوڑھا ہو چکا تھا۔ ستار جگنی اس کے پاس پہنچا اور بولا۔

''ہاں انعام دین بھائی! کیسے ہو؟''

''ارے ستار جگنی...''

''واہ، پہچان لیا تم نے؟''

''کیا بات کرتے ہو...... ہم نہ پہچانیں گے تمہیں؟ مگر بڑے بے وفا نکلے۔ بھول کر بھی نہیں پوچھا کہ انعام دین زندہ ہے یا مر گیا۔''

"ہاں یار! بس ہیرامنڈی کا رخ نہیں ہوا اس کے بعد۔"

"بوڑھے ہو گئے ستار جگنی۔"

"ہونا ہی تھا۔ تم سناؤ، کیسی گزر رہی ہے؟"

"اچھی نہیں گزر رہی۔ یہ سب تو جوانی کے دھندے ہیں۔ مگر بڑھاپے میں آدمی اور کچھ کرے بھی کیا۔ آ بیٹھتے ہیں عادت کے مطابق۔ کوئی پاگل ہی آ جاتا ہے اور گالیاں بکتا چلا جاتا ہے۔ جان تو نکل چکی ہے ان ہاتھوں کی، اب بھلا کیا مالش کریں گے کسی کی۔"

"ہیرامنڈی کیسی جا رہی ہے؟"

"چلے کہاں گئے تھے؟"

"بس یہیں پر تھا، سب لوگوں کی یاد آ گئی۔ ارے ہاں وہ اپنی نیل کنول کہاں گئیں؟"

"لو...... اسے تو مرے ہوئے ہی دس سال ہو گئے۔"

"مر گئی وہ......؟"

"ہاں۔"

"اور کوئی پرانی...... پھول وتی کا کیا حال ہے؟"

"زندہ ہے...... بیٹیوں کے سہارے چل رہی ہے۔"

"ایک اور تھی جس کے نام سے ہیرامنڈی کی رونق تھی۔"

"شمشیرہ...... وہ ہے۔ مزے کر رہی ہے۔ تھوڑے دن پہلے اس کے ساتھ بھی کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی، اب ہمیں تو زیادہ نہیں معلوم، دوسرے پرانے جاننے والے بھی ہمارے پاس آ کر نہیں بیٹھتے۔ سب کی چڑھی ہوتی ہے۔ گھوڑی چڑھی ہو تو سمجھ لو سب کی نظر سیدھی ورنہ کون کسی کو پوچھے۔"

"ٹھیک کہتے ہو انعام دین...... شمشیرہ بیگم موجود ہے؟"

"ہاں ہے، اس کی لونڈیا چلا رہی ہیں اس کا، اپنا سب کام۔"

"واہ...... اچھا ہوا تم مل گئے۔ یہ بتاؤ۔"

"ہاں پوچھو؟"

"یہاں رب نواز نامی کوئی آدمی رہتا ہے؟"

"عزت سے نام لو...... کاہے کو شامت آ رہی ہے؟" انعام دین نے کہا۔

"کیوں...... کیوں......؟"

"بڑی اونچی چیز ہے۔ نواب زادہ ہے۔ کوئی فرشتہ ہے۔ پتہ نہیں یہ فرشتے ہیرامنڈی میں کیوں آ کر رہنے لگے ہیں۔"

"ذرا تفصیل سے بتاؤ اس کے بارے میں۔"

"یہ بتاؤ، کچھ کر دیں؟"

"ہاں کندھے دبا دو۔" ستار جگنی نے کہا اور انعام دین ستار جگنی کے پیچھے پہنچ گیا اور اس کے بعد اس نے رب ناز کی شان میں لسانیاں شروع کر دیں اور اس کے بارے میں ایک ایک بات بتانے لگا۔ احاطے کی طرف بھی اشارہ کیا اور بولا۔

"یہ وہ ڈیرہ ہے جہاں ہر چیز ملتی ہے انسان کو...... یہ سمجھ لو ہیرامنڈی کے لئے فرشتہ ہے۔ بڑے بڑے تیس مار خان اور سورماؤں کو بھگا دیا۔ ہیرامنڈی والیاں تو جان دیتی ہیں اس پر۔ بڑی عزت سے نام لیا جاتا ہے۔ کوئی برائی نہیں کرے گا اس کی۔"

"بڑی بات ہے...... اچھا ایک بات بتاؤ، اس سے دوستی ہو سکتی ہے؟"

"لو دیکھو، وہ آ رہا ہے۔ کر لو دوستی۔"

"ہٹو۔" ستار جگنی نے کہا۔ بالکل اتفاق تھا کہ رب نواز شاہ اپنے چاروں ساتھیوں کے ساتھ یونہی چہل قدمی کے لئے نکل آئے تھے۔ پان والے کی دکان سے پان خریدنا تھے۔ ستار جگنی وہاں پہنچ گیا، جھک کر سلام کیا تو وہیں رک گئے، آگے بڑھے اور مصافحہ کیا، آنکھوں میں دلچسپی کے تاثرات تھے۔ کہنے لگے۔

"پہلی بار دیکھا ہے آپ کو ادھر...... کہاں رہتے ہیں؟"

"نہیں شاہ جی! بہت عرصے کے بعد ادھر آنا ہوا ہے۔ ان علاقوں کے پرانے چکر باز ہیں۔ آج جب یہ احساس ہوا کہ بڑھاپا بہت زیادہ مسلط ہو گیا ہے تو جوانی کی خوشبو سونگھنے ادھر آ گئے۔"

"ارے واہ، جی خوش کر دیا۔ زندہ دل آدمی معلوم ہوتے ہو...... زندہ دلی ہمیں بہت پسند ہے۔ دیکھو یار! اسے کہتے ہیں زندہ دلی۔" انہوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"شاہ جی! اگر آپ کی دوستی مل جائے تو بیڑا ہی پار لگ جائے۔ کا مزے کی بات ہے،

اس عمر میں تو یہاں لکیر ہی پیٹنے آتے ہیں لیکن اگر اچھی دوستی مل جائے......''

''آؤ پان کھلائیں۔''

''انعام دین! پھر آئیں گے کسی دن تمہارے پاس۔ بس یہ تھوڑی سی محبت کی نذر قبول کر لو۔'' ستار جگنی نے کچھ روپے نکال کر انعام دین کی مٹھی میں تھما دیئے۔ شاہ جی غور سے اس کا یہ عمل دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔

''کیا انعام دین سے پرانی دوستی ہے؟''

''بہت پرانی شاہ جی! کبھی جوانی میں آتے تھے، اس کے ہاتھوں کا کرارا پن دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ آج کچھ بھی نہیں ہے بے چارہ، بس ہم یادیں نبھانے آ گئے ہیں۔''

''واہ مزے کے آدمی ہو۔ آؤ۔'' رب نواز کو یہ آدمی واقعی پسند آیا تھا۔ اس عمر میں اگر کوئی اتنا زندہ دل ہو تو قابل قدر ہوتا ہے۔ پان والے سے پان خریدے گئے۔

''نام کیا ہے آپ کا...... نام نہیں بتایا؟''

''ستار نام ہے...... جگنی تخلص ہے۔''

''واہ، شاعری کرتے ہیں؟''

''ہاں...... جوانی میں انسان شاعری ہی تو کرتا ہے۔''

''واہ، دیکھو کیسی مزے کی باتیں کرتے ہیں، آیئے ستار جگنی صاحب! تھوڑی دیر ہمارے ڈیرے پر بھی بیٹھیں، ہم بھی تو سنیں آپ کی پرانی باتوں کو۔''

ستار جگنی کو پہلے ہی مرحلے میں اتنی زبردست کامیابی حاصل ہو جائے گی اس کا اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ شاہ جی اسے اپنے ساتھ لے کر ڈیرے کی جانب چل پڑے۔ تقدیر یاوری کر رہی تھی، احاطے میں داخل ہو گئے، مونڈھے بچھائے گئے، میز بچھائی گئی اور بہت کچھ لا کر سامنے رکھا گیا اور اس کے بعد ستار جگنی نے ایسا رنگ جمایا کہ قہقہے بکھر گئے۔ پتہ نہیں کیا کیا یاد تھا، سب کا سب سنا ڈالا۔ شاہ جی دل کھول کر ہنس رہے تھے اور ستار جگنی کو پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بہرحال ستار جگنی نے اپنا کام خوب توجہ کے ساتھ انجام دیا تھا۔

''اب کیا کرتے ہیں؟''

''آہیں بھرتے ہیں۔''

''اللہ اللہ کرنے کو دل نہیں چاہتا؟''

''کیوں نہیں چاہتا...... کرتے بھی ہیں۔ لیکن اس کی نعمتوں سے منہ موڑنا بھی تو کفر ہے۔''

''بھئی مزے کے آدمی ہو۔ یہاں ہیرا منڈی میں کس کس سے دوستی رہی؟'' شاہ جی نے خوشگوار موڈ میں پوچھا۔

''ہیرا منڈی میں زیادہ ہاتھ پاؤں نہیں مارے، بس دو چار تھیں، ان میں سے کچھ اللہ کو پیاری ہو گئیں، البتہ شمشیرہ بیگم اب تک جی رہی ہے۔''

شاہ جی اچھل پڑے۔ ہنس کر بولے۔ ''دوستی رہی ہے اس سے؟''

''اچھی طرح۔''

''اب کتنے دن کے بعد ہیرا منڈی آئے ہو؟''

''کوئی بارہ پندرہ سال کے بعد۔''

''اس وقت تو شمشیرہ صحیح معنوں میں شمشیر ہو گی۔''

''ہاں جی، بس کیا بتائیں۔''

شاہ جی کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ چہرے پر شوخ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ بہت دن کے بعد شاہ جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی گئی تھی۔ سب خوش تھے۔ اچانک شاہ جی نے کہا۔ ''شالے خان، نور شاہ! یہ اپنے ستار جگنی تو بڑے کام کی چیز ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک کام کیوں نہ کیا جائے۔''

''کیا شاہ جی؟''

''تھوڑی سی تفریح کی جائے۔ پرانا عشق پھر سے زندہ کر دیا جائے۔ مزہ آ جائے گا، سمجھ رہے ہو نا ہماری بات؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آیا شاہ جی۔''

''یار نیا نو دن اور پرانا سو دن۔ اگر ستار جگنی اور شمشیرہ بیگم کا عشق پھر سے شروع ہو جائے تو کیسا رہے؟''

''ایں......؟'' ستار جگنی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''اخراجات ہمارے ذمے۔ منہ بھر دیں گے سسری کا۔ جو مانگے وہ دے دینا، مگر ایک

کھیل بھی کھیلنا ہوگا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں شاہ جی؟"

"بس دوستی نبھانی پڑے گی۔ سسری پرانی گھاگ ہے۔ آج تک دوسروں کو بے وقوف بناتی رہی ہے، اب تمہیں کام دکھانا ہوگا۔"

"مگر کیسے؟"

"پرانے رشتے پھر سے استوار کرلو...... نئے سرے سے اظہارِ عشق کرو۔ آدمی تیز ہو، بات بنالو گے۔ ایک بار پھر گھنگرو بندھوادو، قسم اللہ کی لطف آجائے گا۔" شاہ جی نے کہا تو ستار جگنی شرمندگی سے بولا۔

"کیا کہہ رہے ہیں شاہ جی؟"

"دیکھو، دوستی تو اسی طرح سے پکی ہوتی ہے ستار جگنی۔"

"سنجیدگی سے کہہ رہے ہو؟"

"پوری سنجیدگی سے۔"

"ارے تو پھر کیا رہ گیا، ساری زندگی دوستی کے نام ہی پر تو قربان کی ہے۔ بڑھاپا بھی قربان کردیں گے مگر ایک بات کہے دیتے ہیں، جیب خالی ہے ہماری۔"

"سب سے پہلے ہم نے اسی کے لئے کہا ہے کہ فکرمت کرو۔"

"ٹھیک ہے...... پھر جو کہو گے کریں گے۔" ستار جگنی تیار ہوگیا۔ بہرحال اللہ نواز شاہ سے دوستی بھی بڑی گہری تھی۔

"تو پھر کل آرہے ہونا؟"

"ہاں، وعدہ۔"

شاہ جی نے خوب مدارت کی تھی ستار جگنی کی۔ آخرکار وہ چلا گیا تو شاہ جی ہنس کر بولے۔ "واہ، بڑی چالاک بنتی ہے شمشیرہ بیگم...... ستار جگنی کی چھری ہی سے ہم اسے کاٹیں گے۔ اصل میں ہمارے دل میں اب بھی یہی شک ہے کہ اسے کوثر جہاں کے بارے میں معلوم ہے۔ کوشش کریں گے کہ جگنی اس کی زبان کھلوالے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تب بھی تھوڑی سی تفریح رہے گی۔" شاہ جی سوچ سوچ کر ہنسنے لگے۔ بات واقعی دلچسپ تھی۔

○●○

تلوار کا زخم اتنا گہرا نہیں ہوتا جتنا محبت کا۔ شمشیرہ بیگم نے ہمت افزائی کردی تھی اور بقول کسی کے یہاں پر مطلوب خود طالب بن گیا تھا۔ تجربہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ علی شان کو اس بارے میں کوئی تجربہ نہیں تھا۔ دونوں دوست جاں نثار تھے اور ہر طرح سے وفادار بھی۔ بہرحال غزالہ کی جانب مائل ہوگئے تھے۔ رقص و موسیقی کی کسی محفل میں کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ بہرحال اس وقت بھی صورتحال کچھ ایسی ہی تھی۔ محفل رقص ختم ہوئی۔ سازندوں نے ساز باندھ لئے، مہمان چلنے لگے تو علی شان نے بھی پہلو بدلا۔ شمشیرہ بیگم نے غزالہ کو اشارہ کیا اور غزالہ علی شان کے پاس آگئی۔

"آپ بھی جائیں گے؟"

"جی وہ......"

"آیئے ہم آپ کو اپنا گھر دکھائیں۔ آپ کی تو بہت بڑی کوٹھی ہوگی، ہم غریبوں کے پاس تو بس یہ کوٹھا ہی ہے۔" یہ لگاوٹ، یہ اندازِ بیاں اور یہ مسکراہٹ، آنکھوں کی یہ چمک اور ہونٹوں کی یہ مسکان...... علی شان ہوش وحواس سے بالکل بے گانہ ہوگئے۔ جھجکتے ہوئے اٹھے، دوستوں نے آنکھوں سے اشارے کئے کہ بات بن رہی ہے، تکلف کیسا۔ شمشیرہ بیگم کی مدد بھی شاملِ حال تھی، مداخلت کرنے والا بھلا کون۔ شمشیرہ بیگم تو لکیریں ہی پیٹ رہی تھیں جو اصل تھا وہ گم ہوگیا تھا۔ اب ان مصنوعی ہیروں ہی سے چمک پیدا کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوثر جہاں کے بعد کسی نے اس کوٹھے پر موجود کسی لڑکی سے دلداری کا اظہار کیا تھا۔ یہی تو شمشیرہ بیگم کی آرزو تھی۔ غزالہ میں البتہ الہڑپن تھا، ابھی تجربے کی بھی کمی تھی، ہنسنے کھیلنے ہی میں وقت گزارا تھا۔ شمشیرہ بیگم کی نصیحتوں نے کانوں میں زخم ڈال دیئے تھے۔ اب کون ان زخموں کے چکر میں پڑے۔ علی شان اسے بھی پسند آیا تھا۔ لمبا چوڑا قد، خوبصورت نقوش۔ دیکھنے میں بھی بہت اچھا تھا۔ وہی گیلری آباد ہوگئی جو دوسری جانب کھلتی تھی اور ستاروں بھرا آسمان نمایاں ہوجاتا تھا اور جہاں سے ٹھنڈی ٹھنڈی عطر بیز ہوائیں آتی تھیں اور دلوں میں امنگیں جگاتی تھیں۔ اسی شکارگاہ میں کوثر جہاں کے ساتھ بھی کئی کشتگان کو بھیجا گیا تھا۔ لیکن کوثر جہاں تو خود زخمی پرندہ تھی۔ اپنے ہی زخم سینے میں سجائے بھلا کون کسی کی پذیرائی کرے۔ غزالہ البتہ شگفتہ تھی۔ علی شان کو لے کر اسی راہداری میں پہنچ گئی۔ علی شان خاموش تھا۔ وہ بولی۔

"آپ کو ہنسی آ رہی ہوگی۔ بھلا یہ بھی دکھانے والا گھر ہے...... لیکن جانتے ہیں اصل بات کیا ہے؟"

علی شان نے غزالہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور بولا۔ "اصل بات بھی بتا دیجئے۔"

"اصل بات آپ سے تنہائی میں گفتگو کرنے کی تھی۔ آپ گئے تو اس کے بعد نیند ہی نہیں آئی۔ نجانے کیا کیا سوچیں ذہن میں رہیں۔"

"کیا؟" علی شان نے پوچھا۔

"یہی کہ آپ دوبارہ آئیں گے یا نہیں...... آپ نے ہمارے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔ ایسی ہی بہت سی باتیں۔"

"تو آپ چاہتی تھیں کہ میں دوبارہ آؤں؟"

"میں تو چاہتی تھی کہ آپ جائیں ہی نہیں۔"

"سچ کہہ رہی ہیں؟"

"جھوٹ کی قیمت ادا نہ کیجئے، جو کہوں اسے سچ سمجھ لیجئے۔"

"نہیں نہیں...... ان خوبصورت ہونٹوں سے جھوٹ نکل ہی نہیں سکتا۔ چھپے رستم ہیں آپ۔ جب اتنے اچھے جملے بول سکتے ہیں تو خاموشی کیوں اختیار کر رکھی ہے؟"

"اس خوف سے کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔"

"کوئی اور ایسی بات کہتا تو جی کو نہ لگتی۔ آپ کی زبان سے نکلا ہوا یہ جملہ اچھا لگتا ہے۔"

"آپ کا نام غزالہ ہے؟"

"ہاں۔"

"آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ میں آپ کو دیکھنے کے بعد آپ ہی کے تصور میں ڈوبا رہا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر لمحے آپ کے پاس رہوں۔" غزالہ ہنسی تو وہ چونک کر بولا۔

"کیوں...... اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟"

"بڑی مشکل بات کہی ہے آپ نے۔ ہر لمحہ ہر آن تو ہمارے ہاں یا تو باورچی رہتا ہے یا دوسرے نوکر یا پھر سارنگی نواز اور طبلہ نواز۔ بھلا آپ جیسے رئیس اور شریفوں کا یہاں رہنے کا کیا سوال۔"

"وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن میں یہ کیسے کہوں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ میرے ساتھ رہیں۔"

"چلیں دن کی بات تو رہنے دیں، رات کو تو آپ یہاں رہ سکتے ہیں۔ آیا کریں نا۔"

"آپ نے دعوت دی ہے تو کون کافر یہاں آنے سے باز رہ سکتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا تحفہ لایا تھا آپ کے لئے۔ اگر قبول فرمائیں۔"

"کیسا تحفہ؟" غزالہ نے پوچھا اور علی شان نے وہ گلوبند نکال کر ہاتھوں میں تھام لیا۔ غزالہ نے گلوبند دیکھا، چمکتا دمکتا گلوبند جس میں جڑے ہوئے ہیرے بھی دمک رہے تھے۔ آنکھوں میں چمک جاگ اٹھی۔ علی شان نے کہا۔

"جی تو چاہتا ہے کہ اسے اپنے ہاتھوں سے آپ کی خوبصورت گردن میں آویزاں کروں لیکن ہمت کی بات ہے۔"

"نہیں، آپ کو اجازت ہے۔" غزالہ نے کہا اور رخ تبدیل کر لیا اور اپنے شانے علی شان کے سینے سے ٹکا دیئے۔ علی شان نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے گلوبند گلے میں ڈالا اور عقب سے گرہ لگا دی۔ پھر دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے گھما کر دیکھا اور غزالہ مسکرا دی۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟"

"میں شاید الفاظ میں آپ کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکوں۔"

"دیکھئے یہ چیزیں حیثیت تو بے شک رکھتی ہیں لیکن ان کے لئے آپ کبھی اپنے آپ کو پریشان نہ کریں۔"

"اب یہ بتایئے کہ کب آئیں؟"

"پرسوں۔"

"پرسوں؟"

"ہاں۔"

"کل کیوں نہیں؟"

"کل جمعرات ہے۔ جمعرات کو ہم لوگ محفل نہیں سجاتے۔"

"تو پھر؟"

"گھر پر بھی نہیں ہوتے...... ہم داتا دربار جاتے ہیں۔"

"تو میں وہاں آجاؤں گا۔ بلکہ اچھا ہے آپ کی موجودگی میں دعا بھی مانگ لوں گا۔"

"کیا دعا مانگیں گے؟"

"یہی کہ الٰہی دل سے جدا نہ ہو الفت لیلیٰ۔"

"ارے ارے...... آپ مجنوں کی زبان میں دعا مانگیں گے؟"

"مجنوں جو ہو گیا ہوں۔"

"خدا آپ کو صحیح سلامت رکھے۔ آپ کو ہوش وحواس میں رکھے...... آیا کریں یہاں، میں بھی آپ کا انتظار کیا کروں گی۔"

"ٹھیک ہے......"

بہت دیر اسی طرح گزری۔ علی شان کی جھجک بھی دور ہو گئی تھی۔ واپسی کے لئے تیار ہوا تو غزالہ نے کہا۔ "کل پھر میری نگاہیں منتظر رہیں گی۔"

"حاضر ہو جاؤں گا۔"

"اور پرسوں ذرا دیر سے آئیں۔ تا کہ بعد میں باتیں کرنے کا موقع مل سکے۔ محفل میں تو سب کی نگاہیں اٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔"

"یہی تو پریشانی ہے، آپ پر دوسروں کی نگاہیں بھی پڑتی ہیں۔ خیر وقت گزرنے دیجئے، دیکھیں تقدیر اس کا کیا علاج کرتی ہے۔"

علی شان واپسی کے لئے مڑا۔ شمشیرہ بیگم اس کے دونوں دوستوں کو باتوں میں لگائے ہوئے تھیں۔ وہ شمشیرہ بیگم کے مداح ہو گئے تھے۔ آخر کار ان سب کو خدا حافظ کہا گیا۔ جب وہ چلے گئے تو شمشیرہ بیگم ہانپتی کانپتی غزالہ کے پاس پہنچیں، گلے میں جڑاؤ گلوبند دیکھا تو خوش ہو گئیں۔ بیٹی کی بلائیں لے ڈالیں، سینے سے لگایا۔ گلوبند اتار کر تیز روشنی میں دیکھا، دونوں ہاتھ جوڑ کر چہرہ ہاتھوں کی طرف اٹھایا اور بولیں۔

"میرے مولا! تُو نے میری سن لی...... تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ اپنی راہ پر چل پڑیں۔ غزالہ! کچھ معلومات کیں اس کے بارے میں...... کس حیثیت کا آدمی ہے؟"

"اماں! ایک ہی دن میں ساری معلومات کیسے ہو سکتی ہیں؟ یہ گلوبند دیا ہے مجھے۔ خود اندازہ لگا لو۔"

"غزالہ، ایک بار پھر آنکھوں میں روشنی پیدا ہوئی ہے۔ بیٹا یہی عمر ہوتی ہے، کچھ کر لو،

دھر لو۔ بعد میں تو بس لکیر ہی پیٹنی پڑتی ہے۔ ہائے کیسے سمجھاؤں۔ دیکھو خیال رکھنا، ہاتھ سے نہ نکلنے پائے۔ بس ایک ہی آرزو ہے کہ کہیں اچھی جگہ کوٹھی وو ٹھی مل جائے۔ کیسی بدنصیب ہوں میں جس کی تین تین بیٹیاں کمانے والی ہوں اور اس کی آرزو پوری نہ ہو۔ میرے مولا! میری مدد کر۔"

وہ نجانے کیا کیا غزالہ کو سمجھاتی رہیں اور وہ چپ کر کے سنتی رہی، پھر بولی۔ "اماں! فکر نہ کرو۔ ویسے وہ کل آئے گا داتا صاحب کے مزار پر میرے لئے۔"

"سچ کہہ رہی ہے؟"

"ہاں اماں! اتنا ہی بے تاب تھا۔"

"بس یہی بے تابی ہمارا کام بناتی ہے۔ سُن تُو اگر کچھ دیر کے لئے الگ ہونا چاہے تو ہو جانا، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بعد میں ہم تجھے تلاش کر لیں گے۔ مگر کہیں لمبی نہ نکل جانا۔ اب ذرا تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ اتنا آجائے ہمارے پاس کہ آگے کوئی حساب کتاب ہو سکے۔"

"ٹھیک ہے اماں!" غزالہ نے کہا۔ لیکن رات کو جب وہ سوئی تو دل میں ایک بے کلی سی تھی، ایک احساس سا تھا۔ سوچ رہی تھی کہ ایسے محبت کرنے والے کو، ایسے پیار سے دیکھنے والے کو کیا دھوکے میں رکھنا اچھی بات ہو گی؟ وہ کتنی چاہتوں کا اظہار کر رہا ہے، کتنی محبتوں سے مل رہا ہے اور میں اس سے صرف یہ توقع رکھوں کہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ رقم دے دے۔ اماں نے کوثر جہاں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا جس سے وہ بد دل ہو کر چلی گئی۔ ٹھیک ہے، دولت بھی آئے لیکن اگر کسی کی چاہت کو دل میں رکھا جائے تو کوئی بری بات تو نہیں ہوتی۔ ٹھیک ہے اماں! تمہیں بھی خوش رکھوں گی اور اپنے دل کی لگی کو بھی بجھاؤں گی۔ لیکن کسی سے کچھ کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ راز کی بات راز میں ہی رہنی چاہئے۔"

معمول کے مطابق داتا صاحب جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ بڑی باقاعدگی سے حاضری دی جاتی تھی۔ بہر حال ہیرا منڈی کی اور بھی خواتین نظر آتی تھیں۔ بڑا ہجوم ہوتا ہے وہاں۔ اور آخر کار یہی ہوا کہ علی شان نے غزالہ کو تلاش کر لیا۔ خود غزالہ کی نگاہیں بھی اس کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں اور آج کوئی لالچ یا ماں کی نصیحت دامن گیر نہیں تھی بلکہ وہ محبت بھرے الفاظ اور رات کی لگاوٹ جو حسین خواب بن گئی تھی، اس وقت ان نگاہوں کو

اس کی تلاش میں بھٹکا رہی تھی۔ بہر حال وہ چلتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ سلام کیا۔ غزالہ نے جواب دیا اور بولی۔

''میں نے برقعے کا نقاب صرف آپ کے لئے اٹھا رکھا تھا۔''

''آہ...... میں تو خوفزدہ ہو گیا تھا کہ بھلا میں برقعے میں آپ کو کیسے پہچانوں گا۔''

''فاتحہ خوانی کر لی؟''

''دعا بھی مانگ لی۔ اور دعا بھی یہی تھی کہ آپ میری نگاہوں سے اوجھل نہ رہیں۔''

''چلئے دعا قبول ہو گئی۔''

''سب لوگ ساتھ ہیں؟''

''ہاں ہیں تو۔ وہ ہیں نا سارے کے سارے۔''

''تو آج مزید گفتگو نہ ہو سکے گی۔''

''نہیں، آیئے۔ ابھی تو یہ لوگ زیارت میں کافی وقت لگائیں گے۔''

علی شان خوش ہو گیا۔ تھوڑا سا فاصلہ اختیار کیا اور وہیں دور دراز گوشے میں جا بیٹھے۔ علی شان کی نگاہیں غزالہ کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بولا۔

''میں نے بہت سی دعائیں مانگی ہیں آپ کے لئے۔''

''بھلا کیا؟''

''ابھی رہنے دیجئے، پھر بتاؤں گا۔''

''کل آئیں گے نا؟''

''ہاں کیوں نہیں...... اب بھلا کیسے رہا جائے گا۔''

''اب آپ سے آپ کے بارے میں بہت سی باتیں کرنی تھیں۔''

''کل کریں گے۔ یہاں تو بس آپ کو دیکھنے سے ہی جی نہیں بھرتا۔''

بہر حال خاصی دیر تک وہ لوگ گھومتے رہے اور پھر شمشیرہ بیگم کے اشارے پر غلام شاہ قریب پہنچ گیا اور غزالہ سے بولا۔

''ارے غزالہ بیگم! تم یہاں بھٹک رہی ہو اور وہاں ہم تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔''

غلام شاہ کو شاید ہدایت کر دی گئی تھی کہ جان بوجھ کر علی شان کی طرف رخ نہ کرے۔ اگر وہ خود ہی مخاطب ہو تو دوسری بات ہے۔ غزالہ نے علی شان کو اشارہ کیا اور وہ چپکے سے

خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ تب غلام شاہ اسے ساتھ لے کر چلتا ہوا بولا۔

''بہت دیر ہو گئی۔ تم نے وقت کا احساس نہیں کیا...... چلو، تیاریاں ہو رہی ہیں۔''

گھر واپس آ گئے۔ شمشیرہ بیگم نے دو چار باتیں اس کے بارے میں پوچھیں اور انہیں اطمینان بخش پا کر خاموش ہو گئیں۔ لیکن رات کی تنہائیاں غزالہ کے لئے بھاری تھیں۔ بستر پر لیٹی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ جبکہ شبانہ گہری نیند سو گئی تھی۔ لیکن غزالہ کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔

کیسا حسین نوجوان ہے...... کیسا حسین لگ رہا تھا۔ کیسی چاہت سے باتیں کر رہا تھا...... ایسے محبت کرنے والے شخص کو دھوکا دیا جا سکتا ہے؟ اماں تمہاری ہوس تو کبھی پوری نہیں ہو گی۔ میرا خیال ہے کوثر جہاں نے ٹھیک ہی کیا جو تمہارے چنگل سے نکل گئی۔ اب سبھی، تمہاری طرح سوچنے والے تو نہیں ہوتے۔ علی شان...... علی شان...... علی شان...... انہی تصوروں میں اسے نیند آ گئی۔

شمشیرہ بیگم انسانی فطرت کو ان کوٹھوں پر بے شک مسخ کر دیتی ہے لیکن اسے بھی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ بہر حال ایک بار پھر شمشیرہ بیگم نے پانسہ پھینکا تھا لیکن یہ پانسہ بھی غلط ہی پڑتا نظر آ رہا تھا۔

○●○

الجھی ہوئی گتھیاں سلجھ گئی تھیں...... بہت سے مسئلے حل ہوتے جا رہے تھے۔ ہر شخص کی اپنی کہانی الگ الگ تھی۔ نظام الدین کو پتہ چل گیا تھا کہ یہ حسین لڑکا جوان کے بھائی کا ہو بہو ہم شکل ہے، درحقیقت شمس الدین کی اولاد ہے۔ خون جوش مار رہا تھا، دل چاہ رہا تھا کہ ایک لمحے کے اندر اندر جائیں اور اکرام کو اپنے گھر لے آئیں۔ لیکن ممکن نہیں تھا۔ دوست احباب بھی حقیقتیں سمجھ چکے تھے۔ اکرام اب بالکل بہتر حالت میں تھا اور ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ وہ مکمل صحت یابی کے قریب پہنچ چکا ہے، کسی بھی وقت اس کی پرانی شخصیت واپس آ سکتی ہے۔ پھر جواد حسین ہی کو ذریعہ بنایا۔ خود لاہور پہنچے تھے اور سیدھے جواد حسین کے گھر گئے تھے۔

نادر حسین نے بڑا پر تپاک استقبال کیا۔ ''آیئے نظام بھائی! خیریت تو ہے؟''

''ہاں بالکل خیریت ہے...... جواد حسین کہاں ہیں؟''

''بھائی اندر ہیں، آ رہے ہیں۔ آیئے، آپ آیئے ناں...... بھابی وغیرہ تو سب خیریت سے ہیں؟''

''بالکل......''

جواد حسین کو بھی نظام الدین کے آنے کی اطلاع مل گئی۔ سب گھل مل کر بیٹھ گئے۔ ابتدائی خاطر مدارات ہوئیں، پھر نظام الدین نے کہا۔

''جواد حسین! ایک ضرورت سے حاضر ہوا ہوں تمہارے پاس۔''

''سر آنکھوں پر۔ صرف حکم دیں، کوئی سوال نہ کریں۔''

''نہیں، بات بہت بڑی ہے۔''

''کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، بتایئے تو سہی۔''

''میں تمہیں لندن بھیجنا چاہتا ہوں۔''

''چلا جاؤں گا، بڑی بات بتایئے۔'' جواد حسین نے اپنائیت سے کہا اور نظام نے گردن جھکا لی۔ پھر چند لمحات خاموش رہنے کے بعد بولے۔

''یہ صرف تم ہی ہو جو شمس الدین کو یہاں لا سکتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اب وہ وطن واپس آ جائے۔ صورتحال مکمل طور پر میرے علم میں آ چکی ہے۔ اس کے پاکستان نہ آنے کی وجہ بھی پتہ چل گئی ہے۔ کوثر جہاں...... میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں آئے، کوثر جہاں کو کوٹھے سے اٹھوا لینا ہمارے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں شمس الدین کا نکاح کوثر جہاں سے کرا دوں گا۔ بے وقوف اس کی تو غلطی بھی نہیں تھی، ظہیر الدین کا شکار ہو گیا تھا۔ انسان، انسان ہی رہتا ہے، فرشتہ نہیں ہوتا۔ بھٹک گیا۔ چونکہ فطری طور پر برا نہیں تھا اس لئے کسی سے کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ نجانے کیا کیا بیتی ہو گی دل پر...... اور پھر یہ بچہ......''

''نظام بھائی میں چلا جاتا ہوں...... میرا خیال ہے اسے بہانے سے بلا لیتے ہیں۔ کہہ دوں گا کہ نظام بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

''نہیں جواد حسین! یہ نہ کہنا...... میں ایک جھوٹے آدمی کی حیثیت سے اس سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ تم اس سے یہ کہہ دینا کہ بہت ہی گمبھیر مسئلہ ہے جس کے لئے میں نے تمہیں بھیجا ہے اور یہ کہا ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے، شمس الدین کو لے کر ہی آئیں۔ بس اتنا ہی کہہ دینا کہ کچھ بات کرنی ہے۔''

''جیسا آپ پسند کریں۔ ویسے آپ بے فکر رہئے، میں بھی گڑ کا چیونٹا ہوں۔''

''گڑ کا چیونٹا...... کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اگر چمٹ جاؤں تو آسانی سے نہیں چھوٹتا۔'' جواد حسین نے کہا اور نظام الدین ہنسنے لگے۔

''تو پھر بھائی! یہ تو میں بالکل نہیں کہوں گا کہ اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔''

''ہاں...... یہ آپ کو کہنا بھی نہیں چاہئے۔ کیونکہ اس میں میری بھی ایک غرض پوشیدہ ہے۔'' جواد حسین نے کہا اور نظام الدین نے گردن جھکا دی، پھر آہستہ سے بولے۔

''یقین کرو، بڑے لوگ بڑے ہی ہوتے ہیں۔ اور بڑائی دل کے بڑے ہونے سے سامنے آتی ہے۔'' جواد حسین نے مسکراتے ہوئے نظام الدین کا شانہ تھپکا تھا۔

○●○

کچھ عرصے سے شمشیرہ بیگم کے دل کو قرار آ گیا تھا۔ علی شان نے ایک بار پھر اس گھر میں چراغ روشن کر دیئے تھے۔ شمشیرہ بیگم کو خوشی اس بات کی تھی کہ غزالہ صحیح راستے پر چل نکلی تھی۔ کوثر جہاں کے جانے کے بعد تو اب یوں لگتا تھا جیسے یہ گھر تیسرے درجے کا ہو کر رہ جائے گا۔ شمشیرہ بیگم کے اپنے دور میں بھی اس کوٹھے کی وہ عزت نہیں بن سکی تھی جو کوثر جہاں نے بنا دی تھی۔ اس کی آواز میں سوز کا سمندر موجزن تھا، گائیکی کا انداز، بھید بھاؤ، سُر تال ہر چیز اس طرح سمو دی تھی قدرت نے کہ فن کو نہ جاننے والا بھی اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا تھا اور صاحب ذوق رفتہ رفتہ شمشیرہ بیگم کے کوٹھے کے عادی بن گئے تھے۔ لیکن کوثر جہاں کے جانے کے بعد یہاں کچھ باقی نہ رہا۔ شمشیرہ بیگم نے سب کچھ گھول کر پلانے کی کوشش کی لیکن فن گھول کر نہیں پلایا جا سکتا۔

دونوں ہی نکمی ثابت ہوئی تھیں۔ یہ امید تو ختم ہو گئی تھی کہ کوٹھے کا معیار قائم رہ سکے گا لیکن ناز و انداز کے کھیل تو کھیلے جا سکتے ہیں۔ کم از کم یہ کمبخت اسی میں تاک ہو جائیں۔ لیکن دونوں ایسی بے لگام تھیں کہ کسی بات کو خاطر میں ہی نہ لاتی تھیں۔ اب علی شان تھا جو ذرا دل پر مرہم رکھ رہا تھا۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ رئیس والدین کی اولاد رئیس ہی ہوتی ہے۔ علی شان بے شمار زیور دے چکا تھا جن کی مالیت لاکھوں تک جا پہنچی تھی۔ نقد ادائیگی الگ کی جاتی تھی۔

شمشیرہ بیگم کو یہ امید ہو چلی تھی کہ کوئی بہت بڑی بات بن ہی جائے گی۔ غزالہ کو پٹی پڑھاتی رہتی تھیں۔ ادھر غزالہ تھی کہ شمشیرہ بیگم کی کہانیوں سے بے نیاز اپنی من مانی کر رہی تھی۔ بہن کو رازدار بنا لیا تھا۔ ویسے بھی دونوں بہنوں کی بڑی دوستی تھی اور غزالہ شبانہ کو بتاتی رہتی تھی کہ آج علی شان نے کیا کہا اور کل اس کا کیا ارادہ ہے۔ اس کے لئے غزالہ نے بڑی دل سوزی سے کہا تھا۔

"بہت اچھا انسان ہے وہ شبانہ...... بہت چاہتا ہے مجھے...... مگر ایک بات جب میں اب سوچتی ہوں تو مجھے کوثر جہاں یاد آ جاتی ہے۔"

"کیا؟"

"آخر کار ایک دن علی شان کے پاس یہ سب کچھ نہیں رہے گا۔ وہ جس انداز میں اماں کا منہ بھر رہا ہے اس سے وہ بہت جلد قلاش ہو جائے گا اور اس کے بعد اماں اسے جوتے مار کر نکال دیں گی۔ کوثر جہاں بھی تو یہی کہتی تھی کہ کسی کو اتنا نہ لوٹو کہ وہ بعد میں زندگی سے بھی بے سہارا ہو جائے۔"

"مگر باجی! تم علی شان کو منع کیوں نہیں کرتیں؟"

"اماں کھا جائیں گی مجھے۔"

"اماں کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

"اس کا موقع ہی کہاں ملتا ہے...... پوری نگرانی کی جاتی ہے ہماری۔"

"ہاں، میں جانتی ہوں...... اصل میں اماں دودھ کی جلی ہوئی ہیں، چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پینا چاہتی ہیں...... ایک کام کرو، کہیں باہر جاؤ نا، کہیں باہر لے جاؤ اور سمجھا بجھا دینا اس کو۔"

"میرے دل میں تو ایک اور خیال آتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"کیوں نہ میں علی شان سے شادی کر لوں۔" غزالہ نے کہا اور شبانہ آنکھیں پھاڑنے لگی۔

"کیا بک رہی ہو غزالہ...... ہم لوگ اتنے بے وقوف ہیں کیا؟"

"کیوں؟"

"طوائفوں سے کوئی شادی کرتا ہے کیا؟ کوثر جہاں سے کسی نے شادی کی؟ کتنوں کے لئے اس نے سر دھنے، کتنوں سے سر پھوڑے، کسی نے اپنی عزت بنانے کی کوشش کی اسے؟"

"میں بات تو کروں گی۔ ایک بار تو میں علی شان سے بات کروں گی۔ فیصلہ کرنے میں تو آسانی ہوگی۔ مان جاتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے کیا۔ آتا جاتا رہے، لٹتا رہے، مجھے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"اماں سے مت کہہ دینا کہیں...... زبان کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دیں گی۔"

"یہ اماں سے کہنے کی باتیں ہیں؟ جان جلا رہی ہے میری۔"

ادھر شمشیرہ بیگم منصوبے بنانے لگی تھیں۔ انہوں نے غلام شاہ سے کہا۔ "اے غلام شاہ! تمہارا ابھی کچھ تجربہ ہے۔ ایک کام کرو۔"

"حکم کرو۔"

"خاک حکم کروں، تمہیں خود سوچنا چاہئے۔"

"بہکنے لگیں...... ہم تو بہت کچھ سوچتے ہیں تمہارے بارے میں۔"

"میں علی شان کی بات کر رہی ہوں۔ بہت کچھ دے رہا ہے اس وقت۔ ذرا اس کی صحیح حیثیت کا تو اندازہ کرو۔ معلوم تو کرو کہ کتنے پانی میں ہے۔"

"پتہ چل جائے گا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

پھر تین چار دن کے اندر غلام شاہ نے شمشیرہ بیگم کو اطلاع دی۔

"کروڑ پتی ہے...... کروڑوں کا مالک...... آٹھ کارخانے ہیں...... فیکٹریاں وغیرہ ہیں۔ بے شمار لوگ نوکریاں کرتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے میری آرزو پوری ہو جائے گی۔"

"کیا آرزو پوری ہوگی...... ہمیں بھی تو کچھ بتاؤ۔"

"غلام شاہ! معمولی معمولی لڑکیوں نے جائیدادیں بنا لی ہیں، کوٹھیاں ہیں ان کی۔ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ اور کچھ نہ ہو بس ایک اچھی سی کوٹھی مل جائے۔ کتنی حسرت ہے مجھے۔ مگر کمبخت کہیں سے پوری نہ ہوئی۔ ساری کی ساری نکمی اور ناکارہ نکلیں۔"

"ٹھیک ہے، غزالہ سے بات کرو...... ابھی سے کان میں ڈال دو۔ اس وقت کاٹھ کا الو

بنا ہوا ہے وہ۔"

"دعا بھی تو کرو غلام شاہ! بات کروں گی غزالہ سے۔"

شمشیرہ بیگم نے غزالہ سے بات کی تو وہ جل کر رہ گئی۔ لیکن نہ تو وہ کوثر جہاں کی طرح صاف گو تھی اور اس کے علاوہ چالاک بھی تھی۔ کہنے لگی۔

"اماں ایسی باتیں تو ایک خاص ہی ماحول میں ہوتی ہیں۔ ایسا کرو تم ہمیں کہیں باہر جانے کی اجازت دے دو...... ایسی کسی جگہ بات کروں گی کہ علی شان منع ہی نہ کر سکے۔"

"ٹھیک ہے، چلی جاؤ کسی دن اس کے ساتھ۔ لیکن سوچ لینا، مرد بڑا ظالم ہوتا ہے۔ پوری طرح ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

"بہت ہوشیار ہوں میں اماں!"

"دیکھ لوں گی کہ کیا تیر مارتی ہو۔" شمشیرہ بیگم نے کہا اور غزالہ ہنسنے لگی۔ دل ہی دل میں اس نے کہا۔

"تیر تو ماروں گی اماں! مگر اپنا سینہ بچا کر رکھنا، اس سے اچھی جگہ اور کہیں نہیں ملے گی مجھے۔"

شمشیرہ بیگم کا رویہ لڑکیوں کے ساتھ ایسا رہتا تھا کہ کوثر جہاں تو اپنی جگہ، غزالہ اور شبانہ بھی اس کی وفادار نہیں تھیں۔ بس زندگی گزارنے والی بات تھی جو گزر رہی تھی۔ ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو آخری حد تک ہو۔ ہاں کوثر جہاں کے معاملے میں وہ دونوں اس بات سے اتفاق کرتی تھیں کہ کوثر جہاں شمشیرہ بیگم کی زیادتیوں کا شکار ہو کر گھر سے نکلی ہے۔ مگر اکرام کے معاملے میں شمشیرہ بیگم اس قدر سخت نہ ہوتیں اور اس کے ساتھ اتنی بدسلوکی نہ کرتیں تو ہو سکتا ہے کہ آج حالات بدلے ہوئے ہوتے اور بات یہاں تک نہ پہنچتی۔

علی شان کا تو آج کل یہاں بول بالا تھا۔ انتظار ہوتا رہتا تھا۔ بالکل گھر داماد کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ہر شخص خاطر مدارات میں لگا رہتا تھا۔ اس وقت شمشیرہ بیگم کا خاص منظورِ نظر تھا۔ بہر حال وہ دوسرے دن آ گیا۔ محفل کے رنگ چڑھتے رہے۔ بعد میں اسے تنہائی دی گئی اور غزالہ نے اپنے دل کی بات اس سے کہہ دی۔

"یہاں تو بس ایسا لگتا ہے جیسے کسی قیدی سے سلاخوں کے پیچھے ملاقات کی جاتی ہے۔

کیا تمہارا دل نہیں چاہتا علی کہ کسی کھلی جگہ میں ملاقات ہو؟"

"میرے منہ کی بات چھین لی ہے تم نے...... اس دن وہاں ملاقات ہوئی تھی، آج تک دل تڑپتا ہے کہ پھر وہی لمحات ملیں۔"

"اماں سے بات کر لونا۔"

"کیا بات کروں؟"

"کل دن میں گھمانے کی بات کر لو۔ مان جائیں گی میرا خیال ہے۔" علی شان نے محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا پھر بولا۔

"ابھی بات کئے لیتا ہوں...... میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

شمشیرہ سے بات ہوئی تو ہنس کر بولیں۔ "لو...... کوئی غیر ہو تم جواب تم سے پردہ داری ہو گی۔ جہاں دل چاہے لے جانا گھمانے کے لئے...... بس ذرا یہاں کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ میں یوں کروں گی کہ غزالہ کو تانگے میں بٹھا کر غلام شاہ کے ساتھ کسی جگہ بھجوا دوں گی۔ وہاں سے تم اسے ساتھ لے جانا۔"

"بہت بہتر اور بے حد شکریہ۔" علی شان نے کہا اور اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے دن غزالہ خوشی خوشی تیار ہو گئی۔ رات ہی کو اسے شمشیرہ بیگم نے بتا دیا تھا کہ کل علی شان کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے جانا ہے اور بھی بہت سے سبق پڑھائے تھے انہوں نے اور غزالہ نے سارے سبق پڑھ لئے تھے۔ غلام شاہ کو بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ غزالہ کا پیچھا نہ چھوڑے۔ دوسرا تانگہ کر لیا جائے۔ حاجو کو دوسرا مشن سونپا گیا تھا اور اب اسے غلام شاہ کی جگہ غزالہ کو لے کر جانا تھا تاکہ غلام شاہ پس پردہ رہ کر نگرانی کر سکے۔

اس کے علاوہ غزالہ کو برقعہ اوڑھ کر ہی نکلنا پڑا تھا۔ خوب سج بن کر نکلی تھی اور بہت دلکش لگ رہی تھی۔ تانگہ ایک مخصوص جگہ پر رک گیا جہاں کے بارے میں علی شان کو ہدایت کر دی گئی تھی۔ دوسرے تانگے میں غلام شاہ موجود تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گھومنے پھرنے کے لئے علی شان تانگہ استعمال کرے گا۔ لیکن اس وقت بات بگڑ گئی جب علی شان موٹر لے کر آیا۔ آج تک وہ شمشیرہ بیگم کے پاس کبھی موٹر میں نہیں آیا تھا اور نہ ہی ان کی موٹی عقل نے یہ سوچا تھا کہ بھلا ان لوگوں کے پاس کیا موٹر نہیں ہو گی۔ یہاں غلام شاہ مار کھا گیا۔ علی

شان تو غزالہ کو موٹر میں بٹھا کر ہوا ہو گیا اور غلام شاہ اور اس کا تانگے والا سر کھجاتے رہ گئے۔ اس کے بعد واپسی کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ علی شان کی موٹر کا پیچھا کرنا کہاں آسان تھا۔ غزالہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''علی شان! تمہاری یہ موٹر کہاں تک چل سکتی ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''کیا یہ ہمیں افق کے اس پار لے جا سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں۔''

''تو پھر اتنی ہی دور نکل چلو۔''

خوبصورت کار تیز رفتاری کے ساتھ آگے نکل گئی تھی۔ لاہور کے باہر کے علاقوں کی سیر کا فیصلہ کیا گیا تھا چنانچہ نجانے کہاں کہاں چکراتے رہے اور پھر ایک جگہ منتخب کر کے وہاں بیٹھ گئے۔ ایک گھنے درخت کے سائے میں جہاں دور دور تک زندگی کا نام و نشان نہیں تھا۔ غزالہ نے کہا۔

''یہ میری زندگی میں پہلا دن ہے جو میں خود کو آزاد محسوس کر رہی ہوں۔''

''زندگی کے بقیہ حصے کو بھی آزاد کر دو غزالہ۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''کب تک اس کوٹھے پر اپنے پیروں کو تھکاتی رہو گی؟ زندگی وہیں پر گزارو گی کیا؟ کیا ملے گا تمہیں وہاں سے؟''

غزالہ کے چہرے پر حقیقی اداسی پھیل گئی، پھر وہ کرب زدہ انداز میں بولی۔ ''کیا تم کسی کی بے بسی کو بھی نہیں مانتے علی شان؟''

''مانتا ہوں...... لیکن اگر کسی کی بے بسی کو سہارا مل جائے تو۔''

''کون دے گا مجھے سہارا؟''

''مجھ پر یقین نہیں ہے؟''

''بہت یقین ہے لیکن اپنے آپ پر نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لئے کہ طوائف زادی ہوں۔ مجھے دنیا کا تجربہ نہیں ہے۔ اپنی ذات کے بارے

میں، میں نے یہی سنا ہے کہ وہ بس کھیلنے کی چیز ہوتی ہے اور اس خوبصورت کھلونے سے کھیلنے کے بعد اسے پھینک دیا جاتا ہے۔ میں بے جان نہیں ہوں، اس وقت جب مجھے پھینک دیا جائے گا تو میں کیا کروں گی۔ بس اسی بات سے ڈرتی ہوں۔''

''اور اگر میں تمہیں یہ اعتبار دلاؤں کہ میں زندگی کے آخری لمحے تک تمہیں چاہوں گا اور تمہیں اپنی زندگی میں وہ مقام دوں گا جسے دنیا عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے تو کیا تم مجھ پر یقین کر لو گی؟''

''خدا کرے تم اپنا قول نبھا سکو۔ مگر مسائل تمہیں بھی تو گھیر لیں گے۔''

''جوانی اسی لئے ہوتی ہے غزالہ کہ مصیبتیں مول لی جائیں۔ ان سے پنجہ آزمائی کی جائے اور انہیں شکست دی جائے اور اس کے بعد تو کمزوری کی عمر شروع ہو جاتی ہے۔ جب انسان کچھ نہیں کر پاتا۔ میں اس عمر میں اپنی منزل تعمیر کر سکتا ہوں۔ بولو، تم میرا ساتھ دو گی؟''

''زندگی دے کر بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔''

''مجھ سے شادی کرو گی؟''

''اگر تم اس قابل سمجھو۔''

''تم ہر طرح سے قابل ہو...... میں تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنا کر زندگی کو بہت قیمتی سمجھوں گا۔''

''تو میں تیار ہوں۔''

''کیا طریقہ کار اختیار کریں گے ہم؟''

''تم اپنے گھر والوں کو کیسے تیار کرو گے؟''

''میں اپنے گھر میں تنہا ہوں...... والدین بے پناہ پیار کرتے ہیں مجھ سے...... لیکن اس کے باوجود میں خطرہ مول نہیں لوں گا۔ پہلے ہم لوگ شادی کریں گے، اس کا انتظام میرے آدمی کریں گے۔ پھر دیکھا جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ تم اپنی ماں سے کیا کہو گی؟''

''اماں کبھی تیار نہیں ہوں گی...... یوں کرو کسی بھی دن یہ کام کر لیتے ہیں۔ اس دوران تم اماں کو اسی طرح خوش کرتے رہو جس طرح آج تک کرتے رہے ہو۔ اور کوئی بندوبست بھی کر لو قیام کا۔ بس اس کے بعد جیسا تم پسند کرو۔''

"تم نے مجھے ایک نئی زندگی دے دی ہے غزالہ! بس باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔"
اور شمشیرہ بیگم کے سینے میں اترنے کے لئے ایک اور خنجر تیاریاں کرنے لگا۔

سارا دن گھومنے پھرنے کے بعد علی شان غزالہ کو اس کے گھر چھوڑ آیا۔ شمشیرہ بیگم نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ بعد میں انہوں نے غزالہ سے سوال کئے تو غزالہ نے انہیں شوخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اماں! ساری عمر جو کچھ پڑھاتی رہی ہو، وہی کر رہی ہوں۔ بے فکر رہو، کوٹھی لے کر رہوں گی، کچھ بھی ہو جائے۔"

شمشیرہ بیگم غزالہ کی بلائیں لینے لگیں۔ خوشی سے ان کا سانس سینے میں نہیں سما رہا تھا۔ ان کے خیال میں جو کام کوثر جہاں نے نہیں کیا وہ اس نکمی اور ناکارہ لڑکی نے کر دکھایا تھا۔

○●○

جواد حسین جانتے تھے کہ اکرام کی حیثیت کیا ہے...... لیکن خود انہیں اکرام اس طرح بھایا تھا کہ دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ اسے چھوڑ دیں۔ اور پھر اس وقت تو ان کا دل بالکل ہی پگھل کر موم ہو گیا تھا جب انہوں نے ایک بار رات کی تاریکی میں شانہ کو جائے نماز پر دو زانو بیٹھے ہوئے دعا مانگتے دیکھا تھا۔ اس وقت اس بات کے قطعی امکان نہیں تھے کہ کوئی جاگ کر شانہ کے پاس پہنچ جائے۔ اس لئے شانہ دل کی باتیں کر رہی تھی۔

"معبودِ دو جہاں...... تُو جانتا ہے میں نے زندگی میں کبھی ایسا کوئی کھیل نہیں کھیلا جس سے میرے والدین کی عزت پر حرف آئے۔ یورپ میں کتنے لڑکے میرے پیچھے پڑے جو مقامی بھی تھے اور غیر مقامی بھی، میں نے ان سب پر تھوک دیا اور کبھی کسی کو ایسا موقع نہ دیا جس سے میرے والدین کی آبرو پر کوئی حرف آئے۔ غفور الرحیم، قصور میرا نہیں ہے۔ ان لوگوں نے میرے دل میں اکرام کا تصور ڈال دیا اور میں بے خود ہو گئی۔ اے اللہ، اس کی ہر مشکل دور کر دے، اسے صحت یاب کر دے۔ میرے راستے ہموار کر دے...... میں اسے چاہنے لگی ہوں، میں اس کی زندگی کا ایک حصہ بننا چاہتی ہوں۔ تیرے سوا میرے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ میری یہ آرزو پوری کر دے۔"

جواد حسین ششدر رہ گئے تھے۔

بیوی سے بڑا راز دار اور کون ہو سکتا ہے؟ انہوں نے بیوی کو ساری باتیں بتائیں اور

فاخرہ بیگم آبدیدہ ہو گئیں۔

"ہم اپنی بچی کی خوشی پوری کرنے کے لئے اپنے آپ کو مٹا دیں گے۔ دنیا میں کسی کی پرواہ نہیں کریں گے ہم...... ارے انسان تو انسان ہی ہوتا ہے، کس نے کس طرح زندگی پائی یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ کوئی ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے اور کوئی نہیں آتا۔"

"ٹھیک کہتی ہو تم......"

پھر جواد حسین خود نظام الدین سے ملے اور انہوں نے کہا۔ "بھئی آپ نے تو اس کے بعد خبر ہی نہیں لی۔"

"نہیں جواد حسین! ظاہر ہے میرے دل کو لگی ہوئی ہے۔ ایک ایسا کام میں آپ کے سپرد کر رہا ہوں جو مشکل ترین ہے لیکن کرنا ہے یہ۔ جواد حسین! میں تیاریاں کر رہا ہوں آپ کی روانگی کے لئے۔"

"لیجئے...... ارے بھائی! لندن میرا دوسرا گھر ہے۔ میں دو گھنٹے میں تیاریاں مکمل کر لیتا ہوں وہاں جانے کی۔ بس آپ کی طرف سے گرین سگنل چاہئے۔"

"مگر......"

"مگر کچھ نہیں بھائی...... میں جا رہا ہوں۔ اجازت ہے؟"

"جواد حسین! آپ کا یہ احسان میں......"

"زندگی بھر نہیں بھولوں گا...... یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟ چلئے اس کے بعد آپ کوئی احسان مجھ پر کر ڈالئے، بات برابر ہو جائے گی۔"

جواد حسین لندن پہنچ گئے۔ شمس الدین اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ جواد حسین نے بڑے غور سے شمس الدین کو دیکھا اور خدا کی قدرت کے قائل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کس طرح رابطے قائم کرتا ہے۔ یہ شخص عالم نوجوانی میں اکرام سے ذرہ برابر مختلف نہ ہو گا۔ شمس الدین نے پہلے تو جواد حسین کے دوست کی تعزیت کی، اس کے بعد کہا۔

"حضرت سنا ہے کہ اب آپ لندن آنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"ٹھیک سنا ہے آپ نے۔"

"اور ہمارا کیا ہو گا؟"

"یہی فیصلہ کرنے تو لندن آئے ہیں...... ورنہ کون نامعقول لندن کا رخ کرتا جہاں

ہمارا یارِ غار نہیں ہے۔“

”یعنی آپ میرے بارے میں فیصلہ کرنے آئے ہیں؟“

”جی ہاں، بوریا بستر باندھئے، پاکستان چلنا ہے۔“

”کہاں...... وطن کی مٹی تو ہمیں بھول چکی ہے۔ ہم بھلا کیا پاکستان جائیں گے۔“

”عزیزم احمقانہ باتیں نہ کیجئے، گھر کی خوشبو کبھی انسان کے خمیر سے خارج نہیں ہو سکتی۔ خیر، ہم فلسفہ بولنے کی بجائے یا ادب بگھارنے کی بجائے کھری کھری بات کر رہے ہیں کہ آپ تیاریوں میں کتنا وقت لیں گے؟ اصل میں نظام الدین صاحب نے بلایا ہے آپ کو اور کہا ہے کہ جواد حسین! لے کر ہی آنا ہے اسے۔ بہت ہی اہم گفتگو کرنی ہے۔“

”مگر جواد صاحب! مجھے تو سالہا سال ہو گئے۔ یہ کہنا چاہئے کہ ایک عمر ہی گزر گئی، میں کہاں گیا ہوں پاکستان۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اپنے وطن سے محبت نہیں ہے، پنجاب کی مٹی تو یوں سمجھ لیجئے کہ میرا رواں رواں ہے۔ مگر وطن سے دوری کا دکھ جھیل رہا ہوں اور اس دکھ سے مزے لے رہا ہوں۔“

”ہم نے عرض کیا نا کہ براہِ کرم ادبیت نہ بگھاریئے۔ چلنا ہے۔ بھائی کو آپ سے بات کرنی ہے اور میں ان سے وعدہ کر کے آیا ہوں۔“

”جواد حسین صاحب......“

”دیکھو میاں! ایک کسوٹی ہے شرافت کی، انسانیت کی، محبت کی۔ بڑی غلط فہمیوں کا شکار ہوں۔ کوئی بڑی سے بڑی قسم لے لیجئے، صرف آپ کو لینے کے لئے یہاں آیا ہوں۔“

”خیر کوئی ایسی بات نہیں ہے جو میری انا کا سوال بن جائے نہ ہی میں......“

”بس تو پھر تیاری کیجئے۔“ جواد حسین نے کچھ ایسا انداز اختیار کیا کہ شمس الدین کو تیار ہوتے ہی بن پڑی۔

”پتہ نہیں وطن کی مٹی کھینچ رہی ہے یا آپ کی محبت، آپ کا احترام، آپ کا وقار۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب سرزمین وطن پر قدم رکھوں تو پھر وہاں سے کہیں اور جانے کو جی نہ چاہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ جواد حسین نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

○●○

شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر علی شان ہی علی شان تھا اور علی شان خوب جیبیں بھر رہا تھا ان کی۔ حالانکہ غزالہ نے کئی بار اسے تنہائی میں روکا تھا اور کہا تھا۔ ”علی شان! میں نے تم سے پہلے بھی منع کیا تھا، یہ سب کیوں کرتے ہو؟ اتنا کچھ تو دے دیا ہے تم نے اماں کو، اب اور کیا دو گے؟“

علی شان نے ہنس کر کہا۔ ”یہ سب کچھ تمہارے قدموں کی خاک ہے غزالہ! اگر تمہارا صدقہ اس طرح اتر رہا ہے تو تم مجھے اس سے کیوں روکتی ہو؟ اتنا کچھ ہے میرے پاس کہ تمہاری تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ بلکہ اس کے بعد بھی تم پریشان رہو گی کہ کیسے خرچ کروں۔“

”پھر بھی، مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”میں نے تو ایک اور کام کا آغاز بھی کر دیا ہے۔ ایک کوٹھی خرید رہا ہوں تمہارے لئے۔ جہاں تمہیں اپنی دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔ یہ کوٹھی خریدنے کے بعد اسے آراستہ کروں گا اور اس کے بعد وہی کچھ کریں گے جو ہم نے سوچا ہے۔“

غزالہ کی آنکھوں میں خواب جگمگانے لگے۔ پہلے کبھی اس کے دل میں یہ امنگ نہیں جاگی تھی کہ کوٹھا چھوڑ کر وہ کوٹھی بسائے لیکن شاید جب دل کو دلدار مل جاتا ہے تو سارے خیالات دل میں آنے لگتے ہیں۔ شمشیرہ بیگم کی تقدیر ہی خراب تھی۔ غزالہ کے اندر کی عورت گہری نیند سو رہی تھی اور جب جگانے والا آیا تو وہ جاگ اٹھی۔ ایک بیٹی نے تو دل کے سارے چراغ بجھا دیئے تھے اب دوسری بیٹی دل کچلنے پر آمادہ تھی۔ تقدیر کی ماری تھیں، تقدیر کسی بھی مرحلے پر ساتھ نہیں دیتی تھی۔ دو تین بار انہوں نے سب سے قدیم ساتھی اور نوکروں اور دوستوں سے اس موضوع پر بات کی تھی۔ انہوں نے غلام شاہ سے کہا تھا۔

”غلام شاہ! زندگی گزر گئی جدوجہد کرتے ہوئے، بچپن تو جیسے گزرا تھا، گزرا ہی تھا، اماں مرحومہ بھی یہی سب کچھ کرتی ہوئی مر گئیں۔ مگر غلام شاہ! ہم نے کبھی اماں سے سرکشی نہیں کی۔ ذرا سی کوئی بات ہوئی، سر جھکا دیا، جو کہا سو کیا۔ البتہ ہماری تقدیر میں کوئی لڑکی ایسی نہیں جو ہمارے جیسی ہوتی۔“

”ہاں شمشیرہ بیگم! بدلتے ہوئے وقت کی کہانیاں الگ ہی ہوتی ہیں۔“

”غلام شاہ! اب تو کبھی کوثر جہاں بھی بہت یاد آتی ہے۔ کمبخت ماری نجانے کہاں جا کر

گم ہوگئی۔ کوئی ایسا نہیں ملا جو اسے تلاش کر لائے۔ اور وہ بھنگی کا جنا اکرام نجانے کہاں مر گیا۔ ارے کبھی کبھی تو ہمارے دل میں یہ خیال آتا ہے غلام شاہ! کہ ساری کی ساری انہی شاہ جی کی ملی بھگت نہ ہو۔ پہلے بیٹے کو غائب کیا اور اس کے بعد ماں بیٹی کو بلا لیا۔ وہ تو سینہ ٹھونک کر کہتے تھے کہ کوثر جہاں کو کوٹھے کی کمائی نہیں کرنے دیں گے۔ پوری کر لی انہوں نے اپنی ضد۔ اب ہمارے بس میں کیا ہے...... ہم کیا کریں؟''

غلام شاہ منہ پھاڑ کر شمشیرہ بیگم کو دیکھنے لگا۔ شیطانی دماغ تو خیر پایا تھا شمشیرہ بیگم نے۔ یہ بات واقعی غور کرنے کے قابل تھی۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے؟'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''بات تو تم نے سولہ آنے ٹھیک کہی ہے شمشیرہ بیگم! جی کو لگتی ہے۔ شاہ جی نے سکول جلایا، بھاگ گئے اور پھر نجانے کیا ہوا، پھر آمرے۔ اکرام کا تو خیر پتہ نہیں رہا، کوثر جہاں بھی غائب ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی تسنیم بھی۔ جی کو لگتی ہے بات تمہاری۔''

''ارے اس دنیا میں کوئی ایسا ہے جو شمشیرہ کی بھی سن لے۔ کوئی تو ان شاہ جی کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ الٰہی انہیں ہیضہ ہو، کچھ بھی تو نہیں ہوتا۔ ہٹے کٹے مسٹنڈے، مونچھوں کی نوکیں تانے ہیرا منڈی میں دندناتے پھرتے ہیں جیسے ابا کی جاگیر ہو اور جس کمبخت کو دیکھو ان کے گیت گا رہا ہے۔ ارے کسی کے دل کو نقصان پہنچے تو شمشیرہ بیگم کے دل کی بات سمجھے۔ ہم سے پوچھے کوئی کہ شاہ جی نے ہمیں کیا کیا نقصان پہنچائے ہیں۔''

''بھید تو کھلنا چاہئے شمشیرہ بیگم۔''

''بس پتہ چل جائے غلام شاہ کہ شاہ جی نے کوثر جہاں اور اکرام کو کہاں رکھا ہے تو میں بھی رنڈی کی جنی ہوں، ایسی آگ لگاؤں گی کہ سب جل کر بھسم ہو جائے گا۔ ایسا کام کروں گی کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔ جان کی بازی لگا دوں گی غلام شاہ! کچھ کر کے رہوں گی میں...... ایک بار پتہ لگ جائے۔''

''اس کے لئے کسی پیر فقیر کا سہارا لینا بہتر رہے گا۔'' حاجو نے جلدی سے کہا۔

''جھاڑو پھرے تیرے منہ پر حاجو...... دس بیس ہزار مانگ لو گے کسی پیر، فقیر کے لئے۔ ارے تم کس کام آؤ گے...... تمہیں تو سیخ میں اڑس کر بھونا بھی نہیں جا سکتا۔ خدا کی مار پڑے تم پر۔''

''سن لیا غلام شاہ تم نے...... جہاں محبتوں کے جواب میں یہ جملے سننے کو ملیں وہاں جی چاہے گا کچھ کرنے کو؟''

''ہاں، بات تو کسی قدر ٹھیک ہے۔''

''ارے تو کمبخت کے بچو کچھ کر کے تو دکھاؤ۔ پیر، فقیر، پیر فقیر، ارے کیا مل گیا ہمیں پیروں فقیروں سے...... اُلٹی جیب سے رقم ہی گئی۔ اچھی خاصی رقمیں نکل گئیں اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ چار روز کے لئے شاہ جی ہیرا منڈی سے بھاگے، پھر آمرے۔ خیر کوئی پکا کام ہو تو خرچ بھی کر دوں گی۔ ورنہ دمڑی دینے کی نہیں۔ سوچ لو اچھی طرح۔''

''ارے چھوڑو شمشیرہ بیگم! کون چکروں میں پڑے۔''

''ہاں، ہاں...... حرام کی کھانے کا تو شوق ہے۔ کب سے پڑے ہو اس دروازے پر اور اس دل میں وفا کا ایک ذرّہ بھی پیدا نہیں ہوا۔ ٹھیک ہے حاجو! جو کچھ گزر رہی ہے ہم پر وہ بھی گزر ہی جائے گی۔''

''نہیں نہیں شمشیرہ بیگم...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بیٹھیں، کچھ کرتے ہیں۔'' غلام شاہ نے کہا۔

علی شان سے ہونے والی گفتگو نے غزالہ کے دل کو گدگدایا تھا۔ بہن راز دار تھی، غزالہ نے شبانہ سے کہا۔

''شبانہ! ایک بات بتاؤ۔''

''کیا؟''

''کبھی تیرے دل میں ایسا کوئی خیال آیا کہ ہم بھی شریف زادیوں کی طرح کسی گھر کے ایک کمرے میں بیٹھیں، آگے پیچھے نوکر ہوں، لوگ بیگم صاحبہ، بیگم صاحبہ کہیں۔ ایک شوہر ہو ہمارا۔ باہر سے آئے تو مسکراتا ہوا۔''

شبانہ نے حیرت بھری مسکراہٹ سے کہا۔ ''کچھ ہو گیا ہے تجھے غزالہ!''

''کیا بک رہی ہے تُو...... کیا ہوا ہے مجھے؟''

''مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ تیرے دماغ کی بھی چولیں ڈھیلی ہوتی جا رہی ہیں...... اماں کو پتہ چل گیا تو وہ جوتے لگائیں گی کہ بھیجہ ناک کے راستے بہہ جائے گا۔''

''چھوڑو اماں کو...... اماں تو دولت بنانے کی مشین ہیں۔ ان کے جی میں تو بس ایک ہی

سماتی ہے، اس سے یہ لے لو، اُس سے یہ لے لو۔ ارے کوٹھیاں لے لیں گی تو کیا قبر بھی اس میں ہی بنائیں گی؟ کتنا جئیں گی آخر؟ ایک نہ ایک دن مر جائیں گی۔ اتنی جو محنت کر رہی ہیں ہم، سب کو پیس کر رکھ رہی ہیں، کیا کریں گی اس کا؟ شبانہ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ یہ اماں آخر ہیں کیا؟''

''ان کی اماں بھی ایسی ہی تھیں اور بھلا ہم بھی ایسے ہی ہوں گے...... ذرا ہمارے بچے وغیرہ ہو جانے دو۔'' شبانہ نے کہا اور غزالہ ہنس پڑی، پھر بولی۔

''میں ایسا نہیں کروں گی۔ کوثر باجی نے ہم سب کو راستہ دکھا دیا ہے۔ میں تجھے بتاؤں شبانہ کہ اس کوٹھے کی رونقیں جوانی تک ہیں اور رونقیں بھی کیا ہیں۔ ہر نظر ہمیں کپڑوں کے نیچے سے ٹٹولتی ہے۔ کسی کے دل میں ہمارے لئے محبت کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ ہمیں ناچتے ہوئے دیکھنے والے ہمیں لباس کے ساتھ نہیں دیکھتے بلکہ وہ چشم تصور سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت ہمارے بدن کی تھرکن اندر سے کیسی ہو گی۔ شبانہ! اگر ذرا بھی غور کرے تو تجھے خود احساس ہو گا کہ ہم لوگ دیوالی پر بننے والے ان شکر کے کھلونوں سے مختلف نہیں ہیں جنہیں ہر کوئی اپنی آنکھوں کے پانی سے گھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ عزت کی ایک نظر کیا ہوتی ہے کبھی کوئی اس کا مزہ چکھ کر دیکھے۔''

''کیا بات ہے...... بڑی تقریریں آ گئی ہیں آج کل۔'' شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں شبو! تقریریں نہیں ہیں، بلکہ بعض اوقات دل سے یہ آواز ابھرتی ہے کہ کبھی انسانوں کی طرح جی کر بھی تو دیکھیں۔''

''تیرے خیالات مجھے اچھے نظر نہیں آتے غزالہ۔''

''ٹھیک ہے...... تُو میرے ان خیالات کو برا سمجھتی ہے، سمجھ لے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ کبھی نہ کبھی زندگی میں ایک بار ضرور یہ خیالات تیرے دل میں بھی آئیں گے اور اس وقت تُو زندگی کے سنسان راستوں پر نگاہیں دوڑائے گی اور تیرا جی چاہے گا کہ کسی بھی راستے کے آخری سرے پر کوئی ایسا شخص تجھے کھڑا ہوا نظر آ جائے جو تجھے شرافت سے زندگی گزارنے کے لئے سہارا دے۔''

''تجھے کوئی ملا؟'' شبانہ نے پوچھا۔

''ہاں......''

''کون؟''

''علی شان۔'' غزالہ نے کہا۔

''وہ سہارا ہے تیرا؟ کیسی باتیں کرتی ہو؟ وہ تماش بین ہے، تیرے رقص، تیری آواز کا شوقین۔ وہ تجھے کیا سہارا دے گا...... کیا وہ تمہیں عزت کی نظر سے دیکھتا ہے؟''

''دیکھ، تُو میری بہن ہے۔ دل کی بات کسی اور کو کیا بتاؤں، ہم بہت جلد شادی کر رہے ہیں۔''

''ہیں......؟'' شبانہ نے منہ پھاڑ کر کہا۔

''ہاں شبانہ! علی شان خلوصِ دل کے ساتھ اس کے لئے تیار ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اور ہم لوگ بہت جلد شادی کر لیں گے۔''

''مجھے تو تیرا دماغ خراب ہی لگتا ہے...... تُو ایک ایسا اندھا کھیل کھیل رہی ہے جس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔''

''نہیں شبانہ! میں جو کھیل کھیل رہی ہوں اس کا نتیجہ بہت اچھا نکلے گا۔ وہ مجھے دل سے چاہتا ہے۔ وہ انتظامات کر رہا ہے۔ یہاں وہ جو کچھ دیتا ہے صرف اماں کا دل سنبھالنے کے لئے۔ وہ جانتا ہے کہ اماں کو ایک ہی چیز اس کی طرف مائل رکھ سکتی ہے اور وہ ہے دولت۔ شبانہ! وہ میرے لئے کوٹھی خرید رہا ہے، عزت سے مجھے اس کوٹھی میں رکھے گا۔ اگر آج میں اماں سے کہوں کہ اماں آج ہماری خواہش پوری ہو رہی ہے، ہمیں ایک خوبصورت رہائش گاہ مل رہی ہے، ہمیں عزت مل رہی ہے چلو ہم اس عزت کے گھر چلتے ہیں اور وہاں تم سب بھی ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، تم اس کوٹھے کو بھول جاؤ، ہیرا منڈی کو بھول جاؤ۔ پر اماں کبھی تیار نہیں ہوں گی شبانہ! انہیں عزت کی وہ زندگی کبھی راس نہیں آئے گی۔ انہیں تو اپنی جائیداد میں اضافہ کرنے کے لئے ایک کوٹھی درکار ہے۔ کوٹھی بے شک مل جائے گی لیکن وہ ان کی نہیں، میری ہو گی۔''

''تو تُو بھی چلی جائے گی غزالہ؟''

''ہاں شبانہ! اور اس کے بعد میں تیرے لئے بھی جدوجہد کروں گی۔ اگر تجھے زندگی میں کوئی عزت دینے والا مل جائے تو یقین کر، کوٹھے پر لعنت بھیج کر کسی جھونپڑے میں پناہ لے لینا، وہ اس جہنم سے کہیں اچھا ہو گا۔''

''تیرے اندر تو خاصا لاوا پک رہا ہے۔''

''ہاں...... میں ایسی نہیں تھی۔ مگر اب میرے دل میں یہ جذبہ، یہ احساس پیدا ہو چکا ہے۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ تجھے دعائیں دوں یا سمجھاؤں کہ سنبھل جا۔ ہم لوگوں کے لئے وہ دروازے کبھی نہیں کھلتے جو عزت کے دروازے ہوتے ہیں۔ ہم اگر اپنی زندگی کو آخری لمحے تک کسی کے لئے وقف کر دیں تو بھی ہمارے نام کے ساتھ ایک اور نام چپکا ہوا ہے، وہ ہم سے علیحدہ نہیں ہوگا۔ ہماری ہر جنبش کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ یہی کہا جائے گا کہ آخر ہم ہیں ناں ایک طوائف۔ غزالہ! بہت سی باتیں دل و دماغ تک خود بخود آ جاتی ہیں۔ میری بات پر غور کر لے، جلد بازی اچھی نہیں ہوگی۔ پتہ نہیں بیچاری کوثر جہاں کا کیا حال ہے۔ پتہ نہیں اس کا فیصلہ ٹھیک ہے یا غلط۔''

''میں جو فیصلہ کر چکی ہوں وہ آخری ہے شبانہ! اس پر عمل کروں گی، اپنی ذات پر تجربہ کروں گی۔ اگر اس تجربے میں ناکام رہی تو دوسری بات ہے، میری تقدیر۔ ورنہ کوشش تو پوری پوری کروں گی کہ اس تجربے میں کامیابی حاصل ہو۔''

یہ دونوں یہ باتیں کر رہی تھیں لیکن دروازے کے دوسری جانب شمشیرہ بیگم پر جو قیامتیں ٹوٹ رہی تھیں ان کی کوئی حد نہیں تھی۔ کسی کام سے آئی تھیں، ان دونوں بہنوں کو باتیں کرتے دیکھا، بس عادتاً سننے کے لئے رک گئیں اور جو کچھ سنا، اسے سن کر پیروں تلے سے زمین نکل گئی، آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ایک ایک بات سنی تھی انہوں نے دونوں لڑکیوں کی۔ تو یہ ہو رہا ہے...... یہ غداری ہو رہی ہے۔ یہ نمک حرامی ہو رہی ہے۔ الٹے قدموں واپس آ گئیں...... بہت خوفناک انکشاف تھا شمشیرہ بیگم کے لئے۔

○●○

ہنگامہ آرائیاں جاری تھیں۔ غیاث الدین، نظام الدین، جواد حسین، نادر شاہ، اللہ نواز سارے کے سارے ایک لڑی میں شامل ہو گئے تھے۔ سب اپنے اپنے طور پر کوششیں کر رہے تھے۔ جواد حسین، شمس الدین کو لینے لندن چلے گئے تھے۔ ان کا بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ نظام الدین، بیٹے کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ غرض یہ کہ سب اپنے اپنے معاملات میں مصروف تھے۔ اس وقت بھی غیاث الدین اپنے مخصوص کمرۂ نشست میں بیٹھے ہوئے تھے کہ عرشیہ جھجکتی ہوئی ان کے پاس آ گئی۔ بیٹی کو دیکھ کر غیاث الدین کی آنکھوں میں محبت امڈ آئی۔ ایک مظلوم بچی تھی جس کے لئے غیاث الدین نے دنیا کی ہر خوشی مہیا کر دی تھی لیکن تقدیر نے ایک ایسی بھیانک چال چلی تھی کہ باپ کے ہاتھ میں بیٹی کے لئے کچھ کرنے کا ذریعہ نہیں رہا تھا۔

بہر حال بہت محبت سے عرشیہ کو پاس بلایا اور بولے۔ ''آؤ بیٹا، آؤ...... خیریت...... کہو، کوئی بات تو نہیں ہے؟''

''ہے ابو جی۔''

''ہاں، ہاں بولو بیٹا، بولو...... کیا بات ہے؟''

''ابو ایک ایسی بات کرنے آئی ہوں آپ سے جس کے لئے مجھے خطرہ ہے کہ آپ ناراض نہ ہو جائیں۔''

''بیٹا! بڑا ضروری ہے؟''

''جی ابو۔''

''کیا بات ہے؟''

عرشیہ کچھ دیر جھجکتی رہی، پھر بولی۔

''ابو! میں آپ سے بالکل صاف صاف بات کروں گی۔ اسے میری گستاخی تصور نہ

کریں۔ میری ضرورت ہے اور مجبوری بھی ہے۔"

"ہاں، ہاں...... بولو۔"

"ابو جی! رب نواز شاہ لا پتہ چل گیا ہے۔ ہیرا منڈی میں رہتے ہیں وہ۔ میں آج تک کسی بھی مسئلے میں نہیں بولی اور خاموش رہی۔ ابو میں جانتی ہوں کہ آپ پر کیا گزر رہی ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں ابو کہ میری وجہ سے آپ کتنے اداس رہتے ہیں...... میں نے راتوں کو آپ کو دریچوں میں کھڑے دیکھا ہے۔ ابو! میرے دل کا براہِ راست آپ کے دل سے رابطہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ یہ شب گردی آپ کیوں کرتے ہیں۔ میری تقدیر کا حل تلاش کرتے ہیں ناں آپ؟ ابو! یقیناً آپ نے کوئی دعا مانگی ہوگی جس کے نتیجے میں ہمیں رب نواز شاہ کا پتہ چل گیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں ابو تو اب اس سلسلے میں، میں کوشش کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا کرنا چاہتی ہو عرشیہ؟" غیاث الدین نے پوچھا۔

"ابو! میں ہیرا منڈی جانا چاہتی ہوں۔ رب نواز شاہ سے مل کر ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں ان کے نکاح میں ہوں، مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔ آپ مجھے وہاں جانے کی اجازت دے دیں۔ ایک دفعہ ان سے بات کرلوں، ہوسکتا ہے میں ان کے ذہن میں کوئی ایسا شریفانہ جذبہ جگانے میں کامیاب ہوجاؤں جس سے میرا مستقبل مل جائے۔"

غیاث الدین گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگے اور اس کے بعد انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے...... تم اس سلسلے میں جس طرح بھی کرنا چاہو، میں تمہارے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہوں۔"

عرشیہ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی تھیں، تیاریاں کی گئیں، باپ کی مدد حاصل ہوگئی تھی۔ اب بھلا دنیا کی کیا پرواہ...... ڈرتے ڈرتے اس علاقے میں پہنچی جس کی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ یہ کہانیاں ایسی تھیں کہ شریف زادیوں کے چہرے شرم سے سرخ ہوجائیں۔ لیکن آج ایک شریف زادی اپنے قدموں سے وہاں تک پہنچی تھی۔ برقعہ پہنے ہوئے تھی۔ شاہ جی کا ڈیرہ بتا دیا گیا اور وہ ڈیرے پر پہنچ گئی۔ دروازے پر دستک دی تو ایک شخص نے دروازہ کھولا اور پُر احترام لہجے میں بولا۔

"جی بہن! فرمائیے؟"

"رب نواز شاہ صاحب سے ملنا ہے۔"

"آپ کون ہیں اور کہاں سے آئی ہیں؟"

"انہی کو بتاؤں گی۔" عرشیہ نے کہا اور دروازہ کھولنے والا دروازے سے ہٹ گیا۔ اس نے ایک برقعہ پوش خاتون کو احترام کے ساتھ اندر بلایا اور پھر اطلاع دینے چلا گیا۔ عرشیہ ایک گوشے میں کھڑی اپنے دل پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اس نے سامنے سے رب نواز شاہ کو آتے ہوئے دیکھا...... کبھی بس ایک جھلک دیکھی تھی اور یہ جھلک دل میں اتر گئی تھی۔ بلند و بالا قد و قامت، ورزشی بدن، چہرے پر وقار، کراچی یونیورسٹی کا ایک قابل فخر طالب علم رب نواز آہستہ آہستہ قریب پہنچ گیا۔

"آئیے، خیریت...... کہاں سے آئی ہیں؟ ہمارے لئے کوئی خدمت؟"

"کیا مجھے تھوڑی دیر کی تنہائی مل سکے گی؟"

"ہاں، ہاں...... کیوں نہیں، آپ اندر آجائیے۔" رب نواز شاہ نے کہا اور عرشیہ ان کے پیچھے پیچھے اندرونی حصے میں داخل ہوگئی۔ باقی لوگوں کو رب نواز شاہ نے روک دیا تھا۔ ایک کمرے میں لے جاکر وہ کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"تشریف رکھئے...... آپ کون ہیں؟ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بے دھڑک بتائیے، ہمیں آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی۔ ویسے یہ جگہ شریف زادیوں کے لئے نہیں ہے بی بی! لیکن آپ نے کسی مشکل مرحلے میں ہی یہاں آنے کی زحمت کی ہوگی۔"

"جی ہاں، میں ایک شدید مشکل کا شکار ہوگئی ہوں۔"

"فرمائیے؟"

عرشیہ نے نقاب الٹ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ رب نواز شاہ پر ایک بجلی سی گری تھی۔ یہ چہرہ آشنا نہیں تھا، یہ آواز بھی آشنا نہیں تھی، دیکھا ہی نہیں تھا انہوں نے اپنی ہونے والی بیوی کو۔ والدین نے فیصلہ کر دیا تھا۔ ذکیہ بیگم نے بیٹے سے کہا تھا کہ بیٹے بہو ہمارے ہر معیار پر پوری اترتی ہے۔ رب نواز نے گردن جھکا دی تھی۔ عرشیہ کو دیکھ کر آنکھیں جھک گئیں۔ نجانے کیوں دل کی دھڑکنوں میں ایک بے ربطگی سی پیدا ہوگئی تھی جو پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جھکی آنکھوں کے ساتھ انہوں نے کہا۔

"آپ اگر نقاب نہ بھی اٹھاتیں تب بھی ہم آپ کو سنتے۔"

''آپ میری طرف دیکھئے۔'' عرشیہ نے کہا اور رب نواز کی آنکھیں اٹھ گئیں۔ آواز کی نغمگی بھی بے مثال تھی۔

''جی فرمائیے...... ہم نے دیکھ لیا ہے آپ کو۔''

''پہچانا نہیں ہے؟''

''کیا ہم آپ کو پہلے بھی دیکھ چکے ہیں؟''

''روشن آنکھوں سے نہیں۔ البتہ ہم اس قابل نہیں ہیں کہ آپ ہمیں خوابوں میں دیکھتے۔''

''جی؟''

''جی رب نواز شاہ صاحب! میں آپ کی بیوی عرشیہ ہوں۔ وہ جس کے ساتھ آپ کا نکاح ہوا تھا۔ غیاث الدین کی بیٹی۔''

رب نواز شاہ پر جیسے فالج کا حملہ ہوا تھا...... وہ پاگلوں کی طرح عرشیہ کو دیکھنے لگے اور پھر دیر تک ان پر سکتے کا سا عالم طاری رہا۔

''آپ...... کیا آپ...... کیا آپ......؟''

''جی...... اب تو آپ نے پہچان لیا ہوگا ہمیں۔ آپ نے تو ہماری صورت پر تھوک دیا تھا، لیکن ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ کیا آپ انصاف فرما سکتے ہیں؟ کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارا کیا قصور تھا؟''

رب نواز شاہ تو نجانے کون کون سے جہانوں کی سیر کر رہے تھے۔ دل و دماغ پر ابھی تک قابو حاصل نہیں ہوا تھا، بس سکتے کے سے عالم میں بیٹھے تھے۔ عرشیہ نے پھر کہا۔

''ہم اپنی مرضی سے تو آپ کے پاس نہیں آئے تھے۔ جس طرح یہ سب کچھ ہوتا ہے اس طرح ہی ہوا ہے۔ ہمیں تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا، صرف ایجاب وقبول کے وقت ہم سے پوچھا گیا تھا، ہم تو کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ ہاں کہہ دیں اور ہم نے ہاں کہہ دیا کیونکہ یہ سب اسی طرح ہو رہا تھا جس طرح ہوتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کے بعد کے مدارج کیا ہوتے ہیں۔ ہمارا قصور ہمیں بتا دیجئے، ہم نے تو صرف وہ کیا جو ہمارے جیسی لڑکیاں کرتی ہیں۔ مگر بعد میں ہمیں بتایا گیا کہ ہم آپ کے قدموں میں رہنے کے قابل نہیں ہیں۔''

رب نواز شاہ اب اپنے آپ پر قابو پاتے جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ذہنی قوتیں بیدار ہو

رہی تھیں۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے، کیا سامنے آ گیا ہے، وہ کبھی جس کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ ڈری ڈری نگاہیں اٹھائیں، عرشیہ کو دیکھا، سب کچھ یاد آ گیا۔ ماضی کی کہانی تھی۔ لیکن عجیب لمحات تھے۔ عرشیہ کو تو انہوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا اور یہی وجہ تھی کہ پہچان نہیں پائے تھے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے...... کیا، کیا جائے؟ آہستہ سے بولے۔

''آپ غیاث الدین کی صاحبزادی ہیں؟''

''جی، میں وہی بدنصیب ہوں جس کی چوڑیاں پہننے سے پہلے ہی توڑ دی گئیں۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو ٹوٹی چوڑیاں ہی دیکھیں۔''

''مم...... مگر آپ یہاں کیوں آ گئیں؟ آپ جانتی ہیں کہ یہ کیسی جگہ ہے...... یہاں شریف زادیاں نہیں آتیں۔ یہ شریفوں کا علاقہ نہیں، یہاں آپ کو نہیں آنا چاہئے تھا۔''

''جہاں آپ موجود ہوں، وہاں میرے لئے کیا خطرہ ہو سکتا تھا؟ میں نے تو اللہ اور رسولؐ کے نام کے ساتھ آپ کا تحفظ حاصل کیا ہے۔ جب مجھے علم ہوا کہ آپ کا قیام یہاں ہے تو یہ جگہ میرے لئے سب سے زیادہ محفوظ ہو گئی۔ بتائیے، غلط پہنچی ہوں؟''

''ہماری بات اور ہے......'' شاہ جی کے لہجے میں ایک زہریلا تاثر پیدا ہو گیا۔

''کیا؟...... آپ کی بات کیا ہے؟''

''وہ کہا ہے ناں کسی نے کہ پہنچی وہیں پر خاک جہاں کا خمیر تھا۔ کیا آپ کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ ہم اسی جگہ کے رہنے والے ہیں...... یہی ہمارا مسکن ہے اور یہی ہمارا مدفن۔ ہمارا کیا ہے، ہمیں تو یہیں ہونا چاہئے تھا...... لیکن آپ شریف زادی ہیں۔''

''اگر آپ طنز میں یہ بات کہہ رہے ہیں تو ہماری چند باتوں کا جواب دے دیجئے گا۔ جب کوئی شریف زادی اللہ کی مرضی کے ساتھ کسی کے ساتھ منسلک کر دی جاتی ہے تو وہ کیا اس کے سوا اپنے دل میں کسی اور کا تصور بھی لا سکتی ہے؟ وہ الفاظ جو پروردگار کے نیک نام کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں، کیا ساری زندگی کے لئے ایک دوسرے سے منسلک نہیں کر دیتے؟ کیا دو اجنبی زندگی کی آخری سانس تک کے لئے یکجا نہیں ہو جاتے؟ رب نواز شاہ صاحب! ہمیں آپ کے نکاح میں دیا گیا تھا، آپ کے وکیل نے دو گواہوں کی موجودگی میں ہم سے پوچھا تھا کہ رب نواز شاہ ولد اللہ نواز شاہ کے عقد میں آپ کو بعوض مہر اتنا اتنا

دیا جاتا ہے کیا آپ نے قبول کیا؟ ہم نے تین بار گردن جھکا دی تھی اور اس کے بعد ہم نے یہ گردن ہمیشہ کے لئے جھکا لی۔ آپ بتایئے آپ نے ہم سے یہ حق کیوں چھین لیا...... ہم نے تو کبھی نہیں سوچا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں، کہاں سے آپ کا خمیر اٹھا ہے۔ ہم نے تو بس ایک ہی بات جانی تھی کہ اب ہمیں زندگی کا ہر لمحہ آپ کے ساتھ گزارنا ہوگا۔ ہم نے تو بس ایک دعا مانگی تھی کہ جب اس دنیا سے رخصت ہوں تو آپ کے ہاتھ ہمیں سنبھالے ہوئے ہوں۔ آپ نے ہمیں زندہ ہی اپنے آپ سے رخصت کر دیا۔ آپ جو کچھ بھی تھے، جو کچھ بھی ہیں، ہمیں کیا معلوم تھا۔ اگر کوئی ہمیں بتاتا تو ہم اس سے کہتے کہ ہم نے اقرار کیا، بات ختم۔ کسی کو ہمارے درمیان مداخلت کا حق نہیں ہے۔ آپ ہمیں جب طلب کرتے، ہم دل و جان سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ ہمیں کچھ بتایا ہی نہیں گیا تھا، بس اتنا کہا گیا تھا کہ ہمارے مجازی خدا نے ہمیں قبول نہیں کیا۔ ہمیں زندگی کی وہ خوشیاں نہیں مل سکتیں جو انسان کا مقدر ہوتی ہیں۔ بہت عرصہ گزار لیا ہم نے دوسروں کے رحم و کرم پر، طنزیہ نگاہوں کا شکار رہ کر۔ ہمیں تو کچھ علم ہی نہیں تھا۔ اب بتایئے، صرف اتنا بتا دیجئے کہ ہم کیا کرتے؟''

رب نواز شاہ پر اس وقت جو بیت رہی تھی وہ زندگی میں کبھی نہیں بیتی تھی۔ عرشیہ کے ان الفاظ کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اس کا ایک ایک لفظ سچ تھا۔ لیکن یہ بغلی گھونسہ اس طرح پڑے گا یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

''لیکن عرشیہ! ہم تو یہاں...... ہم تو یہاں......''

''کچھ بھی ہے، بس آپ کے پاس آ گئے ہیں۔''

''نہیں عرشیہ! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔''

''ہمیں کیا کرنا چاہئے تھا، اس کا مشورہ دینے والا کون تھا؟ کیا آپ نے کبھی ہماری طرف رخ کیا؟''

''بھ...... بھب...... بھلا میں کیا مشورہ دے سکتا تھا؟''

''ہم آپ کو مجبور کرنے نہیں آئے۔ آپ کے لئے دل میں ایک آرزو تھی کہ ہم ایک بار یہ بتا دیں کہ قدموں کی دھول قدموں سے جدا نہیں کی جاتی۔ ہم نے تو بس ایک التجا کی تھی جو آپ کے سامنے پیش کر دی۔ بعد کی زندگی کے بارے میں ہم نے خود فیصلہ کر لیا ہے۔ کم

از کم اور کچھ نہ ہوگا تو صرف ایک نگاہ آپ کو دیکھ تو لیا کریں گے۔''

''کک...... کک...... کیا مطلب؟'' رب نواز شاہ بوکھلا کر بولے۔

''ہم یہ سوچ کر آئے تھے کہ ہم ہیرا منڈی جائیں اور خدا کرے آپ ہمیں مل جائیں۔ آپ تک پہنچیں گے اور اگر آپ نے ہمیں قبول نہیں کیا تو اب ہم یہاں سے نکل کر سیدھے کسی کوٹھے والی کے پاس جائیں گے، اس سے کہیں گے کہ ہم جوان ہیں اور شکل و صورت کے بھی ایسے ہیں کہ کوئی ہم پر تھوکنا گوارہ نہیں کرے گا۔ ہمیں گانا بجانا سکھا دیا جائے، ہم بھی انہی ہزاروں کہانیوں میں شامل ہو جانا چاہتے ہیں جو ہم جیسی بدنصیب لڑکیوں کی کہانیاں ہیں۔''

''کک...... کک...... کیا بکواس ہے؟'' شاہ جی نے بری طرح بوکھلا کر کہا۔

''جی ہاں...... ہم نے یہی سوچا ہے کہ جہاں سے آپ کا خمیر اٹھا ہے ہم بھی اسی خمیر میں شامل ہو جائیں۔ ہم طوائف بن جائیں گے۔ بے شمار کہانیاں ایسی ہوتی ہیں شاہ جی جن میں بے گناہ لڑکیاں دوسرے لوگوں کے ہاتھوں ظلم و ستم کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ہم نے بھی ایک ایسی ہی کہانی منتخب کر لی ہے۔''

''آپ کا دماغ خراب ہے کیا...... آپ جانتی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''آپ کو ہمارے یہ الفاظ برے لگے...... بخدا ہمارے دل پر ٹھنڈک کی پہلی بوند پڑی ہے۔ گویا آپ کو یہ بات گوارا نہ ہوگی کہ ہم کوٹھے پر ناچیں گائیں۔''

''آپ کیسی فضول باتیں کر رہی ہیں...... یہ الفاظ کسی شریف زادی کے منہ پر زیب نہیں دیتے۔''

''ہمیں شریف زادی رہنے تو دیجئے۔ آپ خود بتایئے ہم کیسے شریف زادی رہیں؟''

''آپ کا گھر ہے، آپ کے والدین ہیں...... اور...... اور......''

''اور...... اور کیا؟''

''اور...... اور...... میرا مطلب ہے آپ کی تمام ضرورتیں۔''

''بس......''

''آپ بیٹھئے، براہِ کرم بیٹھئے۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔'' عرشیہ نے کہا اور بیٹھ گئی۔

"آپ بہت جذباتی معلوم ہوتی ہیں۔ اچھا اب یہ بتایئے آپ کیا پئیں گی؟"

"جو بھی پلا دیں، بخدا آنکھیں کھول کر پئیں تو آنکھیں پھوڑ دیجئے گا۔"

"آپ...... آپ مجھے بہت ذلیل کر رہی ہیں۔ اچھا رکئے، ہم ابھی آتے ہیں۔" شاہ جی باہر نکلے اور اس کے بعد انہوں نے شالے خان سے کہا۔

"گاڑی نکالو...... گاڑی۔"

"جی شاہ جی......"

شاہ جی واپس عرشیہ کے پاس آئے اور بولے۔ "آیئے۔"

پھر وہ خود گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہاں سے چل پڑے تھے اور اس کے بعد انہوں نے اپنی کوٹھی کے سامنے گاڑی روکی تھی اور اس کے بعد عرشیہ کو لے کر اندر آ گئے تھے۔

"آپ یہاں رہیں۔ ہم آپ کے لئے کوئی مناسب فیصلہ کریں گے۔"

"جو حکم۔" عرشیہ نے گردن خم کر دی۔

"دیکھئے یہاں باورچی خانہ ہے، زندگی کی ہر سہولت یہاں موجود ہے۔ ہم اپنے ایک آدمی کو یہاں بھیج دیں گے جو آپ کے پاس رہے گا۔ آپ اپنی ہر ضرورت اس سے بیان کر دیجئے گا۔"

"اور اگر آپ سے ملنے کو دل چاہے تو؟"

"نہیں...... اب ہم آپ سے زیادہ دیر دور نہیں رہیں گے؟"

○●○

شمشیرہ بیگم کے سارے وجود میں شعلے ابل رہے تھے۔ غصے کی شدت سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ دل و دماغ خاکستر ہوئے جا رہے تھے۔ اس کیفیت کو چھپانے کے لئے غسل خانے میں گھس گئیں، ٹھنڈے پانی کی دھاریں اپنے جسم پر بہائیں اور نجانے کب تک اسی طرح بیٹھیں رہیں۔ آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے کہ ان لڑکیوں نے کس طرح رسوا کیا ہے۔ کم بختوں میں سے ایک بھی تو کام کی نہیں نکلی۔ خدا انہیں غارت کرے...... خدا اسے بھی غارت کرے جس نے یہ بیج گھر میں بویا، یعنی کوثر جہاں۔ اور سب سے بڑی بات یہ رب نواز شاہ جب سے اس محلے میں آیا موذی، گھروں میں آگ لگا کر رکھ دی۔ حالانکہ علی شان والے معاملے میں شاہ جی کا کوئی دخل نہیں تھا لیکن حالات تو اسی وقت سے بگڑے۔

رب نواز نہ اکرام کو سہارا دیتا اور نہ کوثر جہاں کی ہمت پڑتی اور نہ اس کے بعد شمشیرہ بیگم کے کوٹھے پر یہ گندگی پھیلتی۔ آخر اور بھی تو کوٹھے والیاں ہیں، کہیں سے کوئی بات سننے کو نہیں آئی۔ ناچ گانا کرتی ہیں، پیسہ کماتی ہیں، عیش کر رہی ہیں، عزت ہے کوٹھوں کی۔ کیا کیا نہیں ہے ان کے پاس۔ اور یہاں جو کچھ ہے سب کچھ لٹ رہا ہے۔ نہیں شمشیرہ بیگم! کوئی گڑبڑ ہے، تمہاری اپنی ڈھیل ہے۔ کوثر جہاں نے دغا دیا اور اب یہ غزالہ بھی سازش کر رہی ہے اپنے ہی گھر کے خلاف۔

اور وہ علی شان...... ارے یہ سارے کے سارے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کم بختوں کو بدن پسند آتے ہیں، کھلونوں کی طرح کھیلیں گے اور جہاں بدن میں ڈھیل پیدا ہوئی بس نکلے ہاتھ سے۔ ان لمحات کی جو بھی قیمت ادا کرنی پڑے، بھلا ان رئیسوں کے لئے کیا مشکل ہے۔ یہی تو جیت ہے ہماری کہ انہیں الو بنائیں، اور اس سے پہلے کہ یہ ہمیں کھا جائیں، ہم انہیں کھا پی کر ختم کر دیں۔ کچھ فرق ہے...... کچھ تو ہے جس کی وجہ سے کوٹھے آباد ہیں۔ اری غزالہ تُو نے بھی میرے سینے پر خنجر ہی مارا۔ کون سی بد دعائیں دوں تجھے...... پر نہیں، ایسے نہیں چھوڑوں گی، اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گی تم سب سے۔

غسل خانے سے باہر نکل آئیں۔ غزالہ اور شبانہ کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ بات حلق سے نکل کر خلق میں پہنچ گئی ہے۔ بڑے کمرے میں غلام شاہ دیواروں کی صفائی کرا رہا تھا۔ ایک دو جگہ مکڑی کے جالے نظر آئے تو ملازم کو بلا لایا، ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا کہ شمشیرہ بیگم اندر داخل ہوئیں، غلام شاہ کا کام دیکھا۔ وہ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لال بھبوکا چہرہ دیکھا تو چونک پڑا، جالوں کی صفائی کرنے والے ملازم کو باہر بھیج دیا، دروازہ بند کیا اور شمشیرہ بیگم کو دیکھنے لگا۔

"جی شمشیرہ بیگم، وقت چاہے کتنا ہی بدل گیا ہو لیکن تمہارے چہرے کی لکیریں ساری زندگی محفوظ کی ہیں ہم نے اپنے دل و دماغ میں، کیا بات ہے۔"

"غلام شاہ! کہیں سے زہر کی پڑیا لا دو مجھے، تمہارا احسان ہو گا مجھ پر۔ ارے مجھ کمبخت ماری کو زہر دے دو۔ بلاوجہ اس زمین کا زہر بنی ہوئی ہوں۔ اللہ مجھے اٹھا لے...... اب نہیں جینا چاہتی اس دنیا میں...... ہائے کیسی خود پسند دنیا ہے غلام شاہ! کوئی بھی کسی کا نہیں ہوتا۔ بتاؤ کوئی ہوتا ہے کسی کا اس دنیا میں؟"

”بیٹھو بیٹھو، شربت لاتا ہوں بنا کر...... کچھ عجیب سی پریشانی نظر آ رہی ہے تمہارے چہرے پر۔“

”بھاڑ میں جھونکو شربت کو غلام شاہ...... بیٹھو میرے پاس۔ یہ پھلواری میں نے لگائی تھی، یہ باغ میں نے سجایا تھا غلام شاہ! اب اس باغ کو اجاڑ دینا چاہتی ہوں میں، آگ لگا دینا چاہتی ہوں اس گھر میں...... ناگن بن کر سارے سنپولیوں کو کھا لینا چاہتی ہوں غلام شاہ! یہ میری اولاد ہیں...... یہ سب میرے بدن کے ٹکڑے ہیں...... اور مجھ ہی کو جلا رہے ہیں۔ نہیں چھوڑوں گی...... نہیں چھوڑوں گی۔ اب ان دونوں ناگنوں کو بتاؤں گی کہ میں شیش ناگن ہوں۔“

”آخر کون دونوں ناگنیں...... مجھے بھی تو بتاؤ؟“

”کلیجے میں چھریاں چل رہی ہیں میرے...... زخمی ہو گئی ہوں اندر سے...... ہائے میرے مولا! میں کیا کروں؟“

”شمشیرہ بیگم...... شمشیرہ بیگم! آخر کیا ایسی بات ہے؟ کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟“

”ناگن بن جانا چاہتی ہوں میں...... سب کو ڈس لینا چاہتی ہوں، ایک ایک کو ڈسوں گی۔ اپنے باغ کو خود ہی اجاڑوں گی میں...... دوسرے کیسے اجاڑ سکتے ہیں...... خود ہی اجاڑوں گی میں انہیں۔“

”بتاؤ گی مجھے یا اپنا کلیجہ خود ہی جلائے جاؤ گی؟“

”راکھ تو ہو ہی چکی ہوں میں غلام شاہ! بس بکھرنے ہی والی ہوں۔ بس کلیجہ پھنک رہا ہے میرا...... زہر دے دوں گی اس حرام کے پلّے کو، زہر لانا پڑے گا تمہیں...... ارے جسے دیکھو میرے ہی سینے پر خنجر چلا رہا ہے...... کیا کروں آخر میں؟“

”خدا کی قسم سر پھوڑ لوں گا میں اپنا دیوار سے...... ارے بابا! منہ سے تو پھوٹو، کیا ہوا ہے؟“

”غلام شاہ! یہ غزالہ ہے ناں، اسے ڈھیل دی تھی ہم نے علی شان سے ملاقاتوں کی۔ جانتے ہوں ناں؟“

”اچھی طرح جانتا ہوں...... اُلّو کا چرخہ ہے، پھنس رہا ہے۔“

”نہیں میاں! اُلّو کا چرخہ وہ نہیں ہے، بلکہ وہ سیدھا چرخہ ہے، سیدھا چل رہا ہے، اپنا

کام سمیٹ رہا ہے، سب کو لپیٹ رہا ہے۔ ارے اصل میں اپنا ہی مال کھوٹا ہے، کسی سے کیا کہیں۔“

”غزالہ نے کوئی گڑبڑ کر دی؟“

”گڑبڑ کر دی ہے...... بھاگنے کا منصوبہ بنا رہی ہے یہاں سے بڑی بہن کی طرح۔ بڑی بہن ان کے لئے راستہ کھول گئی ہے ناں...... اب غزالہ نے علی شان سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے، بڑی محبت سے چھوٹی بہن کو بتا رہی تھی کہ علی شان کہتا ہے الگ رکھوں گا۔ چپ چپاتے شادی کروں گا۔ کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ شمشیرہ بیگم کی صورت پر لعنت بھیجو۔ سو غلام شاہ! لعنت بھیج دی ہماری بیٹی نے ہمارے منہ پر...... کسی بھی دن اب نکل جائے گی چپ چاپ۔ بس تھوڑا سا انتظار کر رہی ہے علی شان کی طرف سے ہری جھنڈی کا۔“

”ہیں...... کیا کہہ رہی ہو......؟“

”بس جو کہہ رہی ہوں یوں سمجھو ہو چکا ہے...... مگر نہیں...... نہیں غلام شاہ! قدرت نے میری آنکھیں وقت پر کھول دی ہیں۔ اب ایسا ہونے نہیں دوں گی میں۔ ارے سوچو تو سہی، یہ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا ہے...... میں نے جو کچھ بنایا ہے میں اسے بگاڑنا بھی جانتی ہوں...... مگر نہیں...... پاگل نہیں ہوں، غزالہ کو کچھ نہیں کہوں گی میں، لیکن اس ناگ کو ختم کر دوں گی...... ہر قیمت پر غلام شاہ! میں اس حرام کے پلّے کو زہر دینا چاہتی ہوں۔ آتا تو ہے ہی روزانہ، تم ذرا مجھے کہیں سے زہر کا بندوبست کر دو۔ دو منٹ میں تڑی بھڑی ہو جائے گا مردود۔ لاش اٹھا کر پھنکوا دیں گے خاموشی کے ساتھ۔ یہ کام میں کر لوں گی غلام شاہ! تم اس کی بالکل فکر مت کرنا۔ اور اس کے بعد اس غزالہ کو تو میں اچھی طرح ٹھیک کروں گی کہ زندگی بھر کسی سے عشق کا نام نہیں لے گی۔ بولو، لا دو گے کہیں سے زہر مجھے؟“

”پاگل ہوئی ہو کیا شمشیرہ بیگم! کوئی عقل کی بات کرو۔ بیوقوفی کی باتیں کر کے پوری زندگی گزار دی اور سمجھتی ہو اپنے آپ کو بہت سمجھدار۔“

”کیا بک رہے ہو تم...... حد سے آگے نہیں بڑھ گئے کیا؟“

”بدقسمتی تو یہی ہے تمہاری شمشیرہ بیگم! کہ تم نے ان سب کی حدیں مقرر کر دی ہیں جن کی حدیں نہیں ہونی چاہئیں۔ ساری زندگی بتا دی تمہارے ساتھ۔ بتاؤ کون سے تمہارے

کلیجے میں خنجر گھونپے؟ ہمیشہ ہی وفادار رہے تمہارے...... اب بے عقلی کی باتیں کرو گی تو بتاؤ اب بھی نہ بولیں؟"

"میں لٹ رہی ہوں غلام شاہ! میں لٹ رہی ہوں...... میں برباد ہو رہی ہوں۔ میرا سارا کیا دھرا مٹی میں مل رہا ہے اور تم بھی مجھ سے ہی کہہ رہے ہو۔ بتاؤ، آخر میں کیا کروں...... کیا کروں؟"

"دیکھو شمشیرہ بیگم! کوثر جہاں کو بھی اگر تم صحیح طریقے سے سنبھالتیں تو اس کے اندر وہ سرکشی پیدا نہ ہوتی۔ ناچ رہی تھی، گا رہی تھی، کچھ نہ کچھ آ ہی رہا تھا اس کے ذریعے۔ گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن تم پر ہمیشہ یہی دھن سوار ہوتی ہے کہ لاکھوں کماؤ۔ ارے بابا! تھوڑے تھوڑے کر کے حاصل کرو، زیادہ لالچ اچھا نہیں۔ اب غزالہ کے اوپر سختیاں کرو گی تو اس کے اندر بھی سرکشی پیدا ہو گی۔ کیا پایا تم نے کوثر جہاں پر سختی کر کے...... بولو، کیا ملا تمہیں؟"

"تو مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟ آخر کچھ تو بتاؤ، کوئی حل تو ہو۔ نکل جانے دوں اس کو بھی؟ شادی کر کے گھر آباد کرے گی اور اس کے بعد جب خوب لٹ پٹ جائے گی تو برباد ہو کر خود کوٹھے پر واپس آ جائے گی۔ مگر مجھے ملے گا کیا...... مجھے کیا ملے گا؟"

"دیکھو، اگر ہوشیاری سے کام لینا چاہتی ہو تو اپنے آپ کو پوری طرح سنبھال لو اور ذرہ برابر ظاہر نہ ہونے دو کہ تمہیں کسی بات کا علم ہو گیا ہے...... علی شان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ اسے کچھ پتہ نہیں چل سکا ہے، محبتوں کے ڈونگرے برساؤ ان پر...... ہر طرح کی آزادی دو انہیں اور اس کے بعد کوئی حل سوچ لیتے ہیں۔"

"آخر کیا حل ہے...... ہم حل ہی سوچتے رہ جائیں گے اور وہاں سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے...... کام ایک دو دن میں ہی ہو جانا چاہئے۔"

"کیا کام ہے غلام شاہ! یہ تو بتاؤ۔"

"بس میں جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے...... ایک بدمعاش ہے میرا جاننے والا۔"

"کون ہے؟"

"بس یوں سمجھ لو چھوٹے موٹے کام کر لیتا ہے...... بس کچھ رقم خرچ کرنی پڑے گی۔"

"تو کر دوں گی بھیا! اور کیا کروں؟"

"کم از کم دس ہزار روپے دینے پڑیں گے...... علی شان یہاں آتا رہتا ہے۔ ایسا کرتے ہیں کوئی نہ کوئی منصوبہ بنا لیتے ہیں۔ اس بدمعاش کو بھی ابھی یہاں بلا لیں گے اور علی شان سے جھگڑا کرا دیں گے۔ پیسے لے کر علی شان کے پیچھے لگ جائے گا۔ ہم اسے کہہ دیں گے کہ اسے اس قابل نہ چھوڑے کہ وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے یا پھر اپنی عقل سے سوچ سکے...... سر پھاڑ دے، ہاتھ پاؤں توڑ دے۔"

"ٹھیک ہو گا تو پھر آ جائے گا۔"

"نہیں...... اسے اس قابل نہیں چھوڑا جائے گا کہ وہ دوبارہ یہاں آ سکے۔ دس ہزار میں کام نہ بنے تو پندرہ ہزار میں تو بن ہی جائے گا۔"

"دیں گے...... دیں گے...... جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس۔"

"تو پھر بات کر لوں؟"

"ہاں، جب تم کہو گے پیسے دے دوں گی۔" شمشیرہ بیگم نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

غلام شاہ کا دل اچھل رہا تھا خوشی سے، ظاہر ہے پندرہ ہزار کی رقم ہاتھ آ رہی تھی۔ ویسے لاہور میں مختلف علاقوں میں اس طرح کے لوگ مل جاتے تھے، کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ غلام شاہ کے ذہن میں حالانکہ کچھ تھا نہیں لیکن پیسے تو ہاتھ آئیں، بعد میں جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ غلام شاہ، شمشیرہ بیگم کو خوب دلاسے دیتا رہا، پھر بولا۔

"ایسا کرو شمشیرہ بیگم! پانچ ہزار روپے مجھے دو تاکہ میں اسے ایڈوانس دے دوں اور دس بیس روپے مجھے بھی دے دو، کرائے وغیرہ کے کام آئیں گے۔"

بہرحال شمشیرہ بیگم نے ہمیشہ کی طرح نجانے کس دل سے یہ پیسے ادا کئے تھے اور اس کے بعد غلام شاہ باہر نکل آیا۔ دروازے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ حاجو کی صورت نظر آئی۔ غلام شاہ کا دل دھک سے ہو گیا، کم بخت حاجو ساری باتیں سن رہا تھا...... یہ اس کی پرانی عادت تھی اور اس وقت بھی یقینی طور پر اس نے سب کچھ سن لیا تھا۔ غلام شاہ نے حاجو کو دیکھا تو حاجو آنکھ مار کر مسکرا دیا۔

"آؤ باہر چلتے ہیں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟" غلام شاہ نے پوچھا۔

"آؤ بھئی، آؤ۔"

غلام شاہ دل ہی دل میں اسے کوستا ہوا باہر نکل آیا۔ کوٹھے سے نیچے اترے اور ایک مخصوص جگہ پہنچ گئے جہاں ایک بند دکان کے سامنے لگے ہوئے تختے پر نشستیں ہوا کرتی تھیں۔

"مبارک ہو...... مگر پیارے بھائی اکیلے اکیلے کھانے کی سوچ رہے تھے...... میں کہتا ہوں مل بانٹ کر کھانا اچھی بات ہوتی ہے۔"

"کک...... کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"دیکھو جانِ من، وہ جو کہتے ہیں نا کہ اللہ نے دانے دانے پر مہر لگا دی ہے۔ تمہاری کمائی میں سے آدھا آدھا۔"

"جان نہیں چھوڑو گے تم کسی طرح میری...... قسم اللہ کی کسی دن تمہاری بھی چھٹی ہی کرنا پڑے گی۔"

"کر دینا، زندگی بھر روتے رہو گے ایسے یار کو۔ اچھا خیر چھوڑو، اب یہ بتاؤ منصوبہ کیا ہے؟"

"کیا منصوبہ ہے...... کوئی نہ کوئی بندہ تو تیار کرنا ہی پڑے گا۔ ہزار دو ہزار لے کر کام کر ڈالے گا۔ پھر دیکھیں گے کہ کیا ہونا چاہئے۔"

"ہوں......" حاجو نے کہا اور پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔

○●○

جواد حسین شمس الدین کو لے کر پاکستان واپس آ گئے۔ لاہور ایئرپورٹ پر اترے جہاں انہوں نے اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ اجتماع نادر شاہ کے گھر پر ہی ہوا اور اس کے بعد نظام الدین، شمس کو گھر لے گئے۔ شمس بہت خوش نظر آ رہا تھا، گھر میں بھی ایک دم بہار آ گئی تھی۔ بہت سے ایسے تھے جنہوں نے طویل عرصے کے بعد شمس الدین کو دیکھا تھا۔ سب کے سب واری صدقے ہو رہے تھے۔ جب طوفان گزر گیا تو نظام الدین نے شمس الدین کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ہر طرف سسپنس پھیلا ہوا تھا...... شمس الدین نے ابھی تک باپ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ بلانے کی وجہ کیا ہے...... نظام الدین نے ہی شمس الدین سے کہا۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے تمہیں اس طرح طلب کیوں کیا ہے؟"

"نہیں ابا جان...... میری یہ جرأت کہ میں آپ سے کوئی سوال کروں۔"

"کیا جواد حسین نے تمہیں اس سلسلے میں کچھ بتایا؟"

"آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں...... ایک لفظ بھی نہیں۔ نہ میں نے ان سے پوچھا۔ میں اپنے باپ کے لئے غیروں سے کیوں پوچھتا پھروں...... میں پاکستان نہیں آنا چاہتا تھا، آپ نے بھی ہمیشہ میرے ساتھ تعاون کیا۔ اگر آپ سخت لہجے میں مجھ سے یہ سوال کرتے تو بھلا میری مجال کہ میں جواب نہ دیتا۔"

"بیٹے! خدا خوش رکھے تمہیں، میرا خیال ہے کہ اس بات کو تمہیں ماننے میں کوئی عار نہیں ہوگا کہ تم میری اولاد ہو۔"

"بالکل ہوں ابا جان...... اور مجھے اس پر فخر ہے۔"

"بیٹا! تم کہہ رہے تھے کہ اگر میں تم سے کبھی سخت لہجے میں پوچھتا تو تم مجھے پاکستان نہ آنے کی وجہ بتا دیتے۔"

"جی ابا جان!"

"تو اب میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے وجہ بتا دو۔"

"ابا جان! شاید میرے اندر پہلے کبھی اتنی جرأت نہ ہوتی لیکن میری بھی عمر اچھی خاصی ہو گئی ہے اور پھر بات آپ کے حکم کی تعمیل کی ہو رہی ہے اور میں آپ کی توہین کا تصور بھی نہیں کر سکتا...... میرے نزدیک آپ کی توہین یہ ہے کہ آپ کے کسی سوال کا میں جھوٹ جواب دوں۔"

"خدا تمہیں تمہاری اس شرافت کا اجر دے...... بتاؤ بیٹے! مجھے بتاؤ۔"

شمس الدین کے چہرے پر خجالت کے آثار پھیل گئے۔ دیر تک گردن جھکائے سوچتے رہے، پھر انہوں نے کہا۔

"ابا جان! یورپ سے آیا تھا، چچا ظہیر الدین پر بہت اعتماد کرتا تھا، چچا مجھے سیر و سیاحت کرا رہے تھے۔ پاکستان میری زندگی ہے۔ پنجاب ساری دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ دیکھنے والی آنکھ اگر اس کا حُسن دیکھے تو اس کے بعد کسی اور طرف دیکھنا بھول جائے۔ مجھے اپنا وطن دیکھنا اتنا ہی پسند ہے ابا جان۔ چچا ظہیر الدین نے میری انگلی پکڑی اور مجھے ایک ایسی جگہ لے گئے جس کے بارے میں، میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ اس کے بارے میں، میں بالکل نہیں جانتا تھا لیکن کبھی اس راستے سے بھی گزر نہیں ہوا تھا۔ شاہی مسجد کے پہلو میں

ہیرا منڈی آباد ہے۔ ابا جان! آپ کو تفصیل تو معلوم ہی ہے لیکن آپ کے حکم کے مطابق میں عرض کر رہا ہوں، وہاں میری ملاقات ایک خاتون سے ہوئی۔ میں نے جان بوجھ کر خاتون کے قریب جانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ مجھے ایک عجیب سے سحر میں گرفتار کر دیا گیا تھا۔ آپ یقین کیجئے بالکل غلطی سے یہ سب کچھ ہوا...... لیکن ابا جان! میں ذرا مختلف مزاج کا انسان ہوں۔ یہ تو مجھے پتہ چل گیا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے، گناہ عظیم ہے اور نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ابا جان! ہو گیا...... اور میں سچ بتاؤں آپ کو کہ میں سحر زدہ ہو گیا اور یہ سحر مجھ پر ہمیشہ کے لئے قائم ہو گیا...... ابا جان! یہاں میری بے بسی شروع ہوئی۔ میں اگر پاکستان واپس آتا تو اپنے آپ کو ان خاتون سے ملنے سے نہیں روک سکتا تھا...... اور آج بھی میری یہی کیفیت ہے۔ آپ کو حق ہے کہ یہ جوتے اٹھا کر دس میرے سر پر مار دیجئے۔ چونکہ میں جانتا ہوں کہ ظہیر الدین چچا کو کس قدر سخت وست کہا گیا تھا لیکن جھوٹ بھی تو نہیں بول سکتا آپ کے سامنے ابا جان! میں صرف اسی وجہ سے پاکستان واپس نہیں آیا کہ آپ کی حکم عدولی کر کے کہیں پھر سے کوئی گستاخی نہ کر بیٹھوں۔"

"جزاک اللہ...... جس قدر عزت و توقیر تم نے میری کی ہے شمس الدین! بس کیا کہوں اس بارے میں سوائے اس کے کہ اللہ تمہیں اس کی جزا دے بیٹے! ایک بڑی گمبھیر الجھن آ پڑی ہے، جس کے لئے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

"حکم فرمائیے ابا جان!"

"وہ لڑکی جس سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی، اس کا نام کوثر جہاں تھا نا؟"

"جی یہی نام تھا۔"

"بیٹے! محسوس مت کرنا...... میں تمہارا باپ ہوں...... لیکن بعض حقائق سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ جو الفاظ میں تم سے کہنے جا رہا ہوں وہ مجھے نہیں کہنے چاہئیں۔ لیکن مجبوری ہے۔ اس رات کا صلہ کوثر جہاں کو تمہارے ایک بیٹے کی شکل میں ملا...... سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"

"جی......؟" شمس الدین کے جسم کا جیسے سارا لہو خشک ہو گیا...... چہرے کی سفیدی قابل دید تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے باپ کو دیکھتے رہے، پھر بولے۔ "آپ کیا فرما رہے ہیں...... میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔"

"کوثر جہاں کے بطن سے تمہاری اولاد پیدا ہوئی۔ ایک بیٹا، آفتاب و ماہتاب کا مجموعہ...... سمجھ لو تمہارا بچپن۔ دعوے سے کہتا ہوں کہ تمہاری زندگی کا پہلا دن بھی ایسا ہی ہو گا جیسا اکرم کا تھا...... بڑی الجھی ہوئی کہانی ہے۔ وہ تمہارا بیٹا ہے، اس میں کوئی شک و شبہ کی بات ہی نہیں ہے۔ ماشاء اللہ ایسا حسین، ایسا خوش رو کہ انسان دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے...... جوان ہو چکا ہے، عجیب و غریب حادثے کا شکار ہوا ہے۔"

نظام الدین نے ایک ایک لفظ شمس الدین کو بتایا اور شمس الدین تصویر حیرت بنا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھتے رہے۔ نظام الدین تفصیل بتا رہے تھے اور شمس الدین پاگلوں کی طرح ان کی صورت دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ مکمل داستان ختم ہوئی اور چوہدری نظام الدین نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! سمجھ گئے نا کہ صورتحال کس طرح گڈمڈ ہوئی ہے...... تم یہ سمجھ لو کہ قدرت نے ایک عجیب کھیل کھیلا ہے...... خیر ان باتوں کو چھوڑو، میں تمہیں آگے کے بارے میں تفصیل بتانا چاہتا ہوں...... ماننا نہ ماننا تمہاری ذمے داری ہے۔ سماج، معاشرے، روایتیں سب کو جوتوں تلے روند کر میں چاہتا ہوں کہ تم کوثر جہاں سے شادی کر لو...... کوثر جہاں کو بہو بنا کر میں اس گھر میں لاتے ہوئے خوشی محسوس کروں گا اور اس کے بعد تم اکرام کو اپنی پناہ میں لے لو۔"

"آپ نے رب نواز شاہ صاحب کے بارے میں بھی بتایا ہے۔"

"ہاں...... وہ بھی ایک عجیب و غریب داستان ہے۔" نظام الدین صاحب نے اللہ نواز شاہ کے بیٹے کی کہانی سنائی اور شمس الدین آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکنے لگے، پھر ہنس کر بولے۔

"یہ ہمارے ہی وطن کی داستانیں ہیں۔ یورپ میں بھلا یہ خوبصورت موڑ کہاں۔"

"مجھے جواب دو، کیا تم کوثر جہاں سے نکاح کے لئے تیار ہو؟"

شمس الدین کے چہرے پر شرم کے آثار پھیل گئے، پھر انہوں نے کہا۔ "بھائی جان! بہت مرتبہ میری شادی کے تذکرے اور چرچے ہوئے، میں نے معذرت کی۔ لیکن اب آپ سے کہہ چکا ہوں کہ وہ سحر میرے ذہن پر اب بھی طاری ہے اور میں اس سے دور نہیں ہو سکا۔ یہ نہیں کہوں گا کہ آپ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں، بس یہ سمجھ لیجئے کہ ایسا کر کے مجھے

بھی دلی خوشی ہوگی۔"

"گڈ...... تیاریاں کرو...... لاہور واپس چلتے ہیں۔ بڑی ہنگامہ آرائیاں ہوں گی۔ اکرام ایک حادثے کا شکار ہوا تھا...... ذہنی توازن بگڑا ہوا ہے لیکن صرف چند روز کی بات ہے، ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"خدا کرے...... کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

"سب کچھ ہوگا...... فکر مت کرو۔" نظام الدین صاحب نے کہا۔

○●○

اللہ نواز شاہ بیٹے کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کس قدر سخت مزاج اور سنگدل ہے۔ جس بات پر اڑ گیا، بس اڑ گیا۔ دوسرا کوئی طریقہ تو ممکن نہیں ہو سکتا اور کوئی طریقہ ایسا نہیں جس سے اسے منایا جا سکے۔ بہرحال اپنی جیسی کوششوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے ستار جگنی کا سہارا پکڑا تھا اور ستار جگنی اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑے غضب کی چیز تھا۔ ادھر تو وہ رب نواز شاہ کے لئے کام کر رہا تھا اور رب نواز شاہ جیسے آدمی کو اس نے ایک دم شیشے میں اتار لیا تھا تو اُدھر اللہ نواز شاہ کے مقصد کی تکمیل کر رہا تھا۔

بہرحال پچھلے دن شمشیرہ بیگم سے ملاقات ہوئی تھی اور اس نے شمشیرہ بیگم کو کافی حد تک شیشے میں اتار لیا تھا۔ طوائفوں کے اصول بھلا ستار جگنی سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا چنانچہ اللہ نواز شاہ کے تعاون سے اس نے شمشیرہ بیگم کو بہت کچھ دے دیا تھا...... بہرحال شمشیرہ بیگم کی طرز کی رپورٹ اللہ نواز شاہ کو دی گئی تو اللہ نواز شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"واقعی یار جگنی! تو بڑے کام کی چیز ہے۔ تیرے لئے یہ کون سا مشکل کام تھا...... ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزاری ہے تُو نے۔"

"مذاق نہ اڑائیں شاہ جی! اب یہ وقت اللہ اللہ کرنے کا تھا، گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا وقت تھا تو آپ نے اس راستے پر لگا دیا۔"

"مجبوری ہے یار! ہم کون سا ہنسی خوشی ان چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔"

"کمال کی بات ہے...... باپ بیٹے خوب چکر چلائے ہوئے ہیں۔ ادھر تو رب نواز شاہ جی نے مجھے شمشیرہ بیگم کے پیچھے لگایا ہے اور ہر طرح کے اخراجات ادا کر رہے ہیں۔ بہرحال اس بدمعاش عورت کو دیکھو، منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، اداؤں کے ویسے ہی

ڈونگرے برسا رہی ہے۔"

اللہ نواز شاہ جیسے سنجیدہ آدمی بھی ہنس پڑے۔

بہرحال ستار جگنی برابر آتا جاتا تھا۔ اس وقت بھی جب وہ آیا تو اللہ نواز شاہ ہنس پڑے۔

"اُڑا لیں...... اُڑا لیں مذاق، اُڑا لیں۔"

"نہیں...... اس بات پر ہنس رہا ہوں کہ شمشیرہ بیگم پر کیا گزرے گی تمہیں اس عالم میں دیکھ کر۔"

"کہہ رہا ہوں نا...... مذاق اُڑا لیں...... سب کچھ آپ کے لئے کر رہا ہوں۔ خیر اب آیئے۔ آپ کا بیٹا کافی خطرناک ہے۔ بڑی داستانیں اُڑی ہوئی ہیں ہیرا منڈی میں ان کی۔"

بہرحال خوب اچھی طرح ٹھونک بجا کر ستار جگنی رب نواز شاہ کے پاس پہنچا۔ دن کا وقت تھا۔ ابھی ہیرا منڈی میں زندگی کا آغاز نہیں ہوا تھا، شالے خان نے دروازہ کھولا اور اسے پہچان کر اندر بلا لیا۔

"ابے یار ستار جگنی! یار تُو آدمی ٹیڑھا ہے، منع کر دیا تھا کہ یہاں مت آیا کر، کوٹھی ٹھیک ہے۔ جب ضرورت ہوگی وہاں بلا لیا کریں گے تجھے...... خبر بھجوا دیں گے۔ خیر کہو کیا حال ہے، بیٹھو۔"

"شاہ جی! بات اصل میں یہ ہے کہ اب ذرا دل کڑھتا ہے ان باتوں سے۔"

"چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے کبھی نہیں جاتا۔ پرانے پاپی ہو، پاپ کہاں پیچھا چھوڑتے ہیں۔"

"خدا کی قسم ان چیزوں سے کنارہ کشی کر ڈالی تھی۔"

"ہمارے سامنے جھوٹ بول رہے ہو...... کنارہ کشی کر ڈالی تھی تو پھر ہیرا منڈی میں کیا جھک مارنے آئے تھے؟"

"نہیں، بس یونہی راہ گزر تھی، نجانے کیسے ادھر قدم اٹھ گئے۔"

شاہ جی نے قہقہہ لگایا اور بولے۔ "تو پھر ہیرا پھیری کسے کہتے ہیں...... دیکھ ہمارے سامنے یہ چترّ بازی نہ کیا کر، ورنہ کھوپڑی کے کتنے ہی ٹکڑے کر دیں گے۔ خیر شمشیرہ بیگم کو ایسے دبوچو کہ پانی نہ مانگے۔ لین دین کی بات ہو تو کہہ دینا کہ محل کھڑے کرا دو گے۔ ابتدا

میں اتنے مارو سسری کے منہ پر کہ ہر بات کا یقین آجائے۔"

"یہ ساری باتیں تو اپنی جگہ ہیں شاہ جی! مگر میں ایک سوال آپ سے کروں گا کہ آپ کو اس سے کیا دلچسپی ہے؟ دیکھئے، آپ نے ابتداء ہی سے دوست کہا ہے ہمیں...... یہ کیا کہ اپنی بات تو دل میں چھپا کر رکھ لی اور دوسروں کو چڑھا دیا سولی پر۔ خیر ہم تو مان گئے، یاروں کے یار ہیں...... مگر آپ نے ابھی تک یاری کا ثبوت نہیں دیا۔"

"بڑی کتر کتر کئے جا رہا ہے...... کیا پوچھو گے ہمارے بارے میں؟"

"شاہ جی! یہی بتا دیں کہ آپ نے یہاں بسیرا کیوں کر رکھا ہے؟"

"فکر کرنا اچھی بات نہیں، جلدی کھل جائیں گے تم پر۔"

"ٹھیک ہے شاہ جی! ہم خود ہی کھولیں گے آپ کو۔"

بہر حال یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں، ستار جگنی کو بھرے پر چڑھا دیا گیا تھا اور وہ اپنا کام کر رہا تھا۔ لیکن اس نے شمشیرہ بیگم سے جو کچھ کہا تھا اس سے ان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ بہت کچھ دے رہا تھا وہ...... اور پھر اس نے جو کچھ شمشیرہ بیگم سے کہا تھا اس سے شمشیرہ بیگم کی آنکھوں میں روشنی جل اٹھی تھی۔ ستار جگنی نے کہا تھا کہ عالم نوجوانی میں وہ جو کچھ نہیں کر سکا اب اس کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ شمشیرہ بیگم نے یونہی پوچھ لیا کہ وہ کیا ہو گا تو ستار جگنی نے کہا۔

"شمشیرہ بیگم! انسان اپنے خیالات کا شکار ہوتا ہے۔ زمانہ نوجوانی میں ہمیں تم سے جو عشق تھا ہمیں اس کے تحت یہ آرزو تھی کہ آسمان سے تارے توڑ لائیں تمہارے لئے لیکن جو چاہتے تھے، نہ کر سکے۔ پھر خاموش ہو کر بیٹھنا پڑا۔ تم نے بھی منہ نہ لگایا...... اور اب جب تمام ذمے داریوں سے فراغت حاصل ہوئی تو جی میں آئی کہ تمہارا حق تمہیں دے دیں اور یہ بتا دیں کہ سچے عاشق کیا ہوا کرتے ہیں...... اب اس عمر میں تم خود سمجھ لو کہ دل کے علاوہ ہمارا کیا رشتہ ہے تم سے......"

شمشیرہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ "ستار! محبت کرنے والا مل جائے تو انسان کو زندگی میں اور کیا درکار ہوتا ہے۔ تم نے عمر بڑھا دی اس محبت کا اظہار کر کے۔ سب کچھ مل گیا مجھے...... شکریہ ادا کرتی ہوں تمہارا۔ ایک آرزو میں جی رہی تھی کہ کوئی خوبصورت سی کوٹھی لاہور کے کسی حسین علاقے میں ہو...... ساری آرزوئیں پوری کر دیں اس پاک پروردگار نے، بس

ایک آرزو جی میں لے کر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گی۔"

"خدا نہ کرے شمشیرہ بیگم...... خدا نہ کرے۔ تم سلامت رہو ہزار برس اور ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار...... ایک کوٹھی کیا ہے، اور کچھ کہو، کائنات لٹا دوں تمہارے لئے۔ دیکھ لینا، اپنی پسند کی جگہ دل میں رکھنا، بہت جلدی بندوبست کر دیں گے اور تمہیں خوشخبری سنائیں گے کہ تمہاری یہ آرزو بھی پوری ہو گئی۔ ویسے بچوں کی اچھی خاصی تربیت کر دی ہے تم نے...... ایک اور بھی تو لڑکی تھی تمہاری، کیا نام تھا اس کا، شاید کوثر جہاں...... آواز تو اس کی بہت ہی سریلی تھی۔ کہاں چلی گئی؟"

آخر کار ستار جگنی نے رب نواز شاہ کی خواہش پوری کرنا شروع کر دی۔ کوثر جہاں کے نام پر شمشیرہ بیگم کے چہرے پر غم کی پرچھائیں پھیل گئی۔ کہنے لگیں۔

"بس، یہ اولاد بھی کمبخت ایسی چیز ہوتی ہے...... ایک ایسی مکھی جو نہ نگلی جائے نہ اگلی جائے...... انسان اپنے آپ کو مار دیتا ہے اس کے لئے اور پھر اولاد بڑی ہو کر صرف اپنی مرضی کی مالک بن جاتی ہے۔ ارے کیا کچھ نہیں سکھایا اسے...... ان دوسری بچیوں بے چاریوں کو تو کچھ بھی نہ ملا، جو ناز نخرے میں نے کوثر جہاں کے اٹھائے تھے۔ بھٹک گئی کسی کے کہنے پر اور گھر چھوڑ دیا۔ رونق اجاڑ گئی ہماری۔ سب سے زیادہ اسی کے پرستار تھے۔ استادوں کو نجانے کیا کیا کچھ دے کر ہر فن سکھایا تھا اسے...... یہ نہ پتہ تھا کہ یوں منہ موڑ جائے گی۔ اب تو ایک غم کی پرچھائیں بن کر رہ گئی ہے وہ...... پتہ نہیں کہاں چلی گئی۔

"شمشیرہ بیگم! وہ چلی گئی اور تم اس طرح خاموش ہو کر بیٹھ گئیں؟"

"کیا بتائیں جگنی! بس یوں سمجھ لے، مجبوری کا نام شکریہ۔ کچھ ایسی غائب ہوئی کہ پتہ نشان ہی نہ رہا۔ یوں لگا جیسے کبھی ہم میں تھی ہی نہیں۔ مگر میں جانتی ہوں، اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔"

"خیر شمشیرہ بیگم! اگر میں آپ کے کسی کام آ سکا تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ کون ہے...... کس کا ہاتھ ہے اس میں؟"

"بس کیا بتائیں ستار جگنی! نام لیتے ہوئے جان کانپتی ہے...... محلے پر ایسا رعب ڈال رکھا ہے۔ کسی کے سامنے منہ کھولو گے تو کوئی تمہاری نہیں سنے گا، سب اس کے حاشیہ بردار ہیں۔"

''آخر وہ ہے کون...... ہمیں بھی تو آزما کر دیکھو شمشیرہ بیگم!''

''رب نواز شاہ ہے، اس کا نام...... یہیں ہیرا منڈی کے نکڑ پر رہتا ہے...... بہت بڑا بدمعاش ہے۔ نہ پولیس اس کا کچھ بگاڑ سکی نہ غنڈے۔ ایک نہ ایک روگ جی کو لگا رہتا ہے۔ کیا بتائیں۔''

ستار جگنی حیران رہ گیا تھا، پھر تھوڑی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ بولا۔

''تو کیا تمہارے خیال میں رب نواز شاہ نے اسے غائب کیا ہے؟''

''بس کیا کہیں، وہی کہا نا کہ آنکھوں دیکھی بات نہیں ہے، بس اندازہ ہے۔''

''لو یہ کون سی بات ہے شمشیرہ بیگم! اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو ہم تمہیں یہ کام کر کے دکھائیں گے۔ مگر ایک بات ہے، دل سے دل تک کا راستہ پکا ہونا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم تو تمہارے لئے دین ایمان لٹانے پر تل جائیں اور تم ہم ہی سے دغا بازی کرو۔''

''ایسی توقع رکھتے ہو مجھ سے؟''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم سچ کہہ رہی ہو اور تمہیں کوثر جہاں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔''

''تمہاری جان کی قسم، آنکھیں پھوٹ جائیں، کیڑے پڑ جائیں، بدن سے کوڑ ٹپکے اگر ہمیں کوثر جہاں کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔ اب تم سے کیا جھوٹ بولیں گے ستار جگنی! نوجوانی کا سرمایہ ہو تم۔ تم سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے ہمارے لئے۔''

ستار جگنی خاموشی سے یہ سنتا رہا۔

بہرحال پھر وہ چلا گیا اور شمشیرہ بیگم کی سانس سینے میں نہ سمائی۔ جو کام لڑکیاں نہ کر سکی تھیں، شمشیرہ بیگم اس عمر میں خود کر رہی تھیں۔ ستار جگنی کے انداز سے پتہ لگتا تھا کہ بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہے، جان توڑ کر عشق کر رہا ہے، کچھ دے کر ہی مرے گا۔ حالانکہ کوٹھے پر اور بھی بہت سے لوگ تھے لیکن جی جان سے پیارے حاجو اور غلام شاہ ہی تھے جن سے دل کی بات چھپائے نہ چھپائی جاتی تھی۔ کوستی تھیں، پیٹتی تھیں، گالیاں دیتی تھیں اور وہ دونوں بھی ڈھیٹ کہ سب کچھ سنتے اور کھی کھی کر کے گزار دیتے۔ نجانے کب کا ساتھ تھا۔ انہی کو پکڑا۔ وہ دونوں بھی ٹوہ میں لگے ہوئے تھے۔ بھلا اتنا دلچسپ واقعہ ہو اور ان دونوں کو خبر نہ ہو...... شمشیرہ بیگم نے انہیں آواز دی ہی تھی کہ دونوں کے دونوں ان کے سامنے پہنچ گئے۔ شمشیرہ بیگم کے چہرے پر سرخیاں پھیلی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں نوجوانی کے آثار منجمد ہو گئے تھے...... غلام شاہ نے ایک دلخراش آہ کھینچی اور سینے پر ایک ہتھیلی ماری اور دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ شمشیرہ بیگم جھینپ گئی تھیں۔

''کمبخت نوٹنکی کے جوکر لگتے ہو...... وہی ساری جوکروں جیسی حرکتیں، کیا مصیبت پڑ گئی تم پر؟''

''ہائے شمشیرہ بیگم! یہ آنکھوں کے گلابی ڈورے، یہ رخساروں پر اتری ہوئی شفق کی سرخیاں، یہ ہونٹوں پر لرزتے ہوئے شبنم کے قطرے، تیری صبح کہہ رہی ہے، تیری رات کا فسانہ۔''

''اے حاجو! ذرا جوتی اٹھائیو کوئی پھٹی ہوئی۔''

''ہاں، ہاں...... ٹھیک ہے...... جب ستار جگنی جیسے لوگ مل جائیں تو ہمارے لئے پھٹی ہوئی جوتی کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔''

''اچھا بیٹھو، شرافت سے۔ ذرا دل کی بات سنو۔ ہائے میں کیا کروں، کوئی بھی تو اپنا نہیں ہے، کسے حالِ دل سناؤں۔''

''تو یوں کرو شمشیرہ بیگم! اب تو تم مر ہی جاؤ۔ کیا فائدہ اس دنیا میں جینے کا جب آنکھوں سے اندھی ہی ہو گئی ہو۔'' غلام شاہ بھی تنک کر بولا۔

''ہائے ہائے...... کیا بکے جا رہے ہو...... تم خود نہ مر جاؤ، میں کیوں مروں؟''

''دل جان لٹائے دے رہے ہیں تم پر اور تم کہتی ہو کہ کوئی اپنا ہی نہیں۔ اب کیا مصیبت نازل ہوئی ہے، کچھ منہ سے تو پھوٹو۔'' شمشیرہ بیگم کو اس وقت غلام شاہ کی باتیں بھی بری محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ کہنے لگیں۔

''دیکھو غلام شاہ! آنکھوں کی اندھی نہیں ہوں میں، دیکھ رہی ہوں کہ دنیا کے رنگ ڈھنگ کیا چل رہے ہیں۔ یہ ستار جگنی باؤلا ہی ہو گیا ہے۔ باتیں تو بڑی اونچی اونچی کر کے گیا ہے۔ دیکھو کتنا نبھاتا ہے...... ارے حاجو، غلام شاہ! میں تو یہ سوچتی ہوں کہ کچھ ہاتھ لگ جائے تو اچھا ہے۔ پاگل بن رہا ہے تو فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔''

''ہاں، ہاں...... بالکل۔ بھلا اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ کام دکھاؤ اپنا شمشیرہ بیگم! پریشان کیوں ہو؟ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔''

”ذرا الجھ گئی ہوں غلام شاہ! اب ان پر توجہ دوں یا اس مری کے لئے علی شان کو دیکھوں، مارتے ہیں تو اپنے ہی مارتے ہیں۔ ذرا دیکھو اس غزالہ کو، اس نے بھی کل پرزے نکال لئے۔ یہ اولاد اس طرح منہ پھیر لیتی ہے، انسان کو پتہ ہو تو گردن مروڑ دے۔ کمبخت راتوں کو جاگو، اپنی زندگی ختم کرو، ان کے لئے محنت کرو، ان پر لٹا دو۔ اس کے بعد ذرا انہیں دیکھو، کہہ رہی ہیں بی بنو کہ گھر بسائیں گی اپنا، الگ رہیں گی۔ ارے کبھی طوائف کو بھی کسی نے رکھا ہے؟ کتے کی موت ماری جائیں گی، پھر روتی پیٹتی گھر واپس آ جائیں گی، پھر کلیجہ پھٹے گا ہمارا...... میں یہ سوچ رہی ہوں غلام شاہ، ابھی وہ کام روک دو جس کے لئے تم نے پیسے لئے ہیں۔ اگر کسی بدمعاش سے بات کر لی ہے تو کہہ دو اسے کہ ابھی تھوڑے دن کے لئے ارادہ نہیں ہے، پہلے ذرا اس ستار جگنی کی گردن پر چھری چلا دیں اس کے بعد علی شان کو دیکھوں گی۔“

”سوچ لو، ایک طرف کما رہی ہو تو دوسری طرف گنوا رہی ہو۔ علی شان کا معاملہ بھی اگر آگے بڑھ گیا تو روکنا مشکل ہو جائے گا۔“ غلام شاہ نے جلدی سے کہا۔ وہ رقم جو آ رہی تھی اور جس کا ایڈوانس ہو چکا تھا وہ بھی ڈوبی جا رہی تھی۔

”تم نے ان بدمعاشوں کو ایڈوانس تو دے ہی دیا تھا نا...... ان سے کہو تھوڑے دن کے بعد ان سے کام لیں گے۔“

”مگر کرو گی کیا؟“

”علی شان سے بات کروں گی۔ دیکھوں گی کہ کہاں سے کہاں تک گیا ہے...... کیا لے دے سکتا ہے۔“

”بے کار ہے...... بے کار ہے۔ پھر بعد میں کہو گی کہ غلام شاہ تم نے مشورہ نہیں دیا۔“

”جھاڑو پھرے تمہارے منہ پر...... جو دل میں آیا، بکے جا رہے ہو۔ جو میں کہہ رہی ہوں وہ ٹھیک ہے بس۔ ہزار پندرہ سو کی کوئی بات نہیں ہے، تین ہزار روپے اور دے دوں گی۔ ڈوبتے ہیں تو ڈوبیں، جانے دو بس۔“

حاجو نے غلام شاہ کی طرف دیکھا اور غلام شاہ نظریں چرانے لگا۔ حاجو کو شاید اس نے ایک پائی نہیں دی تھی اور کہا تھا کہ پیسے تو ابھی ملنے والے ہیں۔

”دیکھو...... ایک مشورہ دیں، ذرا آزمانا ان ستار جگنی صاحب کو...... کہیں دل پشوری کرنے نہ آ گئے ہوں۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں...... دیکھوں گی، میں کون سی مری جا رہی ہوں۔ بس ایک بار بات کر لوں ذرا، اس کے بعد فیصلہ کروں گی۔ ہو سکتا ہے یہ کام ایک دو دن میں ہی ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے...... جیسی تمہاری مرضی کرو۔“

”دیکھو برا مت ماننا غلام شاہ! میری مشکل بھی تو سمجھو...... کیا آ پڑی ہے مجھ پر۔ بیٹیاں ہیں تو اپنے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ آج غزالہ ہے، کل یہ شبانہ بھی ایسی ہی آنکھیں دکھائے گی۔ اب میں سب کو سمجھ چکی ہوں، ایک ایک کو سمجھ لیا ہے میں نے۔ بیکار ہے ان کے لئے مرنا۔“ شمشیرہ بیگم نے کہا اور غلام شاہ اسے گھورنے لگا۔

غلام شاہ پر دوہری مار پڑی تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ حاجو کو پتہ چل گیا تھا کہ شمشیرہ بیگم نے اسے کوئی رقم ایڈوانس دی ہے، دوسری بات شمشیرہ بیگم نے جو پلٹی کھائی تھی وہ پریشانی کی بات تھی۔ علی شاہ کے سلسلے میں کچھ رقم ہاتھ میں آنے کا آسرا پیدا ہو گیا تھا...... لیکن اب ستار جگنی کی وجہ سے شمشیرہ بیگم بہکنے لگی تھیں اور غزالہ کے مسئلے کو ڈھیل دے رہی تھیں۔ اس بات پر غلام شاہ پریشان تھا، باہر نکل کر حاجو نے کہا۔

”دیکھو شاہ جی! برے کام میں بھی اگر دیانتداری نہ برتی جائے تو سمجھ لو مشکل ہو جاتی ہے۔ بدنیتی سب کچھ ڈبو دیتی ہے۔“

”بک بک کئے جا رہے ہو...... ہم نے کون سی بددیانتی کی ہے، بس ذرا چھری تلے دم تو لو۔ بات سچی ہے، ہم نے سوچا کہ پہلے علی شان کا کام کر دیا جائے اس لئے جو کچھ بھی شمشیرہ بیگم سے ملا تھا وہ اس بدمعاش کو دے دیا ہے۔“

”بے کار باتیں...... بیکار باتیں۔ غلام شاہ! ہم، تم بہت عرصے سے ساتھ رہ رہے ہیں۔ اب ایسا نہیں ہے کہ تم ہمیں ہی چونا لگا جاؤ۔“

”حاجو یار! ایک دنیا میں تُو جی جلانے کے لئے آ گیا ہے۔ کیا ضروری تھا کہ تیری پیدائش ہوتی۔ اور اگر پیدا ہو ہی گیا تھا تو کم از کم ادھورا تو نہ رہ جاتا بونا کہیں کا۔ بکواس کر کر کے ناک میں دم کر دیتا ہے۔“

”ٹھیک ہے غلام شاہ...... جو جی چاہے کہہ لو۔ اللہ کی دین ہے، اس نے تمہیں دیو کی

طرح لمبا بنا دیا لیکن عقل سے پیدل کر دیا۔ ایک منٹ میں سارا کام خراب ہو جاتا ہے، تم نے دیکھ لیا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن اب یہ بتاؤ کہ اب ہوگا کیا؟"

"عقل کی بات ہے نا...... اپنے اس ہاتھی جیسے بدن پر ناز کرتے ہو۔ ہماری کھوپڑی سے سوچو، سب کچھ وہی ہو جائے گا جو ہم نے سوچا ہے۔"

غلام شاہ نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا۔ غصہ تو بہت آیا تھا، حاجو حد سے زیادہ بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ لیکن اس وقت صورتحال ذرا خراب ہو گئی تھی، کہنے لگا۔

"تو پھر بتاؤ آخر کیا، کیا جائے؟"

"دیکھو پہلی بات تو یہ کہ یہ جو ستار جگنی ہے نا، اس کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ شمشیرہ بیگم کے پاس چکر لگا رہا ہے۔ نجانے کیا کیا سبز باغ دکھا دیئے ہیں...... پہلے تو یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ اس میں کچھ دم ہے یا نہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"شمشیرہ بیگم اصل میں یہ سن کر پھول گئی ہیں کہ ستار جگنی انہیں کوٹھی خرید کر دے گا۔ یار ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ عورت کوٹھی کا کرے گی کیا؟"

"چھوڑ حاجو! بعض آرزوئیں انسان کے دل میں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں اسے خود یہ پتہ نہیں ہوتا کہ یہ آرزو کیوں اس کے دل میں پیدا ہوئی ہے۔"

"فلسفہ بگھار رہے ہو...... خیر چھوڑو، ہمیں ان باتوں سے کیا۔ ویسے کیا خیال ہے کہ غزالہ اور علی شان کا معاملہ کس حد تک آگے بڑھ سکتا ہے؟"

"جوانی کی عمر ہے، کوثر جہاں جو کچھ کر کے نکل گئی، اس کے بعد تعجب نہیں ہے کہ غزالہ بھی وہی کھیل، کھیل کر دکھائے۔"

"بس یہی شمشیرہ بیگم کو سمجھاؤ۔ ٹھیک ہے اگر ستار جگنی نے کوٹھی دے بھی دی تو شمشیرہ بیگم سے پوچھو کہ کیا اس کے بعد زندگی بھر کا سہارا ہو جائے گا اس بات سے؟ بس یہی سمجھاؤ کہ علی شان کا کھیل پورا ہو جانا چاہئے...... تم ان بدمعاشوں سے یہ معاملہ طے کر چکے ہو۔ بہرحال وہ تو غنڈے بدمعاش ہیں، ان کا تو کام ہی یہ ہے کہ مارو پیٹو، پیسے کماؤ۔ اگر کام کرانے والا پیچھے ہٹے تو پھر اس کی ٹھکائی کر دو۔ معمولی بات نہیں ہوتی غلام شاہ! اپنی جان

بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔"

"بات بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو...... یہ لچے لفنگوں کا کھیل ہی غلط ہے۔ خیر تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔"

"دھار تو دیکھ لیں گے مگر کچھ مال بھی ڈھیلا کرو۔"

"یار! یہ پانچ سو رکھ لو فی الحال۔"

"پانچ سو؟"

"اس وقت رکھ لو پیارے بھائی! بعد میں حساب کتاب کر لیں گے۔" غلام شاہ نے کہا اور حاجو نے پانچ سو روپے لے کر جیب میں ڈال لئے۔ لیکن دل میں سوچا تھا کہ بیٹے غلام شاہ! میرا قد چھوٹا ہے، بونا ہوں میں لیکن عقل بڑی ہے۔ وہ کھیل، کھیل کر دکھاؤں گا کہ تجھے بھی نانی یاد آ جائے گی۔

شمشیرہ بیگم بھی چالاک ہی تھیں، غلام شاہ نے بڑی ہوشیاری سے یہ بات ان کے کانوں تک ڈالی۔

"شمشیرہ بیگم! تم پر تو جوانی واپس آنے لگی ہے۔"

"مر جاؤ تم کٹ کٹ کر۔ نظر لگا دو۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال رہی ہوں ورنہ پتہ نہیں کتنے روگ لگے ہوئے ہیں جان کو۔"

"خیر ایک بات تو ہم بتا دیں تمہیں...... ستار جگنی تو ہے ہی۔ کیا کہا جا سکتا ہے اس کے بارے میں کب آنکھیں بدل لے۔ زمانے بھر کا تجربہ ہے اسے۔ ہماری سمجھ میں تو یہ بات ہی نہیں آ رہی کہ پرانی عاشقی اب اس عمر میں آ کر کیسے جوان ہو گئی۔"

"تم سے ایک کام کہا تھا، ذرا اتنا تو معلوم کرو کہ اس کی مالی حیثیت کیا ہے۔ تم لوگ ہی میرے جاسوس ہو، تمہارے ساتھ مل کر ہی زندگی گزارتی ہوں۔"

"ہاں شمشیرہ بیگم! اڑی وڑی کی ساری باتیں ہم پر لا دیتی ہو۔ تمہارا برسوں کا طریقہ کار ہے اور جہاں ملائی کھانے کا موقع آتا ہے، اکیلی ہی کھا لیتی ہو۔"

"ڈوب کر مر جاؤ تم غلام شاہ! تمہارے منہ سے کبھی کوئی شرافت کی بات نکلتی ہی نہیں، ہمیشہ اسی چکر میں رہتے ہو کہاں سے رقم ماری جائے۔ کون سا میں اکیلے ہی کھا جاتی ہوں...... عیش تو کرا رہی ہوں تمہیں۔"

''جس طرح عیش کر رہے ہیں اللہ ہی جانتا ہے شمشیرہ بیگم! خیر چھوڑو، اب ان باتوں میں کیا رکھا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے، معلوم کریں گے ستار جگنی کے بارے میں...... لیکن تمہیں کچھ سمجھانا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔''

''تو سمجھاؤ ناں، میں کب تمہاری بات سے انکار کرتی ہوں۔''

''دیکھو شمشیرہ بیگم! اگر ستار جگنی تمہیں کچھ دے بھی دیتا ہے تو ایک کوٹھی میں تمہارا گزارا ہو جائے گا ساری زندگی؟ کیا اس کے بعد تم کوٹھا چھوڑ دو گی؟''

''توبہ توبہ...... کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''چھوڑنا پڑے گا شمشیرہ بیگم! چھوڑنا پڑے گا۔''

''کیوں فضول باتیں کر رہے ہو؟''

''اب یہ غزالہ جا رہی ہے، اس کے بعد شبانہ چلی جائے گی کہیں نہ کہیں دل لگا کر۔ اس سے پہلے کوثر جہاں جا چکی ہے۔ کوثر جہاں کے جانے سے ہی دل بڑھا ہے غزالہ کا ورنہ اس سے پہلے تو وہ خوابوں میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔''

شمشیرہ بیگم کا دل دھک سے ہو گیا، بولیں۔ ''بھئی یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہو...... واقعی یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ارے اس کوٹھی میں رہ کر میں کیا بین بجاؤں گی؟ کیا قبرستان بناؤں گی اس کوٹھی کو اپنے لئے جو مجھے حاصل ہو گی؟''

''یہی تو سمجھانا چاہ رہے ہیں تمہیں مگر تم ہو کہ ستار جگنی کی باتوں پر مست ہو گئی ہو۔''

شمشیرہ بیگم سوچ میں ڈوب گئیں اور پھر بولیں۔ ''آج علی شان سے بات کرتی ہوں، دیکھو اصل میں یہ نہیں چاہتی ہوں میں کہ بلاوجہ کسی کو نقصان پہنچاؤں۔ ویسے اب اگر علی شان تلا ہی ہوا ہے اپنی زندگی گنوانے پر تو پھر مجبوری ہو گی۔ آج بات کر لوں گی میں۔''

''تمہاری مرضی ہے...... ورنہ بات تو جو ہے کھل کر سامنے آ چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے بدمعاشوں کو اپنا کام کرنے دو۔''

''اے غلام شاہ! کبھی کبھی کلیجے پر ہاتھ پہنچ جاتا ہے اور سوچنے لگتی ہوں کہ آخر کسی نہ کسی ماں کی اولاد ہیں...... اب بگڑے ہوئے ہیں، کوئی کیا کرے؟''

''ٹھیک ہے...... تم زیادہ سمجھدار ہو۔ جو جی چاہے کرو۔''

اور اس رات شمشیرہ بیگم نے سچ مچ علی شان کو پکڑ ہی لیا۔ بڑی محبت سے اسے اپنے

پاس بٹھایا۔ مجرا ختم ہو گیا تھا، تماش بین جا چکے تھے۔ علی شان عموماً دیر تک رکتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ غزالہ تو اب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگی تھی۔ بڑے اطمینان سے علی شان کو اپنے کمرے میں لے جاتی۔ ویسے بھی ماں کی طرف سے اجازت ملی ہوئی تھی۔ ویسے یہ دوسری بات ہے کہ وہ اجازت ذرا دوسری تھی۔ غزالہ اسی اجازت سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ آج بھی جب فراغت ہوئی تو شمشیرہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''علی شان میاں! ذرا ہمیں بھی تم سے کام ہے۔''

''جی شمشیرہ بیگم...... فرمائیے؟''

''بھئی آج تو تھوڑا سا وقت ہمیں بھی دو۔ ہمیں بھی تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ غزالہ! تم جاؤ اپنے کمرے میں۔ مجھے علی شان سے بات کرنی ہے۔ اس کے بعد یہ تمہارے کمرے میں آ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے......'' غزالہ نے کہا۔ شمشیرہ بیگم نے بالکل ہی تنہائی حاصل کر لی۔ علی شان کسی قدر پریشان نظر آنے لگا تھا۔ شمشیرہ بیگم نے اس سے کہا۔

''دیکھو، دو باتیں میں تم سے کرنا چاہتی ہوں، وہ اچھی نہیں ہیں، بری لگیں گی تمہیں۔ لیکن کرنا ضروری ہے۔''

''جی فرمائیے۔''

''ایک بات کا وعدہ کرو کہ جو کچھ کہو گے سچ کہو گے۔''

علی شان نے گہری نگاہوں سے شمشیرہ بیگم کو دیکھا اور بولا۔ ''سچ سننے کی ہمت ہے آپ میں؟''

''آج ہمت کی ہے...... سچ سننا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... پھر میں وعدہ کرتا ہوں، جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا۔''

''تو پھر یہ بتاؤ کہ غزالہ کو کس حد تک چاہتے ہو؟''

''غزالہ سے میری چاہت کی کوئی حد نہیں ہے۔''

''اچھا جواب ہے...... بھلا تم نے کبھی سوچا ہے کہ ایک طوائف کا عشق کیا ہوتا ہے۔''

''مجھے علم تھا کہ آپ ایسے ہی سوال کریں گی۔ ایک طوائف کا عشق جہاں تک ہوتا ہے، میرا خیال ہے اس کا تجربہ مجھے آپ سے زیادہ ہے۔''

شمشیرہ بیگم کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بولیں۔

''ہاں میاں! نوجوانی کی عمر میں بھی اگر انسان ایسے الفاظ ادا نہ کرے تو کیا بڑھاپے میں کرے گا؟ خیر ٹھیک ہے، چلو میں یہ بات نہیں کرتی۔ تمہاری اپنی رائے کیا ہے غزالہ کے بارے میں؟''

''آپ نے چونکہ سچ پوچھ لیا ہے مجھ سے اور میں نے وعدہ کرلیا ہے اس لئے آپ کو بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ غزالہ میری زندگی کی ساتھی ہے۔ میں اس سے شادی کروں گا، اسے الگ گھر میں بساؤں گا، وہ عزت دوں گا جو بیویوں کو دی جاتی ہے۔''

''لمبی کہانی ہے...... اگر ذرا سا تجربہ کر ڈالو اس کہانی پر تو ساری بات کھل کر سامنے آ جائے گی۔''

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

''بس اتنا کہ نوجوانی میں یہ دعوے کئے ہی جاتے ہیں...... محبت ایسی ہی چیز ہوتی ہے اور میں اس میں کوئی شک نہیں سمجھتی کہ تمہیں غزالہ سے محبت ہے۔ لیکن زمانہ ذرا مختلف چیز ہے۔ زمانہ تمہاری محبت کے اس انداز کو قبول نہیں کرتا۔ زمانے کے سوچنے کا اپنا ایک انداز ہے۔ طوائف معاشرے کی ایک ایسی گھناؤنی ہستی سمجھی جاتی ہے جس سے ہر شخص بچتا ہے۔ تماش بین دل بہلانے کے لئے ہمارے پاس آ جاتے ہیں۔ جو نوجوان اور ناتجربے کار ہوتے ہیں وہ گردن گردن تک اس دلدل میں دھنس جاتے ہیں۔ بعض کو آخر وقت سمجھ آ جاتی ہے، بعض آخری وقت تک سمجھ نہیں پاتے۔ انجام ایک ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ کوئی جذباتی قدم اٹھا بھی بیٹھتے ہیں تو بعد میں انہیں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ پھر انہیں اپنی حماقت پر شرمندگی ہوتی ہے۔ سارا خاندان مخالفت پر اتر آتا ہے۔ برادری حقہ پانی بند کر دیتی ہے۔ طوائف سے اگر کوئی اولاد بھی پیدا ہو جائے تو وہ کبھی عزت نہیں پاتی۔ خاندان والے کبھی اسے اپنے خاندان میں جگہ نہیں دیتے۔ اور پھر یہ سلسلہ نسلوں تک چلتا ہے۔ بہت سے ایسے واقعات ہوتے ہیں۔ نوابوں، رئیسوں اور راجاؤں کی داستانیں تو ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ جذباتی قدم اٹھا ڈالتے ہیں لیکن ان کا ایک انداز بھی ہوتا ہے۔ طوائف کو زیادہ سے زیادہ کوئی داشتہ کے طور پر رکھ سکتا ہے، اخراجات اٹھاتا ہے اس کے، عیش و عشرت دیتا ہے اور جب جی بھر جاتا ہے تو معاوضہ دینے کے بعد ایک طرف ہٹ

جاتا ہے۔ طوائف کی اپنی سوچ بھی یہی ہوتی ہے۔ اس سے آگے وہ سوچے تو یہ ناتجربے کاری کی بات ہے۔ تمہاری ہی بات لے لو، چلو دنیا کو چھوڑو، شادی کرلو گے تم غزالہ سے، الگ گھر بھی لے دو گے، اسے ماں باپ سے بھی چھپاؤ گے؟''

''جی، بولتی رہئے۔''

''میرا مطلب ہے ماں باپ سے چھپاؤ گے نا یہ بات؟''

''ظاہر ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے...... اس کے بعد؟''

''اس کے بعد جب صورتحال ایسی ہوگی کہ بتانا ضروری ہے تو کھل کر بتا دیا جائے گا۔''

''اور اس کے بعد؟'' شمشیرہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس کے بعد کچھ نہیں ہوگا...... میں بہت ضدی ہوں، اپنی مرضی کا مالک ہوں۔''

''اماں باوا ہیں تمہارے؟''

''جی کیوں نہیں...... بتا چکا ہوں آپ کو۔''

''ناک میں دم کر دیں گے۔ جینا حرام کر دیں گے تمہارا...... دولت اور جائیداد سے عاق کر دیں گے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔''

''یہ تم کہہ رہے ہو صرف...... زمانے میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ سارے رشتے ناتے دار نکو بنا دیں گے۔ کبھی نہیں جی پاؤ گے رشتے داروں کے بغیر۔''

''شمشیرہ بیگم! میں ذرا مختلف مزاج کا آدمی ہوں۔ میں وہ کر دکھاؤں گا جو کسی نے نہیں کیا۔''

''ہائے، ہائے...... ایسا ہی تو کہا جاتا ہے۔ ایک لفظ بھی ان کہانیوں سے مختلف ہوتا تو میں سمجھوں گی کہ تم کچھ کر دکھاؤ گے۔ لیکن جوانی کا جوش ایسا ہی ہوتا ہے، ہر شخص ایسا ہی کہتا ہے اور اس کے بعد پچھتاتا ہے۔''

''میں پچھتانا چاہتا ہوں۔''

''فرض کرو تمہارے ماں باپ نے تمہیں جائیداد سے عاق کر دیا تو اس کے بعد کیا کرو گے؟''

’’میں اپنے بازوؤں پر بھروسہ کروں گا۔‘‘

’’نہ میاں نہ...... طوائف تمہارے زورِ بازو پر بھروسہ نہیں کرے گی۔ وہ عیش وعشرت میں پلتی ہے، یہاں کا ماحول دیکھ رہے ہو نا...... غزالہ نے بھی اسی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ وقت پر کھانا، وقت پر پینا، عیش کرنا، مجرا کرنا، آرام سے سو جانا۔ نت نئے کھیل، نت نئے دوست، نت نئے ساتھی، یہی ہم لوگوں کی دنیا ہے۔ اگر اس دنیا میں ذرا بھی کوئی کمی آ جاتی ہے تو طوائف جی نہیں پاتی۔ عادی ہو جاتی ہے اس عیش وعشرت کی۔ اور یہی عیش و عشرت اس کی زندگی کے ساتھ چلتا ہے۔ کہیں بھی اس میں کمی واقع ہوئی تو وہ ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ غزالہ بھی ایک طوائف کی بیٹی ہے، تم اس کو مختلف نہ سمجھو۔ میں تمہیں بہکا نہیں رہی میاں! دل چاہتا ہے تو خرچ کرو...... خوب خرچ کرو...... داشتہ بنا لو اسے۔ جب دل بھر جائے یا حالات خراب ہو جائیں تو چھوڑ جانا یہاں پر۔ بس اتنا دے دیا کرنا جتنا ہمارا نقصان نہ ہو۔ بس اس کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔‘‘

’’شمشیرہ بیگم! میں اسے عزت دینا چاہتا ہوں، اسے مقام دینا چاہتا ہوں، میں اس کا مستقبل بنانا چاہتا ہوں اور اس مستقبل میں خود میری شرکت برابر کی ہوگی۔ آپ نے بات ہی ایسی کر ڈالی ہے، ہم نے تو سوچا تھا کہ یہ بات اس وقت تک چھپائیں گے جب تک ہمارا کام نہیں ہو جاتا۔ لیکن شمشیرہ بیگم! میں ذرا دوسری طبیعت کا مالک ہوں...... آپ نے پوچھا میں نے بتا دیا۔ اب میں مردانہ وار اپنا ہر کام کر سکتا ہوں۔‘‘

’’تم ہماری اجازت کی ضرورت نہیں محسوس کرتے؟‘‘

’’اب یہ ضروری ہو گیا ہے...... آپ ہمیں اجازت دے دیں۔‘‘

’’اور ہمارا کیا ہوگا؟‘‘

’’بے فکر رہیں، آپ کو ہر وہ چیز دوں گا جو آپ طلب کریں گی۔‘‘

’’پکے ہو؟‘‘

’’ہاں شمشیرہ بیگم! میں واقعی پکا ہوں۔ مجھے کہیں کمزور نہیں پائیں گی۔‘‘

’’اچھا، دیکھیں گے، سوچیں گے...... بس تم سے یہی باتیں کرنی تھیں۔ اور سنو، اس میں بری بات کوئی بھی نہیں ہے۔ غزالہ تمہاری ہے، جب دل چاہے اس کے پاس جاؤ، جب دل چاہے آؤ۔ چلو ٹھیک ہے، تم نے سچ بول دیا مجھ سے، میرا جی خوش ہو گیا۔ اب غور

کر لینا، سوچ لینا۔ اب اگر کہیں کچھ کی کرنا چاہو یا کوئی ردّ و بدل کرنا چاہو تو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم کوئی غیر نہیں ہیں تمہارے لئے۔‘‘

’’شکریہ۔‘‘

’’جاؤ اب۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔‘‘ شمشیرہ بیگم نے کہا اور علی شان اندر چلا گیا۔ حاجو اور غلام شاہ کو بھلا سکون کہاں نصیب تھا، تھوڑی ہی دیر کے بعد شمشیرہ بیگم کے پاس پہنچ گئے۔ غلام شاہ نے پُرخیال انداز میں کہا۔

’’باتیں تو ہم نے بھی سن لی ہیں شمشیرہ بیگم۔ ہاں، تو پھر کیا سوچا تم نے؟‘‘

’’مجبوری ہے غلام شاہ...... مجبوری ہے۔ وہ خود ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہا ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘

’’بس تم ان بدمعاشوں سے کہہ دو کہ دو چار دن کے اندر اندر اپنا کام کر لیں۔‘‘

غلام شاہ مسکرانے لگا تھا لیکن حاجو کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔

○●○

چاروں ساتھی محسوس کر رہے تھے کہ شاہ جی کی سٹی گم ہوگئی ہے۔ ہوش وحواس ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ راتوں کو جاگتے نظر آتے تھے۔ بات کافی حد تک سمجھ میں تو آ گئی تھی لیکن اس سلسلے میں کون کیا کرسکتا ہے، یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ فضل خان، نور شاہ اور باقی دونوں ساتھی خاصے پریشان تھے۔ ادھر رب نواز شاہ عرشیہ کو چھوڑ آئے تھے تو ابھی تک وہاں نہیں پہنچے تھے۔ لیکن پھر انہوں نے دوستوں کو رازدار بنا لینا ہی مناسب سمجھا اور بولے۔

''تم چاروں میرے پاس آ جاؤ...... مجھے تم سے ایک اہم بات کرنی ہے۔''

''خدا کا شکر ہے شاہ جی کہ آپ نے ہمارا کھویا ہوا اعتماد بحال کر دیا۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہم تو بڑے دکھ بھرے انداز میں یہ سوچ رہے تھے کہ کیا ہم اس قابل نہیں رہے کہ آپ ہمیں اپنے معاملات میں شریک کریں؟''

''نہیں دوستو! بات ایسی نہیں ہے۔ الجھن ہی اس طرح کی تھی کہ میری خودسٹی گم ہوگئی ہے۔''

''ہم تو محسوس کر رہے ہیں۔''

''اب تم سے کیا چھپاؤں، سارا کھیل ہی تمہیں معلوم ہے، کس طرح میں نے اپنا گھر چھوڑا، کس طرح کافی عرصے کے بعد گھر والوں کو پتہ چل گیا۔ میرے والد مجھے ملے، میں نے ان سے انکار کر دیا۔ لیکن اب جو مسئلہ ہے وہ بڑا عجیب ہے۔ عرشیہ میری بیوی میرے پاس آئی ہے۔ بہرحال وہ میرے نکاح میں ہے۔ وہ ایک بہت ہی شریف باپ کی بیٹی ہے۔ ایسی جس کے لئے میں اپنا سب کچھ قربان کرسکتا ہوں یعنی اس کی شرافت پر جس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ ایسے الفاظ کہہ گئی ہے کہ بس دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے...... کہتی ہے کہ اگر اسے میرے قرب میں جگہ نہ ملی تو وہ کسی طوائف سے کہے گی کہ وہ اسے اپنے

کوٹھے پر جگہ دے دے۔''

''شاہ جی! کیا سوچ رہے ہیں آپ؟''

''تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''دیکھیں شاہ جی! ساری باتیں اپنی جگہ، یہ تو بہت ہی دل ہلا دینے والی بات ہے۔ اب بے شک یہاں کچھ وقت صرف کریں لیکن بھابی جی کو بھرپور اعتماد دیں۔''

''میں نے وہاں کوٹھی پر پہنچا دیا ہے عرشیہ کو...... تم لوگ اس کے لئے وہاں انتظامات کرو۔ ویسے تو میں نے فضل شاہ کی ڈیوٹی وہاں لگائی ہے، وہ وہاں آتے جاتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی۔''

''شاہ جی! آپ یقین کریں فضل شاہ نے ہمیں کچھ نہیں بتایا ابھی تک۔''

''یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے اپنے دوستوں پر اعتماد ہے۔''

''تو پھر شاہ جی! دو چار دن آپ وہاں پر گزاریئے، ان کے ساتھ رہئے۔''

''یار بڑی عجیب سی بات ہو جاتی ہے۔ میرا تو پورا نظریہ ہی بدل جائے گا۔''

''بہت عرصہ ہو گیا شاہ جی! اب کچھ نرمی کرنا ہی پڑے گی آپ کو۔ ہم آج پہلی بار آپ کے سامنے زبان کھول رہے ہیں۔''

رب نواز اس وقت گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''فضل شاہ! چلو چلتے ہیں۔ اور سنو، ایک دو ملازماؤں کا بندوبست فوری طور پر کرو، ایک ڈرائیور ایک کار وہاں ہونی چاہئے۔''

''بالکل ہو جائے گا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم لوگ آپ کے پاس پہنچ رہے ہیں۔''

''آ جاؤ......'' رب نواز شاہ کوٹھی چلے گئے۔ فضل شاہ کو باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی فضل شاہ رب نواز شاہ کے حکم پر وہاں پر نگرانی کر رہا تھا۔ عرشیہ نے پورے گھر کی صفائی کر ڈالی تھی۔ شاہ جی جس دن چھوڑ کر گئے تھے، اس دن کے بعد آج آئے تھے۔ عرشیہ ان کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔

''دیکھو عرشیہ! میں زمانۂ قدیم کا کوئی انسان نما جانور نہیں ہوں۔ میں نے اپنا مسئلہ تمہیں بتایا تھا۔ بیٹھو، بیٹھو...... باتیں کریں گے۔ اچھا یہ بتاؤ چائے بنانا جانتی ہو؟''

''آپ پئیں گے؟''

"ہاں، اگر کوئی دقت نہ ہو تو۔"

"میں لاتی ہوں۔" عرشیہ کے دل میں نور ہی نور اتر آیا تھا۔ شاہ جی کا لہجہ بڑا محبت بھرا تھا۔ وہ چائے بنا کر لے آئی۔

"ایسے نہیں، اپنے لئے بھی لاؤ۔"

"جی۔" عرشیہ نے کہا اور ایک کپ اور اٹھا لائی۔

"بیٹھو عرشیہ! میں نے بڑی سربلندی سے زندگی گزاری ہے۔ باپ کا اکلوتا تھا، ماں نے اتنی محبت دی تھی کہ یقین کرو کہ کوئی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا، بڑا اعتماد تھا اپنے آپ پر اور اپنے ماحول پر۔ اور پھر عین شادی کے دن چند لوگوں کی موجودگی میں میری جو سبکی ہوئی اس نے میرا ذہنی توازن بگاڑ دیا۔ یوں تو بہت برا لگا جب مجھے میری ماں کے بارے میں بتایا گیا۔ بس عرشیہ! دیوانگی مجھے یہاں تک لے آئی۔ مگر میں اس بات سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ بھرپور زیادتی ہوئی ہے...... وہ نہیں ہونا چاہئے تھا جو ہوا۔ عرشیہ! تم یہاں آئی ہو اور تم نے جو کچھ مجھ سے کہا ہے اس کا بڑا احترام ہے میرے دل میں۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں اور ایک اچھے دوست کی حیثیت سے اب یہ سوال کرتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔"

"میں کبھی یہ نہیں کہوں گی کہ آپ اپنے ضمیر کے خلاف کچھ کریں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گی کہ ضمیر سے مشورہ ضرور لے لیں۔ معافی چاہتی ہوں، اپنی اوقات سے بڑھ کر بول رہی ہوں۔ لیکن وہ بھی آپ کے حکم سے...... اللہ نواز شاہ نے ان خاتون سے شادی کی تھی، دیکھئے میرا نظریہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات کی کمزور ترین ہستی ہے۔ پیدائش کے بعد سے لے کر موت کے وقت تک صرف حالات اس کے راستے منتخب کرتے ہیں۔ ان حالات میں کبھی وہ چنگیز خان بنا دیا جاتا ہے اور کبھی کوئی ایسا مظلوم جو فاقہ کشی سے تنگ آ کر نہر میں کود کر خودکشی کر لیتا ہے۔ شاہ جی! ہم کوئی راستے کبھی بھی خود منتخب نہیں کر سکتے۔ ہم سب وقت کے قیدی ہیں، ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آنا چاہئے۔ اللہ نواز شاہ میرے بزرگ ہیں۔ بہت تکلیف اٹھا چکے ہیں وہ آپ کی وجہ سے۔ آپ ان سب کو معاف کر دیجئے، مجھے قبول کر لیجئے۔ معاشرہ کسی بھی طرح آپ سے منحرف نہیں ہو گا۔"

"آپ کو تو ہم نے قاضی صاحب کے سامنے قبول کیا تھا۔" شاہ جی نے کہا اور پھر

بولے۔ "لیکن ہمیں کچھ وقت چاہئے...... آپ یہاں اپنا گھر تصور کر کے رہیں۔ یہاں آپ کو تکلیف نہیں ہو گی۔ البتہ ہمیں کچھ وقت اور دے دیجئے، پھر اس کے بعد ہم آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔" عرشیہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

○●○

نوجوانی کی عمر، ہر طرح سے بے نیاز، اپنی ہی رنگ رلیوں میں رنگی ہوئی۔ علی شان کی عمر یہی تھی۔ محبت کر بیٹھا تھا غزالہ سے اور یہ سوچ لیا تھا کہ زندگی میں کوئی مشکل، مشکل نہیں ہوتی۔ شمشیرہ بیگم جیسی گھاگ عورت کو وہ معصوم صفت بھلا کیا سمجھتا۔ ایک ایک بات خود علی شان ہی سے پوچھ لی تھی اور اس کے بعد خود اس کی دشمنی پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ علی شان کو چاروں طرف ہرا ہی ہرا نظر آ رہا تھا، اس کا خیال تھا کہ ہر الجھن دولت سے حل ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی وہ ہیرا منڈی سے نکلا تھا اور تھوڑی ہی دور آگے بڑھا تھا کہ تین تانگے سامنے آ گئے۔ رات ثانی گزر چکی تھیں۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ دور دور تک کوئی کتا بھی بھونکتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈرائیور نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"صاحب جی! لگتا ہے جیسے ڈاکوؤں نے ناکہ لگایا ہو۔"

علی شان خود بھی ہکا بکا رہ گیا تھا اور حیران نگاہوں سے تانگوں سے اترنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ سات آٹھ آدمی تھے اور اس طرح گاڑی کو گھیر رہے تھے جیسے سچ مچ کچھ کرنا چاہتے ہوں...... ہاتھوں میں ہتھیار صاف نظر آ رہے تھے۔ علی شان پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ تب ہی ایک خونخوار سی شکل والا آدمی جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں، گلے میں مالا پڑی ہوئی تھی، لمبا چوڑا تھا، آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر علی شان کو باہر کھینچ لیا۔

"تو تُو ہے حرام کے پلّے علی شان...... یہی نام ہے تیرا؟"

"مگر آپ...... آپ کون ہیں؟ میں نے کیا، کیا ہے؟"

"مجھے جانتا ہے؟...... بول جانتا ہے مجھے؟ جانو چوہدری ہے میرا نام۔ چوبرجی کے علاقے سے چاہے میرا نام پوچھ لینا۔ تُو نے جو کچھ کیا ہے اس کا حساب کتاب تو ابھی تجھ سے ہو جائے گا۔" لمبے چوڑے آدمی نے علی شان کو زور سے دھکا دیا۔ دوسرے آدمیوں نے جو اسے گھیرے ہوئے کھڑے تھے اسے سنبھال لیا۔ علی شان کے ڈرائیور نے گھبرا کر اپنا دروازہ کھولا اور نیچے اتر آیا۔

"اوئے کتیا کے پلّے! تُو اس وقت تک یہاں خاموش بیٹھا رہ جب تک ہم یہاں سے چلے نہ جائیں۔ ہاں بیٹا! تو تجھے عشق ہو گیا ہے...... یہی بات ہے ناں؟"

"آ...... آ......" علی شان نے کچھ کہنا چاہا لیکن لمبے چوڑے آدمی کا ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔

"ہاں بول، کیا کہنا چاہتا ہے...... یہی ناں کہ ہم اس لڑکی کے ماما لگتے ہیں کیا...... سالے زبان نکال کر تو دیکھ، گدی سے کھینچ کر ہاتھ میں نہ رکھ دیں تو جانو چوہدری نام نہیں ہے میرا۔"

"مگر بتا تو دیجئے کہ میں نے کیا، کیا ہے؟"

"شمشیرہ بیگم کے کوٹھے سے آ رہا ہے ناں؟"

"ہاں۔"

"اور اس کی لڑکی غزالہ سے عشق بھی کرتا ہے تُو۔ سمجھا رہے ہیں تجھے، اگر آج کے بعد وہاں دیکھا تو پھر وہاں سے سیدھا قبرستان ہی کا رخ ہو گا۔"

"مگر آپ مجھے بتائیں تو سہی، میرے وہاں جانے میں کیا حرج ہے...... وہاں تو بہت سے آتے ہیں۔"

"حرام کے پلّے! بہت سے وہاں آتے ہیں گانا سننے، تُو تو لڑکی ہی کو پھانس رہا ہے۔"

"جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ میں جانتا ہوں۔"

"اچھا...... ایسے نہیں مانے گا...... لگا بھئی لگا اس کے دو چار۔" اور اس کے بعد علی شان پر جوتوں اور گھونسوں کی بارش ہو گئی۔ دو چار ہاتھ تو اس نے شرافت سے کھائے لیکن اس کے بعد اسے بھی غصہ آ گیا اور اس نے بھرپور قوت سے ان کا مقابلہ شروع کر دیا۔

"اچھا...... موت ہی آ گئی ہے تیری۔" جانو چوہدری نے کہا اور پھر اس نے پیچھے سے ایک لاٹھی علی شان کے سر پر ماری اور علی شان کے سر سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ لیکن جانو چوہدری ابھی یہ کام کر ہی رہا تھا کہ اچانک ہی کہیں سے رب نواز شاہ اور اس کے ساتھی آتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے یہ دھینگا مشتی دیکھ لی اور تیزی سے چلتے ہوئے قریب پہنچ گئے۔

"ارے دیکھو دیکھو...... نور شاہ، شالے خان! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ایک عجیب سا منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ کچھ لوگ ایک شخص کو گھیرے ہوئے اس کی پٹائی کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شاہ جی ان کے سر پر پہنچ گئے۔

"ابے او کتیا کے پلّو...... او حرام زادو...... غیرت مند ہو یا کسی بھنگی کی اولاد ہو؟ ایک پر اتنے سارے پِل رہے ہو...... رک جاؤ، ورنہ ایک ایک کو جان سے مار دوں گا۔"

ان لوگوں کے ہاتھ رک گئے۔ جانو چوہدری نے شاہ جی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"چلا جا...... چلا جا یہاں سے...... کیوں مصیبت میں پڑ رہا ہے...... ورنہ کھوپڑی گھوم گئی تو تیری بھی کھوپڑی کھول دیں گے۔"

"دھت تیرے کی...... تیری کھوپڑی تو گھومنی نہیں چاہئے، کیا سمجھا۔ چل دس بیس جوتے پڑ جائیں گے تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

اس بات پر جانو چوہدری چراغ پا ہو کر شاہ جی پر پل پڑا۔ اس نے لاٹھی اٹھائی اور بھرپور وار شاہ جی پر کیا۔ لیکن لاٹھی ان کی مٹھی میں آئی اور زوردار جھٹکا لگا تو جانو چوہدری اوندھے منہ ان کے قدموں میں جا پڑا۔ شاہ جی نے کہا۔

"لاٹھی ہے تیری ہمارے ہاتھ میں۔ چاہیں تو یہیں تیری کھوپڑی کے دو ٹکڑے کر دیں گے۔ مگر جوتے کی بات کی ہے ہم نے۔ اب تو تجھے جوتے ہی کھانے پڑیں گے۔"

جانو چوہدری نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن برق رفتاری سے جوتا اس کے سر پر پڑا۔ اب یہ اس کی تقدیر تھی کہ جوتے کا اگلا حصہ شاہ جی کے ہاتھ میں تھا، ایڑھی سر پر پڑی، سر چکرا گیا، ایک بار پھر اوندھے منہ گر پڑا۔ اسی وقت اس کے تمام ساتھیوں نے شاہ جی کی طرف جھپٹا مارا لیکن شاہ جی کے چاروں ساتھی موجود تھے۔ لکڑیاں ان سے چھین لی گئیں اور انہی سے ان کی پٹائی شروع ہو گئی۔ وہ مارا ماری کہ سارے کے سارے ٹانگوں پر اچھلنے لگے۔ شاہ جی کہہ رہے تھے۔

"کہتے ہیں نا بیٹے کہ میاں کی جوتی میاں کی ٹانٹ، سترہ ہو گئے ہیں، تین اور کھانے ہیں۔ بیس جوتوں کی بات کہی تھی ہم نے۔ چل موقع دیتے ہیں، کھڑا ہو، کچھ بول تاکہ اس میں دس پندرہ جوتے اور بڑھا دیں۔"

جانو چوہدری نے ایک بار پھر اپنے بدن کی قوت سے شاہ جی کی طرف چھلانگ لگائی اور شاہ جی نے جھکائی دے کر ایک اٹھارواں جوتا اس کے سر پر لگا دیا۔ جانو چوہدری کو ایک

ہی سوجھی، یہ کہ اس جھونک کا فائدہ اٹھا کر فرار ہو جائے لیکن یہ بھی اس سے ممکن نہیں ہو سکا۔ شاہ جی نے دوسرے ہاتھ سے پکڑی ہوئی لاٹھی اس کے پیروں میں ماری اور اس نشانے سے ماری کہ اس کے پاؤں لاٹھی میں الجھ گئے۔ وہ گر کر اٹھا تو باقی دو جوتے بھی اس کے سر پر پڑے۔

"تو ہو گئے پورے بیس...... چل جا، بھاگ جا...... چل بھاگ جا۔ اور ایک بات سن لے، آئندہ ادھر کا رخ کیا تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا...... دیکھو، دیکھو ذرا اس بچے کو تو دیکھو۔" یہ کہہ کر شاہ جی نے علی شان کی طرف دیکھا۔ علی شان اچھا خاصا زخمی ہو گیا تھا اور اس کے بعد وہ علی شان کو لے کر ہسپتال چل پڑے۔ طبیعت میں بے پناہ ہمدردی تھی چنانچہ ہسپتال جا کر انہوں نے ڈاکٹروں سے بات کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ اسے ٹھیک کرنا ہے، پیسوں کی پرواہ نہ کی جائے۔ پھر علی شان کی مرہم پٹی شروع کر دی گئی۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں تھا اور ڈاکٹر ہر طرح سے اس کی خبر گیری کر رہے تھے۔ شاہ جی کی شخصیت ایسی ہی تھی کہ ہر ایک کو اپنے رعب میں لے لیتی تھی۔ پھر انہوں نے جو باتیں کی تھیں، اس سے ڈاکٹر اور زیادہ متاثر ہو گئے تھے چنانچہ خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔ خون کافی نکل چکا تھا، ہر طرح سے معائنہ کیا گیا اور تقریباً آدھی رات گزر گئی۔ لیکن شاہ جی کے چہرے پر کوئی شکن نہیں تھی۔ جب رات کے تقریباً ساڑھے تین بجے تو شاہ جی نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب! کوئی خطرے والی بات ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا...... دماغی چوٹ ہے...... ہوش آ جانا چاہئے۔"

"پتہ نہیں کون ہے بے چارہ۔ کپڑوں میں سے بھی کوئی ایسی چیز نہیں نکلی جس سے یہ پتہ چل سکے کہ کس ماں کا لال ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب! کتنی پیاری شکل وصورت کا بچہ ہے...... جو کوئی بھی ہے، آپ کو اس کی پوری پوری دیکھ بھال کرنی ہے، اب میں چلتا ہوں۔ اپنے آدمی کو یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔ صبح کو آپ کے بلوں کی ادائیگی بھی ہو جائے گی۔ کوئی کمی نہ چھوڑیں۔"

"آپ بالکل بے فکر رہیں جناب! ہمیں اندازہ ہے کہ آپ ایک شریف آدمی ہیں۔ پھر ویسے بھی مریض کی زندگی بچانا تو ڈاکٹر کا فرض ہوتا ہے۔"

شالے خان کو اس کے پاس چھوڑ دیا گیا اور اسے ہدایت کی گئی کہ کچھ پتہ لگ سکے اگر

ہوش میں آ جائے کہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے تو زیادہ اچھا ہے ورنہ اللہ مالک ہے۔ ہم جا رہے ہیں، کل آ جائیں گے۔"

شاہ جی وہاں سے واپس چل پڑے۔ دل میں تشویش تھی اور وہ اس نوجوان کے لئے افسردہ تھے۔ نجانے کون ہے بے چارہ...... بہرحال جس کی انہوں نے پٹائی کی تھی، وہی اس کی تفصیل بھی بتائے گا۔ اب نیند تو گئی تھی ساری رات کی۔ ویسے بھی صبح ہونے میں بہت کم دیر رہ گئی تھی۔ ہیرا منڈی سنسان پڑی ہوئی تھی۔ کہاں، کیا ہو چکا ہے، کسی کو کوئی خبر نہیں تھی۔ شاہ جی اندر پہنچ گئے۔ قیدی کے بارے میں پوچھا جسے بعد میں شاہ جی نے روک کر احاطے پر بھجوا دیا تھا اور نور شاہ کو اس کی خبر گیری پر مامور کر دیا تھا۔

"کیا کر رہا ہے وہ؟"

"ہاتھ پاؤں باندھ کر کمرے میں بند کر دیا ہے سسرے کو۔"

"کچھ پوچھا تو نہیں؟"

"نہیں شاہ جی! آپ کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن بڑے بل کھا رہا ہے، گالیاں بھی بک رہا ہے۔ ابھی تو سن لی ہیں اس کی گالیاں، لیکن اب اس کی مزاج پرسی کرنا پڑے گی۔"

"پھر چلو، رات تو کالی ہو ہی گئی ہے، اب سو کر کیا کریں گے؟ اور پھر ایک رات جاگنا کوئی ایسی بات بھی تو نہیں ہے۔"

"نہیں شاہ جی! نیند تو کسی کو بھی نہیں آ رہی۔"

"تو پھر آ جاؤ...... دیکھیں ذرا تماشہ، کیا کہتا ہے بھوتنی کا۔"

ایک بڑے سے کمرے میں جانو چوہدری کو باندھ کر ڈالا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے، پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔ شاہ جی اندر داخل ہوئے تو اس نے گھور کر شاہ جی کو دیکھا۔

"کتے کے پلو! اس وقت تو تم نے مجھے قابو میں کر لیا لیکن بعد میں تمہیں دیکھ لوں گا، کیا سمجھتے ہو تم لوگ مجھے۔ میرا نام بھی جانو چوہدری ہے۔ جانتے نہیں ہو تم لوگ مجھے۔"

شاہ جی نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر بولے۔ "تجھ سے تو مذاق بھی نہیں کر سکتے۔ یہ اچھا ہوا کہ تُو نے خود ہی اپنا نام بتا دیا۔ کہاں کا بدمعاش ہے بے...... کون سے

...قے میں تھا؟ اور یہاں ہیرامنڈی میں کیا کر رہا تھا...... کون تھا وہ لڑکا جسے مارا ہے تم لوگوں نے؟"

"میرے ہاتھ پاؤں کھول دو، پھر بتاؤں گا۔" جانو چوہدری نے جواب دیا۔

"ہم میں سے کس کو بتاؤ گے تم؟"

"تم سب کو بتاؤں گا...... اچھی طرح بتاؤں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے...... یہ بھی سہی۔ مگر ایک بات سن لو، اگر ہم میں سے کسی ایک کو بھی تم کچھ نہ بتا سکے تو پھر بیٹے کھوپڑی پر اتنے ہی جوتے کھانے پڑیں گے کہ تمہیں بھی اس کے ساتھ ہی ہسپتال میں داخل ہونا پڑے گا جسے تم نے مارا ہے سمجھے۔ اور ہم سب مل کر تمہیں نہیں ماریں گے بلکہ جسے بھی دل چاہے منتخب کر لو، اس سے ہی لڑو، اس سے نمٹ لو۔ اگر اسے مار پیٹ کر تم نے لمبا کر دیا تو پھر ہم تمہیں یہاں سے نکل جانے دیں گے، وعدہ کرتے ہیں اور مرد کی زبان ایک ہوتی ہے، پکی نہیں پڑے گی۔ لیکن اگر تم نہ مار سکے اور خود مار کھا گئے تو پھر سمجھ لو کہ یہ جوتا نہیں پڑے گا تمہارے سر پر بلکہ اصل پشاوری چپل رکھی ہوئی ہے جس میں ٹائر کا سول لگا ہوا ہے۔ سوچ لو، اب بھی اپنے الفاظ واپس لے لو۔"

جواب میں جانو چوہدری نے بہت سی گالیاں بک دی تھیں اور شاہ جی ہنسنے لگے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "اچھا تو پھر آدمی بتاؤ۔"

"تُو بھی تو آدمی ہے...... آ جا میرے سامنے...... تجھے مزہ چکھاتا ہوں۔"

"چلو فیصلہ ہو گیا۔" شاہ جی نے جوتے اتارے، لباس میں ایسا لباس جو لڑائی بھڑائی میں الجھن بن سکتا تھا اتار دیا۔ باقی لوگ مسکرا رہے تھے۔ شاہ جی کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے، بڑا اعتماد تھا انہیں شاہ جی پر۔ جانو چوہدری لمبا چوڑا ضرور تھا لیکن پہلی لڑائی میں بھی اس نے شاہ جی کے ہاتھ ہی مار کھائی تھی، اب مزید مار کھائے گا اور اس کے بعد ان گالیوں کا بدلہ بھی چکانا پڑے گا جو اس نے شاہ جی کو دی تھیں۔ بہرحال وہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ شاہ جی سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں، گالی نہیں برداشت ہوتی ان سے۔ بہرحال اب اس آدمی کی شامت ہی آ گئی تھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ مار کھائے گا۔

بہرحال شاہ جی کے کہنے پر اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے گئے اور وہ سب ایک گوشے میں جا کھڑے ہوئے۔ شاہ جی خالی ہاتھوں سے جانو کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ جانو

بھی جوش میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ بہر طور بدمعاش تھا، کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا تھا۔ اس طرح مار کھائی تھی اس نے کہ اس کی بڑی بے عزتی ہو گئی تھی۔ لیکن اس بے چارے کو معلوم نہیں تھا کہ کیا مصیبت گلے لگا لی ہے۔ دونوں بازو پھیلا کر شاہ جی کی طرف اس طرح بڑھا جیسے بازوؤں میں لے کر ان کی ہڈیاں ہی توڑ دے گا۔ شاہ جی نے بھی دونوں بازو اٹھا لئے تھے۔ جانو نے ان کے گرد قولی بھر لی اور انہیں رگڑنے لگا۔ لیکن چند ہی لمحات کے بعد اسے احساس ہو گیا کہ فولادی ستون اپنی جگہ سے ہٹتے نہیں ہیں۔ پھر شاہ جی نے اپنے دونوں ہاتھ نیچے کر کے اس کی پسلیوں پر مارے اور جانو کا سانس ہی بند ہو گیا۔ گھبرا کر ہاتھ کمر سے نکالے اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ شاہ جی نے آگے بڑھ کر ایک لات اس کے پیٹ پر ماری اور جانو پیٹ پکڑ کر جھک گیا۔ شاہ جی کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور وہ زمین پر الٹ گیا۔ تب شاہ جی نے نیچے جھک کر اس کا گریبان پکڑا اور اسے پوری قوت سے کھینچ کر نیچے کر دیا۔ جانو نے ایک بار پھر شاہ جی کے جبڑے پر گھونسہ رسید کرنا چاہا لیکن شاہ جی نے اس کے گھونسے کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے لیا اور اس کے بعد اسی ہاتھ کو موڑ کر اس کی کمر پر رکھ دیا۔ پھر ایک زوردار لات پیچھے کمر پر ماری اور جانو چوہدری آگے جا کر دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی پیشانی پھٹ گئی اور خون بہنے لگا۔ شاہ جی ایک بار پھر آگے بڑھے اور اس بار اس کی گردن پکڑ کر آگے گھسیٹتے ہوئے بیچ میں لے آئے۔ جانو کے حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں، اس نے چیختے ہوئے کہا۔

"رک جاؤ...... رک جاؤ......"

"نہیں، ابھی نہیں۔" شاہ جی نے کئی لاتیں اس کے رسید کر دیں اور جانو بری طرح چیخنے اور کراہنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر شاہ جی کے پاؤں پکڑ کر انہیں گرانے کی کوشش کی لیکن پاؤں پکڑ کر زور ہی لگاتا رہا اور فوراً اسے یہ احساس ہو گیا کہ غلط چیز پلے پڑ گئی ہے۔ بہرحال پٹ پٹ کر وہ بری طرح نڈھال ہو گیا اور اس نے دونوں ہاتھ پاؤں زمین پر ڈال دیئے۔

"مار لو...... اب مجھے مار لو...... اب کچھ نہیں بولوں گا۔ ہار مان لی ہے تم سے۔ مار لو جتنا دل چاہے مار لو۔"

شاہ جی ایک دم رک گئے، پھر بولے۔ "سسرے! مرے ہوئے کو کوئی بھلا کیا مار سکتا

ہے۔ یہ بتا، ہوش ٹھکانے آ گئے تیرے؟''

''ہاں آ گئے۔ خدا کی قسم ہوش ٹھکانے آ گئے۔''

''تو پھر بیٹا اب پھٹے ہوئے جوتے کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

''نہیں نہیں، تمہیں اللہ کا واسطہ، جب میں نے ہار مان لی ہے تو پھر اب مجھے مار کر کیا کرو گے؟''

''اور جو گالیاں بکی ہیں تُو نے؟''

''ان کے لئے معافی چاہتا ہوں...... معاف کر دو مجھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم...... مگر تم ہو کون؟ ہیرا منڈی کو تو شہباز سنبھالے ہوئے تھا...... شہباز خاں کہاں گیا؟''

تُو کہتا ہے کہ تُو بدمعاش ہے...... تجھے اس بات کا بھی پتہ نہیں کہ شہباز کو یہاں سے غرق ہوئے سالہا سال گزر گئے۔ ابے جا بھوتنی کے...... کیوں بدمعاشوں کا نام بدنام کرتا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم تھا...... مگر آپ کون ہیں؟''

''بیٹا! اب ہماری بات چھوڑ دے، اپنی بات بتا۔ شرم نہیں آتی ایک لڑکے کو سارے کے سارے مل کر مار رہے تھے۔ کیا دشمنی تھی تیری اس سے...... کیا قتل کرنا چاہتا تھا اس کو؟ آخر کیوں؟ اب ایسا کر جلدی جلدی جو پیٹ میں ہے سب نکال کر باہر رکھ دے تو زیادہ اچھا ہے ورنہ پیٹ میں چاقو گھونپ کر سب کچھ نکلوا لوں گا۔ جلدی کر، جو کہہ دیا تو بس کہہ دیا۔ عمل کرانا چاہتا ہے تو تیری مرضی۔''

شاہ جی نے چاقو کھول کر ہاتھ میں لیا تو جانو چوہدری کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا۔ دونوں ہاتھ سیدھے کر کے پیچھے کھسکتا ہوا بولا۔ ''بتائے دیتا ہوں...... سب کچھ بتائے دیتا ہوں...... اب کیا کروں گا چھپا کر۔ مجھے ہیرا منڈی کے دو سازندوں نے اس کام کے لئے آمادہ کیا ہے اور اس کے لئے باقاعدہ سپاری دی ہے۔ کام صرف اتنا ہی تھا کہ اس لڑکے کو مار پیٹ کر لمبا کر دوں اور یہ کہوں اس سے کہ آئندہ ہیرا منڈی کا رخ نہ کرے۔''

''سازندوں نے کہی تھی تجھ سے یہ بات یا کسی طوائف کے عاشق نے؟''

''نہیں شاہ جی! دو سازندے ہیں، ایک کا نام غلام شاہ ہے اور دوسرے کا حاجو۔''

''ایں......؟'' رب نواز شاہ اچھل پڑے۔

''ہاں...... کسی شمشیرہ بائی کے کوٹھے کے سازندے ہیں۔ میرا تو کبھی ادھر گزر نہیں ہوتا اس لئے یہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ لڑکا شمشیرہ بیگم کو بہت عرصے سے تنگ کر رہا ہے، کوئی چکر چلایا ہے اس نے۔ چکر کے بارے میں، میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ بس میرا جو کام تھا اس کے لئے انہوں نے مجھے پیسے دیئے اور میں نے کام کر لیا۔''

''دھت تیری کمینے کی اولاد۔ تو اس کا مطلب ہے کہ یہ بھی اسی حرام زادی کا چلایا ہوا چکر ہے۔ بڑی بدمعاش عورت ہے۔ ہم نے ایسی عورت نہیں دیکھی۔ چلو بھئی، بتاؤ کہ اب اس پنڈے کا کیا، کیا جائے؟ چھٹی کر دیں اس کی یا چھوڑ دیں؟''

جانو چوہدری ہاتھ جوڑ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ ''دیکھئے، میرا کیا قصور ہے...... آپ کو پتہ ہے ہم لوگ اسی پر گزارہ کرتے ہیں۔ معاف کر دیجئے ہمیں، ہماری جان لے کر آپ کو کیا ملے گا؟''

''معاف کر سکتے ہیں بیٹا...... لیکن ایک شرط پر۔''

''ہر شرط منظور ہے مجھے۔''

''چل ٹھیک ہے...... یہاں سے بھاگ جا، آئندہ کبھی مڑ کر نہ دیکھنا ادھر ورنہ دونوں آنکھیں نکال کر ہاتھ پر رکھ دیں گے۔ سازندے تیرے پاس پہنچیں تو ایمانداری سے کہہ دینا کہ جو لیا تھا اسے حلال کر دیا۔ لڑکا ہسپتال پہنچ گیا ہے، اتنا ہی کام تھا تیرا اور بعد کی باتیں دل میں نہ رکھنا۔ ہم صرف ایک دفعہ معاف کرتے ہیں۔ وہ بہت بڑے آدمی ہوتے ہیں جو تین دفعہ برداشت کر لیتے ہیں، ہم ذرا چھوٹے آدمی ہیں۔ ایک دفعہ کے بعد دوبارہ برداشت نہیں کرتے۔ دوبارہ اگر تم ہمارے سامنے آئے تو قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جو حال تیرا ہوگا تُو سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''نہیں جناب! میرا کوئی دماغ خراب ہے جو بلاوجہ کے جھگڑے مول لیتا رہوں۔ وعدہ کرتا ہوں، آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔''

''اچھا پھر ٹھیک ہے...... ہاتھ پاؤں کھلے ہیں تیرے۔ چل نکل، بھاگ جا۔ ویسے بھی رات کا وقت ہے کون دیکھے گا کہ کس حال میں باہر نکلا ہے۔ جاؤ چھوڑ آؤ اسے باہر۔ زبان دے دی تو سب کچھ دے دیا۔'' شاہ جی نے کہا اور نور شاہ، چوہدری کو احاطے کے باہر چھوڑ کر واپس آ گیا۔ شاہ جی کہہ رہے تھے۔

''بھئی مان گئے...... دیکھی ہیں بہت سی۔ مگر اتنی کمینی عورت نہیں دیکھی۔ پتہ نہیں بے چارہ لڑکا کون ہے، بے ہوش پڑا ہوا ہے ہسپتال میں۔ دل دُکھ رہا ہے۔ چلو خیر، وہاں ہمارا آدمی موجود ہے۔''

''جی شاہ جی۔''

''اب یہ بتاؤ کیا، کیا جائے؟''

''شاہ جی! میرا خیال ہے غلام شاہ اور حاجو کو ساری تفصیلات معلوم ہوں گی۔''

''ظاہر ہے۔''

''تو پھر ان دونوں ہی کو پکڑوا لیا جائے اور ان سے اُگلوا لیا جائے کہ قصہ کیا ہے۔ اگر لڑکے کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو یہی گواہ بھی ہوں گے۔ شمشیرہ بیگم کو اس بار پولیس میں رگڑوا دینا ہی زیادہ بہتر ہے تاکہ آئندہ وہ کسی کے ساتھ ایسی گڑبڑ نہ کر سکے۔''

شاہ جی نے تھوڑی دیر تک سوچا، پھر بولے۔ ''تو پھر ایک کام کرو۔ اس وقت تو سرے بل میں گھسے ہوئے ہوں گے، مناسب نہیں ہے بات وقت سے پہلے کھل جائے گی۔ یوں کرو کل حاجو کی تاک میں رہو، جہاں اکیلا نظر آئے، چادر ڈال کر اٹھا لاؤ۔ پتہ نہیں چلنا چاہئے کس نے اٹھایا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں شاہ جی! یہ کام کل ہو جائے گا۔''

○●○

رب نواز شاہ کے دل کو لگ گئی تھی۔ صبح ناشتے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے نور شاہ کو ساتھ لے کر ہسپتال پہنچ گئے۔ نور شاہ ذمے دار آدمی تھا۔ اپنی ذمے داریاں اس نے پوری طرح سنبھال رکھی تھیں۔ ادھر یہاں بھی ایک آدمی چھوڑا ہوا تھا جو ساری رات مریض کی تیمارداری کرتا رہا تھا۔ پتہ یہ چلا کہ لڑکے کو ہوش نہیں آیا۔ ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تو ڈاکٹروں نے کہا کہ صورتحال خراب تو نہیں ہے لیکن دماغ کا کوئی ایسا حصہ متاثر ہوا ہے جس نے جاگنے نہیں دیا۔ ویسے حالت بہتر ہے۔

''اصل میں یہ تو نہیں پتہ چل سکا کہ ہے کون...... کوئی اتا پتہ بھی نہیں ملا اس کی جیب سے۔ خیر آج کا دن باقی ہے، شام تک پتہ چل جائے گا۔ ہمارا پتہ لکھ لو ڈاکٹر صاحب! تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی، ہمارا وعدہ ہے۔''

''نہیں جناب! ہم بھی صورت آشنا لوگ ہیں۔ دن رات واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ ہمیں آپ پر مکمل اعتماد ہے۔''

''لو، یہ رقم رکھ لو۔ علاج میں کوئی کمی نہ چھوڑنا۔ یہ نہ ہو کہ اسے کوئی نقصان پہنچ جائے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔''

شاہ جی نے ڈیوٹی بدل دی اور شالے خان کو یہاں سے لے کر چل دیئے۔ دلبر خان کی ڈیوٹی وہاں عرشیہ کی کوٹھی پر لگا دی گئی تھی۔ بہرحال شاہ جی نے یہی کہا تھا کہ لڑکے کے گھر والوں کا پتہ چل جائے تو اس کے بعد یہ ذمے داری ختم ہو جائے گی۔ یہاں سارے انتظامات کر دیئے گئے تھے۔

ادھر شمشیرہ بیگم اپنے کوٹھے پر یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھیں کہ جانو چوہدری نے رات کو اپنا کام پورا کر دیا یا نہیں؟ صبح ہوتے ہی انہوں نے غلام شاہ اور حاجو کے کان کھانا شروع کر دیئے۔

''اے کمبخت مارو...... رقم تو مٹھی بھر کر دے آئے اس موئے بدمعاش کو۔ رات کو اسے یہ خبر دینی چاہئے تھی کہ کام کر لیا یا نہیں؟''

''شمشیرہ بیگم! سچ مچ جوانی ابھی تمہارے پاس سے کہیں گئی نہیں ہے۔ ذرا چھری تلے دم لو، کچھ نہ کچھ پتہ چل ہی جائے گا۔'' غلام شاہ نے کہا۔

''ہاں ہاں، پتہ چل جائے گا۔ انٹی سے رقم جاتی تو پتہ چلتا کہ گئے ہیں پورے پندرہ ہزار۔ اور پھر بات پندرہ ہزار کی بھی نہیں ہے، یہ بیگم صاحبہ بھی ہاتھ سے نکل رہی ہیں۔ اصل معاملہ ان کے رکنے کا ہے۔'' اشارہ غزالہ کی طرف تھا جو بے چاری ان تمام باتوں سے بے خبر تھی۔ غلام شاہ نے حاجو سے کہا۔

''حاجو! تم ذرا چوہدری کے پاس چلے جاؤ۔''

''مم...... میں اکیلا؟'' حاجو نے کہا۔

''ہائے ہائے، پری زاد ہو...... گلفام ہو، نرم و نازک دوشیزہ ہو کہ کوئی راستے سے اغوا کر لے گا۔ ہوش کی دوا لو اور جاؤ۔ میں دوسرے کام دیکھ رہا ہوں۔ تم چلے جاؤ۔''

بہرحال حاجو نے اس سلسلے میں حامی بھر لی تھی۔ غلام شاہ، حاجو کو ساتھ لے کر باہر نکل آئے اور بولے۔ ''سمجھتے نہیں ہو حاجو! یہاں کی صورتحال کو بھی دماغ میں رکھنا ہے اور پھر

آدھی رقم کے حق دار ہو۔ غور کرلو۔''

''ہوں...... اب آدھی رقم کے طعنے دیئے جارہے ہو مسلسل۔''

''بیوقوف ہو یار! ویسے تو بڑے دماغ والے بنتے ہو لیکن اول نمبر کے گدھے ہو۔''

''بکو، کیا بکنا چاہتے ہو؟''

''یار جاؤ، جانو چوہدری سے مل کر آؤ۔''

''ٹھیک ہے...... جاتا ہوں۔ لیکن حساب کتاب آج ہی ہو جانا چاہیے۔''

''ہو جائے گا...... کیوں مرے جارہے ہو؟'' غلام شاہ نے کہا اور حاجو باہر نکل آیا۔ یہ بھی تقدیر کی بات تھی کہ اس وقت شاہ جی احاطے سے گزر رہے تھے۔ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ یوں بھی ہیرا منڈی کے دن سنسان ہوتے ہیں۔ نہ دکانیں کھلتی ہیں نہ لوگوں کا ادھر سے گزر ہوتا ہے۔ سازندے، طوائفیں، سارے کے سارے بستر پر پڑے اینٹھ رہے ہوتے ہیں اور ہیرا منڈی کی نحوست نمایاں ہوتی ہے۔ بہر حال حاجو اپنی دھن میں مست چلا جارہا تھا کہ اچانک ہی اس پر قیامت ٹوٹی۔ کہیں سے ایک کالے رنگ کا کمبل اس پر گرا اور پھر کئی طاقتور ہاتھوں نے اسے دبوچ لیا۔

''ہاں، ہاں...... کیا کر رہے ہو...... کیا کر رہے ہو؟'' حاجو کے منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلیں۔ پھر اسے یوں لگا جیسے وہ خلاء میں پرواز کر رہا ہو۔ یہ پرواز زیادہ طویل نہیں تھی۔ ایک یا ڈیڑھ منٹ کے بعد اسے دھم سے زمین پر پھینک دیا گیا۔

''ابے ستیاناس تمہارا...... کیا کر رہے ہو؟ یہ غلام شاہ کالی زبان والا کہہ رہا تھا کہ کوئی نازک اندام دوشیزہ تو نہیں ہو کہ کوئی اغواء کرلے۔ ہو گیا...... ہو گیا...... ابے کمبل تو ہٹاؤ، دم گھٹا جارہا ہے۔''

کمبل ہٹ گیا اور حاجو نے غصیلے انداز میں اٹھ کر دیکھا اور پھر شاہ جی کی صورت دیکھ کر دم نکل گیا۔ رب نواز شاہ مونڈھے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ حاجو کو لانے والے اطمینان سے ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ حاجو نے صورتحال کی نزاکت کو محسوس کیا، لکھنوی انداز میں جھکا اور آداب بجالانے لگا۔

''حضور قبلہ شاہ جی! حکم دیا جاتا تو بندہ سر کے بل چل کر حاضر ہو جاتا۔ یہ کمبل میں لپیٹ کر کیوں لایا گیا ہے خادم کو؟''

شاہ جی ہنسنے لگے، پھر بولے۔ ''بس حاجو! آخری وقت میں یہی ہوتا ہے۔''

''آخری...... آخری...... آخری کیوں؟''

''کچھ کام تھا تم سے۔''

''تو جان مانگ لی ہوتی...... یہ تکلیف کیوں کی، فرمایئے؟''

''دیکھو حاجو! ہمارا ایک اصول ہے، وہ یہ کہ کوئی ہم سے سچ بولتا ہے تو ہم اس سے سچے رہتے ہیں اور اگر کسی نے گڑبڑ کی تو ہم ناک اور کان کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دیا کرتے ہیں۔ تم سوچ لو کہ نکٹے کہلوانا پسند کرو گے یا پھر اپنا نام حاجو ہی رہنے دو گے؟''

''بخدا خاندانی ہیں...... وقت کے ستائے ہوئے ہیں...... بس یوں سمجھ لیجئے تقدیر نے دھوکا دیا تھا کہ عالم نوجوانی میں شمشیرہ بیگم کے کوٹھے تک پہنچ گئے۔ یہاں اس کے عشق میں گرفتار ہوئے، اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے تو سارنگی بجانے لگے۔'' حاجو نے کچھ اس طرح کہا کہ شاہ جی کے حلق سے بے اختیار قہقہہ نکل پڑا۔

''اچھا، آپ پر بھی کبھی جوانی آئی تھی حاجو! ہم تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ بچپن ہی سے آپ بوڑھے ہو گئے تھے۔ جوانی آتی تو جوان نہ نظر آتے۔''

''بخدا حضور انور! جسامت پر طنز نہ فرمایئے، یہ تو اللہ کی دین ہوتی ہے۔''

''ٹھیک کہا آپ نے...... اچھا بیٹھ جایئے۔''

''حضور کے سامنے یہ جرأت کیسے کر سکتے ہیں؟''

''بیٹھو......'' شاہ جی نے غصے سے کہا اور حاجو اس طرح اچھل کر مونڈھے پر جا بیٹھا کہ وہاں کھڑے ہوئے دونوں حواری ہنس پڑے بلکہ ایسا ہی لگا تھا جیسے کوئی مینڈک اچھل کر مونڈھے پر چڑھ گیا ہو۔ شاہ جی نے حاجو کو غور سے دیکھا اور بولے۔

''وہ لڑکا کون ہے جسے شمشیرہ بیگم نے رات کو جانو چوہدری سے پٹوایا ہے؟''

حاجو مونڈھے سمیت اوندھے منہ زمین پر آرہا...... مونڈھا اس کے اوپر تھا اور وہ اس کے نیچے زمین پر۔ نور شاہ نے قہقہہ لگایا اور پھر جلدی سے سنجیدہ ہو کر مونڈھا سیدھا کر دیا۔ حاجو اوندھا پڑا ہوا تھا۔ شالے خان نے اسے گردن سے پکڑ کر مونڈھے پر رکھ دیا۔ شاہ جی نے کہا۔

''طبیعت ٹھیک ہو گئی؟ بتایئے، وہ لڑکا کون تھا جسے جانو چوہدری نے رات کو مارا ہے؟''

''مر گیا کیا......؟'' حاجو نے پوچھا۔

''تقریباً مر ہی گیا۔''

''خدا قسم...... خدا قسم اس شمشیرہ بیگم پر اتنا عذاب پڑے گا کہ ایک دن کوڑھ ٹپکے گا اس کے بدن سے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ ذرا تفصیل سے بتایئے۔''

''بس جناب! تماش بین تھا، غزالہ پر عاشق ہو گیا۔ ایک بڑے آدمی کا بیٹا ہے۔ غزالہ سے شادی کے خواب دیکھنے لگا۔ آپ کو پتہ ہے شمشیرہ بیگم کس قسم کی عورت ہے۔ اسے اگر کچھ مل جاتا اور غزالہ اس کے بس میں ہوتی تو ٹھیک تھا لیکن کوثر جہاں بھی ایسی ہی نکلی۔ غزالہ بھی ایسی ہی نکل رہی تھی۔ چنانچہ شمشیرہ بیگم نے جانو چوہدری کو رقم دے کر یہ کام کرایا ہے۔''

''ہوں...... یہ ہوئی نا بات۔ حاجو! آپ تو واقعی نیک انسان ہیں اور خاندانی معلوم ہوتے ہیں۔ بس تقدیر دھکا دیتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے بلکہ تقدیر کو کوسنا تو بیکار ہی ہے۔ سب کچھ کیا دھرا انسان کا اپنے ہاتھوں کا ہوتا ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہی آپ نے یہ بات...... اچھا یہ بتایئے یہ لڑکا کون ہے؟''

''اجی لاہور کے بہت اچھے خاندانی لوگوں میں سے ہے۔ ایک رئیس کا بیٹا ہے بلکہ اکلوتا بیٹا ہے۔''

''پتہ؟''

''صحیح پتہ تو ہمیں نہیں معلوم لیکن شاہ عالمی میں ان کا کاروبار ہے، بڑے مشہور آدمی ہیں۔''

''ہوں...... شاہ عالمی میں کاروبار ہے...... چلو ٹھیک ہے، پتہ چل جائے گا۔ مگر یہ بتایئے آپ کا کیا کریں؟''

''مم...... میرا کیا کریں...... جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں۔''

''جانو چوہدری نے اسے رات کو بہت مارا ہے اور وہ تقریباً نیم مُردہ حالت میں ہسپتال میں داخل ہے۔ اچھا خیر، یہ تو بات الگ ہوئی۔ ذرا یہ بتایئے کہ کوثر جہاں کا کیا قصہ ہے؟''

''حضور انور حاجو کی بات پر یقین کر لیں گے؟''

''کوشش کریں گے۔''

''تو آپ یقین فرمایئے کہ یہاں شمشیرہ کو چوٹ ہوئی ہے۔ کوثر جہاں اپنی مرضی سے نکل گئی ہے۔ تسنیم کو بھی ساتھ لے گئی ہے اور ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔ حالانکہ شمشیرہ بیگم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کنوئیں میں بانس ڈلوا دیئے، ہر جگہ خبر بھجوا دی۔ بہت سے آدمیوں نے کوثر جہاں کو تلاش کیا لیکن کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اب دل مسوس کر رہ جاتی ہے۔ کوثر جہاں تو اُڑ گئی حضور، چڑیوں کی طرح۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟''

''اگر کبھی بعد میں بھی یہ بات غلط ثابت ہو جائے تو حاجو کی گردن کٹوا دیجئے گا۔ آپ کے سامنے جھوٹ بولنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی توہین۔''

''حاجو! اب کس کام سے نکلے تھے؟''

''حضور انور! شمشیرہ بیگم نے اس لئے بھیجا تھا کہ جانو چوہدری کے پاس جاؤں اور اس سے معلوم کروں کہ لڑکے کا کیا حال ہے۔''

''تو پھر جانو کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ الٹا آپ ہی کو مارے گا۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے جو آپ کے لئے پوچھنا بےکار ہے۔ آپ شمشیرہ بیگم کو یہ اطلاع دے دیجئے کہ لڑکا بری طرح زخمی ہے، جانو نے اسے بہت مارا ہے اور وہ ہسپتال میں زندگی موت کی کیفیت میں گرفتار ہے۔ لیکن ایک بات آپ کو بتا دوں حاجو! کہ اگر شمشیرہ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ میں نے آپ کو اغوا کر کے آپ سے یہ معلومات حاصل کی ہیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ اس وقت سے میری اور آپ کی دشمنی کا آغاز ہو جائے گا۔''

''توبہ، توبہ حضور! اب تو شمشیرہ بیگم سے ایسی کھٹک گئی ہے دل میں کہ آپ کو بتا نہیں سکتا۔ بس مجبوریوں کا شکار ہوں ورنہ کہیں اطمینان سے زندگی بسر کرتا۔ لیکن آپ کو پتہ ہے کہ جس طرح طوائف بدنام ہوتی ہے اسی طرح اس کے ہاں کام کرنے والے سازندوں کی بھی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ ہم کچھ بھی کریں، کہلائیں گے سارنگی نواز ہی۔''

''اس میں کیا شک ہے...... سب کچھ سمجھا دیا۔ آگے تمہارا مقدر۔''

''آپ اطمینان رکھیں۔'' حاجو نے جواب دیا اور شاہ جی نے اسے باہر نکلنے کا اشارہ کر دیا۔

○●○

شاہ جی کو اچانک ہی علی شان کے ہوش میں آنے کی اطلاع ملی تھی۔

''کیا حالت ہے اس کی؟''

''ہوش آ گیا ہے۔''

''بالکل ٹھیک ہے؟''

''ہاں اللہ کا شکر ہے۔ ہسپتال سے جانے کی کہہ رہا تھا لیکن ڈاکٹروں نے ابھی تک جانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ میں آپ کو بتانے آ گیا۔''

''اچھا کیا...... چلو چلتے ہیں، بات کریں۔'' شاہ جی نے کہا اور جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ہسپتال پہنچ گئے۔ علی شان اب بالکل بہتر حالت میں تھا اور سخت پریشان نظر آ رہا تھا اور اس نے ان سب کو حیرانی سے دیکھا۔ شاہ جی قریب بیٹھ گئے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''علی شان۔''

''دیکھو ہم تمہیں تفصیل بتائے دیتے ہیں۔ ہوا یہ تھا شہزادے کہ ہم رات کو کہیں سے آ رہے تھے اپنے ان ساتھیوں کے ہمراہ کہ ہم نے دیکھا کہ کچھ بدمعاش تم پر حملہ کر رہے ہیں۔ بس ذرا پہنچنے میں دیر ہو گئی اس لئے انہوں نے تمہیں زخمی کر دیا اور تم گر پڑے۔ بدمعاشوں کو تو ہم نے خیر ٹھیک کر لیا اور تمہیں ہسپتال لے آئے۔ اب یہ بتاؤ کہ صورتحال کیا ہے؟ تم کون ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ بدمعاش کون تھے؟''

علی شان نے اپنے باپ کا نام بتایا اور پھر پتہ بھی بتا کر بولا۔ ''وہ لوگ بڑے پریشان ہوں گے...... میں ان بدمعاشوں کو نہیں جانتا۔ بس ہیرا منڈی سے نکلا تھا کہ انہوں نے گھیر لیا اور نیچے اتار کر مارا۔''

''ہوں...... تم نہیں جانتے، ہم جانتے ہیں۔ جانو چوہدری کا ٹولہ تھا۔ ہمارا نام رب نواز شاہ ہے۔ ہیرا منڈی ہی میں رہتے ہیں۔ تمہارے چچا کی جگہ ہیں، جو پوچھ رہے ہیں سچ سچ بتا دینا۔ بتا دو گے تو فائدے ہی میں رہو گے۔ نہیں تو تم جانو اور تمہارا کام۔''

''مم...... میں کیا بتاؤں؟''

''شمشیرہ بیگم سے کوئی جھگڑا چل رہا ہے تمہارا؟'' شاہ جی نے سوال کیا اور علی شان چونک پڑا۔

''آپ شمشیرہ بیگم کو جانتے ہیں؟''

''اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''میرا کوئی جھگڑا تو نہیں تھا ان سے...... لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اس لئے شہزادے کہ شمشیرہ بیگم ہی نے تمہاری دھلائی کرائی ہے۔''

''شش...... شمشیرہ بیگم نے؟''

''ہاں۔''

''لل...... لیکن کیوں؟'' علی شان نے حیرانی سے سوال کیا۔

''اس لئے پتر! کہ جب نوجوانی کی حالت میں عشق ہوتا ہے تو کیفیت اسی طرح کی ہوتی ہے۔ تم اس کی بیٹی سے عشق کرتے ہو نا؟'' شاہ جی نے سوال کیا اور علی شان نے گردن جھکا لی۔ شاہ جی ہنسنے لگے، پھر بولے۔

''نہیں شہزادے، نہیں...... احترام وہاں کرنا جہاں احترام کی گنجائش ہو۔ ہمارا سوال جو ہے اس کا جواب دو۔ بجائے اس کے کہ یہ سوال تم سے تمہارے ابا جان کریں، ہمیں ہی بتا دو۔''

''جی ہاں...... میں غزالہ کو چاہتا ہوں۔''

''شمشیرہ بیگم سے کوئی بات ہوئی تھی اس سلسلے میں؟''

''وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر میں غزالہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو کر سکتا ہوں۔''

''ہوں......'' شاہ جی نے کہا اور پھر ہنس پڑے، پھر بولے۔ ''پھر تم نے کیا، کہا؟''

''بس میں نے یہی کہا تھا اس سے کہ میں بہت جلد انتظام کر کے غزالہ سے شادی کر لوں گا۔''

''انتظام کیا کرو گے؟''

''اس کے لئے ایک رہائش گاہ کا بندوبست اور دوسری ضروریات اور بس اس کے بعد میں اس سے نکاح کر لوں گا۔''

''بندوبست کر سکتے ہو؟''

"بالکل کرسکتا ہوں۔"

"اگر میں تم سے کہوں کہ شمشیرہ بیگم نے ہی تمہیں جانو چوہدری سے پٹوایا ہے تو کیا تم اس بات کا یقین کرلو گے؟"

"آپ کہہ رہے ہیں تو یقین کرلوں گا۔لیکن انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"

"اس لئے میری جان کہ تم طوائف کو نہیں جانتے۔ بھلا وہ اپنی آمدنی کا ذریعہ کیسے چھوڑ سکتی ہے؟"

"وہ تو تیار تھیں۔"

"تمہیں فریب دیا تھا اس نے۔ اچھا خیر چلو چھوڑو، بتاؤ کہ کیا غزالہ کے ساتھ واقعی زندگی گزار سکو گے تم؟"

"یہ میرا عزم ہے چچا جان! زندہ رہا تو اسی کے ساتھ زندگی گزاروں گا ورنہ زندگی کھو دوں گا۔"

"وہ بھی تیار ہے؟"

"دل و جان سے تیار ہے۔"

"تمہیں اس پر اعتماد ہے؟"

"ہاں......اگر اس پر اعتماد نہ ہوتا تو یہ سلسلہ ہی نہ ہوتا۔"

"کتنی رقم لٹا چکے ہو اس پر؟"

"غزالہ تو ایک پیسہ بھی لینا پسند نہیں کرتی، لیکن شمشیرہ بیگم کا منہ بھرنے کے لئے بہت کچھ دے چکا ہوں۔"

"اچھا اب آخری بات اور بتاؤ۔"

"پوچھیے؟"

"اماں باوا کو پتہ چل گیا تو کیا کرو گے؟"

"کچھ نہیں...... میں اپنی زندگی اپنے طور پر گزاروں گا۔ وہ یقیناً جو میں چاہوں گا اس پر خوش ہوں گے۔"

"سوچ لو۔"

"میں نے اچھی طرح سوچا ہوا ہے جناب! آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے، اب مجھے

ہسپتال سے جانے کی اجازت دلوا دیں۔ پتہ نہیں غزالہ پر کیا بیت رہی ہوگی اور میرے ماں باپ بھی میری گمشدگی کی وجہ سے پریشان ہوں گے۔"

"انہیں یہیں بلوا لیتے ہیں۔ چلو اب ذرا اپنا پتہ لکھوا دو۔لیکن سوچ لو۔"

"میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے......آپ پتہ لکھ لیجئے۔"

پتہ لے کر شالے خان کو روانہ کیا گیا۔شاہ جی یہ مسئلہ حل کر دینا چاہتے تھے۔ بہت دیر تک علی شان سے باتیں کرتے رہے۔لڑکا انہیں اپنے ارادوں میں اٹل معلوم ہوا تھا۔ بعد میں وہ وہاں سے ہٹ آئے اور ایک جگہ بیٹھ گئے۔نور شاہ نے کہا۔

"شاہ جی یہ کیا شروع کر دیا آپ نے؟"

"یار نور شاہ! مزہ نہیں آ رہا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ زندگی میں کبھی کسی عورت سے دشمنی نہیں کی لیکن یہ کمبخت کی بچی ایسی ہے کہ اس سے دشمنی کرنے میں بھی مزہ آتا ہے۔اب ایسا کریں گے کہ خاموشی سے غزالہ کا نکاح کرا دیں گے اس لڑکے سے۔ اس کے بعد جو شمشیرہ بیگم کے دل پر گزرے گی اس کا اندازہ لگا سکتے ہو تم؟"

"اندازہ تو ہے شاہ جی! لیکن کیا یہ نبھاؤ ہو سکے گا؟"

"اب یہ ان دونوں کی تقدیر ہے، ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟"

"تو آپ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں؟" نور شاہ نے کہا اور شاہ جی نے چونک کر نور شاہ کو دیکھا۔

"نور شاہ! کیا کہہ رہے ہو؟ کیا ہم کوئی ایسی بات منہ سے نکالتے ہیں جس کا فیصلہ نہ کر لیں؟"

"ٹھیک ہے......اب بھلا کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔"

بہرحال علی شان کے والدین کو اطلاع مل گئی تھی۔ وہ حیران پریشان روتے ہوئے ہسپتال پہنچے تھے۔شاہ جی نے راستے ہی میں انہیں روک لیا۔

"میرا نام رب نواز شاہ ہے۔"

"میرا بیٹا کہاں ہے؟"

"اب بالکل ٹھیک ہے......لیکن اس سے ملنے سے پہلے میں کچھ باتیں آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ضروری ہیں۔ بیٹھ جائیے۔"

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ہم نے کہا ناں، بیٹھ جائیے...... کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ اگر اس کی زندگی چاہتے ہیں آپ لوگ تو پہلے مجھ سے بات کر لیجئے۔"

دونوں میاں بیوی یہ الفاظ سن کر سکتے میں رہ گئے تھے۔ شاہ جی نے پُر رعب لہجے میں یہ بات کہی تھی۔ انہوں نے باقی لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا، پھر بولے۔

"دیکھئے، ویسے تو علی شان کے چوٹ لگی ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن ایک چوٹ ایسی لگی ہے اس کے دل پر جس کا ٹھیک ہونا ممکن نہیں ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"دیکھیے، یہ نوجوانی کی عمر ایسی ہوتی ہے کہ ہر طرح سے بگڑ جانے کے امکانات ہوتے ہیں۔ قصور والدین کا بھی ہوتا ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ جب تک ہم اپنے بچوں کو کسی منزل پر نہ پہنچا دیں، ان پر لمحہ لمحہ نگاہ رکھی جائے، ان کے طور طریق کا اندازہ لگایا جائے۔ لیکن آپ لوگ دو کے چار اور چار کے آٹھ بنانے میں باقی سارے ماحول کو بھول جاتے ہیں۔ معاف کرنا مجھے آپ کے گھر پر تبصرہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، میں آپ سے وہ کہہ رہا ہوں جو ایک سچائی اور ایک حقیقت ہے۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ضرور کرتے رہیے لیکن نوجوانی کی یہ عمر بگڑ جانے کی عمر ہوتی ہے اور اگر اس عمر میں کوئی ایسا روگ لگ جائے تو سمجھ لیجئے کہ ساری زندگی داغدار ہو جاتی ہے۔ ایک طوائف کی بیٹی سے عشق ہو گیا ہے آپ کے بیٹے کو۔ طوائف کا نام شمشیرہ بیگم ہے اور بیٹی کا نام غزالہ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ لڑکی بھی تیار ہے آپ کے بیٹے کے ساتھ زندگی گزارنے کو۔ حالات زیادہ برے نہیں ہیں۔ یہ مار اسے شمشیرہ بیگم نے لگوائی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ اس کی بیٹی کسی لڑکے کے چکر میں پڑے۔ خیر، شمشیرہ بیگم کو تو ہم دیکھ لیں گے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آپ ایک طوائف زادی کو قبول کرنے پر تیار ہو جائیں گے؟ ویسے لڑکی اچھی ہے، اس کی گارنٹی ہم دے رہے ہیں۔"

علی شان کے باپ نے پریشان نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟" شاہ جی ایک دم چونک پڑے۔

"ان کا نام ثریا بیگم ہے۔ لیکن یہ نام میں نے رکھا ہے، پہلے یہ کچھ اور تھیں اور جو کچھ تھیں میں اب اس نام کو دہرانا نہیں چاہتا۔"

"ہم اب بھی نہیں سمجھے؟"

"یہ بھی ایک طوائف زادی ہی تھیں۔ چھبیس سال پہلے میں ان کے عشق میں گرفتار ہوا، میں نے ان کے ساتھ شادی کرنا چاہی تھی۔ اس وقت ہمارے ساتھ بھی یہی تمام حادثات پیش آئے تھے، زمانے بھر کی مخالفتیں مول لی تھیں میں نے۔ بہر حال ہم نے شادی کر لی۔ اور آپ یقین کر لیجئے کہ ہماری زندگی اتنی پُر سکون اور خوشگوار گزری ہے کہ ہماری دعا ہے کہ اگر ایسے ہی کسی حادثے کا شکار کوئی شخص ہو تو اس کی زندگی میں ایسی ہی عورت آئے۔"

"اچھا......" شاہ جی ایک لمحے کے لئے لرز سے گئے، ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پیدا ہو گئے۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولے۔ "تو پھر آپ یہ بتائیے کہ اپنے بیٹے کی خوشی کے لئے آپ یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہیں؟"

"دل و جان سے، پورے خلوص سے۔"

"میں بھی تاریخ کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کروں گی۔ میرے گھر میں آنے والی اگر بری بھی ہوئی تو میں اسے سنبھال لوں گی جس طرح میرے شوہر نے مجھے سنبھالا۔ یہ تو ایک نیک کام ہے۔ میرے شوہر نے مجھے عزت دی۔ کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں کہاں سے آئی ہوں۔ اسی طرح میں بھی اس لڑکی کی عزت کرنے پر تیار کروں گی۔"

"جزاک اللہ...... جی خوش کر دیا آپ نے۔ اب میں آپ کو بڑے خلوص سے بھابی کہہ سکتا ہوں۔ چلیے یہ مسئلہ حل ہوا، اب ہم آپ کے ساتھ ہیں اور سینہ ٹھونک کر کہتے ہیں کہ یہ شادی ہم کرائیں گے۔ دیکھیں گے کہ کون ہمیں روکتا ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آئیے اب اپنے بیٹے سے ملاقات کر لیجئے۔"

شاہ جی خوشی خوشی انہیں لے کر ہسپتال کے اس کمرے کی طرف چل پڑے جہاں علی شان موجود تھا۔

○●○

حاجو کو جلاب ہو رہے تھے...... بری حالت تھی۔ گھڑی گھڑی باتھ روم جا رہا تھا اور چہرہ اُترا جا رہا تھا۔ شمشیرہ بیگم ہنس ہنس کر بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔ کہنے لگیں۔

''اے حاجو! اگر اسی طرح آتے جاتے رہے تو پھر تو تمہیں ٹٹول ٹٹول کر دیکھنا ہوگا۔''

''اُڑا لو مذاق شمشیرہ بیگم! اُڑا لو مذاق۔ اگر تم نہ مذاق اُڑاؤ گی تو پھر کون اُڑائے گا۔''

''میں پوچھتی ہوں کیا کھا لیا...... چلے گئے ہوگے فوڈ اسٹریٹ...... نہاری کے ڈونگے کے ڈونگے کھا لئے ہوں گے۔''

''بخدا الزام تراشی تو تمہارا مسلک ہے۔ ہم دھان پان سے آدمی ہیں، زندگی میں کبھی ڈیڑھ روٹی سے زیادہ نہیں کھائی اور تم کہہ رہی ہو کہ نہاری کے ڈونگے اتار لئے ہوں گے۔''

غلام شاہ بھی شمشیرہ بیگم کے ساتھ ہنس رہا تھا۔ حاجو نے دانت پیس کر کہا۔ ''ہنس لو غلام شاہ! ہنس لو۔ ہم تو صرف ایک بات جانتے ہیں کہ کسی بزرگ نے ہمارے خاندان کے بزرگ کو دعا دی تھی کہ جو کوئی تمہاری نسلوں کا مذاق اُڑائے گا آنے والے دور میں اُن کی نسلیں زمین بوس ہو جائیں گی۔''

''فی الحال تو تم زمین بوس ہو رہے ہو حاجو! ہم تو تشویش کا شکار ہیں۔ قسم اللہ کی دس بیس مرتبہ اور چلے گئے تو اس کے بعد اٹھا کر ہی لانا پڑے گا۔ ہم تو تمہارے لئے پریشان ہیں۔''

شمشیرہ بیگم ٹھٹھے لگاتی رہیں۔ وہ بہت خوش تھیں۔ علی شان تین دن سے نہیں آیا تھا اور اب یہ بات پایہ تکمیل تک پہنچ گئی تھی کہ اس سے چھٹکارہ مل گیا۔ اسامی تو خیر تھی، لیکن جو چکر اس نے اور غزالہ نے مل کر چلایا تھا اس نے صحیح معنوں میں سولی پر لٹکا رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے پیچھا چھوٹا تھا۔ دل میں سوچتیں تو بعض اوقات بڑی خوفزدہ ہونے لگتیں۔ ان لڑکیوں نے تو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ دوسرے کوٹھوں کی لڑکیاں بھی تو ہیں...... خوشی سے دھندہ کرتی ہیں، یہاں کی لنکا میں تو سب ہی باون گز کے نکلے۔

کوثر جہاں نے ایسا غلط سلسلہ شروع کیا کہ اس کے بعد دوسری لڑکیوں کے بھی پَر نکل آئے اور سب کی سب اِدھر اُدھر کی سوچنے لگیں۔ سب کو ہرا ہرا نظر آنے لگا۔ سب گھر بسانے کی فکر میں سرگرداں ہوگئیں۔ کم بختوں کو یہ پتہ نہیں کہ طوائفوں کے گھر کبھی نہیں بستے۔ بلکہ جس گھر کو وہ بسانے کی کوشش کرتی ہیں وہ بھی اُجڑ جاتا ہے۔ مگر جوانی کا جوش کون سمجھائے۔ غزالہ کی کیفیت دیکھ رہی تھیں، مرجھائی ہوئی تھی۔ اندھیرا شروع ہوتا تو آنکھیں دروازے سے جا لگتیں۔ جانتی تھیں کہ کس کا انتظار ہے...... لیکن بہرطور اطمینان تھا

کہ اب مشکل حل ہوگئی ہے۔ کوئی نہیں آئے گا۔ لیکن یہ بات بھول کر بھی اپنی زبان سے نہیں نکالنا چاہتی تھیں۔ لڑکیاں ہیں، سرکش ہیں۔ بغاوت پر اتر آئیں تو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

جس طرح کوثر جہاں دل کو کچوکے لگا گئی تھی، ادھر غزالہ تشویش کا شکار تھی، شبانہ اس کی ہمراز تھی۔ آج برداشت نہ ہو سکا تو زبان کھل گئی۔

''شبانہ! مجھے تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔''

''کیسا باجی؟'' شبانہ نے کہا۔

''علی شان غائب ہے۔''

''ہاں...... آنہیں رہے کئی دن سے۔ ہو سکتا ہے شہر سے باہر گئے ہوں۔''

''مجھے بتائے بغیر؟'' غزالہ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا اور شبانہ اسے ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھنے لگی، پھر بولی۔

''باجی! ایک بات کہوں...... برا تو نہیں مانو گی؟''

''نہیں بول، کیا کہنا چاہتی ہے؟''

''بہت اچھا تجربہ نہیں ہے ہمیں ان مردوں کا۔ یہ تماش بین بن کر آتے ہیں، محبت جتاتے ہیں، دنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں اور اس کے بعد غائب ہو جاتے ہیں۔ بتاؤ، کون ہے ایسا جس نے کچھ کر کے دکھایا ہو؟ کوثر جہاں ساری عمر تڑپتی رہی، مزاروں پر منتیں مانتی رہی، کیا ملا اسے۔ کوئی واپس آیا؟ جب یاد آتی ہے تو باجی تیری قسم، دل کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ کچھ بھی تھا، ہماری بہن تو تھی۔''

''تو کیا شبانہ! علی شان بھی ایسا ہی ثابت ہوگا؟''

''میں کہتی ہوں اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ مگر آیا کیوں نہیں؟''

''خدا جانے...... کتنی بے بسی ہے، کوئی پوچھنے بھی تو نہیں جا سکتا۔ کسی کے سامنے زبان کھولوں گی تو بات حلق سے نکل کر خلق میں چلی جائے گی۔''

''یہ تو ہے۔'' شبانہ نے کہا اور غزالہ خاموش ہوگئی۔ شمشیرہ بیگم تو ٹوہ میں لگی ہی رہتی تھیں، اس وقت بھی دونوں بہنوں کی باتیں سن رہی تھیں۔ اندر داخل ہونے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔ اچانک ہی اندر داخل ہوگئیں۔ دونوں بہنیں انہیں دیکھ کر سکتے میں رہ گئی

تھیں۔ شمشیرہ بیگم نے غزالہ کو دیکھا اور آہستہ سے بولیں۔

''معاف کرنا غزالہ! تیری باتیں سن لی ہیں میں نے۔''

غزالہ کا رنگ فق ہو گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شمشیرہ بیگم کو دیکھنے لگی۔ شمشیرہ بیگم نے چہرے پر اداسی پیدا کی اور مغموم لہجے میں کہا۔ ''بیٹا! اصل میں زمانہ برا آ گیا ہے، جن سے خون کے رشتے ہوتے ہیں انہیں ٹھکرا دیا جاتا ہے، نظر انداز کر دیا جاتا ہے، غیروں پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ میں ماں ہوں تم تینوں کی، ایک کو دیکھو گھر چھوڑ گئی، بچی کو بھی لے گئی۔ کیا سمجھتی ہو تم میرے دل پر دوہرا زخم نہیں آیا ہے؟ بہت کچھ سمجھایا، بہت کچھ بتایا۔ کہا تھا اس سے کہ ان سایوں کے پیچھے نہ بھاگو یہ سائے کبھی ہاتھ نہیں آتے لیکن نہ مانی۔ یہی دعا کرتی ہوں اس کے لئے کہ جہاں بھی ہو کسی مشکل میں نہ پڑے۔ اپنا گھر چھوڑ گئی، جو کچھ تقدیر نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے اس سے انحراف کرو گی تو بھلا کیسے گزارہ ہوگا...... تقدیر سے کوئی لڑ سکا ہے آج تک؟''

''اماں! کیا کہہ رہی ہو...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''یہی کہہ رہی ہوں بٹیا! جو ہو، وہی رہو۔ اس سے آگے بڑھیں تو اپنے راستے بھی کھو بیٹھو گی۔'' شمشیرہ بیگم نے اس سے آگے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا، چلی گئیں۔ غزالہ ہول کر رہ گئی۔

''ہائے شبانہ! کہیں اماں نے ہماری ساری باتیں نہ سن لی ہوں۔''

''سن لی ہوں گی تو سن لیں...... کیا کر لیں گی ہمارا...... سب کچھ ہی تو کر رہے ہیں ان کے لئے۔''

''پھر بھی، کم از کم کچھ پتہ تو چلے کہ آخر علی شان کہاں رہ گئے؟''

شبانہ خاموشی سے غزالہ کی صورت دیکھتی رہی۔ کیا کہتی، کوئی ایسا سہارا نہیں تھا جس سے کوئی کام کرایا جائے۔ ادھر حاجو کی بری حالت تھی۔ اصل میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی وجوہات کچھ اور تھیں۔ دل میں جو کچھ تھا کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ بس حالت خراب تھی۔ شاہ جی کو یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ علی شان کو شمشیرہ بیگم نے پٹوایا ہے، اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کی ذمے داری بہر طور اس گھر پر آنے والی ہے۔ دل ہی دل میں خوفزدہ بھی تھا۔ شمشیرہ بیگم کی طرف بھاگا۔ شمشیرہ بیگم اس وقت غلام شاہ سے باتیں کر رہی تھیں۔ حاجو کو

بھاگتے دیکھ کر بولیں۔

''اے...... اے...... دروازے پر رکو...... دروازے پر رکو...... بھاگتے ہوئے آئے ہو، پیٹ ہلا ہوگا۔ خوامخواہ قالین گندا کرو گے۔''

''شمشیرہ بیگم! بے کار کی باتیں مت کرو...... میں کچھ کہنے آیا ہوں۔''

''کیا آخری خواہش بیان کرنے آئے ہو؟'' شمشیرہ بیگم نے کہا اور ہنس پڑیں۔

''یہی سمجھ لیجئے۔'' حاجو نے جھلا کر کہا۔

''کہو...... کیا وصیت کر رہے ہو؟''

''کوئی وصیت نہیں کر رہا...... میں کچھ دنوں کے لئے لاہور سے باہر جانا چاہتا ہوں۔''

''کہاں؟''

''پنڈی...... اسلام آباد وغیرہ۔''

''وہاں جا کر کیا کرو گے؟''

''وہیں جا کر مروں گا۔'' حاجو نے کہا۔

''توبہ، توبہ...... ابھی تمہارے مرنے کے دن کہاں ہیں حاجو؟''

''دیکھو شمشیرہ بیگم! مذاق مت اُڑاؤ، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے سن لو۔ میں دو تین دن کے لئے جا رہا ہوں کہیں۔ کسی کو بتاؤں گا نہیں کہ کہاں جا رہا ہوں۔ بس ذرا آرام کروں گا۔''

''ارے تو کیا قبرستان جا رہے ہو؟'' شمشیرہ بیگم نے کہا۔

''جہاں بھی جاؤں، تمہیں اس سے کیا؟ بس تمہیں بتانے آیا ہوں۔ سامان باندھ رہا ہوں اور جا رہا ہوں۔''

''مگر تمہارا اور ٹھکانہ کہاں ہے؟ برسوں تو بیت گئے تمہیں میرے دروازے پر۔ یہیں کا کھایا، یہیں کا پیا۔ اب کہیں اور جا کر کیا کرو گے؟''

''بس جی چاہ رہا ہے۔''

''تمہاری صورت بھی نہیں پہچانے گا کوئی اب تو۔''

''تمہیں اس سے کیا۔''

''جاؤ، جاؤ...... سارنگی کوئی اور بجا لے گا، اس کی کیا کمی ہے۔ ہمارے پاس شرافت

حسین بھی موجود ہے۔ کتنے دنوں میں واپس آجاؤ گے؟''

''بس مہینہ ڈیڑھ مہینہ لگ جائے گا۔''

''چلو ٹھیک ہے...... کچھ دنوں کے لئے تو تمہاری منحوس صورت آنکھوں سے دور ہوگی۔ مگر سنو، پیسے ویسے مت مانگنا، جو کچھ تمہارا حساب کتاب بنتا ہے وہ تمہیں دے چکی ہوں۔''

''کچھ تو دے دو شمشیرہ بیگم! سفر پر جا رہا ہوں، کچھ نہ کچھ تو ہاتھ آنا چاہئے۔'' حاجو نے غلام شاہ کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''ہاں، تھوڑے بہت لے لو، مگر اگلے مہینے کی تنخواہ میں کاٹ لوں گی، یہ خیال رکھنا۔''

''کاٹ لینا...... پیسہ تو تمہارا ایمان ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، کس سے کہتی ہوں کہ پیسہ میرا ایمان نہیں ہے...... جو کچھ ہے وہ سچ ہی بولتی ہوں۔ کب جا رہے ہو؟''

''آج ہی شام۔'' حاجو نے کہا۔ وہاں سے باہر نکلا تو غلام شاہ کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔ غلام شاہ جانتا تھا کہ حاجو اسے کیوں بلا رہا ہے۔ بہرطور دل میں بے ایمانی آ چکی تھی اور حاجو کو آدھی رقم دینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا حالانکہ کتنی بار کہہ چکا تھا بلکہ اس رات یہ وعدہ کر کے لایا تھا کہ بس ابھی چل کر پیسے دے دے گا لیکن گھر آ کر یہ کہہ دیا تھا کہ پیسے کسی ایسی جگہ رکھ دیئے ہیں جہاں وہ کسی کے ہاتھ نہ لگیں۔

''غلام شاہ! یوں لگ رہا ہے تم جیسے کچھ بدنیتی پر آمادہ ہو۔''

''کیسی بدنیتی حاجو؟''

''پیسے ابھی تک نہیں دیئے تم نے۔''

''دے دیں گے یار! ایسی کون سی مصیبت آ رہی ہے۔''

''میں بتا چکا ہوں کہ میں جا رہا ہوں۔''

''تو جاؤ، شمشیرہ بیگم تمہیں تھوڑے بہت پیسے دے ہی رہی ہیں۔''

''غلام شاہ! شرافت سے پیسے دے دو، ورنہ خدا کی قسم ابھی جاؤں گا شمشیرہ بیگم کے پاس اور ساری باتیں ان سے کہہ دوں گا۔ پھر انہیں لے کر سیدھا چوہدری کے پاس جاؤں گا اور اس سے ساری باتیں کہلوا دوں گا۔''

''ارے ارے...... تو مرچیں کیوں چبا رہے ہو...... تھوڑے پیسے چاہئیں تو لے لو۔ جب واپس آؤ گے تو باقی بھی دے دوں گا۔''

''پورے ساڑھے سات ہزار لوں گا...... ساڑھے سات ہزار۔''

''بخدا اس وقت ساڑھے سات ہزار تو بالکل بھی نہیں ہے...... دو ڈھائی ہزار پڑے ہیں، لے لو۔ باقی حساب کتاب بعد میں ہو جائے گا۔''

''دیکھو غلام شاہ! باز آ جاؤ۔''

''اچھا چلو ایسا کرو سارا حساب کتاب لگا کر تمہیں چار ہزار اس وقت دے سکتا ہوں، باقی ڈھائی تین ہزار واپس آ کر لے لینا۔''

''سوچ لو غلام شاہ! سلطانی گواہ بن جاؤں گا۔ قسم اللہ کی سیدھا پولیس میں جاؤں گا، کہوں گا کہ غلام شاہ نے چوہدری کے ساتھ مل کر علی شان کو مارا ہے۔''

''ستیاناس ہو تمہارا...... اچھا چلو پانچ ہزار لے لو، ڈھائی ہزار تو چھوڑ دو۔ بعد میں لے لینا۔ میں وعدہ کرتا ہوں دے دوں گا۔''

حاجو کو اندازہ ہو گیا تھا کہ غلام شاہ سے اس وقت پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ملیں گے۔ اس وقت جو بھی مل جائے غنیمت ہے کیونکہ جانتا تھا کہ کچھ وقت کے بعد شاہ جی کچھ نہ کچھ کرنے ہی والے ہیں۔ بہرحال پانچ ہزار قبول کر لئے اور اس کے بعد خاموشی سے وہاں سے نکل گیا۔ جانتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کی تمام تر ذمہ داری غلام شاہ پر ہی ہوگی۔ کیونکہ غلام شاہ چوہدری سے جا کر ملا تھا۔ ساری بات چیت اسی نے طے کی تھی۔ بہرطور حاجو کے لئے پانچ ہزار روپے بھی برے نہیں تھے۔ کچھ دنوں کے لئے کہیں نہ کہیں نکل جائے گا، کئی جگہ پرانے دوست شناسا موجود تھے۔ لیکن جانتا تھا کہ سب کے سب اب صورت بھی بھول چکے ہوں گے۔ بہرحال کیا فرق پڑتا ہے، یہاں سے تو کچھ دن کے لئے نجات مل جائے گی۔ پھر واپس آ کر دیکھے گا کہ صورتحال کیا ہے۔ اگر حالات بہتر ہوئے تو ٹھیک ورنہ کہیں اور کی راہ لے گا۔ بہرحال ابھی خاصا وقت آسانی سے گزر سکتا تھا۔ چنانچہ عقل سے کام لیا اور لاہور سے نکل گیا۔

ادھر شاہ جی کو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔ شمشیرہ بیگم کے دل پر ایک اور چرکہ لگ رہا تھا حالانکہ شمشیرہ بیگم سے شاہ جی کی کوئی خاص دشمنی نہیں تھی لیکن ہیرا منڈی میں داخل

ہونے کے فوراً ہی بعد شمشیرہ بیگم ہی سے واسطہ رہا اور شمشیرہ بیگم نے پے در پے وار کئے تھے۔ خیر اس کا کوئی وار شاہ جی پر آج تک کامیاب نہیں ہوا تھا لیکن اس نے شاہ جی کو اپنی جانب متوجہ کرلیا تھا اور کوثر جہاں کے گم ہونے کے بعد شاہ جی کو شمشیرہ بیگم سے ایک خاص قسم کی نفرت ہوگئی تھی۔ نجانے کیوں ان کا دل اب بھی کسی وسوسے کا شکار تھا کہ کوثر جہاں کی گمشدگی میں شمشیرہ بیگم ہی کا ہاتھ ہے۔ حالانکہ حاجو نے بھی یہی کہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن بس شاہ جی کا دل اس طرف الجھا ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہلا ہی رہے تھے اور اب یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ علی شان کے والدین بھی مزے کے لوگ تھے۔ انہوں نے بڑی خوشی سے غزالہ کو اپنی بہو بنانے کا اظہار کر دیا تھا، یہ بھی ایک انوکھی بات تھی۔ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ سارے افسانے جھوٹے ہوگئے تھے۔ آج تک والدین کسی ایسے مسئلے پر مرنے مارنے پر ہی آمادہ ہو جاتے تھے، خاندان کی عزت، وقار سب کچھ ہی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ چاہے خاندان ہو یا نہ ہو، لیکن اصل مسئلہ بھی شاہ جی کے علم میں آچکا تھا۔ بہت ہی صاف ستھرے لوگ تھے ورنہ کون اپنی کسی خامی کا اظہار کرتا ہے۔

بہرحال جس تن لاگے وہ تن جانے والی بات تھی۔ علی شان کی ماں بھی اسی جہنم سے نکل کر آئی تھی چنانچہ اس جہنم کا راز جانتی تھی۔ ادھر علی شان کو جب یہ دلی سکون ہوا تو آناً فاناً اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہ جی کا سہارا مل گیا تھا اور یہ بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ کتنی بڑی چیز ہیں۔ چنانچہ رب نواز شاہ جی ہی شاہ جی تھے۔ علی شان کے والدین نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا، شاہ جی پہنچ گئے۔ اب اس سلسلے میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آگے کیا اقدامات ہوں گے۔ ان کی بڑی اچھی خاطر مدارت ہوئی، بڑا احترام کیا گیا اور پھر علی شان کے والد نے کہا۔

”شاہ جی! درحقیقت آپ نے جو ہم پر احسانات کئے ہیں ہم ان کا صلہ تو نہیں دے سکتے، ابھی ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ شمشیرہ بیگم کو میں بالکل نہیں جانتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ جو عورت یہ کارروائی کرسکتی ہے کہ بدمعاشوں سے میرے بیٹے کو زندگی سے محروم کروانے کی کوشش کرے وہ باقی اور بھی کچھ کرسکتی ہے۔ اب آپ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

”کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے، نکاح کا دن مقرر کرلو اور کوئی نئی کوٹھی وغیرہ لینے کی ضرورت نہیں ہے، لڑکی تمہارے ساتھ گزارہ کرلے گی۔ ہاں یہاں لانے کے بعد تمہیں ذرا احتیاط کرنا ہوگی۔ لیکن اس کا بندوبست بھی ہم ہی کر دیں گے۔ اب ایسا کرتے ہیں کہ غزالہ کو پیغام بھجوائے دیتے ہیں، اسے اپنے ڈیرے پر بلوائے لیتے ہیں۔ علی شان خود چلا جائے گا شمشیرہ بیگم کے یہاں۔ شمشیرہ بیگم نے تو کام کیا ہی ہے، اس کا کام ہوگیا ہے۔ لیکن آنے جانے پر پابندی نہیں لگائی جائے گی کیونکہ بات کھل کر سامنے نہیں آئی ہے۔ علی شان معمول کے مطابق وہاں جاکر غزالہ سے بات کرے۔ دن کی روشنی میں وہ ہمارے ڈیرے پر آجائے، باقی سارا کام کرنا ہماری ذمے داری ہے۔“

”ٹھیک ہے...... نکاح کہاں کرائیں گے شاہ جی؟“

”ایک چھوٹا سا گھر ہے ہمارے پاس، ہیرا منڈی سے الگ۔ ہمارے ساتھ چلو، ہم دکھائے دیتے ہیں، سارے انتظامات وہیں کر دیں گے۔“

بہرحال علی شان کو بھرپور سہارا ملا تھا۔

ادھر شمشیرہ بیگم کچھ زیادہ ہی خوش نظر آتی تھیں۔ علی شان کا کانٹا دل سے نکل گیا تھا۔ پتہ نہیں کس فطرت کی مالک تھیں، ان کی زندگی میں جوڑ توڑ کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ اگر گہری نگاہوں سے دیکھا جائے تو وہ بھی قابل رحم ہستی تھیں۔ اتنا کچھ تھا ان کے پاس کہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اپنی اور بیٹیوں کی زندگی بخوبی گزار سکتی تھیں لیکن ایک ماحول ایک ہوس جو اس ماحول کا عطیہ تھیں...... بس دولت...... دولت...... اور دولت۔

اس دن بھی محفل جمی ہوئی تھی۔ غزالہ کے دل پر چوٹ پڑی تھی اور وہ درد بھری آواز میں گا رہی تھی کہ اچانک علی شان اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر شمشیرہ بیگم کو یوں ہی لگا تھا جیسے کالی آندھی اچانک ابھری ہو اور اس نے ماحول کو تاریک کر دیا ہو...... علی شان کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی، خوبصورت لباس میں ملبوس اندر آیا تھا۔ شمشیرہ بیگم کو سلام کیا، غزالہ کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ شمشیرہ بیگم پر تو ایسی بدحواسی طاری ہوئی تھی کہ سلام کا جواب تک نہ دے پائیں۔ لیکن غزالہ کی آواز کا سُر ایک دم بدل گیا، اس کے لہجے میں خوشی آگئی۔ آخر کار جب محفل ختم ہوئی تو صرف علی شان وہاں رہ گیا۔ شمشیرہ بیگم نے اس کے قریب آکر کہا۔

”خدا خیر کرے علی شان! کہاں غائب ہوگئے تھے؟ اور یہ چوٹ کیسے لگی ہے؟“

"بس شمشیرہ بیگم! نجانے کون کمبخت بلاوجہ دشمن بن گیا ہے۔ غنڈوں نے گھیر کر مارا تھا اس دن اور زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گئے تھے ہم۔ اب خدا خیر کرے۔"

"صدقہ دوں گی، نیاز کراؤں گی...... کون کمبخت تھا جس نے یہ سب کچھ کیا؟"

"بس کیا بتائیں...... تقدیر میں ہی تکلیف لکھی تھی۔ بہر حال آپ کے درِ دولت پر پھر آ گئے۔"

"جگ جگ آؤ...... تمہارا گھر ہے...... جس طرح چاہو آؤ۔"

پھر علی شان اس کمرے میں پہنچ گیا...... غزالہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے علی شان...... پتہ ہے کیسے کیسے وسوسوں میں ڈال دیا تھا...... بتا نہیں سکتی۔"

"چلو تجدید عشق ہو گئی۔ دل چاہتا تھا کہ تم انتظار کرو۔"

"ظلم کرنے پر آمادہ ہو گئے ہو؟"

"خدا نہ کرے۔"

"تو پھر بتاؤ یہ چوٹ کیسے لگی...... کون بدبخت تھا جس نے یہ چرکہ لگایا؟"

"ذرا دروازہ جھانک کر آؤ، کہیں کوئی سن گن نہ لے رہا ہو۔"

"مطلب؟"

"جو کہا جا رہا ہے کر لو اور دروازہ بند کر دو۔"

غزالہ دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ ایک دم سے دروازہ کھول کر دیکھا تو یوں لگا کہ کوئی چھپاک سے وہاں سے ہٹ گیا ہو۔ حیرت سے وہاں سے مڑی اور بولی۔

"تمہیں اس کا شبہ کیسے ہوا؟"

"چونکہ دشمن شہ رگ کے قریب ہے۔"

"کون؟"

"برا مان جاؤ گی۔"

"نہیں مانوں گی۔"

"دیکھو کھیل نہ بگاڑ دینا۔"

"کیسا کھیل؟"

"جو کچھ کرنا ہے اس میں ہمیں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے...... مجھ پر حملہ کروانے والی تمہاری ماں شمشیرہ بیگم تھیں۔"

"کیا؟"

"ہاں......" علی شان نے کہا اور غزالہ کا چہرہ سرخ ہو گیا، آنکھوں میں غصے کے تاثرات ابھر آئے۔ دیر تک غم و غصے میں ڈوبی رہی۔ شمشیرہ بیگم کو اچھی طرح جانتی تھی، بولی۔

"اماں نے یہ اچھا نہیں کیا۔"

"اللہ نے بچا لیا...... کسی رب نواز شاہ کو جانتی ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔"

"تو یوں سمجھ لو کہ میری زندگی انہی کی مرہونِ منت ہے۔ وقت پر پہنچ گئے...... ورنہ شاید غنڈے ہلاک ہی کر ڈالتے۔"

"شاہ جی ہمارے لئے فرشتۂ رحمت ہی ثابت ہوئے۔ ہر دفعہ ہمیشہ ہی ساتھ دیا انہوں نے ہمارا۔ ماں انہیں لاکھ برا کہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ کیا کہیں بس ان کے بارے میں۔ مگر اماں نے یہ سب کچھ کر کے کلیجے پر چھری ماری ہے۔ جی چاہتا ہے خوب سناؤں انہیں۔"

"ٹھیک ہے غزالہ! مگر بہرطور وہ تمہاری ماں ہیں...... اب ہمیں ذرا سی ہوشیاری سے کام لینا ہے۔"

"میں تو اب ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہوں گی۔ بس اترو اور مجھے ساتھ لے چلو۔ اماں سے صاف کہے دیتی ہوں کہ ایک پائی بھی نہیں لے جا رہی ہوں ان کی۔ بس اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رہوں گی۔"

"نہیں غزالہ! جو کام گڑ دینے سے ہو جائے، زہر دینے سے کیا فائدہ۔ تھوڑا صبر کرو۔ اب یہ بتاؤ کل کوئی وقت نکال سکتی ہو؟"

"کیسا وقت؟"

"شاہ جی کے احاطے تک پہنچنے کا۔ شاہ جی کے احاطے میں تمہارا انتظار ہو رہا ہو گا، جیسے ہی وہاں پہنچو گی ان کا کوئی آدمی تمہیں لے کر وہاں سے چلا جائے گا۔ شاہ جی نے ہمارے نکاح کا بندوبست اپنی ایک رہائش گاہ پر کیا ہے۔"

غزالہ پر بے خودی سی طاری ہو گئی، کہنے لگی۔ "کیا واقعی؟"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے۔"

"کس وقت پہنچنا ہے مجھے؟"

"مناسب وقت کون سا ہوتا ہے؟"

"ڈیڑھ بجے اماں کھانے کے بعد آرام کرنے کے لئے اپنے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔"

"تو کل دو بجے تک تم شاہ جی کے احاطے تک پہنچ جاؤ۔ میں انہیں اس بارے میں خبر کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گی۔"

"کسی کو تمہیں اس بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں ہے...... بعد میں سب کچھ ٹھیک کر لیں گے۔ بے فکر رہو۔"

علی شان تھوڑی دیر وہاں رکا اور اس کے بعد وہاں سے واپس نکل آیا۔ بڑے کمرے میں شمشیرہ بیگم اور غلام شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ غلام شاہ کے چہرے پر پھٹکار برس رہی تھی اور شمشیرہ بیگم کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا، لیکن زمانہ ساز تھیں، مسکرا کر بولیں۔

"چل دیئے بیٹے؟"

"ہاں شمشیرہ بیگم! چلتا ہوں۔"

"کل آؤ گے؟"

"ضرور حاضری دوں گا۔" علی شان باہر نکل گیا۔ شمشیرہ بیگم نجانے کس طرح اب تک صبر کئے بیٹھی ہوئی تھیں، اندر ہی اندر الاؤ جل رہا تھا۔ جو کچھ کیا تھا وہ نہیں ہوا اور انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ علی شان پھر آ موجود ہوا۔ ادھر غلام شاہ کے ہاتھ پاؤں بھی پھولے ہوئے تھے جانتا تھا کہ اب شمشیرہ بیگم پھانسی چڑھا دیں گی۔ حاجو کے بارے میں سوچ رہا تھا، دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہ حاجو کو اچانک جلاب کیسے شروع ہو گئے اور پھر باہر بھاگنے کی کیوں سوجھی؟ یقیناً دال میں کچھ کالا ہے۔ اپنی جگہ سے اٹھا تو شمشیرہ بیگم نے جھپٹ کر قمیض کا کالر پکڑ لیا اور دبوچ لیا، پھر اسے زور سے کمرے کے وسط میں دھکا دیتی ہوئی بولیں۔ "نکل کہاں رہا ہے...... ذرا رک تو سہی، دو باتیں کرنی ہیں۔"

"یہ...... یہ...... یہ کیا مذاق ہے؟"

"مذاق تو اب میں تجھ سے کروں گی غلام شاہ! یہ بتا، علی شان کیسے واپس آ گیا؟"

"مم...... مم...... مجھے کیا معلوم؟"

"ایسے نہیں جینے دوں گی غلام شاہ! شمشیرہ ہے میرا نام...... ارے آج مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ آستین کے سانپ کون ہیں...... کون مجھے ڈستا رہا ہے زندگی بھر۔"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"یہ علی شان واپس کیسے آ گیا...... تم تو کہہ رہے تھے......"

"تو قتل تھوڑا ہی کرنا تھا اسے...... تم تو فوراً ہی مکر جاتیں، پھنستے ہم دونوں۔ تین چار دن ہسپتال میں رہا، پھر واپس آ گیا۔"

"اور بیس ہزار روپے میں تم نے یہ کام کرایا ہے...... بات تو یہ تھی کہ اب اس قابل نہ چھوڑا جائے کہ واپس آئے۔"

"پوچھوں گا میں اس سے...... ایسے ہی تھوڑا چھوڑ دوں گا۔"

"اب تم نہیں پوچھو گے، میں خود پوچھوں گی۔ جاؤ چین کی نیند سو لو...... لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ میں ناگن سے زیادہ زہریلی ہوں...... ڈسنے پر آؤں گی تو پانی نہیں مانگو گے۔"

غلام شاہ کی حالت خراب تھی۔ بہر حال بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی، موقع ملتے ہی دروازہ کھولا اور پھرتی سے باہر نکل گیا۔

○●○

رب نواز شاہ کچھ سوچیں اور پورا نہ ہو...... ان کے ساتھی ان کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔ غزالہ منصوبے کے مطابق باہر نکلی اور شاہ جی کے ڈیرے پر پہنچ گئی۔ یہاں سے اسے اس عمارت میں پہنچا دیا گیا جہاں کبھی اکرام کا ٹھکانہ تھا۔ اس وقت عرشیہ وہاں موجود تھی۔ شاہ جی بھی وہیں موجود تھے اور انہوں نے عرشیہ کو تھوڑی سی صورتحال بتا دی تھی۔ عرشیہ نے جس ذمہ داری کے ساتھ تمام انتظامات کئے تھے وہ قابل دید تھے۔ نکاح کے انتظامات ہو گئے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد علی شان اپنے والدین کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ نکاح کیا گیا اور علی شان اور اس کے والدین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ شاہ جی نے لاکھوں روپے کا سامان آناً فاناً میں اکٹھا کر کے ان کے حوالے کیا۔

"ارے یہ کیا......؟"

"بیٹی بیاہ رہے ہیں...... اب اس قدر ناک تو ہے ہمارے ہاں کہ بیٹی کو عزت سے

روانہ کریں۔"

"آپ کیا ہیں شاہ جی...... یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" علی شان کے والد نے کہا۔

بعد میں تھوڑی سی تکلیف دہ اطلاعات شاہ جی کو ملی تھیں اور وہ تکلیف دہ اطلاعات یہ تھیں کہ شمشیرہ بیگم نے شدید جذبات کے عالم میں کہیں سے زہر حاصل کر کے پی لیا تھا۔ جوش و جذبات میں یہ قدم اٹھا تو بیٹھی تھیں لیکن اس طرح زندگی کھونے کا باعث بن گیا اور شمشیرہ بیگم دنیا سے کوچ کر گئیں۔ شبانہ نیم پاگل سی ہو گئی لیکن علی شان اسے اپنے ساتھ ہی لے گیا۔

ادھر یہ صورتحال چل رہی تھی، ادھر باقی سارے معاملات......

شمس الدین نے بیٹے کو دیکھا تو اس طرح دیوانہ ہوا کہ ہسپتال ہی کا ہو کر رہ گیا۔ اور پھر جب پہلی بار اسے اکرام نے دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

"آپ کون ہیں...... آپ تو بالکل میرے ہم شکل ہیں۔" تو شمس الدین شدت حیرت سے پاگل ہو گیا۔

"اکرام بیٹے...... تم...... تم......"

"آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟ یہ کون سی جگہ ہے...... میں کہاں ہوں؟ ارے یہ تو ہسپتال معلوم ہوتا ہے۔ شاہ جی کہاں ہیں...... ریل کا حادثہ ہوا تھا ناں؟"

شمس الدین خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور پھر کون تھا جو وہاں جمع نہ ہو گیا ہو...... سارے کے سارے آ گئے تھے اور خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ غیاث الدین نے بیٹی کو ہیرا منڈی بھیج دیا تھا، بعد میں انہیں اس کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا لیکن یہ بات جانتے تھے کہ ایک غیرت مند شخص کے پاس بھیجا ہے۔ غلط بات تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ رب نواز شاہ کو اچھی طرح پہچانا جا چکا تھا۔ اکرام نے فوراً ہی کہا۔

"میں شاہ جی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

"ہاں بیٹے، کیوں نہیں۔"

پھر جب گروہ کا گروہ ہیرا منڈی میں رب نواز کے ڈیرے پر پہنچا تو شام جھک رہی تھی، جمعرات کا دن تھا اور یہاں پتہ چلا کہ شاہ جی داتا دربار گئے ہوئے ہیں۔ شمس الدین نے کہا۔ "جب سے آیا ہوا ہوں، دل کو لگی ہوئی ہے کہ کم از کم دربارِ ہجویری پر جا کر سلام

کروں۔ ابھی تک موقع ہی نہیں ملا۔ آج اللہ تعالیٰ نے میرے بیٹے کو صحت عطا فرمائی ہے تو میں وہاں جا کر سلام کرنا چاہتا ہوں۔ آئیے، شاہ جی سے بھی وہیں ملاقات کریں گے۔"

تمام لوگ خوش دلی سے تیار ہو گئے۔ پتہ نہیں کس نے کس کے لئے دعا مانگی تھی، پتہ نہیں مشیت ایزدی کن حوالوں سے بچھڑے ہوؤں کو یکجا کرنا چاہتی تھی۔ کوثر جہاں جو ایک اچھی زندگی بسر کر رہی تھی اور اس کے سرپرستوں نے اسے نئی زندگی سے روشناس کرا دیا تھا، اپنی مصروفیات میں آزاد تھی۔ جب دل چاہے جہاں چاہے جائے۔ جب دل چاہے جو کچھ بھی کرے۔ اس دن جمعرات تھی۔ دل کو ایسے ہی امنگ اٹھی تھی کہ دربار جائے، فاتحہ خوانی کرے۔ چنانچہ تسنیم کو لے کر داتا دربار پہنچ گئی۔ اور وہی آنسوؤں بھری فریاد آنکھوں سے جاری ہو گئی۔ ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ نکلی۔

"ملا دے...... بس ایک بار ملا دے...... بس ایک بار دکھا دے...... تُو تو بہت بڑا ہے...... تیری دعا ہو جائے تو کیا نہ ہو جائے...... میری اتنی سی آرزو پوری نہیں ہو سکتی؟ گناہ تو کئے ہیں میں نے، اس قابل تو نہیں ہوں لیکن تُو تو بہت بڑا ہے۔ ملا دے، ایک بار ملا دے، ایک بار......" یہ کہہ کر نگاہیں اٹھائیں تو کچھ اور ہی منظر دیکھا۔ آنکھوں کو یقین نہ آئے۔ ایک خواب، ایک دھوکا۔ ہاں، وہ دونوں ہم شکل تھے...... ان میں ایک اس کا اکرام تھا اور دوسرا...... دوسرا اس کی آرزو...... آہ...... کیا یہ وہی ہے...... کیا یہ وہی ہے؟...... کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟...... اپنی جگہ سے اٹھی تو چکر سا آیا۔ دو قدم آگے بڑھی اور اس کے حلق سے ایک تیز چیخ نکلی۔

"اکرام......"

یہ تیز چیخ اکرام نے سنی ہو یا نہ سنی ہو لیکن قریب موجود رب نواز شاہ نے ضرور سن لی تھی۔ کوثر جہاں کو تیورا کر گرتے ہوئے دیکھا تو برق رفتاری سے آگے بڑھے اور اسے شانوں سے سنبھالا۔ کوثر جہاں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ اس کی انگلی ایک سمت اٹھی ہوئی تھی اور اس کے حلق سے آواز نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاہ جی کے منہ سے حیرانی سے نکلا۔

"کوثر جہاں......"

کوثر جہاں کے منہ سے بمشکل تمام نکلا۔ "شاہ جی! اکرام......"

تب رب نواز شاہ نے گردن گھما کر دیکھا اور ان کی کیفیت بھی کوثر جہاں سے مختلف نہ ہوئی۔ غیاث الدین، نظام الدین، نادر شاہ، جواد حسین...... سارے کے سارے یہاں جمع ہو گئے۔ اور اس کے بعد جو رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے وہ اپنی مثال آپ تھے۔ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہو گئے تھے۔ شاہ جی نے خود ہی اپنے آپ کو سنبھالا، ان کے آدمیوں نے مجمع ہٹایا اور اس کے بعد یہ گاڑیاں بھر کر چل پڑیں۔ کوثر جہاں بھی ساتھ تھی۔ تسنیم، اکرام، شمس الدین تمام ہی لوگ موجود تھے۔ جمعرات...... پیروں مریدوں کی رات، کرامات کی رات...... یہ رات اتنی خوشیاں لے کر آئی تھی کہ سمیٹے نہ سمیٹی جا سکیں۔ شاہ جی انہیں اپنی کوٹھی پر لے گئے۔ عرشیہ باپ سے ملی اور اس کے بعد سب سے پہلے اللہ نواز شاہ کو اطلاع کی گئی جو لاہور ہی میں موجود تھے۔ خوشیوں کا یہ گھر اتنی خوشیوں کا گہوارہ بنا کہ سمیٹنے والے یہ خوشیاں نہیں سمیٹ پا رہے تھے۔

اکرام، شمس الدین، کوثر جہاں...... غرض کون نہیں تھا یہاں۔ کوثر جہاں کا نکاح بھی اسی مبارک عمارت میں شمس الدین سے کرایا گیا۔ رب نواز شاہ نے باپ کے قدموں میں گر کر ان سے معافی مانگی اور اس طرح خوشیوں کی یہ بارات کافی دن تک اکٹھی رہی اور اس کے بعد زندگی اپنے معمول کی جانب چل پڑی۔ شبانہ دونوں بہنوں کے پاس تھی اور ماضی کے نقوش مٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ رب نواز باپ کے قدموں تلے لگے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ عرشیہ کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ادھر شبانہ بھی اکرام کو مبارکباد دینے آئی تھی اور اکرام نے اسے پہلی بار غور سے دیکھ کر کہا تھا۔

''تم تو عجیب ہو شبانہ! میں نے تو تمہیں کبھی اتنی گہری نگاہوں سے دیکھا ہی نہیں۔''

شبانہ مسکرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن تھوڑے ہی فاصلے پر موجود جواد حسین نے فاخرہ بیگم سے کہا۔

''سنا آپ نے...... یہ نئی نسل ہم سے بہت آگے کی چیز ہے...... آؤ واپس چلیں۔''

فاخرہ بیگم مسکرا کر جواد حسین کے ساتھ واپس چل پڑی تھیں۔

(ختم شد)